

# نفع المسلم شرح صحيح مسلم

فوائد

حضرت اکرام علی صاحبزادہ  
شیخ الحدیث جالعلہم السلام

مترجم

حضرت محمد انعام الحق قاسمی سیارمی  
استاذ دارالعلوم عالی پور کجرات

زمزم پبلشرز

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# نفع المسلم شرح صحيح المسلم

أَقْلَابَات

حضرت مولانا اكرام علي صاحبها اكلوبى

شيخ الحديث جاليعليم الدين ذا بيل انجرات

مترتب

حضرت مولانا محمد انعام الحق قاسمى سياترهمى

استاذ دار العلوم على پور گجرات

مزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اژدو بازاره کلاچن

نوم ۱۵۶۰۳۲۴

# عِلْمِ حَقِيقَتِ تَحْقِيقِ نَاسِیْرِ مَحْفُوظِ اَہِلِّیْنَ

کتاب کا نام — فتح المسلمین صبح المسلم

تاریخ اشاعت — مئی ۲۰۱۲ء

باہتمام — احکامیہ انسٹیٹیوٹ پبلیشرز

مطبع — احکامیہ انسٹیٹیوٹ پبلیشرز

ناشر — انسٹیٹیوٹ پبلیشرز کراچی

شاہ زریب سینئر نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی

فون: 021-32760374

فیکس: 021-32725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: www.zamzampublishers.com

مکتبہ اچھے بچے کی گنجینہ

■ **Madrassah Arabia Islamia**  
1 Azaad Avenue P.O Box 9788-1750  
Azaadville South Africa  
Tel : 00(27)114132786

■ **Azhar Academy Ltd.**  
54-56 Little Ilford Lane  
Manor Park London E12 5QA  
Phone: 020-8911-9797

■ **ISLAMIC BOOK CENTRE**  
119-121 Halliwell Road, Bolton BL1 3NE  
U.K.  
Tel/Fax : 01204-389080

■ مکتبہ بیت اعظم، اردو بازار کراچی - فون: 32724506

■ مکتبہ دارالحدیث، اردو بازار کراچی

■ دارالاشاعت، اردو بازار کراچی

■ قدیمی کتب خانہ بالتقابل آرام باغ کراچی

■ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

## فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۵	شرائط المسلم	۲۷	مبادیات
۵۶	شرائط میں چند اشکال	۲۸	حدیث کے لغوی اور اصطلاحی معنی
۵۷	خصوصیت مسلم	۲۹	علم حدیث کی تعریف
۵۷	طرز مسلم	۳۰	علم حدیث کی قسمیں
۵۸	مسلم کی اسانید	۳۱	علم حدیث کا موضوع
۵۸	ترجمہ مسلم	۳۲	غرض و غایت
۵۸	نوی مسلم	۳۲	وجہ تسمیہ
۵۸	شرح مسلم	۳۳	حدیث کے متقارب الفاظ
۵۸	منقبت مسلم	۳۵	اقسام حدیث اور ان کا ماخذ قرآن
۵۹	کیا مسلم شریف جامع نہیں؟	۳۷	صحاح ستہ کی شرطیں اور فرق مراتب
۵۹	کیا مسلم کی سبھی حدیث صحیح ہے	۳۹	مراتب روایات
۶۰	مسلم میں ضعیف راوی کی روایت	۴۰	صحاح ستہ کے مقاصد
۶۱	کیا صحیحین کی روایت مفید یقین ہے؟	۴۱	کتب حدیث کی قسمیں
۶۲	حدیث جمعہ میں شیخین کا اختلاف	۴۲	تحمل حدیث کی قسمیں
۶۳	سنہ عالی میں عن کا استعمال کیوں؟	۴۳	تدوین حدیث کب اور کس طرح؟
۶۳	امام مسلم کا تعارف	۴۷	دور تابعین
۶۳/۶۴	مسکن اور من ولادت و وفات	۴۸	حدیث ازل کون
۶۴	اساتذہ اور تلامذہ	۴۹	دوسری صدی اور تدوین حدیث
۶۴	فضائل و منقبت	۵۰	تیسری صدی اور تدوین حدیث
۶۵	امام مسلم کا مسلک	۵۰	حفاظت حدیث کے دو اسباب
۶۵	سبب وفات	۵۲	حفاظت حدیث کا دوسرا سبب
۶۵	تصانیف	۵۳	تابعین میں حفظ احادیث کا جذبہ
۶۶	کتاب الایمان	۵۴	حدیث کی اہمیت
۶۶	لفظ کتاب کی تحقیق	۵۵	مقدمۃ الکتاب
۶۷	ایمان کی لغوی و شرعی تحقیق	۵۵	وجہ تالیف اور تعدد روایت



۶۶	لفظ اللہ کی تحقیق	۶۸	تصدیق لغوی و منطقی میں فرق
۶۷	ملائکہ کی تشریح، اور اقسام فرشتہ	۶۹	ایمان کے معنی پر اشکال
۶۸	فرشتہ افضل یا انسان؟	۷۰	ایمان مرکب ہے یا بسیط
۶۹	تقدیر و قدر میں فرق	۷۱	مرکب یا بسیط ہونے میں اختلاف مذاہب
۱۰۲	مقام فنا میں مراد نہیں	۷۳	مشککین اور محدثین کے اختلاف کی حقیقت
۱۰۲	مقام احسان پر ابن رجب ضعیفی کی تحقیق	۷۴	مرکب و بسیط ہونے پر محاکمہ
۱۰۳	احسان کو اسلام سے مؤخر کیوں ذکر کیا؟	۷۶	حضرت شاہ ولی اللہ کی رائے
۱۰۳	قیامت کو سائنہ کہنے کی حکمت	۷۶	اقرار باللسان کی حیثیت
۱۰۴	ما المسؤول عنها باعلم من السائل	۷۷	ایمان و اسلام کے درمیان نسبت
۱۰۴	لا اعلم کے بجائے طویل جواب کیوں؟	۷۸	ایمان میں کمی زیادتی کا مسئلہ
۱۰۵	رضا خونی تو جیبہ	۷۹	اختلاف کی حقیقت
۱۰۵	قیامت کا ربط ما قبل سے	۸۰	دلائل و توجیہات
۱۰۶	فاخبرنی عن املاراتھا	۸۲	مذاہب ایمان کے سمجھنے کا آسان نقشہ
۱۰۶	لفظ امارت، اور علامت قیامت کی تسمیں	۸۳	(۱) حدیث جبرئیل
۱۰۶	لفظ رب کی تحقیق اور تو جیبہ حدیث	۸۵	ترجمہ حدیث
۱۰۷	ان تری الخفاة العراة الخ	۸۶	فرق قدریہ کی تاریخ
۱۰۸	فلبثت ملیا	۸۷	فرق قدریہ کے عقائد اور حکم
۱۰۸	حدیث جبرئیل کے فوائد	۸۸	فرق بندی کے اسباب
۱۰۹	(۲) حدیث	۸۸	حدیث جبرئیل کی اہمیت
۱۰۹	شرح حدیث	۸۹	حضرت جبرئیل کی آمد کب؟
۱۰۹	لقاویباری سے مراد	۸۹	حدیث کا شان و ردد
۱۱۰	شرک کا مفہوم اور اس کی تسمیں	۸۹	شرح حدیث
۱۱۱	کہانت اور غیب دہی	۹۱	اختلاف حال کی مصلحت
۱۱۱	علم غیب کی وضاحت علامہ کشمیری کے الفاظ میں	۹۲	حضرت جبرئیل کی آمد کس شکل میں
۱۱۳	باب بیان الصلوة التي هي احد اركان الاسلام	۹۲	یامحکمہ کہنے پر اعتراض
۱۱۳	حدیث و ترجمہ	۹۳	در بارہ رسالت میں حضرت جبرئیل کا سلام
۱۱۳	جاء رجل کا مصداق	۹۴	ایمان و اسلام کے درمیان فرق
۱۱۴	در بارہ رسالت میں مشککہ تسمیں کیساتھ آتا باعث اشکال	۹۵	شرک کا مفہوم اور اس کی تسمیں
۱۱۵	وجوب و ترک مسئلہ		لفظ اقامت صلوٰۃ کی حکمت

۱۳۱	ارکان میں جہاد کا تذکرہ کیوں نہیں؟	۱۱۶	حدیث سے مسئلہ نفل کا استنباط
۱۳۲	حج اور صوم کی تقدیم و تاخیر میں حضرت ابن عمر کے	۱۱۷	والکل احناف
۱۳۳	کلام کی تحقیق	۱۱۷	شوافع کے والکل کا جواب
۱۳۳	تقدیم و تاخیر کی عقلی وجہ	۱۱۸	لا ازید ولا انقص کا مطلب
۱۳۳	حدیث	۱۱۸	واللہ افعل ان صدق
۱۳۴	باب الامر بالایمان باللہ ورسولہ وشرائع الدین الخ	۱۱۹	غیر اللہ کی قسم پر اعتراض
۱۳۴	حدیث و ترجمہ	۱۲۰	باب السؤال عن ارکان الاسلام
۱۳۵	ابن عباس کی نگاہ میں ابو جہرہ کا مقام	۱۲۰	حدیث و ترجمہ
۱۳۵	حدیث کا شان و ردد	۱۲۱	حضرت خاتم کی آمد اور قبول اسلام
۱۳۶	قد عبد القیس کے آنے کا سبب	۱۲۲	بے جا سوال کی ممانعت
۱۳۷	قد کب آیا؟	۱۲۲	لا ازید علیہن ولا انقص منہن کا مفہوم
۱۳۷	قد کی تعداد اور ان کے اسہلو گرامی	۱۲۳	لا ازید کی حقیقت کیا ہے؟
۱۳۷	لا نخلص الیک الا فی شہر الحرام	۱۲۳	حضرت خاتم کی واپسی پر قوم کا قبول اسلام
۱۳۸	اجمال و تفصیل میں فرق	۱۲۴	باب بیان الایمان الذی یدخل بہ الجنة الخ
۱۳۹	حج ذکر نہ کرنے کی وجہ	۱۲۴	حدیث و ترجمہ
۱۴۰	نہاہم عن اربع	۱۲۴	اعرابی کی تعیین، توفیق کا معنی
۱۴۰	حفتہ، دہاء، نقیر، مزفت، مقیر کا معنی	۱۲۵	عبادت کے درجات
۱۴۱	ان برتنوں میں فیذ بنانے کی ممانعت کیوں؟	۱۲۶	صرف تین اعمال ذکر کرنے کی حکمت
۱۴۱	اختلافی مسئلہ	۱۲۶	اختلاف روایت کیوں؟
۱۴۱/۱۴۱	حدیث ۳۳ و ۳۴ ترجمہ	۱۲۶	صلہ رحمی کی فضیلت اور عید
۱۴۲	لفظ مرحبا کی تحقیق	۱۲۷	حدیث ص ۳۲ و ۳۳ ترجمہ
۱۴۳	خزایا اور نندامی کی تحقیق	۱۲۷	لم ازد علی ذالک کا مفہوم
۱۴۳	نزار بن معد کا انوکھا انداز تقسیم	۱۲۸	باب بیان ارکان الاسلام و دعائہ العظام
۱۴۴	حدیث ص ۳۵ سر دار قوم کی دو خصلت	۱۲۸	حدیث و ترجمہ
۱۴۴	حدیث، اور اس کی تشریح	۱۲۸	اسلام کا طریقہ تنہیم
۱۴۵	حدیث کی مشکل ترین سند	۱۲۹	ارکان اسلام انقیاد و غابری و باطنی کا مکمل نمونہ
۱۴۵	باب الدعاء الی الشہادتین و شرائع الاسلام	۱۲۹	ارکان اسلام پر حضرت نانوتوی کی نکتہ نبی
۱۴۶	حدیث، ترجمہ	۱۳۰	یوجد اللہ میں رسالت بھی داخل
۱۴۶	ما قبل سے ربط	۱۳۱	لفظ اقامت کی حکمت

۱۶۳	حدیث، اشکال و جواب	۱۳۶	نقل سند میں امام مسلم کا احتیاط
	باب الدلیل علی صحة اسلام من حضره	۱۳۷	حضرت معاذ بن کس سند میں گئے؟
۱۶۵	الموت الخ	۱۳۷	انک تاتی قوما من اهل الکتاب
۱۶۵	حدیث، ترجمہ	۱۳۷	حج اور روزہ کا ذکر کیوں نہیں؟
۱۶۶	ربط اور شرح حدیث	۱۳۸	تین ارکان ذکر کرنے کی حکمت
۱۶۶	لما حضر الخ	۱۳۹	ایمان کے لئے اقرب اور سبب ضروری
۱۶۶	کیفیت نزع کی ایک جھلک	۱۳۹	کیا کفار فروع کے مخاطب ہیں
۱۶۷	ایچھے نام کا اثر	۱۵۱	زکوٰۃ وصول کرنے کا حق کس کو؟
۱۶۷	در خواجہ پر حضرت کی آمد اور تلقین ایمان	۱۵۲	دوسری جگہ زکوٰۃ منتقل کرنا
۱۶۸	عقیدہ شیعہ کہ ابو طالب مسلمان تھے	۱۵۲	کیا غیر مسلموں کو زکوٰۃ، صدقہ فطر دیا جاسکتا ہے
۱۶۹	نزول آیت کے وقت میں اختلاف	۱۵۳	لبس بینہا و بین اللہ حجاب کا مطلب
۱۷۰	ہدایت کے معنی	۱۵۳	باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لا اله الا الله الخ
۱۷۰	ہدایت کی قسمیں	۱۵۳	حدیث، ترجمہ
۱۷۱	حدیث، ترجمہ و شرح	۱۵۳	ربط
۱۷۲	باب الدلیل علی من مات علی التوحید دخل الخ	۱۵۳	تذکرہ تداد کی ایک جھلک
۱۷۲	حدیث، ترجمہ اور ربط	۱۵۵	تذکرہ تداد پر ایک شبہ کا ازالہ
۱۷۲	شرح حدیث	۱۵۶	کسی حکم شرعی کے انکار پر کفر کا حکم
۱۷۲	مرتب کبیر سے متعلق فرق باطلہ کی تردید	۱۵۷	جنگ اقدامی کی اجازت نہیں
۱۷۳	فرق بیہیمہ کا عقیدہ، اور تردید	۱۵۷	ایمان کے لئے دلائل جاننا ضروری نہیں
۱۷۳	کلمہ رسالت کا تذکرہ کیوں نہیں؟	۱۵۷	حضرت عمر کا حضرت ابو بکر سے علمی مکالمہ
۱۷۳	حدیث ص ۳۲ ترجمہ	۱۵۸	حضرت ابو بکر کا جواب
۱۷۵	شرح حدیث	۱۵۹	ما نعیین زکوٰۃ کے استدلال کا جواب
۱۷۵	اضافہ گوشہ پر شہادتین کی فضیلت کا کیا جوڑ	۱۶۰	جنگ بندی کی چند صورتیں
۱۷۶	حدیث، ترجمہ	۱۶۰	حدیث میں صرف دور کن عیاذ کو رہیں؟
۱۷۶	شرح حدیث	۱۶۱	بحق الاسلام کا مطلب
۱۷۷	حدیث ترجمہ	۱۶۱	مسئلہ زندیق
۱۷۸	حضرت عیسیٰ کو عبد اللہ اور ابن امیہ کہنے کی حکمت	۱۶۲	من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ کا مطلب
۱۷۸	کلمہ، روح، ابن امیہ کہنے کی وجہ	۱۶۱	منکر فرائض کا حکم
۱۸۰	اعتراف، جنت میں داخلہ کس دروازے سے	۱۶۳	لو منعونی عقلاً، عقلاً کے معنی پر اشکال

۱۹۸	حیاء شرعی کا معیار	۱۸۰	خلاصہ حدیث
۱۹۸	حیاء پر تین اشکال	۱۸۰	حدیث ص ۳۳ علی مالکان من عمل پر اعتراض و جواب
۱۹۹	حیاء کی صورتیں	۱۸۱	حدیث ترجمہ، تشریح
۱۹۹	حدیث کی جامعیت	۱۸۲	کیا صرف اقرار توحید و دخول جنت کے لئے کافی ہے
۲۰۰	حدیث ص ۷۷ اور شرح حدیث	۱۸۳	حدیث ترجمہ
۲۰۰	جامعیت حدیث	۱۸۳	لا تبشروہم فیتکلو الا حصداً
۲۰۰	حدیث و شرح حدیث	۱۸۴	حدیث ص ۴۴ کا ترجمہ
۲۰۰	حدیث	۱۸۵	تشریح، کیا خدا پر بھی کچھ واجب ہے
۲۰۰	حضرت عمران کے قصہ ہونے کی وجہ	۱۸۶	حدیث ترجمہ ص ۳۵
۲۰۱	باب بیان جامع اوصاف الاسلام	۱۸۷	تشریح الفاظ حدیث
۲۰۱	حدیث ترجمہ	۱۸۸	کیا صرف کلمہ توحید پر دخول جنت
۲۰۱	استقامت کا مفہوم	۱۸۹	حضرت عمرؓ کے ضرب کا مقصد
۲۰۱	حدیث کی جامعیت	۱۹۰	حدیث، شرح حدیث
۲۰۲	باب بیان تفاضل الاسلام واتی امورہ افضل	۱۹۰	ممانعت کے باوجود حضرت معاذؓ نے حدیث کیوں سنائی
۲۰۲	حدیث و ترجمہ	۱۹۲	حدیث، ترجمہ، اس حدیث کی دو خصوصیت
۲۰۲	ربط اور شرح حدیث	۱۹۲	شرح حدیث
۲۰۳	افضل اعمال کون؟		باب الدلیل علی ان من رضی باللہ رباً
۲۰۳	لفظ خیر، افضل، اور احب میں فرق	۱۹۳	وبالاسلام الخ
۲۰۳	تطعم الطعام و تقرأ السلام	۱۹۴	حدیث، ترجمہ، ربط اور مقصد باب
۲۰۵	سلام کے چند اہم مسائل	۱۹۴	ذاق طعم الايمان کا مطلب
۲۰۵	اقتناء سلام کا حکم کس ماحول میں دیا گیا	۱۹۵	حدیث کی اہمیت
۲۰۵	حدیث ص ۳۸ ترجمہ	۱۹۵	بیان شعب الايمان و افضلها و ادناها الخ
۲۰۶	تشریح، باتحہ زبان کی تخصیص کیوں؟	۱۹۵	حدیث، ترجمہ
۲۰۶	کیا صرف مسلمان کو ایذا دینا حرام ہے؟	۱۹۵	لفظ بضع کی تحقیق
	باب بیان خصال من اتصف بہن وجد	۱۹۶	شعبہ ایمان میں اختلاف روایت
۲۰۷	حلاوة الايمان	۱۹۶	اہمیت حدیث
۲۰۷	حدیث، ترجمہ اور خلاصہ حدیث	۱۹۶	رکن اور شعبہ کے درمیان فرق
۲۰۷	ایمانی حلاوت سے کیا مراد	۱۹۷	ایمان کے مرکب ہونے پر استدلال
۲۰۹	کیا اللہ اور رسول کو ایک ضمیر میں جمع کرنا ممنوع	۱۹۷	الحیاء شعبۃ من الايمان

۲۲۳	رہا اور مؤمن کی دوزخ داری	۲۱۰	لا یحبہ الا للہ
۲۲۳	نہی عن المنکر کے درجات	۲۱۱	باب وجوب محبة رسول الله ﷺ اکثر الخ
۲۲۳	وذلك اضعف الايمان کا مطلب	۲۱۱	حدیث، ترجمہ ربط اور اقسام محبت
۲۲۳	کس قسم کے منکرات کا ازالہ واجب	۲۱۲	حدیث کا مطلب
۲۲۴	نہی عن المنکر کی شرعی حیثیت اور ترک پر وعید	۲۱۲	اسباب محبت
۲۲۴	کیا صرف اپنی اصلاح کافی ہے	۲۱۳	کوئی محبت مطلوب
۲۲۵	نہی عن المنکر اور موقعہ کی نزاکت	۲۱۳	کثرت محبت نبوی کا معیار
۲۲۵	من رأى منكم منكرا کا مطلب	۲۱۴	محبت رسول حاصل کرنے کا طریقہ
۲۲۶	نہا عید سے پہلے خطبہ کس نے دیا؟	۲۱۴	صحابہ کرام کی بٹالی محبت
۲۲۷	حدیث، ترجمہ اور حواری کا مصداق	۲۱۶	حدیث ص ۹ اور جامعیت
۲۲۸	جہاد بالقلب کا مفہوم	۲۱۶	اختلاف روایت
۲۲۸	ولیس وراء ذلك کا مطلب	۲۱۶	والدہ کا ذکر کیوں نہیں؟
۲۲۸	باب تفاضل اهل الايمان فيه ورجحان الخ	۲۱۶	لفظ محبت کی نکتہ سنجی
۲۲۸	حدیث، ترجمہ اور ربط	۲۱۷	باب الدلیل علی ان من خصال الايمان الخ
۲۲۸	محبت کا اثر ایمان پر	۲۱۷	حدیث، ترجمہ اور ربط
۲۲۹	ان القسوة وغلظ القلوب	۲۱۸	ما یحب لنفسه کا مطلب
۲۲۹	حيث یطلع قرنا الشيطان	۲۱۹	حقوق پڑوسی پر ایک قصہ
۲۲۹	حدیث کا شان بوردو	۲۱۹	خلاصہ حدیث
۲۳۰	شیطان کے دو سیٹک۔ ایمان کو یحییٰ کہنے کی وجہ	۲۱۹	باب بیان تحریم ایذاء الجار
۲۳۱	فقد و حکمت کی تحقیق۔ فائدہ	۲۱۹	حدیث، ترجمہ، مقصد حدیث، پڑوسی کی حد
۲۳۱	باب بیان انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون الخ	۲۲۰	توجیہ حدیث
۲۳۱	حدیث، ترجمہ اور مقصد حیات	۲۲۰	باب الحدث علی اکرام الضیف ولزوم الصمت
۲۳۲	محبت بڑھانے کا طریقہ	۲۲۰	حدیث، ترجمہ
۲۳۲	اسلام کا امتیازی تہذیب سلام	۲۲۰	کیا صرف اللہ اور یوم آخر پر ایمان کافی ہے؟
۲۳۲	ایک چیتا	۲۲۱	پڑوسی کا اکرام
۲۳۳	باب بیان ان الدین النصیحة	۲۲۱	کیا مہمان نوازی واجب ہے
۲۳۳	حدیث، ترجمہ اور ربط	۲۲۱	فلیقل اور لیصمت
۲۳۳	لفظ نصیحت کی تحقیق	۲۲۲	باب بیان کون النهی عن المنکر من الايمان الخ
۲۳۳	خیر خواہی کی اہمیت	۲۲۲	حدیث ترجمہ

۲۴۹	حدیث، ترجمہ۔ شرح حدیث	۲۳۳	خدا اور رسول کے ساتھ نصیحت کا کیا مطلب
۲۵۰	ایمان و کفر کا معیار	۲۳۵	حدیث، شرح حدیث
۲۵۰	ایک اعتراض	۲۳۶	بیان نقصان الایمان بالمعاصی و نفيه الخ
۲۵۱	باب بیان قول النبی ﷺ لا ترجعوا بعدی کفرا	۲۳۶	حدیث، ترجمہ اور ربط
۲۵۱	حدیث، ترجمہ۔ شرح حدیث۔ توجیہ حدیث	۲۳۷	کیا محصیت کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے
۲۵۲	لفظ یوحیٰ اور ویل کی تحقیق	۲۳۷	مسک معزہ اور خوارج
۲۵۲	باب اطلاق اسم الکفر علی الطعن فی النسب	۲۳۸	توجیہات حدیث
۲۵۲	حدیث، ترجمہ اور شرح حدیث	۲۳۹	ایک اشکال۔ خلاصہ بحث۔ فائدہ عجیب
۲۵۳	باب تسمیة العبد الآبق کافرا	۲۴۰	وکان ابوہریرۃ یلحق معہن
۲۵۳	حدیث، ترجمہ۔ شرح حدیث	۲۴۰	باب خصال المنافق
۲۵۳	لم تقبل صلواتہ قول کے کیا معنی	۲۴۱	حدیث، ترجمہ۔ نفاق کے معنی، وجہ تسمیہ۔
۲۵۴	باب بیان کفر من قال مطرنا بالنوء	۲۴۱	نفاق کی تسمیہ
۲۵۴	حدیث، ترجمہ	۲۴۲	کسی بھی تحریک کیلئے سب سے مضر کون؟
۲۵۵	لفظ نوہ کی تحقیق و مصداق۔ شرح حدیث	۲۴۲	کیا جھوٹ اور وعدہ خلافی کی اجازت ہے
۲۵۵	اسباب کی طرف نسبت موجب کفر کب؟	۲۴۲	نفاق کی علامت تین یا چار؟
۲۵۶	توجیہ حدیث	۲۴۳	علامہ نفاق مؤمن میں ہو تو کیا وہ بھی منافق؟
۲۵۶	سیاروں کی طرف حوادث کی نسبت کسے کش کیا مضائقہ؟	۲۴۴	دور نبوی میں منافقوں کو قتل کیوں نہیں کیا گیا؟
۲۵۶	سیارہ کے ساتھ توہم پرستی کیوں؟	۲۴۵	باب بیان حال من قال لا ٰخیہ المسلم یا کافر
۲۵۶	فائدہ، سیاروں کا طول و عرض	۲۴۵	حدیث، ترجمہ اور مقصد حدیث
	باب الدلیل علی ان حب الانصار و علی	۲۴۶	شرح حدیث
۲۵۷	من الایمان الخ	۲۴۶	ضروریات دین کے منکر کو کافر کہا جائے گا
۲۵۷	حدیث، ترجمہ	۲۴۶	اہل قبلہ کا مفہوم
۲۵۸	شرح حدیث	۲۴۶	کیا تکفیر مسلم کفر ہے
۲۵۸	انصار سے محبت کی وجہ	۲۴۷	کیا تکفیر مسلم موجب تفریہ ہے
۲۵۸	چند اشکال اور جواب	۲۴۸	باب من رغب عن ایہ و هو یعلم
۲۵۹	حدیث، ترجمہ و مطلب	۲۴۸	حدیث، ترجمہ مقصد حدیث
۲۶۰	بیان نقصان الایمان بنقص الطاعات الخ	۲۴۸	زیادہ کے نسب پر اعتراض کیوں؟
۲۶۰	حدیث، ترجمہ اور مقصد باب	۲۴۹	توجیہ حدیث
۱۶۱	کفر کے اقسام	۲۴۹	بیان قول النبی ﷺ سباب المؤمن الخ

۲۷۸	مجرور و سحر میں فرق	۲۶۱	کفر اعتقادی اور عملی میں فرق
۲۷۸	سحر کی شرعی حیثیت	۲۶۲	شرح حدیث
۲۷۸	میدان جنگ سے بھاگنا جرم عظیم	۲۶۲	تکثرون اللعن
۲۷۹	خود اپنے والدین کو گالی دینے کی صورت	۲۶۳	زمانہ حیض و نفاس میں نماز نہ پڑھنے پر ثواب۔ اشکال
۲۷۹	باب تحریم الکبر و بیانہ۔ حدیث	۲۶۳	بظاہر جنت میں عورتیں زیادہ ہوں گی
۲۸۰	ترجمہ۔ مقصد حدیث	۲۶۳	کیا سبکی عورتیں کم عقل ہیں؟
۲۸۰	کبر اور خود پسندی میں فرق	۲۶۵	بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوٰۃ
۲۸۰	عہدہ پڑھنے کی حد	۲۶۵	حدیث، ترجمہ۔ ترک صلوٰۃ پر وعید
۲۸۱	جہیل کا معنی اور مصداق	۲۶۶	اختلاف ائمہ اور تاویل حدیث
۲۸۱	کیا حکمران جنت میں نہیں جائے گا	۲۶۶	ترک صلوٰۃ پر قتل و سزا کی تفصیل
۲۸۲	باب الدلیل علی ان من مات لا یشرب باللہ الخ	۲۶۶	ولیل احاط
۲۸۲	حدیث، ترجمہ	۲۶۷	کیا سجدہ تلاوت واجب ہے
۲۸۳	مقصد حدیث۔ تفصیلی حدیث	۲۶۸	باب بیان کون الایمان باللہ افضل الاعمال
۲۸۳	شرح حدیث	۲۶۸	حدیث، ترجمہ
۲۸۳	اختلاف الفاظ روایت کی وضاحت	۲۶۹	سب سے افضل کون؟
۲۸۵	حدیث، و شرح حدیث	۲۷۰	کونسا غلام آزاد کرنا افضل ہے
۲۸۵	باب تحریم قتل الکافر بعدہ وقولہ لا الہ الخ	۲۷۰	بیان کون الشوک اقبح الذنوب و بیان اعظمتها
۲۸۶	حدیث، ترجمہ۔ مقصد حدیث	۲۷۰	حدیث، ترجمہ
۲۸۶	وجود ایمان کی تین شکلیں	۲۷۱	ذنب کی چار قسمیں
۲۸۷	میدان جنگ میں بھی اسلام کی فیاضی	۲۷۱	گناہ کے لئے چار الفاظ اور ان کے درجات
۲۸۸	شرح حدیث	۲۷۱	شرح حدیث، پڑوسن سے زنا کے برابر
۲۸۹	مسلمانوں کی آپسی جنگ میں شرکت	۲۷۲	باب الکبائر و اکبرها
۲۹۰	باب من حمل علینا السلاح لیس منا	۲۷۲	حدیث، ترجمہ
۲۹۰	حدیث، ترجمہ۔ قبیحہ بالکفار کا معیار	۲۷۳	گناہ کبیرہ اور صغیرہ کے متعلق علمہ کے خیالات
۲۹۱	احترام عن الخبہ کی حکمت	۲۷۴	کبیرہ اور صغیرہ کی تعریف میں اقوال علمہ
۲۹۲	لیس منّا کی تاویل	۲۷۵	علامہ ابن قیم کی تحقیق
۲۹۲	باب تحریم ضرب الخدود و شق الجیوب	۲۷۵	شرح حدیث
۲۹۲	والدعا الخ	۲۷۶	والدین کی نافرمانی کب جائز اور کب ناجائز
۲۹۲	حدیث، ترجمہ	۲۷۷	کیا سحر سے حقیقت بدل سکتی ہے؟

۳۰۳	مقصد حدیث	۲۹۳	مقصد حدیث
۳۰۳	غیر ملوک کی نذر	۲۹۳	الفاظ حدیث کے معنی
۳۰۴	حدیث و شرح حدیث	۲۹۳	لیس منا کی وضاحت
۳۰۵	حدیث و شرح حدیث	۲۹۳	انا بروی کا مفہوم
۳۰۵	مقصد حدیث	۲۹۳	باب بیان غلط تحریم النسیمة
۳۰۶	باب غلط تحریم الغلول وانہ لا یدخل الجنة الخ	۲۹۳	حدیث، ترجمہ
۳۰۶	حدیث، ترجمہ۔ مقصد حدیث	۲۹۳	حل لغات۔ نسیمة کی تعریف
۳۰۷	حل لغات	۲۹۳	پھلخوری کے گناہ سے بچنے کی صورت
۳۰۷	شہداء کے اقسام	۲۹۳	نسیمة اور غیرت میں فرق
۳۰۷	حدیث، ترجمہ	۲۹۳	غیرت کب جائز ہے
۳۰۸	تحقیق الفاظ	۲۹۵	توجیہ حدیث
۳۰۸	فوائد	۲۹۵	باب بیان تحریم اسبال الازار والمن الخ
۳۰۸	باب الدلیل علی ان من قاتل نفسه لا یکفر	۲۹۵	حدیث، ترجمہ
۳۰۹	حدیث، تحقیق الفاظ	۲۹۶	شرح حدیث
۳۰۹	اللهم ولیدیہ فاغفر	۲۹۶	حرم اسبال کی علت اور حد
۳۰۹	باب الریح التي تكون قرب القيامة تقبض	۲۹۶	مردوزن کے لئے اسبال کی دو حالت
۳۰۹	حدیث، ترجمہ	۲۹۷	لا یکلمہم اللہ یوم القيامة الخ کی وضاحت
۳۰۹	علامت قیامت، ہوا کا چلنا کب ہوگا	۲۹۷	عذاب کا معنی
	باب الحدیث علی المبادرة بالاعمال قبل	۲۹۸	حدیث و شرح حدیث
۳۱۱	تظاہر الفتن	۲۹۸	کن چیزوں کا نہ دینا جرم عظیم
۳۱۱	حدیث، ترجمہ	۲۹۹	باب بیان غلط تحریم قتل الانسان نفسه الخ
۳۱۱	مقصد حدیث	۲۹۹	حدیث، ترجمہ۔ مقصد حدیث
۳۱۱	شرح حدیث	۲۹۹	خود کشی اور جہاد میں فرق
۳۱۲	باب مخافة المؤمن ان یحبط عمله	۳۰۰	انسانی جان کی عظمت
۳۱۲	حدیث، ترجمہ	۳۰۰	حل لغات
۳۱۲	مقصد حدیث	۳۰۰	فی نار جہنم خالدا مخلدا فیہا ابدا
۳۱۳	کیا گناہ عظیم اعمال ہیں	۳۰۱	خالدا مخلدا کی توجیہ
۳۱۳	مسکسو مرغیہ کو اس کا رد	۳۰۲	حدیث، ترجمہ اور شرح حدیث
۳۱۳	ایک اعتراض	۳۰۲	کسی کام کے کرنے پر کافر ہونے کی قسم کھائی تو؟



۳۱۴	باب بیان تجاوز الله عن تحدیث النفس	۳۱۴	نزول آیت کا مقدمہ
۳۱۵	والخواطر	۳۱۵	باب هل یواخذ باعمال الجاهلیة
۳۱۵	حدیث، ترجمہ	۳۱۵	حدیث، ترجمہ
۳۱۵	وسوسہ کے اقسام و احکام	۳۱۵	کیا بعد الاسلام زمانہ کفر کے گناہوں پر مواخذہ ہوگا
۳۲۰	عمل قلب پر مواخذہ	۳۱۶	باب کون الاسلام یتهدم ملکین قبلہ وکذا
۳۲۰	شرح حدیث	۳۱۶	الحج والہجرة
۳۲۱	دولوں متضاد آجوں کی توجیہ و تعلیق	۳۱۷	حدیث، ترجمہ
۳۲۲	توحی تسمیں	۳۱۷	رہوی حدیث کا تحارف
۳۲۲	ایک اہم قاعدہ	۳۱۸	مقدمہ حدیث
۳۲۲	حدیث، ترجمہ	۳۱۸	اعمال کی ضرورت کیوں؟
۳۲۲	شرح حدیث	۳۱۸	ہجرت و حج سے کس قسم کے گناہ معاف ہو گئے
۳۲۲	حدیث، ترجمہ	۳۱۸	حدیث، ترجمہ
۳۲۲	ایک نیکی پر دس گئے ثواب کی حکمت	۳۲۰	قاتل کی مغفرت ہوگی یا نہیں
۳۲۵	نیکی پادری کی چار فصل	۳۲۰	حضرت امین عباس کا مسلک اور اس کی حقیقت
۳۲۵	عزم معصیت پر مواخذہ کا معیار	۳۲۱	باب بیان حکم الکافر اذا اسلم بعدہ
۳۲۶	کیا تکلیف مالا یتطاق ممکن ہے	۳۲۱	حدیث، ترجمہ
۳۲۶	ایک اشکال	۳۲۱	مقدمہ حدیث
۳۲۷	باب بیان الوسوسة فی الایمان وما یقولہ	۳۲۱	کافر کی نیکی آخرت میں کار آمد ہوگی؟
۳۲۷	حدیث، ترجمہ	۳۲۳	اسلمت علی ما اسلفت
۳۲۸	مقدمہ حدیث	۳۲۳	حدیث پر ایک اشکال
۳۲۸	ملاوچ و وسوسہ	۳۲۳	باب صدق الایمان و اخلاصہ
۳۲۹	وجود ہاری پر متعلق استدلال	۳۲۳	حدیث، ترجمہ
۳۳۰	باب وعید من اقتطع حق مسلم یمین	۳۲۳	سند کے متعلق ایک اہم بات
۳۳۰	حدیث، ترجمہ	۳۲۳	شرح حدیث
۳۳۱	شرح حدیث	۳۲۳	شرک کی تسمیں
۳۳۱	حرم الله علیہ الجنة کی توجیہ	۳۲۵	صحابہ کرام کا اشکال اور حضور ﷺ کا جواب
۳۳۳	باب الدلیل علی ان من قصد اخذ مال غیرہ	۳۲۵	قلم بمحتی شرک یا معصیت
۳۳۳	حدیث، ترجمہ	۳۲۶	مسلک معتزلہ اور اس کا رد
۳۳۳	شہید کے اقسام	۳۲۷	چند اشکالات

۳۵۸	شرح حدیث	۳۴۴	یا چور کو قتل کرنا جائز ہے
۳۵۸	تقدیر صحابہ میں اختلاف کیوں؟	۳۴۵	باب استحقاق الوالی الفاش لوعیتہ
۳۵۹	پیشنگونی کا صدق	۳۴۵	حدیث، ترجمہ، مقصد
۳۵۹	باب تألف قلب من یخاف علی ایمانہ لضعفہ	۳۴۵	شرح حدیث
۳۵۹	حدیث، ترجمہ	۳۴۶	باب رفع الامانة والایمان من بعض
۳۶۰	شرح حدیث	۳۴۶	القلوب و عرض الفتن
۳۶۱	الفاظ حدیث کی تحقیق	۳۴۶	حدیث، ترجمہ
۳۶۱	مؤلفۃ القلوب کی تفصیل اور بیت المال کی نوعیت	۳۴۷	مقصد حدیث
۳۶۲	باب زیادة طمانیة القلب بتظاهر الادلة	۳۴۷	افانیت سے کیا مراد
۳۶۲	حدیث، ترجمہ، مقصد حدیث	۳۴۸	فی جذر قلوب الرجال
۳۶۳	نحن احق بالشک	۳۴۹	حدیث، ترجمہ
۳۶۳	کیا حضرت ابراہیم کو شک تھا؟	۳۵۰	تذکرہ کی تعریف اور اقسام
۳۶۳	احیاء موتی کا سوال کیوں کیا گیا؟	۳۵۰	زمانہ فتنہ کے احکام
۳۶۳	فائدہ	۳۵۱	شرح حدیث
۳۶۵	یہ سوال حضرت ابراہیم کو کیوں کر ہوا	۳۵۲	باب بیان الاسلام بدأ غریباً وسیعود
۳۶۵	یرحمہ اللہ لو طأ لقد کان یأوی الی رکن شدید	۳۵۲	غریباً
۳۶۶	کیا حضرت لوطؑ نے دوسروں کی لڑکی پیش کی تھی؟	۳۵۲	حدیث، ترجمہ
۳۶۷	ولو لیت فی السجن	۳۵۲	شرح حدیث، اسلام کی ابتدا الی اور آخری حالت
۳۶۹	باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام حاکماً	۳۵۵	فطوین للغریاء
۳۶۹	حدیث، ترجمہ	۳۵۵	قرب قیامت میں اسلام مجاز میں
۳۶۹	مقصد حدیث	۳۵۵	کما تأرز الحیة
۳۶۹	شرح حدیث	۳۵۵	سانپ سے تشبیہ دینے کی وجہ
۳۷۲	نزول عیسیٰ کے وقت امام کون ہوگا	۳۵۶	باب ذهاب الایمان آخر الزمان
۳۷۲	حضرت عیسیٰ کا نزول کیوں	۳۵۶	حدیث، ترجمہ، مقصد حدیث
۳۷۲	نزول حضرت عیسیٰ کا عقلی جائزہ	۳۵۷	ذکر اللہ اللہ
۳۷۳	ایک اہم بحث	۳۵۷	باب جواز الاستسار بالایمان للخائف
۳۷۵	باب وجوب الایمان برسالة محمد الی جمیع الناس	۳۵۷	ایمان چھپانا کب جائز ہے؟
۳۷۵	حدیث، ترجمہ	۳۵۷	حدیث، ترجمہ
۳۷۶	شرح الفاظ	۳۵۷	مقصد حدیث

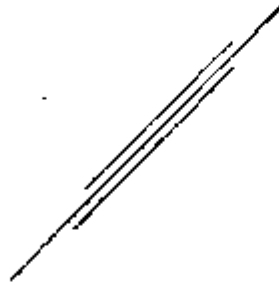
۳۹۸	حضرت موسیٰ کی طرف نسبت کرنے کی وجہ	۳۷۶	شرح حدیث
۳۹۸	حضرت سدرۃ مومن تھے یا نہیں؟	۳۷۷	فضائل قرآن
۴۰۰	حدیث، ترجمہ	۳۷۹	اشکال: اہل کتاب سے کیا سر ادا اور انکو ہر حج کیوں؟
۴۰۰	فطرۃ وحی کی حکمت اور مدت	۳۷۹	علامہ شبیر احمد عثمانی کی رائے
۴۰۱	وثنیاءک فظہر	۳۸۱	شیخ اکبر عمری الدین ابن عربی کی تحقیق
۴۰۱	سب سے پہلے کون سی آیت اتری	۳۸۱	باب بیان الزمن الذي لا يقبل فيه الايمان
۴۰۲	باب الاسراء برسول الله ﷺ	۳۸۲	حدیث، ترجمہ
۴۰۲	حدیث	۳۸۲	مقصد حدیث
۴۰۲	ترجمہ	۳۸۲	سب سے پہلی علامت قیامت کون
۴۰۵	چند اہم باتوں کی مختصر وضاحت	۳۸۲	دلہ الارض کے صفات
۴۰۶	معراج روحانی، یا معراج جسمانی	۳۸۳	حدیث، ترجمہ
۴۰۸	معراج کا ذکر صراحت قرآن میں کیوں نہیں	۳۸۳	کیا سورج کا سجدہ کرنا عقلاً محال ہے
۴۰۸	معراج کا عقلی ثبوت	۳۸۵	باب بدء الوحي
۴۱۰	روح کی چار قسم	۳۸۶	حدیث، ترجمہ
۴۱۱	براق پر سفر کی حکمت اور ائمہ اربعہ فقار	۳۸۷	وحی کے معنی
۴۱۲	اسباب کا اختیار کرنا اختلاف پر کل نہیں	۳۸۷	مبادیات وحی کا مقصد
۴۱۲	معراج پر پادری کی شہادت	۳۸۸	روایہ صالحہ بشرات خداوندی
۴۱۲	دودھ شہد کی پیش کش اور اختلاف روایت	۳۸۹	غار حرا کا انتخاب کیوں؟
۴۱۲	فطرۃ کا معنی اور انتخاب دودھ کی حکمت	۳۸۹	نبوت سے پہلے طریقہ عبادت
۴۱۵	آسمان کا سفر کس پر ہوا	۳۹۰	حضرت جبرائیل سے پہلی ملاقات
۴۱۶	فرشتے کے سوال کی حکمت	۳۹۱	ما انا قاری کا مطلب
۴۱۶	انبیاء کرام کے آمد کی نوعیت	۳۹۲	حتى بلغ من الجهد
۴۱۷	حضرت یوسف اور حضور اکرم ﷺ کے حسن میں فرق	۳۹۲	دیو پٹے کی حکمت
۴۱۸	کیا حضرت اور یس آسمان پر اٹھائے گئے	۳۹۳	اقرأ وربك النور کی تفسیر
۴۱۹	بیت المعمور کس آسمان پر	۳۹۳	حضرت جبرائیل واسطہ ہیں معلم نہیں
۴۲۰	سدرۃ المنتهی کی وجہ تسمیہ، اور سدرہ کے انتخاب کی وجہ	۳۹۳	خوف کس بات کا
۴۲۱	معراج میں فرضیت نماز کی حکمت	۳۹۵	ذرا نشان نبوت کے خلاف نہیں
۴۲۲	حضرت ابراہیم نے تخفیف کا مشورہ کیوں نہیں دیا	۳۹۶	حکمت خوف
۴۲۳	اختلاف روایت کی توجیہ	۳۹۶	فقال خديجة كلا والله ما يخزيك النور کی تفسیر

۴۴۶	حدیث، ترجمہ۔ شرح حدیث	۴۲۳	آخری دفعہ نہ جانے میں حیا کی وجہ
۴۴۷	دجال کو مسخ کہنے کی وجہ	۴۲۴	کیا نزول احکام سے قبل فتح ممکن ہے
۴۴۸	دجال کا طواف کعبہ۔ حدیث، ترجمہ	۴۲۵	لکل صلوٰۃ عشرہ کی تفسیر
۴۴۸	کیا بیت المقدس سامنے لایا گیا تھا	۴۲۵	حدیث، ترجمہ۔ فتح صدر کی حکمت
۴۴۹	کفار کے سامنے ذکر معراج، اور الکابراتو	۴۲۶	زم زم سے غسل کی وجہ، اور قلب میں نگاہ
۴۵۲	حدیث، ترجمہ۔ شرح حدیث	۴۲۶	راوی مسلم کی ایک وضاحت
۴۵۳	حیات انبیاء پر شواہد	۴۲۷	حدیث، ترجمہ
۴۵۳	کیا سورہ بقرہ کی آخری آیت معراج میں دی گئی	۴۲۷	شرح الفاظ حدیث
۴۵۴	حدیث، ترجمہ	۴۲۸	کیا فتح صدر کسی اور نبی کا ہوا
۴۵۵	شرح حدیث	۴۲۸	حدیث، ترجمہ، تشریح
۴۵۷	علم غیب کے حلقہ بحث	۴۳۱	حدیث، ترجمہ
۴۶۳	باب معنی قول اللہ ولقد رآه نزلة اخرى	۴۳۳	چھت میں سورج کرنے کی حکمت
۴۶۳	حدیث، ترجمہ	۴۳۳	طشت میں کیا تھا
۴۶۳	شب معراج میں رویت باری ہوئی یا نہیں؟	۴۳۴	تمام ارواح کا آسمان پر جمع ہونا بظاہر ناممکن
۴۶۳	دلائل	۴۳۴	کیا کفار کی روح آسمان پر جاتی ہے
۴۶۵	شرح الفاظ حدیث	۴۳۴	حضرت ابراہیم سے ملاقات کس آسمان پر
۴۶۶	باب ان اللہ لاینام وفي قوله حجابہ النور	۴۳۶	لا یبذل القول لدیٰ پر اعتراض
۴۶۶	حدیث، ترجمہ۔ مقصد حدیث	۴۳۷	حدیث، ترجمہ
۴۶۶	ان اللہ لاینام	۴۳۸	اسراء کی ابتداء کس مکان سے؟
۴۶۷	یخفف القسط ویرفعہ	۴۳۹	حضرت موسیٰ کے رونے کی مصلحت
۴۶۷	ما ننہی الیہ بصرہ	۴۳۹	آپ کو غلام کہنے کی وجہ
۴۶۸	نقل روایت میں نام مسلم کا احتیاط	۴۴۰	حدیث، ترجمہ
۴۶۸	باب اثبات روية المؤمنین فی الآخرة الخ	۴۴۰	شرح الفاظ
۴۶۸	حدیث، ترجمہ	۴۴۰	حدیث
۴۶۸	مسئلہ رویت باری	۴۴۰	فلا تکن فی مریۃ من لغائہ کی تفسیر
۴۶۹	رویت باری کے مدعی کا حکم	۴۴۰	حیات انبیاء پر اشکال
۴۷۰	رویت پر حضرت نانوتوی کی تحقیق	۴۴۲	حیات انبیاء پر عقلی دلیل
۴۷۱	شرح الفاظ حدیث	۴۴۵	حدیث، ترجمہ
۴۷۳	باب معرفة طریق الرویۃ	۴۴۵	شرح حدیث

۵۱۱	مختلف جملوں کی تشریح	۴۷۴	حدیث، ترجمہ
۵۱۷	کیا ہر نبی کی دعا قبول ہوگی؟	۴۷۶	شرح حدیث
۵۱۸	کیا صرف کلمہ کے ایک جزو پر نجات؟	۴۷۷	من کان یعبد شیئاً فلیتبعہ
۵۱۹	باب دعاء النبی ﷺ وبکافہ شفقت علیہم	۴۷۸	کیا اللہ کی کوئی صورت ہے
۵۱۹	حدیث، ترجمہ، تشریح	۴۸۱	جہنم میں مومن کی پہچان کس طرح
۵۲۰	خدا کو عزیز و محکم کہنے کی حکمت	۴۸۳	حدیث، ترجمہ
۵۴۱	باب بیان ان من مات علی الکفر فهو الخ	۴۸۴	سند کی ایک اصولی بحث
۵۴۱	حدیث، ترجمہ	۴۸۶	حدیث، ترجمہ
۵۴۲	مقدمہ حدیث حضور ﷺ کے والدین جنتی ہیں یا نہیں	۴۸۸	شرح حدیث
۵۴۳	صلو رحمی کو تراویح سے تشبیہ دینے کی حکمت	۴۹۳	باب اثبات الشفاعۃ و اخراج المؤمنین
۵۴۵	سورہ تبت کا سبب نزول	۴۹۳	حدیث، ترجمہ
۵۴۵	کافر کو کنیت کے ساتھ پکارنا	۴۹۳	شفاعت کے معنی اور مسلک و دلائل
۵۴۵	باب شفاعۃ النبی ﷺ لابی طالب الخ	۴۹۴	شفاعت کی اقسام
۵۴۵	حدیث، ترجمہ	۴۹۵	کیا جہنم میں موت آئے گی
۵۴۶	ابو طالب کی شفاعت زبان حال سے یا زبان قائل سے؟	۴۹۶	حدیث، ترجمہ
۵۴۷	کافر کے عذاب میں فرق مراتب	۴۹۷	شرح۔ خدا کی طرف مزاح کی نسبت
۵۴۷	باب البلیل علی ان من مات علی الکفر الخ	۵۰۰	حدیث، ترجمہ۔ شرح حدیث
۵۴۷	حدیث، ترجمہ	۵۰۱	حدیث
۵۴۸	باب موالاة المؤمنین ومقاطعة الخ	۵۰۲	مسلم کی روایت پر اختلاف و تصحیف کا اعتراض
۵۴۸	حدیث، ترجمہ	۵۰۲	شرح حدیث
۵۴۹	باب الدلیل علی دخول طوائف الخ	۵۰۳	حدیث، ترجمہ
۵۴۹	بے حساب کتنے لوگ جنت میں داخل ہو گئے؟	۵۰۵	فیذکر خطیبتہ التي اصاب
۵۳۰	عکاشہ کی خصوصیات	۵۰۵	ام سابقہ اور مسئلہ عصمت
۵۳۲	توکل کی حقیقت	۵۰۶	عصمت کا مفہوم
۵۳۳	توکل کی تفسیر اور محل	۵۰۶	عصمت انبیاء پر حضرت نانوتوی کی تحقیق
۵۳۳	محشر میں امت محمدیہ کی پہچان کب ہوگی؟	۵۰۷	عصمت کے ارکان اربعہ
۵۳۵	علامہ ائمہ تیسیر اور مسئلہ تعویذ	۵۰۸	عصمت پر حضرت بدر عالم کا طریقہ استدلال
۵۳۶	باب کون ہلک بالامۃ نصف اہل البیت	۵۰۹	غفر اللہ ما تقدم وما تاخر کی تفسیر
۵۳۸	یا جرج و ماجرج کے مختصر حالات	۵۱۰	حضرت تھانوی کی تفسیر پر اعتراض
۵۳۹	حضرت عیسیٰؑ اور مہدیؑ کتنے دن رہیں گے؟		

## ”انتساب“

میں اپنی اس تالیف کا انتساب سیدی و مولائی شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ، اور جامع المعقول والمنقول حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی برد اللہ مضجعہ، اور حضرت امیر شریعت سابق سرپرست جامعہ رحمانی و حزل سکریٹری مسلم پرسنل لاء بورڈ مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور اپنے والدین رحمہما اللہ تعالیٰ کی طرف کرتا ہوں۔ کہ یہ حضرات میرے روحانی و جسمانی آباء ہیں، اور انہیں حضرات کی فیض صحبت اور طفیل میں اس خدمت کے لائق ہوا، اللہ تعالیٰ ان حضرات کی قبروں کو رحمت کے پھولوں سے لبریز فرمائے! (آمین)



(حضرت مولانا اکرام علی بھاگلپوری)

## تقریظ ..... حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب

قاضی القضاۃ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم .....

حدیث نبوی اساس دین ہے اور سنن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عظیم الشان ذخیرہ انسانیت کے لئے راہ ہدایت اور ذریعہ نجات ہے، صحابہؓ نے اور ان کے بعد تابعین نے احادیث کی حفاظت کا غیر معمولی اہتمام کیا، احادیث کی جمع و ترتیب و تدوین و جویب اور تنقیح و تہذیب کا عظیم الشان کام اکابر علماء امت کے ذریعہ انجام پایا۔ صحیحہ حمام بن محمد (روایات سیدنا ابو ہریرہؓ کا مجموعہ) عبد اللہ بن عمرو ابن العاصؓ کی لکھی ہوئی حدیثیں جو باجائز نبی تحریر فرمائی تھیں، مکتوبات نبوی، احکام زکوٰۃ سے متعلق تحریر حضرت عمرو بن حزمؓ کو لکھی گئی ہو یا حضرت علیؓ کو، معاہدات نبوی جسے ڈاکٹر حمید اللہ نے ”الوثائق السیاسیہ“ میں جمع کر دیا ہے، پھر حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کا تدوین حدیث کی طرف متوجہ ہونا، حضرت ابن شہاب زہریؓ کے ذریعہ جمع حدیث کا ابتدائی اقدام، پھر مکہ میں ابن جریج، بصرہ میں ربیع بن صبیح، مدینہ میں امام مالک اور دیگر بزرگوں کا کتابی صورت میں احادیث کو مرتب فرمانا، یہ سب وہ کوششیں ہیں جن کے ذریعہ احادیث کا مجموعہ محفوظ رہا، اللہ تعالیٰ نے اپنے چند خاص بندوں کو اس کام کے لئے منتخب فرمایا تھا، چنانچہ ۱۹۳ھ میں اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ کے گھر ایک بچہ وجود میں آتا ہے، جو امام بخاری کے نام سے معروف ہے، جو صرف ۶۲ برس زندہ رہے، پھر تقریباً ان کے ہم عصر دوسری اہم شخصیات امام مسلم بن الحجاج القشیری، اور پھر دیگر ائمہ حدیث پیدا ہوئے، ان دونوں بزرگوں نے حدیث نبوی کی استنادی حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے باعتبار سند اصطلاح حدیث کے اعتبار سے صحیح ترین احادیث کو جمع فرمایا، اس طرح الجامع الصحیح للبخاری اور الجامع الصحیح للمسلم کی شکل میں حدیث کے دو اہم اور عظیم ذخیرے تیار ہوئے، دونوں کی الگ الگ خصوصیات ہیں جو اہل نظر سے مخفی نہیں، اگر امام بخاری نے کسی حدیث کے ہر کلمے سے مسائل و احکام مستنبط فرمائے اور ان کو ترجمۃ الباب میں سمودیا، جن سے امام بخاری کی قوت اجتہاد کا پتہ چلتا ہے، تو دوسری طرف امام مسلم نے ایک واقعہ یا ایک مسئلہ سے متعلق سبھی طرح کی روایات کو اس طرح اکٹھا فرمادیا کہ اس باب کو پڑھ کر باب سے متعلق جملہ تعبیرات پر ہماری نظر حاوی ہو جاتی ہے۔

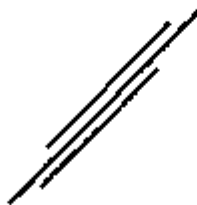
ہماری دسگاہوں میں حدیث کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے، اور کتب حدیث میں صحاح ستہ کو اور صحاح میں بخاری و مسلم کو ایک زمانہ سے کئی بڑے اساتذہ کے نام کے ساتھ خاص شہرت ہے، ہمارے زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ صحیح بخاری اور سنن ترمذی اور حضرت علامہ ابراہیم علیاوی کے ساتھ صحیح مسلم اور حضرت مولانا

اعزاز علیؑ کے ساتھ سنن بی دلاور شاکل ترمذی کا بہت شہرہ تھا۔

حضرت مولانا اکرام علیہ صاحب شیخ الحدیث جامع اسلامیہ ڈابھیل دارالعلوم دیوبند کے وہ گل سرسبد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حدیث نبوی کے ساتھ اشتغال اور تدریس احادیث نبویہ کے اعزاز سے شرف فرمایا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ”ذکر فضل اللہ یوتیہ من یشہ“ میں انہیں پڑھنے کے زمانہ سے جانتا ہوں، وہ علم و صلاح و تقویٰ کے اعتبار سے اپنے فقہ میں ممتاز تھے، اتفاق سے جامعہ رحمانی موگیر میں صحیح مسلم کادرس دیتے ہوئے دیکھا ہے، عرصہ دراز سے ہندوستان کی عظیم الشان مرکزی دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں اور صحیح بخاری و ترمذی کادرس دے رہے ہیں، اس طرح اس وقت ہندوستان کے ان ممتاز اساتذہ کرام حدیث میں ہیں جو ڈھونڈنے سے بہت مشکل سے ملتے ہیں، مولانا نے عرصہ تک مسلم شریف کادرس دیا ہے، سنت اکابر کے طور پر ان کے شاگردوں نے ان کے امالی اور تقریر کو جمع کر دیا ہے جو علوم اسلامی کی تاریخ میں مستقل ایک صنف تعریف ہے۔ مسلم شریف کے ان درس پر خود مولانا نے نظر ثانی فرمائی ہے، اس لئے اس کی سند کی حیثیت پر اعتبار کیا جاسکتا ہے، میں نے اس مجموعہ کو جستہ جستہ لیکن بغور پڑھا ہے، اس علمی کاوش کا محفوظ ہو جانا علم کی، دین کی، اور فتن حدیث کی بڑی خدمت ہے۔

حضرت مولانا اکرام علی صاحب کی درسی تقریریں ہوں یا غیر درسی، حسن ترحیب ان کا طرہ امتیاز ہے، میں اپنے اور ان کے استاذ علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے الفاظ میں کہوں گا کہ دین جو بذریعہ نقل و روایت ہم تک پہنچا ہے اس کی عقلی تعبیر اور اس منقول و معقول کو تزکیہ باطن کے ذریعہ مشاہد کر دینا ہمارے سلف کا امتیاز رہا ہے، مجھے خوشی ہے کہ مولانا موصوف کے درس میں نقل و عقل کی مطابقت کا رجحان پایا جاتا ہے، مجھے اللہ کی ذات سے پوری امید ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول فرمائے گا اور اس سے طلبہ، علمائے اور دیگر اصحاب کو فائدہ پہنچے گا۔

ایں دعاؤں میں دعا جملہ جہاں آمین باد



مجاہد الاسلام قاسمی

سکرٹری جنرل اسلامک فک اکیڈمی



## تقریظ ..... فقیہ النفس حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

محدث کبیر دارالعلوم دیوبند

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد!

دین کی تین بنیادیں ہیں، کتاب اللہ، رسول اللہ اور اجماع امت۔ قرآن مجید کلام اللہ ہے۔ اس کے الفاظ آسمانی اور الہامی ہیں۔ وہ رب العالمین کا اپنے بندوں کے لئے نازل کیا ہوا قانون ہے۔ اس کی پیروی پوری انسانیت پر لازم ہے اور سعید رسول اللہ، کتاب الشک تشریح و تبیین ہے۔ یہیں اس کا مرجع بھی کلام اللہ ہے اور اجماع امت کے لئے مستند الی الاثر ہو یا ضروری ہے اس لئے اس کا مرجع سند رسول اللہ ہے۔ غرض اجماع کا تعلق حدیث سے ہے اور حدیث کا قرآن کریم سے، خواہ وہ تعلق قریب ہو یا بعید۔

قریبی تعلق کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام نے کسی آیت کی تفسیر و بابت کی ہو یا کوئی اشکال پیش کیا ہو اور آپؐ نے اس کی وضاحت فرمائی ہو تو اس حدیث کا براہ راست قرآن کریم سے تفسیری تعلق ہوتا ہے۔

اور تعلق بعید کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بیان فرمودہ احکام کی جو حقیقت اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ کو سمجھائی ہے آپؐ نے وہ امت کو تلقین فرمائی ہے مثلاً سورۃ الاعراف آیت ۵۷ میں پیغمبر ﷺ کی پانچ خصوصیات باذنہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) نیک باتوں کا علم دینا (۲) بری باتوں سے روکنا (۳) پاکیزہ چیزوں کی حلت ظاہر کرنا (۴) گندی چیزوں کی حرمت کا اعلان کرنا (۵) لوگوں پر جو جو بوجہ اور طوق تھے ان کو دور کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو معروف و منکر کی حقیقت سجدائی اسی طرح طہارت و خبائث کے حقائق بھی بتادیے اور اثر و اغلال کی مابیت سے بھی واقف کر دیا۔ اب آپ ﷺ نے اس خدا کی تفہیم کے مطابق وقتاً فوقتاً اور موقع موقع مختلف احکام دیئے جو مقدار میں قرآنی احکام کے بقدر ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔ یہ سب احادیث مذکورہ آیت ہی کی تفسیر ہیں۔

پھر امت نے قرآن مجید میں غور و غرض کیا، کیونکہ یہ امت کی ذمہ داری ہے۔ سورۃ النحل آیت ۴۴ میں ہے ”وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ ظَاهِرًا مِّنْ بَاطِلِهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ“ (اور ہم نے آپؐ پر قرآن کریم اتارا کہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے آپؐ ان کو ان کے سامنے کھول کر بیان کریں اور تاکہ وہ (بھی سوچیں) اس آیت کے آخری حصہ میں امت کو مکلف بنایا گیا ہے کہ وہ قرآن مجید میں غور و فکر کریں۔ امت نے یہ فریضہ انجام دیا تو سیکڑوں علوم قرآنی پیدا ہوئے اور لاکھوں کتابیں لکھی گئیں اور ایک وسیع کتب خانہ وجود میں آیا، جس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا نہیں ہے البتہ قرآن کریم کی سب سے پہلی تفسیر احادیث شریفہ سے تعلق جو علوم مدون ہوئے اور ان میں جو کتابیں لکھی گئیں یقیناً ان کا شمار بھی لاکھوں سے کم نہیں، متون حدیث کے ہزاروں مجموعے صحاح، مسانید، جوامع، ماورسن و غیرہ کی شکلوں میں عہدِ نبویؐ سے اس وقت تک تیار ہو چکے ہیں۔ پھر احادیث کی تشریح، حل لغات، ان سے احکام کے استخراج و استنباط اور حکم و اسرار پر جو کتابیں مختلف زبانوں میں اور مختلف زبانوں میں حصہ شہود پر جلوہ گر ہو چکی ہیں وہ بھی حد شدہ سے باہر ہیں۔ دیگر متعلقہ علوم جیسے راویوں کے سوانح و تراجم اور جرح و تعدیل پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں وہ ستراد ہیں۔

مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ متون حدیث میں اعلیٰ مقام صحاح کا ہے اور صحاح میں سب سے برتر مقام صحیحین کا ہے۔ یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو امت نے بالا جماع قبول کیا ہے اور ان کو سب سے برتر مقام دیا ہے۔ صحیحین میں کون اول نمبر ہے اس میں اختلاف ہے بہت سے حضرات صحیح بخاری کو ترجیح دیتے ہیں تو کچھ حضرات صحیح مسلم کی فوقیت کے قائل ہیں۔ چنانچہ ہر زمانہ میں علمائے کرام نے جہاں بخاری شریف کو اپنی عنایات کا مرکز بنایا ہے، کچھ حضرات نے صحیح مسلم کی بھی خدمت کی ہے۔ اس وقت میرے سامنے اسی سلسلہ کی زریں کڑی حضرت مولانا کلام علی صاحب دامت معالیہم کی مسلم شریف کی کتاب الایمان کی نہایت مفصل لمائی ہیں میں نے ابھی ان سے بالاستیعاب تو استفادہ نہیں کیا مگر جتہ جتہ مقامات سے دیکھا ہے۔ مولانا ایک جید الاستاذ اور عالم اور مجھے ہوئے بدریں ہیں انکے افادات کسی تعریف و توصیف کے محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائیں اور امت کو عام طور پر اور طلبہ حدیث شریف کو خاص طور فیض یاب فرمادیں۔ (آمین)۔

حزبہ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند

۱۹ شعبان ۱۴۳۰ھ

## رائے گرامی حضرت مولانا مفتی عاشق الہی صاحب مفتی احناف مدینہ منور

الحمد لله الذي ارتضى لنا الإسلام ديناً وشرع خير شريعة وأسأها حمى حماها وأيدها بالحجج الساطعة والبراهين القاطعة فشيدها وقواها،

والصلاة والسلام على سيدنا محمد الذي بلغ الأحكام فهي نائرة كالشمس وضحاها والقمر اذا تلاها، قاسى الشدائد في اعلاء كلمة الله تعالى وبلغ المشقة اقصاها. فنال من الله عز وجل ووصل من الدرجات أرفعها واعلاها وعلى آله وصحبه الذين قاموا بدعوته فبلغوها في بضع سنين الى أدنى الارض واقصاها وعلى من حفظ احاديثه وآثاره صلى الله عليه وسلم ووعاها واستندها الى من بعده فادها، فوها لمن صرف ابامه في ذلك وافناها، وجعل ذلك من أمانية منتهاها. صلاة دائمة لا تعد ولا تحدد ولا تنهاى.

اما بعد.....! مولانا اکرام علی صاحب بھاگل پوری "زاد اللہ علمہ وجمہ" عمر حاضر میں ان شخصیتوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علوم حدیث سے مالا مال کیا اور خدمت حدیث کے لئے منتخب فرمایا، آپ جامعہ تعلیم الدین ذابھیل سورت، (گجرات) میں کئی سال سے تدریسی خدمات انجام رہے رہے ہیں اور بحیثیت شیخ الحدیث پوری شان و شوکت کے ساتھ حدیث کا درس دیتے ہیں آپ کے بعض تلامذہ نے درس صحیح مسلم کے جو افادات قلم بند کر لئے تھے مولانا محمد انعام الحق صاحب مدظلہم مفتی و استاد حدیث دارالعلوم عالی پور (گجرات) کو موصول ہوئے تو موصوف نے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لئے قلم اٹھایا اور نہایت مناسب ترتیب کے زیور سے اس کو آراستہ کر دیا جو ناظرین کے پیش نظر ہے۔

مولانا محمد انعام الحق صاحب زید مجدہم نے نہ صرف حضرت مولانا اکرام علی صاحب کی تقاریر مسلم کو قالب جدید میں مرتب کیا بلکہ کہیں کہیں ضروری اضافے کر کے کتاب میں چار چاند لگا دیئے، اللہ تعالیٰ ان کے علوم و اعمال میں مزید برکت عطا فرمائے۔ وکثر الله فينا امثاله.

مولانا موصوف نے احقر کے سامنے حصہ مہادیات اور کتاب الایمان کی ترتیب کا مسودہ پیش کیا لیکن مقدمہ صحیح مسلم پر کچھ کام نہیں کیا احقر نے عرض کا کہ وہ بھی شامل ہونا ضروری ہے تاکہ کتاب ناقص نہ رہے (۱) کتاب الایمان پڑے انہم فوائد اور معارف و نکات پر مشتمل ہے، ماشاء اللہ خوب ہی لکھا ہے۔

اللہ کرے زور قلب اور زور قلم اور زیادہ ہو،

احقر کا ہر کتاب کی کتابوں کے بارے میں رائے دینے کے قابل نہیں لیکن مولانا نے اپنے حسن ظن کی بنا پر مجھے امور فرمادیا احتیاط امر کے بغیر چارہ نہ تھا ہذا یہ سطر لکھ دیں۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

وانا العبد الفقیر

المدينة المنورة

محمد عاشق الہی بلند شہری عفا اللہ عنہ

۱۳۱۹/۱۱/۲۹ھ

## رائے گرامی حضرت مولانا خالد حسین صاحب

استاد حدیث مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله العزيز العليم والصلوة والسلام على النبي الرؤف الرحيم وعلى آله الطيبين الطاهرين واصحابه الغر المحجلين۔

”إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ“

علم شریعت خولہ بشكل وحی جلی ہو یا بشكل وحی خفی یعنی قرآن وحدیث، اسی علم پر ابدی نجات اور خشیت کاملہ کا دار و مدار ہے، اور یہ خشیت الہی انہیں پاک طینت افراد کے ساتھ خاص ہے جو قرآن وحدیث کے علوم کے امین اور اس پر عامل ہیں جیسا کہ اس دعویٰ پر شاہد عدل وہ آئمہ قرآنی ہیں جسے اس مضمون کا عنوان ہے۔

الحمد للہ کہ علما ربانین نے اس حقیقہ کو خوب سمجھا اور اسی علم کو اوڑھنا چھوٹا بتا لیا اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ شرح مسلم بنام ”نفع المسلم“ آپ کے ماننے ہے جو ایک ماہر حدیث، صاحب فن، شرح حدیث میں یدِ طولیٰ کے مالک، مولانا مکرم معظم جناب اکرام علیہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ کا فیض اتم اور سخی پیچم ہے، جو ربع صدی سے بخاری ومسلم کے تادور درختوں کے شاخوں پر بلبل بن کر نغمہ سرا ہیں، اللہ کرے یہ نغمہ سرائی ان کا طفرائے امتیاز بہار ہے۔

مجھ کم علم بلکہ بے علم سے یہ کہا گیا ہے کہ اس عظیم خدمت کے سلسلہ میں کچھ کہوں، کچھ لکھوں، الامر فوق الأدب کے تحت انکار تو نہ کر سکا مگر کیا کہوں اور کیا لکھوں یہ میرے لئے معصوم بن گیا ایک توبہ علمی کی بنا پر خزانہ علم اور اس کے جواہر کی شناخت مشکل، دوسرے موسم حج کی بنا پر موقع نکالنا اور موقع اور محل کے مناسب کچھ لکھتا ممکن مگر

اوچنیں خواہد خدا خواہد چنیں  
ی دہ یزداں مرا دہ چنیں

بھلا مولانا مکرم کی مراد کیسے بر نہ آئے کچھ لکھنے بیٹھ ہی گیا، اور مولانا کے درس کا مسودہ جہاں جہاں سے دیکھا کیفیت یہ رہی ۔ دامن دل می کشد کہ جالیں جااست،

ایمان کی بحث کو دیکھا تو خود بندہ کا ایمان تازہ ہو گیا جیسے ۔ حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را، اسی طرح باب بدو الوحی اور بحث معراج واسراہ جو منزل الاقدام میں سے ہے مگر ان بحثوں کو دیکھ کر بے ساختہ یہ شعر سعدی زبان پر آیا ۔

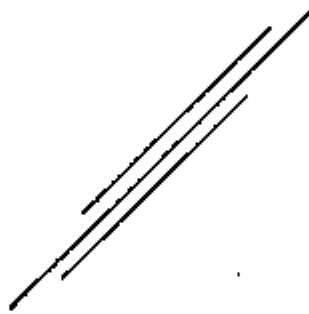
برکئے جام شریعت برکئے سندان عشق  
ہر ہوسنا کے نداند جام وسندان باختم

الحمد للہ تمام بحثیں اسی معیار کے مطابق ہیں، البتہ بحث قضا و قدر کی مزید تفصیل ہوتی تو حضرت مولانا قاسم نانوتوی،

حضرت انور شاہ کشمیری اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے جواہر پارے بھی آجاتے اور سیر حاصل بحث ہو جاتی۔  
 بندہ نے مولانا کے محترم کا نام تو سنا تھا مگر یہ درس دیکھ کر کام کو نام سے بہت بلند اور بام عروج پر پایا، اور ظاہر ہے کہ  
 جس طرح احادیث کی تمام کتابیں مصنفین سے بذریعہ راوی ہم تک پہنچیں ہیں پھر کہیں طباعت کے زیور سے آراستہ  
 ہوئیں بالکل اسی طرح یہ تقریر درس بھی حضرت علامہ مدظلہ سے خصوصی ربط رکھنے والے مولانا مفتی انعام الحق صاحب  
 مدظلہ کی روایت سے ہم تک پہنچی ہے اور وہی اس کے مرتب ہیں بلکہ حضرت علامہ مدظلہ کی اجازت سے کہیں کہیں ترمیم  
 و اضافہ بھی کیا ہے جو حضرت علامہ مدظلہ کی نگرانی میں ہوا۔

لہذا لائق صد مبارکباد ہیں انعام الحق کہ ان کو یہ حق کا بے بہا انعام حصہ میں آیا۔ اللہ ان دونوں کو خوب خوب اکرام  
 و انعام سے نوازے اور حضرت علامہ مدظلہ کی محنت قبول فرمائے اور اہل علم کے طبقہ میں مقبول بنائے۔

یوحم اللہ عبداً قال آمیناً، فقط۔



خالد حسین عفا اللہ عنہ

سابق خادم التدریس دارالعلوم دیوبند

فی الحال خادم التدریس مدرسہ مولویہ مکہ مکرمہ سعودیہ عربیہ

۱۳۱۹/۱۲/۲۳ھ

## بسم اللہ الرحمن الرحیم

## عرض حال

مادر علمی از ہر الہند اُم المدارس دار العلوم دیوبند سے ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں دورہ حدیث، دورہ تفسیر اور شعبہ افتاء سے فراغت کے بعد تدریسی خدمات جامعہ اشرفیہ تھانہ بھون، سیوہارہ ضلع بجنور، جامعہ حسینہ ہرنتھ تھانہ شاہ کنڈ ضلع بھاگپور میں انجام دیتا رہا مگر چہ ان مدارس میں تدریس کی مدت بہت کم رہی مگر مختلف فنون کی اہم کتابوں کی تدریس کا موقع ملا۔ ۱۳۸۲ھ شوال ۱۳۸۲ھ میں جامعہ حسینہ ہرنتھ سے مستعفی ہو کر تین دن کے بعد سرپرست جامعہ رحمانی خانقاہ موگیئر حضرت امیر شریعت سید شاہ منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہ کی دعوت پر تدریسی خدمت کے لئے جامعہ رحمانی سے وابستہ ہو گیا، جامعہ تعلیمی اور تربیتی لحاظ سے عروج پر تھا بہار کے مدارس میں جامعہ رحمانی ایک ممتاز دینی ادارہ ہے اور ملک کے گئے چنے مرکزی اداروں میں جامعہ کا شمار ہے۔ خانقاہ رحمانی صوبہ بہار میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ سیدی و مولائی شیخ العرب والعمم شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کو خانقاہ رحمانی سے درینہ تعلق تھا بہار کا جب دورہ ہوتا تو عموماً خانقاہ موگیئر تشریف لاتے ایک بار حضرت شیخ الاسلام فرماتے تھے کہ خانقاہ میں اب بھی روحانیت معلوم ہوتی ہے اس پر حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی نے عرض کیا کہ حضرت دعا فرمادیں کہ جامعہ رحمانی تعلیمی اعتبار سے مرکزی ادارہ بن جائے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور بڑے الحاح و زاری کے ساتھ جامعہ کے لئے دعا فرمائی اللہ نے حضرت کی دعا قبول فرمائی اور بہت جلد حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی دعا اور حضرت امیر شریعت کے حسن تدبیر سے بے مثال ادارہ ثابت ہوا۔

میرے جانے کے دو سال بعد جامعہ رحمانی میں دورہ حدیث شریف کا آغاز ہوا۔ افتتاح کے نام پر ایک شاندار اجلاس ہوا خصوصی نشست میں ملک کے نامور علماء سے صحاح ستہ کی بسم اللہ کرائی گئی اور عمومی نشست میں حضرات علماء مدعوین نے علم حدیث کی اہمیت اور محدثین کے کارناموں پر بصیرت افروز تقریریں کیں دونوں اجلاس بہت ہی کامیاب رہے۔

دورہ حدیث کے پہلے سال میرے متعلق ابودود شریف تھی اور کئی سال تک ابودود پڑھانے کا موقع ملا چند سال کے بعد ابودود کے ساتھ مسلم شریف مجھ کو پڑھانے کے لئے دی گئی اس کا بھی کئی سال تک سلسلہ رہا ہر سال کچھ طلبہ درسی تقریر نوٹ کرتے تھے میرے جامعہ رحمانی کے آخری سال میں شریک درس عزیز مولوی وصی احمد رحمانی سہر سادی مسلم شریف کی تقریر باندی سے نوٹ کر رہے تھے ایک روز عزیز موصوف نے یہ خواہش ظاہر کی کہ روزانہ مسلم شریف کی نوٹ شدہ تقریر پر نظر ثانی کر کے اصلاح و ترمیم کر دیا کریں میں نے اس کی اس خواہش کے مطابق اصلاح و ترمیم کا سلسلہ شروع کر دیا اس طرح اخیر سال میں ایک اچھا خاصا مجموعہ تیار ہو گیا پھر سال کے اختتام پر عزیز موصوف کی یہ خواہش ہوئی کہ اس مجموعہ کو شائع کر دیا جائے عزیز موصوف کی اس خواہش سے اتفاق کرتے

ہوئے اس مجموعہ پر از سر نو کام شروع کر دیا اور جا بجا معتبر کتابوں سے مفید نو رفتی اقتباسات شامل کرنا ہر اس طرح یہ مجموعہ قیمتی اقتباسات کا مجموعہ بن گیا اور زمانہ دراز تک میرے پاس پڑا ہر اس کی اشاعت پر کثیر رقم کی ضرورت تھی جو میری استطاعت سے باہر تھا۔ نہ معلوم جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے بعض طلبہ کو اس مجموعہ کی کیسے اطلاع ہو گئی ان میں بعض طلبہ نے اس کی اشاعت پر زور دیا میں خاموش رہا شدہ شدہ یہ بات پچھلتی گئی، ایک روز عزیز مکرم مولانا انعام الحق صاحب قاسمی استاذ حدیث دہرا العلوم عالی پور گجرات میرے پاس آئے اور انہوں نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ میں مسلم شریف کی شرح لکھنا چاہتا ہوں مگر بعض معتبر ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ کتاب الایمان کی شرح لکھ چکے ہیں اگر یہ بات صحیح ہے تو آپ اس کو شائع کر دیں میں نے عرض کیا کہ اشاعت سے قبل میری خواہش ہے کہ کسی معتبر عالم سے نظر ثانی کر لوں (اسی مقصد کی خاطر میں نے محدث العصر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہ سے نظر ثانی کی درخواست کی تھی حضرت نے پھر نہ سالی کے باوجود بطیب خاطر منظور فرمایا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دو جز ملاحظہ فرمائے اور بعض جگہ اصلاح بھی فرمائی اس کے بعد میں نے باقی اجزاء بھیجے مگر حالات کی وجہ سے نہ دیکھ سکے اور حضرت کا انتقال ہو گیا) اگر آپ ان باقی ماندہ اجزاء پر نظر ثانی کی ذمہ داری لیں تو میں ان کو آپ کے حوالہ کر دوں عزیز موصوف نے اس کو منظور کیا اور میں نے پورا مجموعہ ان کے حوالہ کر دیا موصوف نے از سر نو ان کو دیکھا اور ان پر بڑی محنت کی جا بجا حوالیات لکھے اور عنوانات لگائے اور جہاں جہاں ترمیم کی ضرورت تھی مناسب ترمیمات کئے اور اس کی تحفہ میں اپنے رفیق مولانا مظہر عالم قاسمی شیوہری استاذ حدیث دہرا العلوم عالی پور سے مدد لی عزیز موصوف نے دلچسپی اور لگن کے ساتھ اس کام کو انجام دیا مزید برآں مولانا انعام الحق صاحب نے پورے موصفات کو بغرض تقریظ مختلف علما کے پاس بھیج کر ان کے تقریظات حاصل کئے جو شامل کتاب ہیں اور پھر عزیز موصوف نے دار الکتاب دیوبند کے ذمہ دار سے گفتگو کر کے ان کو کتابت و طباعت پر آمادہ کیا اتنے مراحل کے بعد یہ کتاب منظر عام پر آ گئی۔ اس کے باوجود میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہوں کہ یہ مجموعہ غلطیوں سے پاک ہے قرآن کریم کے سوا کسی بھی کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں کسی طرح کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ حضرات علما سے بڑی مخلصانہ درخواست ہے کہ اگر کہیں ان کو اس مجموعہ میں غلطی نظر آئے تو ازراہ خیر خواہی مجھ کو مطلع فرمائیں ان شاء اللہ اس کی اصلاح میں مجھے کسی قسم کا پس و پیش نہ ہوگا۔

خداوند قدوس علم حدیث کی اس معمولی سی خدمت کو میرے لئے سعادت دارین کا ذریعہ بنا دے اور تمام معاونین کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین!

اس مجموعہ کا نام "نفع المسلم" ہے اللہ تعالیٰ اس کو اسم باسملیٰ بنادے۔ آمین ثم آمین!! وما توفیقی الا باللہ

محمد اکرام علی غفرلہ چپاگری بھانگلپوری

خادم جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات

۲۸ شوال المکرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۳ فروری ۲۰۰۰ء

## عرض مرتب

مسلم شریف میں کتاب الایمان جن اہم ابواب اور مضامین کی وسعت پر مشتمل ہے وہ اہل علم سے غنی نہیں اسی بناء پر ہمارے اکابر ایمان کے ابواب پر تحقیق کے ساتھ سیر حاصل بحث کرتے رہے ہیں جس کو آپ یہاں بھی محسوس کریں گے۔  
 بندہ کو جب مسلم شریف پڑھانے کی سعادت ملی تو اس کے شروع و متعلقات کی تلاش کے دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا اکرام علی صاحب کی درسی کاپی کا علم ہوا اور پھر حضرت کی عنایت سے وہ کاپیاں مل گئیں جن کے مضامین ہر پہلو سے وسعت پر مشتمل تھے، حضرت کے حکم سے کتابی شکل میں مرتب کر کے اہل علم کی خدمت میں پیش ہے،  
 — ترتیب میں ان امور کو ملحوظ رکھا گیا ہے،

(۱) ہر باب کے تحت صرف پہلی حدیث نقل کی گئی ہے سرور ولایت سے احتراز کیا گیا ہے البتہ جس حدیث کے الفاظ تحقیق طلب تھے یا جس میں کوئی اہم مضمون اور نئی بات تھی اُسے بھی نقل کیا گیا ہے۔

(۲) حدیث کے بعد تخریج احادیث (۳) ترجمہ حدیث (۴) مقصد باب (۵) عنوانات (۶) جہاں مضامین طویل تھے اس کا اختصار (۷) حسب موقعہ ترمیم و اضافہ (۸) اکثر و بیشتر حوالجات (۹) مقدمہ مسلم کی شرح اس لئے شامل کتاب نہیں کہ اسکی کئی کامیاب اردو شرح موجود ہے۔

بہت ممکن ہے دوران مطالعہ جملہ کی رکاکت، بے ترتیبی یا اور کوئی نقص و غم نظر آئے اس کے لئے بندہ نصیحت و خیر خواہی اور خود درگزر کا طالب ہے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس قلمی کاوش میں اپنے معاون مولانا مظہر عالم قاسمی مدرس دارالعلوم عالی پور کا ذکر نہ کروں جنہوں نے حمیت میں ہر ممکن تعاون پیش کیا، اور برادر خورد مولانا رضوان الحق قاسمی جنہوں نے دورہ حدیث کے مشغول ترین سال میں صحیح کتابت کا کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ ﴿جزاہما اللہ خیر﴾

خداوند قدوس اس کاوش کو قبول فرمائے، اور میرے شفیق اساتذہ کرام والدین اور بندہ کے حق میں ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین یا رب العالمین!



### محمد انعام الحق قاسمی

حسن پور برہروا، سیٹھانڑی بہار

مدرس دارالعلوم عالی پور بگھرات

۲ ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ

## مبادیات

کسی بھی فن کو شروع کرنے سے پہلے اسلاف کا دستور رہا ہے کہ مقدمہ، اور مبادیات کے عنوان سے چند باتیں بیان کرتے ہیں، اس موقع پر بعض حضرات صرف تین امور یعنی تعریف، موضوع، غرض و غایت ذکر کرتے ہیں، اور بعض آٹھ (امور، جن کو دوس ٹمائے کہا جاتا ہے جبکہ بعض حضرات امور عشرہ بیان کرتے ہیں ان کو اشعار میں اس طرح کہا گیا ہے

اعلم ان مبادی کل فن عشرة الحد والموضوع ثم الثمرة  
الاسم والاستعداد وحکم الشارع وفضله ونسبته والواضع  
ومسائل والبعض بالبعض ومن درى الجميع حاز الشرفا

تعریف :- ”ما یبیین به حقیقة الشئ“ کو تعریف کہتے ہیں یعنی جس شئی کے ذریعہ کسی چیز کی حقیقت بیان کی جائے، تعریف کا جاننا اس لئے ضروری ہے تاکہ اس فن کا اجمالی تعارف ہو جائے ورنہ تو مجہول مطلق کا حاصل کرنا لازم آئے گا، جبکہ اہل فن کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امر مجہول کا حصول امر محال ہے، سید شریف جرجانیؒ کے الفاظ میں تعریف کی حیثیت لولاء لا متنع کی ہے، یعنی اگر حد معلوم نہ ہو تو اس فن کا حصول ممکن ہو گا، تاہم اس کی تعریف میں علی بصیرۃ کی تید ملحوظ رکھنا ہوگی۔

موضوع :- ”ما یبحث فیہ عن عوارضہ الذاتیۃ“ کو موضوع کہتے ہیں، یعنی کسی فن کا موضوع وہ شئی کہلاتی ہے جس شئی کے عوارض ذاتیہ سے بحث کی جائے اس کا جاننا اس بنا پر ضروری ہے تاکہ اس فن کے مسائل کو دوسرے فن کے مسائل سے ممتاز کیا جاسکے۔ عقولین نے لکھا ہے ”انفا تعامین العلوم بتماثل الموضوعات“ یعنی فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث سے موضوع کے ہی فرق سے الگ الگ فن شمار کئے جاتے ہیں مثلاً اصول فقہ کا موضوع، اولہ فقہ، تصنیف ہے، اور فقہ کا موضوع افعال مکلفین ہے تو موضوع کا ایک مقصد دیگر علوم سے امتیاز کرنا، دوسرا مقصد یہ ہے کہ فن کی عظمت و شرافت، موضوع سے ہی واضح ہوتی ہے جس فن کا موضوع جتنا بلند و بالا ہو گا وہ فن اتنا ہی اونچا ہو گا۔

غرض و غایت :- ”ما یصدر الفعل عن الفاعل لاجلہ“ کو غرض کہتے ہیں، یعنی غرض وہ ارادہ ہے جس کی وجہ سے فاعل کا فعل صادر ہوتا ہے، اور غایت وہ نتیجہ ہے جو اس پر مرتب ہوتا ہے اس کا جاننا اس لئے ضروری ہے تاکہ عبث اور بیکار شئی کا حاصل کرنا نہ لازم آئے، یعنی اس سے ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ جس فن میں ہم مشغول ہیں اس پر کیا نتیجہ اور ثمرات مرتب ہوں گے جب ثمرات معلوم ہوں گے تو اس فن سے دلچسپی میں اضافہ ہو گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ تعریف و حد کا جاننا ”لواء لا متنع علی بصیرۃ“ کے درجہ میں ہے۔

موضوع کے جاننے سے دیگر علوم میں امتیاز، اور اس کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے۔

اور غرض و غایت سے طالب علم کو دلچسپی اور رغبت پیدا ہوتی ہے۔



## حدیث کے لغوی اور اصطلاحی معنی

حدیث کے لغوی معنی "بات" اور "خبر" کے ہیں، امام جوہری نے ان الفاظ میں معنی ذکر کیا ہے کہ الحدیث: "الكلام قليله وكثيره وجمعه احادیث" یعنی لغت کی رو سے ہر قسم کی گفتگو کو حدیث کہہ سکتے ہیں

**اصطلاحی تعریف** "اصطلاحی تعریف سے پہلے یہ جان لینا نہایت ضروری ہے کہ ایک ہے فن حدیث، اور ایک ہے حدیث، یعنی نفس حدیث جس طرح ایک ہے علم بلاغت اور فن بلاغت، اور ایک ہے نفس بلاغت، جو فصاحت کا مقابل ہے اسی طرح یہاں بھی دو چیزیں ہیں ایک ہے حدیث اور ایک ہے فن حدیث، دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔ پھر فن حدیث کی دو قسم ہے علم الحدیث روایت (۲) علم الحدیث درایت یعنی ایک قسم کا تعلق روایت سے، اور ایک کا درلحدیث سے، صحاح ستہ کی تدریس میں علم روایت حدیث ہی پیش نظر ہوتی ہے اس لئے اصلاً وہی تعریف مقصود ہو ا کرتی ہے تاہم پہلے نفس حدیث کی تعریف سمجھ لیجئے۔" م

**نفس حدیث کی تعریف** حدیث کی تعریف محدثین اور اصولیین دونوں نے کی ہے لیکن دونوں کی تعریف میں فرق ہے چنانچہ اصولیین تعریف کرتے ہیں "اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہ" اس کے تحت تقریر نبوی، اور احوال اختیار یہ شامل ہیں لیکن اس تعریف کے مطابق وہ روایات حدیث کے زمرہ سے خارج نظر آتی ہیں جن میں آپ کے احوال غیر اختیاریہ منقول ہیں مثلاً آپ کی شکل و صورت، جسمانی ساخت، اور موت و حیات سے متعلق روایات۔

اس کے برخلاف محدثین نے ایسی تعریف کی ہے جس میں احوال غیر اختیاریہ بھی شامل ہو جاتے ہیں حافظ سخاوی نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے "ما ضیف الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قولاً له او فعلاً له او تقریراً او صفۃ حتی الحركات، والسکنات فی البیظۃ والمنام۔ (۵) فتح المغیث ص ۶

اصولیین اور محدثین کی تعریف میں قدرے فرق کا ہونا اور احوال غیر اختیاریہ کا خارج ہو جانا باعث اشکال نہیں کیونکہ اصولیین کا اصل مقصد مسائل کا استنباط ہے ظاہر ہے ان کے زعم کے مطابق حدیث تو وہ ہو جن سے مسائل مستنبط ہوں لیکن اس کے برخلاف محدثین کا مقصود ہر ان روایات کو جمع کرنا ہے جن کی نسبت آپ کی ذات گرامی کی طرف کسی بھی طرح ہو، اس لئے ایسی تعریف کرتے ہیں جس میں ہر قسم کی روایات جمع ہو جائیں

**تقریر کا مفہوم** کسی قبیح سنت کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی بات کہنا، یا کوئی کام کرنا یا آپ کے عائبانہ میں کوئی بات کہی جائے یا کوئی کام کیا جائے، اور آپ کو اطلاع بھی ہو جائے پھر اس پر

آپ سکوت فرمائیں اور بعد میں اس پر نکیر بھی نہ کریں تو اس کو تقریر نبوی کہتے ہیں۔ نبی کی یہی شان ہوتی ہے کہ ان کا کسی بھی قول و فعل پر نکیر نہ کرنا اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے، دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑی آرزو اور تمنا کے بعد

تحصیل علم کیلئے حضرت خضر کے پاس پہنچے، حضرت خضر کے صلاح و تقویٰ اور خدا پرستی کا علم بھی خدا نے انکو پہلے کر دیا، نیز یہ کہ میں نے ان کو خاص علم عطا کیا ہے، اس کے باوجود جب حضرت خضر نے کشتی کے تختہ کو اکھاڑ پھینکا، یا جب نابالغ بچہ کو قتل کر دیا اسی طرح جب گرتی ہوئی دیوہ کو بلا معاوضہ درست کر دیا تو حضرت موسیٰ نے ٹوک دیا، کیونکہ ظاہر شریعت کے خلاف کوئی نئی خاموش نہیں رہ سکتا اس لئے ماننا ہو گا کہ قبیح سنت کے کام پر نئی کائنات کرنا اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔

حالات دو طرح کے ہیں اختیاری، غیر اختیاری۔ احوال اختیاری سے مراد وہ روایات ہیں جن کا تعلق آپ صفة: کے انداز قرار و گفتار اور اخلاق و معاشرت سے ہو، اور غیر اختیاری سے مراد وہ روایات جن میں آپ ﷺ کے حلیہ مبارک، قدم و قامت، چہرہ انور کی ساخت، بیان تابانی، اور رنگ و روپ کے حسن و جمال کا تذکرہ ہو بالفاظ دیگر آپ کے احوال خلقیہ اور خلقیہ سے متعلق روایات بھی شامل حدیث ہیں۔

## علم حدیث کی تعریف

”محدثین نے علم حدیث کی مختلف تعریف کی ہیں ان تعریف کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بظاہر ان کے درمیان تضاد معلوم ہوتا ہے، لیکن اس مختلف تعریف کی حقیقت یہ ہے کہ علم حدیث ایک کلی کی حیثیت رکھتی ہے جو بہت سے علوم پر مشتمل ہے چنانچہ ابن السلقن کا کہنا ہے کہ علم حدیث دو سو سے زائد علوم کو شامل ہے امام حاکم صاحب مستدرک کا خیال ہے کہ علم حدیث پچاس علوم کو شامل ہے جبکہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ علامہ حازمی نے الحجابہ نامی کتاب میں اس کی تعداد سو بتائی ہے، اور علامہ نووی اور ابن صلاح نے ۶۵ ذکر کئے ہیں اسکے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ یہ آخری تعداد نہیں بلکہ اس سے زائد ہے۔“ (۱)

انہی اقسام کو سامنے رکھ کر بعض نے ان میں سے کسی خاص قسم کی تعریف کی تو بعض نے کسی اور قسم کی، اس طرح تعریف مختلف ہو گئی

(۱) علامہ عزالدین ابن جماع نے علم حدیث کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ”علم الحدیث علم بقوانین يعرف بها احوال السند والمتن“ علم حدیث ایسے ضابطہ کے جاننے کا نام ہے جس کے ذریعہ سند و متن کے احوال، حسن و صحت کے اعتبار سے معلوم ہوں۔ (۲)

(۲) علامہ جلال الدین سیوطی نے علم حدیث کی تعریف اشعار میں اس طرح کی ہے

علم الحدیث ذو قوانین تحدیدی بها احوال متن وسند

فذلك الموضوع والمقصود ان يعرف الاستبوال والمردود (۳)

یعنی علم حدیث، ان چند قوانین کے مجموعہ کا نام ہے جن کے ذریعہ متن و سند کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں لیکن

مذکورہ بالا تعریف ھدیۃ علم حدیث کی تعریف نہیں بلکہ اصول حدیث کی تعریف ہے اسی لئے علم حدیث کی عمدہ تعریف وہ ہے جو علامہ یعنی اور علامہ کرمائی نے شرح بخاری میں کی ہے :

(۳) وَهُوَ عِلْمٌ يَعْرِفُ بِهِ اقْوَالَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَفْعَالَهُ وَاحْوَالَهُ. (۱)

(۴) محمد بن عبد الرحمن حافظ سخاوی نے یہ تعریف کی ہے : معرفة ما اضيف الى النبي صلى الله عليه

وسلم قولاً له او فعلاً او تقريراً او صفه. (۲)

لیکن ان دونوں تعریف پر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ تعریف کے مطابق احادیث موقوفہ اور مقطوعہ شامل نہیں ہوتیں حالانکہ علم حدیث میں ان سے بھی بحث کی جاتی ہے اسی لئے علامہ سیوطی نے اس تعریف پر تبصرہ کیا ہے  
هذا غیر محذور

اس لئے سب سے بے غبار تعریف وہ معلوم ہوتی ہے جو فتح الباقی شرح المفید العرانی میں مذکور ہے :

معرفة ما اضيف الى النبي صلى الله عليه وسلم، قيل او الى صحابي او الى من دونه قولاً او

فعلاً او تقريراً. (۳)

یہ تعریف سب سے جامع اور بہتر ہے اس میں "من دونہ" کی تفسیر "من يقتدى بهم" مراد ہے نہ کہ عام انسان، لہذا اس سے غیر مقتدا بادشاہ وغیرہ کے اقوال خارج ہو گئے، اور اقوال علماء شامل ہو گئے، لیکن اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ کتب احادیث میں اقوال علماء بھی مذکور ہیں۔

## علم حدیث کی قسمیں

یہ بات بھی گزری کہ علم حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں تاہم اصولی طور پر اس کی دو قسمیں کی جاتی ہیں علامہ سیوطی نے نقل کیا ہے کہ علم حدیث کی دو قسم یہ ہے علم روایت الحدیث (۴) علم درایت الحدیث۔

علم الحدیث روایت کی تعریف : (۱) هو علم بنقل اقوال رسول النبي صلى الله عليه وسلم

وافعاله بالسماع المتصل وضبطها وتحديثها. (۴)

(۲) دوسری تعریف: علم يشتمل على اقوال النبي صلى الله عليه وسلم وافعاله وروايتها

وضبطها وتحديثها. (۵)

دونوں تعریف کا مطلب یہ ہے کہ علم حدیث درایت وہ علم و فن ہے جس میں یہ معلوم ہو کہ کون سی حدیث متصل ہے اور کون سی ضعیف، اور جس میں راویوں کے ضبط و عدالت اور رجال پر جرح و تعدیل کے لحاظ سے بحث کی جائے نیز اسلامی حیثیت بھی ملحوظ ہو کہ کون متصل، اور کون منقطع۔

علم حدیث درایہ کی تعریف : انہ علم باحث عن المعنی المفہوم من الفاظ الحدیث وعن المواد منها مبنیاً علی قواعد العربیة وضوابط الشریعة، مطابقاً لحوال النبی ﷺ. (۱)  
(۲) هو علم يتعرف منه انواع الرواية واحكامها وشروط الرواة واصناف المرويات واستخراج معانيها. (۲)

یعنی وہ عربی قواعد، اور شرعی قوانین کا علم جسکے ذریعہ الفاظ حدیث کے مرادی معنی سے بحث کی جائے، اور وہ معنی آپ کے حالات کے مطابق بھی ہوں، اس علم کو علم حدیث درایہ کہتے ہیں، اس میں حالات کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ حالات کے بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں فرعون نے انا ربکم الاعلیٰ کہا تو کافر ہوا کیونکہ حالات زندگی بتاتے تھے کہ وہ مکر خدا ہے اور اسی کے ہم معنی جب منصور جلالت نے انا الحق کہا جب بھی وہ مسلمان رہے کیونکہ حالات بتاتے تھے کہ خدا پرست تھے۔  
(۳) منافذ ابن حجر نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے : معرفة القواعد المعرفة بحال الراوی والمروی .  
یعنی فن درایت حدیث، ان قواعد و اصول کے جاننے کا نام ہے جن کے ذریعہ راوی، اور روایت کے حالات پہچانے جاتے ہوں۔

”درایت حدیث کے دوسرے کئی نام اور بتائے جاتے ہیں علوم الحدیث، علم اصول الحدیث، علم معطخ الحدیث لیکن یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ درایت حدیث اور اصول حدیث دونوں مترادف ہیں یا کچھ فرق ہے؟ اس سلسلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ دونوں ایک ہی شئی ہے اسی کی طرف حضرت شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی ص کا میلان معلوم ہوتا ہے، لیکن مذکورہ دونوں تعریف کو سامنے رکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ دونوں میں باریک فرق ہے دیکھئے درایت حدیث کی تعریف میں ایک جزو یہ بھی ہے کہ حدیث کے معنی مرادی اور استنباط مسائل سے بھی بحث کی جائے، جبکہ اصول حدیث میں معنی مرادی اور احکام کے استنباط سے بحث نہیں کی جاتی۔“ م

علم حدیث کا موضوع | علم حدیث کا موضوع علامہ کرمانی نے سب سے عمدہ انداز میں بیان فرمایا ہے لکھتے ہیں :  
”موضوعه : ذات الرسول من حیث انه رسول الله“

یعنی اس علم کا موضوع آپ کی ذات گرامی ہے اس حیثیت سے کہ آپ رسول خدا ہیں۔  
موضوع کے سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ ہر موضوع کسی نہ کسی قید کے ساتھ متعین ہوتا ہے، یہاں بھی اس فن کا موضوع ذات رسول تو ہے مگر نبوت و رسالت کی قید اور حیثیت کے ساتھ اس قید سے واضح ہوا کہ اس فن کا موضوع ذات رسول اس حیثیت سے نہیں کہ آپ کن کے والد ماجد تھے اور کن کے فرزند، اور کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔  
علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ میرے استاد علامہ محی الدین کا فنی، علامہ کرمانی کے اس قول پر اعتراض کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تو بہر حال بشر اور انسان ہیں اور بدن انسان علم طلب کا موضوع ہے نہ کہ علم حدیث کا، لہذا ذات رسول

کو اس علم کا موضوع کہنا کیونکر صحیح ہوگا۔

لیکن شارحین حدیث کو علامہ محی الدین پر تعجب کے ساتھ خود علامہ سیوطیؒ پر بھی حیرت ہے کہ اس اعتراض کو نقل کر کے سکوت اختیار فرمایا اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ اشکال خود علامہ سیوطیؒ کی نگاہ میں صحیح ہے، حالانکہ یہ اشکال سر اسر غلط ہے کیونکہ ذات رسول میں دو چیزیں ہیں۔ (۱)

ایک صفت بشریت و انسانیت، اور ایک وصف رسالت۔ علامہ کرمانی کی مراد یہ ہے کہ ذات رسول وصف رسالت کے اعتبار سے موضوع ہے نہ کہ وصف انسانیت اور بدن کے لحاظ سے اس وضاحت کے بعد علامہ کا منہبی کا اعتراض تعجب خیز بن جاتا ہے۔

(۲) حضرت شیخ زکریا لکھتے ہیں کہ ذات رسول من حیث الرسالة یہ تو مطلق علم حدیث کا موضوع ہے اب خواہ وہ علم حدیث کی کوئی قسم ہو، لیکن محدثین جس علم روایت حدیث سے بحث کرتے ہیں وہ چونکہ خاص ہے اس لئے اس کا موضوع بھی خاص ہونا چاہئے، چنانچہ حضرت شیخ کا پسندیدہ موضوع حدیث یہ ہے۔  
"المرویات والروایات من حیث الاتصال والانقطاع" یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سند کے اتصال وانقطاع کے ساتھ روایت علم حدیث کا موضوع ہے" (۲)

**غرض و غایت** "الفوز بسعادة الدارين" یعنی دین و دنیا کی کامیابی، اس علم کی غرض و غایت ہے، تاہم یہ غرض و غایت قدر مشترک تمام علوم دینیہ کے ہیں اسی لئے بعض حضرات نے دوسرے الفاظ میں غرض و غایت بتائی ہے

(۲) حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ اس کی غرض ان دعاؤں اور بشارتوں کا مستحق بننا ہے جو دعائیں اور بشارتیں اس علم کے پڑھنے پڑھانے سے متعلق وارد ہیں۔

(۳) چونکہ فہم قرآن موقوف ہے فہم احادیث پر، لہذا عمل بالقرآن حدیث پڑھنے کا مقصد ہے۔  
(۴) ہر مسلمان کو ذات رسول سے محبت ہے تو آپ مسلمانوں کے محبوب ہوئے، اور سچا محبت وہ ہے جس کو محبوب کی ہر اد اور ہر بات پسند ہو اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بار بار پڑھ کر حلاوت و تازگی حاصل کی جائے، غرض حلاوت ایمانی کا حصول اس کی غرض ہے۔

(۵) مقدمہ مشکوٰۃ میں ایک عبارت اما بعد فان التمسك بهديه (۳) کو پیش نظر رکھ کر بعض حضرات نے یہ غرض بتائی ہے کہ معرفة كيفية اقتداء النبي صلى الله عليه وسلم یعنی آپ کے نقش قدم پر کس طرح چلا جائے اس کا طریقہ معلوم ہو سکے "م" (۴) "م"

وجہ تسمیہ :- حدیث کو حدیث کیوں کہتے ہیں اس کی کئی وجہیں بیان کی جاتی ہیں :

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ لفظ حدیث قدیم کی ضد ہے حدیث کے معنی حادث، چونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے قدیم ہے اس لئے کلام اللہ کو بھی قدیم کہتے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی حادث ہے، تو آپ کا کلام بھی حادث ہوا، اس لئے کلام نبوی کو حدیث بمعنی حادث کہا گیا۔

(۲) حدیث کے معنی بات، چونکہ احادیث درحقیقت آپ کی باتیں ہیں اس لئے آپ کے کلام کو حدیث کہتے ہیں، رہا یہ معاملہ کہ احوال و صفات کو احادیث کہنا، تو تعلیم کہا جاتا ہے، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح اللہم میں بہت ہی اچھے انداز میں وجہ تسمیہ ذکر فرمائی ہے، کہ لفظ حدیث قرآنی آیت "و اما بنعمة ربك فحدث" سے ماخوذ ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ خداوند قدوس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تین انعام کا تذکرہ کیا ہے اور پھر ہر نعمت پر شکر کرنے کا طریقہ بتلایا ہے

(۱) اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَآوَىٰ اِسْ اِنْعَامِ كَيْفَ يَشْكُرُ فِيهِ مِنْ عَمَلِ مَا

فَاَمَّا الْيَتِيْمُ فَلَا تُقْهَرُ

(۲) وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنَىٰ اِسْ اِنْعَامِ كَيْفَ يَشْكُرُ فِيهِ مِنْ عَمَلِ مَا

وَاَمَّا السَّائِلُ فَلَا تَنْهَرُ

(۳) وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ اِسْ اِنْعَامِ كَيْفَ يَشْكُرُ فِيهِ مِنْ عَمَلِ مَا

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

اس میں ضال کا عام معنی مراد نہیں، بلکہ احکام شرع سے نا آشنا مراد ہے، اور ہدایت سے شریعت کی تعلیم مراد ہے کہ بذریعہ وحی اللہ نے آپ کو احکام شرع بتلادی تو اسکے شکرانہ میں دوسروں کو یہو نچائیں، چنانچہ اپنے قول و فعل کے ذریعہ دوسروں تک یہو نچا کر اس حکم کی تعمیل کی، لہذا اس مناسبت سے آپ کے اقوال و افعال کو حدیث کہا جانے لگا۔ (۱)

(۲) "فن بلاغت کا ایک قاعدہ ہے" استعارۃ العام للخاص "یعنی کوئی عام لفظ کسی ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے کسی خاص مفہوم کے لئے متعین کر لیا جائے، لہذا حدیث اگرچہ ہر قسم کی بات کو کہیں گے، لیکن اب علم شریعت میں روایات نبوی کے لئے خاص کر لیا گیا، تو اب اس لفظ سے روایات نبوی ہی مراد ہوں گی اور مناسبت یہ ہے کہ خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مقامات پر اپنے کلام کے لئے حدیث کا لفظ ارشاد فرمایا، مثلاً ..... "من حفظ علی امتی اربعین حدیثاً فی امر دینہا بعثہ اللہ فقیہاً وکنت لہ یوم القیمة شافعاً و شہیداً" (۲) م

### حدیث کے متقارب الفاظ

"اس فن کے چار نام اور بھی ہیں ..... روایت، اثر، خبر، سنت"

جب لفظ حدیث کے ہم معنی، اور متقارب الفاظ محدثین کے سامنے آئے تو سوال پیدا ہوا کہ ان الفاظ میں کون سی نسبت ہے۔

روایت :- اس لفظ کا اطلاق بالاتفاق حدیث کے لغوی مفہوم پر ہوتا ہے یعنی ہر طرح کی بات کو لغوی طور پر روایت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

خبر :- خبر کے لفظی معنی ماینقل، حدیث بھی نقل کی جاتی ہے اس مناسبت سے حدیث کو خبر کہتے ہیں اس میں اختلاف ہے کہ حدیث اور خبر کے درمیان کون سی نسبت ہے؟ بعض کے نزدیک تساوی کی نسبت ہے، جبکہ بعض کے نزدیک دونوں میں تباہی کی نسبت ہے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا رجحان اسی طرف معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے حدیث بیان کرنے والے کو محدث، اور خبر بیان کرنے والے کو اخباری سے تعبیر کیا ہے، اس قول کے مطابق حدیث کو خبر کہنا صحیح نہیں (۱) لیکن یہ قول خود صحیح نہیں، کیونکہ بکثرت احادیث کے لئے اخبار کا لفظ مذکور ہے بعض کے نزدیک دونوں میں عموم خصوص کی نسبت ہے، خبر عام ہے جو دوسرے لوگوں کے اقوال و افعال کو بھی شامل ہے اور حدیث صرف آپ کے اقوال کو شامل ہے۔

اثر :- لغت میں اثر "بقیۃ الشئ" کو کہتے ہیں، چونکہ کلام اللہ کے مقابلہ میں احادیث بقیہ ہیں اس لئے اس کا نام اثر رکھا گیا، یا اثر کے معنی نقل کے ہیں، اور حدیث بھی نقل کی جاتی ہے اس لئے اس کو اثر کہتے ہیں۔

حدیث اور اثر کے درمیان فرق کیا ہے؟ فقہاء خراسان کا خیال ہے مرفوع روایت کو حدیث، اور صحابہ و تابعین کی موقوف روایات کو اثر کہیں گے، گویا ان کے بقول تباہی کی نسبت ہے، حضرت امام محمدؒ نے اپنی کتاب جس میں صرف موقوف روایات لکھی اور اس کا نام انہوں نے کتاب الآثار رکھا، جس سے بظاہر اس قول کی تائید ہوتی ہے، بعض نے دونوں کے درمیان عموم خصوص مطلق کی نسبت ذکر کی ہے کہ حدیث کا اطلاق صرف مرفوع پر، اور اثر کا مرفوع، موقوف، مقطوع تینوں پر ہوگا۔ لیکن جمہور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تساوی کی نسبت ہے، اور اس کی تائید بھی ہوتی ہے، مثلاً وہ نوعیہ جو آپ سے مرفوعاً منقول ہیں ان کو عرف میں نوعیہ کا ثورہ کہا جاتا ہے، امام طحاوی نے حدیث کی مشہور کتاب لکھی جس میں مرفوع احادیث بھی ہیں اس کا نام معانی الآثار رکھا، اسکے علاوہ انکی دوسری کتاب حدیث مشکل الآثار ہے، حافظ ابن جریر طبری کی تہذیب الآثار بھی ہے اس کا یہی حال ہے اس سے معلوم ہوا کہ دونوں میں تلافی کی نسبت ہے۔

(۴) سنت :- سنت کے معنی "الطریقة المسلوكة فی الدین" یعنی دین کا وہ راستہ جس پر چلا جائے، چونکہ آپ کے اقوال و افعال پر چل کر زندگی گزاری جاتی ہے، اس وجہ سے اسے سنت کہتے ہیں، ان دونوں کے درمیان نسبت کے سلسلہ میں اختلاف ہے، بعض حضرات عموم خصوص مطلق کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ حدیث اقوال کے لئے خاص ہے اور سنت عام ہے، اقوال و افعال دونوں کے لئے مستعمل ہے، بعض نے بالکل برعکس کہا کہ حدیث عام اور سنت خاص ہے، لیکن صحیح قول تساوی کا ہے کیونکہ سب حدیث میں سنن نامی مشہور کتب ہیں حالانکہ ان میں فعلی روایات کیساتھ قولی بھی بکثرت ہیں، معلوم ہوا کہ تراویف کی نسبت ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام الفاظ محدثین کے نزدیک مترادف ہیں اور ایک دوسرے کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتے

ہیں۔ (۵)

## اقسام حدیث اور ان کا ماخذ ”قرآن“

حضرات محدثین نے حدیث کی بنیادی طور پر دو قسمیں کی ہیں: (۱) خبر متواتر (۲) خبر آحاد۔ پھر خبر آحاد کی تین قسمیں کی ہیں مشہور، عزیز، غریب۔ یہ کل چار قسمیں ہوئیں جو اصول حدیث میں ذکر کی گئی ہیں، البتہ اور اقسام تو وہ ذیلی اور ضمنی ہیں جو انہیں چار سے نکلے ہوئے ہیں۔

ان چار قسموں پر غور کریں تو ان سب کا ماخذ قرآن ہی ہے، مثلاً خبر متواتر کی حیثیت کا ثبوت، خود قرآن کا وجود ہے جس کی روایت و تلاوت کا طریقہ ہی متواتر ہے، اگر متواتر سے انکار کر دیا جائے تو قرآن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا خبر مشہور:- اس روایت کو کہتے ہیں جو کم از کم تین ثقہ راویوں سے منقول ہو، اس کی حیثیت قرآن کریم کی اس آیت سے ثابت ہے جو اصحاب القریہ کے تذکرہ میں سورہ یسین میں مذکور ہے۔

واضرب لهم مثلاً اصحاب القرية اذ جاءها المرسلون اذ ارسلنا اليهم اثني عشر مبشرون  
فغزونا بشالثل فقالوا انا اليكم مرسلون۔

اہل اٹھاکہ کے پاس حق تعالیٰ نے دو شخص کو رسول بنا کر بھیجا ان لوگوں نے ان دونوں کی تکذیب کر دی، خداوند قدوس نے ان دونوں کی تقویت کے لئے تیسرے شخص کو بھیجا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ دو کی تکذیب کر دینے کے بعد تیسرے کا اضافہ اصولاً اس وجہ سے تھا کہ عاقلہ تین ثقہ اور عادل افراد کو جھٹلاتا فطرت انسانی کے خلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سے گاڑوں والوں پر حجت تمام ہو گئی معلوم ہوا کہ کسی بات کو تین آدمی مختلف طور پر بیان کریں تو وہ قاطباً حجت ہے ممکن ہے یہ سوال اٹھایا جائے کہ ہماری بحث تو راویوں کے سلسلہ میں ہے اور دلیل میں انبیاء کو پیش کیا گیا ہے کیا غیر نبی، نبی کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت نقل و روایت کے سلسلہ میں تین کا عدد پیش نظر ہے رسالت کی صفت پیش نظر نہیں کیونکہ ایک رسول بھی ثقہ و عدالت، اور صدق و امانت میں ساری دنیا سے بڑھ کر ہوتا ہے، اہل اٹھاکہ نے ان دونوں کی تکذیب اس بنا پر نہیں کی تھی کہ وہ دونوں رسول ہیں، بلکہ راوی اور ناقل سمجھ کر کیا تھا لہذا جب خبر مشہور قرآن کی اس آیت سے مستفاد ہے تو اس آیت کو ماننا، خبر مشہور کے ماننے کو مستلزم ہے، اور خبر مشہور کا انکار اس آیت کے انکار کو مستلزم ہے۔

جبر عزیز:- اس روایت کو کہتے ہیں جس کو کم از کم دو ثقہ راوی روایت کریں دو ثقہ انسان کی نقل و خبر قرآن کی نگاہ میں معتبر ہے، واستشهدوا شہیدین من رجالکم، دوسری جگہ ہے واشہدوا ذوی عدل، یعنی دو کی شہادت صرف معتبر ہی نہیں بلکہ حجت بھی ہے جس پر دین و دنیا کے ہزار ماجانی، باہلی اخلاقی اور معاملاتی چیزوں کا دار و مدار ہوتا ہے،



اور انہیں دو پر فیصلے بھی ہوتے ہیں حتیٰ کہ دو کی شہادت کے بعد قضائے قاضی ظاہر و باطن نافذ ہو جاتی ہے، جب دو کی شہادت حجت ہے تو دو ثقہ راوی کی روایت بدرجہ اولیٰ حجت ہوگی، کیونکہ شہادت کی شرط سخت ہے اس میں حریت، عدد، عدالت اور ذکر کا ہونا لازم ہے جبکہ حدیث میں سوائے عدالت کے باقی مذکورہ چیزیں مشروط نہیں، غرض جب دو کی شہادت معتبر ہے تو دو کی خبر بدرجہ اولیٰ معتبر ہونی چاہئے، اس لئے کہتا پڑے گا کہ خبر عزیز کی حجت کا ثبوت قرآن کی مذکورہ بالا آیتوں سے فراہم ہوتا ہے۔

خبر غریب :- جس روایت کے بیان کرنے والے ایک فرد ہوں، اس کو خبر غریب، اور خبر فرد کہتے ہیں، خبر فرد کے ثبوت اور اس کی حجت میں ایک نہیں بیسوں آیتیں پیش کی جاسکتی ہیں، ان میں چند ملاحظہ ہو، (۱) سارے انبیاء کے پاس حضرت جبرئیلؑ تھا وحی لیکر آتے تھے، پورا قرآن تنہا وہ لیکر آئے، اگر ایک کی خبر قابل حجت نہ ہوتی تو انبیاء کے پاس صرف ایک فرشتہ کونہ بھیجا جاتا۔

یہاں بھی وہی اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہماری بحث تو راویوں کے سلسلہ میں ہے، اور دلیل میں فرشتہ کو پیش کیا جا رہا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خداوند قدوس نے حضرت جبرئیلؑ کی بات یہ کہہ کر نہیں منوائی کہ یہ فرشتہ ہے بلکہ اصول کی کسوٹی پر جانچ کر ان کی بات تسلیم کرنے کی ہدایت فرمائی، کہ جبرئیلؑ میں عدالت، ضبط، امانت وغیرہ جیسے اوصاف قبولیت ہیں یا نہیں؟ ایک جگہ قرآن نے ان کے متعلق کہہ دیا اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِيْمٍ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مَّطَاعٍ ثَمَّ اٰمِيْنٍ اس آیت میں واضح کر دیا گیا کہ قرآن کی روایت، اور خبر فرد، ان کے فرشتہ ہونے کی وجہ سے قابل تسلیم نہیں ہوتی، بلکہ اس بناء پر کہ راویوں کے تمام اوصاف اور محاسن روایت ان میں جمع ہیں، اور تمام مطاعن روایت سے پاک و صاف ہیں جیسا کہ لفظ رسول، کریم، ذی قوۃ، مطاع، امین وغیرہ سے واضح ہے

(۲) اہل انطاکیہ کے علاوہ باقی تمام امت کے پاس، ان کی ہدایت کے لئے ایک ایک ہی نبی آتے رہے جیسا کہ اِذْ قَالَ لٰهُمُ تَوْحٍ، اِذْ قَالَ لٰهُمُ هُوْدٌ، اِذْ قَالَ لٰهُمُ لُوْطٌ سے ظاہر ہے یہاں بھی سرسری طور پر وہی اعتراض قائم کیا جاسکتا ہے کہ دعویٰ راویوں کے بارے میں ہے جو غیر رسول ہیں، اور دلیل میں رسول کو پیش کیا جا رہا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے رسول کی بات اس حیثیت سے نہیں منوائی کہ یہ رسول ہیں، بلکہ اصول کی کسوٹی پر جانچ کر ماننے کی ہدایت کی، چنانچہ قرآن میں ہے وَالتَّجْمِ اِذَا هُوَ، مَا ضَلَّ صٰحِبُکُمْ وَمَا غٰوٰی وَمَا يَنْطٰقُ عَنِ الْهُوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحٰی یُوْحٰی، پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں ”صاحب“ کہا ”رسول“ نہیں کہا اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ محمدؐ ایک زمانہ دراز تک تمہارے ساتھ رہے، ان کے حالات زندگی کے واقعات عیاں ہیں کیا تم نے ان کے اندر نفس پرستی وغیرہ کے اوصاف مشاہدہ کئے ہیں؟ اگر ایسی بات نہیں بلکہ تم کفار خود ان کی امانت، دیانت اور صداقت کے معترف ہو تو جو انسان، انسان پر جھوٹ نہیں بول سکتا وہ خدا پر جھوٹ کیسے بول سکتا ہے یہ

دلیل ہے اس بات کی کہ رسول جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ قابل قبول ہے کیونکہ قبولیت کے اوصاف ان میں موجود ہیں۔

(۳) وجاء رجل من اقصى المدينة يسعى قال يا موسى ان الملاء يأترون بك ليقتلوك فاخرج اني لك من الناصحين فخرج منها خائفاً يترقب۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک انسان کی خبر مان لی، بلاشبہ یہ خبر فرد، اور خبر غریب تھی جبکہ اسی خبر پر حائر ہوئے، اور مصر سے باہر نکل گئے، مگر چہ حضرت موسیٰ کا یہ فعل نبوت سے پہلے کا ہے لیکن قرآن نے اس کو بیان کیا ہے اور ان کے اس فعل پر سکوت کیا ہے، اگر خبر فرد کو ماننے کی صورت میں ان کا یہ عمل غلط ہوتا، تو قرآن میں اس کی صراحت ہوتی معلوم ہوا کہ ایک آدمی کی بات اگر قرآن سے اس کا ثقہ اور عادل ہونا معلوم ہو جائے تو یہ قرآن کی روشنی میں صحیح ہے (۴) یا ایہا الذین آمنوا اذ جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا۔

معلوم ہوا کہ تحقیق و تفتیش کے بعد جب ایک فاسق کی خبر بھی مانی جاسکتی ہے تو عادل کی خبر کیونکر قابل حجت نہ ہوگی، ظاہر ہے کہ حضرات محدثین کسی راوی کی پوری تحقیق کے بعد ہی اس کی روایت کو معتبر مانتے ہیں۔  
الحمد للہ کہ حدیث کے بنیادی اقسام کی حجت کا ثبوت قرآن سے نکل آیا۔ (فتح الملہم ص ۶/۱)

## صحابہ ستہ کی شرطیں اور فرق مراتب

”محدثین نے حدیث کی بے شمار کتابیں لکھی ہیں ان میں چھ کتابوں کو ماخذ کا درجہ حاصل ہے، لیکن صحابہ ستہ کے نام سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ ان کتابوں کی ہر حدیث صحیح ہے، اور اس کے علاوہ صحیح نہیں، لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں بلکہ غلط ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بخاری و مسلم کے علاوہ نہ تو ہر حدیث صحیح ہے اور نہ ان سے باہر کی ہر حدیث ضعیف ہے، صحابہ ستہ کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ ان کو پڑھ لینے کے بعد اصول دین سے متعلق صحیح روایات کا ایک بڑا ذخیرہ آجاتا ہے جو دین کے معاملات میں کافی ہو بہر حال ان چھ کتب حدیث کو متقی یا مقبول کا درجہ حاصل ہے اس لئے یہ دیکھنا ہے ان حضرات نے کن شرطوں کو سامنے رکھ کر یہ ذخیرہ حدیث جمع کیا ہے لیکن پریشانی یہ ہے کہ خود ان محدثین نے صراحت نہیں فرمائی کہ ان کے سامنے لغز روایت کے کیا شرط ہیں البتہ بعد کے لوگوں نے ان کے اسلوب کو پیش نظر رکھ کر ان شرائط کا استنباط کیا ہے مگر ان شرطوں کے تذکرے سے پہلے راویوں کے طبقات کا جائزہ ضروری ہے راویان حدیث کے پانچ طبقے ہیں“ م

(۱) قوى الضبط كثير الملازمة یعنی جس راوی کا حافظہ بہت قوی ہو، اور انہوں نے سفر و حضر میں اپنے شیخ کی صحبت زیادہ پائی ہو

(۲) قوى الضبط قليل الملازمة یعنی ان کا حافظہ تو قوی ہو لیکن شیخ کی صحبت زیادہ حاصل نہ رہی ہو

(۳) قليل الضبط كثير الملازمة یعنی جن کا حافظہ کمزور ہو البتہ شیخ کی صحبت زیادہ پائی ہو

(۴) قليل الضبط قليل الملازمة یعنی حافظہ کمزور ہو اور صحبت شیخ کا موقعہ بھی کم ملا ہو

(۵) الضعفاء والجاهل اسی کو بالفاظ دیگر "قلیل الضبط قلیل الملازمة مع الجرح" سے بھی

تعبیر کیا گیا ہے۔

انہی پانچ طبقات کے لحاظ سے صحاح ستہ کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔

(۱) چنانچہ امام بخاریؒ کے یہاں کسی بھی حدیث کو لینے کے لئے سب سے سخت شرطیں ہیں کہ وہ صحیح کی شرائط پر پوری اترتی ہوں نیز مذکورہ رواقہ خمسہ میں سے صرف پہلے طبقہ کی احادیث کو مستقلاً ذکر کرتے ہیں البتہ دوسرے طبقہ کی احادیث کبھی کبھی محض بطور استشہاد لے آتے ہیں

حافظ مقدسیؒ نے تو یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام بخاریؒ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ صرف ان راویوں کی روایت لاتے ہیں جنکے ثقہ ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہو، لیکن ایسا نہیں یہی وجہ ہے کہ امام حازمی نے اس کی تردید کی ہے، اور بعض نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ بخاری کے اتنی راوی ایسے ہیں جن کے لو پر کسی نہ کسی نے کلام کیا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے نصب الرایہ۔

بخاری شریف کے بارے میں عام ذہن یہی ہے کہ حدیث غریب اس میں نہیں حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ اس کی پہلی حدیث انما الاعمال بالخ، اور سب سے آخری حدیث کلمتان حبیبتان الخ بھی غریب ہے

(۲) امام مسلمؒ بھی صحیح حدیث کے ذکر کرنے کا التزام کرتے ہیں، لیکن امام بخاری کے مقابلہ میں تین اعتبار سے نرم ہیں، امام بخاری کے برخلاف دوسرے طبقہ کے راویوں کی حدیث بلا تکلف لاتے ہیں اور تیسرے طبقہ کی روایت تائیداً ذکر کرتے ہیں امام بخاریؒ کے یہاں حدیث معصن کی صحت کے لئے راوی اور مروی عنہ کے درمیان لقمہ و ساع ضروری ہے، اس کے بغیر روایت اخذ نہیں کرتے، جبکہ امام مسلم اس قسم کی حدیث کے صحت کے لئے محض راوی کا مروی عنہ کے معاصر ہونا کافی قرار دیتے ہیں، تیسرا فرق یہ ہے کہ امام مسلم راویوں پر جرح و نقد کے سلسلہ میں نرم ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض ان راویوں سے بھی روایت نقل کی ہے جن سے امام بخاری نے ترک کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بخاریؒ کے مقابلہ میں مشکلم فیہ راوی کی تعداد ایک سو اسی (۱۸۰) ہے۔

(۳) امام نسائیؒ پہلے تین طبقوں کی روایت کو مستقلاً لاتے ہیں۔

(۴) جبکہ امام ابوداؤد تینوں طبقوں کے ساتھ بطور استشہاد طبقہ رابعہ کی بھی روایات لاتے ہیں۔

(۵) امام ترمذیؒ چوتھے طبقہ کی روایات مستقلاً اور بعض جگہ پانچویں طبقہ کو بھی ذکر کرتے ہیں

(۶) ابن ماجہ نے یہ پانچوں طبقہ کی روایات بلا تکلف اور مستقلاً ذکر کی ہیں

فرق مراتب :- تو یہ سند کے اعتبار سے صحاح ستہ کی ترتیب یہ ہے

بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ بعض لوگوں نے مسلم کو بخاری پر ترجیح دی ہے شیخ ابو محمد تھیمی نے اپنی

فہرست میں امام ابن حزم ظاہری کے متعلق لکھا ہے کہ مسلم کو بخاری پر ترجیح دیا کرتے تھے، حافظ عبد الرحمن بن علی الرضی

یعنی شافعی کا شعر ہے

تنـازع قوم فی البخاری و مسلم ❖ لدى وقالوا ای ذین تقدم

فقلت لقد فاق البخاری صحته ❖ كما فاق فی حسن الصناعة مسلم (۱)

یعنی میرے سامنے بخاری و مسلم کے بارے میں کچھ لوگوں نے تنازعہ کیا، کہ ان میں کس کو فوقیت حاصل ہے تو میں نے کہا کہ صحت کے اعتبار سے بخاری کو فوقیت ہے، اور ترتیب ابواب وغیرہ میں امام مسلم ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔

من وجہ مسلم کو فوقیت دی جاسکتی ہے لیکن علی الاطلاق اصح کہنا اور اول درجہ دینا صحیح نہیں (۲)

صاحب کشف الظنون کا خیال ہے کہ ترمذی کا درجہ صحیحین کے بعد ہے لیکن علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں بحوالہ ذہبی نقل کیا ہے کہ اس کا درجہ صحیحین کے بعد ہوتا چاہئے تھا مگر اس کا مرتبہ اس لئے گھٹ گیا کہ اس میں مصلوب جیسے راویوں کی روایات آگئیں ہیں اور حافظ ابن حجر نے تقریب میں، اسی طرح تذکرۃ الحفاظ، تہذیب المعجزات میں جو اشارات کئے ہیں ان سے محسوس ہوتا ہے کہ ابوداؤد اور نسائی کے درمیان اس کا مرتبہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا رجحان ایسی ہے کہ ترمذی کا مقام پانچویں درجہ پر ہے اکابر دیوبند کا خیال کچھ اسی قسم کا ہے نسائی شریف کی صحیح روایت چونکہ ابوداؤد کے مقابلہ میں زیادہ ہے اس لئے اس کو اولیت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ ابن ماجہ :- شروع میں (ابن ماجہ کے علاوہ) مذکورہ بالا کتب خمسہ صحاح کی اصطلاح سے مشہور ہوئیں، ابن ماجہ کو صحاح میں شامل نہیں کیا گیا، اسی بناء پر امام ابو بکر حازمی نے "شروط الاثنتی الخمسۃ" تالیف فرمائی، بعد میں ابن ماجہ کو اس کی حسن ترتیب کی وجہ سے صحاح میں شامل کیا گیا، اور پھر صحاح ستہ کی اصطلاح قائم ہوئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ اگر صحاح میں چھ کتابوں کو داخل کرنا ہو تو ابن ماجہ کے بجائے مؤطا امام مالک کو شامل کرلو، بعض حضرات نے صحاح ستہ میں دہری کو شامل کیا ہے، کیونکہ ابن ماجہ میں ضعیف اور منکر روایتیں بلکہ بعض موضوع روایات بھی آگئی ہیں بعض علما نے ان کی تعداد انہیں، بعض نے سترہ، بعض نے اکیس اور بعض نے پچیس بتلائی ہے، تاہم حسن ترتیب کی بنا پر صحاح ستہ میں اس کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ :- بعض حضرات مثلاً ابوالحجاج السری نے لکھا ہے کہ جس روایت میں ابن ماجہ متفرد ہوں وہ روایت ضعیف ہوگی، لیکن حافظ ابن حجر تہذیب المعجزات میں لکھتے ہیں کہ میری تلاش و جستجو کے مطابق علی الاطلاق ایسا نہیں، اگرچہ فی الجملہ اس میں بہت سی منکر حدیثیں ہیں۔ (۳)

مراتب روایت :- مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ کتب حدیث ایک درجہ کی نہیں بلکہ راویوں کے فرق مراتب کے مطابق روایت میں فرق آتا ہے اس لحاظ سے روایات کے ساتھ درجات قائم کئے گئے ہیں (۱) سب سے اعلیٰ روایت جو صحیحین میں ہو (۲) وہ روایت جس کو بخاری نے ذکر کی ہو جس کو ابن ماجہ بخاری کہتے ہیں (۳) جس کو امام مسلم نے

نقل کی ہو جس کو ائمہ مسلم کہتے ہیں۔

(۳) وہ روایت جو ان دونوں میں تو نہ ہو لیکن ان دونوں کے شرط کے مطابق ہو (۵) وہ جو صرف شرط بخاری پر ہو (۶) جو شرط مسلم پر ہو، شرط بخاری یا مسلم کا مطلب یہ ہے کہ راوی کے وہی صفات ہوں جو بخاری و مسلم کے راویوں کے صفات ہیں اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کی روایت کے سوا کوئی نئی روایت انہی دونوں کے راویوں سے مروی ہو! (۷) اسکے بعد اس روایت کا درجہ ہو گا کہ جس کتاب میں صحیح روایت نقل کرنے کا التزام کیا گیا ہو، (۶۲)

### صحابہ ستہ کے مقاصد

علم حدیث کے طلبہ کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ صحابہ ستہ کن مقاصد کے پیش نظر مرتب ہوئی ہیں تاکہ ان مقاصد کو سامنے رکھ کر کما حقہ استفادہ کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس پہلو پر بحث کی ہے کہ امام بخاری کے مقاصد یہ تھے :

(۱) صحیح اور متصل السند روایتوں کو جمع کرنا، (۲) فقہی مسائل کو مضبوط کرنا، اسی لئے جاہل موقوف، معلق، صحابہ کے فتاویٰ نقل کر کے مسائل کا استخراج کرتے ہیں (۳) حدیث کی تفسیر و معانی بتانا، اسی لئے تراجم میں حدیث کی شرح کرتے ہیں، بخاری کے تراجم در حقیقت، فقہی مسائل کا مجموعہ ہے اگر کوئی سوال کرے کہ امام بخاری نے فقہ میں کون سی کتاب لکھی تو کہہ دو کہ بخاری کے تراجم ہی فقہی مسائل ہیں، مقولہ مشہور ہے ”فقہ البخاری فی تراجمہ“۔

(۲) امام مسلم کا مقصد ان روایتوں کو جمع کرنا جن کی صحیح اور مرفوع ہونے پر ان کے زمانہ کے ائمہ حدیث کا اتفاق ہو، (۲) استنباط مسائل کے لئے مرتب طریقہ پر احادیث یکجا کر کرنا (۳) حدیث کے مختلف سندوں کو ذکر کرنا تاکہ اسکی وجہ سے متن اور سند کا اختلاف اچھی طرح سامنے آجائے، اور ایک موضوع سے متعلق تمام احادیث کو ان کے طریق صحیح کے ساتھ مرتب شکل میں جمع کر دیا جائے، حسن ترتیب کے لحاظ سے مسلم بے نظیر ہے اور اس میں تلاش حدیث بہت آسان ہے۔ (۳) امام ابو داؤد کا مقصد ان احادیث کو ذکر کرنا جن سے کسی فقیہ نے کسی بھی فقہی مسئلہ پر استدلال کیا ہو اسی لئے ایسی احادیث کو تمام طرق کے ساتھ یکجا ذکر کر دیتے ہیں اور چونکہ فقہاء کے مستلزمات ذکر کرتے ہیں اس لئے امام مسلم کی طرح صحیح احادیث کی پابندی نہیں کر سکے، بلکہ وہ صحیح، حسن اور ان ضعیف احادیث کو لے آتے ہیں جو قابل عمل ہو، البتہ جو ناقابل عمل روایت ہو اس کو ذکر نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو قال ابو داؤد کہہ کر اسکے نکارت کو ظاہر کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں سکوت اختیار کریں وہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے۔

(۴) امام ترمذی ان کا پہلا مقصد تو وہی ہے جو بخاری اور مسلم کا ہے یعنی صحیح احادیث کو جمع کرنا، (۲) ان کے مقاصد میں امام ابو داؤد کا مقصد بھی داخل ہے یعنی ان احادیث کو ذکر کرنا جو مسائل فقہیہ کے متعلق ہیں گویا ان کا مقصد ہر فقیہ کے مسئلہ کو جداگانہ باب میں ذکر کرنا ہے، لیکن ایک موضوع کی احادیث کا استیعاب نہیں کرتے بلکہ عموماً صرف

ایک حدیث لاتے ہیں اور حدیث بھی حتی الامکان وہ ذکر کرتے ہیں جو دوسرے ائمہ نے تخریج نہیں کی، اور اس موضوع کی باقی احادیث کی طرف ”وفی الباب عن فلان وفلان“ کہہ کر اشارہ کرتے ہیں اور اسناد کی علتوں پر اشارہ کے ساتھ مذاہب فقہاء صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(۵) امام نسائی: امام نسائی کا مقصد تالیف زیادہ تر علل اسانید بیان کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر باب کے شروع میں وہ حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں ان کے نزدیک کوئی علت ہو ان علتوں کو بیان کرنے کے بعد وہ حدیث لاتے ہیں جو ان کے نزدیک صحیح ہو، اسی کے ساتھ استنباط احکام بھی پیش نظر رکھتے ہیں مگر یہ انداز بہت لطیف ہوتا ہے، اسی لئے اس کے تراجم اپنی دقت نظر کے اعتبار سے بخاری کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں۔

(۶) امام ابن ماجہ: ان کا انداز امام ابو داؤد کے انداز و مقاصد سے ملتا جلتا ہے، فرق اگر ہے تو یہ کہ ان کے یہاں صحت و حسن کا وہ اہتمام نہیں جو ابو داؤد کے یہاں ہے۔

### کتب حدیث کی قسمیں

محدثین نے مختلف انداز اور مختلف حیثیت سے کتابیں لکھی ہیں، چنانچہ بعض محدثین نے مضامین کے لحاظ سے کتب حدیث لکھیں، اور پھر ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا۔

جامع، سنن، معجم، مسانید، افراد، مستدرک، مستخرج، جزوہ جامع:- اس کتاب حدیث کو کہتے ہیں جس میں آٹھ مضامین سے متعلق احادیث جمع کر دی گئی ہوں، ان مضامین کو شعر میں اس طرح کہا گیا ہے

سیر و آداب و تفسیر و عقائد      فتن و اشرار و احکام و مناقب

سنن:- وہ کتاب حدیث جس میں ابواب فقہیہ کی ترتیب پر احادیث احکام جمع کی گئی ہوں، جمع احادیث کے ابتدائی دور میں ایسی کتابوں کو ابواب کہا جاتا تھا، بعد میں نام بدل کر مصنف کہا جانے لگا، لیکن پھر جلد ہی سنن کے نام سے معروف و مشہور ہو گئیں، صحاح ستہ میں جہاں سنن درجہ بولتے ہیں تو اس سے نسائی، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ یہ کتابیں مراد ہوتی ہیں اسکے علاوہ اور بھی سنن کے نام سے کتابیں ہیں مثلاً سنن دارقطنی، دارمی، بیہقی، سعید بن منصور۔

معجم:- وہ کتاب حدیث جس میں اساتذہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں جمع کی گئی ہوں یعنی ایک شخص کی ساری حدیث ایک جگہ ذکر کر دی جائیں، لیکن حضرت شیخ ذکر کیا فرماتے تھے، کہ یہ تعریف صحیح نہیں بلکہ معجم ان کتب حدیث کو کہیں گے جن میں حروف تہجی کی ترتیب پر احادیث جمع کی گئی ہوں خواہ وہ ترتیب صحابہ کرام کی ہو یا شیوخ کی، معجم تو کئی ایک ہیں لیکن نام طبرانی کی تین معجم، المعجم الکبیر، المعجم الاوسط، المعجم الصغیر کے نام سے مشہور ہے۔

مسانید:- وہ کتب حدیث جن کو صحابہ کی ترتیب پر جمع کیا ہو یعنی ایک صحابی کی تمام روایات ایک جگہ ہو خواہ کسی بھی باب سے متعلق ہو، اب صحابہ کی ترتیب میں کبھی تو افضل فالأفضل کا اعتبار کرتے ہوئے نام لاتے ہیں، اور کبھی

سبقت فی الاسلام یا حروف بھی کے اعتبار سے ذکر کرتے ہیں، عام طور پر تین سند زیادہ معروف و مشہور ہیں سند لام احمد، سند ابو داؤد طحاوی، سند حمیدی۔

**مشيخہ:** - اس کتاب حدیث کو کہیں کے جس میں صرف کسی ایک یا چند شیوخ کی احادیث جمع کر دی گئی ہوں۔  
**افراد:** - وہ مجموعہ حدیث جس میں کسی ایک شخص یا صرف کسی ایک شہر کے لوگ بیان کرنے میں متفرد ہوں۔  
**مستدرک:** - محدثین نے اپنی کتب حدیث میں جن شرطوں کو ملحوظ رکھ کر احادیث مرتب کی ہیں، پھر بھی ان شرطوں کے مطابق ہونے کے باوجود بہت سی احادیث ان کتابوں میں نہ آسکیں، ایسی احادیث کو بعد میں لوگوں نے جمع کیا، تو ایسے مجموعہ کو مستدرک کہتے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور مستدرک حاکم ہے جس میں انہوں نے ان روایتوں کو جمع کیا ہے جو صحیحین میں نہیں لیکن ان کے زعم کے مطابق وہ علی شرط الثمین ہیں۔

**مستخرج:** - وہ کتاب حدیث جس میں کسی بھی کتاب حدیث کو اپنی ایسی سند سے روایت کی جائے کہ اس کتاب کے مصنف کا واسطہ نہ آتا ہو، یہ کام مسلم شریف پر ہوا مثلاً مستخرج ابی عوانہ علی صحیح مسلم، مستخرج ابی نعیم علی صحیح مسلم، ان دونوں کے مصنف نے مسلم کی روایتوں کو ایسی سند سے نقل کیا ہے کہ اس میں امام مسلم کا واسطہ نہیں آتا۔

**جزء:** - وہ کتاب جس میں کسی خاص مسئلہ سے متعلق احادیث ہوں، جیسے جزء القراءۃ للبخاری، جزء رفع الیدین، جزء الجہر ببسم اللہ للندار قطنی، حضرت شیخ زکریا کی جزء حجة الوداع وغیرہ۔

## تحمل حدیث کی قسمیں

شیخ سے احادیث حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں، اپنے شیخ سے احادیث حاصل کرنے کو محدثین کی اصطلاح میں تحمل کہتے ہیں اور ان کی پانچ قسمیں ہیں

(۱) **قراءۃ علی الشیخ:** - اس سے مراد وہ طریقہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شاگردوں کو الفاظ حدیث پڑھے اور استاذ نے، اس صورت میں شاگرد جب روایت کہیں اور بیان کرے گا تو "اخبرنی"، "انبانی"، "قرأت علیہ" کے صیغے استعمال کرے گا، اور اگر پوری جماعت شریک درس رہی تو صیغہ جمع یعنی "اخبرنا"، "انبانا" کہنا ہوگا، بعض حضرات نے دونوں میں فرق کیا ہے کہ جماعت سے جو شخص پڑھ رہا ہو وہ تو "اخبرنا" کہے اور جو تنہا رہے ہیں وہ "انبانا" کہیں گے۔

(۲) **السماع:** - اس سے مراد یہ ہے کہ الفاظ حدیث استاد پڑھے اور شاگرد نے اس کو سماع عن الشیخ سے تعبیر کرتے ہیں، اس صورت میں شاگرد کیلئے "حدثنی"، "اخبرنی"، "سمعت فلاناً" کے صیغے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

یہاں ایک اختلاف یہ ہے کہ "سماع" اور "قرأت علی الشیخ" ان دونوں میں سے کون سا طریقہ افضل ہے؟ حضرت امام شافعی اور امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ سماع کو افضل قرار دیتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ قرأت علی الشیخ کو افضل کہتے ہیں، بظاہر یہ فکھن عطا نظر آتی ہے کہ اگر تلاوت میں شاگرد غلطی کرے تو استاد اس کو ٹوک سکتا ہے اور اگر شیخ

پڑھے تو ممکن ہے شاگرد کی توجہ میں کمی آجائے، اور اس کے علاوہ اگر شیخ سے سبقت لسانی ہو گئی تو شاگرد شیخ کی ہیبت کی وجہ سے ان کو نہ ٹوکے اور وہ غلطی اپنی جگہ باقی رہ جائے۔

قول فیصل وہ بات ہے جو حافظ ابن حجرؒ اور حافظ سخاویؒ نے بیان کیا ہے کہ اصل ہے اسکاں غلطی سے بچنا، اور حالات مختلف ہو ا کرتے ہیں جہاں جو شکل مامون عن الخطا ہو وہاں وہی اتویٰ اور افضل ہو گا لہذا فیصلہ یکطرفہ نہ ہونا چاہئے۔

محققین اور مآخِرین کے درمیان ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ جب زمانہ قدیم سے قرأت علی الشیخ اور سماع دونوں طریقے رائج ہیں تو جب شاگرد دوسروں کے سامنے حدیث نقل کرے تو کن الفاظ کے ذریعہ؟ کیا دونوں صورت کے لئے ہر کوئی لفظ استعمال کر سکتے ہیں یا الگ الگ الفاظ؟

مآخِرین کہتے ہیں سماع عن الشیخ کی صورت میں لفظ حدیث استعمال کرنا ہو گا، اور قرأت علی الشیخ کی صورت میں اخبارنا، یہی مسلک امام شافعیؒ، اکثر محدثین، ابن جریجؒ، اوزاعیؒ، ابن وہبؒ، امام نسائیؒ اور امام مسلمؒ کا ہے، ان حضرات کے یہاں ان دونوں کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرنا جائز ہی نہیں۔

محققین جن میں ابن شہاب زہریؒ، امام مالکؒ، سفیان بن عیینہؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، امام بخاریؒ اور اکثر اہل حجاز اور اہل کوفہ، ان حضرات کا خیال ہے کہ حدیث اور اخبارنا کے درمیان کوئی فرق نہیں، ایک کو دوسرے کی جگہ پر بلا تاویل استعمال کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں امام مسلمؒ نے انتہائی احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ ہر میثقہ کو اپنے اپنے موقع پر ہی استعمال کیا ہے چنانچہ استاد نے پڑھا اور سننے والا ایک شاگرد ہو تو حدیثی، اور پوری جماعت ہو تو حدیث کہتے ہیں، اور اگر شاگرد پڑھے استاد نے اور شاگرد تنہا ہو تو خبری، اور پوری جماعت ہو تو اخبارنا کہیں گے، پھر اختصار کی بنا پر عام محدثین حدیثی کے بجائے حدیثی، محدثنا کے بجائے ثناء، اخبارنا کے بجائے انباءنا کے بجائے نبأ لکھتے ہیں۔

(۳) المراسلة او المکاتبة: یعنی استاد و شاگرد میں سے کوئی کسی کے سامنے روایت نہ پڑھے نہ سنے،

بلکہ کوئی استاد خط میں کوئی حدیث لکھ کر کسی کے پاس بھیج دے اس صورت میں یہ اختلاف ہے کہ ایسے خط میں روایت پڑھ کر شاگرد کے لئے کب روایت بیان کرنا درست ہو گا؟ ایک قول یہ ہے کہ جب تک اس میں صراحۃً اس روایت کو شیخ کے واسطے سے نقل کرنے کی اجازت نہ ہو اس وقت تک جائز نہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ صراحۃً اجازت کا ہونا ضروری نہیں البتہ حدیثی، اخبارنی کا لفظ استعمال نہیں کر سکتا بلکہ "کاتبنی"، "کتبت الی یا ارسل الی" استعمال کرنا ہو گا۔

المناولة: یعنی شیخ اپنے شاگرد کو اپنی روایات کا مجموعہ سپرد کر دے، یہاں بھی بعض حضرات کے بقول شیخ کی صریح اجازت کے بعد ہی اس کو نقل کرنا جائز ہو گا لیکن معتد بات یہ ہے کہ شاگرد کو اگر یقین ہو کہ روایت بیان کرنے کیلئے ہی شیخ نے دیا ہے تو اس کے لئے بیان کرنا درست ہے، البتہ حدیثی وغیرہ کے لفظ کے بجائے ناولنی کہنا ہو گا۔

الوجادة: یعنی کسی شیخ کی روایات کا وہ مجموعہ جو خود اس شیخ کے بجائے کسی دوسرے اور طریقہ سے حاصل ہو جائے، تو اس کے بارے میں بیشتر محدثین کا مسلک ہے کہ اس سے روایت کرنا جائز نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے موضوع



روایت، یا معلول روایت کو یاد رکھنے کے لئے لکھا ہو، بعض یہ کہتے ہیں کہ اگر شیخ کے خط پر اعتماد ہو تو "وجدت بخط فلان" کے الفاظ کے ذریعہ روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں  
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کا مقدمہ فتح المسلم قائل دید ہے انہوں نے نقل کیا ہے کہ سلم شریف میں بطریق و جاہدہ روایت مروی ہے۔

## تدوین حدیث کب اور کس طرح

حدیث کا اتنا بڑا ذخیرہ کب اور کس طرز میں تدوین ہوا، اور کتابت حدیث کا سلسلہ کب شروع ہوا، تدوین حدیث کے یہ وہ پہلو ہیں جن کا ہر طالب علم کو جاننا ضروری ہے۔

کتب احادیث میں جب ہم صحابہ کرام کی تدوین حدیث کی انفرادی کاوشوں کو دیکھتے ہیں تو یقین ہوتا ہے کہ کتابت حدیث اور تدوین حدیث کی دلیغ بیل عہد رسالت، اور خلفاء اربعہ عی کے زمانہ میں پڑ چکی تھی، چنانچہ احادیث کی ایک معتد بہ تعداد خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے املاء کرائی ہے، یا پھر آپ کی ہدایت پر تحریری شکل میں محفوظ کی گئی، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں

(۱) حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کا ایک مجموعہ "کتاب الصدقہ" نامی املاء کرایا، جس میں زکوٰۃ، عشر، صدقات وغیرہ کے احکامات تھے ابھی آپ گورنروں کے پاس ارسال نہ فرما سکے کہ دنیا سے رحلت فرما گئے اس مجموعہ حدیث پر حضرت ابو بکرؓ نے ان کے بعد حضرت عمرؓ نے عمل کیا، ان کے انتقال کے بعد ان کے دو صاحبزادے حضرت عبد اللہ، اور حضرت عبید اللہ کے پاس وہ مجموعہ پہنچا، پھر وہی مجموعہ حضرت عمرو بن عبد العزیز کے پاس پہنچا پھر ان سے حضرت سالم نے اخذ کیا اور ان سے حضرت ابن شہاب زہری نے حاصل کیا، اس مجموعہ کے بارے میں حضرت ابن شہاب زہری کہا کرتے تھے کہ یہ متن اس مجموعہ کا ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے املاء کرایا ہے، اور اس کا اصل مخطوط حضرت ابن عمرؓ کے لڑکوں کے پاس ہے اور حضرت سالم نے حضرت عبد اللہ سے اس کی ایک نقل حاصل کی تھی وہی نقل میرے پاس ہے۔ (۱)

(۲) ۱۰ھ میں جب نجران فتح ہوا تو آپ نے عمرو بن حزم کو وہاں کا گورنر متعین فرمایا اور حضرت ابی ابن کعب کے ذریعہ تفصیلی خط لکھوا کر گورنر کو ارسال فرمایا اس میں طہارت، نماز، عشر، زکوٰۃ، حج، عمرہ، جہاد، مالی غنیمت، ویت وغیرہ سے متعلق احکام و مسائل تھے ان کے انتقال کے بعد وہ مجموعہ ان کے پوتے حضرت ابو بکر کے پاس رہا، ابن شہاب زہری نے بھی وہ مجموعہ ان سے پڑھا بلکہ اپنے شاگردوں کو پڑھایا کرتے تھے اس نوشتہ کے جتنے جتنے کلمے احادیث و سیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔ (۲)

(۳) مدینہ منورہ سے دور بسنے والے قبائل جب مشرف باسلام ہوتے تو اپنے وفود حضور اکرم کی خدمت میں بھیجتے، یہ وفود

اکثر مضمون ہر جب تدوین حدیث کے لئے محرکۃ اللہ کتاب حضرت مناظر احسن گیلانی کی کتاب "تدوین حدیث" تو دیکھئے اکثر مضمون وہیں سے ماخوذ ہیں۔ (۱) حجیت حدیث ص ۱۳۶، (۲) الوثائق السياسية فی الاسلام ص ۱۰۹۔

یہاں اگر اسلامی تعلیم و احکام حاصل کرتے اور وطن واپسی کے موقعہ پر درخواست کرتے کہ ان کے قبائل کے لئے کچھ ضروری دستور حیات لکھوادیں آپ ان کی درخواست قبول فرماتے اور وہ امور الماکروادیعہ جو ان کے لئے موزوں و مناسب ہوتے چنانچہ وائل بن حجر کا واقعہ مذکور ہے کہ جب یمن سے تشریف لائے تو وطن واپس ہونے سے قبل درخواست پیش کی اکتب لی ہالی کتاباً یعنی میرے لئے ایک صحیفہ لکھوادیتجئے جس میں میرے قبیلے کے لئے خطاب ہو۔ (۱)

(۲) اسی طرح مقد بن حیان جب مشرف باسلام ہوئے تو ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستاویز عنایت فرمایا جس سے ان کا پورا قبیلہ عبدالقیس مسلمان ہوا۔ (۲)

(۵) فتح مکہ کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تفصیلی خطبہ دیا جس میں انسانی حقوق پر مشتمل کئی احکامات شامل تھے، مجمع میں ایک یمنی شخص جس کا نام ابو شاہ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ خطبہ ان کے لئے تحریری شکل میں مہیا کر دیا جائے، چنانچہ آپ نے فرمایا ”اکتب لابی شاہ“ (۳) مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات، احادیث مبارکہ حسب موقعہ الماکرائے ہیں تاکہ محفوظ ہو جائیں۔

اس کے بعد اب دیکھیں کہ صحابہ کرام نے انفرادی طور پر تدوین احادیث کی کیا کوششیں کیں،

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں جس قدر احادیث سنتا تھا ان کو لکھ لیا کرتا تھا کچھ قریشی بھائی نے مجھے نوکا، کہ آپ سے بہت سی باتیں غصہ کی حالت میں نکلتی ہیں اس لئے نہ لکھا کرو، میں ان کے کہنے پر رک گیا مگر بعد میں جب میں اس کا تذکرہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ لکھا کرو، کیونکہ اس زبانِ رسالت سے کسی بھی حالت میں ناحق بات نہیں نکل سکتی، اس کے بعد تو ان کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا جس کا نام انہوں نے ”الصادقہ“ رکھا تھا۔ (۴)

حضرت ابو ہریرہؓ جن کا شمار مکثرین صحابہ میں ہے اور ان کی تعداد روایت ۵۳۷۷ ہے، فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ احادیث کسی کے پاس نہیں ہوئے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے، اور وجہ یہ ہے کہ وہ لکھ لیا کرتے ہیں اور میں لکھتا نہیں۔ (۵) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس صحیفے کا نام ”الصادقہ“ اس لئے رکھا تھا کہ ان کے پاس ایک اور صحیفہ تھا جس کا نام انہوں نے ”الصحیفۃ الیرموکیۃ“ رکھا تھا، چونکہ یرموک سے ان کو اسرائیلیات کے کچھ ذخیرے ہاتھ لگ گئے تھے، جبکہ اسرائیلیات صحیح اور جھوٹ کا مجموعہ، اور اس کی بابت فرمانِ رسول لَانْصَدُقَ وَلَا نَكْذِبُ وارد ہے اس کے برعکس احادیثِ رسول تمام سچی، اسلئے اس کا نام الصادقہ رکھا تاکہ احادیثِ رسول کا مجموعہ اس صحیفہ سے ممتاز ہو جائے۔ (۶)

ابن اثرقا بیان ہے الصادقہ میں ایک ہزار احادیث تھیں۔ (۷)

”لیکن یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ تب تو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مقابلہ میں حضرت عمرو بن العاص کی

(۱) طبقات ابن سعد ص ۲۸/۱، (۲) نووی ص ۳۳، (۳) بخاری ص ۱/۲۲، (۴) (۱) ابو داؤد شریف ص ۱۳/۱، (۵)

بخاری ص ۱/۲۲، (۶) فتح الباری (۷) اسد الغابہ باب العین ص

مرویات زیادہ ہونی چاہئے، حالانکہ ان کی مرویات اتنی نہیں ملتیں اس کی کیا وجہ ہے؟  
حافظ ابن حجر نے اس کے مختلف جوابات نقل کئے ہیں

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے الفاظ الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو میں الاستثناء منقطع ہے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مجھ سے زیادہ کسی کے پاس روایت نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کتابت حدیث کیا کرتے ہیں اور میں نہیں کرتا، لہذا ممکن ہے کہ ان کی احادیث زائد ہو جائیں، البتہ ان کے علاوہ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں میرے پاس سب سے زیادہ روایت ہے۔

(۲) اور اگر استثناء کو متصل مان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ واقعہ ان کے پاس مجھ سے زائد احادیث ہیں مگر اس وضاحت کے بعد سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر ان کی مرویات کم کیوں ملتی ہیں؟

تو ان کی مرویات کے کم منقول ہونے کی یہ وجہ ذکر کی جاتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ مرکبِ علم میں رہے اور اہل علم تلاشِ علم میں مدینہ منورہ آتے رہے اس لئے ان کی مرویات پھلتی رہیں جبکہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کا قیام مصر، طائف، شام میں رہا، جہاں طالبانِ علم حدیث کی آمد اس دور میں کم تھی نیز ان کا اشتغال بالعبادۃ تعلیمی مشغولیت کے مقابلہ میں زیادہ تھا اس بنا پر ان کی مرویات نہ پھیل سکیں۔

حافظ ابن حجر نے ایک وجہ اور لکھی ہے کہ فتح شام کے موقع پر ان کو اہل کتاب کے کچھ مخالف مل گئے تھے جن کا وہ مطالعہ کرتے اور کچھ مضامین بھی لکھ لیتے تھے، ان کے اس طرزِ عمل پر بہت سے تابعین نے ان سے احادیث اخذ کرنا چھوڑ دیا بہر حال صحیفہ صادقہ ان کے انتقال کے بعد ان کے پڑپوتے حضرت عمرو بن شعیب کے پاس منتقل ہوا جس کی سند بہت ہی مشہور اور قدرے مشکل ہے، ان کے پڑپوتے عام طور پر عن ابیہ عن جددہ کے ذریعہ نقل کرتے ہیں، حافظ ابن حجر نے امام یحییٰ بن معین، علی بن مدینی کا قول نقل کیا ہے کہ جو حدیث بھی عن عمر بن شعیب عن ابیہ عن جددہ کی سند سے آئے، تو سمجھنا چاہئے کہ صحیفہ صادقہ سے ہے۔“ م (۱)

(۲) امام حاکم نے مستدرک میں، اور علامہ ابن عبد البر نے حضرت حسن بن عمرو کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے ایک حدیث بیان کی، تو انہوں نے ناواقفیت ظاہر کی میں نے کہا کہ یہ حدیث تو میں نے ہی آپ سے سنی ہے اس پر حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان فرمایا کہ اگر میں نے بیان کی ہوگی تو میرے پاس لکھی ہوگی چنانچہ اندر جا کر وہ صحیفے لائے، جن میں احادیث درج تھیں تلاش کے بعد وہ حدیث مل گئی۔

یہاں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بخاری شریف کی روایت ابھی گزری جس سے معلوم ہوا کہ وہ حدیث نہیں لکھتے تھے، جبکہ یہاں لکھنے کا تذکرہ ہے۔

علامہ ابن عبد البر نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ بخاری شریف کی روایت جس کے راوی امام ہیں، وہ اصح ہیں جبکہ مذکورہ روایت ضعیف ہے لہذا یہ روایت متروک ہوگی۔

دوسرا جواب: یہاں دو دفع تباہی ممکن ہے ہاں طور کہ حضور کے زمانہ میں نہ لکھتے تھے بعد میں جب خیال پیدا ہوا کہ کہیں نسیان طاری ہو جائے، اور بھولی جاؤں تو آخر عمر میں لکھ لیا تھا۔ (۱)

(۳) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بخاری کی روایت سے جب معلوم ہوا کہ نہیں لکھتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود نہیں لکھتے تھے اور جہاں مکتوب صحیفہ کا تذکرہ ہے تو وہ کسی نے لکھ دیا ہوگا۔

(۳) حضرت انس بن مالک جن کو دس سال تک خدمت رسول کا ذریعہ موقع ملا، انہوں نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تحریر کر لی تھیں آپ کے ایک شاگرد حضرت سعید بن ہلال کہتے ہیں کہ جب ہم حضرت انس بن مالک سے بہت اصرار کرتے تو آپ ہمارے پاس تحریری صحیفے لاتے اور فرماتے یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی، اور پھر لکھ لیں اور پھر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تصدیق کے لئے پیش بھی کر چکا ہوں۔ (۲) نکر انس "م

(۴) یہ بات تو بہت معروف و مشہور ہے کہ حضرت علی کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا، حضرت تمام بخاری نے چھ مقامات پر اس مسودہ کا ذکر کیا ہے ان تمام مقامات کے مجموعی مطالعہ سے واضح ہوتا ہے وہ مسودہ ضخیم تھا، اس میں قصاص، دیت، فدیہ، اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق اور وراثت کے کچھ مخصوص مسائل اور عروث پر زکوٰۃ کے چند مسائل مندرج تھے۔ (۳)

غرض دور صحابہ میں جمع احادیث کی کاوشیں ہوئی ہیں محبت نبوی سے براہ راست فیض یافتہ اسرار شریعت کے سمجھنے والے صحابہ کرام نے کیف بالحق احادیث لکھ لیا کرتے تھے، بطور مثال چند کا ذکر کیا گیا اور نہ تو دور بھی صحابہ کے اسلا گرامی اس فہرست میں شامل ہیں۔

### ﴿دور تابعین میں﴾

"تابعین کا جم غفیر صحابہ کرام کا شاگرد بنا، اور علم حدیث کے لئے ان کے سامنے مدت دراز صرف کردی اور ان سے حاصل کردہ روایتوں کو قلم بند کرنا شروع کیا حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگردوں نے اس کا خاص اہتمام کیا تھا، ان میں ایک حضرت بشر بن ہبیک ہیں اور ایک حضرت امام بن منبہ ہیں۔

حاجی خلیفہؒ نے ان کے صحیفہ کا نام الصحیفۃ الصحیحہ ذکر کیا ہے، حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے ان کی پوری روایات اپنی مسند میں نقل کی ہے (۴) حضرت امام مسلمؒ نے اس صحیفہ سے چند احادیث نقل کی ہے چنانچہ اس کی جب کوئی روایت نقل کرتے ہیں تو فرماتے ہیں

عن ہمام بن منبہ، قال هذا ما حدثنا به ابو ہریرۃ عن رسول اللہ ﷺ فنکر احادیث منها وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۵)

حضرت بشر بن ہبیک کے متعلق امام داری نے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں جو کچھ حضرت ابو ہریرہؓ سے سنا تھا

اسے لکھ لیتا تھا، ایک دفعہ میں نے ان کی خدمت میں وہ مجموعہ پیش کیا اور عرض کیا کہ وہ یہ احادیث ہیں جو میں نے آپ سے سنی ہیں تو حضرت ابو ہریرہؓ نے اسکی تصدیق فرمائی۔ م

عہد تابعین کے مشہور خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ احادیث نبویہ جو صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ ہیں اور جن کو صحابہ نے گراں قدر سرمایہ سمجھ کر اپنے سینوں میں محفوظ کر رکھا ہے ظاہر ہے کہ ان کی رحلت کے بعد وہ احادیث بھی ان کے ساتھ مدفون ہو جائیں گی اس لئے انہوں نے ۹۹ھ میں اپنے زیر مملکت گورنر کے نام فرامین جاری کئے کہ احادیث رسول کو جمع کیا جائے اس سلسلہ میں بخاری شریف میں ان کا ایک خط ان الفاظ میں منقول ہے، انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكثبه فاني خفت دروس العلم وذهاب العلماء۔ (۱)

”موظا امام مالکؒ میں سنت رسول کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کو بھی جمع کرنے کا حکم ہے حافظ ابو نعیم اصفہانی نے تاریخ (اصفہانی) میں لکھا ہے: کتب عمرو بن عبد العزیز الى الآفاق انظروا حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجمعوه۔

ان خطوط پر پہلی صدی کے اختتام پر اس وقت کے حاملین احادیث اور محدثین نے احادیث جمع کیا ان جمع کرنے والوں میں دو نام زیادہ معروف و مشہور ہیں ایک ابن شہاب زہری کا، جن کا پورا نام محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری ہے، اور یہ حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت سہل بن سعد، اور حضرت انس بن مالک کے شاگرد ہیں، اور خود ان کے شاگردوں میں حضرت معمر، اوزاعی، لیث اور حضرت امام مالک کا اسم گرامی شامل ہے ان کی ولادت ۵۵ھ میں، اور وفات ۱۵۳ھ میں ہوئی۔ علامہ ابن عبد البر نے امام زہری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہمیں (عمر بن عبد العزیز) نے مدین حدیث کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، پھر حضرت عمر نے مملکت کے ہر خطے میں ان دفاتر میں ایک دفتر بھیج دیا۔

دوسرا مشہور نام حضرت ابو بکر ابن حزم کا ہے یہ ابن شہاب کے ہم عصر ہیں، اور مدینہ منورہ کے گورنر تھے، انہوں نے بھی حدیث کی کئی کتابیں لکھیں لیکن حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے پاس نہ پہنچا سکے کہ حضرت عمر کا ۱۰۱ھ میں انتقال ہو گیا۔ ”م مدون اول کون؟

اب یہاں یہ بات اختلافی بن گئی کہ ان دونوں میں مدون اول کون ہیں؟ اکثر حضرات محدثین کا میلان ابن شہاب زہری کی طرف ہے، مثلاً حضرت امام مالکؒ، ابن حجرؒ، علامہ سیوطی وغیرہ، تاہم امام بخاری کی رائے ابو بکر ابن حزم کی طرف ہے، لیکن ابھی ابن عبد البر کے حوالہ سے امام زہری کا جو قول نقل کیا گیا ہے کہ ہم نے مجموعہ بھیج دیا اور انہوں نے ہر خطہ میں ار سال فرمایا تو اس سے جمہور کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ ابن شہاب مدون اول ہیں۔

بعض کتابوں میں دیگر محدثین کو بھی مدون اول قرار دیا گیا ہے، علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ در حقیقت یہ اختلاف اقوال حیثیت کے اعتبار سے ہے یعنی ہر ایک کو مدون اول کہہ سکتے ہیں تاہم اعتباری فرق کے ساتھ کہ کوئی تو

مطلقاً جمع حدیث میں اولیت کی شان رکھتا ہے، تو کوئی ابواب کی ترتیب کے ساتھ جمع کرنے میں اول ہے تو کوئی مرتبہ صحابہ کے اعتبار سے جمع کرنے میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے اسی کو انہوں نے اپنے اشعار میں جمع کیا ہے

اول جامع الحدیث والاثار      ابن شہاب آمر لہ عمر  
واول الجوامع للابواب      جماعة فی العصر ذواقتراب (الفیہ سیوطی)

## دوسری صدی

”پہلی صدی میں تدوین حدیث کا جو کام ہوا وہ کیف بالتحقق تھا، عام طور پر وہ صحیفے موضوعاتی ترتیب پر نہ تھے، لیکن جب دوسری صدی کا آغاز ہوا تو اس میں مزید پیش رفت ہوئی، اور بہت ہی اہتمام کے ساتھ یہ کام ہوا اس صدی میں ترتیب شدہ کتب حدیث کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد موضوعات کے لحاظ سے مرتب ہوئیں، ہاں بعض ایسی بھی ہوئی جو بغیر موضوع کے مرتب ہوئی، لیکن قدرے مشترک، ہر ایک میں یہ بات ضرور تھی کہ اس میں صرف صحیح احادیث نہ تھیں بلکہ صحابہ کے اقوال و فتاویٰ بھی مخلوط کر دئے گئے۔

اس صدی میں مدون ہونے والی کتب حدیث کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان میں سے اب اکثر اس لئے نہیں پائی جاتیں کہ ان میں کی اکثر و بیشتر بعد میں مرتب ہونے والی بڑی ضخیم کتب حدیث میں منظم ہو گئیں، اور وہ ضخیم کتب حدیث تفصیلی اور جہتی بر ضرورت ہونے کی بنا پر اس طرح وسیع پیمانے پر مقبول عام ہوئیں کہ ان حضرات کی کاوشیں منظر عام پر نہ آ سکیں، ان میں بعض جو مطلوبہ ہیں ان کی فہرست یہ ہے.....

### (۱) کتاب الآثار لابی حنیفہ :

سب سے پہلی دفعہ امام ابو حنیفہؒ نے چالیس ہزار احادیث میں سے منتخب کر کے یہ کتاب فقہی ترتیب پر مرتب کی، یہ کتاب موطا امام مالک سے مقدم ہے اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ حضرت امام مالکؒ نے حضرت امام صاحب کی تالیف سے استفادہ کیا ہے، حافظ ذہبی نے مناقب میں قاضی ابوالعباس محمد بن عبداللہ بن ابی العوام کی ”اخبار ابو حنیفہ“ کے حوالہ سے سند متصل کے ساتھ مشہور محدث عبدالعزیز زور اور دی کا یہ قول نقل کیا ہے کان مالک ینظر فی کتب ابی حنیفہ ویستفیع بہا۔ علامہ سیوطیؒ نے حموض العرفہ میں لکھا ہے کہ علم حدیث میں امام ابو حنیفہؒ کی یہ فضیلت کچھ کم نہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے ابواب فقہیہ پر مرتب کتاب تالیف کی، یہ فضیلت کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی۔

### (۲) موطا امام مالک :

جب یہ تالیف ہوئی تو اس کو ”اصح الکتاب بعد کتاب اللہ“ کہا جانے لگا اسکے بعد بخاری شریف کو یہ خطاب ملا۔

### (۳) مصنف ابن عبد الرزاق :

میار و جلدوں میں شیخ حبیب الرحمن اعظمیؒ کی تحقیق کیساتھ چھپ چکی ہے۔

### (۴) کتاب الزهد والرقائق :

خراسان میں حضرت عبداللہ بن مبارک نے لکھی، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

## (۵) کتاب الأم للشافعی

(۶) السنن لابن جریر : یہ سب سے پہلے مکہ میں مرتب ہوئی

(۷) مسند ربیع بن صبیح : حضرت ربیع بن صبیح نے بصرہ میں سب سے پہلے مسند لکھی جن کا حرا

بمروج شہر سے ۱۲/ کلومیٹر دور بھار بھوت مقام پر ہے۔

(۸) جامع سفیان ثوری : کوفہ میں سب سے پہلے یہ مرتب ہوئی۔

غرض دوسری صدی کے محدثین کی یہ وہ کاوشیں ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کا کام تیسری صدی میں نہیں بلکہ پہلی اور دوسری صدی میں شروع ہو چکا تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ رسالت کے بعد ہر دور میں تسلسل کے ساتھ کام ہوتا رہا اور مختلف مدارج طے کرتا ہوا اب موجودہ شکل میں آیا۔ "م

## تیسری صدی

"تدوین حدیث اس صدی میں اپنے شباب اور عروج کو پہنچی حدیث کی سندیں طویل ہوئیں کئی کئی سندوں سے روایت نقل ہونے لگیں، اور نئی نئی ترتیب اور نسخ پر کتب حدیث مرتب ہونے لگیں، اسی دور کی کاوشیں صحاح ستہ، مصنف ابن ابی شیبہ، المستدرک للحاکم، المعجم طبرانی، سنن دار قطنی وغیرہ قابل ذکر ہیں،

مذکورہ کتب حدیث میں نمایاں اسلوب سب سے پہلے امام بخاری نے اختیار کیا ذخیرہ احادیث سے صرف ان احادیث کا انتخاب کیا جو محدثین کی اصطلاح میں صحیح ہوں جبکہ اس سے پہلے کی کتب، صحیح اور غیر صحیح کا مجموعہ تھیں بغیر علم رواقہ کے اندازہ لگانا مشکل تھا، اگر رواقہ کا علم نہ ہوتا تو اپنے اساتذہ سے رجوع کرتے اور جس کو یہ بھی میسر نہ ہوتا تو وہ مجہول الحال روایت سمجھی جاتی لیکن امام بخاری نے امت کو سب سے پہلے اس الجھن سے نجات دی ان کے بعد امام مسلم نے اس اسلوب کو اختیار فرمایا۔

غرض تدوین حدیث کے مختلف ادوار ہوئے پہلا تدوین علی الاطلاق رہا، جس میں بلا کسی خاص ترتیب و مضمون کے ہر نوع کی حدیثیں نقل کی گئیں، یہ پہلی اور دوسری صدی کے اوائل میں پیش آئی۔

دوسرے تدوین علی الابواب کا ہے یعنی احادیث کے مخلوط ذخیروں میں سے ہر مضمون کی حدیثیں الگ الگ منتخب کر کے علیحدہ علیحدہ باب میں ترتیب دی گئیں جیسا کہ دوسری صدی کے وسط میں یہ کام ہوا۔

تیسرے تدوین علی الصحاح کا ہے جس میں صرف احادیث صحیحہ کو مستقیم سے الگ کر کے لکھا گیا یہ تیسری صدی کے اوائل میں پیش آیا۔ "م

## حفاظت حدیث کے اسباب

جس طرح کلام الہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود باری تعالیٰ نے ہی اور اعلان فرمایا انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون اسی طرح حق تعالیٰ نے حدیث نبوی کی حفاظت کا انتظام فرمایا، کیونکہ معانی قرآن کا دوسرا نام حدیث ہے، حفاظ قرآنی کی حفاظت کے ساتھ معانی قرآن کو محفوظ نہ کیا جاتا تو نفس قرآن سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اس لئے اس

کی بھی حفاظت کے انتظام فرمائے، خدا نے حفاظت حدیث کے لئے جو اسباب پیدا فرمائے ان کی بنیاد صرف دو ہے :

(۱) خدا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں کشش و جاذبیت کے اس قدر جوہر ودیعت کر دیئے کہ آپ صحابہ کی نگاہ میں دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب ہو گئے اور آپ کی بات دنیا کی بہترین اور قیمتی نعمت بن گئی۔

نیز آپ کی ایسی امتیازی شان کہ خدا نے ہر لحاظ سے بلند و بالا، اور اشرف و کامل بنایا، حتیٰ کہ خاندانی اور سماجی اعتبار سے بھی مکرم و معزز بنایا، یہ وہ دو باتیں ہیں کہ آپ کی عام خوبیاں تو درکنار دوسرے انسانوں کی وہ چیزیں جو قابلِ تکرار ہوتی ہیں اگر وہ آپ کی ہوں تو اس میں بھی غیر معمولی جاذبیت ہو گئی، اور امت کے حق میں باعثِ فخر بن گئیں

چند مثالیں ملاحظہ ہوں :.....

حضرت ابو عبیدہؓ کو حضرت انس کے ذریعہ ایک موعے مبارک ہاتھ آگیا، تو فرمانے لگے لان تکون عندی شعرة منها احب الی من الدنيا وما فیہا۔

آپ کے جسم اطہر سے جو پسینہ نکلتا تھا اس میں عطر کی خوشبو محسوس ہوتی، ایک صحابیہؓ رسول آپ کے پسینہ مبارک کو جمع کر رہی تھیں، آپ کے پوچھنے پر انہوں نے عرض کیا کہ مدینہ کی خوشبو میں آپ کے پسینہ مبارک کو ملا دیتی ہوں، تو وہ عطر تمام عطوروں سے زیادہ عمدہ اور نفیس ہو جاتا ہے صحابہ کرام کا بیان ہے کہ جس گلی سے آپ کا گذر ہوتا وہ خوشبو سے مہکے لگتی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بلغم تھوکتے تھے تو صحابہ کرام کی محبت و عشق کا اندازہ لگائیے کہ زمین پر اس کو گرنے نہیں دیتے بلکہ اپنے چہرے اور ہاتھ پر مل لیتے تھے، جب وضو فرماتے تو جسم اطہر سے گرنے والے پانی کے لئے صحابہ ایک دوسرے سے سبقت کرتے۔

صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ آپ کے لعاب اور غسالہ تک اپنے جسم پر مل لیتے تھے۔

غرض جس جماعت کو اپنے محبوب کی ذات اقدس اور ان کے لعاب و ہال و غیرہ سے اتنی محبت اور عقیدت ہو ان کو آپ کے کلام مبارک سے کتنی محبت و عقیدت ہوگی؟ جب صحابہ نے ذات اقدس کی حفاظت کی تو خدا نے ان کے قلوب کو محبت سے اس قدر لبریز کر دیا کہ کلام رسول کی حفاظت میں مشغول و منہمک بلکہ مجبور ہو گئے۔

اور پھر کلام رسول سے کس درجہ عشق ہوا، اس کا اندازہ ان واقعات سے لگائیے

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیر حضرت عائشہؓ سے احادیث سن کر قلمبند کر لیا کرتے تھے واقعہ حرہ میں ان سے وہ مجموعہ گم ہو گیا تو حیرت و افسوس میں کہا کرتے لو ددت انی کنت فدیلتھا باہلی و مالی، یعنی کاش میں اہل و عیال و دیگر اس مجموعہ کو بچا لیتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ اپنی زندگی طلب حدیث میں وقف کر چکے تھے، اور طلب حدیث کے درمیان ان پر کیا کیا گزری؟ ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو، واللہ الذی لا الہ الا هو ان کنت لاعتمد علی الارض بکبدی من الجوع و اشد الحجر علی بطنی۔ خدا کی قسم بھوک کی وجہ سے جگر تمام کر زمین پر میں ٹیک لگا لیتا اور بھاری پتھر اپنے شکم پر باندھ لیتا، کبھی فرماتے کہ منبر رسول اور حجرہ حضرت عائشہؓ کے درمیان چکرا کر گر جاتا، لوگ یوں سمجھتے کہ میں پاگل ہو گیا ہوں



حالانکہ جنوں سے مجھے کیا تعلق؟ وہ تو صرف بھوک کا اثر ہوتا، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ جن کا مکان مدینہ منورہ میں تھا فرماتے ہیں کہ (کسی صحابی رسول) کے واسطے سے مجھے ایک حدیث پہونچی، میں نے سوچا کہ براہ راست وہ حدیث ان سے سنوں، چنانچہ میں نے ایک اونٹ خرید اور ایک ماہ مسلسل سفر کرتا ہوا ملک شام پہونچا وہاں حضرت عبد اللہ بن انصاری کے گھر پہونچ کر ایک آدمی کو بھیجا کہ ان سے کہو دروازہ پر ایک مسافر کھڑا ہے، انہوں نے اندر سے پوچھا کہ کیا جابر بن عبد اللہ ہیں؟ میں نے کہا ہاں! وہ باہر نکلے دونوں ایک دوسرے سے گلے لگے، اسکے بعد میں نے کہا کہ آپ کے واسطے سے مجھے ایک حدیث پہونچی ہے میں آپ سے براہ راست سننے آیا ہوں، انہوں نے پوری حدیث سنائی، سننے کے بعد یہ فوراً واپس لوٹ آئے اس سے اندازہ لگائیے کہ حدیث رسول سے کس قدر عشق و محبت تھی کہ طویل مسافت طے کرنا آسان تھا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ کبھی زبان پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آجاتا تو اِرْتَعَدَتْ اِرْتَعَدَتْ ثِيَابُهُ تَنْضَعُ اَوْ دَاجِيَةً اَعْرَوْرَقَتْ عَيْنَاهُ، یعنی کانپنے لگتے، کپڑوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی، گردن کی رگیں پھول جاتی، اور آنکھیں آنسو سے بھر جاتیں۔ (مسند رک حاکم) حضرت ابو ذرؓ بھی حدیث بیان کرتے ہوئے اوصافی حبیبی ابو القاسم، اوصافی خلیلی جیسے الفاظ کہتے اور چی مار کر بے ہوش ہو جاتے۔

ان واقعات کی روشنی میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محبت و عقیدت، اور عظمت و ہیبت کس قدر غالب تھی اور ان کے کلام کو یاد رکھنے اور بھولے ہوئے کو محفوظ کرنے کا کتنا شوق ان کے قلوب میں موجزن تھا، یہی وہ بنیادی سبب ہے جس نے کلام رسول کو ان ہی کے الفاظ میں محفوظ رکھا۔

اسی کیساتھ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھئے کہ جس قرآن نے اقوال و افعال کی اطاعت و اتباع کو ضروری قرار دیا تھا اسی قرآن نے اس کا بھی پابند بنادیا تھا کہ زبان رسالت سے جو کچھ سنو یا جو کچھ انہوں نے کیا اسے مسلسل پہونچاتے چلے جاؤ، بلکہ ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلے کو پیغام پہونچاتا رہے، میدان منیٰ میں ایک لاکھ سے زائد پر وازہ رسول کا مجمع ہے آپ نے درمیان خطاب فرمایا:

نَضَرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي شَيْئًا فَلْيَغْه كَمَا سَمِعَهُ قَرِيبَ مَبْلَغِ اَوْعَىٰ لَهُ مِنْ سَامِعٍ يَحْمِلُهَا: اَلَا فَلْيَبْلِغْ الشَّاهِدَ الْغَائِبَ بَلْكَ بَاہِرَ سَآءَ اَنِّ دَاوُدَ كُوْهُمُ بُوَا، اَحْفَظُوْهُنْ وَاخْبِرُوْهُنْ مِنْ وِرَآثِكُمْ، اور حدیث پاک من سئل عن علم ثم كتبه ألجم يوم القيامة بلجام من نار، میں بھی اسی حفظ و اشاعت کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ احادیث رسول کے یاد رکھنے اور پہونچانے میں محتاط رہنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے، اور ان کی فطرت میں مشہور حدیث من كذب على متعمداً فليتبوا مقعده من النار کے تہدید کی خوف کو اس طرح راسخ کیا گیا، کہ جتنے صحابہ سے یہ حدیث مروی ہے مشکل ہی سے چند احادیث کے سوا اس قدر کثیر تعداد میں صحابہ سے منقول ہو، تاکہ روایت کے یاد رکھنے کی پوری فکر ہو اور سناتے وقت ذمہ داری کا احساس ہو۔

### حفاظت حدیث کا دوسرا سبب

دوسرا سبب حفظ احادیث ہے، یہ طریقہ اس دور کے لحاظ سے بہت ہی قابل اعتماد ذریعہ تھا، حق تعالیٰ نے جن صحابہ کرام سے حفظ حدیث کا کام لیا ان کو غیر معمولی قوت حافظہ عطا فرمایا، بلکہ عمومی طور پر موزعین کہتے ہیں :

”مذهب العرب انہم کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذلك“

یعنی عرب کا عام طریقہ تھا کہ زبانی یاد رکھنا ان کی فطرت جیسی تھی

ایک مجلس میں صحابہ کرام تشریف فرما تھے ایک شاعر آیا اور کچھ اشعار پڑھ کر سنایا، اور پھر فوراً مروان بھی ہو گیا، حضرت ابن عباسؓ نے حاضرین سے پوچھا کہ فلاں مصرعہ شاعر نے کس طرح پڑھا؟ حاضرین نے کہا آپ صرف ایک شعر اس طرح پوچھتے ہیں جیسے بقیہ اشعار آپ کو یاد ہو چکے ہوں، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ پھر پورا قصیدہ سنایا۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ عبدالملک بن مروان نے حضرت ابو ہریرہؓ کے حافظہ کا امتحان لینا چاہا، انہیں بلا کر احادیث بیان کرنے کی درخواست کی، ادھر ایک کاتب کو بٹھا دیا کہ ان کی احادیث لکھتے رہو، حضرت ابو ہریرہؓ نے بہت سی احادیث سنائیں اور تشریف لے گئے اگلے سال عبدالملک ابن مروان نے ان کو دوبارہ بلوا کر کہا کہ جو حدیث آپ نے سال گذشتہ سنائی تھی اس سال بھی سنائیے، انہوں نے سنا شروع کیا تو کاتب کاپی سے ملتا رہا، کسی جگہ ایک حرف، ایک نقطہ کا بھی فرق نہیں ہوا بلکہ حسب سابق اسی ترتیب کے ساتھ سنایا، جب حضرت ابو ہریرہؓ تشریف لے گئے تو عبدالملک کے پوچھنے پر کاتب نے کہا ماغادر حرفاً، یعنی اتنے عرصہ کے بعد بھی سنانے میں ایک حرف کا بھی کوئی فرق نہیں پڑا، اس طرح کے واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان حضرات کو غیر معمولی حافظے من جانب اللہ اسی لئے عطا ہوئے تھے تاکہ ان سے حفاظت حدیث کا عظیم کام لیا جاسکے۔

### تابعین میں حفظ حدیث کا جذبہ

گذشتہ واقعات تو ان ستورہ صفات کے تھے جنہوں نے براہ راست نور نبوت سے استفادہ کیا تھا، لیکن جنہوں نے اپنی نگاہوں سے آپ کو نہیں دیکھا ان کے ذوق و شوق اور کلام رسول سے عشق کے واقعات تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں (۱) ابن سعد نے دمشق کے محدث عبدالرحمن ابن میسرہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ خواب میں ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو انہوں نے موقعہ کو غنیمت جان کر سرکارِ دو عالم ﷺ سے دعا کی درخواست کی یا نبی اللہ ادع لی ان اکون عقیلاً للحديث ووعاء له اس سے حفظ حدیث کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے کہ خواب میں بھی حفظ حدیث کا شوق مسلط ہے۔ (۲) ابو حاتم رازی جو عطل کے امام ہیں لکھا ہے کہ یہ کم عمری ہی میں طلب حدیث کے لئے وطن سے نکل پڑے اور لمبی مدت سفر میں رہے، علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا قول نقل کیا ہے اول ما رحلت اقمعت سبع سنین، یعنی پہلی بار جب گھر سے نکلا تو سات سال تک سفر میں رہا، خود ان کا بیان منقول ہے کہ شروع میں اس کا خیال رکھا کہ کتنے میل طے ہوئے تین ہزار میل تو میں گنتا رہا، لیکن پھر گنتا چھوڑ دیا، تاہم اطمینان تھا کہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنا لمبا سفر انہوں نے کیا، جبکہ خود ان کا بیان ہے کہ خرجت من البحرين الی مصر ماشياً ثم الی الرملة، ثم الی طرطوس ولی عشرون سنة، بحرین سے مصر، پھر رملہ، طرطوس تک پیدل سفر کیا اور اس وقت میری عمر میں سال تھی، علم حدیث کی حفاظت کے پیش نظر دشوار گزار راستوں کو طے کرنا کتنا مشکل ہو گا جبکہ موجودہ دور کی سبوتوں کا نام و نشان نہ تھا، لیکن یہ سب طلب حدیث کے جذبہ نے ان کے لئے آسان کر دیا تھا۔

مشہور محدث حضرت امام مالکؒ کے استاد حضرت ربیعہ الرائی کا یہ حال تھا کہ علم حدیث کی تلاش میں گھر کی چھت اور کڑیاں تک سچ دیں اور یہ حال بھی، ہوا کہ گرے پڑے کجور چن کر کھانے کی نوبت آئی، اسی طرح امام یوسف نے علم حدیث کے شوق میں گھر کی کڑی تک فروخت کر ڈالی۔

فن رجال کے امام یحییٰ بن معین کے والد دس لاکھ پچاس ہزار درہم چھوڑ کر وفات پائے، لیکن اتنی بڑی دولت کیا ہوئی؟ خطیب بغدادی لکھتے ہیں فانفقہ کلہ علی الحدیث حتی لم یبق له نعل یملبسہ۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بڑی تنگی میں علم حدیث حاصل کیا، لیکن اپنے استاد عبدالرزاق کی خدمت میں پہنچے وہاں ازار بند بن بن کر اپنی ضرورت پوری کرتے، جب علم حدیث حاصل کر لیا تو تانہائی کے کچھ روپے باقی رہ گئے تھے تو جو جو تاپہنے ہوئے تھے وہی اس کو دے دیا اور پیدل روانہ ہو گئے راستے میں بھی مزدوری کرتے اور زاد راہ حاصل کرتے، مذکورہ سارے واقعات تاریخ دمشق میں موجود ہیں ان کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ خداوند قدوس نے تابعین اور تبع تابعین کے دل میں علم حدیث کا ایسا شوق و جذبہ ڈال دیا تھا کہ ہر طرح کی دشواریوں کو جھیلنا آسان ہو چکا تھا۔

(نور) یہ ساری تفصیلات تدوین حدیث سے ماخوذ ہیں۔

### حدیث کی اہمیت

ہر دور میں علماء ربانین نے فن حدیث کو تفسیر سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فن حدیث در حقیقت قرآن کی تفسیر اور فقہ کا متن ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ثم ان علینا بیانہ۔ اس لئے حدیث کے بغیر نہ تو قرآن حل ہو سکتا ہے اور نہ ذخیرہ فقہ تیار ہو سکتا ہے، حدیث کی خدمت در حقیقت قرآن نہیں اور فقہ سازی کی خدمت ہے حدیث اگر کتاب اللہ کے اجمال کی تفصیل ہے تو فقہ حدیث کے اجمال کی تفصیل ہے، اس کو اس طرح سمجھنا چاہئے کہ کتاب اللہ اصل اور جڑ ہے اور تناسخ پر درخت کھڑا ہے وہ حدیث ہے اور پھول پتیوں کا پھیلاؤ فقہ ہے، گویا فقہ حدیث کا نتیجہ اور قرآن کا ثمرہ ہے یہ ثمرہ حدیث کے واسطے کے بغیر وجود میں آنا ناممکن تھا تو جس طرح اللہ اور بندوں کے درمیان رسول واسطہ ہے کہ ان کے بغیر بندہ خدا تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح کلام خدا اور کلام مجتہدین کے درمیان کلام رسول واسطہ ہے حدیث کے بغیر مجتہدین کے کلام کو خدا سے کوئی سند نہیں مل سکتی، اور جو طبقہ بھی حدیث کو ترک کرے گا نہ وہ قرآن تک پہنچ سکے گا اور نہ فقہ تک، اسکے پاس دین کی کوئی بھی اصل اور حجت باقی نہ رہ سکے گی، وہ بندہ حق ہونے کے بجائے بندہ نفس ہو گا۔

کیونکہ ”ثم ان علینا بیانہ“ کی عملی تعبیر ذخیرہ حدیث ہے کہ جس طرح حفاظ قرآن کی ذمہ داری خود اللہ نے لی اس کے معانی و مراد کی وضاحت بھی اپنے ذمہ لی، یہی معانی و مراد جو زبان نبوت سے نکلے احادیث کہلائی، تو جس طرح متن کو بغیر شرح حل کرنا دشوار ہوتا ہے قرآن بھی بغیر حدیث سمجھنا ناممکن ہے اگر حدیث کو قرآن سے خارج کر دیا جائے تو ذخیرہ فقہ ایسا ہی بے تعلق ہو جائے گا جیسے کہ درخت سے تناکو جدا کر دینے کے بعد شاخ اور پھل پھول جڑ سے بے تعلق ہو جاتے ہیں اور جس طرح شاخ، پتیاں اور تنہا، جز ایک دوسرے سے مربوط ہیں اسی طرح حدیث و قرآن اور فقہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم، اور ایک کو ماننا دوسرے کے ماننے کو مستلزم ہے۔

## مقدمة الكتاب

آغاز کتاب سے پہلے نفس کتاب کا تعارف کرانا از حد مفید معلوم ہوتا ہے، اس لئے کتاب سے متعلق چند باتیں قابل ذکر ہیں، اسم کتاب، وجہ تالیف، مرتبہ کتاب، شرائط مسلم، خصائص مسلم، تعدد اور دیات، مسلم کے ابواب و تراجم، امام مسلم کی اسانید، مسلم کے نسخے، شروحات مسلم، اور فضائل مسلم شریف۔

(۱) کتاب کا اصل نام "المسند الصحيح" ہے، خود امام مسلم اور حاکم سے یہ نام منقول ہے۔

(۲) وجہ تالیف :- امام مسلم کے رفیق درس اور تلمیذ احمد بن مسلمہ نے امام مسلم سے عرض کیا کہ مجھے ایک

ایسے جامع مختصر کی تلاش ہے جس میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر طرح کی مسند احادیث جمع ہوں، اور جو اعتقادی، فقہی، اور اخلاقی وغیرہ روایات پر مشتمل ہو، آپ اس قسم کا گلدستہ تیار فرمادیں البتہ وہ مختصر ہو تو بہتر، کیونکہ میں احادیث کو سمجھنے کے ساتھ مسائل کا استنباط بھی کرنا چاہتا ہوں، مبادا اگر لمبا ہو گیا تو میرے مقصد کے لئے مفید نہ ہو گا، امام مسلم نے ان کی درخواست کو بہت اہمیت دی اور فرمایا اگر مجموعہ مرتب ہو گیا، تو ہر دور میں مفید ثابت ہو گا، اور اس طرح امت کا ہر طبقہ اس سے فائدہ اٹھا سکے گا، جبکہ کثیر تعداد میں روایت جمع کرنے اور رطب دیا بس لکھنے سے علم حدیث کا مقصد پورا نہ ہو گا، تو اس درخواست پر امام مسلم نے یہ کتاب تالیف فرمائی۔

تاہم یہاں ایک سؤل یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام مسلم نے اختصار ہی کو قابل مفید کہا، جبکہ بعض محدثین نے ایسی کتاب مرتب فرمائی، جس میں کثیر تعداد میں روایات موجود ہیں، اور وہ بھی امت کے حق میں مفید ہے مثلاً مسند امام احمد میں چالیس ہزار احادیث ہیں جن میں دس ہزار مکرر ہیں، تو اس کا جواب خود امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں دیا کہ ان حضرات کا مقصد ان مخصوص لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے جن میں احادیث کے ضعیف ہونے کے اسباب و علل سے واقفیت کے ساتھ تحقیق و بیدار مغزی موجود ہو، ایسے حضرات اپنی صلاحیت کی بنا پر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن جن میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی اس سے فائدہ اٹھانا تو الگ کبھی غلبان کا سبب بن جاتا ہے۔

تعدد اور روایت :- امام مسلم کے سامنے تین لاکھ احادیث کا مجموعہ تھا، جن سے منتخب کر کے مسلم شریف مرتب کی، اس میں علامہ طاہر جزائری کے بقول حذف کمرات کے بعد چار ہزار احادیث ہیں شیخ ابن صلاح کی تحقیق بھی یہی ہے۔

علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ مسلم کی کمرات کا لحاظ کیا جائے تو صحیح مسلم کثرت طرق میں بخاری سے زائد ہے، چنانچہ خود احمد بن مسلمہ کا بیان ہے کہ اس میں بارہ ہزار احادیث ہیں ابو حنظل میاچی آٹھ ہزار ذکر کرتے ہیں، بعض حضرات نے آٹھ ہزار کو اقرب قرار دیا ہے (تدریب ص ۱۱۰۳) مسلم شریف آپ نے پندرہ سال میں لکھی۔

شرائط کتاب مسلم :- "امام مسلم نے اپنی کتاب میں حدیث لکھنے کے لئے جن شرطوں کو ملحوظ رکھا ہے وہ یہ ہیں (۱) وہ حدیث صحیح لذات ہو،

(۲) راویوں کے پانچ طبقہ میں سے صرف دو طبقہ کی روایت ہو، ہاں بطور متابعت تیسرے طبقہ کی ہو، تو الگ بات ہے،  
(۳) راوی کی ثقاہت پر اجماع ہو، یعنی انہیں راویوں کی روایت اخذ کریں گے، جن کی عدالت و ضبط پر ائمہ حدیث کا اجماع ہو۔

(۴) راوی کا حدان اور مجاہل کی روایت نہ ہو، و حدان کا مطلب یہ ہے کہ وہ رواقہ جن سے صرف ایک راوی نے روایت کی ہو، امام حاکم مدخل میں لکھتے ہیں کہ امام کی نظر میں وہ حدیث ایسی ہو کہ کم از کم وہ ثقہ تابعین، دو صحابی سے اس روایت کو بیان کریں، اور یہی شرط تمام طبقات یعنی تابعین، تبع تابعین میں ملحوظ ہو یہاں تک کہ سلسلہ سند امام مسلم تک اسی طرح دو، دو سے روایت ہوتے ہوئے پہنچ جائے۔

(۵) وہ حدیث متفق الصحیح ہو، یعنی مطلقاً صحیح نہیں بلکہ وہ صحیح روایت جن کی صحت پر مشائخ وقت کا اجماع ہو چکا ہو، چنانچہ خود امام مسلم کا قول ہے ایس کل شئی عندی صحیح وضعفہ لہنا ما اجمعوا علیہ م (مقدمہ مسلم)

## شرائط مسلم پر چند اشکال

”امام مسلم کی آخری تینوں شرطوں پر چند اشکالات، جو حسب ذیل ہیں:

(۱) ابھی تیسری شرط میں کہا گیا کہ اسی راوی کی روایت کو لیں گے جن کی ثقاہت پر اجماع ہو، حالانکہ اس شرط پر امام مسلم نہ رہ سکے، کیونکہ امام نسائی نے شیخین کے بعض راویوں کی تضعیف کی ہے معلوم ہوا کہ وہ رجال متفق علیہ نہیں؟  
جواب: جن راویوں کے حالات ائمہ جرح و تعدیل کے درمیان مختلف فیہ ہیں ان کی روایت کو مستقلاً ذکر نہیں کیا، بلکہ محل استشہاد میں ذکر کیا ہے جو ان کی شرط کے خلاف نہیں کہا جاسکتا،  
(ب) جن ضعیف راویوں کی روایات اس میں مذکور ہیں ان کا ضعف تغیر حافظہ کی بنا پر ہے جبکہ امام مسلم نے تغیر حافظہ سے پہلے ان سے حدیث اخذ کی، گویا وہ ضعف اخذ روایت کے بعد پیش آئی، اس لئے کوئی اشکال نہیں،  
(ج) ضعیف راوی سے مراد وہ راوی ہے جن کا ضعف مفسر بالسبب ہو، لیکن جن کا ضعف غیر مفسر ہو وہ قابل احترام نہیں،

(د) بسا اوقات کسی حدیث کو اس کے ضعیف سند سے اس بنا پر لاتے ہیں کہ دوسری قوی سند کے مقابلہ میں وہ سند عالی اور بلند ہوتی ہے، باوجودیکہ امام مسلم کے نزدیک وہ اصل حدیث و اگر ثقہ و عمدہ راویوں کی روایت سے معروف ہوتی ہے،  
(۲) چونکہ شرط پر یہ اعتراض ہے کہ مسلم کی بعض روایات ہیچند حدان راوی کی ہے مثلاً صحابہ میں سے ”ربیعہ بن کعب اسلمی“ کہ ان سے فقط ابو سلمہ امین عبدالرحمن نے روایت کی ہے، اور غیر صحابہ میں زید بن ابی رباح، کہ ان سے فقط امام مالک نے روایت کی ہے؟

جواب: کم از کم دور راوی کا ہونا یہ شرط صحابی کے لئے وجوبی نہیں، بلکہ استحبائی ہے لآن الصحابة کلہم عدول۔

البتہ غیر صحابہ میں رفع جہالت کے لئے دو یا زائد ملاذہ کا ہونا ضروری ہے، اور جن مواقع میں اسکے برخلاف مسلم میں راوی تباہ ہیں، وہ نا در ہے، والنادر کالمعدوم، نیز ایسے ایک راوی کی کسی نہ کسی نے توثیق کی ہے،

انما الاعمال بالنیات، بھی صرف ایک راوی حضرت عمر سے مروی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شہرہ طرق، ثبوٰت صحت، نیز حصول برکت کیلئے اپنی اس شرط پر قائم نہ رہ سکے،

(۳) پانچویں شرط پر یہ اعتراض ہے کہ اس کی ہر حدیث متفق الصحہ نہیں۔ جواب: اس شرط کا مطلب یہ ہے کہ باب کی بنیادی روایات اس قسم کی ہوں گی ہاں یہ ضروری نہیں کہ استشہاد میں جو روایت لائی جائے وہ بھی اسی قسم کی ہو،

(۲) مراد ایسی روایت جس پر چار امام عثمان بن شیبہ، سعید بن منصور خراسانی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین کا اجماع ہو جمیع ائمہ حدیث کا اجماع مراد نہیں م

”مسلم شریف کی بنیادی خصوصیت سات ہیں: ضبط نقادۃ لفظ (۲) ازالہ التباس (۳) خصوصیت مسلم شریف فرق ”حدثنا“ و ”اخبرنا“ (۴) سلاست، (۵) قلت آثار و تعلیقات (۶) فذكر

احادیث، (۷) مقدمہ مسلم،

ان خصوصیات کی وضاحت:

”ضبط نقادۃ لفظ“ کا مطلب یہ ہے کہ اگر متعدد شیوخ سے کوئی حدیث مختلف الفاظ میں مروی ہو تو امام مسلم ان میں سے شیخ کے لفظ کو لیتے ہیں، حتی الامکان اس کی تعیین کر دیتے ہیں،

”ازالہ التباس“ کا مطلب یہ ہے کہ اثناء سند میں کوئی نام مبہم اور مشتبہ ہو تو ”هو“ کے لفظ سے اس کی وضاحت اور تعیین کر دیتے ہیں تاکہ امتیاز ہو جائے۔

”حدثنا“ اور ”اخبرنا“ یعنی ان دونوں کے استعمال میں ایک فرق پیش نظر رکھتے ہیں، کہ ”حدثنا“ اس مقام پر ہو گا جہاں شیخ کی تلاوت سے شاگرد نے سنا ہو، اور ”اخبرنا“ اس حدیث میں ذکر کرتے ہیں جو شیخ کے سامنے تلاوت کی گئی ہو، بعض حضرات کے نزدیک ان دونوں کے استعمال میں کوئی فرق نہیں، جبکہ اس معاملہ میں امام مسلم بہت محتاط ہیں، حتیٰ کہ جہاں تنہا تھے وہاں حدیثی کہتے ہیں اور جس موقع پر اور بھی لوگ شریک تھے سماعت حدیث میں تو حدیث کہتے ہیں،

”قلت آثار و تعلیقات“ یعنی امام مسلم احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ کے اقوال و فتاویٰ ذکر نہیں کرتے جبکہ امام بخاری کے یہاں بکثرت موجود ہیں،

”فذكر احادیث“ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد خاص حضرت عمار بن منبہ نے ان سے حاصل کردہ روایات کو لکھ لیا تھا، اور چونکہ اس صحیفہ کے شروع میں ”فذكر احادیث“ کا لفظ ہے اسلئے جب اس صحیفہ کی کوئی روایت لاتے ہیں تو پہلے اسی لفظ سے ابتدا کرتے ہیں، دیکھئے مسلم شریف

آخری خصوصیت مقدمہ مسلم ہے، مقدمہ لکھ کر گویا آپ نے اصول حدیث کی بنیاد قائم فرمادی م

طریز مسلم شریف | امام مسلم، امام بخاری کی طرح صحیح لفظ ذکر کرتے ہیں، صحیح لفظ سے مراد وہ حدیث جس کے

کل راوی عادل کامل الضبط ہوں، سند متصل ہو، اور وہ معطل، شاہد اور منکر ہونے سے محفوظ ہو،  
**سرورِ روایت** یعنی یقین و جزم کی زیادتی کے لئے احادیث مرفوعہ متصلہ صحیحہ کے متعدد طرق ذکر کرتے ہیں،

**مسلم کی اسانید** مسلم کی سب سے عالی سند رباعی ہے، رباعی کا مطلب یہ ہے کہ جس میں راوی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف چار واسطے ہوں، ایک قول کے مطابق اس میں رباعی احادیث اتنی (۸۰) ہیں، جبکہ بخاری شریف کا ایک امتیازیہ بھی ہے کہ بخاری شریف میں ۲۲ / ملائحات ہیں،

**تراجم مسلم** آپ نے خود ترجمۃ الباب قائم نہیں کیا، لیکن امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام مسلمؒ نے اپنی کتاب کو ابواب کا لحاظ کرتے ہوئے مرتب کیا ہے، لیکن ترجمہ یا تو اس لئے چھوڑ دیا کہ کتاب ضخیم ہو جائے گی، یا کسی اور بنا پر، بعد میں بہت سے شارحین حدیث نے ابواب قائم کئے لیکن حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ مصنف اور کتاب کے شاہانِ شان اب تک تراجم قائم نہ ہو سکے۔

**نسخہ مسلم** یوں تو امام مسلمؒ سے ہزاروں انسانوں نے مسلم پڑھی لیکن اس کی روایت کا سلسلہ شیخ ابواسحاق ابراہیم بن سفیان نیشاپوری (متوفی ۳۰۸ھ) سے قائم رہا، انہیں کا نسفہ ہمارے سامنے ہے، وہ فرماتے ہیں کہ امام مسلمؒ نے اسکی قرأت سے رمضان ۲۵ھ میں فراغت پائی، مسلم شریف کا ایک نسخہ ابو محمد احمد بن علی قلانی سے بھی منقول ہے، "م  
**شروح مسلم** مسلم شریف کی بہت سی شرحیں، حاشیے لکھے گئے، صاحب کشف الظنون نے پندرہ کے قریب لکھا ہے چند معروف و مشہور کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) المنہاج فی شرح صحیح مسلم، یہ ابو زکریا یحییٰ بن شرف جو علامہ "نودی" سے مشہور ہیں ان کی تصنیف ہے، اور یہاں کی درسی مسلم شریف کے حاشیہ میں مطبوع ہے

- |                   |                                                                          |
|-------------------|--------------------------------------------------------------------------|
| (۲) شرح صحیح مسلم | ملا علی قادریؒ نے چار جلدوں میں لکھی،                                    |
| (۳) اکمال المعلم  | قاضی عیاض مالکی نے شرح مازری کی تکمیل کی،                                |
| (۴) الدیباج       | جلال الدین سیوطیؒ کی،                                                    |
| (۵) المعلم        | شیخ ابو یوسف یعقوب البیانی، اللاہوری                                     |
| (۶) حاشیہ مسلم    | شیخ ابوالحسن نور الدین محمد بن عبد البہادی السندی الحنفی                 |
| (۷) السراج الوہاج | نواب صدیق حسن خاں کی جو مختصر منذری کی شرح ہے                            |
| (۸) فتح الملہم    | علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی بہترین شرح ہے، تین جلد میں مکمل ہو سکیں اس کا |
- مکملہ پاکستان کے مشہور عالم دین چیف جسٹس حضرت مفتی تقی عثمانیؒ نے کی ہے جس کا انداز نو لکھا ہے،  
 اور بھی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، اختصاراً ان کو ترک کیا جاتا ہے،

**منقبت مسلم شریف** "ابو علی زاغونی کو ایک ثقہ شخص نے خواب میں دیکھا تو ان کو پوچھا کہ کس عمل سے آپ کی

نجات ہوئی، انہوں نے صحیح مسلم کے اجزاء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان اجزاء کی برکت سے۔ (بستان الحدیث ص ۸۸ مترجم) خود فرط مسرت میں اور تحدیثِ نعت کے طور پر امام مسلم نے فرمایا کہ اگر محدثین دو سال تک بھی حدیث لکھتے رہیں، تب بھی ان کا درود ارا سی، المسند الصبیح، پر ہو گا، م،

## کیا مسلم شریف جامع نہیں؟

یوں تو جامع کے عنوان سے کئی کتب حدیث کے نام سے ملتے ہیں، مثلاً جامع معمر بن راشد، جامع سفیان ثوری، جامع مصنف عبد الرزاق، لیکن ان سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جامع بخاری کو، اس کے بعد ترمذی کو، ان دونوں کے جامع ہونے پر تو کوئی کلام نہیں کیونکہ ان میں آٹھوں مضامین بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، لیکن مسلم شریف جامع ہے یا نہیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کے جامع ہونے کا انکار کیا ہے، کیونکہ اس میں ایک مضمون یعنی کتاب التفسیر کی روایات بہت ہی کم، برائے نام ہیں، اس لئے اس کو جامع نہ کہتا چاہئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلم شریف جامع میں داخل ہے کیونکہ جامع ہونے کے لئے آٹھوں مضامین کا وجود کافی ہے کثرت و قلت سے بحث نہیں یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر کے استاذ اور لغتِ حدیث، قاموس کے مصنف مجدد الدین فیروز آبادی نے، اسی طرح صاحب کشف الظنون نے اس کو جامع میں شمار کیا ہے،

اب یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ امام مسلم نے تفسیر کی روایات کم کیوں ذکر کی؟ تو اس کی دو وجہ تھی ایک تو یہ کہ انہوں نے یہ التزام کیا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع احادیث ذکر کریں گے، آثار صحابہ ان کے اقوال و فتاویٰ اور تابعین کے اقوال سے گریز کریں گے، دوسرے یہ کہ مکررات سے احتراز کریں گے، یہی وجہ ہے کہ مسلم میں گئے چنے مکررات ہیں، تو چونکہ تفسیر میں احادیث مرفوعہ کم ملتی ہیں اور جو ملی بھی ہیں ان کو امام مسلم دوسرے ابواب میں ذکر کر چکے ہیں پھر کیوں مکررات؟

غرض صحاح ستہ میں تین کتاب حدیث جامع میں شامل ہیں،

## کیا مسلم کی سبھی حدیث صحیح ہے

”بخاری شریف ہو یا مسلم، ان دونوں کے بارے میں بھی کلام ہوا کہ کیا ان میں کی تمام احادیث و اقوال صحیح ہیں؟ اس سلسلہ میں امام دارقطنی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صحیحین کی دو سو دس احادیث صحیح نہیں، جن میں بیس تو دونوں میں موجود ہیں اور اٹھ سو بخاری میں، اور سو مسلم شریف میں، امام طحاوی نے بھی صحیحین کی بعض احادیث پر کلام کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً توذک کے باب میں حضرت ابو حمید ساعدی کی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، جبکہ وہ صحیحین میں موجود ہے

اسی طرح فظ عبد القادر قرشی نے اپنی کتاب طبقات میں اس کلیہ کا انکار کیا ہے کہ ان دونوں کی ہر حدیث صحیح ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے حدی الساری مقدمہ فتح الباری میں دارقطنی کے ہر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے



کی کوشش کی ہے کہ ان کی احادیث بے غبار اور صحیح ہیں، ”م

مسلم میں کس قسم کی روایت ہے؟

امام مسلمؒ نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ حدیث کی تین قسمیں ہیں، جن کو میں ذکر کروں گا

(۱) جس کا راوی حفظ و اتقان، ضبط و عدالت میں اعلیٰ درجہ کا ہو

(۲) جس کے راوی کا حفظ و اتقان متوسط درجہ کا ہو

(۳) جس کا راوی ضعیف ہو، اور ان کی روایت متردک نہ ہو

امام مسلم کے اس تقسیم حدیث کے بعد محدثین کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ ہو گیا کہ امام مسلمؒ نے اپنے اس وعدہ کو

پورا کرتے ہوئے تینوں طرح کی روایت ذکر کی ہے یا نہیں؟

حاکم ابو عبید اللہ، امام بیہقی، ابن عساکر کا خیال ہے کہ درحقیقت امام مسلمؒ نے ان تینوں قسم کی احادیث الگ الگ کتاب

میں جمع کرنے کا وعدہ فرمایا تھا، البتہ ابھی صحیح مسلم میں صرف طبقہ کوئی ہی کی احادیث جمع کر پائے تھے کہ عمر نے وفا نہیں کی اور

دوسرے اور تیسرے طبقہ کی روایات الگ الگ کتاب میں جمع کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا، اسی بنا پر حاکم فرماتے ہیں:

قد اراد مسلم ان يخرج الصحيح على ثلاثة اقسام في الرواة فلما فرغ من هذا القسم

الاول ادركته المنية وهو في حد الكهولة. (المدخل ص ۷)

غرض ان حضرات کے بقول، مسلم شریف میں صرف پہلے طبقہ کی روایات ہیں،

مگر قاضی عیاضؒ اور دیگر علماء نے مذکورہ توجیہ کو پسند نہیں کیا، بلکہ اسکی تردید کر دی ہیں کہ مسلم شریف بغور مطالعہ

کرنے سے یقین ہوتا ہے کہ مسلم میں صرف پہلی قسم کی نہیں بلکہ دوسری اور تیسری قسم کی روایات بھی ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے

کہ پہلے پہلی قسم کو ذکر کرتے ہیں اسکے بعد متابعت اور شواہد کے طور پر ان کی روایات ہوں گی جو متوسط درجہ کے ہوں، اس

طبقہ کو پہلے طبقہ کے ساتھ ملحق کیا ہے، اس کے بعد تیسرے طبقہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ان کا ضعف متفق علیہ ہے تو پھر ان

کی روایت ذکر نہیں کی ہاں جن کے بارے میں کلام ہوا، اور اکثر محدثین نے تزکیہ و تعدیل کی ہے ان کی بھی روایت ذکر کی

ہیں، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض نے جس کو تیسرا طبقہ کہا ہے ان کی احادیث بہت تھوڑی مقدار میں مذکور ہے، وہ

بھی بطور متابعت، ورنہ تو اگر اس کا استقصا کرتے تو کتاب کافی ضخیم ہو جاتی اور درجہ صحت سے گر جاتی،

غرض امام حاکم کا یہ کہنا کہ ایک ہی قسم کی روایات ہیں اور دوسری، تیسری قسم کی روایات کیلئے کتاب لکھنے کا ارادہ تھا

صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ (تدریب الراوی ص ۹۶/۱)

### مسلم میں ضعیف راوی کی روایت

”قاضی عیاضؒ اور علامہ ذہبی کے بقول امام مسلمؒ پر اعتراض ہوتا ہے کہ جب مسلم میں صحیح روایتوں کے نقل کرنے

کا التزام کیا ہے تو پھر مستور الحال، اور ضعیفہ کی روایت کیسے نقل کر دی؟ کیونکہ یہ دونوں راوی صحیح کے راوی نہیں،

محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں :

(۱) ابو عمرو بن صلاح فرماتے ہیں جن ضعفاء کی روایات نقل کی ہیں یہ وہ ضعیف راوی ہیں جن پر اوروں نے تو کلام کیا لیکن خود امام مسلم کے نزدیک وہ ضعیف نہیں، لیکن اس جواب پر اشکال ہوتا ہے کہ اس کے باوجود مسلم میں اس کی روایت درج نہ ہونی چاہئے، کیونکہ اصول حدیث کا مسئلہ ہے "الجرح مقدم علی التعذیل" اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس اصول کا تعلق جرح منفر سے ہے اگر جرح مبہم ہو تو پھر اس جرح کا کوئی اعتبار نہیں، خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ جن ضعفاء کی روایات بخاری، مسلم، ابوداؤد میں ہیں یہ وہی ضعیف اور مجرد راوی ہیں جن پر جرح مبہم ہوا ہے جرح مبہم کا مطلب یہ ہے کہ جرح کی کوئی معقول وجہ نہ ذکر کی گئی ہو، علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ جن کی ملامت اور جلالت شان امت میں مسلم ہے ان پر جرح منفر بھی قابل اعتبار نہیں، اگر ہر شخص کے بارے میں جرح منفر مستبران لیا جائے تو دنیا میں کوئی بھی کلام سے خالی نہیں مانا جائے گا، امام ابو حنیفہ پر دار قطنی نے جرح کیا، امام شافعی پر یحییٰ بن معین نے، امام احمد پر کراہیسی نے، امام بخاری پر ذہلی نے، امام اوزاعی پر، امام احمد نے، ابن حزم نے ترمذی اور ابن ماجہ پر، امام نسائی پر نشیع کا الزام، غرض اگر اس طرح کے جرح کا اعتبار کیا جائے تو ان میں سے کوئی ثقہ باقی نہیں رہ جائے گا۔

(۲) امام مسلم پر اس وقت اعتراض ہوتا جبکہ دوسری اور تیسری قسم کی روایت کو ثبوت مسئلہ کے لئے اصل اور بنیاد بناتے جبکہ اصل مسئلہ کے لئے بطور تائید و متابعت ذکر کی ہے اس لئے کوئی اعتراض نہیں۔

(۳) جن ضعفاء کی روایت آتی ہیں ان پر اسباب ضعف مسلم میں روایت لینے کے بعد طاری ہوا، مثلاً بوڑھلا آگیا، جبکہ مسلم میں اخذ روایت کے وقت نوجوان تھے اس کے اور بھی جوابات ہیں دیکھئے ترمذی ص ۹۷/۹۸۔ "م

### کیا صحیحین کی روایت مفید یقین ہے؟

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی فیض الباری میں تحریر فرماتے ہیں کہ علماء امت میں یہ بات محل بحث رہی ہے کہ صحیحین کی روایتیں مفید یقین ہیں یا مفید ظن؟ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ مفید یقین نہیں، البتہ حافظ ابن حجر مفید یقین ہونے کے قائل ہیں، یہی رحمان شمس الانہ سرخسی، علامہ ابن تیمیہ، شیخ عمرو بن صلاح کا ہے، علماء دیوبند میں حضرت انور شاہ کشمیری کا بھی یہی خیال ہے، تاہم اگر یہ شبہ ہو کہ صحیحین میں بہت سی احادیث خبر واحد ہیں، اور خبر واحد مفید ظن ہے مفید یقین نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصول اور ضابطہ کا تقاضا تو یہی ہے لیکن اگر خبر واحد کے ساتھ خارجی قرائن مل جائیں مثلاً تعدد طرق سے مروی ہو تو پھر اہل فن کو ایسے خبر واحد کی صحت کا یقین ہو جاتا ہے، کیونکہ جو حضرات راویوں کے صفات اور اس کے مختلف طریق سے واقف ہوتے ہیں ان کو اس کی صحت کا یقین ہو جاتا ہے، مگر چہ نادانف کو یہ بات حاصل نہیں ہوتی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خبر واحد کا مفید یقین ہونا خبر واحد ہونے کی بنا پر نہیں، بلکہ رواۃ کے حالات ان کی ثقاہت، ضبط و عدالت رتبہ حزم و یقین کو پہنچا دیتا ہے، اور یہ بات بہت واضح ہے کہ کوئی جلیل القدر ہستی کسی بات کی خبر دے تو اس کے بارے میں دل میں کسی قسم کا تردد نہیں رہتا، اور تھا ایسے انسان کی بات ایک جماعت کی بات سے بھی زیادہ وزنی ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تھا امت کہا گیا اِنَّ ابراہیمَ کانَ اٰمَنًا قانتًا، بلکہ اس قسم کا ثبوت روایتوں میں بھی ملتا ہے تحویل قبلہ کے بعد اہل قبا کو نماز کی حالت میں ایک شخص نے خبر دی کہ قبلہ

بدل چکا اس ایک خبر پر مصلیان مسجد نماز کی حالت میں ہی کعبہ کی طرف گھوم گئے، حالانکہ یہ خبر واحد تھی، جبکہ بیت المقدس کی طرف استقبال، دلیل قطعی سے ثابت ہو چکا تھا، لہذا اس کو منسوخ کرنے کے لئے اسی طرح کے نص قطعی کی ضرورت ہونی چاہئے تھی مگر چونکہ صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دلی خواہش ہے کہ مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہو جائے، اور اس کی رغبت و خواہش اس قدر ہے کہ وحی کی امید میں بار بار آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھتے ہیں، اور صحابہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ خدا اپنے حبیب کی خواہش کو جلد ہی پورا کر دیتا ہے، اتنی بات معلوم ہونے کے بعد جب اہل قبا کو ایک ثقہ شخص نے تویل کی خبر دی تو اس خبر کے ساتھ مذکورہ قرآن کی بتا پر صحابہ کو شخص واحد کی خبر پر یقین ہو گیا، لہذا نماز ہی میں قبلہ کی طرف گھوم گئے۔

بعض علما نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ خبر واحد آغضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اکثر قطعی اور یقینی تھی، غرض یہی رائے انب اور معروف و مشہور ہے کہ صحیحین کی روایات مفید یقین ہیں۔ (۱)

### حدیث عنعنہ میں تشخیص کا اختلاف

حدیث کی روایت کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کہیں "حدثنا فلان" کہیں "أخبرنا فلان" کہیں "سمعت عن فلان" اور کہیں "فلان عن فلان" کے ذریعہ بیان کرتے ہیں جس حدیث کو "عن" کے ذریعہ بیان کیا جائے اس حدیث کو حدیث معنعن کہا جاتا ہے، اور اس طرح روایت کرنے والے کو معنعن کہا جاتا ہے،

بیان روایت کے وقت راوی اگر "حدثنی"، "حدثنا"، "أخبرنی"، "أخبرنا"، اور "سمعت" کے الفاظ کے تو صراحت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ راوی نے مروی عنہ سے سنا ہے، لیکن اگر حدیث کی روایت "عن فلان عن فلان" کے ذریعہ ہو تو بصراحت معلوم نہیں ہوتا کہ راوی نے براہِ راست مروی عنہ سے سنا ہے یا نہیں؟

اب اس معنعن روایت کو کس صورت میں اتصال پر محمول کیا جائے، اور کس صورت میں القطع پر؟ تو اس سلسلہ میں معیار یہ ہے کہ اس کی تین صورت ہے،

- (۱) غیر مدلس، معنعن راوی کا اس کے مروی عنہ سے لقاء و سماع ثابت ہو،
- (۲) غیر مدلس معنعن راوی کا اس کے مروی عنہ سے عدم لقاء، عدم سماع معروف و متیقن ہو،
- (۳) غیر مدلس معنعن راوی کا اپنے معاصر راوی سے نہ تو لقاء و سماع کا ثبوت ہو اور نہ عدم لقاء و عدم سماع کا ثبوت ہو بلکہ دونوں پہلو غفی ہوں،

اس میں پہلی صورت بالاتفاق سند متصل کہلاتی ہے، اور دوسری صورت بالاتفاق حدیث کو حدیث منقطع بتلاقی ہے تیسری صورت میں علما باہم مختلف ہیں، حضرت امام بخاری، علی ابن مدینی، ابو بکر بن صیرفی کے نزدیک ایسی روایت منقطع غیر صحیح ہے، ان حضرات کے یہاں صیغہ "عن" کی روایت کے متصل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ راوی کا مروی

عند سے کم از کم ایک دفعہ لقلہ یا سلع یعنی طور پر ثابت ہو۔

ابو مظفر سمعانی کا یہ کہنا ہے کہ رولتِ عنعنہ اس وقت مقبول ہوگی جبکہ راوی مروی عنہ کے ساتھ ایک زمانہ و راز تک رہ چکا ہو۔

ابو عمرو مقلبی کا مذہب یہ ہے کہ روایتِ عنعنہ متصل اس وقت ہوگی جبکہ راوی کا مروی عنہ سے روایت کرنا معروف و مشہور ہو، امام مسلمؒ اور خود ان کے بقول جمہور محدثین، فقہانہ اور اصولیین کا مسلک یہ ہے کہ ایسی روایتِ عنعنہ متصل اسناد ہوگی ہاں اس شرط کے ساتھ کہ راوی کا مروی عنہ سے لقلہ کا امکان ہو نا کافی ہے یعنی عدم لقلہ ثابت نہ ہو۔ (۱)  
اس مسئلہ پر امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، اور امام بخاری وغیرہ کی تردید بھی کی ہے جبکہ اس مقام پر حضرت امام مسلم کا لب و لہجہ سخت ہو گیا ہے۔

## سندِ عالی میں عن کا استعمال

”احادیث کی اسانید میں عموماً سند کے ابتدائی دو تین راویوں تک ”حدثنا“ اور ”أخبرنا“ کے صیغے آتے ہیں اس کے بعد اوپر کے راویوں میں عموماً عنعنہ کا طریقہ ہوتا ہے، ایسا کیوں؟

حضرت شاد صاحبؒ نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ متقدمین کے یہاں تدلیس کا رواج بہت کم تھا اور متاخرین میں زیادہ ہو گیا، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ تابعین کے دور میں مدلسین کی تعداد چونتیس سے زائد نہ تھی، جبکہ نیچے کے راویوں میں اس کی تعداد سو سے زیادہ ہو گئی اور اس کے بعد تو ان کی تعداد بے شمار ہو گئیں، بہر حال متقدمین میں تدلیس بہت کم تھی اس لئے عنعنہ کے ذریعہ بیانِ روایت کو مشکوک نہیں سمجھا جاتا تھا، بعد میں تدلیس کا رواج بڑھ گیا، اس لئے بعد والوں کے نام کے ساتھ حدیثِ اخیر تا کے صریح الفاظ کے ذریعہ بیانِ روایت ہونے لگی تاکہ شائبہ تدلیس نہ ہو۔ “م (۲)“

## امام مسلمؒ کا تعارف

امام مسلمؒ کے حالات کے تحت چند باتیں ہیں نام و نسب، مولد و مسکن، سن ولادت و وفات، شیوخ و تلامذہ، فضائل و مناقب اور تالیفات وغیرہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ابو الحسین کنیت، عساکر الدین لقب، اور اسم گرامی مسلم ہے، والد ماجد کا نام ثانی حجاج اور دادا کا نام بھی مسلم تھا، سلسلہ نسب کچھ اس طرح ہے مسلم بن الحجاج بن مسلم بن درہ بن کوشاد القشیری۔

مسکن } ملک خراسان کے مشہور و خوبصورت شہر نیشاپور میں ولادت ہوئی، وہاں کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے آپ کا تعلق تھا اس بنا پر آپ کو قشیری اور نیشاپوری کہا جاتا ہے، نیشاپور شہر بہت ہی مردم خیز شہر تھا، یا قوتِ حوی اس شہر کو معدن الفضلاء، منبع العلماء کہا کرتے تھے، تاج الدین سبکا کا کہنا ہے کہ بغداد کے بعد اس کی نظیر نہ تھی، اسی بنا پر بعض مؤرخوں نے اس کو امہات البلاد کا خطاب دیا ہے، اور بعض کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ عالم اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ

اسی شہر میں مدرسہ کبھیقہ کے نام سے شروع ہوا، اس کے بعد بغداد کا مدرسہ نظامیہ شروع ہوا۔

### سن ولادت و وفات

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی ولادت ۲۰۴ھ میں ہوئی، ابن خلکان کا کہنا ہے کہ ۲۰۲ھ میں ہوئی اور اس کی تفصیل وہ یوں ذکر کرتے ہیں کہ میرے شیخ حافظ ابن صلاح نے غالباً ۲۰۲ھ بتایا تھا، اور اس قول کا اصل ماخذ امام حاکم کی ایک تصنیف تھی، لیکن جب مجھے اصل کتاب دستیاب ہوئی تو اس میں سن ولادت کے بجائے صرف سن وفات ۲۶۱ھ لکھا تھا، اور یہ بھی لکھا تھا کہ ان کی عمر بچپن سال ہوئی، اس حساب سے ان کی ولادت ۲۰۶ھ میں ثابت ہوتی ہے، ابن اثیر نے اسی کو راجح قرار دیا ہے، موصوف کی رحلت ۲۶۱ھ بروز یک شنبہ ۲۳/ رجب کو ہوئی، اور دو شنبہ کو نیشاپور سے باہر نصیر آباد میں تدفین ہوئی۔ (۱)

چودہ سال کی عمر تھی کہ علم کے حصول کے لئے طویل مسافت اور متعدد ممالک کا سفر کیا، مثلاً عراق، حجاز، شام، مصر، بغداد اور بلخ وغیرہ، ان کے کل اساتذہ کی تعداد بیس بتائی جاتی ہے، چند مشہور نام یہ ہیں:

اسحاق بن راہویہ، امام ذہلی، امام احمد بن حنبل، عبد اللہ بن مسلمہ قعنبی، سعید بن منصور، اور خاص طور پر امام بخاری کا نام قابل ذکر ہے، ابتدائے میں امام مسلم، امام بخاری سے زیادہ مانوس نہ تھے، لیکن آخر عمر میں جب امام بخاری نیشاپور پہنچے اور ان کی بحیر العقول خدمت حدیث کی معرفت ہوئی تو ان کے پہلے کے تمام خیالات، عقیدت اور اچھے جذبات سے بدل گئے، امام بخاری کی آنکھوں کو بوسہ دیا اور قدموں کو بوسہ دینے کی خواہش ظاہر کی، اور استاذ الاساتذہ، سید المحدثین، طیب الحدیث فی عللہ کے محبت بھرے خطاب سے ان کو یاد کیا، خلق قرآن کے مسئلہ میں جب محمد بن یحییٰ ذہلی اور امام بخاری کا اختلاف حد سے بڑھ گیا اور ذہلی نے اعلان کر دیا، کہ جو امام بخاری کے مشرب پر ہو میرے حلقہ درس میں شریک نہ ہو، یہ سن کر بعض افراد امام بخاری سے کٹ گئے، لیکن امام مسلم تھے کہ علم بخاری سے کچھ اس طرح مخمور ہو چکے تھے کہ انہیں کسی دوسرے محدث کے علوم میں اب کوئی ذائقہ ہی نہیں معلوم ہوتا تھا، اعلان سن کر فوراً چادر سنبھالی، عمامہ سر پر رکھا اور مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے، بلکہ ان کے علوم کا جو ذخیرہ کاغذ پر لکھا تھا، وہ بھی ایک خادم کے ذریعہ ان کے مکان پر واپس کر دیا، اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام مسلم کو امام بخاری سے کس حد تک عقیدت و محبت تھی۔

آپ کے شاگردوں میں ابو حاتم رازی، ابو بکر بن خزیمہ، ابراہیم بن ابی طالب، ابو حامد بن الشری، اور خاص طور پر امام ترمذی کا اسم گرامی شامل ہے، امام ترمذی نے اپنی کتاب ترمذی شریف کتاب الصوم میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہؓ کی نقل کی ہے جو امام مسلم سے حاصل کی ہے۔ (۲)

### فضائل و مناقب

امام ابو حاتم نے ان کی امامت حدیث کی شہادت دی ہے، ابو حاتم رازی نے ہی ان کو موت کے بعد خواب میں دیکھا تو پوچھا کیا حال ہے؟ تو امام مسلم نے فرمایا کہ خداوند قدوس نے اپنی جنت کو میرے لئے مباح کر دیا ہے، جہاں چاہتا ہوں سیر کرتا ہوں، اساتذہ کرام کا نہایت ادب و احترام کیا کرتے تھے، آپ کی

انتیازی شان یہ تھی کہ عمر بھر نہ کسی کی غیبت کی نہ کسی کو مارا، اور نہ کسی کو برا بھلا کہا، آپ کے زہد و تقویٰ، علم و فضل کا اعتراف ہمعصروں نے کیا، شیخ ابو حاتم رازی تو ہمعصر مشائخ میں، حضرت امام مسلم کو ترجیح دیا کرتے تھے، حافظ ابو قریش کا بیان ہے کہ اس وقت دنیا میں حفاظ حدیث چار ہیں، ان میں ایک امام مسلم ہیں، امام بخاری، امام دارمی، اور ابو زر عہ رازی۔ ابو عمر حمدان نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے شیخ ابن عقدہ سے سوال کیا کہ امام بخاری حافظ تریں یا امام مسلم؟ آپ نے فرمایا بھائی یہ دونوں عالم ہیں، میں نے کئی بار یہی سوال کیا تو فرمایا امام بخاری سے کبھی کبھی اہل شام کے راویوں میں غلطی ہو جاتی ہے بخلاف امام مسلم کے۔

### امام مسلم کا مسلک

”آپ کے مسلک کی تعیین کچھ مشکل ہے، علامہ کشمیری کا خیال ہے کہ امام مسلم اور ابن ماجہ کا مذہب معلوم نہیں، نواب صدیق حسن خاں نے انہیں شافعی شمار کیا ہے، صاحب کشف الظنون نے ان کے تعارف میں الامام المسلم الشافعی لکھا ہے، شیخ عبد اللطیف سندی فرماتے ہیں، امام ترمذی و مسلم کے بارے میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دونوں شافعی مذہب کے مقلد ہیں، حالانکہ دونوں مجتہد ہیں، صاحب الیانع و نجی نے لکھا ہے کہ اصولی طور پر شافعی تھے، شیخ طاہر جزائری کا خیال بھی یہی ہے کہ کسی امام کے مقلد محض نہیں تھے، البتہ امام شافعی کے مسلک کی طرف میلان ضرور تھا، امام علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ امام مسلم نہ تو مقلد محض تھے اور نہ مجتہد مطلق، بلکہ مجتہد منتسب تھے، ابن قیم نے حنابلہ میں شمار کیا ہے، اور بعض نے مالکیہ، لیکن طبقات مالکیہ میں ان کا نام نہیں ملتا۔“

### سبب وفات

آپ کا واقعہ وفات نہایت حیرت انگیز، پورے عبرت ہے کہ ایک دفعہ مجلس میں کسی حدیث کے متعلق کسی نے سوال کیا، اتفاق سے آپ کو یاد نہ آئی، مگر تشریف لائے اور تلاش و جستجو میں محو ہو گئے، اسی درمیان کھجور کا ٹوکرا پیش کیا گیا، خرابی بھی تناول فرماتے رہے حتیٰ کہ پورا ٹوکرا صاف ہو گیا اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ اس کا احساس بھی نہ ہوا، اخیر حدیث قول کئی، مگر زیادہ تناول کی وجہ سے طبیعت نامساں ہوئی اور بالآخر وہی مرض موت کا سبب بنا، اور ۲۵ / رجب ۲۶۱ بروز یکشنبہ وفات پا کر دو شنبہ کو نصیر آباد میں مدفون ہوئے۔

### تصانیف

مسلم شریف کے علاوہ اور بھی تصنیف کا تذکرہ ملتا ہے، مسند کبیر، جامع کبیر، کتاب العلل، کتاب الوحدان، کتاب الاقران، کتاب الاشخاص، کتاب مشائخ مالک، کتاب مشائخ الثوری، کتاب المختصر میں، کتاب اولاد الصحابہ، کتاب الطبقات وغیرہ آپ کے علمی کارنامے ہیں۔ (۱)

# بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## کتاب الایمان

مقدمہ کے بعد دوسرا مرحلہ کتاب الایمان کا ہے، مسلم شریف کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے مقدمہ جس میں اسناد کی بحث ہے، اس کے بعد کتاب الایمان اور پھر اس کے بعد اعمال کی احادیث۔ سب سے پہلے مقدمہ میں اسناد کی بحث لانے کی وجہ یہ ہے کہ مسلم شریف لکھنے کا مقصد احادیث پر عمل کرنا ہے، اور عمل صحیح حدیثوں پر کیا جاتا ہے، جبکہ حدیث کی صحت کا دار مدار اسناد پر ہے، اس لئے جب تک اسناد کی اہمیت اور اس کی تشریحات معلوم نہ ہوں اس وقت تک احادیث کی صحت اور اس کی اہمیت کا بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں انہی رجال کی احادیث قبول کی جائیں گی، جن کے صفات اچھے، اور وہ بلند اخلاق و کردار کے حامل ہوں، لیکن جو فاسق و فاجر اور سوء اخلاق کے مرتکب ہوں، ان کی روایات اخذ نہیں کی جائیں گی، اس سے ابتداء کتاب میں ہی امام مسلمؒ طالبان علوم نبوت کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ اچھے اوصاف و اخلاق کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کے بغیر ایمان دل میں جتنا نہیں، یا کم از کم ایمان میں کمال پیدا نہیں ہوتا، گویا مقدمہ میں اسناد کی بحث مقدم کر کے طلبہ کو اچھے اوصاف کی ترغیب، اور برے اوصاف سے احتراز کی رہنمائی فرما رہے ہیں، تاکہ اسکے بعد جب کتاب الایمان پڑھیں تو ایمان قلب میں خوب بنے اور اس کے بعد عمل کر کے ایمانی مدارج طے کیا جاسکے۔

کتاب :- کتاب مصدر ہے، لغت میں جمع کے معنی آتا ہے، یہاں کتاب بروزن فعال مصدر مبنی للمفعول ہے یعنی مکتوب بمعنی مجموع، جیسے خلق بمعنی مخلوق، یہ مجاز متعارف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے ”هذا مجموع فی الاحادیث الواردة فی الایمان“

مصنفین کا دستور ہے کہ جب کسی عنوان کے تحت مختلف نوع کے مسائل ہوں تو اس کو کتاب کا عنوان دیتے ہیں اس لحاظ سے کتاب بمنزلہ جنس ہوگا، اور اگر عنوان کے تحت ایک ہی نوع کے مسائل ہوں تو اس کو باب کا عنوان دیتے ہیں، اس لحاظ سے باب بمنزلہ نوع ہوگا، اور اگر ایک ہی نوع کے مسائل کو جدا کر کے بیان کرنا ہو تو فصل کا عنوان قائم کرتے ہیں۔

اصطلاح میں کتاب کی تعریف وہو طائفة من المسائل اعتبرت مستقلة، یعنی کتاب مسائل کے ان حصوں کا نام ہے جن کا مستقل اعتبار کر لیا گیا ہو، خواہ واقعی مستقلاً ہوں جیسے کتاب الملقط، یا مابعد کے تابع ہوں جیسے کتاب الطہارۃ، یا کسی کے بعد آ رہا ہو جیسے کتاب الصلوٰۃ کہ یہ کتاب الطہارۃ کے بعد آتا ہے، صاحب بحر نے لکھا ہے کہ استقلال کا مطلب یہ ہے کہ اس کا سمجھنا قبل یا مابعد کے سمجھنے پر موقوف ہو، (بحر الرائق ص ۸/۱) اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ کوئی

ضروری نہیں کہ کتاب کے ذیل میں باب کا عنوان بھی آرہا ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ باب بغیر کتاب کے نہ آئے چنانچہ بخاری شریف میں باب کیف کان بدء الوحی بغیر کتاب ہے، البتہ فصل بغیر باب کے نہیں آتا۔ ترکیب کے لحاظ سے اسکو مستدامخوف کی خبر بنا سکتے ہیں، تقدیر عبارت ہوگی، هذا کتاب الایمان، اور "اعنی"، "خذہ"، "ہاں" کا مفعول بنا کر منصوب بھی پڑھ سکتے ہیں۔

### ایمان کی لغوی و شرعی تحقیق

ایمان لغوی ہے "امن" سے اور یہ خوف کی ضد ہے، قرآن میں دونوں کو ایک جگہ یکجا کر دیا گیا ہے وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ، (۱) دوسری جگہ ارشاد ہے "وَالْيَتَذَكَّرُونَ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ آمَنًا" (۲) امن نام ہے زوال خوف اور حصول طمانینت کا، امن ثلاثی مجرد ہے، باب جمع سے آتا ہے پھر اس کو باب افعال میں لے گئے، آمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا، اِيْمَانِ افعال کا مصدر ہے یہ بالاتفاق متعدی ہے کبھی بلا صلا متعدی ہوتا ہے، جیسے آمَنَت زيدا، اور کبھی بذریعہ صلا، صلہ میں کبھی "با" لاتے ہیں اور کبھی "لام" قرآن میں دونوں طرح سے استعمال ہوا ہے، آمَنَت بِاللّٰهِ وَمَلَأَتْكَتَهُ" (۳)، "يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ" (۴) لام کی مثال سورہ یوسف میں ہے "وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا ضَالِّينَ" (۵) جب لام بابہ کے ذریعہ متعدی ہو تو اس میں ایک ضمنی معنی پیدا ہوتا ہے، وہ ضمنی معنی کیا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی بات کے بارے میں یہ کہہ دے کہ ٹھیک ہے، تو سچا ہے، تو گویا اس نے مخاطب کو تکذیب اور مخالفت سے مامون کر دیا، جب تک انسان کی تصدیق نہ ہو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا، تو تصدیق ایمان کا اصل معنی نہیں، مگر چونکہ حصول اطمینان کا ذریعہ ہے اس لئے اس کو ایمان کے معنی میں شامل کر کے ایمان کی تفسیر تصدیق سے کر دیتے ہیں، اور چونکہ تصدیق کا صلہ باہ آتا ہے جیسے "تصدق به" تو ایمان کے صلہ میں بھی باہ لے آتے ہیں، نیز جب انسان کسی کی تصدیق کرتا ہے تو گویا سچائی کے سامنے جھک جاتا ہے، تو اس لحاظ سے ایمان، اذعان، انقیاد کے معنی کو محضمن ہو گیا اس لئے اس کے صلہ میں لام بھی لے آتے ہیں، کیونکہ اذعان کا صلہ لام آتا ہے، وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا اِذْ مَدَعْنَا وَمَنْقَاد لَّنَا" (۶) یعنی آپ ہماری خبر کو تسلیم نہیں کریں گے، غرض تصدیق کی تین صورتیں ہوئیں (۱) بقیہ (۲) بالبابہ (۳) باللام۔ صحیح مسلم کتاب الایمان میں ایک حدیث ہے "اِلَّا اَعْطٰی مِنَ الْاٰیٰتِ مَا مِثْلُهُ اَمِنْ عَلَيْهِ الْبَشَرُ" (۷) صرف یہ ایک مقام ہے جہاں ایمان کا صلہ علی آیا ہے، اور کہیں ایمان کا صلہ علی نظر سے نہیں گذرا، اور اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے "اَمِنْ مَعْتَمِدًا عَلَيْهِ الْبَشَرُ" لغوی تحقیق سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ کبھی ایمان کے معنی تصدیق کے آتے ہیں، اور کبھی وثوق کے، اور جب علی صلہ ہو تو اعتماد کے معنی کو محضمن ہو گا جیسا کہ مسلم کی حدیث میں ہے۔

شرعی معنی

"التصديق بما علم مجيئى الرسول به ضرورة تفصيلاً فيما علم تفصيلاً، واجمالاً فيما علم اجمالاً"

فقہاء جب ایمان کی تعریف کرتے ہیں تو کبھی لفظ ضرورہ کو ترک کر دیتے ہیں، چونکہ ایمان ہر چیز کی تصدیق کا نام نہیں ہے، بلکہ خاص چیز کی تصدیق کا نام ہے، تو شریعت میں ایمان و اسلام صفت انقیاد و اطاعت کی اس آخری منزل کا نام



ہے، جس کے بعد اوامر الہیہ اور منہیات شرعیہ کے قبول کرنے سے قلب میں کوئی انحراف باقی نہ رہتا ہے۔

### ”تصدیق لغوی و تصدیق منطقی میں فرق“

منطق کی کتابوں میں التصدیق کا لفظ آتا ہے، ہمارے یہاں چونکہ یہ علوم رائج ہیں اس لئے عام طور پر لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے، کہ ایمان تصدیق منطقی کا نام ہے، اور جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو ہمارا ذہن اسی منطقی اصطلاح کی جانب منتقل ہو جاتا ہے، اس لئے دونوں کی تحقیق ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔

مناطقہ نے علم کی دو قسمیں کی ہیں (۱) ان کان اذعاناً للنسبۃ فتصدیق وإلا فتصور، اس تعریف کے پیش نظر تصدیق منطقی اور تصدیق لغوی میں دو طرح سے فرق ہے (۱) پہلا فرق: تصدیق منطقی کا تعلق عام چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے، خواہ رسول کی تصدیق سے ہو یا ”السماء فوقنا“ کی تصدیق سے، جبکہ ایمان شرعی میں ایک خاص چیز کی تصدیق ملحوظ ہے اور وہ ہے ”التصدیق بما جاء به الرسول“ اس لئے ”السماء فوقنا“ وغیرہ ایمان سے خارج ہے۔ (۲) دوسرا فرق: تصدیق منطقی، یہ تصدیق اضطراری اور اختیاری دونوں کو شامل ہے، مثلاً عالم کا حادث ہونا دلائل سے معلوم ہے، العالم متغیر وکل متغیر حادث، ان دونوں مقدمہ کو ترتیب دے کر العالم حادث کا نتیجہ برآمد ہوا، تو یہ اختیاری تصدیق ہے، اضطراری تصدیق کی صورت یہ ہے کہ ہم کسی مقصد سے کسی جگہ جا رہے ہوں اور اچانک کسی مکان پر نظر پڑ گئی جس کا قصد و ارادہ بھی نہیں تھا، پھر بھی مکان کا یقین ہو گیا تو یہ تصدیق اضطراری ہے، منطق کی تصدیق دونوں کو شامل ہے لیکن ایمان شرعی میں جو تصدیق ہے اس میں صرف اور صرف اختیاری داخل ہے، اضطراری تصدیق کو ایمان نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اہل کتاب کو تصدیق تھی، چنانچہ کہ یعزقونہ کما یعزقون ابنائہم سے ظاہر ہے، اور جیسا کہ ابوسفیان کی زبانی آپ کے حالات سن کر ہر قل کو تصدیق ہو گئی تھی، چونکہ یہ اضطراری تھی اس لئے ان کو مؤمن نہیں کہا جاتا اسی لئے بعض لوگوں نے ثبوت ایمان کے لئے التزام طاعت کی بھی قید لگائی ہے، اور اسی بات کی طرف قرآن نے ”و یسلّموا تسلیماً“ سے اشارہ کیا ہے، (۳) تیسرا فرق، اگر کسی شخص کو کسی بھی طرح کسی چیز کا علم یقینی حاصل ہو، لیکن ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر انکار کرتا ہے، تو مناطحہ کی اصطلاح میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کو تصدیق حاصل ہے، کیونکہ تصدیق ان کے نزدیک علم و ادراک کا نام ہے، لہذا ضد اور انکار کے باوجود تصدیق ممکن ہے جبکہ نفس تصدیق ماننے کا نام ہے نہ کہ صرف جاننے کا، اس لئے تصدیق لغوی ضد اور انکار کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، (۴) چوتھا فرق، تصدیق منطقی میں ظنیات بھی داخل ہیں، جبکہ تصدیق لغوی صرف یقینیات پر مشتمل ہوتی ہے، غرض ان فرقوں کی وجہ سے تصدیق لغوی تصدیق منطقی کے مترادف نہیں بلکہ الگ الگ ہے۔ ”م

(۵) علامہ ابن تیمیہؒ نے تصدیق کی تعریف میں غیب کی بھی قید لگائی ہے، انہوں نے بہت قیمتی بات لکھی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے، اس لئے امانت و اعتماد کے معنی اس میں ملحوظ ہوں گے، جبکہ تصدیق کے مادہ میں یہ خصوصیت نہیں ہے، اس لئے ہر خبر خواہ اس میں مخبر کی امانت داری کی ضرورت ہو یا نہ ہو، تصدیق کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے، لیکن ایمان کا لفظ انہیں خبروں میں محدود رہے گا، جو اپنی چشم دید نہ ہو، بلکہ مخفی ہو کیونکہ تصدیق کی جائزگی تو

صرف خبر کی امانت و دیانت، اور اسکے اعتماد کی بنا پر، اسی لئے اگر کوئی شخص طلوع آفتاب، یا السہلہ فوقا کی خبر دے تو اس کے جواب میں آمنت نہیں کہا جاسکتا، اسی طرح کسی چیز کا دو شخص مشاہدہ کریں تو لفظ ایک دوسرے کی تصدیق کے لئے صدق احدہما صاحبہ کہا جاسکتا ہے، آمین لہ، نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ یہاں تصدیق کے لئے دوسرے پر اعتماد کی کیا ضرورت؟ ایمان کی اسی خصوصیت کو سورہ بقرہ میں "یؤمنون بالغیب" سے بیان کیا ہے کہ ایمان کا تعلق مغیبات سے ہے نہ کہ مشاہدات سے، اس سے بھی تصدیق منطقی اور تصدیق شرعی کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

## ایمان کے معنی پر اشکال

تصدیق کے بارے میں معلوم ہو چکا، کہ وہ اذعان و یقین کا نام ہے، جس میں کسی قسم کا تردد اور شبہ باقی نہ رہے، لیکن قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انکار ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے، حالانکہ انکار یقینی طور پر کفر ہے، قرآن کریم میں ہے "وَجِدُوا بَیْہَا وَاسْتِیْقِنَہَا اَنْفُسُہُمْ ظُلْمًا وَعُدُوْا، اَیْکَ اور جبکہ ارشاد ہے "فَلَمَّا جَاہَلُہُمْ مَا عَرَفُوْا کُفِرُوْا بِہُ" ان آیات میں یقین و معرفت، خود و انکار کے ساتھ جمع ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان انکار کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ ناممکن ہے۔

اس شبہ کو دور کرنے کیلئے حضرات فقہاء نے اقرار لسانی کو ایمان کیلئے شرط لازم قرار دیا ہے، تاکہ جاعدین، اور منکرین کی تصدیق، ایمان شرعی کی تعریف سے خارج ہو جائے، وجہ یہ ہے کہ منکر زبان سے اقرار کر ہی نہیں سکتا، اور جو اقرار کر لے گا پھر انکار کر ہی نہیں سکتا، فقہاء نے اقرار کو ضد اور مقابل سمجھ کر اقرار باللسان کو شرط قرار دیا، تاکہ اس قسم کی معرفت و یقین ایمان سے خارج ہو جائے، اب جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ اہل کتاب کو اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا پورا پورا یقین تھا، لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتے تھے، بلکہ منکر تھے اس لئے ان لوگوں کی تصدیق کا کوئی اعتبار نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کو مؤمن نہیں کہا گیا، کیونکہ اقرار باللسان جو ایمان کے لئے شرط ہے وہ موجود نہیں، اذافات الشرط فانت العشر و ط .

اسی سوال کا جواب صدر الشریعہ نے اس طرح دیا کہ تصدیق منطقی، تصدیق اضطراری اور اختیاری دونوں کو شامل ہے، جبکہ ایمان میں صرف تصدیق اختیاری معتبر ہے کیونکہ ایمان پر ثواب ملتا ہے، اور ثواب فعل اختیاری پر ملا کرتا ہے، لہذا ایمان میں جس تصدیق کی ضرورت ہے اس کے ساتھ خود جمع نہیں ہو سکتا، کیونکہ جو شخص بلا کسی جبر و اکراہ کے کسی کی تصدیق اپنے ارادہ و اختیار سے کر لیا، پھر وہ انکار نہیں کر سکتا، اور جس تصدیق کے ساتھ خود جمع ہو رہا ہے وہ ایمان میں معتبر نہیں، کیونکہ اہل کتاب کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اضطراری تصدیق حاصل تھی۔

علامہ تفتازانی نے اس اشکال کا جواب دوسرے انداز میں دیا ہے ان کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ جس تصدیق کے ساتھ خود جمع ہو گا وہ حقیقت وہ تصدیق ہی نہیں ہوگی، بلکہ وہ تصور ہوگا تصدیق تو اس یقین کو کہا جاتا ہے جس میں مصدق مصدق بہ کو تسلیم بھی کرتا ہو، گویا علامہ تفتازانی کے نزدیک منکرین کی تصدیق، تصدیق میں داخل ہی نہیں، بلکہ وہ تصور میں داخل ہے، اس لئے علامہ کے نزدیک خود و تصدیق کے جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

علامہ کشمیری کی رائے یہ تھی کہ بات دینی اچھی معلوم ہوتی ہے جو صدر الشریعہ نے ذکر فرمائی ہے کیونکہ جس تصدیق کے ساتھ انکار جمع ہو حکم کے نزدیک وہ تصدیق ہی کہلائے گی، تصور ہونے کا کوئی قائل نہیں، علامہ کشمیری فرمایا کرتے تھے کہ ایمان کی تعریف میں التزام طاعت اور دین اسلام کے ماسواہ سے براہت ظاہر کرنے کی قید ملحوظ رکھنا چاہئے، اور اسی پر ایمان کا دار و مدار ہے، اور کفر سے نکلنے کیلئے التزام طاعت ضروری ہے، اس کی وجہ سے ابوطالب، ہرقل اور اہل کتاب کے ایمان کے سلسلے میں اشکال بھی دور ہو جاتا ہے، اسلئے کہ ابوطالب اور ہرقل نے گرچہ دین کی حقانیت کا اعلان کیا مگر اسکے مطابق زندگی گزارنے کا التزام نہیں کیا۔ (۱)

ایمان کی تعریف میں دوسرا لفظ ضروری ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کا دین میں سے ہونا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا تو اثر اور دلیل قطعی سے ثابت ہو، اور اس درجہ مشہور ہو چکی ہو کہ عامۃ الناس کی معتد بہ جماعت جانتی ہو، ایمان کی تعریف میں تو اثر کی قید سے وہ چیزیں نکل جاتی ہیں جو خبر آحاد سے ثابت ہوں کیونکہ ان کے انکار سے کفر لازم نہیں آتا، لہذا اب ضرورت کا مطلب یہ نکلا کہ جس کے متعلق قطعی علم ہو کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اگرچہ وہ مستحب ہی کیوں نہ ہو، جیسے سواک، کہ اس کا انکار اسی طرح کفر ہو گا کہ کوئی کہے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ پیدا ہی نہیں ہوئے۔

یہاں ضرورت کے معنی بدیہی کے نہیں جو نظری کے مقابل ہے کیونکہ دین میں بہت سی ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جو نظری ہیں، اور اس کا ماننا بھی ضروری ہے جیسے توحید الہی، عذاب قبر، حدوث عالم وغیرہ، یہ چیزیں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہیں، اور ان کا جزو دین ہونا یقینی طور سے معلوم ہے۔ (۲)

ایمان کی تعریف میں "اجمالاً فیما علم اجمالاً" کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک حکم اجمالی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو مؤمن ہونے کیلئے اس کا اجمالی علم کافی ہے، جیسے عذاب قبر کہ اس کا علم اجمالی طور پر ہونا کافی ہے، باقی یہ تفصیل کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟ تو اس کا حلیم کرنا ضروری نہیں نہ اس کا منکر کافر ہو گا، ہاں مبتدع ضرور کہلائے گا۔

### ایمان مرکب ہے یا بسیط ؟

ایمان چند اجزاء سے مرکب ہے یا اس میں کوئی جزء نہیں؟ اس سلسلہ میں اختلاف ہے،

بعض حضرات چند اجزاء سے مرکب مانتے ہیں، اور بعض حضرات اس کو بسیط مانتے ہیں، سب سے پہلے اس کے اجزاء کی تفصیلات معلوم کریں کہ وہ کیا کیا ہیں، کسی چیز کے وجود کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) یعنی ان تینوں قسموں میں لفظی وجود سب سے کمزور وجود ہے کسی چیز کے وجود میں جو مقاصد ملحوظ ہو سکتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی وجود لفظی پر مرتب نہیں ہوتے، پانی کا لفظی وجود کسی پیاسے کی پیاس نہیں بجھاتا، اور نہ صرف روٹی کا زبانی تذکرہ کسی بھوکے کا پیٹ بھر سکتا ہے۔

وجود ذہنی گرچہ وجود لفظی سے قوی تر ہے مگر شئی کے آثار، اغراض و مقاصد مرتب ہونے کے لئے یہ بھی ناکافی ہے۔ وجود یعنی وہ وجود ہے جو خارج میں کسی کے اعتبار کے بغیر موجود ہوتا ہے اسی وجود کو درحقیقت وجود کہا جاسکتا ہے، اور

اس پر شکی کے سارے احکامات مرتب ہوتے ہیں اسی لئے جب کوئی پیاسا پانی مانگتا ہے تو اس کا مقصد پانی کا ہی وجود سمجھا جاتا ہے، اس کا لفظی اور ذہنی وجود کسی کے خواب و خیال میں نہیں آتا، بالکل اسی طرح ایمان کے وجود کی تین صورتیں ہیں (۱) لفظی، دو اقرار باللسان ہے (۲) ذہنی، تصدیق بالہیمنان ہے (۳) عملی، عمل بالارکان ہے۔ سابق تمہید کی بنا پر ایمان کا لفظی وجود بیکار محض ہونا چاہئے، جیسا کہ کسی پیاسے کے لئے پانی کا صرف لفظی وجود کار آمد نہیں ہوتا، توانیہ کی دعوت کے جواب میں اقرار باللسان کیا مفید ہو سکتا ہے؟ لیکن یہاں ایک دشواری پیش آتی ہے کہ انسان جو سرِ پلا محتاج ہے وہ اپنی مافی الضمیر کو الفاظ و حروف کا جامہ پہنائے بغیر ادا نہیں کر سکتا، اس کی قلبی ترجمانی کا یہی ایک ذریعہ ہے اگر وہ بھی ناقابل اعتبار ٹھہرا دیا جائے تو عالم انسانی کا تمام کار و بار معطل اور بیکار ہو جائے اسی لئے ایمان کا لفظی وجود بھی ایک حد تک قابل اعتبار سمجھا گیا ہے۔

### ایمان کے مرکب و بسیط ہونے میں مذاہب کی تفصیل

ایمان کی حقیقت میں بہت زیادہ اختلاف ہے، ایک گروہ کا خیال ہے کہ ایمان بسیط ہے یعنی تصدیق قلبی کا نام ایمان ہے، پھر اس میں بھی دو جماعت ہو گئی ایک اہل سنت کی اور ایک اہل بدعت کی۔ اور جو لوگ ایمان کو مرکب مانتے ہیں ان میں بھی اختلاف ہے، کہ یہ مرکب ثنائی ہے، یا ثلاثی؟ علامہ بیہقی نے اس اختلاف کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ (۱) ایمان کے بسیط ماننے والے اہل سنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق بالقلب ہے البتہ اقرار باللسان احکام دنیوی کے لئے شرط ہے، اور عمل بالارکان مکملات ایمان، اور فردوع ایمان ہے۔ (۲) ایمان کو بسیط ماننے والے اہل بدعت کی چند جماعتیں ہیں

ایمان کی حقیقت صرف تصدیق بالقلب ہے، اقرار باللسان نہ تو شرط ہے نہ ہی خطر ایمان ہے، نیز فرقہ مرجیہ ایمان کو تحمیل ایمان میں کوئی دخل نہیں، بلکہ ان کا مشہور مقولہ ہے "لا تضرم مع الایمان معصیۃ" کما لاتنفع مع الکفر طاعة۔ ان کا استدلال "من قال لا اله الا الله دخل الجنة وإن زنى وإن سرق۔" نیز عقلی استدلال کہ قلب میں نفس تصدیق و ایمان کے ہوتے ہوئے معصیت مضر اور نقصان دہ ہو، اور عدم اقرار باللسان اور معصیت کی بنا پر جہنم میں ڈالا جائے تو ایمان کا جہنم میں لے جانا لازم آئے گا اور یہ ایمان کی توہین ہے۔

اس فرقہ کا جواب یہ ہے کہ "وإن زنى وإن سرق" کے الفاظ پر تو نظر رکھی لیکن دیگر روایات "لا یدخل الجنة نمام" "لا یدخل الجنة قتات" "من یقتل مؤمناً منعداً فجزاءه جہنم" وغیرہ کی طرف دیکھا ہی نہیں، ظاہر ہے اگر اسی طرح ظاہری معنی کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ہو تو کہنا چاہئے کہ مؤمن عاصی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، عقلی دلیل اس وقت کار آمد ہو سکتی ہے جبکہ نصوص نہ ہوں یہاں مؤمن عاصی کا جہنم میں جانا احادیث متواتر المعنی اور دلیل قطعی سے ثابت ہے، تو اب عقلی گھوڑا دوڑانا بے عقلی اور گمراہی ہے، حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ ایمان قلب کے لئے شاہی لباس ہے، اور ضابطہ ہے کہ جب شاہی لباس والے کو جیل میں ڈالا جائے تو پہلے شاہی لباس اتار

دیا جاتا ہے تاکہ تو بین نہ ہو تو اسی طرح ایمان قلب سے نکال کر انسان کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

**جہمیہ** | اس فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ ایمان کے لئے معرفت بالقلب کافی ہے، تصدیق بھی ضروری نہیں، صرف علم و یقین کافی ہے۔ استدلال "من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة" کہتے ہیں کہ اس میں کہیں تصدیق کا نام نہیں ہے، شخص علم و معرفت پر دخول جنت کی بشارت ہے۔

لیکن اس مسلک پر حیرت ہے کیونکہ نفس علم و معرفت کا نام اگر ایمان ہے تو پھر فرعون کو مؤمن کہہ کیونکہ حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا "لقد علمت ما انزل هؤلاء الا رب السموات والارض" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو علم تھا، اسی طرح "يا اهل الكتاب لم تلبسون الحق بالباطل وانتم تعلمون" مگر علم و معرفت کے باوجود اہل کتاب کو کافر کہا گیا، خواجہ ابوطالب کو بھی تو علم یقین حاصل تھا جیسا کہ ان کے شعر سے ظاہر ہے۔

و عرفت دينك لامحالة انه

دعوتني وزعمت انك صادق

پھر بھی ان کو مؤمن تسلیم نہیں کیا گیا۔

ربان کا استدلال حدیث کے لفظ "وهو يعلم" سے تو اس کا معنی یؤمن، ویصدق کے ہیں۔

**کرلمیہ** | ایمان کی حقیقت صرف اقرار باللسان ہے، معرفت بالقلب شرط اور ضروری نہیں، البتہ دل میں انکار نہ ہونا چاہئے، ان کا استدلال یہ ہے کہ منافقوں کے ساتھ مسلمان جیسا برتاؤ کیا گیا، اور حضرت اسامہ کے واقعہ میں "فهلأ شققت قلبه" کہا گیا، زبانی اقرار کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔

لیکن ان کی نظر منافقوں کے ظاہری برتاؤ پر تو گئی، مگر قرآنی آیت "وما هم بمؤمنين" "ان المنافقين في الدرك الأسفل من النار"، "ان المنافقين لکذوبون" پر نظر نہیں پڑی، اسی طرح لاتصل علی احد منهم مات ابدأ ولا تقم علی قبره پر غور نہیں کیا کہ زبانی اقرار کے باوجود انکے ایمان کی نفی کی گئی، اگر یہ حضرات مذکورہ آیتوں اور ایمان کے معنی پر توجہ کئے ہوتے تو ایسا عقیدہ نہ رکھتے، جہاں تک حدیث کا جواب ہے تو وہ یہ ہے کہ تصدیق قلبی ایک امر مخفی ہے، دل کے حال کا معلوم کرنا ممکن نہیں، جبکہ دنیوی معاملات میں انسان مکلف ہے ظاہر کا، لہذا ہم کو حکم ہے کہ جب کوئی شخص کلمہ پڑھے تو اس کو مؤمن سمجھو۔

ایمان کو مرکب ماننے والے کی بھی دو جماعت ہے، ایک اہل سنت والجماعت کی اور دوسری اہل بدعت کی، اہل سنت میں محدثین شوافع شامل ہیں، ان حضرات کے نزدیک ایمان امور ثلاثہ سے (تصدیق بالجنان، اقرار باللسان، عمل بالارکان) مرکب ہے، لیکن تارک عمل خارج از ایمان یا داخل فی الکفر نہیں ہے، ایمان کے مرکب کہنے والوں میں مشہور اہل بدعت، جماعت معتزلہ اور خارجیہ ہے۔

**معتزلہ** | ایمان تصدیق بالقلب، اقرار باللسان، عمل بالارکان کے مجموعہ کا نام ہے، اگر ان میں سے ایک بھی فوت ہو جائے تو ایمان باقی نہیں رہتا، نیز مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جائے گا، البتہ کافر نہ ہوگا، مؤمن تو اس لئے نہیں رہا کہ اس نے حکم عدولی کی، اور کافر اس لئے نہیں ہوا کہ تصدیق موجود ہے۔

## خوارج

اس کا مذہب بھی معتزلہ کی طرح ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے نزدیک مرکب کبیرہ کافر ہو گا، مگر یہ دونوں فرقہ اس بات پر متفق ہیں کہ ایمان تینوں سے مرکب ہے، نیز اس پر بھی اتفاق کیا کہ مرکب کبیرہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اور اس کی وجہ سے ایمان خارج ہو جائے گا، البتہ کافر ہونے میں اختلاف ہے، ان دونوں کا استدلال یہ ہے کہ بہت سی احادیث میں ایمان کا اطلاق عمل پر کیا گیا ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل ہے، اسی طرح من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر، لایزنی الزانی حین یزنی وهو مؤمن، سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی اور تارک صلوٰۃ کافر ہو جاتا ہے، اس مسلک پر ایک رکیک شبہ وہ لوگ یہ پیش کرتے ہیں کہ خود بخود کوئی بھی آگ میں کودنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس کے نقصان کو جانتا ہے، اسی طرح مؤمن کو یقین ہے کہ زنا جہنم میں جانے کا سبب ہے، تو وہ کبھی زنا نہیں کرے گا مگر جب زنا کاری کر بیٹھتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس کے دعویٰ ایمان میں ضعف ہے، لہذا ضعف کی وجہ سے ایمان سے خارج ہو گیا۔

جواب :- بہت ساری آجوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان کا جزء نہیں، جیسا کہ وہ آیتیں آئندہ آنے والی ہیں، تو جن احادیث میں اعمال پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے، اس کی تاویل کی جائیگی تاکہ دونوں میں تضاد نہ رہے، اور ہر ایک کا مقصود باقی رہے، (۱) قرآنی آیات اعمال کے جزء ایمان نہ ہونے پر صریح اور واضح ہیں اور احادیث مبہم ہیں، ظاہر ہے کہ صریح کو مبہم پر ترجیح ہوتی ہے۔

(۲) جن آجوں سے یہ دونوں فرقہ اپنے مسلک کو ثابت کرتے ہیں، درحقیقت وہ آیتیں خود ان کے خلاف ہیں کیونکہ ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ہی ایمان ہیں، حالانکہ یہ دونوں فرقہ تین چیز کے مجموعہ کو ایمان کہتے ہیں فضا ہو جوابکم فہو جوابنا؟ ان کی عقلی دلیل کہ معصیت کا ارتکاب تصدیق کی کمی کی دلیل ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ چور جانتا ہے کہ چوری کرنا جرم ہے، پکڑے جانے پر جیل جانا پڑے گا لیکن اس یقین کے باوجود وہ چوری کرتا ہے کہ شاید نہ پکڑا جاؤں یا پکڑا جاؤں، تو جرم ثابت نہ ہو سکے، یا کوئی سفارش کر دے، یا حاکم معاف کر دے، تو چوری کے قابل مواخذہ کے یقین ہونے کے باوجود چوری کرنا یہ دلیل نہیں کہ اس کے جرم ہونے کا اس کو یقین کامل نہیں اسی طرح ایمان کی حالت میں معصیت کے ارتکاب کا معاملہ ہے۔

ترک صلوٰۃ اور زنا سے متعلق ان کے استدلال کا جواب باب کے تحت آجائیگا۔

## مشکلمین اور محدثین کے اختلاف کی حقیقت

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ایمان محدثین و شوافع کے نزدیک تینوں سے مرکب ہے، اور فقہائے احناف و مشکلمین کے نزدیک بسیط ہے، اور صرف تصدیق کا نام ایمان ہے، اس سے بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت میں ان حضرات کا یہ اختلاف حقیقی ہے نہ کہ لفظی۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان حضرات کے مابین حقیقی اختلاف قطعاً نہیں، صرف تعبیر و عنوان یا ماحول و وقت کا اختلاف

ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ ایمان کے جو تین اجزاء ہیں تصدیق، اقرار، اور عمل، اگر کسی انسان سے تصدیق نکل جائے تو چاہے اقرار باقی رہے لیکن یہ اقرار مفید نہیں ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ تصدیق میں خلل آجانے سے ایمان ہی رخصت ہو جاتا ہے، اور عمل میں خلل آجانے سے فاسق کہلاتا ہے، کافر نہیں کہلاتا۔  
گویا اہل سنت کے یہاں جو حیثیت تصدیق کی ہے وہ حیثیت عمل کی نہیں ہے تصدیق مدہ ایمان ہے، عمل مدہ ایمان نہیں، ہاں کمال ایمان کے لئے عمل ضروری ہے۔

یہ ہم نے اس لئے کہا کہ احناف کے اوپر بعض اہل حدیث نے مرجیہ، ہونے کا الزام لگایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بڑے پیر صاحب نے بھی اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں احناف کو مرجیہ کہا ہے۔ (۱)  
اس کا جواب یہ ہے کہ غنیۃ الطالبین کے ابتدائی نسخوں میں یہ عبارت موجود ہی نہیں تھی، بعد کے نسخوں میں یہ عبارت حاشیہ میں شامل کر دی گئی، اس کے بعد جب دوبارہ طبع ہوئی تو اس کو اصل کتاب میں شامل کر دیا گیا، درحقیقت احناف کو بدنام کرنے کی یہ ایک سازش تھی، کہ بڑے پیر صاحب بھی ان کو مرجیہ کہتے ہیں۔

علامہ زہیدؒ نے شرح احیاء العلوم میں یہی لکھا ہے کہ یہ عبارت الحاقی ہے۔ (۲)  
اور اگر الحاقی نہیں بلکہ غنیۃ کی اصل عبارت تسلیم کر لی جائے، تب بھی اس سے احناف پر یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ بعض حنفی اگر اس کے قائل ہو گئے ہوں تو پھر حضرت امام ابو حنیفہؒ یا سارے احناف مرجیہ کیونکر کہلا سکتے ہیں۔ (۳)  
اس کا اثر ای جواب یہ ہے کہ اگر ایمان بسیط ماننے کی وجہ سے احناف مرجیہ ہو جاتے ہیں تو محمد ثین مرکب کہنے کی وجہ سے (العباد باللہ) معتزلہ ہو جائیں گے، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے، عبدالمکریم شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں اس کا یہ بھی جواب دیا ہے کہ مرجیہ دو طرح کے ہیں (۱) اہل سنت (۲) اہل بدعت، احناف کا شمار اہل سنت میں ہوتا ہے، مزید تفصیل کیلئے دیکھئے شرح فقہ اکبر کی شرح تعلیم الایمان (ص ۳۹۱) اور فیض الباری (۱/۹۱)۔

### مرکب و بسیط ہونے پر محاکمہ

امام ابو حنیفہؒ اور متکلمین ایمان کو بسیط کہتے ہیں، اور محمد ثین مرکب کہتے ہیں ان دونوں تعبیرات کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر جانچنا چاہئے، کہ ایمان کو بسیط ماننا اسلوب قرآن سے زیادہ قریب ہے، یا مرکب کہنا قرآنی اسلوب سے قریب تر ہے، قرآنی آیات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نگاہ میں ایمان بسیط ہے، اور اس کا ثبوت قرآن کی بیشتر آیات سے ملتا ہے جو ذیل میں درج ہیں :

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ : ایمان اور عمل صالح کے درمیان واؤ عطف ہے جو مغایرت پر دلالت کرتا ہے، اگر اعمال صالحہ ایمان کا جزء ہوتے تو بیچ میں واؤ عطف نہیں لایا جاتا۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اعمال کا ذکر زیادتی و اہتمام کی غرض سے ہے، جیسے ملائکہ کے ذکر کے بعد

مزید اہتمام کی غرض سے جبرئیل، میکائیل کا ذکر قرآن میں ہے، لیکن زیادتی اہتمام کا یہاں مقدمہ ہی غلط ہے کیونکہ مزید اہتمام کے لئے کسی چیز کا ذکر اس وقت ہوتا ہے جبکہ پہلی چیز سے بعد کی چیز زیادہ اہم ہو، جیسا کہ اوپر کی مثال میں تمام ملائکہ سے جبرئیل، میکائیل زیادہ اہم ہیں اور یہاں تو معاملہ برعکس ہے یعنی ایمان عمل سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ ایمان ہی اصل ہے۔ اسی طرح بہت سی آیتوں میں بندوں کو لفظ آمنوا سے خطاب ہے، اور اسکے بعد اعمال صالحہ کا حکم، مثلاً یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام الخ (۲) یا ایہا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوہکم (۳) یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص، ان جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال، ایمان کے مفہوم سے خارج ہیں ورنہ "آمنوا" کہنے کے بعد اعمال کے مستقل ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

(۲) قرآن میں اعمال کو ایمان کے ساتھ بطور شرط ذکر کیا گیا ہے من یعمل من الصلٰت وهو مؤمن فلا کفران لہ، ایک دوسری آیت میں حرف شرط صراحۃ مذکور ہے واصلحوا ذات بینکم، واطیعوا اللہ ورسولہ ان کنتم مؤمنین، تو شرط کے ساتھ مذکور ہونا دلیل ہے کہ اعمال ایمان سے خارج ہیں، کیونکہ شرط مشروط سے خارج ہوا کرتی ہے۔

(۳) اگر اعمال کو جزو ایمان قرار دیا جائے تو محاصی ایمان کی ضد ہو جائیں گے، اور یہ بات مسلم ہے کہ کوئی شئی اپنی ضد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، جبکہ قرآن میں مصیبت کرنے والے کو مؤمن سے مخاطب کیا ہے مثلاً وان طاشت من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما، اسی طرح یا ایہا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا ایک دوسری جگہ، توبوا الی اللہ جمیعاً۔

(۴) اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ بھی ہے کہ قرآن میں ایمان کی دعوت، لفظ آمنوا سے دی گئی ہے، اور اہل عرب اس لفظ کو تصدیق کے ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور اب تک یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ تصدیق کے علاوہ کسی اور معانی میں استعمال کیا گیا ہو، اور یہ ناممکن ہے کہ ایمان جیسا معروف اور کثیر الاستعمال لفظ کسی دوسرے معنی میں منقول ہوا یا مستعمل ہو اور اہل لغت اس کا ذکر نہ کریں۔

(۵) قرآن کریم میں ایمان کا مکمل قلب کو بتایا گیا ہے، اور اعمال کا مکمل نہیں معلوم ہے کہ وہ اعضاء و جوارح ہیں، قرآن میں ہے اولئک کتب فی قلوبہم الایمان ایک دوسری جگہ ہے ولما لم یدخل الایمان فی قلوبکم ایک تیسری جگہ ہے قالوا آمنّا بافواہم ولم تؤمن قلوبہم ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ عمل ایمان کا جزء نہیں ہے، ایمان محض تصدیق قلبی کا نام ہے جو بسیط ہے اور یہی حکیمین اور امام ابو حنیفہ کی تعبیر ہے۔

اب احادیث کی روشنی میں محاکمہ ملاحظہ ہو..... (۱) حدیث جبرئیل اس کی واضح دلیل ہے کیونکہ ما الایمان؟ کے جواب میں الایمان ان تؤمن باللہ وملائکتہ الخ ہے اعمال کا کہیں ذکر نہیں، (۲) ایک اور حدیث میں جس کے راوی ابوذر غفاریؓ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صدق دل سے لا الہ الا اللہ کا قائل ہو جائے، وہ جنتی ہے ابو ذر نے دریافت کیا وان زنی وان سرق تو آپ نے فرمایا وان زنی وان سرق، اس سے صاف معلوم ہوا کہ اعمال



ایمان سے خارج ہیں ورنہ معصیت کے ساتھ ایمان جمع نہیں ہو سکتا۔

بہر حال امام ابو حنیفہؒ کی تعبیر قرآن کی تعبیر کے بالکل مطابق ہے، اور محدثین کی تعبیر حدیث کی تعبیر کے مطابق ہے اب خود ہی انصاف کرو کہ امام ابو حنیفہؒ اور محدثین کی تعبیر میں کوئی اعلیٰ تعبیر ہے، کیا جو انسان قرآنی تعبیر کی پوری رعایت کرے وہ دوزخ کا مستحق ہے یا نہ مت کا؟ یا اللعجب!! فبہای حدیث بعدہ یؤمنون (۳) امام ابو حنیفہؒ کی تعبیر کی حمایت میں قرآن سے جو دلائل پیش کئے گئے انہی آیتوں سے معتزلہ اور خوارج کی بھرپور تردید ہوتی ہے۔

### حضرت شاہ ولی اللہؒ کی رائے

مشکلمین و محدثین کے مابین اختلاف کو دور کرنے کی ایک وہ بھی صورت ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ذکر فرمائی ہے، ان کی تحقیق یہ ہے کہ اہل سنت کے درمیان نزاع کو نزاع لفظی سے تعبیر کرنا کوئی وزنی بات نہیں، بلکہ نزاع حقیقی ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایمان دو قسم کا ہے ایک ایمان دنیاوی اور ایک ایمان اخروی۔ ایمان دنیاوی کا مطلب، دنیا میں کسی انسان کو مسلمان سمجھنا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ کرنا، اگر مر جائے تو اس پر جنازہ کی نماز پڑھنا، مسلم مقبرہ میں دفن کرنا، اور اس کے حق میں استغفار کرنا وغیرہ۔

اور ایمان اخروی وہ ایمان ہے، جو انسان کو مرنے کے بعد فوراً جنت میں پہنچا دے، جہنم جانے کی بالکل نوبت نہ آئے، ظاہر ہے ان دونوں ایمان میں بڑا فرق ہے، دنیاوی احکام جاری ہونے کے لئے صرف تصدیق کافی، عمل ضروری نہیں اور ایمان اخروی جو مؤمن کو فوراً جنت میں پہنچا دے یہ وہی ایمان ہے جس میں عمل ہو، برائیوں سے اجتناب ہو۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مشکلمین اور امام ابو حنیفہؒ ایمان دنیاوی سے بحث کرتے ہیں، اور وہ بسیط ہے۔ اور محدثین ایمان اخروی سے بحث کرتے ہیں اور وہ یقیناً مرکب ہے، ظاہر ہے کہ دونوں ایمان مختلف ہیں لہذا دونوں کی تعبیر میں فرق لازمی ہے، اس لئے اس کو نزاع لفظی نہیں کہا جاسکتا، ہاں اتنی بات ہے کہ اگر محدثین سے یہ دریافت کیا جائے کہ جو ایمان انسان کو غلہ دنی النار سے بچا دے، وہ مرکب ہے یا بسیط؟ تو یقیناً ان کا جواب ہو گا کہ وہ بسیط ہے، اور مشکلمین سے دریافت کیا جائے کہ جو ایمان جہنم سے ہر طرح سے بچا دے، وہ مرکب ہے یا بسیط؟ تو یقیناً ان کا جواب ہو گا کہ مرکب ہے۔

اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ نے ایک اور بات فرمائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ محدثین و مشکلمین کی تعبیر کا اختلاف زمانہ کے اختلاف کی وجہ سے ہے، مشکلمین کا زیادہ مقابلہ معتزلہ اور خوارج سے رہا، چونکہ معتزلہ اور خوارج ایمان کو مرکب مانتے ہیں، تو ان کی بھرپور تردید کے لئے مشکلمین نے اس کو بسیط کہا، اور محدثین کا زیادہ مقابلہ مرجئہ وغیرہ کے ساتھ رہا جو عمل کو ایمان سے الگ مانتے ہیں ان کی بھرپور تردید کے لئے محدثین نے ایمان کو مرکب کہا، خواہ کمال ہی کیلئے کیوں نہ ہو۔

### اقرار باللسان کی حیثیت

اقرار باللسان میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا ہونی چاہئے، ایک جماعت رکن کی حیثیت جو یز کرتی ہے، اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے، پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک قسم کی تصدیق کا نام ہے، فرق

ہے تو یہ ہے کہ ایک تصدیق قلب سے ہوتی ہے، اور اقرار زبان کی تصدیق ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن، اور دوسری شرط قرار دے دی جائے، یہ اور بات ہے کہ تصدیق قلبی رکن اصلی ہے، یعنی کسی حالت میں اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جبکہ اقرار رکن زائد ہے بعض حالات میں اس سے چشم پوشی کر لینا بھی ممکن ہے، جیسا کہ اگر وہیں۔

شیخ ابو منصور ماتریدی، شیخ ابوالحسن اشعری، اور امام نسبی کار جہان اقرار کی شرطیت کا ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ثبوت اسلام سے قبل ہی احکام اسلام نافذ کر دینا غیر معقول ہے، اور زبانی اقرار کئے بغیر ہمارے پاس اسلام پر کوئی شہادت نہیں اس لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ نفاذ احکام اسلامیہ کے لئے اقرار باللسان کو شرط کہا جائے۔ (۱)

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ اگر اس اقرار کا مقصد نفاذ احکام کا ممکن ہونا ہے تو پھر تنہائی کا اقرار کافی نہ ہوتا چاہئے، بلکہ کم از کم مسلمانوں کے امیر کے سامنے ہونا چاہئے تاکہ اجراء احکام کا اصل مقصد حاصل ہو سکے، بہر حال دونوں فریق کا اس پر اتفاق ہے کہ مطالبہ کے بعد زبان سے اقرار کرنا بہر کیف ضروری ہے، کیونکہ اب اقرار نہ کرنے کے معنی گویا انکار کرنا ہے جو کفر جوہد کہلاتا ہے۔

حضرت شلہ کشمیری فرماتے تھے کہ ہمارے فقہاء نے ایمان کیلئے بطور شرطیت اقرار کا اضافہ اسی بنا پر کیا ہے کہ جو تصدیق قلبی زبانی اقرار کیساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہ رہے، نیز جب زبان کے لئے اقرار کرنا لازم ہو جائے گا تو اب انکار کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس کو دوسری طرح ادا کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب تک اقرار نہ ہو، ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ کہ اس کے قلب میں ھیچ تصدیق موجود ہے ہذا اگر ایک شخص مطالبہ کے بعد بھی اقرار نہیں کرتا تو ہم اسی پر محمول کریں گے کہ اس کو تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اقرار باللسان کو ایمان کا جزء قرار دیدیا جائے۔

علامہ بدر عالم میرٹھیؒ نے اس کا حاصل اس طرح نکالا ہے کہ اگر اس کا یہی مقصد ہے جو حضرت شاہ صاحب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، تو رکیت اور شرطیت کا اختلاف بہت بڑھاتا نہ چاہئے، بلکہ اب مناسب یہ ہے کہ اختلاف کی تنقیح یوں کر دی جائے کہ اقرار باللسان بالاتفاق ضروری ہے، مگر ایک فریق نے اس کی اہمیت زیادہ محسوس کر کے رکیت کا لفظ کہہ دیا ہے، اور دوسری جماعت نے اہمیت کو تو تسلیم کیا ہے مگر رکیت کا لفظ نہیں کہا پھر اگر پہلے فریق نے رکن کہا ہے تو لفظ زائد کہہ کر ذرا خفیف بھی کر دیا ہے۔

### ”ایمان و اسلام کے درمیان نسبت“

اسلام کے معنی تابع ہونا، مان لینا، تسلیم و انقیاد۔ اور ایمان کے معنی تصدیق کے ہیں، امام غزالیؒ لکھتے ہیں ایمان کا محل قلب ہے زبان اس کی ترجمان ہے اور اسلام جو تسلیم و انقیاد ہے وہ قلب، زبان، جوارح تینوں کو شامل ہے کیونکہ تصدیق بالقلب بھی تسلیم ہی ہے لہذا لغوی اعتبار سے اسلام عام، اور ایمان خاص، گویا دونوں میں عموم و خصوص کی نسبت ہے تاہم قرآن و احادیث سے ان دونوں کے درمیان کئی نسبت سمجھ میں آتی ہے۔

## نسبت تراوف

فاخرجنا من كان فيها من المؤمنين فما وجدنا فيها غير بيت من المسلمين،  
وہاں صرف ایک ہی گھر تھا جس کے باشندے کو مؤمنین اور مسلمین کہا گیا۔ (۲)

یا قوم ان کنتم آمنتم بالله فعليه توكلوا ان كنتم مسلمين، ایک ہی قسم کے مخاطب کو مؤمن و مسلم کہنا، ایمان و اسلام کے مترادف ہونے کی واضح دلیل ہے۔

## نسبت تداخل

حدیث میں ہے سئل ای الاعمال افضل؟ فقال الاسلام، فقال ای الاسلام افضل؟ فقال الايمان،

## نسبت تباین

قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا، یہاں ایمان سے مراد تصدیق قلبی ہے، جس کی نفی کی گئی ہے اور اسلام سے زبان و جوارح کے ذریعہ اعتقاد مراد ہے، معلوم ہوا دونوں میں تباین ہے۔

## نسبت عموم و خصوص من وجہ

ایمان و اسلام کے درمیان یہ تینوں نسبت اعتباری فرق کے ساتھ صحیح ہو سکتی ہیں، اور مصداق الگ الگ ہو سکتے ہیں مثلاً تراوف اس وقت جبکہ دونوں سے ایمان کامل، اور اسلام کامل مراد ہو، اور اگر ایمان سے مراد صرف تصدیق قلبی ہو اور اسلام سے ظاہری تسلیم و اعتقاد تو دونوں میں نسبت تباین ہوگا، اور اگر اسلام سے مراد تسلیم بالقلب و عمل بالارکان ہو اور ایمان صرف تصدیق کو کہا جائے تو دونوں میں تداخل یعنی عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہوگی، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا رجحان امام غزالیؒ کے قول یعنی عموم و خصوص مطلق کی طرف محسوس ہوتا ہے، علامہ ابن تیمیہؒ کا رجحان تداخل کی طرف ہے، ابو طالب مکی لکھتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی مثال شہادتین کی طرح ہے کہ تو شہادت وحدانیت اور شہادت رسالت دو الگ الگ چیزیں ہیں، مگر ان دونوں میں ایسا ربط ہے کہ لحاظ حکم ایک ہی ہیں، رسالت کے بغیر شہادت توحید بیکار، اور شہادت وحدانیت کے بغیر اقرار رسالت بیکار، بالکل اسی طرح اسلام (اعمال ظاہرہ) اور ایمان (اعتقاد باطن) باہم مربوط ہیں۔

## ایمان میں کمی زیادتی کا مسئلہ

ایمان کے سلسلہ میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے یا نہیں؟ پہلے بطور تمہید کمی زیادتی کی صورتوں کو دیکھیں۔

(۱) ایمان میں کمی زیادتی کا تعلق صرف تصدیق سے ہو

(۲) ایمان میں کمی زیادتی عمل کے اعتبار سے ہو

(۳) ایمان میں کمی زیادتی مؤمن بہ کے اعتبار سے ہو (۱)

(۱) یعنی ابتدائے اسلام میں جب تک چند احکام تھے اس وقت اتنے ہی پر ایمان لازم ضروری تھا جیسے جیسے احکام بڑھتے گئے مؤمن بہ بڑھتے گئے یہاں تک

کہ پورے احکام آنے کے بعد الیوم اکملت اللہ کے اعلان کے ساتھ ساری شریعت پر ایمان لازم ضروری ٹھہرا۔

اس کی اور زیادتی کے سلسلہ میں مشہور ہے کہ محدثین اور اسلاف اس کے قائل ہیں، جبکہ امام ابو حنیفہؒ اس کے منکر ہیں لیکن حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے امام صاحب کی طرف اس نسبت میں کچھ تردد ہے، کیونکہ امام صاحب سے اس مسئلہ میں کوئی صراحۃً قول منقول نہیں، البتہ فقہ اکبر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ امام صاحب کی تصنیف ہے اس میں "الایمان لایزید ولا ینقص" موجود ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب کی تصنیف نہیں بلکہ ابو مطیعؒ کی کتاب ہے جو امام صاحب کے شاگرد ہیں، ظاہر ہے استاد و شاگرد کا ہم خیال ہونا ضروری نہیں، نیز یہ ابو مطیعؒ اپنی محدثین کے نزدیک غیر معتبر بلکہ علامہ ذہبیؒ نے ان پر بھی ہونے کا الزام لگایا ہے، انہیں سے شرح عقیدۃ الطحاوی میں ایک روایت منقول نقل ہے "الایمان لایزید ولا ینقص" (۱)

لیکن حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں اس کے سبھی روایۃً مجہول و مجروح ہیں، گویا یہ بھی ساقط الاعتبار ہے۔

البتہ طبقات الحنفیہ میں امام ابو یوسفؒ کے شاگرد ابراہیم بن یوسف اور احمد بن عمران سے منقول ہے کہ وہ زیادتی اور نقصان کے قائل تھے حالانکہ یہ احناف میں شامل نہیں، لیکن ابو عمرو مالکیؒ شرح موطا میں حضرت امام صاحب کے استاذ خاص حضرت حماد کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ وہ کی اور زیادتی کے قائل تھے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کا بھی یہی قول ہو، (۲) لیکن شیخ ابو منصور بغدادیؒ کی وضاحت سے امام صاحب کی طرف اس نسبت کی صحت پر یقین ہو جاتا ہے، وہ اپنی کتاب "الاسماء والصفات" میں لکھتے ہیں کہ امام ابوالحسن اشعریؒ نے اپنی تصنیف "المقالات الاسلامیہ" میں امام صاحب کا قول نقل کیا ہے کہ "الایمان لایتبعض ولا یزید ولا ینقص ولا یتفاضل الناس فیہ" کہ ایمان ذواجزاء نہیں کہ بعض جزو پر ایمان کافی ہو، اور ایمان نہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے، چونکہ شیخ ابو منصور ماتریدیؒ اور شیخ ابوالحسن اشعریؒ دونوں محتاط و معتد ہیں اس لئے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کی طرف اسکی نسبت صحیح ہے۔ (۳)

## اختلاف کی حقیقت

ایمان میں کی زیادتی کا جو اختلاف مذکور ہوا یہ اختلاف درحقیقت الفاظ و تعبیر کا اختلاف ہے نہ کہ حقیقت کا، گویا یہ اختلاف اختلاف لفظی ہے حقیقی نہیں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو،

یہ لفظی اختلاف دراصل فرع ہے ایک اصل مسئلہ کی، محدثین کے درمیان یہ موضوع بھی زیر بحث رہا کہ ایمان مرکب ہے یا بسیط؟ جو لوگ ایمان کو اعمال سے مرکب مانتے ہیں وہ ایمان میں کی زیادتی کے قائل ہیں، کیونکہ ایمان کے بعد عمل کرنے سے ایمان میں کمال آتا ہے، اور جو ایمان اعمال سے خالی ہو اس میں نقص آجائے گا، اور جن کے نزدیک ایمان بسیط ہے مرکب نہیں، اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں ان کے نزدیک اعمال میں کی زیادتی سے نفس ایمان میں کی زیادتی کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا، غرض کی زیادتی کا دار و مدار اعمال کو ایمان میں داخل کرنے اور نہ کرنے میں ہے۔ تو امام صاحب نے اصل ایمان میں کی زیادتی کی نفی کی، اور رہا مواعیل ۱۶۱ ال کے اعتبار سے زیادتی کی کا، تو اس کی نفی نہیں کی، البتہ ایمان میں تفاضل اعمال کے اعتبار سے ہو تو اس اعتبار سے خود احناف اس کے قائل ہیں (عقیدۃ الطحاوی ص ۹۵) تو احناف کا

محمد ثین وغیرہ سے اختلاف کہاں رہا؟ جس تناظر کے قائل وہ حضرات ہیں اس کا انکار کہاں ہے؟ بلکہ اس کا ثبوت ہے، اور جس کی نفی کی ہے اس کے متعلق ان کی طرف سے کوئی اثبات نہیں، لہذا کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔

### دلائل اور توجیہات

جن حضرات نے ایمان میں کمی و زیادتی کا (بجائز اعمال) قول اختیار کیا ہے ان کے سامنے مندرجہ ذیل آیتیں ہیں:

(۱) هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيُؤْذِنُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ (سورہ فتح)

(۲) إِنَّهُمْ فِتْنَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَرِزْنَهُمْ هُدًى (سورہ کہف)

(۳) وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى، وَالْبَاقِيَتُ الصَّالِحَتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَزَادًا

(۴) وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ

(۵) قَالِمَا الَّذِينَ آمَنُوا فَرَزَدْتُهُمْ إِنَّمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (سورہ توبہ)

ان آیات میں واضح طور پر ایمان میں زیادتی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، ان آیات کو مد نظر رکھ کر بھی خلیان ہوتا ہے کہ آخر امام صاحب نے کی اور زیادتی کی نفی کیسے کر دی؟ اسکی توجیہات ملاحظہ ہوں:

(۱) امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ جن آیات میں کمی زیادتی کا ثبوت ہے اس سے مراد ایمان کامل ہے یعنی ایمان کے کمال میں بلندی ہوتی ہے جس سے مومن دخول اولیٰ سے شرفیاب ہوتا ہے،

(۲) شارح حاشیہ لکھتے ہیں کہ جس ایمان میں کمی زیادتی نہیں ہوتی اس سے مراد وہ ایمان ہے جس پر مطلق نجات کا مدار ہے اور وہ لولاء لا متنع کے درجہ میں ہے کہ اس کے بغیر نجات ہو ہی نہیں سکتی، اور جس ایمان میں زیادتی اور کمی ہو سکتی ہے اس سے مراد وہ ایمان ہے جس پر نجات کامل کا مدار ہے،

(۳) صاحب کشاف نے امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ جن آیتوں میں زیادتی کا تذکرہ ہے اس میں زیادتی مومن پر کی ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں احکامات کیے بعد دیگرے نازل ہوتے رہتے تھے، آیتیں اترتی رہتی تھیں جب جب اتریں اس پر ایمان لے آئے، تو گویا مومن بہ بڑھتا رہا، لیکن اصل ایمان یعنی تمام ضروریات دین کا مانتا بہر صورت باقی تھا، اور اب بھی باقی ہے اس میں کوئی فرق باقی نہیں لہذا امن و جزیید و ینقص بھی صحیح ہے اور لا یزید و لا ینقص بھی صحیح،

(۴) علامہ کروری فرماتے ہیں اصل ایمان میں کمی زیادتی ناممکن ہے، کیونکہ ایمان تمام ضروریات دین کے ماننے کو کہتے ہیں اور اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی، کیونکہ ان میں کسی ایک کا انکار اجماعاً کفر ہے، البتہ ہر عمل صالح کے لئے ایک نور ہوتا ہے، اور ہر معصیت کے لئے ایک ظلمت ہوتی ہے، پس زیادتی اور کمی نور ایمان کے اعتبار سے ہو سکتی ہے نہ کہ اصل ایمان میں۔

(۵) علامہ یحییٰ فرماتے ہیں ان آیات کی مراد یہ ہے کہ کیفیات کے اعتبار سے زیادتی ہو سکتی ہے، نفس ایمان کے اعتبار سے نہیں،

(۲) مجدد الف ثانی کا قول ہے: جس طرح تمام انسان نفس انسانیت میں برابر ہیں، اور کمالات میں فرق ہے اسی طرح تمام مسلمان نفس ایمان میں برابر ہیں، ہاں فضائل میں کمی زیادتی ہوتی ہے جیسا کہ تمام انبیاء نفس نبوت و رسالت میں برابر ہیں (لا تفرق بین احد کا مصداق یہی تو ہے) لیکن فضائل میں کمی زیادتی مسلم ہے، اسی طرح تمام مسلمان اصل ایمان میں برابر، لیکن فضائل و کمالات میں، نور و انبساط میں، ثبات و استقامت میں، اجزاء و تفصیل میں، مومن بہ وغیرہ میں زیادتی ممکن ہے۔

## منکرین کی عقلی دلیل

(۱) تصدیق ایک مابیت ہے اس میں کمی زیادتی کو ماننا مابیت میں کمی زیادتی کے ماننے کو مستلزم ہے، جبکہ حکماء اس پر متفق ہیں کہ لا تشکیک فی الماہیات، مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ایمان جیسے شرعی مسئلہ میں قولی حکماء سے مدد لینا مناسب نہیں،

(۲) تصدیق میں تشکیک مان لیا جائے، تو ایمان کا شک کے ساتھ جمع ہونا لازم آئے گا، کیونکہ تصدیق کا کوئی جز ختم ہو جائے تو اس کی ضد یعنی شک کا کوئی حصہ آجائے گا، اور شک آنے سے ایمان باقی نہیں رہے گا، لیکن یہ دلیل پہلی دلیل سے زیادہ تعجب خیز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاہ کپڑا اور سیاہ کوڑے میں فرق تو ہے ہی، کون سے میں اس کی بنسبت زیادہ، تو کہا جاسکتا ہے کہ کپڑے میں سفیدی کا کوئی حصہ آگیا؟ تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ تصدیق میں کمی آجانے سے کفر کا ایک حصہ آجائے گا، ہاں جب سیاہی کے تمام مراتب ختم ہو جائیں تب بیاض آسکتا ہے، اسی طرح تصدیق کی تمام قسمیں ختم ہو جائیں تب ہی اس کی ضد آسکتی ہے۔

ایمان کے متعلق مذاہب تو بہت ہیں جنہیں علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن ہم چند مشہور مذاہب کو بیان کرتے ہیں،

ایمان میں دس اقوال ہیں

بسیط

کرامیہ

مشہور یہ ہے کہ کرامیہ بھی ایمان کو بسیط مانتے ہیں اور اسکی حقیقت صرف اقرار ہے بشرطیکہ دل میں انکار نہ ہو، تصدیق و عمل ایمان کیلئے نہ تو اجزا ہیں اور نہ ہی ضروری، لیکن انکا اصل مذہب یہ ہے کہ جسکے دل میں تصدیق نہ ہو اور صرف اقرار ہو وہ مومن لفظاً اور کافر السریہ ہے، دنیا میں مومن آخرت میں کافر۔

هكذا التحقيق وكذا في العيني

غیلانیہ

ان کے یہاں ایمان کی حقیقت اقرار باللسان ہے، لیکن تصدیق شرط ہے۔

جہمیہ

جہمیہ کے نزدیک بھی ایمان بسیط ہے، ایمان کی حقیقت صرف معرفت قلبی ہے تصدیق ضروری نہیں۔

مرجیہ اہل بدعت

ایمان کی حقیقت صرف تصدیق قلبی ہے، اقرار باللسان اور عمل نہ شرط ہیں نہ ضرور کن، عمل کے بغیر بھی ایمان کامل ہو جاتا ہے۔

معصیت مضر نہیں، ان کا مقولہ مشہور

ہے لا تضر مع الايمان معصية

كما لا ينفع مع الكفر طاعة،

یہ عقیدہ مرجیہ یونسیہ کا ہے۔

(الملل والنحل ص ۸۷/۱۰۱)

مرجیہ کے مختلف فرسے ہیں بعض اقرار کو بھی رکن مانتے ہیں، لیکن عمل کے بغیر ضروری ہونے میں تمام مرجیہ متفق ہیں۔

امام ابو حنیفہ و اہل سنت والجماعت

تفصیل یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایمان بسیط ہے، صرف تصدیق قلبی یعنی تمام ضروریات دین کے ماننے کا نام ایمان ہے اقرار باللسان اجزا احکام دنیویہ کے لئے شرط ہے، علامہ نسفی فرماتے ہیں امام ابو حنیفہؒ سے یہی منقول ہے، امام ہاتمی کا قول یہی ہے، اور اشعری کے اصح اور بیشین یہی ہوتا ہے، البتہ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ کوئی مانع نہ ہو تو عند المطالبہ اقرار ضروری ہے، اور عمل مکملات ایمان اور فرع ایمان میں سے ہے اہل سنت کا متفقہ قول یہی ہے جو اختلاف مشہور ہے احوال و عنوان اور ماحول کا اختلاف ہے جس نے کہا ایمان بسیط ہے اس کی مراد اصل ایمان ہے اور جس نے مرکب کہا، ایمان کامل کو مرکب کہا، تبارک عمل اور مرکب کبیرہ نہ ایمان سے خارج ہوتا ہے نہ کافر، البتہ فاسق ہو جاتا ہے توبہ سے اس کا گناہ معاف ہو سکتا ہے، توبہ نہ ہو تو تحت المعیہ ہے ان شاء عفا عنه وان شاء عذبه،

## مرکب

## مرکب ثنائی

(ایمان اور کفر سے مرکب ہے)

## مرکب ثلاثی

(ایمان تین اجزاء سے مرکب ہے)

## امام الائمہ

سے ایک قول یہ منقول ہے کہ ایمان تصدیق و اقرار کا نام ہے، اس صورت میں ایمان ثنائی ہوگا، لیکن اقرار کو رکن زائد کہا گیا ہے جو ساتھ ہو سکتا ہے عند الغدر، کما عند الاکراه، لیکن تصدیق کسی حال میں ساتھ نہیں ہو سکتی، پس حقیقت میں اختلاف نہیں، عمل بھی ضروری ہے، ایمان کی تکمیل کے لئے۔

## مرجیہ ثوبانیہ غسانہ

ان کا مسلک یہی ہے کہ ایمان تصدیق و اقرار کا نام ہے۔

## امام مالک امام شافعی

## امام احمد و محمد شین

مشہور قول یہ ہے کہ نام مالک امام شافعی امام احمد و محمد شین کے نزدیک ایمان تین اجزاء سے مرکب ہے تصدیق بالہمان، اقرار باللسان، عمل بالارکان، یعنی تینوں کے مجموعے کا نام ایمان ہے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ ان حضرات نے ایمان کامل کو مرکب بنا ہے اور اس کے اجزاء کو اجزاء کمالیہ ترمیمیہ فرمایا ہے باقی اصل ایمان کو تمام اہل سنت والجماعت بیضا ہی مانتے ہیں یعنی ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے۔

## معتزلہ

اصل ایمان مرکب ثلاثی ہے، تینوں کے مجموعے کا نام ایمان ہے، اور تینوں اجزاء حقیقیہ مقومہ ہیں، کہ ہر ایک کے فوت ہو جانے سے ایمان ختم ہو جاتا ہے، مرکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور اگر بدون توبہ مرآتو، ہمیشہ جہنم میں رہے گا یہاں تک معتزلہ و خوارج متفق ہیں، لیکن معتزلہ چونکہ منزلہ بین المنزلتین کے قائل ہیں یعنی کفر و ایمان میں ایک درجہ مانتے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ مرکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جائے گا، مگر کافر نہ ہوگا۔

## خوارج

خوارج بھی معتزلہ کے ساتھ ہیں، اس بات میں کہ اصل ایمان تینوں سے مرکب ہے، اور ہر ایک کے فوت ہو جانے سے ایمان ختم ہو جائے گا، اور مرکب کبیرہ بدون توبہ مرے تو غلڈنی النار ہوگا۔ لیکن خوارج کفر و ایمان میں کوئی تیسرا درجہ نہیں مانتے، اسلئے وہ کہتے ہیں کہ مرکب کبیرہ کافر ہو جائے گا۔

(منقول از لد ابو الباری، م)



## كِتَابُ الْإِيمَانِ

قَالَ الْإِمَامُ أَبُو الْحُسَيْنِ مُسْلِمُ بْنُ الْحَجَّاجِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ بِعَوْنِ اللَّهِ نَبْتَدِي وَإِيَاءَ نَسْتَكْفِي وَمَا تَوْفِيقُنَا إِلَّا بِاللَّهِ جَلَّ جَلَالُهُ حَدَّثَنِي أَبُو خَيْثَمَةَ زُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ نَا وَكَيْعٌ عَنْ كَهْمَسٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بَرِيدَةَ عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمُرَ ح وَحَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ مُعَاذٍ الْعَنْبَرِيُّ، وَهَذَا حَدِيثُهُ، قَالَ نَا كَهْمَسٌ عَنْ ابْنِ بَرِيدَةَ عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمُرَ قَالَ: كَانَ أَوَّلُ مَنْ قَالَ فِي الْقَدْرِ بِالْبَصْرَةِ مَعْبُدُ الْجَهَنِيِّ فَاَنْطَلَقْتُ أَنَا وَخَمِيدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْجَمْعِيُّ حَاجِّينَ أَوْ مُعْتَمِرِينَ فَقَلْنَا لَوْلَيْنَا أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلْنَاهُ عَمَّا يَقُولُ هَؤُلَاءِ فِي الْقَدْرِ، فَوَفَّقَ لَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ دَاخِلًا الْمَسْجِدَ فَكَتَبْتُهُ أَنَا وَصَاحِبِي أَحَدُنَا عَنْ يَمِينِهِ وَالْآخَرَ عَنْ شِمَالِهِ، فَظَنَنْتُ أَنَّ صَاحِبِي سَيَكِلُ الْكَلَامَ إِلَيَّ فَقُلْتُ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَنَّهُ قَدْ ظَهَرَ قَبْلَنَا نَاسٌ يَقْرَأُونَ الْقُرْآنَ وَيَتَقَفَّزُونَ الْعِلْمَ وَذَكَرُوا مِنْ شَائِهِمْ وَأَنَّهُمْ يَزْعُمُونَ أَنَّ لَا قَدَرَ، وَأَنَّ الْأَمْرَ أُنْفُ، قَالَ إِذَا لَقِيتَ أُولَئِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنِّي بَرئُ مِنْهُمْ وَأَنَّهُمْ بَرَاءُ مِنِّي، وَالَّذِي يَحْلِفُ بِهِ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ مِثْلُ أَحَدٍ ذَهَبًا فَانْفَقَهُ مَا قَبِلَ اللَّهُ مِنْهُ حَتَّى يُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ ثُمَّ قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ، شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لَا يُرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَاسْتَدْرَكَتْنِي إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى قَعْدَتَيْهِ، وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ: أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَتَقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتُحُجَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا، قَالَ: صَدَقْتَ، قَالَ: فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ، قَالَ: أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ قَالَ: صَدَقْتَ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ، قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ، قَالَ: مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِاعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ، قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا، قَالَ: أَنْ تَلِدَ الْأُمَةُ رَيْثَهَا، وَأَنْ تَرَى الْخُفَاءَ الْغُرَاءَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبَنِيَانِ، قَالَ: ثُمَّ انْطَلَقَ فَلْيَبُثْ مَيِّتًا ثُمَّ قَالَ لِي يَا عُمَرُ أَتَدْرِي مِنَ السَّائِلِ قُلْتُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ فَإِنَّهُ جَبْرِئِيلُ أَتَاكُمْ يَعْلَمُكُمْ وَيُنَكِّمُ. (٥)

(٥) تخریج حدیث: ابو داؤد ص ٦٤٥ حدیث ٤٦٥٩، ترمذی ص ٨٨/٢، حدیث ٢٦١٣، نسائی ٨/٩٧، ابن ماجه ص ٦٣،

## ترجمہ

یحییٰ بن یعمر بیان کرتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر میں جس نے سب سے پہلے کلام کیا وہ بعمرہ میں معبد جنتی شخص تھا میرے ساتھ حید بن عبدالرحمن میری حج یا عمرہ کرنے کی نیت سے لٹکے، تو ہم نے کہا کاش! ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی مل جاتا، تو ہم ان شبہات کے متعلق جو یہ لوگ تقدیر کے بارے میں نکالتے ہیں کچھ باتیں دریافت کر لیتے، حسن اتفاق کہ ہمیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات نصیب ہوئی، جبکہ وہ اور ہم معبد میں داخل ہو رہے تھے، پھر کیا تھا میں اور میرے ساتھی، ہم دونوں میں سے ایک نے ان کو دائیں جانب اور دوسرے نے بائیں جانب سے گھیر لیا، میں سمجھ رہا تھا کہ میرے رفیق سلسلہ گفتگو کا آغاز میرے ہی سپرد کریں گے، اس بنا پر میں نے ہی عرض کیا کہ اے ابو عبدالرحمن (کنیت ابن عمر) ہمارے اطراف میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جو قرآن پڑھتے ہیں اور علم میں بہت کد و کاوش بھی کرتے ہیں، پھر ان کی مفصل روئداد بیان کی، ان کا عقیدہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں، اور دنیا کے واقعات بغیر تقدیر کے یوں ہی چلتے رہتے ہیں، انہوں نے فرمایا جب ان سے تمہاری ملاقات ہو تو ان سے کہہ دینا کہ نہ میرا ان سے کوئی تعلق رہا نہ ان کا مجھ سے، اس ذات کی قسم جس کے نام کی قسم عبداللہ بن عمرؓ کھاتا ہے کہ اگر ان میں سے کسی کے پاس اُحد پہلا کے برابر بھی سونا ہو، اور وہ اس کو خیرات کر ڈالے، جب بھی وہ اس وقت تک اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، جب تک کہ اس کا ایمان تقدیر پر نہ ہو، پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میرے والد حضرت عمر بن الخطابؓ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک دن ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، دفعۃً ایک شخص آیا، اس کے کپڑے نہایت سفید، بال نہایت سیلے تھے، نہ اس پر سفر کی کوئی علامت تھی (کہ ہم اسے مسافر کہتے) نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا (کہ شہری سمجھتے) یہاں تک کہ وہ آپ کے اتنا قریب آ بیٹھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دیا، اور اپنے دونوں ہاتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زانوئے مبارک پر رکھ دیا، اور عرض کیا اے محمد! مجھے بتلائیے کہ اسلام کیا چیز ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا اسلام یہ ہے کہ اس بات کا اقرار کرو کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اس کے پیغمبر ہیں، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو، اور اگر بیت اللہ تک پہنچنے کی صلاحیت ہو تو حج کرو، اس نے کہا کہ آپ نے صحیح فرمایا۔ راوی کا کہنا ہے کہ ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ پہلے تو وہ آپ سے دریافت کرتا ہے اور پھر خود ہی آپ کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس نے عرض کیا ایمان کے بارے میں بتائیے، تو آپ نے ارشاد فرمایا خدا، اس کے فرشتے، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، اور قیامت کو دل سے مانو، اور اس بات پر یقین کرو کہ برا بھلا جو کچھ ہے وہ سب نوشتہ تقدیر کے موافق ہے، اس نے کہا کہ آپ نے صحیح فرمایا۔ اب یہ بتائیے کہ احسان کیا چیز ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ خدا کی اس توجہ کے ساتھ عبادت کرنا کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ تم اگرچہ اس کو حقیقہً نہیں دیکھتے، مگر وہ تمہیں حقیقہً دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے قیامت کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ جس سے تم سوال کرتے ہو وہ سائل سے زیادہ اس کے متعلق عالم نہیں، تو اس نے کہا کہ اچھا کچھ علامت ہی بتلائیے، آپ نے فرمایا، جب ہانڈی اپنے آقا کو جھٹکے، اور ٹنگے پاؤں، نیچے بدن والے (محتاج) بکریوں کے چرانے والے لمبی لمبی عمارت بنانے لگیں۔ راوی کا کہنا ہے کہ اس کے بعد وہ شخص چلا گیا، میں نے کچھ عرصہ توقف کیا، اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا اے عمر! جانتے ہو یہ سائل کون تھا؟ میں نے عرض کیا خدا اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ حضرت جبریلؑ تھے تمہیں دین سکھانے آئے تھے۔

## فرقہ قدریہ کی تاریخ و عقائد

حدیث باب میں امام مسلم کا ایک مقصد فرقہ قدریہ کی تردید بھی ہے، اس لئے شرح حدیث سے پہلے فرقہ قدریہ کی تاریخ، اسکے عقائد، اور اسلام میں فرقہ بندی کے اسباب پر مختصر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے، فرقہ قدریہ، یہ قدر کی طرف منسوب ہے، کیونکہ وہ فضلہ و قدر کے منکر ہیں، ان کے نزدیک، کثرتِ تقدیر کوئی شئی نہیں، بلکہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، انسان کی سعادت و شقاوت میں فضلہ و قدر کو کوئی دخل نہیں، اس بنا پر اس فرقہ کو قدریہ کہا جاتا ہے، اس فرقہ کا بانی کون ہے؟ کب اور کس جگہ اسکی دماغ بیل ڈالی گئی؟ اس سلسلہ میں شیخ ابو زہرہ نے ایک اصولی بات لکھی ہے کہ کبھی بھی فرقہ کے بارے میں حتمی اور یقینی بات کہنا کہ اسکا نقطہ آغاز کہاں ہے بڑا مشکل ہے، اس فرقہ کا بھی یہی حال ہے۔ قدریہ کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں، کہ خلفاء راشدین کے عہد مسعود میں اس فرقہ کا نام و نشان نہ تھا، صحابہ کرام کے آخری دور میں اس کا ظہور ہوا، اور جو صحابہ اس وقت بقیہ حیات تھے انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اس کے استیصال میں حصہ لیا، جن میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، اور حضرت وائلہ بن اسحق کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے،

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے مسئلہ تقدیر پر گفتگو کی وہ ایک نصرانی شخص تھا، یہ مسلمان ہوا، اور پھر نصرانیت پر لوٹ آیا، لیکن قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدریہ جو اس کے ذریعہ اسلام میں آئی، بصرہ میں ایک شخص جسکا نام یسویہ یا سوس تھا، اس نے اسکو ایجاد کیا، اس سے معبد چینی نے اسکو سیکھا، اور اسکو فرقہ کی شکل دینے کی کوشش کی۔ حافظ ابن حجرؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ معبد چینی جو قدریہ کا سردار تھا، جب اس نے سنا کہ لوگ تقدیر کو خدا کی نافرمانی کا بہانہ بنا رہے ہیں، تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ان کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ تقدیر وغیرہ کچھ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کو حوادث کا علم بھی اسی وقت ہوتا ہے جب وہ وقوع میں آتے ہیں۔ (فتح الباری)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حجاز میں اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب محاصرہ عبداللہ بن زبیر کے زمانہ میں ایک مرتبہ خانہ کعبہ کو آگ لگی تو کسی شخص کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ تقدیر الہی یوں ہی ہوگی، اس پر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ بھلا ایسا کیوں مقدر فرماتا، پس اتنی سی بات پر فضلہ و قدر کی بات چھڑ گئی، بہر حال معبد چینی نے اپنے دعویٰ کا مرکز عراق اور اسکے گرد و نواح کو بنایا، لیکن جب عبداللہ بن اشعث کی بغاوت کا واقعہ پیش آیا اور حسب عادت معبد اس فتنہ میں شریک ہوا، اور پھر اشعث کو شکست ہوئی تو حجاج نے اسکی فتنہ پر دوازی کے جرم میں اسکو قتل کر دیا اور ہر شام میں معبد کے شاگرد غیلان نے ملک شام کو اپنا مرکز بنایا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے غیلان کو دعوتِ مناظرہ دیا، اسکے دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں، نور انصاریؒ ہو گیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ اس باطل عقیدہ کی نشر و اشاعت نہیں کروں گا، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد غیلان نے از سر نو اس عقیدہ کی نشر و اشاعت شروع کر دی، فقہیہ شام امام اوزاعیؒ نے اسکو مناظرہ کی دعوت دی جس کی تفصیل اسلامی مذاہب میں موجود ہے۔

ان دونوں سردار کے قتل ہو جانے کے بعد، کیا وہ فرقہ ہی ختم ہو گیا یا باقی رہا؟ ایک خیال یہ ہے کہ صحابہ اور تابعی حضرات کی کوششوں سے یہ فرقہ بھی ناپید ہو گیا، (۲) دوسرا خیال یہ ہے کہ ختم تو نہ ہوا البتہ معتزلی افکار کے ساتھ مدغم ہو گیا،

(۳) شیخ ابو حرہ فرماتے ہیں کہ یہ مذہب اس وقت نہ ختم ہوا اور نہ ہی مدغم ہوا بلکہ صدیوں تک بصرہ میں چلتا رہا، تاہم ان اقوال میں اس طرح تطبیق ممکن ہے کہ ان دونوں کے قتل کے بعد ان کے قبضین نے فروغ دیا ہو، لیکن قدریت کا خصوصی عقیدہ بہت جلد ختم ہو گیا ہو، اور بقیہ معتزلہ میں کھل مل گیا ہو، اس کا قرینہ یہ ہے کہ بعض اسلاف نے معتزلہ کو قدریہ کہا ہے، غرض علامہ قرطبی، علامہ نووی، حافظ ابن حجر کی تحقیق یہ ہے کہ اب اس عقیدہ کا کوئی قائل نہیں۔

### عقائد قدریہ اور حکم

**عقیدہ** قدریہ کا عقیدہ تھا کہ الامر ائمتہ، عربی زبان میں ائمتہ اس باب کو کہتے ہیں، جس میں سرسبزی کے باوجود جانور نے منہ نہ ڈالا ہو، یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہر حادثہ بلکہ بندہ کی سعادت و شقاوت بھی خود اپنے ہی عمل سے پیدا ہوتی ہے، حق تعالیٰ کو نہ پہلے سے اس کا علم ہوتا ہے، اور نہ کہیں اس کی کتابت ہوتی ہے، ہر انسان جب کسی عمل کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے خود ایک نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے، پھر اسی کے مطابق اس کو عملی جامہ پہناتا ہے، اسی ذہنی نقشہ کو تیار کرنے کا دوسرا نام خلق ہے، اسی لئے فرقہ قدریہ بندہ کو خالق کہتے ہیں، اس جماعت کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ کو کہ اپنے بندوں کے لئے شریعت نازل کرتا ہے، مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون اس کی فرمانبرداری کرے گا اور کون اس کی نافرمانی کرے گا، کون ان میں دوزخی ہو گا، اور کون جنتی، حتیٰ کہ بندہ جب خود عمل کر کے دوزخ اور جنت کا مستحق ہو جاتا ہے تو اب خدا کو بھی دوزخیوں اور جنتیوں کا علم ہو جاتا ہے، نعوذ باللہ، اس عقیدہ کا بطلان اظہر من الشمس ہے، قرآن کریم میں جا بجا اس نظریہ کی تردید موجود ہے۔

**قدریہ کا حکم** حضرت امام مالک، امام شافعی، اور امام ابو حنیفہ نے اس فرقہ کی تکفیر کی ہے، حضرت ابن عمر کی یہ حدیث اسی فرقہ کی تردید کیلئے ہے، علامہ اسلام نے جب اس فرقہ کی تردید کی تو لاچار ہو کر ان کو ایک قدم پیچھے ہٹا دیا، اور وہ علم الہی کے تو قائل ہو گئے، مگر یہ کہ بندوں کے اعمال و افعال مشیت الہی کے تحت ہی ہوتے ہیں، اس کا انکار ہی رہا۔ "علماء متکلمین اور فقہاء کرام کی عبارتوں کے پیش نظر مطلقاً اس نوید فرقہ کا کافر کہنا مشکل ہے، کیونکہ تقدیر کی تین قسمیں ہیں، تقدیر علمی، تقدیر کتابی، تقدیر ارادی۔

تقدیر علمی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا علم ازلی اور ابدی ہے اور امکان و مایکون کا علم اس کو حاصل ہے۔ تقدیر کتابی کے علم کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنے علم ازلی کے مطابق ہونیوالے امور کو اسکے ہونے سے پہلے لکھ دیا ہے، تقدیر ارادی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اس کے ارادہ اور مشیت کے مطابق ہوتا ہے، اور اب فتویٰ فرماتے ہیں کہ تقدیر علمی کا منکر تو کافر ہے، تقدیر کتابی اور ارادی کا منکر کافر نہیں، جن حضرات نے فرقہ قدریہ کی تکفیر کی ہے ممکن ہے تقدیر علمی کے انکار کی بناء پر کیا ہو، ہاں بقیہ فرقہ کو بدعت کہنے میں کوئی تاثر نہیں۔ "م اب غور طلب صرف یہ امر ہے کہ اس عقیدہ کی آخر اتنی اہمیت کیوں ہے؟ کہ اس کو دین کا ایک رکن قرار دیا گیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر بندہ کا اللہ تعالیٰ سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکتا، وہ اگر اس کی خالقیت کا انکار کر بھی لیتا

مگر آئندہ اس کی زندگی میں جب اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں دیکھتا، بلکہ دنیا کے خود خالق ہونے کا گمان کر بیٹھتا ہے تو اس کو اس عالم کے حقیقت کے اعتقاد پر بھی پورے طور پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے، فوراً سمجھ کر کہ ایک شخص جب اپنا اپنے اعمال کا اور ساری دنیا کا تعلق خالق کائنات سے قائم نہیں رکھ سکتا تو بھلا اس کو اسلام سے ہی کیا تعلق ہو گا، اب اگر وہ احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر ڈالے تو یہ صرف ایک کافر کا صدقہ ہو گا، جس کا بار گاہ الہی میں کوئی وزن نہیں ہے۔

## فرقہ بندی کے اسباب

”ابھی آپ نے ایمان کی تفصیل گفتگو کے درمیان بہت سے فرقوں کا تذکرہ سنا، حتیٰ کہ مسئلہ قضا و قدر میں بھی دو فرسے نظر آئے، تو سوال یہ ہے کہ آخر اسلام میں یہ فرقہ بندیاں کن اسباب کی بنا پر وجود میں آئیں اس سلسلہ میں حضرت سید مناظر حسن گیلانیؒ کا مضمون قابل دید ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) دو صحابہ میں کوئی نظریاتی اختلاف پیدا ہوا تو برپا راست حضور اکرم ﷺ سے دریافت کرتے، اور پھر کسی ایک مسئلہ پر متفق ہو جاتے آپ کے بعد حضرات صحابہ کرام سے رجوع کرتے، لیکن عہد رسالت کے بعد مسئلہ خلافت اور امامت میں اختلاف پیدا ہوا اور مسلمانوں میں دو بارٹیاں ہو گئیں، دونوں کے نظریاتی اختلاف الگ الگ تھے، مگر جلد ہی ان کا بر صحابہ کے عمل سے اختلافات ختم ہو گئے، جیسا کہ شیخین کی خلافت کے معاملہ میں ہوا، لیکن اس کے بعد اہل زمانہ نے بدلتے ہوئے حالات اور اسلام دشمن افراد (مثلاً عبد اللہ بن سبا وغیرہ) نے مذہبی قالب میں ڈھال دیا، مثلاً حضرت علیؑ کے زمانہ میں صحابہ اور تابعی کے درمیان جنگ (جمل و صفین وغیرہ) ہوئی، اس نے ایک تیسرے فرقہ کو جنم دیا، یہ خارجی تھے، حضرت علیؑ اور ان کے مقابل حضرت امیر معاویہؓ سے یکساں عدالت رکھتے تھے، دونوں کو **إِن الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ** کا بہانہ بنا کر کافر کہنے لگے۔ غرض اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اسلام میں اختلاف کی ابتدا کواور فرقہ بندی سیاسی تصور سے شروع ہوئی۔

(۲) تابعین کے زمانہ تک اسلام جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، جہاں یہودی، عیسائی، دھریہ، مختلف فرقے تھے، ان کے پاس قدیم مذہبی نظریے فلسفیانہ، اور مطلقانہ اصول پر مدون تھے، اگرچہ وہ لوگ بھی مسلمان ہونے لگے، لیکن عقلی حیثیت سے اسلام کے ہر حکم سے وہ شیدائیت نہیں ہوئی تھی جو دور اول میں تھی اس لئے عقلی سانچے سے اسلامی افکار کو تولد شروع کیا، اور ان کی عقل کی کسوٹی پر نہ اترنے کی وجہ سے قرآن و احادیث میں تاویلات شروع کیں۔“م

## حدیث جبریل کی حیثیت

اثبات قدر کی دلیل میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث جبریل کو امام مسلم نے پیش فرمایا جامعیت کے لحاظ سے ذخیرہ احادیث میں اس کی وہی حیثیت تسلیم کی گئی ہے، جو قرآن کریم کی تمام سورتوں میں سورہ فاتحہ کی حیثیت ہے، سورہ فاتحہ اجمالی متن ہے اور پورا قرآن اس کی تفصیل ہے، اسی لئے وہ اُم الکتاب کے نام سے موسوم ہے، بالکل اسی طرح تمام احادیث کے مضامین کا اجمالی متن و اختصار حدیث جبریل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو اُم الاحادیث کہا جاتا ہے، اور جس طرح

سورۃ فاتحہ ام القرآن ہونے کی بنا پر ابتدا قرآن میں ہے، بالکل اسی کی اتباع میں بعض محدثین نے اپنی کتاب کی ابتدا ام الاحادیث سے کی ہے، جیسا کہ امام مسلم، امام بغوی نے مصابیح اور شرح السنہ میں کی ہے، علامہ قرطبی فرماتے ہیں یصلح ان یقال لہ ام السنۃ۔ (۱)

### حضرت جبرئیل کی آمد کب؟

بیان کا ایک اسلوب یہ ہے کہ تفصیل کے بعد اس کا نچوڑ و خلاصہ اور لب لباب ذکر کر دیا جائے، کہ تفصیل محض نہ رہے تو کم از کم علی وجہ الاجمال، خلاصہ اند مگر کلام تو یاد رہے، اور یہ چیز عموماً اخیر میں ذکر کی جاتی ہے چنانچہ اسی لئے محدثین نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ مکالمہ حجۃ الوداع سے کچھ قبل پیش آیا، جبکہ وحی ختم ہونے کا زمانہ قریب آچکا تھا، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہو، ان حضرات کی بنیاد حضرت ابن مندہ کی روایت پر ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں "ان رجلاً فی آخر نمحر النبی ﷺ جاتہ" (عمدة القاری ص ۳۴۰) آخر عمر میں آمد پر قبل از حجۃ الوداع یا اس کے بعد، دونوں احتمال ہو سکتے ہیں، بہر حال اس روایت سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ انکی آمد آخری زمانہ میں ہوئی، چونکہ وحی ہمیشہ کے لئے بند ہونے والی تھی، اس لئے عرب کی امی قوم کے لئے ضرورت تھی کہ جو دین تکمیل سال میں مد ربی طور پر اترتا رہا، آخر میں اس کی ایک مختصر مگر مکمل فہرست ان کو دیدی جائے، اس کیلئے قدرت نے سب سے زیادہ سلیقہ مند شعاع فرشتہ کو منتخب کیا اور جو اصولی سوالات تھے، وہ ان کی زبان سے پیش کرادیے، اور بارگاہ رسالت سے اس کا جو آخری جواب ہو سکتا تھا وہی دلویا گیا، اور اس طرح صحابہ کرام نے اپنی خاموشی میں دین کی ایک تسلی بخش فہرست بھرن لی۔

### حدیث کا شان و درود

مسلم شریف (ص ۲۹) میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تشریف آوری کی یہ وجہ بتائی گئی ہے، کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے فرمایا: "تسلوینی" یعنی اب میرا آخری وقت آچکا ہے دین کے بارے میں جو ضروری باتیں دریافت کرنی ہو کرلو، چونکہ قرآن کریم (مائدہ پ ۷) میں صحابہ کرام کو نبیؐ کے اسوالات کرنے سے روک دیا گیا تھا، اور اس پر سخت وعید سنائی گئی تھی تو اس وعید کے اندیشہ سے صحابہ کرام نے کوئی سوال نہیں کیا، کہ کہیں عند اللہ وہ سوال بلا ضرورت نہ سمجھا جائے، اور ہم مورد عقاب ہو جائیں، تو حق تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو سائل بنا کر بھیجا کہ حضرت جبرئیل سوالات کریں، اور حاضرین اس کو بغور سن کر استفادہ کریں۔

### حدیث کی شرح

فوفق لنا عبد اللہ بن عمر، قوله ذات یوم: لفظ ذات یا تو مخم یعنی زائد ہے یا معنی بجائے شبہ کو ختم کرنے کے لئے لایا گیا ہے، کیونکہ یوم کا اطلاق مطلق زمانہ پر بھی ہوتا ہے، جس میں رات و دن دونوں شامل ہیں، یہاں ذلت لاکر حبیہ کردی گئی کہ یہ واقعہ دن کا ہے رات کا نہیں۔

قوله اذ طلع علينا رجل: حضرت جبرئیلؑ کی آمد اور تشریف آوری کو طلوع سے تعبیر کرنے میں آنے والے کی محنت پیش نظر ہے یعنی آنے والا شخص شکل و صورت میں ایسا وجہ اور نورانی تھا جیسے سورج نکل آیا ہو، رجل کی تین یا تو تکبیر کے لئے ہے، کیونکہ آنے والا غیر معروف اور انجان تھا یا تین کو تعظیم کے لئے مانیں تو معنی ہوگا رجل عظیم۔ حضرت جبرئیلؑ جو ایک نورانی مخلوق ہیں، ان کو رجل سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ غیر آشنا تھے، اور انسانی روپ میں تھے، ورنہ تو فرشتہ کو رجل سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، بعض روایت میں رجل کے بجائے نام مذکور ہے، چونکہ اخیر میں معلوم ہو گیا تھا ورنہ تو اکثر روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کوئی پہچان نہیں سکا تھا، حتیٰ کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شروع میں شناخت نہ ہو سکی تھی۔ (۱)

قوله شديد بياض الثياب، شديد سواد الشعر الخ، ابن حبان نے شعر کے بجائے لمحہ کا لفظ نقل کیا ہے (۲) یعنی اس کے داڑھی کے بال سیاہ تھے، بعض روایت میں اذ اقبل رجل احسن الناس وجهاً واطيب الناس ريحاً (۳) کہ نہایت حسین اور بہترین خوشبو لگائے ہوئے تھے، جو ان کے مہذب و شائستہ، اور آداب مجلس سے واقف و باخبر ہونے کی علامت ہے، ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں "فيه استحباب البياض والنظافة في الثياب" (۴) کہ عام انسانوں کے لئے بھی سفید لباس اور نظافت کے ساتھ آنا اچھی بات ہے، حضرت جبرئیلؑ کے کپڑوں کی صفائی اور بالوں کی سیاہی میں اس طرف اشارہ تھا کہ طالب علم کے لئے اپنا ظاہری لباس صاف رکھنا چاہئے، اور نوعمری میں طلب علم کے لئے لکھنا چاہئے، لیکن نوعمری کے بعد بھی اگر علم کی ضرورت ہو تو عار اور سستی نہ کرنی چاہئے، کہ صحابہ کرام بڑی عمر میں مسلمان ہونے کے بعد جس جذبہ و شوق کے ساتھ حصول علم میں مشغول رہا کرتے تھے، وہ ہم سب کے لئے درس عبرت سے کم نہیں۔

قوله لا يرى عليه اثر السفر: لام نووی فرماتے ہیں یؤی بالضم ہے صحیحین میں اسی طرح ہے البتہ حافظ ابو حازم عبدی نے اور مسند ابویعلیٰ موصلی میں نوین مفتوح کے ساتھ مروی ہے، دونوں صحیح ہے (۵)

قوله لا يعرفه منا احد: حضرت عمرؓ نے یہ کیسے فرمایا کہ ہم میں سے کوئی نہیں پہچانتا تھا؟ اس کی دوجہ ہو سکتی ہے، کہ حاضرین اس قدر محو حیرت تھے کہ ہر ایک کے چہرہ بشر سے محسوس ہوتا تھا کہ آنے والے کو کوئی نہیں پہچان پارہا ہے، دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حاضرین نے خود اعتراف کیا ہو کہ ہم نہیں پہچان سکے، بہر حال اس سے غرض یہ ہے کہ وہ کوئی قریب کے آدمی نہیں تھے، کیونکہ قریب کے ہوتے تو کوئی نہ کوئی ضرور پہچان لیتا۔ (۶)

قوله فاسند ركبتيه الي ركبتيه: یعنی اس شخص نے اپنے گھٹنہ کو حضور اکرم ﷺ کے زانوئے مبارک سے ملا دیا، اس بیت سے بیٹھنے کی مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ دو زانوں بیٹھنا، تواضع اور ادب و احترام کے پیش نظر تھا، اور اپنے زانوں کو آقا کے زانوں سے ملانے میں خصوصی قرب و توجہ مطلوب تھا، نیز اس بیت سے بیٹھنے میں محسوس ہوتا ہے کہ سائل شدید حاجت مند اور بہت ہی متبہی اور مشتاق ہے، جو مسئول کی توجہ کے لئے باعث کشش ہے، حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں "لیس المراد الا

(۱) فتح الباری ص ۱۲۵/۱ (۲) ابن حبان بحوالہ فتح الباری ص ۱۱۶/۲ (۳) فتح الباری ص ۱۱۶/۴ (۴) مرقاۃ

ص ۱۱/۴ (۵) نووی علی المسلم ص ۲۸ (۶) فتح الباری ص ۱۱۶/۱

لِزَاقِ الْحَقِيقِ" کہ ھیت انہوں نے کھنڈ ملائے نہیں تھے، بلکہ بہت ہی قریب بیٹھے تھے، راوی نے غایت قرب کو "اسند رکبتیہ" سے تعبیر کر دیا تاکہ جوابات پوری طرح سن سکیں۔ (۱)

قوله كَفَيْهِ عَلَى فَخْذِهِ: فَخْذِهِ کی ضمیر میں اختلاف ہے، بعض اس کا مرجع رجل کو بتاتے ہیں، یعنی آنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں زانو پر رکھ دیئے، جس طرح کوئی باادب شخص بڑے آدمی کے سامنے بیٹھتا ہے، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے "حَنِي بَرَك بَيْنَ يَدَيِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا يَجْلِسُ أَحَدُنَا فِي الصَّلَاةِ" (۲) یہی وجہ ہے کہ علامہ نووی نے حاشیہ مسلم میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (۳)

بعض نے ضمیر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع کیا ہے، جیسا کہ سلیمان تمیمی کی روایت میں صراحت ہے، ثم وضع يده على ركبتَي النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وكذا في حديث ابن عباس وأبي عامر الأشعري ثم وضع يده على ركبتَي النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (۴) بہر حال دونوں ضمیر کی تائید موجود ہے، اور اس سے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن دونوں میں تطبیق اس طرح دی جائے گی کہ اولاً اپنے ہاتھ اپنی ران پر رکھے ہوں جیسا کہ کما يجلس احدا في الصلوة، سے معلوم ہوتا ہے، اور پھر کچھ بے تکلف ہوتے گئے، اور آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ران مبارک پر ہاتھ رکھ دیئے۔

اشكال: "لیکن اس توجیہ و تطبیق پر یہ اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ بڑے مقدس انسان کی ران پر اپنا ہاتھ رکھ دینا یہاں عرف میں خلاف ادب اور خلاف احرام سمجھا جاتا ہے، پھر یہ ہیئت کیوں اختیار کی؟

اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں: (۱) یہ ہیئت اس لئے اختیار کی کہ درحقیقت حضرت جبرئیل بنی حقیقت حاضرین پر غنی رکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے لے کر انتہا تک ان سے ایسے امور صادر ہوئے کہ جن سے انکا صحیح حال معلوم نہ ہو سکے، کبھی مہذب انداز اختیار کیا، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام کر کے آئے، اور پھر خطی رقاب اختیار کیا، جس سے غیر مہذب ہونا ظاہر کیا، کبھی اُذُنْ يَا مُحَمَّد، تو کبھی اُذُنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ، کہہ کر پکارا، مقصد یہ تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ شہزی ہے یا دیہاتی؟ غرض اخفاء حال مطلوب تھا۔ (۲) دوسرے کے زانو پر ہاتھ رکھنے کی دو صورت ہے، ایک خلاف ادب ہے جیسا کہ مشہور ہے اور ایک خلاف ادب نہیں، بلکہ کمال ادب اور انتہائی تواضع اور خوشامد انداز پر دلالت کرتی ہے، یہی شکل یہاں تھی، (۳) یہ ہیئت اس لئے اختیار کی کہ رسول و مفتی کی رہنمائی مقصود تھی کہ ان کو حلم و بردباری کا پیکر ہونا چاہئے، اور کسی دیہاتی کے اکھڑین پر چڑھنا نہیں بلکہ چشم پوشی کرنا چاہئے۔" (۵)

### اخفاء حال کی مصلحت

حضرت جبرئیل کی آمد و نشست، سوال و جواب کے اسلوب، اور لب و لہجہ سے غایت درجہ اخفاء حال مترشح ہوتا ہے، ابن حبان میں روایت ہے کہ: فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا اشْتَبَهَ عَلَيَّ مِنْذُ اتَانِي قَبْلَ مَرَّتِي هَذِهِ وَمَا عَرَفْتُهُ حَتَّى

(۱) فتح الباری ص ۱۱۶/۱ (۲) کوکب ص ۱۲۱/۱ (۳) فتح الباری ص ۱۱۶/۱ (۴) نووی ص ۲۸، (۵) فتح الباری

ص ۱۱۶/۱ (۶) امداد الباری ص ۷۲۷/۴، مرتب



ولہٰذا (۱) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جو پچیس سالہ جان پہچان رکھتے تھے، اس بار نہیں پہچان سکے، اخفاء کے اس قدر اہتمام کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ یہ اشارہ مقصود ہو کہ سارے علوم و معارف پورے کر دیئے گئے، دین مکمل ہو گیا، مگر پھر بھی بندہ کا حال یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ذات سے کچھ نہیں، سب عظیم خداوندی ہے وہ چاہے تو محسوس و مشاہد کا علم بھی مخفی کر دے۔

### حضرت جبرئیل کس شکل میں آئے؟

نسائی شریف میں ابو فروہ کے طریق سے منقول ہے کہ "وإنه لجبرئیل فنزل فی صورة دحية الكلبي" (۵) کہ حضرت وحیدہ کلبی کی شکل میں آئے، مگر حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ نسائی کی یہ روایت وہم راوی پر مبنی ہے، ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں نہ پہچانتے، اور صحابہ کرامؓ "لا یعرفہ منا احد" کیوں کہتے؟ اگر نسائی کی روایت کو صحیح باور کر لیا جائے، تو کہا جائے گا کہ حضرت جبرئیلؑ حضرت وحیدہ کی شکل میں آئے تھے، مگر ممکن ہے حضرت وحیدہ مجلس میں پہلے سے موجود تھے، تو وحیدہ کلبی کی شکل میں آنے والے کو دیکھ کر صحابہ کرام کو یقین ہو گیا کہ یہ ہمارے وحیدہ نہیں، کیونکہ وہ تو پہلے سے شریک محفل ہیں، یقیناً کوئی اور ہیں جو ان کے ہم شکل ہیں جن کو ہم نہیں جانتے، اسی لئے لا یعرفہ منا احد، کہا گیا، لیکن اس توجیہ پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیلؑ کی آمد و نشست، امداد سوال، اور جواب پر خود ان کی طرف سے مہر تقدیق، اور لب و لہجہ، یہ سب بتاتا ہے کہ اپنی حقیقت حاضرین پر مخفی رکھنا چاہتے تھے، حتیٰ کہ ابتدائے میں خود سرکار پر بھی مخفی رہا، تو پھر پہچاننے کا کیا تصور؟ (۵)

”کسی روایت میں یا محمدؐ ہے اور کسی میں یا رسول اللہ، دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ممکن ہے دونوں کہا ہو، اور یہ بھی امکان ہے کہ کہا تو ہو ایک لفظ اور روای نے روایت بالمعنی کے طور پر دوسرے لفظ ذکر کر دیا ہو، یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلے یا تو یا محمدؐ کہا ہو لا خفاء حالہ، اور پھر یا رسول اللہؐ کہا ہو، علامہ عینی لکھتے ہیں "او انه قال اولاً یا محمد، کما کان الاعراب یقولہ قصداً للتعمية ثم خاطبه بعد ذالک بقولہ یا رسول اللہ" (عینی ص ۲۹۲/۱) تم یا محمدؐ کہنے پر اعتراض | ان کا نام لیکر عام لوگوں کی طرح پکارا جائے، جیسا کہ قرآن میں ممانعت ہے، لا تجعلوا دُعَاةَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاةِ بَعْضِكُمْ بَعْضاً (۱۸۰ع ۱۰، نور) یعنی نام لے کر نہ پکارو، بلکہ یا رسول اللہؐ کہہ کر خطاب کرو، تو حضرت جبرئیلؑ نے نام لیکر کیوں پکارا؟ اس کے چند جوابات ہیں: (۱) ایک جواب گذر چکا کہ اخفاء حال کے لئے نام لیا، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اس قسم کا خطاب اکڑ دیہائی کیا کرتا ہے، (۲) قرآنی احکامات انسانوں کیلئے ہیں فرشتے اس کے مکلف

(۱) مزید روایت ان الفاظ میں مذکور ہے، والذي بعث محمدًا بالحق ما كنت باعلم به من رجل منكم وإنه لجبرئيل. وفي حديث عامر بن ولى فلما لم نر طريقه قال النبي صلى الله عليه وسلم سبحان الله هذا جبرئيل جاء ليعلم الناس دينهم، والذي نفس محمد بيده ما جئكم قط إلا وأنا أعرفه إلا أن تكون هذه، عمدة القاري ص ۱۸۰. (۲) نسائي ص ۲۹۶/۲. (۳) فضل القبلاي ص ۵۲۸/۱.

نہیں، (۳) ممکن ہے لفظ محمد سے حضرت جبرئیل نے معنی و معنی مراد لئے ہوں کہ محمد ایسی مقدس ہستی کو کہا جاتا ہے کہ اس کی اتنی تعریف کی گئی ہو جتنی کسی اور کی نہ کی گئی ہو، اور لفظ محمد میں جو مبالغہ ہے وہ لفظ محمود میں نہیں کیونکہ باب فعل کی خاصیت میں علماء صرف نے مبالغہ کو بھی ذکر کیا ہے، جیسے قطع کے معنی اچھی طرح کاٹنا، گلڑے گلڑے کر دینا، اگر حضرت جبرئیل لفظ محمد سے معنی علمی مراد لیتے تو بے لوثی کا سوال ہو سکتا تھا، فرض انہوں نے معنی و معنی مراد لیا ہو جس میں مدح ہی مدح ہے، اور اس کی یہ مصلحت سمجھ میں آئی ہے کہ کفار کہ عدوت و دشمنی میں مذمّم کہا کرتے تھے، اس لئے حضرت جبرئیل نے ان کی تردید میں معنی و معنی مراد لیکر یا محمد کہا ہو۔

### دربار رسالت میں حضرت جبرئیل کا سلام

”دربار رسالت میں حاضری کے بعد حضرت جبرئیل نے گفتگو شروع کر دی سلام نہیں کیا جبکہ سلام اسلامی آداب میں سے اہم ادب ہے، تو پھر حضرت جبرئیل نے سلام کیوں نہیں کیا؟ اس کے خلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

- (۱) شرعی احکام اور اسلامی آداب کے مکلف انسان و جنت ہیں نہ کہ فرشتے، اس لئے ان کے عدم سلام نہ کوئی اعتراض نہیں
- (۲) ابتداء سے انتہا تک ایسے ہی امور صادر ہوئے کہ ان کا پچھانا مشکل ہو جائے، اس لئے اختلاف حال کیلئے سلام نہیں کیا
- (۳) حضرت جبرئیل تعلیم کے لئے آئے تھے، اس لئے سلام نہیں کیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ سلام فرض نہیں
- (۴) لیکن یہ دونوں جواب اس وقت کمزور بلکہ ضعیف ہو جاتے ہیں جبکہ بعض کتب حدیث مثلاً مسند امام اعظم میں روایت ہے کہ انہوں نے سلام کیا تھا، گویا اس روایت میں سلام کا اضافہ ہے، اور اصول حدیث کے پیش نظر ثقہ کی زیادتی معتبر ہے، لہذا تحقیق ہو کہ انہوں نے سلام کیا تھا لہذا نہ کوئی اعتراض اور نہ کوئی جواب کی حاجت باقی رہی مسند امام اعظم کے الفاظ یہ ہیں

عن حماد عن ابراهيم عن علقمة عن ابن مسعود قال جله الى النبي ﷺ في صورة شاب عليه ثياب بيضاء فقال السلام عليك يا رسول الله قال رسول الله ﷺ وعليك السلام، (۵) م

اخبرني عن الاسلام: مسند امام اعظم میں سوال اس انداز میں ہے فاخبرني عن شرائع الاسلام، اور دوسری جگہ فعا شرائع الاسلام؟ کے لفظ سے سوال منقول ہے، بخاری شریف میں سوال کی ترتیب مسلم کے برعکس ہے، پہلے ایمان کا سوال ہے، اور بعد میں اسلام کا، چونکہ واقعہ ایک ہی ہے اس لئے حقیقت بھی ایک ہی ہوگی، اور اس تقدیم و تاخیر کو ردی کی جانب منسوب کیا جائے گا، محدثین نے دونوں ترتیب کو اختیار کیا ہے، جسکی منقول وجہ ہے، امام بخاری نے ایمان کو پہلے نمبر پر اس لئے بیان کیا کہ ایمان حاصل ہے، اور امام مسلم نے اسلام کو اس لئے مقدم کیا کہ حضرت جبرئیل کی آمد کا مقصد شریعت کی تعلیم دینا تھا، اور شریعت اعمال ظاہری کا مجموعہ ہے، اس لئے اس کے مناسب یہ ہے کہ اسلام کا تعلق اعمال جوارج سے ہو، اور ایمان کا اعتقاد است سے۔

اکثر روایات میں اعمال جوارج کی تفصیل شہادتین، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج سے کی گئی ہے، عمرہ غسل جنابت اور وضو کی تکمیل کا تذکرہ صرف ابن حبان کی روایت میں ہے (۶) لیکن عمرہ و حج کے تابع ہے، اور غسل جنابت اور اسہل و ضرور

کے، اس لئے یہ اختلاف کوئی اختلاف حقیقی کی حیثیت نہیں رکھتا۔

## ایمان و اسلام کے درمیان فرق

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اس روایت میں اسلام اور ایمان کا الگ الگ مفہوم بتایا گیا ہے، ان دونوں کے درمیان حافظ ابن رجب حنبلی کے قول سے بھی فرق معلوم ہوتا ہے "الاسلام والایمان کالسمی الفقیر والمسکین، اذا تفروقا اجتماعا واذا اجتماعا تفروقا" اس سے بھی دونوں میں جابین ظاہر ہے، حالانکہ وفد عبد القیس کی روایت (د) میں ایمان کی ٹھیک وہی تفسیر کی گئی ہے جو یہاں ایمان کی تفسیر میں مذکور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام و ایمان کے درمیان کوئی فرق نہیں، تو پھر یہاں جواب میں فرق کیوں؟

نام فرمائی فرماتے ہیں کہ دراصل ایمان و اسلام کا استعمال شریعت میں تین طرح وارد ہے (۱) علی سبیل التواؤد و التواؤف (۲) علی سبیل التواؤف (۳) علی سبیل الاختلاف (۴)، تواؤف کی مثال فاجر جنا من کان فیہا من المؤمنین فما وجدنا فیہا غیر بیت من المسلمین (۵) کہ پوری بستی میں ایک ہی مسلم گھر حضرت لوط کا تھا، انہیں کو مسلم کہا اور انہیں کو مؤمن کہا گیا، معلوم ہوا کہ دونوں میں تواؤف ہے۔

علی سبیل الاختلاف کی مثال: قائلۃ الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا ولما يدخل الایمان فی قلوبکم (۴۵) اس میں ایمان کی نفی اور اسلام کا اثبات ہے، معلوم ہوا کہ مغایرت ہے، تداخل کی مثال: بخاری شریف (۵۵) میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اچھے اعمال افضل، قال الایمان باللہ، اور مسند امام احمد میں ہے (۱۶) کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا اچھے الاسلام افضل، فقال ایمان باللہ، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں میں تداخل ہے۔

(۲) جانفہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ایمان و اسلام میں سے ہر ایک کی الگ الگ حقیقت شرعیہ ہے، جس طرح ہر ایک کی الگ الگ حقیقت لغویہ ہے، لیکن درجہ تکمیل میں ہر ایک دوسرے کو مستلزم ہے، اس لئے کہ کوئی مؤمن مؤمن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں اسلام نہ ہو اور کوئی مسلم کامل مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں ایمان نہ ہو، (ص ۴۸) ”م

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ ایمان و اسلام مصداق کے لحاظ سے ایک عہد چیز ہے یعنی اسلام کامل اور ایمان کامل جدا نہیں ہو سکتے، اس لئے ایمان و اسلام کے اجزاء ایک دوسرے کی تعریف میں ذکر کئے جاسکتے ہیں۔ (۵)

لور اگر غور کیجئے تو اس اختلاف جوابات سے ایک حقیقت کا پتہ چلتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حدیث جبرئیل میں مسائل کے سوالات کی نوعیت اور پھر بار بار اس کی تصدیق کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی ذی علم، ذی فہم شخص ہے اس لئے اس کے سامنے ہر ایک کی جداگانہ مہارت اور علیحدہ علیحدہ حقیقت بیان کرنا، اور ان باریک علمی گوشوں پر متنبہ کرنا جس سے ایمان و اسلام کی حقیقتیں ممتاز ہوتی ہیں بیان کرنا نہایت مناسب ہے، اور اس کے برخلاف دہ دہ عبد القیس میں آپ کے مخاطب چند نو

(١) مسلم شريف ص ٢٣/١. (٢) (٢) احياء العلوم ص ١٢٢/١. (٣) سورة ناريات ب ٢٧، (٤) سورة حجرات

پ ۲۶، (۵) بخاری شریف ص ۹، (۶) مسند امام احمد (۷) فتح الباری ص ۵۵، (۸) فیض الباری ص ۱/۱۱۷۔

مسلم تھے، ان کے سامنے علمی تحقیقات بیان کرنا غیر ضروری تھا، نیز وہ صرف ایسا نظام عمل دریافت کرنے آئے تھے جو ان کی نجات کے لئے کافی ہو جائے، اور یہ تعبیری فرق صرف مخاطبین کے حالات کی رعایت سے کیا گیا، مسئلہ کا فرق نہیں ہے، اقامتِ صلوٰۃ :- ”تصلی الصلوٰۃ“ کے بجائے تقیم الصلوٰۃ کی تعبیر اختیار کرنے میں نماز کے اندر خشوع و خضوع، تعدیل ارکان، سنن و مستحبات کی رعایت اور اوقات و جماعت کی پابندی وغیرہ کی طرف اشارہ ہے، ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں ای ان تقیم الصلوٰۃ ای المعہودۃ شرعاً وفي رواية مسلم المكتوبة تنبيهاً على ان النافلة وان كانت من الاسلام لكنها ليست من اركانها یعنی بیان تودیعہا وتحفظ شروطہا وتعدل اركانہا وتداوم علیہا ولذا لم يقل وتصلی م۔ (۵)

توتی الزکوٰۃ : کلف زکوٰۃ زکی سے مشتق ہے، جس کے معنی نموسے ہیں، وجہ تسمیہ: (۱) زکوٰۃ دینا کرنے سے مال میں حسی یا معنوی اضافہ ہوتا ہے، حسی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مال کی مقدار میں اضافہ کر دے، اور معنوی کا مطلب مال کو بے جا موقع پر صرف ہونے سے بچایا جائے، اور صرف ضروریات میں ہی خرچ ہوا کرے (۲) یا زکوٰۃ کا آخرت میں بہت زیادہ ثواب ہو گا (۳) یا اس لئے کہ زکوٰۃ کا تعلق مالِ مائی سے ہوتا ہے، جیسے زراعت و تجارت۔ (۴) بعض روایت میں الزکوٰۃ کے ساتھ المفروضۃ کا لفظ ہے، اس قید کے متعلق علامہ قسطلانی کا خیال ہے کہ نقلی صدقات سے احتراز ہے، نیز پیش کی زکوٰۃ سے بھی احتراز ہو سکتا ہے۔ (۵)

وتصوم رمضان: ”بعض روایت میں ہے کہ مطلقاً رمضان نہ کہا کرو، بلکہ شہر رمضان کہا کرو، مگر یہ روایت صحیح نہیں، لہذا بغیر شہر کے بھی بولا جاسکتا ہے جیسا کہ اکثر روایات میں ہے،

رمضان ماخوڑے رمضان سے معنی گری کی تیزی، وجہ تسمیہ: اس ماہ کے روزے کی برکت سے گناہ جلا دیے جاتے ہیں، جب روزہ فرض ہوا تھا تو گری کا زمانہ تھا، اور وہ ۲۷ تھا (۶) م۔

وتحج البيت ان استطعت اليه سبيلاً: بخاری شریف میں جہاں یہ روایت ہے، وہاں حج کا ذکر نہیں وہاں بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ: لیکن یہ اس وقت حج فرض نہ ہوا ہو، لیکن یہ جواب اس لئے بھی درست نہیں کہ یہ واقعہ حجۃ الوداع کے بعد کا ہے، جبکہ اس سے قبل حج فرض ہو چکا تھا، اسلئے بہتر جواب یہ ہے کہ راوی حدیث نے اختصار کے پیش نظر، حج کا تذکرہ نہیں کیا، یا لساناً چھوٹ گیا ہو، اور اسکی عطاقت یہ ہے کہ خود مسلم شریف اور مسند امام اعظم میں اس کا تذکرہ ہے، (۷)

بيت سے خاص بیت یعنی خانہ کعبہ مراد ہے، اور استطاعت کے مراد مفہوم میں فقہاء کے درمیان قدرے اختلاف ہے، حضرت امام مالکؒ کے یہاں سلامت بدن (سندرستی) مراد ہے، اس لحاظ سے ان کے یہاں اگر کوئی شخص غریب ہو مگر تندرست ہو تو اس پر حج فرض ہو گا، وہ کماتے کماتے چلا جائے، حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک استطاعت سے مراد زوال اور راحلہ ہے، لہذا

(۱) مرقاۃ ص ۵۲/۱، (۲) فتح الباری ص ۱۶۸/۲، (۳) فتح الباری ص ۱۷۰/۳، (۴) مجمع بحار الانوار

ص ۲۷۸، (۵) مسند امام اعظم ص ۳۶

اگر کوئی شخص ضرورت سے فاضل اسنے مال کا مالک ہو کہ خاندان کعبہ آلودر جاسکتا ہو، مگر بیمار ہو اور ایسی بیماری ہو کہ خود سفر کرنے کی طاقت نہ ہو تو ایسے شخص پر بھی حج فرض ہوگا، اور بجائے خود حج کرنے کے کسی سے حج بدل کرنا لازم ہوگا۔ (۱۰)

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے یہاں استطاعت کی تفسیر میں دونوں چیزیں داخل ہیں سلامت بدن بھی ہو، اور زلو اور اہلہ کا مالک بھی ہو، اگر ایسے وقت میں مالدار ہوا جبکہ وہ ہر طرح سے جسمانی صحت سے مجبور ہو چکا، تو اس پر حج فرض نہ ہوگا، اسی طرح اگر نادار ہے مگر بے تندرست، تو ایسے شخص پر بھی حج فرض نہیں ہوگا۔ (۱۱)

قال صدقت فعجبنا: آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب عنایت فرمایا اُسے سن کر سائل نے تصدیق کی تو صحابہ کرام کو حیرت ہوئی، کہ سوال بتا رہا ہے کہ اس کو معلوم نہیں، اور تصدیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ہے، نیز تعجب کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر اس شخص کو علم ہوا تو پھر کہاں سے؟ یہ باتیں تو سوائے حضور کے کسی اور سے معلوم نہیں ہو سکتیں، جبکہ یہ مدینہ کا رہنے والا بھی نہیں، پھر ان کو معلوم ہوا تو کہاں سے؟

فاخبرنی عن الايمان قال أن تومن بالله الخ: ایمان کی تشریح میں جن امور خبہ کا احادیث میں ذکر ہے قرآن کریم نے بھی کئی جگہ ان کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً کُلْ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ الخ (۱۲) حضرت جبریلؑ نے ایمان کے متعلق سوال "ما" کے ذریعہ کیا، حالانکہ سوال جب "ما" کے ذریعہ ہو تو سوال کا مقصود حقیقت شئی ہو کر رہتا ہے، اس لئے بظاہر جواب میں تصدیق کافی تھا، لیکن چونکہ سامعین صحابہ کرام تھے اور ایمان کی حقیقت و مفہوم جانتے تھے، اس لئے اس سوال کا منشا صرف اتنا ہی نہیں ہو سکتا بلکہ منشا سوال یہ ہوگا کہ ایمان کا تعلق کن چیزوں سے ہے، اس لئے جواب میں وہ چیزیں بیان کی گئیں جن کا تعلق ایمان سے ہے۔

ایک اشکال: - یہاں حد اور محدود کے ایک ہونے کی وجہ سے دور کا سوال بھی ہو سکتا ہے، یعنی سوال میں بھی ایمان ہے اور جواب میں بھی ایمان ہے، حاصل یہ نکلا کہ ایمان کیا ہے؟ تو جواب یہ ملا کہ ایمان قبول کرو، تو اس صورت میں تعریف الٰہی بنفسہ اور دور لازم آتا ہے، علامہ طبری نے جواب دیا ہے کہ تو من تعترف کے معنی میں ہے، لہذا دور لازم نہیں آیا، مگر ملا علی قاریؒ کو یہ جواب تسلیم نہیں، فرماتے ہیں کہ اعتراف تو اسلام کے اجزائے میں سے ہے، نہ کہ ایمان کے اجزائے میں سے، لہذا تو من کا ترجمہ تعترف سے کرنا بہتر نہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہاں تو من تصدق کے معنی میں ہو۔ غرض محدود سے مراد ایمان شرعی ہے اور حد سے مراد ایمان لغوی، تو تعریف کا حاصل یہ نکلا کہ ایمان شرعی تصدیق مخصوص کا نام ہے، اب ایمان باللہ کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے وجود کی تصدیق کی جائے، اور اس کو تمام صفات کمالیہ سے متصف اور ہر طرح کے نقائص سے منزہ مانا جائے۔ (۱۳)

لفظ اللہ کی تحقیق | لفظ اللہ ذات باری کا مخصوص علم ہے، اس کو اسم اعظم بھی کہتے ہیں، لفظ اللہ کے احتیاط اور باب کے سلسلہ میں گونا گوں اختلاف رائے پایا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض نے یہ کہہ دیا کہ یہ لفظ عربی نہیں بلکہ عبرانی یا سریانی ہے، مگر یہ صحیح نہیں بلکہ علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی لفظ ہے۔ (۱۴)

لفظ اللہ کے ماخذ و احتقاق میں بھی اختلاف ہے کہ اسم جامد ہے یا مشتق، اکثر علماء اسلام اس کو اسم جامد کہتے ہیں اور اس کے الف لام کو لازم اور اصل کو مقرر دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس پر حرف نداء واسطہ داخل کر کے، یا اللہ کہہ سکتے ہیں، جبکہ نحوی قاعدہ کے مطابق کسی معرف بلا لام پر حرف نداء داخل کرنا جائز نہیں، چنانچہ یا الرحمن نہیں کہہ سکتے، لام رازی اکثر فقہاء اور اصولیین کا بھی مختار قول ہے،

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اسم مشتق ہے، پھر خوردین کے درمیان مادۂ اشتقاق میں چند اقوال ہیں: آلۃ یا آلہ اللوہۃ (ف) بمعنی بندگی کرنا، اللہ بمعنی ماہوہ یعنی معبود، (۲) آلۃ یا آلۃ آلهآ (س) فرمانبرداری کرنا، (۳) لایۃ یلوۃ لوہآ (ن) چمکانا اور چھینا (من الاضداد) مناسبت ظاہر ہے، خدا نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور اس کی صفات کے جلوے نگاہوں کے سامنے ہیں (۴) لایۃ یلیہا لیہآ (ض) بلند ہونا، چھیننا، مناسبت ظاہر ہے۔ بہر حال ان حضرات کے قول کے مطابق اللہ کی اصل لایۃ تھی الف لام شروع میں لا کر ادغام کیا گیا، ظلیل غوی کا کہنا ہے کہ اس کی اصل اللہ تھی، ہمزہ حذف کر کے اس کے عوض الف لام شروع میں لے آئے اور ادغام کر دیا گیا، جیسا کہ اناس سے اناس ہوا، لیکن امام کسائی، نور فرہ کا خیال ہے کہ اس کی اصل اللہ تھی ثانی ہمزہ حذف کر کے الف لام کو اس کا عوض قرار دیا گیا، پھر لام کو لام میں ادغام کر دیا گیا تو اللہ ہو گیا۔ "و ملائکتہ:" یہ ملک کی جمع ہے، اور ملائکہ بھی اس کی جمع ہے، لیکن اشکال یہ ہوتا ہے کہ فعل کی جمع فاعل نہیں آیا کرتی، پھر ملک کی جمع ملائکہ یا ملائکۃ کیونکر آئی؟ ملا علی قاریؒ نے نقل فرمایا ہے کہ ملائکہ اصلاً ملائک کی جمع ہے، اور یہ لفظ در اصل مائک تھا، الوکۃ سے مشتق ہے، جسکے معنی رسالت یعنی فرستادہ اور قاصد کے ہیں، چونکہ وہ بھی من جانب اللہ فرستادہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کو ملائکہ کہا جاتا ہے، مائک سے ملک اس طرح بنا، کہ لام کو ہمزہ پر مقدم کر دیا، تو ملک ہو اور ہمزہ کی حرکت نقل کر کے مائل کے لام کو دیا گیا، پھر کثرت استعمال کی بنا پر ہمزہ کو حذف کر دیا گیا تو ملک ہو گیا، پھر جب اس کی جمع بتائی گئی تو وہ ہمزہ لوٹا دیا گیا، اس لئے جمع ملائک ہوئی اسکے بعد ملائکۃ میں تاکا اضافہ تائید کیلئے کر دیا جائے۔ (د)

فرشتے کے اوصاف و اقسام | قرآن نے فرشتوں کے مختلف اوصاف ذکر کئے ہیں، بل عباد مکرمون، لا یعصون اللہ ما امرهم ویفعلون ما یومرون، یسبحون اللیل والنہار

لا یفترون وہم بامرہ یفعلون۔

اقسام | (۱) حاملین عرش (۲) عرش کے ارد گرد طواف کر نیوالے (۳) اکابر ملائکہ مثلاً حضرت جبرئیل وغیرہ (۴) ملائکہ ارواح (۵) کرکاتاتین (۶) ملائکہ حفاظت (۷) وہ فرشتے جو نظام عالم پر موقوف ہیں (۸) ملائکہ جنت (۹) ملائکہ جہنم (۱۰) ملائکہ یامین، جو ذکر کے حلقوں میں حاضر ہو کر سیر ہوتے ہیں (۱۱) ملائکہ مقررین، جن کا مشغلہ تجلیات ربانی میں ہم وقت استغرق ہے۔ فرشتوں کی یہ قسمیں اہل نظر نے اپنے ذوق کے مطابق بتائی ہیں، تاہم فرشتوں کی اس قدر کثرت ہے کہ آسمان میں ایک بالشت بھی جگہ خالی نہیں، جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ معروف و عبادت نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ فرشتوں کی تعداد اور اس کی اقسام عالم الغیب و صدہ لا شریک لہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

ایمان بالفلانکے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کرنا، اور اس بات کا یقین کرنا کہ وہ اللہ کے نیک بندے ہیں گناہوں سے معصوم ہیں، دنیوی انتظامات کے لئے من جانب اللہ مامور ہیں، کوئی بادل پر، کوئی وحی رسانی پر، کوئی قبض روح پر، تو کوئی کتاب اعمال پر۔ ان کی تعداد سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں، ان میں حضرت جبرئیل، میکائیل، عزرائیل، اسرافیل ممتاز ہیں۔“م۔

## فرشتہ افضل ہے یا حضرت انسان؟

”علامہ شافعیؒ نے فرق مراتب کے لحاظ سے انسانوں کی تین قسم قرار دی ہے، (۱) خواص، جیسے انبیاء، (۲) اوساط، جیسے صحابہ، تابعین، شہداء، صالحین و اقیہ (۳) عوام الناس۔ پھر فرشتوں کی دو قسم قرار دی ہے، خواص فرشتہ، جیسے مشہور چار فرشتے، حملۃ العرش، رضوان، ملک، روحانیون وغیرہ، دوسری قسم عام فرشتے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام خاص فرشتے سے بھی افضل ہیں، البتہ خاص فرشتے اوساط الناس اور عوام الناس سے افضل ہوتے ہیں، لیکن اوساط الناس اور عوام الناس یہ دونوں عام فرشتوں سے افضل ہیں، تاہم اس مسئلہ میں بھی توقف و سکوت اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی نص وارد نہیں۔ (شبہ ص ۹۰ ج ۱)“م۔

وگتنبہ: کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ آسمانی کتابوں کو منزل من اللہ سمجھنا، اور اس کے مضامین کو حق تسلیم کرنا، اور ان میں قرآن کو آخری اور ناسخ سمجھا جائے،

بعض علماء نے لکھا ہے کہ کتب منزلہ ۱۰۴ ہیں، جن میں دس صحیفہ حضرت آدم علیہ السلام پر، پچاس حضرت شیث پر، تیس حضرت ادریس پر، اور دس حضرت ابراہیم پر، اور چار مشہور کتاب۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ پر تورات کے علاوہ دس صحیفہ مزید آئے، اس طرح کل ایک سو چودہ کتب و صحیفہ کا مجموعہ نازل ہوا، تاہم ان میں جن کتابوں کا علم تفصیلی ہے (تورات، زبور، انجیل، قرآن) ان پر نام بنام تفصیلی اعتقاد رکھنا ہوگا، اور باقی (خواہ مذکورہ تعداد سے کم ہو یا زیادہ) پر اجمالی ایمان کافی ہے۔ قرآن کے سلسلہ میں قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ قرآن کریم پر ہر مومن کا اجمالی ایمان فرض عین ہے اور تفصیلی ایمان فرض کفایہ ہے۔ (بیضاوی ص ۲۱ سورہ بقرہ)“م۔

سوال:۔ ”قرآن کریم کے علاوہ اگر آسمانی کتابوں کو حق ماننا اور پھر قابل عمل تسلیم نہ کرنا گویا بظاہر متنافیین معلوم ہوتا ہے، لہذا تو قابل عمل ہو یا پھر حق نہ ہو حالانکہ ایسا نہیں؟

اس کا جواب ایک مثال سے سمجھئے کہ چاند ستارے قلعے اور چراغ کو بھی قابل قدر اور شب تاریک میں کار آمد سمجھا جاتا ہے اور فائدہ اٹھایا جاتا ہے، لیکن جب رات کی تاریکی چھٹی ہے، اور نور آفتاب پھیلتا ہے تو اس وقت کوئی بھی آفتاب کے سامنے ان چیزوں کو نہ روشن کرتا ہے اور نہ ہی قلعے اور چراغ کو روشن کرنا عقلمندی سمجھا جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ایسا بھی نہیں کہ ان کو تاندیری کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، اور اسکو توڑ پھوڑ کر پھینک دیں بالکل اسی طرح عالم روحانیت کا آفتاب قرآن ہے اس کے طلوع ہونے کے بعد کتب سابقہ کی حاجت اور ضرورت باقی نہ رہی، جیسا کہ آفتاب نے دوسری روشنیوں کو ختم کر دیا، اسی طرح روحانی آفتاب نے دوسری کتابوں کو ناقابل عمل بنادیا تاہم کتب سابقہ پر گو کہ ایمان ضروری ہے مگر یہ یقین

نہیں کر سکتے کہ موجود جو محرف شدہ کتب ہیں یہی آسمانی ہیں کیونکہ اصل کتاب میں تحریف کی شہادت قرآن کریم نے کر دی ہے۔ (۱)

والیوم الآخر: مراد اس سے قیامت اور اس کے بعد کا دن ہے، فناء دنیا کے بعد والے دن کو یوم آخر کہتے ہیں اس کو تسلیم کرنا بھی ایمان کا جزء ہے۔

تؤمن بالقدر خیرہ وشرہ: یہاں عامل (تو من) کا اعادہ کیا گیا ہے اسکی وجہ یا تو یہ ہے کہ عامل و معمول میں لبا فصل ہے اور ایسی صورت میں عامل کو لونا چاہئے، دوسری معنوی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مسئلہ قدر کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے عامل کو ذکر کر دیا گیا، کیونکہ تقدیر کا مسئلہ بہت ہی نازک اور دقیق ہے، اسی لئے اس مسئلہ میں فرقہ قدریہ اور جبریہ کو سخت دھوکہ لگا اور وہ جادہ مستقیم سے دور چارڑے، اسکی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے دوسرے متعلقات ایمان سے گویا علیحدہ کر کے ایک مستقل جملہ کی صورت میں ذکر کیا گیا، علیحدہ ذکر کرنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایمان بالقدر کی حیثیت ماقبل کے متعلقات سے کم درجہ کی ہے کیونکہ سابقہ متعلقات کے انکار کرنے سے دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، اور ایمان بالقدر کے انکار سے بدعتی ہو گا کافر نہیں ہو گا، یہی وجہ ہے کہ محققین نے قدریہ مرجعہ کی تکفیر نہیں کی ہے۔ (۲)

ایمان بالقدر کے سلسلہ میں ابن ماجہ میں ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا عدی اسلم تسلیم قلت، وما الاسلام فقال تشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله وتؤمن بالاقدار کلها خیرها وشرها حلوها ومراها۔" (۳)

یعنی اس پر یقین کرو کہ بھلا بر اور تلخ و شیریں جو کچھ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ وہ سب پہلے سے مقدر ہو چکا ہے، ایک دوسری روایت میں ہے ویومن بالموت ویومن بالبعث بعد الموت ویومن بالقدر۔ (۴)

خیرہ اور شرہ سے مراد نفع و ضرر ہے، یعنی یہ اعتقاد ہو کہ حق تعالیٰ نے خیر و شر کو مخلوقات کی پیدائش سے پہلے ہی مقدر کر دیا ہے۔

”بعض حضرات کے نزدیک قضا و قدر ایک ہی شئی ہے، لیکن دوسرے حضرات کا خیال ہے، قضا و قدر میں فرق ہے کہ احکام ازلیہ اجمالیہ کا نام قضا ہے، اور احکام تفصیلی جو اجمال کے مطابق ہوں وہ قدر ہے، حضرت مولانا قاسم نانوتوی فرماتے ہیں کہ معاملہ بزرگس ہے مثلاً کسی مکان بنانے کا جب ارادہ ہو تو ایک اجمالی نقشہ ذہن میں آ جاتا ہے یہ بمنزلہ قدر ہے اور اس نقشہ کے مطابق جو مکان تیار ہو کر موجودی الخارج ہو ایہ بمنزلہ قضا ہے۔“

ایک اشکال :- ”جس چیز میں کوئی خیر و بھلائی نہ ہو، بلکہ وہ شر اور باعث مصیبت ہو تو اسکے پیدا کرنے سے کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان جس چیز کو شر، خراب اور باعث مصیبت سمجھتا ہے اس کی دو حیثیت ہے، ایک تو وہ شر اور برائی جس قوم یا فرد میں آئی، اور ایک حیثیت اس شر و برائی کا تعلق مجموعہ عالم کے اعتبار سے، تو کوئی بھی شر، برائی کسی خاص

(۱) و یحرفون الکلم عن مواضعہ، آیت ۱۳، (۲) تعلیم الاسلام شرح فقہ اکبر ص ۲۲۵، (۳) سنن ابن ماجہ ص ۱۰،

(۴) ترمذی ص ۲/۳۶



تو مہیا فرو کے لحاظ سے شر تو ہو سکتی ہے لیکن اگر مجموعہ عالم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو درحقیقت وہ شئی شر نہیں ہوتی بلکہ مصلحت خدائے مہدی میں وہ خیر ہی ہوا کرتی ہے، خواہ انسان کی نگاہ اس کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے، مشہور شاعر صہبائی کا شعر مصائب قوم عند قوم فوائد، اسی قسم کی طرف غماز ہے، کہ کوئی اپنی ذات میں خواہ کتنی ہی بری سمجھی جائے مگر مجموعہ عالم کے مصالح و فوائد کے لحاظ سے وہ شر قابل عیب نہیں، بلکہ خیر ہی کے زمرہ میں داخل ہے، مثلاً انسان کے بال اور ناخن کو اگر جسم انسانی سے الگ کر کے دیکھیں تو وہ ناپسندیدہ اور باعث کبیدگی ہے، مگر جب یہی بال سر پر ہو تو رونق و حسن کا کام دیتا ہے، اور یہی ناخن زینت و دست و پا بن جاتا ہے، اسی طرح سے پورے عالم کو ایک جسم تصور کر لیں اور پھر دیگر اشیاء کو دیکھیں جن کو شر کہا جاتا ہے، وہ مجموعہ عالم اور جسم عالم کے عین مصلحت معلوم ہوگا، ہاں انفرادی اور جزوی طور پر اس کو شر، خراب کہا جائے گا، غرض خالق کائنات کی طرف نسبت مجموعہ عالم کی مصلحت کے لحاظ سے کوئی شئی شر یا خراب نہیں، بلکہ مفید ہے اس لئے کوئی اعتراض نہیں۔ اس کو دوسری مثال میں یوں سمجھیں کہ چوری ہے بری، مگر اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو روزی حلال مل رہا ہے، جیسے بڑھئی، تالا بچنے والے، اور چابی بنانے والے وغیرہ کو مل رہا ہے،

شعر - نہیں ہے چیز نیک کوئی زمانہ میں کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں ”م

فاخبرونی عن الاحسان : احسان باب افعال کا مصدر ہے، صلہ اور بلاصلہ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، احسن کذا کے معنی اتقنتہ، اور احسنت الی فلان، اس وقت بولتے ہیں، جب کسی کو نفع پہنچاتا ہو، یہاں پہلا معنی مراد لیا جائے گا، کیونکہ مقصد اتقان عبادت ہے، اور دوسرے معنی بھی ملحوظ ہو سکتے ہیں، کیونکہ عابد اخلاص کے ساتھ عبادت کر کے اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

اس حدیث میں الاحسان کے الف لام کو عہد کے لئے مانا جائے، تو منشا سوال یہ ہوگا کہ وہ احسان جس کا تذکرہ قرآن کی آیت ”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ ”ہل جزاء الاحسان إلا الاحسان“ میں ہے اس کا مطلب اور اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟ یا یہ کہا جائے کہ احسان حسن سے ماخوذ ہے، اور ہمزہ تصحیر یعنی حسین و خوبصورت اور نکھار کے معنی میں ہو تو مقصد سوال یہ ہوگا کہ ایمان و اسلام کی حقیقت معلوم ہو چکی، اب یہ بھی بتا دیجئے کہ ان کو سنوارنے اور اچھا بنانے کی صورت کیا ہے؟ اس حدیث میں ایمان کے تین درجے بتائے گئے ہیں، ادنیٰ اوسط، اعلیٰ۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ شہادتین کے ساتھ ارکان خمسہ سے ظاہری اعضاء و جوارح مزین ہو جائیں اگرچہ حقائق ایمانیہ سے ہنوز قلب منور نہ ہو، اس تکمیل انقیاد کا یہ نتیجہ ضرور ہونا چاہئے کہ غفلت میں کبھی کبھی معصیت بھی سرزد ہو جائے اسی کو قرآن نے حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تَقُومُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ، عرب کے بد کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے چکے ہیں آپ فرمادیجئے کہ یہ دعویٰ ابھی مت کرو، ابھی تو صرف ظاہری انقیاد حاصل ہوا ہے، ہاں اس کی توقع ہے کہ آئندہ دین تمہارے قلوب میں آجائے، پھر تمہارا باطن ظاہر کی طرح منور ہو جائے گا، اسی کا نام ایمان ہے، اور یہی دین کی متوسط منزل ہے، یہاں پہنچ کر واجبات کا تحفظ اور محرمات سے اجتناب ضروری ہو جاتا ہے، اس کے بعد اگر قسمت نے ساتھ دیا اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ حاصل ہو گیا تو تیسرا اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ قلب میں حاضر و غائب کا فرق نہ رہے، اور دنیا

میں عین حجاب و غیبت میں عبادت کا وہ سلیقہ ہاتھ آجائے جو عام بے حجابی میں ہوتا، ان تینوں منازل کی طرف قرآن نے آیت مذکورہ میں اشارہ کیا ہے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخیرات باذن اللہ، پھر ہم نے اپنی کتاب کا وراثت ان لوگوں کو بخشا جنہیں ہم نے اپنے بندوں سے چن لیا تھا، اس میں تو کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا رہا اور کوئی سیانہ رو چلا رہا، اور خدا کے حکم سے کوئی نیکی میں آگے رہا یہی اللہ کا بڑا فضل ہے، اس تیسرے درجہ کا نام احسان ہے۔

قال ان تعبد اللہ کأنک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک الخ: قوله فانہ یراک، ان لم تکن کی شرط نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ خدا کی رویت مشروط ہے تمہارے نہ دیکھنے پر اور یہ معنی غلط ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کو رویت ہر حال میں ہے، بندہ کو اس کی رویت ہو یا نہ ہو اس لئے ان لم تکن کی جزاء کو محذوف سماتا جائے، اور فانہ یراک، جزائے محذوف کی دلیل ہے، تقدیر عبارت یوں ہے فان لم تکن تراہ فاحسن العبادۃ فانہ یراک، اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو بھی تم کو عبادت اچھے ذہن سے کرنا چاہئے، کیونکہ وہ تمہاری عبادت کو ہر حال میں دیکھتا ہے۔

حدیث میں درحقیقت دو حالت بتائی گئی ہے (۱) مشاہدہ (۲) مراقبہ، مشاہدہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم خدا کو دیکھ رہے ہیں، اور مراقبہ یہ ہے کہ عابد کو متحضر ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، مشاہدہ دلی صورت کأنک تراہ میں کاف تشبیہ لا کرتا یا بآنک کے ذریعہ نہیں معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کسی کیلئے رویت باری مسلم نہیں، مسلم شریف میں ہے لن تروا ربکم حتی تموتوا، (مسلم ص ۹۹) کیونکہ اس عالم میں رویت باری کی طاقت آنکھ کو نہیں دی گئی، ہاں قلب پر جو کشف ہوتا ہے بھی اس کو رویت کہہ دیتے ہیں اس میں اگر استثناء ہے تو صرف معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کا، بشرطیکہ روایت مسلم ہو،

عام شرح کی تحقیق تو یہی گذری کہ اس جملہ میں دو مقام بتائے گئے ہیں مشاہدہ اور مراقبہ۔ لیکن امام نووی اور دیگر بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ اس میں دو مقام کا ذکر نہیں، بلکہ ایک ہی مقام کا تذکرہ ہے، اس کی شرح یہ ہے کہ انسانی فطرت حضور اور غیبت کا فرق کرتی ہے، ایک غلام اپنے آقا کی خدمت جب اس کے سامنے انجام دیتا ہے تو خشوع و خضوع اور حسن و بوب کے جتنے مراتب ہو سکتے ہیں سب کو صرف کر ڈالتا ہے، لیکن اس کے سامنے سے ذرا علیحدہ ہو جاتا ہے تو اس کی تمام مستعدی سرسبز کو تابی اور تصور میں تبدیل ہو جاتی ہے، غیبت اور حضور کا یہ فرق ایک قسم کا انفاق ہے، شریعت چاہتی ہے کہ اس عیب سے اُسے پاک کر کے اخلاص حقیقی کے بلند پایہ مقام تک پہنچادے، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ بندہ پر حق یہ ہے کہ وہ ہر حال میں ایسی عبادت کا عادی ہو جائے جیسا کہ حلیہ حضور میں اور عبادت میں وہ ایسی لگن دکھائے جیسے اللہ تعالیٰ ان کی نظروں کے سامنے ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جدوجہد اور احسان عبادت اس تصور پر موقوف نہیں، کہ ہم اُسے دیکھ رہے ہیں بلکہ حلیہ حضور میں بھی حسن عمل اور حسن ادب کے باعث یہی تصور ہوتا ہے کہ وہ ہمیں دیکھتا ہے اس لئے ہم اگر اس تصور سے عبادت نہیں کر سکتے تو گویا ہم اُسے دیکھ رہے ہیں تو یہ علم بہر حال ہمیں حاصل ہے، کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے خشوع و خضوع کا سبب اصلی اس کا دیکھنا ٹھہرا، اور یہ علم ہر وقت حاصل ہے تو پھر حضور و غیبت کا فرق کیوں؟ الم یعلم بأن اللہ یرى، غرض احسان عبادت ہمارے دیکھنے پر موقوف نہیں بلکہ اس کے دیکھنے پر ہے، اس کی مثال آقا کی موجودگی میں غلام

کام کر رہا ہے، جبکہ آقا کا رخ کسی دوسری جانب ہے کہ غلام کو نہیں دیکھ رہا ہے مگر غلام اُسے دیکھ رہا ہے تو ایسی صورت میں کسی نہ کسی درجہ میں غلام کے لگن اور جذبہ میں کمی آئے گی، مگر جب غلام کو آقا نظر تو نہ آتا ہو، لیکن اس بات کا یقین ہو کہ وہ چھپ کر دیکھ رہا ہے تو اس صورت میں پورے جذبہ اور لگن کے ساتھ کام کرے گا کیونکہ دیکھنے کا یقین ہے، دوسری مثال: نابینا کو بادشاہ کے سامنے کھڑا کر دو اور کہہ دو کہ بادشاہ سامنے دیکھ رہا ہے تو گو کہ نابینا نہیں دیکھ سکتا مگر پورے لوب و تہذیب کے ساتھ کھڑا رہے گا اور ادنیٰ بے تہذیبی کو دخل نہ دیگا، ایسا ہی یہاں معاملہ ہے۔

ایک عابد کو اس قسم کا استعجاب ہو سکتا تھا کہ خدا کو کیسے دیکھا جاسکتا ہے، تو اس کے اسی حیرت و استعجاب کو غمان نہ تنکن میں دور کیا گیا، کہ مانا کہ تم نہیں دیکھ رہے ہو، مگر اتنا تو تم کو یقین ہے کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے اور اخلاص عمل میں اسی تصور کو دخل ہے اور یہ ہر حال میں حاصل ہے، تو پھر اخلاص عمل بھی ہر حال میں ہونا چاہئے۔ غرض اخلاص کا، جو انوکھا اور نادر طریقہ ارشاد فرمایا کہ حاضر و ناظر سمجھ لیا جائے، اور ہر وقت اس کا تصور ہو جائے تو پھر جلوت و خلوت یکساں ہو جائے اور صورت و نفاق سے نجات مل جائے قرآن کریم میں مختلف مقام پر احسان کا تذکرہ کہیں تقویٰ کے ساتھ تو کہیں عمل صالح کے ساتھ ہے۔

لِلَّذِينَ احْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِيَادَةٌ (۵) مسلم شریف میں زیادۃ کی تفسیر رویت باری سے کی گئی ہے، صفت احسان کے لئے یہ جزاء نہایت ہی موزوں ہے، جب احسان یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کی عبادت اس تصور سے کی جائے کہ گویا اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے تو آخرت میں مناسب یہی جزاء ہو سکتی ہے، کہ اس کو دیدار الہی سے ہیچ شرف کیا جائے۔

### مقام فنائیت مراد نہیں

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ احسان کی یہ دونوں حالتیں معرفت باری اور خوف الہی پیدا کرتی ہیں، اسی لئے عمارہ بن قحطاف کی روایت میں (۴) ان تخشى الله كأنك تراه، کا لفظ مذکور ہے،

بعض صوفی حضرات نے غمان نہ تنکن تراہ فانہ یراک، میں کان کو تادم مان کر یہ تاویل کر ڈالی ہے کہ اس حدیث میں مقام فنائیت کو بتایا گیا ہے، کہ اگر تم لم یکن ہو جاؤ، یعنی فنائیت کا وہ مقام حاصل ہو جائے کہ اپنے آپ کو معدوم سمجھ لو تو ایسی حالت میں اللہ کو دیکھ لو گے، یہ فنائیت کا وہ مقام ہے جہاں منصور حلاج نے ”انا الحق“ کا دعویٰ کیا تھا، حافظ نے اس توجہ کو نقل کر کے اعتراض کیا ہے کہ یہ قاعدہ فحوی کے خلاف ہے، کیونکہ ایسی صورت میں یراک جزاء ہونے کی وجہ سے اس کا الف محذوف ہونا چاہئے، حالانکہ کسی روایت میں الف کا حذف ثابت نہیں، بلکہ بعض روایت میں فانک ان لا تراہ میں ان رویت پر داخل ہے نہ کہ کون پر، اس سے بھی اس تاویل کی غلطی سمجھ میں آتی ہے۔ (۵)

### مقام احسان پر ابن رجب حنبلی کی تحقیق

حافظ ابن رجب کی یہ تعبیر، بہت صاف اور علو و صوفیہ دونوں کے ذوق کے قریب ہے، وہ فرماتے ہیں کہ شریعت کا

(۵) اس سلسلہ کی مزید چند آیات ملاحظہ ہوا (۱) مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَىٰ مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذَلِكَ وَلَا كَبْرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَمَا كَانُوا، (۲) نَحْنُ اقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرْدِ، (۳) يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ، (۴) فَتَحَ الْبَارِیْ ص ۱۲۰/۱، (۵) ایضاً۔

اصل مقصد توحید و رسالت کا صرف علم حاصل کرنا نہیں، بلکہ ان علوم کو حالات اور حالات کو مقامات کی حد تک پہنچانا ہے، غلام جب تک حالات کی شکل اختیار نہیں کرتا، اس وقت تک طبیعت میں نہ تو جذبہ عمل پیدا ہو سکتا ہے اور نہ عمل میں ذوق نصیب ہو سکتا ہے، انسانی دماغ ان کو صرف علمی تحقیق کی نظر سے دیکھا کرتا ہے، اور یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ تمام علوم درحقیقت عالم غائبات کے دو عظیم الشان حقائق ہیں، جو خارج میں عالم مشاہدہ سے زیادہ مستحکم طور پر موجود ہیں ایسے حق تعالیٰ کے ذات و صفات کے مسائل، تقدیر، برزخ، جنت اور دوزخ کے تمام غیبی حقائق صرف خیالی نظر آتے ہیں، لیکن منازل یقین طے کرتے کرتے جب وہ منزلی احسان تک پہنچ جاتا ہے تو پھر جن کو وہ اوہام و خیالات سمجھا کرتا تھا اب وہی ثابت شدہ حقائق نظر آنے لگتے ہیں، اور جن کو حقائق سمجھا کرتا تھا وہ اوہام سے زیادہ پائیدار اور بے حقیقت ہوتے چلے جاتے ہیں، انسان کے باطن میں جب یہ انقلاب رونما ہو جاتا ہے، تو شریعت اس کو احسان سے تعبیر کرتی ہے، اس کی مثال یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک سائنس کا ماہر مسلسل تجربات کرتے کرتے جب کسی ایک نقطہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کو اپنی تحقیق پر وہ یقین میسر آ جاتا ہے جو اپنی آنکھوں کے مشاہدات سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتا ہے، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر صفت احسان کی طرف اشارہ کیا ہے، وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ

### احسان کو اسلام سے مؤخر کیوں کیا؟

”آخر میں ایک بات رہ جاتی ہے کہ اس کو اسلام سے مؤخر کیوں کیا؟ تو اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں،

- (۱) مومن کیلئے سب سے ابتدائی درجہ جس پر نجات کا دار و مدار ہے اور جو خلود فی النار سے بچاتا ہے، وہ ہے ایمان، اور جس سے کامل نجات اور دخولِ نار سے حفاظت ہوتی ہے، وہ ہے اسلام، اور جس شئی سے مومن کو رفیع درجات کا آخری درجہ حاصل ہوتا ہے وہ ہے احسان اس لحاظ سے اخیر میں ذکر کرنا مناسب ہوا،
- (۲) اگر ایمان میں اخلاص نہ ہو تو وہ نفاق ہے، اور اسلام یعنی اعمال ظاہری میں اگر اخلاص نہ ہو تو وہ ریا اور نام و نمود ہے جو شرکِ خفی ہے، اس لئے ریا اور نفاق سے بچانے کے لئے احسان بطور تدبیر و تقویم مؤخر ذکر کیا گیا،
- (۳) یا اس وجہ سے کہ احسان کے ذریعہ ایمان و اسلام میں کمال پیدا ہوتا ہے، اس لئے اخیر میں ذکر کیا،
- (۴) بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ احسان، ایمان و اسلام کے لئے صفت کے درجہ میں ہے اور ظاہر ہے کہ صفت موصوف کے بعد آیا کرتی ہے۔“

قوله فاخبرني عن الساعة: "الساعة" كالف لام عهدي ہے، مراد قیامت کا دن ہے، لفظ ساعت لغت میں وقت غیر معین کو کہتے ہیں لیکن عام طور پر عرف میں مختصر وقت کے لئے مستعمل ہے، پھر قیامت کا دن جو ایک ہزار سال یا پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، جیسا کہ قرآن میں ہے إِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مَّا تَعْدُونَ، اسی طرح فی يومِ كان مقداره خمسين ألف سنة، تو پھر اتنے طویل دن کو ساعت سے تعبیر کرنا کیوں کر صحیح ہوگا؟

اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں،

- (۱) چونکہ حساب و کتاب بہت جلد ہو جائے گا اس لئے سرِ غیب حساب کے لحاظ سے ساعت سے، تعبیر کیا گیا،

(۲) قیامت کا دن اگرچہ بہت طویل ہو گا مگر مخصوص بندگانِ خدا کیلئے ایک ساعت ہی ہو گا، چنانچہ حدیث نبوی میں ہے کہ خدا کی قسم ایماندار آدمی کو قیامت کا دن ایسا چھوٹا معلوم ہو گا کہ جتنی دیر میں فرض نماز ادا کی جاتی ہے، (۱)۔

(۳) قیامت کا دن گو کہ طویل ہو گا مگر اس کی آمد چونکہ اچانک ہو گی اور ایک لمحہ میں ہو گی، اس لئے اس کے ابتدائی وقت کے لحاظ سے ساعت کہا گیا،

(۴) یا نیک فال کے طور پر اسے طویل دن کو ساعت سے تعبیر کیا گیا یعنی جس طرح چمیل میدان کو عربی میں مفادہ کہا جاتا ہے، جسکے معنی کامیابی کی جگہ کے ہیں، حالانکہ چمیل میدان میں کامیابی کہاں؟ وہ تو ہلاکت اور پریشانی کی جگہ ہو کر تی ہے تو نیک فال کے طور پر مفادہ کہا کہ خدا کرے کہ یہ چمیل میدان جو مقام ہلاکت ہے ہمارے لئے باعثِ راحت ہو، اسی طرح نیک فالی کے طور پر ساعت کہا گیا کہ اگرچہ طویل دن ہے مگر خدا کرے کہ میرے حق میں ایک ساعت کی طرح گزر جائے۔ "م" (۵)۔

قوله ما المسئول عنها باعلم من السائل: اس میں مضاف ہے، ابو فروہ کی روایت (۴) میں ہے کہ اس سوال پر آپ تھوڑی دیر سر جھکائے رہے، جب کوئی جواب نہیں ملا تو پھر سوال دہرایا، جب کوئی جواب نہیں ملا، تو پھر تیسری بار سوال کیا، اس پر آپ نے سر اٹھایا اور یہ جواب ارشاد فرمایا "با علم" میں باز ائمہ نے نفی کی تاکید کے لئے ہے، اس سے بظاہر علم کے مساوات کو بتانا چاہتے ہیں یعنی اس مسئلہ میں ہم دونوں کا علم برابر ہے مقصد یہ ہے کہ ہم دونوں اس بات کو جانتے ہیں! قیامت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خاص کر لیا ہے، کیونکہ دلیل میں إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ الْآيَةِ کی تلاوت کا مقصد یہی ہے، بعض روایت میں تو اس کی تصریح ہے کہ میں تم سے اس مسئلہ میں زیادہ علم نہیں رکھتا، معلوم ہوا کہ عدم علم کے مساوات کو بتانا مقصود ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ اس روایت کو سنتے ہی فرمایا سبحان اللہ خمس فی الغیب لا یعلمہن إلا اللہ۔

### لَا أَعْلَمُ کے بجائے طویل جواب کی وجہ

چونکہ قیامت کا سوال کثرت سے ہوا کرتا تھا، اس سوال جواب سے حاضرین کو معلوم ہو گیا کہ اس کا جواب کوئی شخص دے ہی نہیں سکتا، لہذا اس کا سوال فضول ہے، آپ نے لا اعلم کے مختصر جواب میں "ما المسئول الخ" اتنے طویل جواب کو اختیار فرمایا، درحقیقت اس سے ایک قاعدہ کلیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس سوال کا جو بھی سائل ہو گا یا رسول ہو گا سب کا یہی حال ہو گا، یہی سوال و جواب حضرت عیسیٰؑ اور جبرئیلؑ کے مابین ہوا تھا، حضرت عیسیٰؑ سائل تھے اور حضرت جبرئیلؑ مسؤل۔ حمیدی نے نو لور میں اس کو اس طرح ذکر کیا ہے،

حدثنا سفيان حدثنا مالك بن مغول عن اسماعيل بن رجاء عن الشعبي قال سأل عيسى بن مريم جبرئيل عن الساعة، قال فانتفض باجنته وقال ما المسئول عنها باعلم من السائل، (۳)

**رضا خانی توجیہ** | ”بریلویوں کا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہیں، اور ”جميع ملکان وما یکون“ کا علم آپ کو عطا کیا گیا، لیکن ”ما المسؤول عنها باعلم من السائل“ سے ان کے عقیدہ پر ضرب لگتی ہے، اسلئے جمہور سے ہٹ کر انہوں نے دوسری توجیہ کی، مفتی احمد یار خاں صاحب لکھتے ہیں ”اس میں حضور علیہ السلام نے اپنے نہ جاننے کی نفی نہیں کی، بلکہ زیادتی علم کی نفی کی، ورنہ تو فرماتے لا اعلم، اتنی دراز عبارت کیوں ارشاد فرمائی؟ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اے جبرئیل! اس مسئلہ میں میرا اور تمہارا علم برابر ہے، کہ مجھ کو بھی خبر ہے اور تم کو بھی خبر ہے، اس مجمع میں پوچھ کر راز ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ (۱)“

ایک دوسرے عالم مولانا محمد عمر نے لکھا ہے کہ رسول سائل سے اعلم نہیں یعنی اے جبرئیل قیامت سے تو بھی بے خبر نہیں اور میں بھی بے خبر نہیں، تو بھی جانتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں۔ (۲)“

جواب :- لیکن غور کرنے سے اس کا بطلان ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آپ کو معلوم تھا تو پھر اس کے بعد آپ نے خمس لا یعلمون الا اللہ الخ کیوں ارشاد فرمایا، اور سورہ لقمان کی آخری آیت جس میں ان اللہ عنده علم الساعة مذکور ہے، آپ نے کیوں تلاوت فرمائی؟

نیز اس سے قبل نسائی شریف کی روایت گذر چکی ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں پہچان سکے، تو پھر آپ نے یہ کیسے فرمایا کہ تم لوہم دونوں قیامت کا علم رکھتے ہیں، یہ تو اس وقت کہنا صحیح ہو تا جب کہ آپ پہچان لیتے، اس سلسلہ میں علامہ جلال الدین سیوطی کا واقعہ ملا علی قاریؒ نے موضوعات کبیر (۳) میں نقل کیا ہے، جو قائل دیدہ ہے اور اس سے بریلویوں کے غلط عقیدہ کا پلندہ بھی منہدم ہو جاتا ہے۔ (۴)“

### قیامت کا ربط ما قبل سے

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ایمان، اسلام، احسان باہم تو مربوط ہیں، مگر قیامت کا سوال بظاہر غیر مربوط ہے؟ ایک جواب اس کا یہ ہے کہ مرتبہ احسان حاصل کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے ”ان تعبد اللہ کانک تراء“ فرمایا گیا تھا، کأن سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رویت حقیقی اس عالم میں نہیں ہو سکتی ہے لہذا سوال پیدا ہوا کہ حقیقی رویت کبھی ہو گی یا نہیں؟ اور اگر ہو گی تو کب ہو گی؟ اس لئے قیامت کا سوال قرین قیاس ہے، کیونکہ وہی وقت ہے حقیقی رویت کا۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث جبرئیل میں یوم آخر کا بھی تذکرہ ہے تو قدرتی طور پر ایمان و اسلام کے بعد سوال پیدا ہوا کہ وہ یوم آخر ہے کب؟ جس کے لئے یہ سارے اعمال کئے جا رہے ہیں اس مناسبت سے قیامت کا سوال کیا گیا۔

(۳) تیسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ تمام دنیا عبادت کے لئے ہے، اور اس کا آخری مرتبہ احسان ہے، اور حسن عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، تو دنیا کی تخلیق کی غرض پوری ہو گئی تو اب دنیا کے باقی رہنے کی کیا ضرورت؟ اس لئے حدیث میں کہا گیا ہے أنا والساعة کھاتین، میرا آنا گیا قیامت کا آنا ہے، اس میں بھی یہی اشارہ موجود ہے۔

(۱) جلد الحق ص ۱۰۷ (۲) مقیاس حقیقت ص ۴۲۹ (۳) موضوعات کبیر ص ۱۱۹ (۴) علم طب کے سلسلہ میں حقیقی تہذیبی کتاب لایہ طب من عقیدہ، علم الغیب معنی حضرت مولانا محمد فروزاں صاحب فرمایا

حضرت بانو توئی فرماتے ہیں کہ تکمیل عبادت کے دو مرتبے ہیں، ایک کیلئے دوسرا کہ کیا تو اس طرح حاصل ہو چکی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اس کی تکمیل ہو گئی، اور بعثت نبوی اسی تکمیل کے لئے تھی، اور کہا اس وقت حاصل ہو گی جب تمام دنیا میں اسلام پھیل جائے اور کوئی جگہ باقی نہ رہے اور یہ اب تک حاصل نہیں ہوئی، ایک حدیث میں ہے لا یبقی علی ظہر الارض بیت وبر ولا مدبر الا ادخلہ اللہ الاسلام بغز عزیز وذل ذلیل، اور یہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے زمانے میں ہو گا، اور اس کے آثار اب نظر آنے لگے ہیں، یہاں تک کہ طہ بھی اب پیشینگوئی کرنے لگے ہیں کہ آئندہ تمام دنیا کا مذہب اسلام ہو گا، غرض جب کیا اور کہا دونوں طرح تکمیل ہو جائے گی تو پھر دنیا ختم ہو جائے گی کیونکہ مقصود حاصل ہو جائے گا۔

قوله فاخبرنی عن اماراتہا: امارات فتح الہزمہ اور بدون الہام، یعنی لمارۃ، لمار دونوں طرح ہے، علامت و نشانی کے معنی میں ہے، بعض روایت میں اثر ط آیا ہے، جو شرط فتح الشیمن والربو کی جمع ہے، علامت، مقدمہ، چھوٹے امور کے معنی میں ہیں، اور یسکون الربو کی جمع شرط آئی ہے، بخاری شریف کتاب التفسیر میں ولكن ساحدك ہے، اور ابو فروہ کی روایت میں ولكن لها علامات تعرف بها، ہے اور کھمس کی روایت میں قال فاخبرنی عن اماراتہا کے الفاظ ہیں، اور بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علامات قیامت آپ نے خود ہی بیان فرمائے، اور بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پوچھنے پر ذکر فرمایا، بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، حافظ ابن حجر نے دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وسأخبرك فرمایا تو سائل نے کہا اخبرنی، اور اس کا پتہ سلیمان تھی کی روایت سے چلتا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ولكن ان شئت نبأتك عن اماراتها قال أجل۔ (۵)

### علامات قیامت کی قسم

علامات قیامت دو طرح کے ہیں (۱) ایک مختار، اور ایک غیر مختار۔ مختار کا مطلب یہ ہے کہ وہ علامت اچانک رونما نہیں ہو گی، بلکہ روزمرہ معمول کے مطابق رفتہ رفتہ واقع ہو گی، اس روایت میں علامت مختارہ کا ہی تذکرہ ہے، اور غیر مختارہ کا مطلب یہ ہے کہ اچانک رونما ہوں جیسے طلوع شمس من المغرب وغیرہ اسی کو دوسرے الفاظ میں علامت صغریٰ اور علامت کبریٰ کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۵)

ان تلد الامة ربتہا: بخاری شریف میں ربتہا کا لفظ ہے، عمارہ بن قنقاع کی روایت میں اذا رأیت المرأة تلد ربتہا کا لفظ ہے، اور عثمان بن غیاث کی روایت میں أمہ اربابہن جمع کے ساتھ ہے، یہاں الفاظ روایت میں جو اختلاف نظر آ رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمتقی بھی رائج تھی، اس لحاظ سے گویا ایک ہی ملبوم کی مختلف تعبیر ہے اس لئے ہر ایک کا ایک ہی محل ہو گا۔

لفظ رب اگر معروف باللام ہو تو یہ ذات باری کے لئے مخصوص ہوتا ہے، نیز لفظ رب غیر اللہ کے لئے بغیر اضافت استعمال کرنا درست نہیں، ہاں اضافت کے ساتھ درست ہے، جیسے رب الدار، رب المال۔ یہاں رب سے مراد مالک، یا سید

اور زوج کے معنی بھی ہو سکتے ہیں، اس کی تفسیر چار طرح کی گئی ہے :

(۱) مسلمانوں کا تسلط مشرکین کے شہروں پر ہو گا اور ان کی عورتوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گا، جو بچے باندیوں سے پیدا ہوں گے وہ باندیوں کے بمنزلہ رب کے ہو جائیں گے کیونکہ وہ بچے باندیوں کے آقا ہیں، یہ توجیہ علامہ خطابی نے کی ہے، امام نووی نے اس کو اکثر علماء کا قول کہا ہے، مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس پر کلام کیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ بلاد مشرق پر تسلط، باندیوں پر قبضہ، اور ام ولد بنانے کا رواج عہد رسالت میں ہی ہو چکا تھا، اور علامات قیامت کے سیاق سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایسی علامتیں آپ بیان فرما رہے ہیں جو عہد رسالت میں موجود نہیں تھیں، بلکہ وہ قرب قیامت میں پیش آنے والی ہیں، بعض لوگوں نے یہ توجیہ بھی کی ہے کہ باندیوں سے بادشاہ پیدا ہوں گے، اور باندیاں ان کی رعایا میں شامل ہوں گی، یہ توجیہ ابراہیم جوینی نے کی ہے، وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ شروع میں مسلمانوں کا طبعی میلان آزاد عورتوں کی طرف تھا باندیوں کی طرف بہت کم تھا، اس میں اشارہ ہے کہ بعد میں یہ رجحان بدل جائے گا اور باندیوں کی طرف میلان زیادہ ہونے لگے گا، چنانچہ خلفہ عباسیہ کا رجحان زیادہ تر باندیوں کی طرف تھا۔

(۲) قرب قیامت میں ام ولد کی بیچ کا رواج ہو جائے گا، اور ایک ہی ام ولد کی خرید و فروخت بار بار ہوگی، وہ مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوگی، اور نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ اس کا لڑکا لاطعی میں ماں کو خرید لے گا اور اس کے ساتھ وہی برہنہ کرے گا جو باندیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، ایسا اس لئے ہو گا کہ لوگوں میں جہالت عام ہو جائے گی،

(۳) باندی کا نکاح کسی آزاد سے ہو جائے یا آزاد نے زنا کیا یا کسی آزاد نے وطی بائشہ کی اور اس سے آزاد لڑکا پیدا ہو، پھر مولیٰ نے اس باندی کو بیچ دیا اور بار بار اس کی بیچ ہوئی رہی، یہاں تک کہ اس کے آزاد لڑکا یا لڑکی نے لاطعی میں خرید اور اپنی باندی بنالیا، گویا جہالت اور بے احتیاطی عام ہو جائے گی،

(۴) قیامت کے قریب والدین کی نافرمانی عام ہو جائے گی، اولاد والدین کے ساتھ وہی برہنہ کریں گے، جو آقا اپنی باندیوں کے ساتھ کرتا ہے یعنی ماتحت اور خادم بنالیں گے، سب دشتم کریں گے، یہ برہنہ جو تک سیدوں جیسا ہے اس لئے مجازاً رب کہا گیا ہے، یہ توجیہ سب سے عمدہ ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ قرب قیامت میں انقلاب آجائے گا حاکم، محکوم، محکوم حاکم، بن جائیں گے، آنے والا جملہ أن تصیر الحفلة العراة العالة ملوك الارض، اسی توجیہ کا مؤید ہے (۵) اگر رب سے بھل (شوہر) مراد لیا جائے جیسا کہ بعض روایت میں بھل کا لفظ آتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ قرب قیامت میں زنا عام ہو جائے گا، یہاں تک کہ بیٹا اپنی ماں سے بھی زنا کرے گا۔

قوله ان ترى الحفلة العراة العالة رعاء الشاء يتطاولون في البنيان الخ: حقا، حاتی کی جمع ہے نیچے پاؤں، عراة عاری کی جمع، بدن کا وہ حصہ جسکو چھپاتا تہذیب میں شمار کیا جاتا ہے اس کو کھلا رکھنا عاری کہا جاتا ہے، عالة: فقرہ عال (ض) بمعنی افتقر، رُعلہ بضم الراء اور بکسر الراء دونوں طرح ہے، راعی کی جمع بمعنی چرواہہ، تطاول: بلند عمارت بنانا، اس پر فخر کرنا، یعنی ضرورت مند اتنے مالدار ہو جائیں گے کہ محلات پر فخر کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ نااہل برسر اقتدار ہو جائیں گے ایک حدیث میں ہے إناؤسند الأمر إلى غير أهله فانظروا الساعة، (بخاری شریف) وجہ



اس کی یہ ہے کہ پست است، بد خلق، اور جہل لوگوں کے دلوں میں عہدہ وغیرہ سے محبت نال، مفاد پرستی ہوتی ہے، دین دنیا کے لئے خرچ نہیں کر سکتے، جس سے حقوق تلف ہوتے ہیں اور لوگوں کے قلوب میں نفرت و عدوت پیدا ہوتی ہے، نیز تعلیم دین کا نظام قائم نہ رہنے کی بنا پر جہالت روز بروز بڑھ کر خدائی معرفت کے لحاظ سے ایک عام تاریکی چھا جاتی ہے، اس طرح دین و دنیا کا نظام جاہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے جب اس طرح عالم کی دو اہم بنیادی بربادی سامنے آنے لگے تو یقین کرنا چاہئے کہ خود عالم کی بربادی جس کا دوسرا نام قیامت ہے بہت نزدیک آچکی ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ اس عالم اسباب میں خود قیامت کا وجود بھی سبب سے مربوط ہے کہ جب تک اسباب نہ ہوں گے قیامت نہ آئے گی۔

قوله ثم انطلق فلبحث ملياً ثم قال لي يا عمر الخ: ملياً: جھد ید پاؤ، طویل وقت کے معنی میں ہے، ابو ذر و نور ترمذی شریف (ص ۸۸/۹) کی روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت عمرؓ کو تین دن کے بعد بتایا، گویا یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے محارض ہے، کیونکہ ان میں تصریح ہے کہ حضرت جبرئیل کے جانے کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ جہاں کو وہاں بلاؤ جب صحابہ گئے تو ان کو نہ پاسکے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت حاضرین کو بتلایا کہ وہ جبرئیل تھے اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اسی وقت لوگوں کو بتلایا۔

دونوں میں تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ تلاش کرنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی تھے، جب وہ نہیں ملے تو حضرت عمرؓ اسی طرف سے اپنے مکان چلے گئے، اور باقی حضرات مجلس نبوی میں آگئے، جب آپ نے حضرت جبرئیل کے بارے میں صراحت کی اس وقت حضرت عمرؓ موجود نہ تھے، اس واقعہ کے تین یوم کے بعد حضرت عمرؓ حاضر خدمت ہوئے تو اس وقت آپ نے ان کو بھی بتلایا اس طرح دونوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

قوله يعلمكم دينكم: حقیقی معلم تو سرور کائنات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، چونکہ یہ علمی باتیں حضرت جبرئیل کے سوال پر کی گئیں، تو اس لحاظ سے وہ علم کا سبب بن گئے، یہ بھی کہہ سکتے ہیں سلیقہ کا سوال بھی علم ہی کہلاتا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے السؤال نصف العلم، غرض مجاز ان کی طرف معلم کی نسبت کی گئی ہے۔

### حدیث جبرئیل کے فوائد

لام نووی نے اس حدیث سے بہت سے قیمتی مسائل مستنبط کئے ہیں (۱) آداب مجلس میں سے یہ ہے کہ اگر اہل مجلس کو کوئی مسئلہ جاننے کی ضرورت ہو اور کسی بنا پر وہ لوگ سوال نہ کر پاتے ہوں تو آنے والا مہذب انداز میں سوال کر دے، تاکہ سب کو معلوم ہو جائے (۲) مسائل کو چاہئے کہ اچھے انداز میں سوال کرے تاکہ عجیب پورے انشراح کے ساتھ جواب دے سکے، (۳) اور عالم کو یہ چاہئے کہ مسائل کے ساتھ نرمی کا برتو کرے، اور اس کو قریب بٹھائے (۴) جس کا جواب معلوم نہ ہو وہاں صفائی سے لا علمی ظاہر کر دے، اور یہ کمال احتیاط کی دلیل ہوگی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلم الناس ہونے کے باوجود لا علمی ظاہر فرمائی۔ مزید علمی نکات کیلئے ملاحظہ ہو عمدہ اقتادی ص ۲۹۰/۱۔

❦ حدیث ❦ حدثنا ابو بكر بن ابي شيبة و زهير بن حرب ..... عن ابي هريرة قال: كان رسول الله ﷺ يوماً بارذاً للناس فأتاه رجل فقال: يا رسول الله ما الإيمان؟ قال: أن تؤمن بالله وملكه وكتابه ولقائه ورسله وتؤمن بالبعث الآخر، قال يا رسول الله ما الإسلام؟ قال: الإسلام أن تعبد الله ولا تشرك به شيئاً وتقيم الصلوة المكتوبة وتؤتي الزكاة المفروضة وتصوم رمضان قال: يا رسول الله ما الأحسان؟ قال: أن تعبد الله كأنك تراه فإنك أن لا تراه فإنه يراك، قال: يا رسول الله متى الساعة؟ قال: ما المسؤول عنها بأعلم من السائل، ولكن سأحدثك عن أشراطها: إذا ولدت الأمة زبها فذاك من أشراطها، وإذا كانت الغداة الخفاة رؤس الناس فذاك من أشراطها، وإذا تطاول رعدة اليهم في الغنيان فذاك من أشراطها في خمس لا يعلمهن إلا الله ثم تلا ﷻ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ثُمَّ أَدْبَرَ الرَّجُلُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ زِلُوا عَلَيَّ فَآخِذُوا بِمِزْزُوهُ فَلَمْ يَزُوا شَيْئاً فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَذَا جَبْرَيْئَلُ جَلَّ لِیَعْلَمَ النَّاسُ دِينَهُمْ. (۱)

”مسلم شریف کی پہلی روایت سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھے کی کیفیت کیا تھی، جس وقت حضرت جبرئیل کی تشریف آوری ہوئی اس حدیث کے اس جملہ ”بارذاً للناس“ نے وضاحت کر دی، اسی ظاہراً لہم غیر محتجب عنہم ولا ملتبس بغيره (فتح الباری ص ۱۱۶/۱) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ممتاز جگہ نمایاں ہو کر بیٹھے ہوئے تھے، اس کی تفصیل حضرت ابو فردہ کی روایت میں اس طرح مذکور ہے کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم غایت تواضع اور خلق عظیم کی بنا پر صحابہ کرام کے ساتھ گھل مل کر بیٹھے تھے، حتیٰ کہ آنے والے نووارد کو یہ پوچھنا پڑتا ایک محقق؟ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ ہم نے آپ سے اجازت چاہی کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے لئے ایک چوڑا بنادیں، اور آپ اس پر تشریف رکھیں تاکہ کسی بھی نووارد کو پوچھنے کی نوبت نہ آئے دربار رسالت سے جب اجازت مل گئی تو ہم نے مٹی کا ایک چوڑا بنادیا، حضور اکرم ﷺ اسی پر جلوہ گر تھے اور صحابہ کرام پر رونہ وارادہ کر دیا حاضر تھے کہ حضرت جبرئیل کی تشریف آوری ہوئی۔ (بخاری ص ۱۱۶/۱)

کیا اس وقت مجلس خاموش تھی یا سلسلہ کلام جاری تھا؟ اس سلسلہ میں ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم محو گفتگو تھے کہ حضرت جبرئیل قدم رنجد ہوئے، اسی یفظ ان جلدہ رجل۔ تم (۲)

قوله ولقائه: لقائه سے مراد بحث کے بعد والے حالات ہیں اور بعض کی رائے یہ ہے کہ قلم سے مراد اللہ کی رویت ہے، علامہ خطابی کا قول یہی ہے لام نووی کو اس پر اعتراض ہے کہ رویت باری کے لئے شرط ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو اور قطعی طور پر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا خاتمہ کس حال پر ہوگا، لہذا رویت باری شرط ایمان میں کیسے ہوگا؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے

کہ اس بات کا یقین ہو کہ رویت باری حق ہے، اب یہ کسکو حاصل ہوگی اور کس کو نہیں اس کا علم اللہ کو ہے۔

رویت باری کے سلسلہ میں امت میں اختلاف ہے اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں رویت باری ممکن تو ہے لیکن واقع نہیں ہوگی، اور آخرت میں ممکن الوقوع ہے، اور مخصوص بندگان خدا (جنتی) کو حاصل ہوگی، جبکہ فرقہ مستتر نے کا خیال ہے کہ نہ تو یہاں اور نہ آخرت میں رویت ممکن ہے، اس فرقہ کی تردید کے لئے امام مسلم نے ص ۹۹ پر باب قائم کیا ہے، تاہم حدیث مذکورہ کا یہ جملہ رویت باری کے ثبوت کے لئے مضبوط دلیل ہے۔

قوله وتومن بالبعث الآخر: آخر کی قید یا تو تاکید کے لئے ہے جیسے امس الذاہب، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو بعث کی طرف اشارہ ہو، پہلا بعث عدم سے وجود میں لانا، یا بطین ماورے دنیا میں لانا، اور دوسرا قبر سے میدان حشر میں جانا۔ بعث آخر پر ایمان لانے سے مراد حساب، میزان، جنت، جہنم پر ایمان لانا ہے، بعض روایت میں بعث کے بعد چاروں چیزوں کی صراحت مذکور ہے۔

قوله الاسلام أن تعبد الله ولا تشرك به شيئاً وتقيم الصلوة: جواب میں اسلام کا اعادہ اسلام کی عظمت و بزرگی ظاہر کرنے کی غرض سے ہے، جیسے قرآن میں من یحیی العظام کے جواب میں "قل یحییہا الذی" کے اعادہ کی یہی وجہ بتائی جاتی ہے، اسلام کی حقیقت أن تعبد الله، سے بیان فرمائی حضرت امام نووی کا خیال ہے کہ عبادت سے خدا کی معرفت بھی مراد لے سکتے ہیں، تو اس صورت میں صلوٰۃ وغیرہ کا عطف أن تعبد الله، پر ان امور کو اسلام میں داخل کرنے کی غرض سے ہوگا، اور عبادت سے طاعت بھی مراد لے سکتے ہیں، تو اس صورت میں تمام وظائف داخل ہو جاتے ہیں لہذا صلوٰۃ، کا عطف عطف خاص علی العام کے قبیل سے ہوگا۔

حافظ ابن حجر کا خیال ہے کہ عبادت سے خدا کی معرفت مراد لینا مناسب نہیں، کیونکہ معرفت تو متعلقات ایمان سے ہے اور تفسیر اسلام کی ہے جو قولی اور بدنی عمل سے متعلق ہے لہذا یہاں نطق بشہادتین مراد ہے، جسکی تائید حضرت عمر کی حدیث أن تشهد ان لا اله الا الله، کے الفاظ سے ہوتی ہے، کیونکہ یہ "ما الاسلام" کا جواب ہے، اس لئے شہادتین کا ہونا ضروری ہے، دونوں کا حاصل یہی ہے کہ شہادتین کا اقرار کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو کسی کو شریک نہ ٹھہرو۔

### شرک کا مفہوم اور اس کی قسمیں

"اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں جو عقائد ہیں اس طرح کا کوئی عقیدہ کسی مخلوق کے بارے میں رکھنا شرک کہلاتا ہے۔ اقسام: - شرک فی العلم: یعنی کسی بزرگ یا پیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اس کو خبر ہے، نجومی، ہندت سے غیب کی خبریں دریافت کرنا۔ شرک فی التصرف: یعنی کسی کو نفع و نقصان کا مختار سمجھنا، کسی سے مراد اس مانگنا، روزی و اولاد مانگنا۔ شرک فی العبادة: کسی کو سجدہ کرنا، کسی کے نام کا جانور چھوڑنا، چڑھانا، کسی کے نام کی منت ماننا، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا۔"م

قوله البہم: اس کا معنی کالا، اہل عرب کے نزدیک رنگوں میں سرخ رنگ عمدہ سمجھا جاتا تھا، اور سیاہ بدترین، چرواہے کی صفت میں بہم کا ذکر کرنا مجہول منسوب ہونے کی بنا پر ہے کیونکہ "ابہم الامر" غیر معروف کو کہتے ہیں، علامہ قرطبی کا خیال

ہے کہ چرواہوں کے کالے ہونے کی بنا پر انہیں کہا گیا کہ کیونکہ عرب عموماً گندم گوں ہوتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ رُعلہ البہم کے معنی نادار، مفلس کے ہیں، مگر یہ معنی صحیح نہیں کیونکہ ان کی طرف لونٹ کی نسبت کی گئی ہے، لیکن اس کا بھی جواب ہے کہ یہاں اس کی طرف اضافت ملکیت کے طور پر نہ ہو بلکہ دوسروں کے لونٹ چراتے ہوں ان کا اپنا نہ ہو، اور دستور بھی ایسا ہی ہے کہ جانوروں کے مالک خود نہیں چراتے، غرض نادار، اور مفلس کے معنی میں بھی لیا جاسکتا ہے اور انہیں اہل کی بھی صفت ہو سکتی ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کالے لونٹ جو عرب کے نزدیک معمولی سمجھے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ اس کے چرواہے بھی معمولی ہوں گے قرب قیامت میں برسرِ اقتدار ہوں گے۔

قوله خمس: عامل محذوف ہے تقدیر عبارت علم وقت الساعة داخل فی جملة خمس، جیسا کہ قرآن میں ہے فی تسع آیات۔ بعض آیات میں مغلغ الغیب کی تفسیر میں انہیں پانچ کو ذکر کیا گیا ہے۔

### کہانت اور غیب دانی

دنیا جس کو غیب دانی سے موسوم کرتی ہے عرب میں پہلے یہ مستقل ایک فن تھا جس کو کہانت کہا جاتا تھا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کے محاورہ میں علم وہ ہے جو واقعہ سے مستفاد ہو، اور معلومات اپنی جانب سے تیار کیا جائے اس کو ظن کہا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اجراع ظن کی جاہلانہ مت کی گئی ہے، ماہم من علم الا اتباع الظن، یعنی حضرت عیسیٰ کے قتل و سولی میں اختلاف کرنے والوں کو واقعہ کا کچھ علم نہیں صرف اپنی جانب سے انکل لگاتے ہیں، ان یقتبعون الا الظن الخ یعنی یہ لوگ صرف ظن اور انکل پر چلتے ہیں، لیکن مدعیین غیب کو واقعہ کا علم نہیں ہوتا، جیسے کہ دھواں اٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ لگی ہے، ہوا چلتی ہے تو مٹی کی بو سے پتہ چلتا ہے کہ بارش ہوئی ہے، مانسون اٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ برسات قریب ہے، یہ سب استدلال ہیں جن سے درجہ بدرجہ گویقین حاصل ہو جاتا ہے مگر واقعہ کا علم کسی کو نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کو بلا واسطہ واقعہ کا علم ہے، اور اتنا قطعی ہے کہ اس کا تحلف محال ہے یہاں تک کہ اشیاء عالم اپنے وجود میں اس کے تابع ہیں، وہ اشیاء کے تابع نہیں ہاں عزتہ غیب سے خواص کو کوئی حصہ عطا کر دیا جاتا ہے، تو وہ اس کے تعلق و خصوصیت کی برہان بن جاتا ہے، مگر یہ علم بھی اتنا ہی ملتا ہے جتنا مناسب حال ہوتا ہے۔

### علم غیب کی وضاحت علامہ کشمیری کے الفاظ میں

حضرت انور شاہ کشمیریؒ نے علم غیب کو اس انداز میں سمجھایا ہے کہ ایک چیز کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور کچھ فروغ، تو اصلی علم اس وقت کہیں گے جب اس کے اصول کا علم ہو جائے، فرض کرو ایک شخص سودو سود مرض کے نسخے یاد کر لے تو کیا وہ اس سے طبیب ہو جائے گا؟ نہیں، بلکہ طبیب وہ ہوگا جو اصول طب اور اس کے فن سے واقف ہو چاہے امراض و نسخے یاد نہ کئے ہوں، اسی طرح عالم دی ہوگا جو اصول علم سے واقف ہو، فقیہ وہ نہیں ہے جسے جزئیات فقہی یاد ہوں فقیہ وہ کہلائے گا جو اصول اور مآخذ پر مطلع ہو، خولہ جزئیات کم یاد ہوں، امام اعظمؒ کے زمانے میں اتنی جزئیات بھی نہ رہی ہوں گی جس قدر آج کل ہیں، اسی پر شاعر وغیرہ کو قیاس کر لو، غرض حقیقی علم وہ ہے کہ اس کے اصول سے آگاہی ہو، لہذا کسی چیز کا عالم اسی وقت کہلائے گا جب اس کے اصول سے واقف ہو اس وضاحت کے بعد علم غیب پر، غور کریں کہ بالکل اسی طرح علم غیب کے بھی

جزئیات ہیں اور کلیات ہیں، تو جس طرح جزئیات طب کے جاننے والے کو طبیب نہیں کہتے، اسی طرح جزئیات غیبیہ پر مطلع کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے۔ کلیات کے علم کا مطلب یہ ہے کہ ضابطہ بتلادیا جائے، کہ مثلاً فلاں ضابطہ سے پہچان لیں کہ فلاں جگہ، فلاں وقت، اتنے اونچے بارش ہوگی، پھر اتنی ہی بارش اسی وقت میں ہو بھی جائے اس میں تھکف نہ ہو بس جو اس ضابطہ کا علم رکھتا ہے اُسے عالم الغیب کہا جائے گا ورنہ نہیں، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی عالم الغیب نہیں خدا کے سوا، کیونکہ کسی کو بھی کلیات محمودیہ کا علم نہیں ہو سکتا صرف ایک ہی ذات ہے، اور وہ اللہ کی ہے جس کو تنکوینیات کا علم محیط حاصل ہے، ہاں بعض امور کا انکشاف ہو جاتا ہے، مگر اُسے علم نہیں کہتے، کسی طرح ہمیں معلوم بھی ہو جائے کہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے لیکن کوئی پوچھ لے کہ لڑکا کیوں ہے؟ تو یقیناً اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہو گا۔

البتہ تشریح سے ہم کلیات سے جواب دے سکتے ہیں تو ضوابط اور اصول غیب کا علم کسی نبی، ولی کو نہیں ہو سکتا یہ علم اللہ کی قدرت کے ساتھ خاص ہے، ایک کلیہ کا اگر علم ہو تو وہ مطلق بنتا ہے بہت سی جزئیات کے علم کا، قرآن میں ہے وعندہ مفاتیح الغیب لایعلمہا الا هو، ہاں تشریعات کے باب میں کلیات کا علم غیب انبیاء علیہم السلام کو ہے، کیونکہ اگر یہ علم الہیہ نہ دیا جائے تو ان کے کام میں فرق آجائے۔

خلاصہ یہ کہ حوادث دہر پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا، اور جزئیات کے عالم کو عالم نہیں کہتے ..... اہل حقائق نے لکھا ہے کہ کرسی مظہر ہے علم کا، جس طرح عرش مظہر ہے رحمت کا، یہ تو علم غیب کا مسئلہ ہے، رہا کسی علم کا کسی پر منکشف ہو جانا، تو یہ دوسری بات ہے، اور یہ انبیاء کرام اور اولیاء دونوں کو ہوتا ہے، البتہ دونوں کے کشف میں فرق ہوتا ہے اس فرق کو سورہ جن میں بیان فرمایا گیا ہے عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احد الا من ارتضیٰ من رسول، یعنی وہ عالم الغیب ہے اور غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، ہاں انبیاء، رسول کو باب تشریعات اور تنکوینیات میں سے جتنا چاہے مطلع کر دیتا ہے، معلوم ہوا کہ ایسا غیب جس میں نفس، شیطان اور کسی قسم کے شک و شبہ کو دخل نہ ہو صرف انبیاء کرام کے لئے خاص ہے فانہ یسلک من بین یدیه ومن خلفہ رصداً، اس لئے کہ اس کے آگے اور پیچھے پہرہ دار ہوتے ہیں، معلوم ہوا کہ نبی کو جو کشف ہوتا ہے یا وحی آتی ہے اس کیلئے پہرہ دار ہوتے ہیں، اس لئے اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا، ہاں کشف ولی میں احتمال غلطی کا ہوتا ہے، اور شبہ کی بھی گنجائش ہوتی ہے، نبی کا علم قطعی، ولی کا ظنی، وہاں خدا کی طرف سے ذمہ داری ہے، اور یہاں نہیں، اس کے باوجود یہ سب جزئیات غیب ہیں کلیات کا علم صرف اللہ کو ہے، انہیں کو مفاتیح الغیب کہا گیا ہے، رہا اہل نجوم کو جو علم ہوتا ہے وہ حاصلی علم ہے اس کو دوسرے لوگ بھی حاصل کر سکتے ہیں، اور اس میں غلطی کا ہمیشہ احتمال رہتا ہے، حساب صحیح ہوا، تو نتیجہ صحیح نکل آیا، حساب غلط ہو گیا تو نتیجہ غلط نکل آیا، کتنی پیشین گوئیاں غلط ہوتی ہیں، مگر حضرات انبیاء کرام کے یہاں غلطی کا احتمال نہیں۔

## باب بیان الصلوات التي هي اركان الاسلام

ان نمازوں کا بیان جو اسلام کا ایک رکن ہے

حدثنا قتيبة بن سعيد بن جميل بن طريف بن عبد الله الثقفي ..... سَمِعَ مَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ  
اللَّهِ يَقُولُ جَلَسَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرُ الرَّأْسِ تَسْمَعُ دَوْبِيَّ صَوْتِهِ وَلَا تَنْفَقُهُ  
مَا يَقُولُ، حَتَّى دَنَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيْكَ غَيْرُهُنَّ قَالَ لَا، إِلَّا أَنْ  
تَطْلُوعَ، وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكَاةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيْكَ غَيْرُهَا قَالَ لَا، إِلَّا أَنْ  
تَطْلُوعَ، قَالُوا فَادَّبَرُوا الرَّجُلَ وَهُوَ يَقُولُ وَاللَّهِ لَا أَرِيدُ عَلَى هَذَا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ (تم الحديث) (۱)

ترجمہ | طلحہ بن عبید اللہ کہتے ہیں کہ نجد والوں میں سے ایک شخص سرور کو نہیں جانتے تھے کہ اس کی خدمت میں آیا اس کے سر کے بال کھرے ہوئے تھے، اس کے بھناٹ کی آواز ہمیں سنائی دے رہی تھی، جبکہ اس کی بات ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے، اسی حالت میں حضور کے قریب پہنچ گیا، جب معلوم ہوا کہ اسلام کے بارے میں کچھ معلوم کر رہا ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دن میں پانچ نمازیں پڑھنی ہیں، اس نے کہا میں اس کے علاوہ تو اور کوئی نماز مجھ پر نہیں؟ فرمایا نہیں، مگر یہ کہ تم نفل پڑھو، (تو اور بات ہے) پھر آپ نے فرمایا اور رمضان کا روزہ رکھنا، اس نے کہا اور تو کوئی روزہ مجھ پر نہیں؟ فرمایا نہیں، مگر یہ کہ تم نفل روزہ رکھ لو، ابو طلحہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زکوٰۃ کو بیان کیا اس نے کہا میں اور تو کوئی مجھ پر فرض نہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، ہاں نفل صدقہ دو (تو اور بات ہے) راوی کا بیان ہے کہ وہ شخص بیٹھ پھیر کر یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم میں نہ اس سے بڑھوں گا نہ گھٹوں گا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر یہ سچا ہے تو اپنی مراد کو پہنچ گیا۔

مقصد باب | حدیث جبرئیل میں پہلا سوال اسلام کے بارے میں تھا جس کا تعلق ظاہر عمل سے ہے اور انہی ظاہری اعمال کا نام شریعت ہے، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں شہادتین کے بعد نماز کو پہلے ذکر فرمایا جس سے دیگر اعمال میں نماز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس لئے امام مسلم نے حدیث جبرئیل کے بعد نماز کا باب ذکر فرمایا۔ اس توجیہ سے اس باب کا حدیث جبرئیل سے ربط بھی سمجھ میں آ گیا۔

قولہ جاء رجل: ”رجل کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ کون بزرگ ہیں، ابن بطال، قاضی عیاض وغیرہ کہتے ہیں کہ رجل مجہول سے مراد ضمام بن ثعلبہ ہیں، جو بنی سعد بن بکر کے فرستادہ تھے، اس نام کی تعین کے سلسلہ میں ان حضرات کا استدلال اس سے ہے کہ امام مسلم کا یہ دستور ہے کہ اگر کسی حدیث کے اندر ابہام ہو تو بعد والی حدیث کے ذریعہ تفسیر کرتے ہیں، چنانچہ حسب دستور امام مسلم نے رجل مجہول کی روایت کے بعد ہی ضمام بن ثعلبہ کی روایت ذکر فرمائی ہے، نیز دونوں

روایت میں اُن کے بدوی ہونے کا تذکرہ ہے، اور دونوں کے اخیر میں لا ازید ولا نقص، کا قرینہ بتاتا ہے کہ دونوں سے ایک ہی شخص مراد ہے، مزید براں بخاری شریف (ص ۱/۱۵) میں حضرت انسؓ کی روایت میں تصریح ہے وَاَنَا ضَمَامُ بْنُ ثَعْلَبَةَ، اور اس باب کا مضمون بھی ملتا جلتا ہے، اس بنا پر ان حضرات نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ر جل مجہول سے مراد ضمام بن ثعلبہ ہی ہیں اور دونوں واقعہ ایک ہی ہے۔

لیکن علامہ قرطبیؒ کا خیال ہے کہ دونوں روایت کا سیاق مختلف ہے، دونوں کے سوالات الگ ہیں بشارت میں بھی فرق ہے، کہیں بشارت مطلق اور کبھی غیر مطلق، پھر دونوں کو ایک ماننا تکلف ہے، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ مؤرخین میں ابن اسحاق، ابن سعد، علامہ ابن عبد البر نے ضمام بن ثعلبہ کا صرف وہی واقعہ نقل کیا ہے جو حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے، دوسرا کوئی واقعہ ان کے نام کے ساتھ نہیں ملتا، اس سے بھی محسوس ہوتا ہے کہ واقعہ ایک نہیں بلکہ دو ہے، الغرض علامہ قرطبیؒ، حافظ ابن حجرؒ، علامہ عینیؒ اور حضرت انور شاہ کشمیریؒ کے رجحان کے مطابق ر جل سے مراد ضمام بن ثعلبہ نہیں ہاں یہ الگ بات ہے کہ لب ولہجہ اور بعض سوالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ "م (د)

من اهل نجد: بلند اور اونچی جگہ کو نجد کہا جاتا ہے، تہامہ کا وہ حصہ جو بلندی پر ہے اور اس کا سلسلہ عراق تک پھیلا ہوا ہے، اسی کو نجد کہا جاتا ہے۔

ناثر الرأس: نثار کو ر جل کی صفت بنا کر مرفوع اور حال بنا کر منصوب دونوں پڑھ سکتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ بال وغیرہ میں گنگھانہ کرنے کی بنا پر بکھرے ہوئے تھے، یہ بعد مسافرت کی جانب اشارہ ہے نیز یہ کہ سفر سے آنے کے بعد زیادہ وقت نہیں گزرا ہے، ر اُس سے مراد سر کے بال ہیں کہ اس کا شعر پر اطلاق مبالغہ کے طور پر ہے، یا اس لئے کہ بال سر سے ہی اگتے ہیں اسی لئے حال پر عمل کا اطلاق کیا گیا ہے۔

قوله يسمع: مضارع مجہول کیساتھ اور نسمع متکلم مضارع بھی پڑھا گیا ہے، اسی طرح یفقه کو دونوں طرح پڑھا گیا ہے ذوی: دال مفتوح، ولو مکسور اور یاء مشدّد قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ بخاری شریف میں دال مضموم کی روایت بھی ثابت ہے، لیکن انہوں نے دال مفتوح کو ترجیح دی ہے، قاضی عیاض کہتے ہیں کہ "ذوی" ایسی بلند اور مکرر آواز کو کہتے ہیں، جو سمجھ میں نہ آ سکے، شہد کی مکھی کی جھنڈا ہٹ کو بھی "ذوی" کہا جاتا ہے لیکن جب انسان کی طرف اسکی نسبت ہو تو اس کے معنی گنگناہٹ کے آتے ہیں۔

ایک اشکال:۔ "یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس طرح گنگناہٹ کے ساتھ آنا، بظاہر ادب و تہذیب کے خلاف معلوم ہوتا ہے، پھر انہوں نے یہ انداز کیوں کر اختیار کیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ بدوی تھے اور بدوی عموماً تہذیب و تمدن سے واقف نہیں ہوتے اور نہ ہی اسکے مکلف ہوتے ہیں، لیکن یہ جواب مناسب نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے ترجمان اور نمائندہ بن کر آئے تھے جبکہ عرب میں بھی ہوشمند انسان کو سفیر بنا کر بھیجا جاتا تھا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تہذیب و تمدن سے آراستہ رہے ہوں گے، اس لئے وہ جواب بہتر معلوم ہوتا ہے جسے حضرت شیخؒ نے نقل

فرمایا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی شان یہ تھی کہ قدرتی طور پر لوگوں پر رعب تھا جب کوئی نووارد آتا تو ہیبت زدہ ہو جاتا، جب یہ اپنی قوم کے نمائندے بن کر آئے تو ان کو ایک طرف رعب کا احساس اور دوسری طرف اپنی ذمہ داری کا خیال، اسلئے دور سے ہی الفاظ ہر آنے لگے، تاکہ رعب نبوی کی بنا پر بات کرتے وقت کسی غلطی اور نسیان کا باعث نہ بن جائے۔ "م (۱)

قوله عن الاسلام: جواب کا انداز بتاتا ہے کہ حقیقت اسلام اور مابیت اسلام کے متعلق سوال نہیں تھا، بلکہ اسلامی اعمال اور فرائض اسلام کے متعلق سوال تھا یہی وجہ ہے کہ اس میں شہادت تین کا ذکر نہیں، اسکی تائید بخاری شریف کی ایک روایت جس میں سوال ان الفاظ میں مذکور ہے اخبرنی اذا فرض الله على من الصلوة، اسی طرح جو لائنہ مذکور ہے اخبرہ بشرائع الاسلام، (۲) سے بھی ظاہر ہے کہ حقیقت اسلام کا نہیں بلکہ شرائع اسلام کا سوال تھا، بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ ممکن ہے حقیقت اسلام ہی دریافت کیا ہو مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر حقیقت اسلام کا سوال ہو تا تو روایت میں شہادت تین کا ذکر ہونا چاہئے تھا حالانکہ وہ مذکور نہیں، مگر اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ چونکہ آپ کو معلوم تھا کہ مسائل کو شہادت تین کا علم ہے اس لئے اس کو ذکر نہیں فرمایا، پھر راوی نے بطور اختصار یا برائے شہرت اس کو حذف کر دیا، بہر حال یہاں دونوں احتمال ہے۔

اسی طرح اس میں حج کا ذکر نہیں یا تو اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا یا پھر اختصار ا حذف کر دیا گیا۔

### وجوب وتر کا مسئلہ

قوله خمس صلوات: اصل عبارت اقامة خمس صلوات ہے،

وتر کے وجوب اور عدم وجوب کے سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک وتر واجب نہیں، بلکہ سنت مؤکدہ ہے جبکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے ان حضرات کے پاس جہاں ترمذی (ص ۱۰۳)، ابو داؤد (ص ۲۰۰) کی روایت ہے وہیں اس حدیث کے لفظ خمس سے بھی عدم وجوب وتر پر استدلال کرتے ہیں، کہ لفظ خمس مخصوص عدد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جس میں کمی اور زیادتی کا احتمال نہیں، اس لئے اگر وتر کو بھی فرض کہا جائے تو فرائض کی تعداد چھ ہو جائے گی، جو خمس کے مدلول کے خلاف ہے، نیز اس کے بعد الا ان تطوع، تو اس بارے میں پختہ دلیل ہے۔

جواب:- اس کے جواب میں حضرت شیخ ذکر کیا فرماتے ہیں "والعجب من الذين استدلوا على خلاف الحنفية

برواية الخمس ونحوها، فان الحنفية لم يقولوا أنها سادس المكتوبات بل قالوا بالوجوب، (۳)

وجوب وتر کی جو روایات ہیں وہ مثبت ہیں، اور یہ روایت وتر کے سلسلے میں ساکت ہے، اور اصول حدیث کے مطابق مثبت روایت کو ہی ترجیح ہوتی ہے، نہ کہ ساکت کو، لہذا ہمارا استدلال مثبت روایات سے ہے جو وجہ ترجیح کے لئے کافی ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں لکھتے ہیں کہ جو روایات ابتدائہ اسلام میں ابتدائی تعلیم سے متعلق ہیں ان سے استدلال کرنا صحیح نہیں، اور اس قسم کی روایتوں کی وجہ سے بعد کی تمام روایات کو نظر انداز کر دینا صحیح نہیں، ورنہ توحج کی فرضیت کا بھی انکار کرنا پڑے گا کیونکہ اس میں حج کا ذکر نہیں۔ (۴)

الترامی جواب:- اگر الا ان تطوع، سے عدم وجوب وتر پر استدلال ہو سکتا ہے تو پھر زکوٰۃ کے علاوہ کو بھی تو - الا



ان تطوع کہا گیا ہے، لہذا صدقہ فطر کے وجوب یا (بقول امام بخاری) اس کے فرض ہونے پر بھی استدلال غلط ہوتا چاہئے، حالانکہ خود شوافع صدقہ فطر کو فرض واجب عملی کہتے ہیں، فسا هو جوابکم فی فرضیۃ صدقۃ الفطر فهو جوابنا فی وجوب الوتر،

مزید جوابات اور وجوب وتر کے دلائل کے لئے کتب حدیث و فقہ باب الوتر دیکھئے،

### حدیث سے مسئلہ نفل کا استنباط

نفل کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، کہ نفل شروع کر دینے کے بعد بھی نفل رہتا ہے، یا پھر وہ واجب ہو جاتا ہے احناف کے نزدیک واجب، اور اس کا اتمام بھی واجب ہو جاتا ہے، اگر کسی بنا پر قاسد کر لیا تو اس کی قضاء لازم ہوگی، جبکہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک نہ تو واجب ہو گا نہ ہی اتمام واجب ہو گا، ہاں پورا کرنا مستحب ہے، لیکن توڑنے پر قضا لازم نہیں، مالکیہ کا مسلک عام کتب فقہ میں احناف کے مطابق ہے، تاہم ان کی بعض کتابوں کے مطابق قضا اس وقت واجب ہوگی جبکہ بلا عذر توڑ دے۔ (۱)

فقہائے کرام اپنے اپنے مسلک کے ثبوت میں روایت باب کو بھی ذکر کرتے ہیں چنانچہ "إلا أن تطوع" کے استثناء کے متعلق احناف اور مالکیہ کہتے ہیں کہ استثناء متصل ہے اس لئے کہ جب نماز بیگناہ کے سوا وجوب و فرضیت کی نفی کی گئی اور پھر "إلا أن تطوع" سے فرضیت کا اثبات کیا گیا ہے تو چونکہ نفی کے بعد استثناء اثبات کا قاعدہ دیتا ہے اور یہاں ابتداء نفل کی فرضیت کا کوئی قائل نہیں لہذا متصل ہی ہو گا، اس سے معلوم ہوا کہ "إلا أن تطوع" "إلا أن تشرع التطوع" کے معنی میں ہے، اور چونکہ استثناء وجوب سے ہے اس لئے "إلا أن تشرع فی التطوع فیلزمك إتمامه" کے معنی میں ہو گا یعنی اس کے بعد تمہارے ذمہ کچھ لازم نہیں ہاں اگر نفل شروع کر دو گے تو واجب ہو جائے گا۔

حضرت امام شافعی اس میں استثناء منقطع کے قائل ہیں اور منقطع لکن کے معنی میں ہوتا ہے اور چونکہ استثناء منقطع کے اندر مستثنیٰ سے مستثنیٰ کے مغایر ہوتا ہے اس لئے ترجمہ ہو گا تم پر اس کے علاوہ کچھ فرض نہیں، ہاں نفل پڑھنا چاہو تو پڑھ سکتے ہو۔

ایک سوال :- "اگر استثناء متصل ہو تا تو شروع کرنے کے بعد نفل نماز فرض ہو جاتی حالانکہ واجب ہوتی ہے؟

جواب :- چونکہ نماز بیگناہ کی فرضیت تو اس سے ثابت ہے، اس لئے وہ فرض ہے اور "إلا أن تطوع" کا جملہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے وجوب ثابت ہوتا ہے اس لئے بعد از شروع نفل نماز واجب اور فرض عملی ہوگی،

دوسرا سوال :- جب نماز روزہ، حج ایک ہی جیسے فرض عبادت ہیں اور اس حدیث میں نماز، روزہ کے ساتھ حج میں بھی "إلا أن تطوع" مذکور ہے تو پھر حج میں استثناء کو منفصل کیوں مانتے ہیں؟ جبکہ دو جگہ استثناء متصل مان چکے ہیں، تو ہر جگہ ایک ہی ماننا چاہئے؟

جواب :- وجہ اس کی یہ ہے کہ نماز، روزہ، اور حج کے درمیان کافی فرق ہے، کہ نماز روزہ میں خاص نظام ہے اور اس نظام خاص میں مصلیٰ یا صائم کو اختیار نہیں، مثلاً مصلیٰ کو یہ اختیار نہیں کہ ایک رکعت بھی پڑھے اور دوسری رکعت آئندہ

کل، یا رکوع ابھی اور سجدہ گھٹنے کے بعد، اسی طرح روزہ دار کو یہ اختیار نہیں کہ نصف دن تک آج روزہ رکھے اور بقیہ دوسرے دن، غرض نماز اور روزہ میں اتصال اور انتظام ضروری ہے اس کے برخلاف زکوٰۃ دینے والے کو اختیار ہے آج کچھ دیدے، اور کچھ بعد میں، اس میں اتصال ضروری نہیں اس لئے نماز و روزہ میں اتصال کا تقاضا ہے کہ استثنائے بھی متصل ہو، برخلاف زکوٰۃ کے کہ اس میں الفصل ممکن ہے اس لئے یہاں استثنائے مفصل مراد لینا مناسب ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ زکوٰۃ میں ابتداء اور انتہا کا تصور ممکن نہیں، جب تک زکوٰۃ نہیں دی اس وقت تک ادا نہیں ہوگی، اور جب دیدی تو ادا ہوگئی، اس میں استداد نہیں ہوتا اس لئے زکوٰۃ کے معاملہ میں استثنائے متصل ہو ہی نہیں سکتا، لہذا بوجہ مجبوری منقطع مانا گیا ہے، کیونکہ یہ تو مجاز ہے، جو بوجہ ضرورت مراد لیا جاتا ہے۔“

**دلائل احناف** حضرت نخاع نے وضاحت کی ہے کہ استثنائے میں اصل استثنائے متصل ہے، غیر متصل (منقطع) غیر اصل ہے، اور قاعدہ ہے کہ بلا ضرورت اصل کو ترک کرنا جائز نہیں، نیز جب کوئی چیز مطلق ذکر کی جاتی ہے تو اصل اور حقیقت ہی مراد ہوتی ہے، واللہ یہ کہ حقیقی معنی محذور ہو، اور یہاں اصل معنی مراد لینے میں کسی قسم کی قباحت نہیں، بلکہ دوسرے نصوص سے اس بات کی تائید ہوتی ہے، قرآن کریم میں ہے ”لَا تَبْتَغُوا أَعْمَالَكُمْ إِبْطَالًا“ کے معنی ہیں کسی کام کو شروع کر کے احوال را چھوڑ دینا، جب ابطال عمل کی ممانعت ہے تو اسی سے ثابت ہوا کہ اتمام عمل ضروری ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ آیت کا مقصد بطلان عمل نہیں بلکہ بطلان ثواب ہے لہذا بطلان عمل پر استدلال مناسب نہیں، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ابطال ثواب ممنوع ہے تو ابطال عمل بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا۔ نیز دواجماعی مسئلہ سے ہماری تائید ہوتی ہے اگر کسی نے نقل حج یا نفل عمرہ شروع کیا تو وہ واجب ہو جاتا ہے، اگر حج یا عمرہ کو باطل کر دیا جائے تو اسکی قضا بالافتقار واجب ہے، لہذا نماز روزہ کا بھی یہی حکم ہونا چاہئے۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے ”عن عائشة أصبحت انا وحفصة صائمین فاهدیت لنا شاہ فاکلنا فدخل علينا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال اقضیا یوماً مکاناً، اس میں میخہ امر ہے جو وجوب کیلئے ہوتا ہے۔ (۲) عن ام سلمة رضی اللہ عنہا: أنها صامت یوماً تطوعاً فافطرت فامرھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تقضی یوماً مکاناً، (مشکوٰۃ ص ۱۸۱) اس سے بھی معلوم ہوا کہ قضا واجب ہے۔

**شواہد کے دلائل کا جواب** حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مسئلہ کا اصل مدار استثنائے پر ہے جس نے منقطع کہا، وہ دلیل کا محتاج ہے پھر اسکے بعد انہوں نے دلیل پیش کی ہے، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان احياناً يصوم التطوع ثم يفطر، (۲) انه امر جویریۃ بنت الحارث ان تفتقر یوم الجمعة بعد ان شوعت فیہ، (فتح الباری ص ۶، ۷) ان روایتوں میں افطار کا ذکر ہے، لیکن قضا کرنے کا تذکرہ نہیں معلوم ہوا کہ قضا نہیں، لیکن یہ استدلال محل نظر ہے، کیونکہ مذکورہ بالا دونوں روایات قضا کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں ساکت ہیں، اور ضابطہ ہے کہ عدم ذکر عدم وجود کو مستلزم نہیں، علامہ زر قانی فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے جن روایتوں سے استدلال کیا ہے وہ واقعات جزئیہ ہیں، جن میں عموم نہیں اور ارشاد باری ”لَا تَبْتَغُوا أَعْمَالَكُمْ“ ایک ضابطہ کلیہ ہے، اور یہ مسئلہ میں سے ہے۔

کہ قاعدہ کلیہ کے مقابلہ میں واقعہ بجز یہ حجت نہیں، نیز صبح اور محرم میں اگر تعارض ہو تو محرم کو ترجیح ہوتی ہے۔ علامہ عینی لکھتے ہیں: "ولو وقع التعارض بین الاخبار فالترجیح معنا ثلثة اوجیه، احدها: اجماع الصحابة، والثانی:

احادیثنا مثبتة واحادیثهم نافية، والمثبت مقدم علی النافی، والثالث: انه احتیاط فی العبادة۔ (۱)  
قوله واللہ لا ازید علی هذا ولا انقص: یعنی نہ اس سے زائد کروں گا اور نہ اس سے کم، تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ صحیح رہا ہے تو کامیاب ہے، ایک روایت میں افلح انہ صدق ہے، یعنی چونکہ صحیح کہہ رہا ہے اسلئے کامیاب ہے۔

اشکال:- جن چیزوں کا حدیث میں تذکرہ ہے صرف انہی چیزوں پر فلاح کا دار و مدار نہیں بلکہ بہت سے امور ہیں جن کے بغیر فلاح مشکل، نیز اس روایت میں منہیات شرعیہ کا ذکر نہیں جبکہ اس سے اجتناب کے بغیر فلاح کیوں کر ممکن؟ پھر آپ نے فلاح و کامیابی کی بشارت کیسے عنایت فرمادی؟ اس کے چند جوابات دیئے گئے ہیں:

(۱) ابن بطلان نے کہا کہ ممکن ہے ضام بن ثعلبہ کی آمد کے وقت منہیات سے بچنے کا حکم نہ آیا ہو، لیکن حافظ ابن حجر نے اس کی تردید کی ہے، کہ اگر سائل حضرت ضام بن ثعلبہ کو مان لیا جائے تو ان کی آمد ۵ھ یا اس کے بعد ہوئی ہے اور اکثر منہیات کا نزول ۵ھ سے قبل ہو چکا تھا، تو پھر ابن بطلان کا یہ جواب کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟ البتہ منہیات شرعیہ کو "شرائع الاسلام" کے عموم میں شامل کر دیا جائے تو پھر کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا،

(۲) "لا ازید ولا انقص" کا تعلق عمل سے نہیں بلکہ اعتقاد سے ہے کہ جس طرح فرائض و منہیات کی تقسیم فرمائی ہے اس کے مطابق اعتقاد رکھوں گا، ظاہر ہے کہ ہر شخص اس اعتقاد میں کامیاب ہے۔

(۳) زیادت و نقص کا تعلق مقدار فرض سے ہو اس کی مقدار مثلاً فجر کی دو رکعت، تو اس میں کمی زیادتی نہ کروں گا،

(۴) جس طرح آپ نے ارشاد فرمایا اسی طرح بلا کم و کاست ہو نچاؤ دنگا، اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کروں گا

(۵) لیکن یہ سب جوابات اس وقت کمزور نظر آتے ہیں جب لا انتطوع، (کہ نفل نہ کروں گا) پر نظر پڑتی ہے، جو واضح

کرتا ہے کہ انہیں چیزوں پر عمل کروں گا حتیٰ کہ نفل بھی نہ پڑھوں گا، اس لئے بہتر جواب یہ ہے کہ "لا ازید ولا انقص" کو

لغوی معنی مراد نہ لیکر محاورہ پر محمول کیا جائے، قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بات مخاطب کے سامنے پختہ کر کے ظاہر کرنا

چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ جو کچھ کہہ دیا ہے وہی ہو گا اس میں کمی بیشی نہ ہوگی، سائل نے بھی پختگی عمل کو ظاہر کرنے کے لئے

"لا ازید ولا انقص" فرمایا، رہا لا انتطوع تو مطلب یہ ہے کہ میں کار و درباری آدمی ہوں مجھ سے نوافل ادا نہیں ہو گے، ظاہر

ہے کہ نفل کا تارک اور فرائض و واجبات اور سنن مؤکدہ کا عامل مطلق ہے، اسلئے کسی اعتراض کی اب گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

افلح ان صدق: خود مسلم شریف اور ابوداؤد شریف کی روایت میں افلح و ابیہ ہے۔ (۵) افلح کے معنی قیل

انه عبارة عن اربعة اشياء: بقاء بلا فناء وغناء بلا فقر و عمر بلا ذل و علم بلا بذل و قالوا: ولا كلمة اجمع

للخیرات منه، (۳)

اعتراض:- "افلح ان صدق: اس جملہ پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس جملہ میں فلاح مطلق بالشرط

ہے، جبکہ دوسری روایت من سمرۃ أن ينظر إلى رجل من أهل الجنة فليتنظر إلى هذا من مطلقاً جنت وفلاح کی بشارت ہے، تو بظاہر دونوں میں تعارض ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں دو آدمی کا تذکرہ ہے نہ کہ ایک ہی فرد کا، (۲) اگر دونوں جملے مقام بن ثعلبہ سے ہی متعلق مان لئے جائیں تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ پہلے آپ نے بشارت معلق ارشاد فرمایا، کیونکہ اس وقت اس کے جنتی ہونے کا یقین نہ تھا پھر اس کے جنتی ہونے کا یقین بذریعہ وحی ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ جو جنتی کو دیکھنا چاہے تو دیکھ لے، (۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ بعض مصلحت کی بنا پر آپ نے ان کے سامنے بشارت معلق فرمایا جب جانے لگے تو دوسرے اصحاب سے فرمایا کہ جنتی کو دیکھ لو۔ (۴)

دوسرا اشکال: - دوسرا اشکال یہ ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے، لا تحلفوا بآبائکم (۵) اسی طرح من حلف بغیر اللہ فقد اشرك، (۶) میں صراحتاً ممانعت ہے تو پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قسم کھانے کی کیا مصلحت؟

(۱) علامہ شوکانی لکھتے ہیں کہ اگر سبقت لسانی کی بنا پر قسم نکل آئے تو اس پر احکام مرتب نہیں ہوتے، لہذا حضور اکرم ﷺ کی یہ قسم سبقت لسانی کی بنا پر صادر ہوئی، جو باعث اشکال نہیں۔ لیکن علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ "افلح وایہ" اور اس قسم کے قسمیہ جملے کو حضور کی سبقت لسانی پر محمول کرنا غیر مناسب اور بے جا جہاد ہے۔ (۷)

حضرت امام ابو داؤد نے روایت نقل کی ہے: کنت اکتب کل شئی اسمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اريد حفظه، ففقتنی (قریش) وقالوا: اکتب کل شئی اسمعہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر یتکلم فی الغضب والرضاء فامسکت عن الکتابۃ فذکرت ذالک إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فأوما باصبعه إلی فیه، فقال: اکتب فو الذی نفسی بیده ما یخرج منه إلا حق، (۸) اس سے معلوم ہوا کہ غیر مناسب لفظ آپ کی زبان مبارک سے نہیں نکلتا، پھر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ جگہ اس طرح قسم منقول ہے تو پھر اتنی جگہوں پر سبقت لسانی کیوں کر مان لیا جائے؟ (۲) مشہور جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ قسم نبی سے پہلے کی ہے اور یہ منسوخ ہے، لیکن یہ جواب اس لئے کمزور ہو جاتا ہے کہ صحیح ایسی چیزوں میں ہوتا ہے جو اصلاً جائز ہو، جبکہ "من حلف بغیر اللہ فقد اشرك" سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ یا تو شرک ہے یا اس کے مشابہ۔ اور جو شرک ہو یا مشابہ شرک وہ ہمیشہ حرام رہی ہے، لہذا نسخ والا جواب صحیح نظر نہیں آتا۔

(۳) کلام عرب میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن کا ظاہری معنی وہ معلوم مراد نہیں ہوا کرتا، مثلاً عقری، حلقی، ثوبت یداک اسی طرح وایہ کا لفظ بھی مستعمل ہے، لیکن اس سے مقصد حلف نہیں ہوتا اور ممانعت اس صورت میں ہے جبکہ قسم مقصود ہو، (۴) علامہ سبکی نے نقل کیا ہے کہ دراصل واللہ تھا تعقیف ہو کر وایہ ہو گیا، لیکن علامہ قرطبی نے اس کی تردید کی ہے کہ اگر اس قسم کے احتمالات نکالے گئے تو روایتوں سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ "م

(۵) اس کو خاصاً نبوی پر محمول کر لیا جائے اس کی وجہ علامہ ذرقانی نے لکھی ہے کہ حلف بغیر اللہ کی ممانعت تعظیم

غیر اللہ کی وجہ سے ہے اور انبیاء کرام تعظیم مفرط سے محفوظ ہیں اس لئے آپ کے لئے جائز ہے، (۶) بعض کا خیال ہے کہ اصل میں و ربّ ایہ ہے مگر سب سے عمدہ جواب حسن چٹٹی حنفی کا ہے اور وہ مطول کے حاشیہ میں ہے کہ قسم دو طرح کے ہیں ایک لغوی دوسرے شرعی، لغوی میں صیغہ قسم کا ہوتا ہے مگر مقصود تزئین کلام ہوتی ہے اور محض ترویج اور خوبصورت بنانا ہوتا ہے جیسا کہ ذوق کا شعر ہے

اتاہوں تیری تیج کا شر مند کا حیاں سر میر اتیرے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا

شع نے اگ رکھی سر پر قسم کھانے کو بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

تو در حقیقت یہاں تزئین کلام ہے اور شرعی قسم وہ ہے جہاں تعظیم ہو اور وہ حلف ہے در مختار میں جہاں والعمری آیا ہے وہیں علامہ شامی نے حسن چٹٹی کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ (۷)

## بَابُ السُّؤَالِ عَنْ أَرْكَانِ الْإِسْلَامِ

ارکان اسلام کے متعلق پوچھنے کا بیان

﴿ حَدِیْثٌ ﴾ حَدَّثَنِی عَمْرُو بْنُ مُحَمَّدٍ بْنِ بُكَيْرٍ عَنْ أَنَسٍ بْنِ مَالِكٍ نَهْنَهْنَا أَنْ نَسْأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ، فَكَانَ يُعْجِبُنَا أَنْ يَجِيءَ الرَّجُلُ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ الْعَاقِلِ فَيَسْأَلُهُ وَنَحْنُ نَسْعُ فَجَلَّةٌ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ؟ أَتَانَا رَسُولُكَ فَرَزَعَمَ لَنَا أَنْكَ تَزْعُمُ أَنَّ اللَّهَ أَرْسَلَكَ قَالَ صَدَقَ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ السَّمَاءَ قَالَ: اللَّهُ، قَالَ: فَمَنْ خَلَقَ الْأَرْضَ قَالَ: اللَّهُ، قَالَ فَمَنْ نَصَبَ هَذِهِ الْجِبَالِ وَجَعَلَ فِيهَا مَا جَعَلَ قَالَ: اللَّهُ، قَالَ فَبِالَّذِي خَلَقَ السَّمَاءَ وَخَلَقَ الْأَرْضَ وَنَصَبَ هَذِهِ الْجِبَالِ أَلَّهِ أَرْسَلَكَ، قَالَ نَعَمْ، قَالَ: وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا خُصَسَ صَلَوَاتٍ فِي يَوْمِنَا وَلَيْلَتِنَا قَالَ صَدَقَ، قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ أَلَّهِ أَمَرَكَ بِهَذَا، قَالَ نَعَمْ، قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا زَكَاةً فِي أَمْوَالِنَا قَالَ صَدَقَ، قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ أَلَّهِ أَمَرَكَ بِهَذَا، قَالَ نَعَمْ، قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرِ رَمَضَانَ فِي سَنَتِنَا، قَالَ صَدَقَ، قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ أَلَّهِ أَمَرَكَ بِهَذَا قَالَ نَعَمْ، قَالَ: وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا حَجَّ الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا قَالَ: صَدَقَ قَالَ ثُمَّ وَلَّى، قَالَ وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أَرِيدُ عَلَيْهِمْ وَلَا أَنْقُصَ مِنْهُمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَعِنْ صَدَقَ لِيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ، (۲)

حضرت انس بن مالک روایت فرماتے ہیں کہ ہمیں قرآن کریم میں اس بات سے روکا گیا تھا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ

ترجمہ

علیہ وسلم سے بلا ضرورت سوال کیا کریں اس لئے ہم یہ پسند کیا کرتے تھے کہ دیہات و جنگل کا رہنے والا، کوئی سمجھدار آدمی آئے اور آپ سے سوال کرے اور ہم کو سننے کا موقع ملے، اتفاقاً ایک شخص آجہو پنچا اور عرض کیا، اے محمد! آپ کا قاصد ہمارے یہاں آیا تھا، اور اس نے کہا کہ آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس نے حج

کہا، پھر اس نے کہا کہ آسمان کس نے بنایا؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے، پھر اس نے کہا کہ زمین کس نے بنائی؟ تو آپ نے فرمایا کہ خدا نے، اچھا تو پہاڑوں کو کس نے قائم کیا؟ اور ان میں قسم قسم کی چیزیں کس نے بنائیں؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے، یہ سن کر وہ بولا اسی ذات کی قسم جس نے آسمان، زمین بنائی اور ان پہاڑوں کو قائم کیا، سچ بتائیے کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنایا ہے؟ فرمایا ہاں، پھر اس نے کہا کہ آپ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ شب و روز میں ہمارے ذمہ پانچ نمازیں فرض ہیں آپ نے فرمایا کہ سچ کہا، (یہ سن کر وہ کہنے لگا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، سچ بتائیے کہ کیا واقعی اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے، آپ نے فرمایا ہاں، پھر اس نے کہا کہ آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ہاں میں زکوٰۃ واجب ہے، آپ نے فرمایا سچ کہا، پھر اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے، آپ نے فرمایا ہاں، پھر اس نے کہا کہ آپ کے قاصد کا یہ بھی خیال ہے کہ ہمارے لوہے پر سال میں ایک مرتبہ رمضان کا روزہ فرض ہے، آپ نے فرمایا ہاں، اس نے سچ کہا، پھر اس نے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے، آپ نے فرمایا ہاں، پھر اس نے کہا کہ آپ کے قاصد کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم میں جس کے پاس سواری اور توشہ سفر مہیا ہو اس پر بیت اللہ کا حج فرض ہے، آپ نے فرمایا سچ کہا، روای کہتے ہیں کہ یہ سوالات کر کے اس نے پشت پھیری اور یہ کہا کہ اس ذات کی قسم ہے کہ جس نے آپ کو سچائی بنا کر بھیجا ہے، میں ان باتوں پر کچھ کم و بیش نہ کروں گا، آپ نے فرمایا اگر یہ سچ کہتا ہے تو یقیناً جنت میں جائے گا۔

### مقتصد باب

حدیث جبرئیل میں اسلامی ارکان کے سائل حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کی تصدیق حضرت جبرئیل نے کی، جبکہ حنابلہ بن ثعلبہ کی حدیث میں ارکان اسلامی کو مبلغین کے حوالہ سے حنابلہ بن ثعلبہ نے بیان فرمایا اور وہاں اس کی تصدیق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی، اس سے معلوم ہوا کہ ارکان اسلامی اس قدر ظاہر ہیں کہ فرشتہ اور انسان سب کو معلوم ہیں گویا نماز کے بعد پھر تمام ارکان اسلام کو بیان کر دیا گیا۔  
حنابلہ بن ثعلبہ کی حدیث پر امام بخاریؒ نے عرض علی الحدیث کا باب قائم کر کے اصولی حدیث کے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے کہ جس طرح سماع عن الشیخ قابل حجت ہے اسی طرح قرأت علی الشیخ بھی قابل حجت ہے۔

### حضرت حنابلہ کی آمد اور قبول اسلام

مؤرخین کے نزدیک حنابلہ بن ثعلبہ کی آمد کے سال میں اختلاف ہے، ابن اسحاق، ابو عبیدہ وغیرہ کی رائے ہے کہ ۶ھ میں تشریف لائے، مگر علامہ واقفی کا خیال ہے کہ ۷ھ میں حاضر ہوئے، مگر محققین نے اس قول کو قبول نہیں کیا ہے۔  
ان کے اسلام کے سلسلہ میں بھی اختلاف ہے امام بخاریؒ وغیرہ کا رجحان ہے کہ جس وقت آپ کا قاصد ہو چکا تھا یہ اسی وقت مسلمان ہو چکے تھے، اور اب ان کا مقصد صرف تصدیق کرنا تھا۔ علامہ قسطلانی کا خیال ہے کہ آپ کی خدمت میں آکر مسلمان ہوئے ہیں ان کا استدلال لفظ ”نعم“ سے ہے کہ اگر یہ ایمان لائے ہوتے تو یہ لفظ استعمال نہ کرتے کیونکہ زعم قولی غیر محقق اور مشکوک کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ ”نعم“ بمعنی قائل مستعمل ہے، اور قول محقق میں بھی اس کا استعمال ثابت ہے، امام سیوطی کی کتاب نحو میں جا بجا زعم الخلیل بمعنی قال الخلیل استعمال ہوا ہے۔

(۲) دوسرا استدلال ابو داؤد شریف کے ترجمہ الباب بابُ الْمُشْرِكِ يَدْخُلُ الْمَسْجِدَ (۱) سے ہے لام ابو داؤد نے اس کے ذیل میں اسی روایت کو ذکر کیا ہے، معلوم ہوا کہ ابو داؤد کی نظر میں حضرت حنظلہؓ اس وقت مشرک تھے، لیکن یہ استدلال بھی محل نظر ہے، کیونکہ ترجمہ الباب کا ثبوت حضرت حنظلہؓ کے شرک پر موقوف نہیں، بلکہ استدلال یہ ہے کہ صحابی کی موجودگی میں ایک اجنبی آتا ہے اور بے تکلف مسجد میں چلا جاتا ہے، اس کے متعلق ایمان و شرک کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، اگر مشرک کا مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہو تا تو داخل ہونے سے پہلے دریافت کیا جاتا کہ تم مسلمان ہو یا نہیں؟ غرض دریافت نہ کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کی نگاہ میں مسجد میں داخل ہونے کیلئے مومن ہونا ضروری نہیں۔

اگر غور کیا جائے تو ان کا مسلمان ہونا ہی قرین قیاس ہے، کیونکہ انہوں نے توحید کے دلائل طلب نہیں کیا، بلکہ آپ کی رسالت اور اہل کتاب اسلام کے بارے میں سوالات کئے، مزید یہ کہ اگر مومن نہ ہوتے تو ہجرات کا مطالبہ کرتے، غرض یہ کہ وہ مسلمان ہو کر تشریف لائے تھے۔

نَهَيْنَا أَنْ نَسْأَلَ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ، اس آیت کریمہ میں سوالات سے حرمانت کا یہی منظر یہ ہوا کہ جب صحابہ حج فرض ہوا تو حضرت اقرع بن حابس نے سوال کیا کہ کیا ہر سال ہمارے ذمہ حج فرض ہے، آپ نے خاموشی اختیار فرمائی بار بار ان کے سوال کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمایا کہ اگر میں تمہارے جواب میں کہہ دیتا کہ ہاں ہر سال حج فرض ہے تو ایسا ہی ہو جاتا اور وہ تم سے پورا نہ ہو پاتا، اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ جن چیزوں کے بارے میں تمہیں حکم نہ دوں اسکو کھود کرید مت کرو کیونکہ تم سے پہلے کی امت اسی کثرت سوال کے ذریعہ ہلاک ہو چکی ہے، کہ جس چیز کو اللہ اور رسول نے فرض نہیں کیا بلا ضرورت سوالات کر کے فرض کر لیا، اور پھر ان سے نہ ہو سکا، تو مصیبت میں مبتلا کئے گئے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، اس کے بعد صحابہ کرام سوال کرنے میں بہت زیادہ محتاط ہو گئے، کہ کہیں ہم کوئی سوال ضروری سمجھ کر دریافت کریں اور وہ عند اللہ بے ضرورت ہو، اس اندیشہ سے سوال نہیں کرتے تھے مگر یہ تمنا ہوتی تھی کہ کوئی آئے اور قاعدہ کا سوال کرے، اور ہم کو سننے کا موقع ہاتھ لگ جائے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حنظلہؓ کوئی سمجھدار کسی اور اعرابی کو نہیں دیکھا، کہ اتنے مختصر الفاظ میں دین کی تمام ضروری باتیں دریافت کر لیں اور وہ بھی مرتب انداز میں۔

لَا زِيدَ عَلَيْهِمْ وَلَا انْقُصَ مِنْهُمْ: اس روایت میں نماز، حج، زکوٰۃ، صوم، اور حج کا تذکرہ تو ہے، لیکن سنن مؤکدہ، صدقہ الفطر وغیرہ کا ذکر نہیں تو یہ قسم کھانا کہ میں ان اعمال مذکورہ میں سے نہ تو زیادہ کچھ کروں گا اور نہ کم کروں گا، گویا بظاہر سنن مؤکدہ کے نہ کرنے کی بھی قسم کھائی پھر اسی پر قلاع اور دخول جنت کی بشارت کیونکر دی جا رہی ہے؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ درحقیقت اس روایت میں "وشرائع الاسلام کلھا" کے الفاظ بھی بخاری شریف (۱۷) میں ہیں، نیز مسند امام احمد میں ان کا یہ جواب بھی نقل کیا ہے "وسأودى هذه الفرائض واجتنب ما نهيتنى عنه ولا أزيد ولا أنقص" اب ان الفاظ کے بعد کیا یہ کہا جاسکتا ہے، کہ حضرت حنظلہؓ نے پورے دین پر عمل کرنے کا وعدہ نہیں کیا

تھا؟ یقیناً کیا تھا، لہذا دخول جنت کی بشارت عین موافق عدل ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں اتنی بات اور نقل کی ہے فاما هذه الهبة فوالله انا كنا ننزله عنها في الجاهلية يعني الفواحش، (۱) یعنی وہ فحش اور بے حیائی کی حرکتیں تو ان سے ہم کفر کے زمانے میں بھی بجا کرتے تھے، اس لئے یہ بات تو تعجب خیز ہوگی، کہ حضرت ضمام کی سلامت فطرت اور ان کے تفصیلی جواب کے بعد بھی صرف ”لا ازيد“ کے ایک لفظ سے یہ خیال قائم کر لیا جائے، کہ انہوں نے صرف چند احکام کے سوا باقی احکام کے نہ کرنے کا قصد کر لیا تھا واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔

### ”لا ازيد“ کی حقیقت کیا ہے

”اس کے بارے میں چند جوابات گذر چکے ہیں، مگر ذوق و مزاج سے لگتی ہوئی بات اور سب سے عمدہ توجیہ وہ ہے جو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمائی ہے فرماتے ہیں: کبھی کبھی ایک چیز کی نفی مقصود ہوا کرتی ہے، مگر ساتھ ہی میں تحسین کلام یا تاکید و مبالغہ کے لئے اس کی ضد کی بھی نفی کر دی جاتی ہے، مثلاً بیچنے والے سے خریدار پوچھتا ہے قیمت میں کمی بیشی ہوگی یا نہیں؟ اسی طرح تولتے وقت خریدار کہتا ہے اچھی طرح وزن کرو کم بیش نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہاں مقصود کمی کی نفی ہے، زیادتی کی نفی نہیں اور پہلی مثال میں کمی مقصود ہے نہ کہ زیادہ کرنا، تو اسی طرح صحابی کا مقصود کلام ”لا انقص“ ہے اور لا ازيد تحسین کلام کے لئے ہے، یا تاکید و مبالغہ کیلئے، اس توجیہ کے بعد کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا، اس کی ایک مثال قرآن کریم میں ہے، لَا يَسْتَفْهِمُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَأْذِنُونَ، اس جگہ بھی اشکال ہے کہ جب موت آجائے تو تاخیر ممکن ہے لہذا اسکی نفی صحیح ہے مگر گزرے ہوئے وقت کو مقدم کرنا تو عقلاً ممکن نہیں، تو پھر اس کی نفی کا فائدہ؟ اس آیت کے بھی بہت سے جوابات دیئے گئے ہیں مگر عمدہ جواب یہی ہے کہ مقصود لَا يَسْتَأْذِنُونَ کی نفی ہے، اور لَا يَسْتَفْهِمُونَ کو تحسین کلام یا تاکید و مبالغہ کے لئے لایا گیا ہے۔“ م (۵)

### حضرت ضمام کی واپسی پر قوم کا اسلام

”حضرت ضمام بن ثعلبہ جب اپنی قوم میں واپس پہنچے تو ان کی قوم آٹا فانا ان کے گردا گرد جمع ہو گئی، حضرت ضمام نے اپنی قوم سے جو پہلی گفتگو کی وہ ابن اثیر کے بیان کے مطابق کچھ اس طرح تھی، لات وعزى بت بہت ہی برے ہیں لوگوں کو ان کی یہ بات ناگوار لگی، اور کہا کہ ضمام خاموش ہو جاؤ، ورنہ دیکھو اس جرم میں کہیں تم کو برص کا مرض نہ ہو جائے، کہیں جذام کے شکار نہ ہو جاؤ، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان معبود کی بے حرمتی میں عقل سلب ہو جائے۔ حضرت ضمام جن کے قلب و دماغ پر توحید و وحدانیت اور رسالت کا نقش دوام آچکا تھا، فوراً جواب دیا کہ تم پر افسوس ہے خدائے وحدہ کی قسم لات وعزى نہ تو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نفع دے سکتے ہیں، بیشک خدائے ایک رسول بھیجا ہے اس پر کتاب مقدس نازل کی ہے، اور اس کے ذریعہ تمہیں جہالت سے نجات دلایا ہے جس میں تم گرفتار تھے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں جن باتوں کا تمہیں حکم دیتا ہوں اور جن باتوں سے تم کو منع کرتا ہوں وہ سب باتیں اسی رسول کے پاس سے لایا ہوں، راوی کا بیان ہے کہ شام تک ان کی



مجلس میں جس قدر مردوزن تھے وہ سب کے سب شرفِ اسلام ہو گئے۔“ (۱)

## باب بیان الایمان الذی یدخل بہ الجنۃ وانّ من تمسک بما أمر بہ دخل الجنۃ

اس ایمان کا بیان جس سے انسان جنت میں داخل ہو گا اور بیشک حکم بحال لانے والا جنت میں جائے گا

﴿ حدیث ﴾ حدثنا محمد بن عبد اللہ بن نمیر ..... قال حدثنی ابو ایوب أن اعرابیاً عرّضَ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وَهُوَ فِي سَفَرٍ فَآخَذَ بِخِطَامِ نَاقَتِهِ أَوْ بِزِمَامِهَا، ثُمَّ قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَوْ يَا مُحَمَّدٌ؟ أَخْبِرْنِي بِمَا يَقْرَبُنِي مِنَ الْجَنَّةِ وَمَا يَبْعِدُنِي مِنَ النَّارِ قُلْ: فَكَفَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ نَظَرَ فِي أَصْحَابِهِ ثُمَّ قَالَ لَقَدْ وَفَّقَ أَوْ لَقَدْ هَدَى قَالَ: كَيْفَ قُلْتَ قَالَ: فَأَعَادَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعْبُدُ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئاً وَتُقِيمُ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ وَتَحِلُّ الزَّيْمَ، ذِمَّ النَّاقَةَ، (۲)

ترجمہ: حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عرب کا ایک بدو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا، جبکہ آپ حاضر سفر میں تھے انہوں نے آپ کے اونٹنی کی مہار (یاراوی نے زمام کا لفظ کہا) پکڑ لیا، اسکے بعد انہوں نے کہا یا رسول اللہ یا محمد کہہ کر پکارا کہ مجھے ایسا عمل بتائیں جو جنت سے قریب کر دے اور جہنم سے دور کر دے، راوی کا بیان ہے کہ سرکارِ مدینہ اس کی بات سن کر رُک گئے، اور اپنے صحابہ کرام کی طرف ایک نظر ڈالی، اور فرمایا کہ سائل کو عمدہ انداز میں سوال کرنے کی توفیق ملی ہے، یا فرمایا کہ اچھے سوال کی رہنمائی ہوئی ہے، آنحضور ﷺ نے سائل سے کہا کہ تم نے کس طرح سوال کیا؟ راوی کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سوال کو دہرایا، تو اسکے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو، خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرو، زکوٰۃ دو، اور صلہ رحمی کرتے رہو، (یہ کہہ کر آپ نے فرمایا) اونٹنی کو چھوڑ دو۔

مقصدِ باب :- ارکانِ ایمان کا ثمرہ بیان کیا گیا ہے کہ ماموراتِ اسلامی پر عمل کرنے کا سب سے بڑا فائدہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہے، اور جنت اللہ کی رضا کا مظہر ہے، اور اسی وجہ سے مطلوب ہے کہ وہ اللہ کی رضا کا مظہر ہے اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مومن ماموراتِ اسلامی پر عمل کرنے سے اللہ کے غضب اور غصہ سے محفوظ رہتا ہے اور خدا کی غضب کا مظہر جہنم ہے اور جہنم اسی وجہ سے مبغوض ہے کہ وہ غضبِ الہی کا مظہر ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ہر چیز کا ثمرہ بعد میں ظاہر ہوتا ہے اسلئے ارکان کے بعد ثمرہ کا ذکر کیا گیا جو ترتیب عقل کے مناسب ہے۔ ان اعرابیاً عرض: ”اعرابی کی تعین: یہ قبیلہ قیس کے ایک فرد ہیں جن کو ابنِ المنفق کہا جاتا ہے مگر میری کا خیال ہے کہ ان کا نام لقیط بن مبرہ ہے، جو دراصل قبیلہ کنی منتفق کے قاصد بن کر تشریف لائے تھے۔ (۳)

لقیط بن مبرہ کا ایک واقعہ خود ان کے صاحبزادے نے نقل کیا ہے کہ ایک دن وہ بنی منتفق کی طرف سے مدینہ منورہ

آئے تھے اتفاق یہ کہ آپ ﷺ اس وقت وہاں موجود نہ تھے، ہم انہو مشین حضرت عائشہؓ نے چھو ہارے کھلائے، اور عسیدہ (ایک قسم کا کھانا) تیار کر لیا، اتنے میں آقا تشریف لے آئے، آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں نے کھلایا؟ تو انہوں نے کہا جی ہاں! اسکے بعد چرواہا بکری کے بچے کو گود میں لیکر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کیا بکری نے بچہ دیا ہے اس نے عرض کیا جی ہاں! آپ نے فرمایا ایک بکری ذبح کر دو، پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تمہارے لئے بکری ذبح کی ہے، بلکہ میری سو بکریاں ہیں اس سے زیادہ رکھنا مناسب نہیں سمجھتا لہذا جب ایک زائد ہوتا ہے تو ایک بکری ذبح کر دی جاتی ہے۔ ”م (۱)“

لقد وفق: مشکمین توفیق کی تعریف ابن الغضائی میں کرتے ہیں تخلق قدرة الطاعة وخذلان خلق قدرة العصية اور عام عرف میں توفیق کہتے ہیں ایسے حالات و اسباب پیدا کر دینا کہ مقصود کا حاصل ہوتا آسان ہو جائے، اور اس کے خلاف دشوار ہو جائے۔

فاخذ بخطام: خطام اور زمام یکسر الخیال والذی، خطام وہ سی جس کے ایک کنارہ میں حلقہ بنا کر دوسرے کنارہ کو داخل کر دیا جائے، اور اس حلقہ کو لوٹ کی گردن میں ڈال دیا جائے اور وہ رستی جو باریک ہوتی ہے اور جس کو ناک میں ڈالتے ہیں اسکو زمام کہتے ہیں، علامہ ہر وی نے ازہری کے حوالہ سے اسی طرح نقل کیا ہے، تاہم صاحب مطالع کہتے ہیں کہ زمام وہ رستی ہے جس سے اونٹ کے سر کو باندھا جائے تاکہ اسکو چلایا جاسکے۔

تعبد اللہ: یہاں عبادت کا کیا مہیوم ہے؟ اس سلسلہ میں چند اقوال ہیں، لفظ عبادت کے لغوی معنی غایت خشوع و خضوع کیساتھ عبادت کرنا، یہاں عبادت سے اگر اللہ کی معرفت و وحدانیت کا اقرار مراد ہے تو بعد کے اعمال کا اس پر عطف ان اعمال کو اسلام میں داخل کرنے کی غرض سے ہوگا، کیونکہ وحدانیت مراد لینے کی صورت میں اعمال تعبد اللہ میں شامل نہیں تاہم اگر اس سے وحدانیت مراد ہے تو پھر چونکہ عرف اسلام میں وحدانیت کے اندر نبوت شامل ہے اسلئے اس کو ذکر نہیں کیا گیا،

(۲) عبادت سے مطلق عبادت مراد ہو تو اس صورت میں اسلام کے تمام وظائف اس کے مہیوم میں شامل ہوں گے، لہذا تقیم الصلاة اور زکوٰۃ وغیرہ کا عطف، عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہوگا، جیسے ”واخذنا من النبیین میثاقہم ومنک ومن نوح“ میں ہے۔

لا تشرك به شیئاً: عبادت الہی کے بعد لا شرک کے اضافہ کی بظاہر ضرورت نہ تھی، مگر یہاں بت پرستوں کے نظریہ کی تردید پیش نظر ہے، کیونکہ مشرکین بھی خدا کی عبادت کرتے تھے، مگر اس کی عبادت میں بتوں کو شریک کرتے تھے، شیئاً کے عام لفظ میں شرک جلی، خفی، ریا، سمعہ سب داخل ہیں۔

### عبادت کے درجات

”عبادت گزار کے لحاظ سے عبادت کی تین قسمیں ہیں اگر کوئی اس نیت سے عبادت کرے کہ عذاب الہی سے نجات ملے اور اجر خداوندی حاصل ہو تو یہ عبادت ہے، اور اگر مقصود یہ نہ ہو بلکہ ہم اسکے بندے بن جائیں اس سے ہماری نسبت قائم ہو جائے، تو یہ عبودیت ہے یہ پہلے سے اعلیٰ درجہ ہے، اور اگر عبادت سے مقصود نہ تو ثواب، اور نہ کچھ، بلکہ محض اس کی

## خوشنودی مقصود اصلی ہو تو یہ عبودت ہے یہ سب سے ارفع مقام ہے۔ "م صرف تین اعمال ذکر کرنے کی حکمت

اس روایت میں دخول جنت اور ہر طرح کی فلاح و کامیابی کے لئے صرف تین عبادت مذکور ہے تو کیا ان تین پر ہی عمل کر لیا کافی ہے، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حقوق دو طرح کے ہیں، حقوق اللہ، حقوق العباد، سارے ہی حقوق العباد کی طرف صلہ رحمی کے ذریعہ اشارہ فرمادیا، گویا صلہ رحمی کا تذکرہ تسمیۃً للکل باسم الجزاء کی قبیل سے ہے، اور حقوق اللہ کی دو قسم ہے بدنی، اور مالی، تو مال سے متعلق بخشی عبادت ہے اس کی طرف زکوٰۃ سے اشارہ کر دیا گیا، پھر بدنی عبادت دو طرح کی ہے، ایک تو وہ ہے جو فعل و عمل کی قبیل سے ہے، اور ایک وہ ہے جو ترک کی قبیل سے ہے تو جو عبادت فعل و عمل کی قبیل سے ہے ان کی طرف نماز سے، اور جو ترک کی قبیل سے ہے اس کی طرف روزہ کے ذریعہ اشارہ کیا گیا، گویا ان تین الفاظ کے پردہ میں پوری شریعت پر عمل کرنے کی رہ نمائی فرمادی۔ (۱)

### اختلاف روایت کیوں؟

یہ روایت کئی طرق سے مروی ہے جبکہ اس کے متن میں فرق ہے، مثلاً بعض میں صوم کا ذکر نہیں، بعض میں زکوٰۃ کا ذکر نہیں، بعض میں ایمان کا ذکر نہیں، اور کسی میں صلہ رحمی کا ذکر نہیں، جبکہ بعض میں ادھانٹس کا ذکر موجود ہے، اس کو بناگوں اختلاف کی وجہ قاضی عیاضؒ وغیرہ نے لکھا ہے یہ سارے فرق اختصار یا تیسان کے پیش نظر ہوئے ہیں، تاہم کسی بھی روایت میں حج کا ذکر نہیں، اس لئے حافظ ابن حجرؒ نے اپنا رجحان بیان کیا ہے لم يذكر الحج لانه كان حينئذ حاجباً ولعله ذكره فاختصر۔ "م (۲)

### صلہ رحمی کی فضیلت و وعید

"یہاں اس روایت میں حقوق العباد میں سے صلہ رحمی کو اس بنا پر آپ نے ذکر فرمایا کہ آپ نے محسوس فرمایا کہ اس شخص میں اس باب میں کچھ کمی ہے، موجودہ دور میں عام خاندان جو بے چینی، الجھن، بے برکتی کا شکار ہے اسکی بنیادی وجہ صلہ رحمی کا نہ ہونا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنا خاندان میں محبت، مال میں برکت اور موت میں ذلیل کا سبب ہے، (۳) حضرت انسؓ سے مروی ہے جو شخص روزی میں وسعت و فراخی چاہتا ہو اور دنیا میں اس کے آثار تادیر رہیں (یعنی اس کی عمر دراز ہو اور اس میں برکت ہو) تو اُسے چاہئے کہ رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرے، (۴) اسکے برخلاف رشتہ اور تائید کو توڑنے والے کے بارے میں سخت وعید ہے، رشتہ توڑنے والے جنت میں داخل نہ ہوں گے، (۵) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ظلم اور قطع رحمی سے زیادہ کوئی گناہ ایسا نہیں کہ اس گناہ کرنے والے کو جلد ہی دنیا میں سزا دی جاتی ہو، اس عذاب کے ساتھ جو اس کیلئے آخرت میں بطور ذخیرہ رکھا گیا ہے، (۶) یعنی ظلم اور قطع رحمی ایسے دو گناہ ہیں کہ آخرت میں ان پر جو کچھ وبال ہو گا وہ تو ہو گا ہی آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ان کی سزا بہت جلد ملتی ہے۔ "م

﴿حَدِيث﴾ عن جابر رضى الله عنه قال: أتى النبي صلى الله عليه وسلم النعمان بن قوقل فقال: يا رسول الله أرايت إذا صليت المكتوبة وحرمت الحرام وأحللت الحلال أدخل الجنة فقال النبي صلى الله عليه وسلم نعم، وفي رواية أرايت إذا صليت الصلوات المكتوبات وصمت رمضان، وأحللت الحلال وحرمت الحرام، ولم أزد على ذلك شيئاً أدخل الجنة قال: نعم، قال والله لا أزيد على ذلك شيئاً قال والله لا أزيد على ذلك. (۵)

ترجمہ | حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نعمان بن قوقل آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ فرمائیے کہ جب میں فرض نماز ادا کروں اور حرام کے ساتھ حرام کا معاملہ کروں اور حلال کیساتھ حلال کا معاملہ کروں تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا ہاں (ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے) کہ جب فرائض پڑھ لوں، روزہ رکھوں، حلال کو حلال جانوں اور حرام کو حرام جانوں اور اس سے زائد کچھ نہ کروں تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا تو آپ نے فرمایا ہاں، اس پر اس نے کہا خدا کی قسم اس سے زیادہ میں نہیں کروں گا۔

تشریح | ”شیخ ابو عمرو بن صلاح کے حوالہ سے امام نووی لکھتے ہیں کہ حرام کو حرام سمجھنے کا مطلب ایک یہ ہے کہ اسکی حرمت کا عقیدہ رکھا جائے، اور دوسرے اس سے بچا جائے، اور حلال میں صرف حلت کا اعتقاد کافی ہے اسکا کرنا ضروری نہیں۔“م

ولم أزد على ذلك: ”صحابی رسول نے ایک تو“ ولم أزد على ذلك ”کہا پھر بشارت جنت سن کر“والله لا أزيد على ذلك شيئاً“ کہا، تو جب اس میں سارے امور خیر بلکہ سنن مؤکدہ، دوسرے واجبات کا تذکرہ نہیں پھر ان کے لئے ”ولم أزد على ذلك“ کہنا کیونکر صحیح ہوا؟ نیز ”والله لا أزيد“ کہہ کر دوسرے امور خیر نہ کرنے کی قسم کھائی، حالانکہ امور خیر کے نہ کرنے پر قسم کھانا ممنوع ہے، تو سوال یہ ہے کہ جب انہوں نے قسم کھائی تو آپ نے منع کیوں نہ فرمایا؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس وقت وہ نو مسلم تھے، جن اہم چیزوں کے کرنے کا وعدہ انہوں نے کر لیا اس وقت ان کے لئے وہی بہت تھا، آپ کی حکیمانہ نگاہ دیکھ رہی تھی، کہ انہیں عبادت میں مشغولیت سے مزید امور خیر کرنے کا انس و جذبہ پیدا ہو گا اور پھر یہی اسلام کے مختصر اعمال و دگر سارے احکامات پر عمل کیلئے سبب بنیں گے، اسی حکمت کے پیش نظر ان کو قسم کھانے پر بھی آپ نے منع نہیں فرمایا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے صحابی رسول دربار رسالت سے اپنے لئے مخصوص رخصت لینے آئے ہوں تو آپ نے عام افراد سے ان کو مستثنیٰ کرتے ہوئے انہی اعمال پر جنت کی بشارت سنائی ہو۔“م

\*\*\*\*\*

## باب بیان ارکان الاسلام و دعائمه العظام

اسلام کے بڑے بڑے ارکان اور ستونوں کا بیان

❦ حدیث ❦ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ نُمَيْرٍ الْهَمْدَانِيُّ ..... عَنْ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسَةٍ عَلَى أَنْ يُؤْتِيَ اللَّهُ بِكَ الْفَلَاحَ وَالصَّلَاةَ وَالزَّكَاةَ وَصِيَامَ رَمَضَانَ وَالْحَجَّ فَقَالَ رَجُلٌ: الْحَجُّ وَصِيَامُ رَمَضَانَ قَالَ: لَا؛ صِيَامُ رَمَضَانَ وَالْحَجُّ هَكَذَا سَعَتُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

ترجمہ | حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستون پر قائم کی گئی ہے، اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے اور پورے آداب و حقوق کی رعایت کر کے نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، اور رمضان کے روزے رکھنا، کسی نے کہا حج، اور صوم رمضان، تو اس پر حضرت ابن عمر نے فرمایا نہیں بلکہ صوم رمضان اور حج، اسی طرح میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے۔ (۱)

### مقصد باب

اسلام کو ایک مکان سمجھنا چاہئے اور ارکان اسلامی کو ستون، جس طرح ستون کے بغیر مکان باقی نہیں رہ سکتا اسی طرح ارکان اسلامی کے بغیر اسلام باقی نہیں رہ سکتا، یہ تشبیہ بلیغ ہے جس سے اسلام اور ارکان اسلام کا باہمی ربط اور تعلق اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

### اسلام کا طریقہ تفہیم

تشریح | الفاظ حدیث کی وضاحت سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انبیاء کرام اور کتب الہی کا طریقہ افہام و تفہیم انسانی مزاج و فطرت کے مطابق ہوتا ہے، روزمرہ کے معمولی مشاہدات سے مغیبات اور آخرت کی بڑی بڑی باتیں، باتوں بات میں حل کر دیئے جاتے ہیں چنانچہ اسی طریقہ افہام و تفہیم کا اندازہ یہاں ہوتا ہے کہ عرب کی ایک ایسی قوم کو اسلام اور اعمال کے درمیان باہمی ربط، پھر اعمال میں باہمی مراتب کا فرق جب سمجھانا ہوتا تو اس کے لئے ایک سادہ تعبیر اختیار کیا کہ جس طرح اپنے مکان میں دیکھتے ہو، کہ اس میں چھت ستون اور دروازے ہوتے ہیں اور یہ مجموعہ مل کر مکان تیار ہوتا ہے، پھر اس مکان کی بنیاد بھی ہوتی ہے جس پر پوری عمارت کی بقاء ہے پھر یہ بھی دیکھئے کہ عالیشان مکان تو نظر آتا ہے، مگر اس کی بنیاد کہیں نظر نہیں آتی بلکہ پوشیدہ ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اسلام کو سمجھو کہ وہ بھی چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس کے بھی چند اجزاء ہیں اس کی بھی ایک بنیاد ہے، مزید یہ کہ اس کے اجزاء میں بھی ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ مکان کے اجزاء میں تفاوت ہے، ہر ایک یکساں نہیں، جیسا کہ ستون کی جتنی اہمیت و ضرورت ہے اتنی طاق و روشندان، نقش و نگار کی نہیں اسی طرح یہاں ارکان خمسہ اسلام کے بنیادی اصول ہیں، جن کے بغیر اسلام کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی، ان ارکان خمسہ میں

تصدیق قلبی اہم ترین جز ہے، جو قلب میں پوشیدہ ہے جیسا کہ بنیاد زمین میں پوشیدہ ہوتی ہے تو اسلام کی یہ محکم تعمیر اسی تصدیق قلبی پر قائم ہے، غرض کتنی بڑی حقیقت عام مثال میں مورد بھی اس انداز میں کہ سامعین کو محسوس بھی نہ ہو سکا کہ کوئی مشکل اور اہم بات حل کی جا رہی ہو، لیکن جب یہی صاف ستھری بات تحقیق و مطالعہ کے میز پر آئی تو ایک مختلف فیہ مسئلہ بن گیا کہ اعمال ایمان کے اجراء میں سے ہیں یا نہیں؟ اور اسی پر ایمان کے مرکب اور بیض ہونے کا اختلاف اس انداز میں ہوا کہ مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔

### ارکان اسلام انقیاد و ظاہری و باطنی کا مکمل نمونہ

اسلام نام ہے خدا کے سامنے جھک جانے کا، اور انقیاد باطنی کا لبادہ اوڑھ لینے کا، ظاہر ہے کہ کچھ باتیں ایک مسلمان میں ایسی ہونی چاہئے جو ہر وقت اس کے انقیاد ظاہری اور باطنی کا مکمل ثبوت فراہم کرتی ہوں، اور کسی وقتی مصلحت پر بھی وہ ساقط نہ ہوتی ہوں، اس معیار کو سامنے رکھ کر حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اسلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو چند قسم کے احکام ملیں گے (۱) ایسے احکام جو ہر فرد پر واجب ہوں وہ احکام جو خاص خاص پر واجب ہوں، پہلی قسم کا ایک حصہ صرف فرض علی الکفایہ ہے جیسا کہ جہاد، دعوت و تبلیغ، لمانت، قاضی حاکم مفتی وغیرہ، ان سب کا تعلق عارضی اسباب اور وقتی مصلحت سے متعلق ہے کہ اگر وہ مصلحت کسی اور طرح حاصل ہو جاتی تو پھر احکام واجب نہیں رہتے، اسی طرح قیام حدود کہ اس کا تعلق جرائم سے ہے اگر یہ نہ ہوں تو وہ احکام بھی واجب نہ ہوں گے۔ دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جو حقوق العباد کہلاتا ہے جیسے قرض کی ادائیگی، غصب، عاریت و بیعت، لمانت وغیرہ کی ادائیگی یہ تمام ابواب مظلوم کی مدد کے لئے ہیں اگر کوئی بوا کر دے یا صاحب حق معاف کر دے، تو ان ابواب کی بھی ضرورت نہیں رہتی، اسی طرح صلہ رحمی، حقوق ذریت، حقوق اولاد، پڑوسی کے حقوق وغیرہ یہ وہ احکام ہیں جن کا تعلق بھی خاص افراد اور خاص وقت سے ہے، غرض پوری شریعت پر نظر ڈالنے کے وہ کون سے احکام ہیں جو ہر فرد پر ہر وقت لازم ہوں اور انقیاد ظاہری و باطنی کا مکمل ثبوت فراہم کرتے ہوں، تو یہی معلوم ہو گا کہ وہ یہی ارکان خاصہ ہیں جو ہر موقعہ پر عکاسی کرتے ہیں۔ (ترجمان ملت)

### ارکان اسلام پر حضرت نانوتوی کی نکتہ سنجی

حضرت نانوتوی فرماتے ہیں عبادت در حقیقت عہدیت اور بندگی کی ٹریننگ ہے، اور عہدیت در اصل وہ رشتہ ہے جو بندہ اور اسکے معبود کے درمیان قائم ہے اس رشتہ کو صرف سمجھنا مقصود نہیں بلکہ ایک خاص طرز او اسے انسانوں کو رنگین بنانا بھی ہے، اگر خالق و مخلوق کے درمیان اس رشتہ کا تجزیہ کرو تو جو اسکے بڑے عنصر ہیں وہ صرف دو ہیں: اطاعت، محبت۔ ہر غلام کا فرض ہے کہ اپنے مولیٰ کے سامنے ہمہ تن اطاعت کرے مگر وہ اطاعت ہی کیا؟ جو ذوق محبت سے خالی ہو۔

لب اگر غور کریں تو محسوس ہو گا کہ اسلام میں کچھ عبادتیں تو وہ رکھیں جو اسکی حکمرانی و حکومت کا سکہ دل پر چلاوے اور کچھ وہ عبادت جو جذبہ محبت بھڑکاوے نماز اور زکوٰۃ پہلی قسم میں ہے، اور روزہ و حج دوسری قسم میں، نماز ہے کیا؟ عام نوٹس (نواہ) کے بعد لباس و جسم کی صفائی اس کے بعد کورٹ (مسجد) کی حاضری کے لئے تیاری، وکیل (امام) کا انتخاب، پھر وہاں پہنچ کر دست بستہ بالاب قیام، دائیں بائیں دیکھنے، بات چیت کرنے کھانے پینے حتیٰ کہ بلا وجہ کھانسنے اور نظر اٹھا کر دیکھنے

کی ممانعت، پھر بذریعہ وکیل درخواست کی پیشی، پھر بالادب سلام کر کے رخصت ہوتا ہے۔ اسکی طاقت و قوت اور حکومت کے ماننے کا مظہر ہے، اسی طرح زکوٰۃ پر غور کریں کہ غلام کی طرح اپنی کمائی دوسرے کے حوالہ کر دیتا، سرکاری ٹیکس وصول کرنے والے کو حتی الامکان راضی کر کے واپس کرنا، وہ جو لینا چاہیں بے چوں چراں کو دیدیتا، یہ سب عبدیت کا مظہر ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر غور کرو تو محبت کا پہلا زینہ کم گفتن، کم گفتن، کم خوردن ہی ہوتا ہے، حصول محبت میں کھانا پینا چھوڑ دے، راتوں کو ایک جگہ جمع ہو کر اس کے کلام کو سنے، جس سے مردہ و جس بھی تڑپ اٹھتی ہیں، اگر ایک ہلکی ٹرینگ سے اس کے رنگ و منگ، طور و طریق میں کچھ عاشقانہ انداز پیدا ہوا ہے تو اب اس کو دوسرا قدم اٹھانا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ جب کھانے پینے سونے جاگنے اور دنیا کی دوسری لذتوں میں اس کے لئے کوئی لذت باقی نہیں رہی تو اس کو اب کوئے یار کی ہوا کھانی چاہئے، جہاں زیب و زینت، ترک و احتشام کی ضرورت نہیں، بلکہ سراسر عجز و انکساری، شکستہ و اشکبار حال زار، ہر ہنہ پاؤں غرض سر پا دیولتہ و عاشقانہ انداز میں ایسے مکان میں حاضری دیتا ہے جس کا مکین کوئی نہیں، مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی کے حسن و جمال کی کرنیں اس کے ہر ہر پتھر سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں، ایسے دل کش نظارہ کے موقع پر وہی فرض ادا کرنا پڑتا ہے، جو مجنوں نے دیارِ لیلیٰ کو دیکھ کر ادا کیا تھا، اسی کا نام طواف ہے، صوم و حج کے اسی ربط کی وجہ سے ماہ رمضان کے بعد حج کے لیام آتے ہیں۔

غرض ہر کانِ خسہ میں ایمان قبول کر لینے کے بعد یہ چارہ رکھن ہیں جو مقصود عبدیت اطاعت و محبت کا مظہر اتم اور اکمل درجہ میں ہے، اس لئے ان کو رکھن کی حیثیت دی گئی واللہ اعلم،

یہیں سے ان روایات کی ترتیب بھی معقول سمجھ میں آتی ہے جس میں صوم مقدم ہے حج پر، چونکہ صوم کا تعلق تخلیہ سے ہے اور حج کا تعلق تحلیہ سے، یعنی صوم کا مقصد یہ ہے کہ اکل و شرب سے جو رذائل پیدا ہوتے ہیں، وہ صوم سے دور ہوں، اور حج کا مقصد بیت اللہ کی زیارت سے نفس کو مزین کرنا اور ظاہر ہے کہ پہلے میل کیل دور کیا جاتا ہے پھر قلمی ہوتی ہے، پھر رنگ جزو حلیا جاتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ پہلے صوم ہو پھر حج آئے۔

”طاعلی قدسی فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس روایت میں صراحتاً پانچ ہی چیزوں کا تذکرہ ہے مگر درحقیقت دیگر ایمانی اجزاء کو کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ خیمہ میں چھوٹی چھوٹی کھوٹیاں ہوتی ہیں، اسی طرح ارکانِ خسہ کے علاوہ گرامعال ہیں، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے ایک جہازہ میں شرکت کے موقع پر فرزندِ شاعر سے فرمایا، کہ ما احدثت لهذا المقام، تو نے اس مقام کے لئے کیا تیاری کی ہے تو اس نے کہا شهادة ان لا اله الا الله، تو حضرت حسن نے فرمایا لهذا العمود غایین الاطناب؟، طاعلی قاری لکھتے ہیں کہ بطور تشبیہ اسلام کو خیمہ سے تشبیہ دی جو چار ستون، اور ایک درمیانی عمود پر قائم ہو، اس میں اشارہ ہے کہ اگر چاروں ستون گر جائیں پھر درمیانی عمود باقی رہے تو خیمہ بالکل ختم نہیں ہوگا، اسی طرح اگر ارکانِ اربعہ چھوٹ گئے، مگر درمیانی رکنِ شہادتین باقی ہے تو نفس اسلام و ایمان باقی رہے گا اور یہی اگر گریا تو ایمان کا نام و نشان ہی باقی نہ رہ سکے گا، غرض بنی الاسلام میں الاسلام سے مراد اسلام کامل ہے۔“ (مرقات)

یوحده الله: ”کلہ ایمان کے دو جزو ہیں اقرارِ توحید، اور اقرارِ رسالت مگر اس روایت میں صرف ایک جزو مذکور ہے دوسرے جزو کا تذکرہ نہیں، جبکہ دونوں آپس میں متلازم ہیں، توحید بغیر رسالت کے اور رسالت بغیر توحید کے نجات کا

ذریعہ نہیں بن سکتی، تو یہاں ایسا کیوں؟

جواب :- یہاں اسی طرح اختصار ہے جس طرح کلمہ ایمان من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة میں اختصار ہے، جبکہ مراد دونوں ہے گویا کلمہ کے دو جز میں سے ایک جزء بولی کر کل مرو ہے۔

(۲) یا پھر یہ کہا جائے کہ رلوی نے اختصار لیا لیسانا چھوڑ دیا ہو لوریہ تو جہہ اس لئے کہ بعض طرق میں مسلم کے دونوں جزء موجود ہیں۔

سوال :- یہاں یہ بات بھی محل نظر ہے کہ حدیث جبریل میں ایمان بالانبیاء والملائکہ کا بھی تذکرہ ہے، لیکن یہاں صرف توحید کا تذکرہ ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

علامہ عثمانیؒ نے اس کا دو جواب نقل فرمایا ہے: (۱) توحید و شہادت سے مراد تصدیق الرسول فیما جاء بہ ہے لہذا اس میں تمام بنیادی عقائد آگئے۔

(۲) کلمہ توحید تسمیۃ الكل باسم الجزء کے قبیل سے ہے جیسا کہ کوئی کہتا ہے قرأت الحمد، تو اس سے مراد پوری سورۃ فاتحہ ہوتی ہے ہکذا لھنا، "م (۵)۔

اقام الصلوۃ: "اقام اصل میں اقوام تھا وہ حذف کر دیا گیا، مگر اشکال یہ ہوا کہ صرفی قاعدہ کے مطابق جب و حذف ہو تو اس کا عوض ضرور لایا جاتا ہے تو پھر "تا" کو اخیر میں کیوں نہیں لایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حذف کے عوض میں لانا ضروری ہے مگر تا ہی لانا ضروری نہیں، یہاں اقوام اضافت کے ساتھ مستعمل ہے اور یہ اضافت ہی تا کے قائم مقام ہے، اسکی بنا پر ماہرین صرف کا کہنا ہے اقوام بغیر اضافت کے استعمال کرنا صحیح نہیں۔"

### لفظ اقامت کی حکمت

قرآن ہو یا حدیث، جہاں بھی نماز کا حکم ہے یا نمازیوں کی مدح کی گئی ہے وہاں اقامت یا اسکے ہم معنی لفظ استعمال کیا گیا ہے، بطور حکم صلوا یا بطور مدح مصلی، کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، ہاں جہاں مذمت بیان کی گئی ہے وہاں لفظ اقامت یا اسکے ہم معنی لفظ سے بالکل احتراز کیا گیا ہے، اور صرف مصلین کہا گیا جیسا کہ سورۃ فاعلون میں ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ مطلقاً نماز پڑھنا محمود و مطلوب نہیں بلکہ مطلوب یہ ہے کہ خشوع و خضوع آداب و سنن اور پابندی کیساتھ لوائجائے، "م

ایتاء الزکوۃ: "لفظ ایتاء استعمال کرنے میں اس طرف حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ زکوۃ میں تملیک ضروری ہے مراد یہاں یہ ہے کہ زکوۃ کی لوائجی کیلئے قانون شریعت کے مطابق دینا مطلوب ہے۔

صوم کا مفہوم گزر چکا ہے۔

سوال :- اس روایت میں جہاد کا تذکرہ نہیں، جبکہ اس کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا؟

اسکے چند جوابات ہیں: ابن بطلال نے لکھا ہے کہ یہ روایت ابتدائہ اسلام کی ہے اور جہاد کی فرضیت سے پہلے کی ہے اس لئے جہاد کا ذکر نہیں، حافظ ابن حجرؒ نے اس جواب کو خطا پر محمول کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جہاد کی فرضیت تو غزوہ بدر سے پہلے



ہوئی جبکہ واقعہ بدر ۲؎ رمضان میں ہوا، اور اسی سال صوم و زکوٰۃ کی فریضت ہو چکی تھی، اور حج تو اس کے بہت بعد، تو جب حج کا تذکرہ موجود ہے تو یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ روایت فریضت جہاد سے پہلے کی ہے۔ (۱) بہتر اور بے غبار جواب یہ ہے کہ دراصل یہاں فرائض عینہ کا بیان ہے جبکہ جہاد فرض کفایہ ہے، اس لئے جہاد کو رکھیں، مزید یہ کہ ارکان خمسہ وہ اعمال ہیں جو دائمی ہیں، اور یہ تو حالات و واقعات پر وجود میں آتے ہیں، م

### حج اور صوم کی تقدیم و تاخیر میں ابن عمرؓ کے کلام کی تحقیق

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے روایت بیان کرتے ہوئے جب صوم و رمضان کو حج سے مقدم بیان کیا تو حاضرین میں سے کسی نے ٹوک دیا کہ ترتیب میں حج کو صوم و رمضان سے پہلے آنا چاہئے، اس پر حضرت ابن عمرؓ نے اس کے ترتیب کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ میری ترتیب یعنی صوم کا تذکرہ پہلے ہے، وہ صحیح ہے، پھر بطور تائید فرمایا **هكذا سمعته من رسول الله ﷺ**۔ یہاں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بخاری شریف (ص ۶) میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہی روایت اسی سند کے ساتھ مذکور ہے جس میں حج صوم سے مقدم ہے، بلکہ یہی روایت سعد بن عبیدہ اور محمد بن زید سے خود مسلم ہی میں منقول ہے، جس میں حج صوم سے مقدم ہے، البتہ حضرت حظلہ کی روایت سے پہلی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دونوں طریقے اصولی محدثین کے مطابق صحیح ہیں تو پھر حضرت ابن عمرؓ نے اس شخص کی تردید کیوں کی؟ اور اگر تردید صحیح ہے تو پھر دو طرق کیوں منقول ہیں؟ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مرتبہ سنا ہے؟

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بخاری شریف کی روایت روایت بالمعنی ہے، اور مسلم شریف کی روایت اصل ہے، کیونکہ اس کی روایت میں سماع کی تصریح ہے اور حضرت حظلہ کی روایت بھی اس کی موافقت میں ہے لہذا بخاری کی روایت کو نقل بالمعنی کہنے میں کوئی حرج نہیں، حافظ ابن حجرؒ کا یہ جواب قاعدہ کی رو سے صحیح ہے۔ (۱)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں روایت صحیح ہیں کسی کو اصل اور کسی کو روایت بالمعنی کہنے کی ضرورت نہیں، دراصل حضرت ابن عمرؓ سائل کے بے جا سوال پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طرح ارشاد فرمایا کبھی حج کو صوم پر مقدم فرمایا، کبھی حج پر صوم کو، تو پھر تم کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ کسی کو غلط کہہ دینا خلاف احتیاط ہے لہذا اس توجیہ کے پیش نظر **هكذا سمعته** کے معنی ”اسی طرح سنا ہے“ سے کرنا مناسب نہ ہو گا بلکہ یہ معنی ہو گا کہ میں نے اس طرح بھی سنا ہے، اس کی نظیر وہ واقعہ ہے کہ جب حضرت حزام بن عکنم سورہ فراقان کی تلاوت حضرت عمرؓ کے علم کے خلاف کر رہے تھے تو نماز سے فراغت کے بعد حضرت عمرؓ کی گردن میں چادر ڈال کر درانداز میں لے گئے اور عرض کیا کہ یہ قرآن غلط پڑھتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو، پھر حضرت حزام سے قرآن سنا، تو انہوں نے اسی طرح سنایا، جس طرح پہلے سنایا تھا تو آپ نے فرمایا **هكذا أنزلت** پھر حضرت عمرؓ سے سنا تو انہوں نے اپنے علم کے مطابق پڑھا تو اس پر بھی آپ نے فرمایا **هكذا أنزلت**، امام نوویؒ نے دوسری وجہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ جس وقت اس شخص نے اعتراض کیا تھا اس وقت ممکن ہے حضرت ابن عمرؓ

کو دوسری روایت ذہن میں محفوظ رہی ہو،

### تقدیم و تاخیر کی عقلی وجہ

عبادت کی دو قسمیں ہیں وجودی، اور ترکی۔ پھر وجودی کی دو قسمیں ہیں فعلی، قوی، پھر فعلی کی دو قسمیں بدنی، مالی۔ حدیث میں صوم کے علاوہ تمام عبادتیں وجودی ہیں اسلئے پہلے تمام وجودی عبادتوں کو ایک جگہ ذکر فرمایا اور اس میں بھی حج کو بعد میں ذکر کیا کیونکہ باقی تمام عبادتوں کا خود ہی ادا کرنا ضروری ہے، جبکہ حج میں نیابت بھی چل جاتی ہے، اور صوم کو سب سے آخر میں ذکر کیا، کہ وہ ترکی ہے اور اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ صوم کی فرضیت مقدم ہے کیونکہ ۲۔ میں ہوئی اور حج کی فرضیت ۶۔ میں، تو اس لحاظ سے صوم کی تقدیم مناسب ہے، نیز یہ وجہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تکلف ہر بالغ ہے، جبکہ حج ہر شخص پر نہیں، نیز روزہ ہر سال فرض جبکہ حج عمر میں ایک بار، اس لحاظ سے روزہ عام ہوا جس کا تقاضا ہے کہ اس کو پہلے ذکر کیا جائے۔

❦ حدیث ❦ حَدَّثَنَا ابْنُ عُيَيْنٍ ..... أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ لَا تَقْرَؤُا النَّحْ (مسلم ص ۳۲)

ترجمہ | حضرت عبد اللہ بن عمر سے کسی نے سوال کیا کہ آپ جہاد میں شرکت کیوں نہیں کرتے؟ تو اس پر انہوں نے حدیث رسول پڑھ کر سنائی، مقصد ان کا یہ تھا کہ جہاد کوئی رکن اسلام اور فرض عین تو ہے نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے جب کچھ لوگ اس میں مشغول ہیں تو باقی لوگوں سے یہ فریضہ ساقط ہے۔ دوسرا جواب: حضرت عبد اللہ بن عمر کو جس جنگ میں شرکت کی دعوت دی جا رہی تھی وہ حضرت عبد اللہ بن زبیر کی خلافت سے متعلق ہونے والا معرکہ تھا (۱) حضرت ابن عمر کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کا مقصد فتنہ دور کرنا ہے جو مشرکین سے ہوا کرتا ہے اور یہاں تم مسلمانوں سے جنگ کی دعوت دے رہے ہو، اس سے فتنہ اور بڑھتا ہے، معلوم ہوا کہ عبد اللہ بن عمر کے جواب کا تعلق مشرکین سے جہاد کے متعلق تھا ہی نہیں، اس کی وجہ خود دوسری جگہ موجود ہے، بخاری شریف میں حدیث ہے

عن نافع أن رجلاً أتى ابن عمر، فقال يا أبا عبد الرحمن، ما حملك أن تحج عاماً وتعتز علماً؟ وتترك الجهاد في سبيل الله، وقد علمت ما رغب الله فيه، قال يا ابن أخي بُغِيَ الإسلامُ على خُصَمٍ، إيمان بالله ورسوله والصلوة الخس، وصيام رمضان وإداء الزكوة وحج البيت، قال يا أبا عبد الرحمن ألا تسمع؟ ما نكر الله في كتابه "وَأِنْ طَلَفْتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا" (ال) امر الله وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونُ فِتْنَةٌ، قال. فعلنا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان الإسلام قليلاً، فكان الرجل يفتن في دينه إما قتلوه وإما يعذبوه حتى كثر الإسلام فلم تكن فتنة، (۵)

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمر کے جواب کا مقصد یہ نہیں تھا کہ جہاد فرض عین نہیں ہے جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ جہاد دراصل کفار سے جنگ فتنہ ختم کرنے کے لئے ہوتا ہے اور جو آیت حدیث میں مذکور ہے اس کا بھی مصداق یہی جنگ ہے۔

## باب الامر بالايمان بالله ورسوله وشرائع الدين والدعاء اليه والسؤال عنه وحفظه وتبليغه من لم يبلغه

اللہ رسول اور دینی احکام پر ایمان لانے کا حکم کرنا، اور اس کی طرف لوگوں کو بلانا، دینی باتیں پوچھنا اس کو یاد رکھنا اور دوسروں کو یہ پوچھنا جن تک دین نہیں پہنچ سکا،

﴿حَدِيثُ﴾ حَدَّثَنَا خَلْفُ بْنُ هِشَامٍ ..... عَنْ أَبِي جَنْدَرَةَ عَنْ أَبِي عُبَيْسٍ قَالَ: قَدِمَ وَفَدَ عَبْدُ الْقَيْسِ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَنَا هَذَا الْحَيُّ مِنْ رِبِيعَةٍ وَقَدْ حَالَتْ تَبِينُنَا وَبَيْنَكَ كُفَارٌ مُضَرٌّ وَلَا نَخْلُصُ إِلَيْكَ إِلَّا فِي شَهْرِ الْحَرَامِ فَتُرْنَا بِأَمْرٍ نَعْتَلُ بِهِ وَنَدْعُو إِلَيْهِ مِنْ وَرَاءِ نَاءٍ، قَالَ أَمَرَكُمْ بِأَرْبَعٍ وَأَنْهَيْكُمْ عَنْ أَرْبَعٍ الْإِيمَانَ بِاللَّهِ ثُمَّ فَسَّرَهَا لَهُمْ، فَقَالَ: شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَاةَ الزَّكَاةَ وَأَنْ تَوَدَّوْا خُمْسَ مَا غَنِمْتُمْ وَأَنْهَيْكُمْ عَنِ اللَّبَاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالنَّقِيرِ وَالْمُقْبِرِ وَزَادَ خَلْفٌ فِي رَوَايَتِهِ: شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَعَقْدَ وَاحِدَةً، (۱)

ترجمہ | حضرت ابو جندہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عبد القیس کا قافلہ آیا اور کہنا کہ رسول اللہ ہم لوگ قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر حاکم ہیں، ہم لوگ ہمر حرام کے علاوہ اور مہینوں میں آ نہیں سکتے، اس لئے ہم کو ایسی باتیں بتادیں کہ ہم اس پر عامل ہو جائیں اور جو لوگ یہاں نہیں آسکے ہیں ان کو ہم دعوت دیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم لوگوں کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں اور چار باتوں سے منع کرتا ہوں، ایمان باللہ کا حکم دیتا ہوں، اور پھر اس کی تفسیر ان لوگوں کو بتاتے ہوئے فرمایا ایمان باللہ، اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول خدا ہونے کی شہادت دیتا ہے، نماز کو دیتا، اور غنیمت میں سے پانچواں حصہ لے کرنا، اور میں تم کو ذبائہ، حنتم، نقیر اور مقبر سے منع کرتا ہوں، حضرت خلف نے اپنی روایت میں اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ شہادۃ ان لا اله الا الله پر آپ نے ایک انگلی بند کر لی۔

### مقصد باب

گزشتہ ابواب سے جب ارکان اسلامی کی اہمیت، حقیقت اور فائدہ ظاہر ہو گیا اور چونکہ یہ باتیں ایمان کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہیں ایمان کے بغیر کوئی عمل بھی قابل قبول نہیں ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ایمان لانے کے بعد مومن دوسروں کو بھی ایمان باللہ و بالرسول، اور تمام اسلامی اعمال کا حکم کرے، اور لوگوں کو ان باتوں کی دعوت دے اور دین کی باتوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے واقف کاروں سے پوچھتا رہے اور معلوم کر کے ان کو اچھی طرح محفوظ رکھے اور جو لوگ ان چیزوں سے ناواقف ہیں ان کو معلوم کرنا چاہئے، جیسا کہ وفد عبد القیس کے سوال کا جواب عنایت فرما کر ان باتوں کو محفوظ رکھنے، دوسروں تک پہنچانے کی تاکید کی گئی ہے۔

## حضرت ابن عباسؓ کی نگاہ میں حضرت ابو جمرہ کا مقام

”حضرت ابو جمرہ کا نام نصر بن عمران بن عصام ہے، قبیلہ نضج سے انکا تعلق ہے، اور یہ قبیلہ نضج، عبد القیس کی ایک شاخ ہے انکی وفات مقام سرخس میں ہوئی مورخین کا خیال ہے کہ (۱۲۸ھ میں یا اس کے قریب انکا انتقال ہوا۔ (۱)

ابام بخاریؓ نے اس روایت کی ابتداء میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو جمرہ کو اپنے تخت پر بٹھایا کرتے تھے، ان سے ایک دفعہ یہ فرمایا کہ یہیں میرے پاس رہو، تاکہ اپنے مال میں سے تم کو کچھ حصہ دوں، شامین نے اس موقع پر اس پہلو پر یہ گفتگو کی ہے کہ حضرت ابو جمرہ کی کس خصوصیت کی بنا پر حضرت ابن عباسؓ کی نگاہ میں ان کا یہ مقام بنا؟

(۱) بعض شامین کا خیال ہے کہ صحابہ کرام میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ یہ دونوں حضرات علاقائی لوگوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے، جس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح خانہ کعبہ پوزے سال عمرہ کرنے والوں سے آباد رہے، حضرت ابو جمرہ نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا، تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا ان کو بہت ملال اور افسوس ہوا اسی حالت میں حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا تو حضرت ابن عباسؓ نے اجازت دیدی، جب رات میں حضرت ابو جمرہ سوئے تو خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے ”حج مبرور و عمرہ مقبلة“ حضرت ابو جمرہ نے یہ خواب حضرت ابن عباسؓ کو سنایا، تو بہت خوش ہوئے اور فرماتے لگے ”اصبت سنة النبي“ چونکہ اس خواب سے ان کے مسلک کی تائید ہو گئی اور حضرت ابو جمرہ کے صلاح و تقویٰ کا حال معلوم ہو گیا، اسلئے ان کا خاص اکرام کرنے لگے، اور کچھ رقم اعزاز میں دینے کی خواہش ظاہر کی اس اکرام کے بارے میں خود ان کے شاگرد حضرت شعبہ نے سوال کیا لِمَ؟ فقال للرويا التي رايتها، (۲) معلوم ہوا کہ اس خصوصی اعزاز و اکرام کی وجہ وہ خواب تھا۔

(۲) بعض حضرات نے دوسری علت یہ لکھی ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں حضرت ابن عباسؓ کو بصرہ کا گورنر منتخب کیا گیا اور بصرہ چونکہ فارس کی سرحد پر واقع ہے اس لئے فارسی لوگ بھی مقدمات لیکر آیا کرتے تھے، حضرت ابو جمرہ فارسی زبان کے ماہر تھے، اس لئے ترجمان کی حیثیت سے اپنے پاس بٹھاتے تھے، جیسا کہ خود مسلم کی روایت میں ان کے الفاظ ہیں: كنت اترجم بين يدي ابن عباس وبين الناس، (۳) گویا جو لوگ عربی نہیں جانتے تھے ان کو فارسی میں سمجھاتے اور خود حضرت ابن عباسؓ کو ان کی باتیں عربی میں بتاتے تھے۔

(۳) حضرت ابن عباسؓ کے حعلق خیال کیا جاتا ہے کہ نسب ان کی آواز پست تھی جبکہ حضرت ابو جمرہ کی آواز بلند تھی اس لئے حضرت ابن عباسؓ اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کے لئے انکو پاس بٹھاتے تھے،

(۴) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ کم فہم ہوتے ان کو سمجھاتے تھے، تاہم حضرت ابن عباسؓ کی نگاہ میں ان کے اعزاز و اکرام کا اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خواب کی بنا پر یہ مقام ملا، رہا ترجمانی یا افہام و تفہیم تو یہ کوئی ایسی امتیازی شئی نہیں کہ اتنے اکرام کا سبب قرار دیا جائے۔“

## شان و درود

قبولہ وفد: ”خود مسلم شریف میں اسکی صراحت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ابو جمرہ کو وفد عبد القیس کا واقعہ

اس لئے خلیفہ ایک عورت نے ابن عباسؓ سے منکھ میں فیذ بنانے کا حکم پوچھا تو اس سے منع کر دیا، اس پر ابو جمرہؓ نے کہا کہ ہم لوگ تو اپنے دیار میں اس قسم کے فیذ کا استعمال کرتے ہیں جو بڑا شیریں اور ہاضم ہوتا ہے، اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ایسا مت کرنا اگرچہ شہد سے زیادہ شیریں کیوں نہ ہو اور اس کی دلیل میں وفد عبد القیس کا قصہ سنایا، چونکہ ابو جمرہؓ کا تعلق بھی عبد القیس سے تھا، اور وفد عبد القیس کو اس قسم کی فیذ بنانے سے منع کر دیا گیا تھا، اس مناسبت سے ان کو یہ حدیث سنائی، حضرت ابن عباسؓ کو یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ ممانعت منسوخ ہو چکی ہے، اور اجازت دیدی گئی ہے۔ تم وفد عبد القیس کے آئے کا سبب

بحرین میں اسلام مقلد بن حیان کے ذریعہ پہنچا، والدہ اس طرح پیش آیا کہ مقلد بن حیان بحرین کے بڑے تاجروں میں تھے، ان کی تجارت مدینہ تک پہنچی ہوئی تھی، مدینہ میں کپڑے لیکر تجارت کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ گزرتے ہوئے تشریف لائے تو یہ اکرام میں کھڑے ہو گئے آپ نے ان پر شفقت فرمائی، ان کے اور ان کی قوم کے حالات سرداروں کے نام بنام اتنی تفصیل سے پوچھے کہ حضرت مقلد کو بھی حیرت ہونے لگی، کہ نہ آپ کبھی تشریف لے گئے اور نہ ملاقات ہوئی پھر آپ کو تفصیلی حالات کیسے معلوم ہو گئے؟ وہ بہت حائر ہوئے آپ نے ان کے خسر جو اس طلاق کے سردار تھے ان کے بارے میں پوچھا کہ سردار قوم منذر بن عائد جن کا مشہور نام شح ہے، ان کا کیا حال ہے، پھر آپ نے ان کو دعوت اسلام دی وہ مشرف باسلام ہو گئے، پھر سورہ فاتحہ سورہ اقرہ کی تعلیم حاصل کی جب وطن جانے لگے تو اس قبیلہ کے سردار کے نام خط لکھوا کر آپ نے ان کو عنایت فرمایا مگر وطن پہنچتے ہی انہوں نے اپنا اسلام ظاہر نہیں کیا، بلکہ ایمان چھپاتے رہے، نماز کا وقت ہوتا تو گھر میں نماز پڑھ لیتے ان کی بیوی نے اپنے والد منذر بن عائد سے ذکر کیا، کہ اس بار مدینہ سے جب مقلد لوٹ کر آئے ہیں تو ان کا حال ہی بدلا ہوا ہے مخصوص وقت میں ہاتھ پاؤں چہرہ دھوتے ہیں اور قبلہ رو ہو کر کبھی کھڑے ہوتے، کبھی جھکتے، کبھی زمین پر گر جاتے ہیں، خسر نے دلاو سے پوچھا کہ یہ کیا نئی بات ہے تو انہوں نے پورا واقعہ سنایا، اور یہ بھی کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا حال خصوصیت سے دریافت فرمایا تھا، اب کیا تھا؟ مقلد بحرین میں اگر کوئی شخص پہلا مسلمان ہونے والا تھا تو وہ دلاو کے ہاتھ پر خسر تھا، اس کے بعد انہوں نے اپنے خسر کو وہ خط دیا جو آپ نے ارسال فرمایا تھا، پھر منذر بن عائد اس نامہ مبارک کو لیکر دوسرے سردار کے پاس گئے اور انہیں پڑھ کر سنایا، تو وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے اور دربار رسالت مآب میں حاضری کا دلواہ کیا۔ جب بحرین اسلامی فضا سے منور ہو اور وہ نورانی قافلہ وہاں سے رخت سربانہ عہد تو لاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کو یہ مژدہ سنایا "اتلکم وفد عبد القیس خیر اهل المشرق

وفیہم الاشج العثری غیر ناکثین ولا مبطلین ولا متایین اذ لم یسلم قوم حتی وتروا" (نوری ص ۲۲)

"زرقانی نے شرح مواہب میں بیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پاس ابھی ایک قافلہ آنے والا ہے، جو اہل مشرق میں سب سے بہتر ہے، حضرت عمرؓ ان کو دیکھنے کیلئے کھڑے ہوئے، تو انہیں تیرہ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر آیا، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بشارت سنائی پھر ان کیساتھ ساتھ آپ کی خدمت میں آئے جب ان لوگوں نے آپ کو دور سے دیکھا تو بے تاب ہو کر فرط اشتیاق میں اپنا سامان اسی طرح چھوڑ کر

دیوانہ وار آپ کی خدمت میں دوڑ پڑے، فرما اشتیاق میں آپ کا دست مبارک چومنے لگے، لیکن عبد القیس جو ان کے سردار تھے گرچہ نو عمر تھے، سب سے پیچھے رہ گئے انہوں نے سب سے پہلے لوگوں کے لوٹ باندھا پھر اپنا لباس سڑا تار کر دوسرا سفید لباس پہنا، پھر باطمینان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ کے دست مبارک کو بوسہ دیا یہ قدرے بد شکل تھے، جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف آنکھ اٹھائی تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آدمی کی قیمت صرف اس کے اُحانچے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کی قدر و قیمت اس کے صرف دو چھوٹے اعضاء سے ہوتی ہے زبان، دل، آپ نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ اور رسول پسند کرتے ہیں دلائلی اور بردہاری، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ خصلتیں مجھ میں پیدا کئی ہیں یا میں نے اپنے کسب سے حاصل کی ہیں؟ فرمایا پیدا کئی ہیں۔ تم

یہ وفد کب آیا؟

”یہ وفد آپ کی خدمت میں دوبار حاضر ہوا ایک مرتبہ فتح مکہ سے پہلے ۶ یا اس سے قبل، اس وفد میں کل حیرہ یا حیرہ افراد شامل تھے، دوسری وفد کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ۹ میں آیا لیکن یہ بات روایت کے الفاظ اور تاریخ کے خلاف معلوم ہوتی ہے، کیونکہ روایت میں تصریح ہے کہ قبیلہ ”مضر جو ہمارے نزدیک کے درمیان آباد ہیں ان سے ہم کو خوف ہے، تو جب ۹ میں مکہ فتح ہو چکا اور قبائل جو درجہ جو درجہ مسلمان ہونے لگے تو اس وقت ۹ میں کفار مضر کا خوف ہوئی نہیں سکے، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ اس سے پہلے آیا ہو، یعنی ۸ میں تاہم ممکن ہے کہ فتح مکہ کی روایت سے پہلے پہلے اس بات کے تحت جو واقعہ ہے وہاں ۸ کا ہے۔“

وفد کی تعداد اور ان کے اسمائے گرامی

منذر بن جاندہ، مہدی بن حسان، حریذ بن مالک، عمرو بن مرحوم، حارث بن شعیب، عبیدہ بن حاتم، جرث بن جندب، صحابہ بن عباس، عجم بن قیس، رستم عہدی، جویریہ عہدی، ذراع بن عامر، ابو خیرہ صباہی، مطر، لنگے بھانجے، سرح سعدی، جابر بن خث، خزیمہ بن عبد بن عمر، حاتم بن ربیعہ، جلدیہ بن جابر، نوح بن قلفہ (۱۰) بعض روایات سے ان لوگوں کی مجموعی تعداد چالیس، اور بعض سے حیرہ اور بعض سے چودہ معلوم ہوتی ہے، اس اختلاف تعداد کو دو مرتبہ کی آمد پر محمول کر لیا جائے مایہ کہ تیرہ دوسرا حصہ اور باقی ان کے ماتحت، اور جن روایتوں میں تیرہ اور چودہ کا اختلاف ہے اس میں تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ حیرہ ایک سواری پر سوار تھے، اور دو ایک سواری پر، تو سواری کے لحاظ سے حیرہ ہوئے، اور مجموعی تعداد چودہ ہوئی۔

حافظ ابن حجر اور علامہ مہدی نے اس وفد کے اسماء کو تفصیل سے بیان کیا ہے اخیر میں فیض کرتے ہیں کہ اس وفد کی تعداد کے بارے میں کوئی روایت ثابت نہیں ماسی بنا پر شیخین نے عدد صحیح کی کسی روایت کو نقل نہیں کیا ہے۔ (۱۱) قوله لا نخلص اليك الا في شهر الحرام الخ: لکھنے کا منشا یہ تھا کہ ہمیں مجبوری ہے کہ ہمارے نہیں آسکتے اسلئے ہمیں دو لوگ بالکل واضح الفاظ میں امور اسلام بتایا جائے تاکہ ابہام نہ ہو کہ دوسروں کو قتل کرنے میں دشواری پیش آئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اشہر حج چار ہیں ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب تو پھر شہر کو واحد کیوں ذکر کیا گیا؟ جمع ہونا چاہئے تھا؟

جواب :- شہر حرام سے مراد یہاں رجب کا مہینہ ہے، کیونکہ قبیلہ مضر ماورجب کا حد سے زیادہ لحاظ کیا کرتے تھے، اور اس میں کبھی تقدیم و تاخیر نہیں کرتے تھے، اس کے برخلاف اپنی اغراض نفسانی کے لئے بقیہ تین مہینوں میں تقدیم و تاخیر کر لیا کرتے تھے، اس لئے جن لوگوں کی قبیلہ مضر سے جنگ ہوئی وہ اسی ماہ میں سفر کرتے اسی بنا پر خاص ماورجب کے پیش نظر واحد کا لفظ استعمال کیا گیا، (۲) بخاری شریف میں شہر الف لام کے ساتھ ہے الف لام جنسی مان لیں تو چونکہ جنس کا اطلاق کثیر و قلیل دونوں پر برابر ہے لہذا چاروں مہینے اس میں شامل ہوں گے۔ (۱)

### اجمال و تفصیل میں فرق

فامرہم باربع: اشکال یہ ہے کہ اجمال میں چار چیزوں کا تذکرہ ہے جبکہ تفصیل میں پانچ چیزیں مذکور ہیں، شہاد تین، نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس۔ تو اس اجمال و تفصیل میں مطابقت کیوں نہیں؟ اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں،

(۱) فامرہم باربع کے تقاضا کے مطابق چار چیزوں ہی کا تذکرہ تھا لیکن چونکہ ان لوگوں کا کفار مضر سے اکثر مقابلہ ہوتا رہتا، اور عموماً جنگ میں مالی غنیمت حاصل ہوتی ہے، اس لئے ایک ضمنی بات خمس بتادی گئی، خمس کے ان چار امور سے خارج ہونے اور ضمنی و علیحدہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ لاءوا الخمس کا طرز بیان ماقبل سے بدلا ہوا ہے، لہذا و ان تعطوا من المغنم الخمس کا عطف زکوٰۃ پر نہیں بلکہ فامرہم پر ہوگا، اور تقدیر عبارت یوں ہوگی فامرہم باربع و امرہم ان تعطوا من المغنم الخمس۔

علامہ قرطبی کا خیال ہے کہ اصل مقصود تو بیان اجمال ہے، جو شہاد تین کے بعد چار مذکور ہیں، رہا شہاد تین کا تذکرہ تو یہ حرم کے طور پر ہے۔ لیکن حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نے اشکال کیا ہے کہ مسلم شریف میں روایت میں شہادۃ ان لا الہ الا اللہ و عقد واحد (۱) کہ شہاد تین کو ذکر کرتے ہوئے ایک انگل دو بانی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاد تین ان مامورات میں شامل ہے، لہذا امور اربعہ سے خارج کرنا، اور ضمناً تمبر کھانا صحیح نہیں۔ (۲)

(۳) ابن عربی فرماتے ہیں کہ خمس کوئی الگ چیز نہیں بلکہ زکوٰۃ میں داخل ہے اور زکوٰۃ کی تفصیل ہے کہ ایک زکوٰۃ وہ ہے جو ہر وقت وصول کی جاتی ہے اور ایک وہ ہے جو گاہے گاہے واجب ہوتی ہے، مگر یہ شبہ نہ ہو کہ جب زکوٰۃ میں داخل ہے تو پھر تفصیل کی حاجت کیوں پڑی؟ وجہ یہ ہے کہ وہ حضرات نو مسلم تھے اور مجاہد تھے، خمس سے واقف نہ تھے اس لئے بالاستقلال خمس کی تفصیل کر دی گئی۔

(۴) ممکن ہے کہ نماز روزہ کو ایک شکر کیا گیا ہو، کیونکہ قرآن کریم میں بہت سارے مقامات پر دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے (۵) قاضی بیضاوی نے شرح مصابیح میں یہ جواب دیا ہے کہ دراصل ان چار میں سے صرف ایک ہی کا تذکرہ ہے یعنی شہاد تین، اور بقیہ مذکورہ چیزیں اسی شہاد تین کے اجزاء ہیں تو بقیہ تین کون ہیں؟ فرماتے ہیں بقیہ تین یا تو ربوی نے نسیا بلایا وجہ

اختصار ترک کر دیا، لیکن ان کی یہ رائے اس وقت درست ہوتی جبکہ کسی بھی ایک روایت میں ان تین چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہو جو نکتے قول کے مطابق رولوی نے ترک کر دیا ہو حالانکہ کسی روایت میں تذکرہ نہیں اس لئے نسیان و اختصار کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

(۶) یہاں دراصل عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے، اصل عبارت یوں ہے امرہم بالایمان باللہ وحدۃ و امرہم باریع اقام الصلوٰۃ، چنانچہ امام بخاری نے الادب المفرد میں جو روایت نقل کی ہے اس میں یہی ہے۔ (الادب المفرد)  
(۷) دراصل مامور بہ ایمان بنا ہے، پھر اس کے بعد چار چیزوں سے منع کیا گیا، لہذا اس مناسبت سے ایمان جو مقصود ہے اس کو بھی اجزاء اربعہ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، خمس کے لحاظ سے چار تعبیر کر دیا، کیونکہ مامور بہ اور منعی عنہ کے اہل میں موافقت کرنا بھی عسنت بدھ میں شامل ہے۔ (۸)

### حج ذکر نہ کرنے کی وجہ

اس روایت میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ایمان باللہ کی شرح میں حج کا ذکر نہیں، حالانکہ وہ بھی اسلام کا ایک اہم رکن ہے، اس کے کئی وجوہات شارحین نے بیان فرمائے ہیں:

(۱) بعض کا خیال ہے کہ بعض روایت میں مثلاً بیعتی کی سنن کبریٰ کے کتاب الحیام میں اس روایت میں اختلاو اضافہ ہے و تحجوا البیت الحرام، مگر حافظ ابن حجر نے اس کو شاذ کہا ہے کیونکہ بخاری، مسلم، نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان میں سے کسی نے اس جملہ کو ذکر نہیں کیا ہے، جس میں حج کا ذکر ہے، اس کی سند میں ایک رولوی ابو قلابہ ہیں، جن کا حافضہ اخیر عمر میں خراب ہو گیا تھا، ممکن ہے یہ روایت اسی زمانہ کی ہو (۲) مگر مسند احمد میں دنف عبد القیس کے قصہ میں حج کا تذکرہ موجود ہے (۳) تو اگر حج کے ذکر کو محفوظان لیا جائے تو پھر چار سے مراد شہادتین اور نولہ خمس کو چھوڑ کر متعین کرنا ہوگا۔

(۲) قاضی میاض کے بقول حج کے ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دنف عبد القیس کی آمد کے وقت تک حج فرض نہیں ہوا تھا، ان کا خیال ہے کہ یہ دنف ۸۷ھ میں فتح مکہ سے پہلے آیا تھا، واقعہ کا بھی یہی خیال ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ پھر تو حج کا ذکر ہونا چاہئے، کیونکہ اس قول کے مطابق ۶۷ھ میں حج فرض ہوا (۴) لیکن قاضی میاض کا رجحان یہ ہے کہ حج ۹ھ میں فرض ہوا۔

(۳) بعض کا خیال ہے کہ حج کا ذکر اس لئے نہیں کہ وہ فی الفور واجب نہیں، بلکہ اس میں تاخیر کی گنجائش ہے، لیکن یہ خیال بھی صحیح نہیں، کیونکہ علی التراخی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کا مامورات میں تذکرہ ہی نہ کیا جائے،

(۴) ایک قول یہ بھی ہے کہ بمقتلے شہرت اس کا ذکر نہیں کیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جن صحابہ کے سامنے آپ نے حج کا تذکرہ کیا ہے ان کے نزدیک حج دنف عبد القیس سے بھی زیادہ مشہور تھا، پھر ان کے سامنے بھی تذکرہ کی ضرورت نہیں تھی،

(۵) بعض کا خیال یہ ہے کہ کفار مضر سے چونکہ ان لوگوں کی جنگ رہتی تھی اور راستہ مامون نہیں تھا اس لئے ان لوگوں پر حج فرض نہیں تھا، لیکن یہ توجہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر اس وقت حج نہیں کر سکتے تھے، مگر مستقبل میں قورستہ مامون ہونے کا امکان تھا اس لئے فرائض کے تذکرہ میں حج کا تذکرہ بھی آنا چاہئے، نیز حج اشہر حرم میں ہوتا ہے اور ان



لوگوں کے بیان میں اس کی وضاحت ہے کہ اشہر حرم میں جگہ کا امکان نہیں۔

(۶) سب سے عمدہ اور بے غبار جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بعض لوازم کی خبر دی نہ کہ کل مامورات کی کیونکہ انہوں نے اپنے سوال میں اس کی تصریح کر دی کہ ایسے احوال کی تلقین فرمائیں، جن کو کرنے کے بعد جنت میں داخل ہو جائے، تو جس طرح منہیات میں صرف چند چیزوں کا تذکرہ کیا گیا حالانکہ منہیات کل یہی نہیں ہیں، بلکہ بہت سے منکرات اس سے بھی زیادہ اہم ہیں جیسے زنا وغیرہ اسی طرح یہاں بھی چند مامورات مذکور ہیں، غرض مقصود چند مامورات اور چند منہیات کی اطلاع دینی ہے کل کا احصاء مقصود نہیں۔

نہاہم عن اربع: بخاری شریف کی روایت میں وسئلوه عن الاشربة ہے، اسی طرح مسلم میں ماذا یصلح لنا من الاشربة ہے، ان دونوں سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوال کا منشا یہ تھا کہ کس قسم کی نبیذ اور مشروب استعمال کی جاسکتی ہے؟

لیکن جواب میں شروب نہیں بلکہ مطروف کا حکم مذکور ہے، لہذا اگر سوال مشروب کے بارے میں تھا تو سوال و جواب میں مطابقت معلوم نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ وفد عبدالقیسؓ کا ہے، جبکہ اس سے قبل شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ ان کے سوال کا منشا مطروف کا حکم معلوم کرنا تھا اس لئے الفاظ سوال اگرچہ شروب کے متعلق بظاہر معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کا منشا مطروف تھا اس لئے جواب مطابق سوال ہوا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیذ حنتم، نبیذ دباء، سے منع کیا تھا جیسا کہ مسلم کی روایت میں انہلکم عما ینبذ فی الدباء الخ سے محسوس ہوتا ہے۔

عن الحنتم: معنی شراب کا گھڑا، اکثر و بیشتر شراب سبز رنگ کے مشکوں میں بنتی تھی، اس لئے اس کی تفسیر الحزۃ الخضراء سے کرتے ہیں، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ دو مکے سبز رنگ کے ساتھ ہی خاص اور مختصر نہیں، بلکہ مٹی کا ہر وہ برتن جس میں کوئی ایسی چیز لگا دی جائے جس سے اس کے مسامات بند ہو جائیں اس کو حنتم کہتے ہیں۔  
الدباء: کدو کے اس برتن کو کہتے ہیں کہ کدو کو اس کے پودے پر ہی خشک کر لیا جائے پھر اندر سے خشک گودا نکال کر برتن جیسا بنالیا جائے اس کو توڑا بھی کہتے ہیں۔

النقیق: اسکی تفسیر خود مسلم شریف (ص ۳۶) میں الجذع ینقر وسطہ سے آئی ہے، نقیق، نقر سے بنا ہے، نقر کے معنی کھودنے کے ہیں، یہاں نقیق بمعنی منقور ہے لہذا اقصیٰ ہر کھودی ہوئی چیز کو کہہ سکتے ہیں، مگر عرب میں ایک خاص قسم کے برتن کو کہتے ہیں، کجور کے درخت کی جڑ کو کھود کر پیالہ سا بنالیتے ہیں اسے نقیق کہا جاتا ہے۔

المزفت یا المقیق: روایت میں المزفت، اور کسی روایت میں المقیق کا تذکرہ آیا ہے۔

مزفت: زفت سے بنا ہے اور مقیق قار سے، قار کو قیر بھی کہتے ہیں، بہر حال مزفت اور مقیق دونوں ایک ہی شے کے دو نام ہیں، عموماً اس کا معنی رال سے کرتے ہیں یہ کسی درخت کا عصا ہوتا ہے جو ایران میں ہوتا ہے اور لکھا ہے کہ اسی سے کشتی اور جہاز کی پالش کی جاتی ہے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ ترجمہ غلط ہے بلکہ یہ ایک قسم کا جل ہے جو زمین سے

نکاح ہے جیسے تار کول اسی طرح کی کوئی اور چیز ہے۔ (نیش ابھی میں ۱۵/۱۱)  
**ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کیوں؟**

(۱) ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ برتن موٹے ہوتے ہیں ان کے مسلات کھلے نہیں ہوتے بلکہ بند ہوتے ہیں اور مسلات کے بند ہونے کی وجہ سے نشہ جلد پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے ممکن تھا کہ نشہ جلد پیدا ہو جائے، اور پھر نہ چلے، اور غفلت میں اس کا استعمال ہو جائے، اس کے برخلاف چڑے کا مشغیزہ کہ اس میں بال کے مسلات ہوتے ہیں اس میں ہو سکتا ہے کہ اس لئے اس میں نشہ جلد پیدا نہیں ہوتا، اس بنا پر ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا گیا،

(۲) یہ برتن چونکہ شراب کے لئے مخصوص تھے، جب شراب حرام ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ ان کے برتنوں کے استعمال پر بھی پابندی لگا دی گئی، یہ اس لئے کہ ان برتنوں میں شراب کے اثرات اب بھی باقی تھے، لہذا جو چیز اس میں رکھی جائے گی وہ بھی ناپاک و نجس ہو جائے گی لیکن یہ جواب کمزور ہے۔

(۳) خصوصیت کے ساتھ شراب پینے والے ان برتنوں کا استعمال کرتے تھے اسلئے انکی مشابہت سے بچنے کیلئے منع کیا گیا،

(۴) یا اس لئے منع کیا گیا کہ ابتدائی دور میں برتنوں کو دیکھ کر شراب یاد آ جاتی تھی، تو ممکن تھا کہ یہ برتن ذریعہ شراب نوشی نہ بن جائے۔

(۵) لیکن سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ جب کسی چیز کی عادت رگ و پے میں رچ بس جاتی ہے، اور پھر ایسی عادت سے روکنا مقصود ہوتا ہے تو حرمت کے ساتھ، اس میں سختی اور تشدد اختیار کیا جاتا ہے، کہ دلوں میں نفرت پیدا ہو جائے جیسا کہ کتوں سے محبت و دلچسپی زیادہ تھی جب اس سے روکا گیا تو اس میں تشدد اور سختی کا انداز اختیار کیا گیا، کہ کتوں کو قتل کر دیا جائے، تاکہ پوری نفرت پیدا ہو جائے، جب نفرت پیدا ہو گئی تو قتل سے روک دیا گیا، اسی طرح شراب کی عادت ان کی گھلیوں میں رچی بسی تھی، اس لئے جب شراب حرام کی گئی تو تشدد سے کام لیا گیا، حتیٰ کہ ان برتنوں سے بھی منع کر دیا گیا، جن میں شراب استعمال ہوتی تھی، لیکن جب مقصد حاصل ہو گیا تو پھر ایسے برتن کے استعمال کی اجازت دیدی گئی، مسلم شریف میں ہے

كُنْتَ نَهَيْتُمْ عَنِ الْإِنْتِزَاجِ فِي الْأَوَانِي الْأَسْقِيَةِ فَانْتَبِذُوا فِي كُلِّ وَعَلٍ وَلَا تَشْرَبُوا مَسْكُورًا

اختلافی مسئلہ | احناف و شوافع کے نزدیک مذکورہ حدیث کے پیش نظر ان برتنوں کی ممانعت کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، جبکہ حنابلہ اور مالکیہ کا خیال ہے کہ اس کی ممانعت کا حکم باقی ہے ان حضرات کا استدلال حدیث

باب ہے کہ جب حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی روایت سنائی، معلوم ہوا کہ منسوخ نہیں بلکہ حکم باقی ہے، لیکن احناف اور شوافع کہتے ہیں کہ اس ممانعت کے نسخہ کا علم حضرت ابن عباسؓ کو نہ ہوسکا، اس بنا پر انہوں نے یہ روایت سنائی جیسا کہ مسلم کی روایت گزری۔

◆◆◆◆◆

❦ حدیث ❦ حدثنا ابو بکر بن ابی شیبہ ..... عن ابی حمزۃ قال: کُنْتُ أُنَرِّجُمُ بَيْنَ

يَدَيِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ بَيْنَ النَّاسِ فَلَتَنَتْنِي امْرَأَةٌ تَسْأَلُهُ عَنْ نَبِيذِ الْجَزِّ فَقَالَ: إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ أَتَوْا

النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ الْوَفْدُ أَوْ مِنَ الْقَوْمِ قَلُّوا

ربیعة: قَالَ: مرحباً بالقوم أو بالوفد، غير خزايا ولا ندامي، قال: فقال يا رسول الله انا نأتيك من شقة بعيدة وإن بيننا وبينك هذا الحى من كفار مضر، وإننا لا نستطيع أن نأتيك إلا فى الشهر الحرام فنحن بائس فصل نخبر من قدائقنا وندخل به الجنة قال فأمروهم بأربع ونهاهم عن أربع، قال: أمروهم بالإيمان بالله وحده وقال تدرؤن ما الإيمان بالله وحده؟ قالوا الله ورسوله اعلم، قال: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله وإقام الصلوة وإيتاء الزكاة وصوم رمضان وأن تؤدوا خمساً من الثمن، ونهاهم عن الذبيل والخنثى والمزفت، قال: شعبه ورؤيتنا قال النقيز وقال احفظوا وأخبروا به من ورائكم قال أبو بكر فى رواية من ورائكم وليس فى رواية النقيز،

حضرت ابو جرہ سے روایت ہے کہ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور لوگوں کے درمیان ترجمانی کا کام کرتا تھا، ترجمہ | اسی اثنا میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک عورت حلقہ کی بنید کے بارے میں مسئلہ دریافت کرنے آئی تو عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ وفد عبد القیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا، تو آپ نے دریافت فرمایا کہ کس جماعت سے تمہارا تعلق ہے؟ ان لوگوں نے جواباً کہا کہ قبیلہ ربیعہ سے، آپ نے ان کو خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ نہ تم رسوا ہو گے اور نہ پشیمان، رلوی کا بیان ہے کہ ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ہم لوگ دور دراز مسافت طے کر کے آپ کی خدمت میں آ رہے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان کفار معتر کا قبیلہ حائل ہے، اور ہم لوگ صرف اس شہر حرام ہی میں آپ کی خدمت میں آ سکتے ہیں لہذا آپ ہم کو کوئی مفصل بات بتادیں تاکہ ہمارے جو لوگ نہیں آ سکے ہیں ہم ان کو بتادیں اور وہ کام کر کے ہم جنت میں داخل ہو جائیں، رلوی کا کہنا ہے کہ آپ نے ان کو چار باتوں کا حکم فرمایا اور ہی کہتے ہیں کہ آپ نے صرف خدا پر ایمان لانے کا حکم دیا، اور دریافت فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ایمان باللہ وحدہ کیا چیز ہے؟ ان لوگوں نے کہا اللہ ورسولہ اعلم، آپ نے فرمایا اللہ کی وحدانیت اور محمدؐ کی رسالت کی شہادت دینا اور نماز پورے حقوق و آداب کے ساتھ ادا کرنا، زکوٰۃ دینا رمضان کا روزہ رکھنا اور غنیمت کے مال میں سے پانچواں حصہ دینا، اور پھر ان کو چار چیزوں سے روکا، ہڈ، حتم، حرت، سے حضرت شعبہ کہتے ہیں کہ کبھی مقیر کا لفظ فرمایا اور پھر حضرت شعبہ ہی کہتے ہیں کہ کبھی مقیر کہا، اور آپ نے فرمایا کہ ان باتوں کو یاد کر لو، اور جو لوگ یہاں نہیں آ سکے ہیں ان کو بتادو اور رلوی حدیث ابو بکر نے من ورائکم کہا اور ان کی روایت میں مقیر کا لفظ نہیں۔

قالوا ربیعة: "ای نحن ربیعة، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وفد عبد القیس نے اپنا تعارف اس انداز میں کر لیا کہ ہم لوگ قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتے ہیں، حالانکہ مختصر جواب یہ تھا کہ ہم قبیلہ عبد القیس کے لوگ ہیں، لیکن چونکہ عبد القیس بڑے قبیلہ ربیعہ کی شاخ ہے اور یہ قبیلہ مشہور تھا اس لئے مشہور نام سے تعارف کر لیا۔" تم

لفظ مرحبا کی تحقیق | مہمان کی آمد پر اس کے اعزاز و اہرام اور اس سے اجنبیت دور کرنے کے لئے کہا جاتا ہے، سب سے پہلے سیف بن یزید نے یہ لفظ کہا تھا..... یہ رجب سے ماخوذ ہے اسکے معنی وسعت کے ہیں یہاں عامل محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے "صادقت رجباً" گویا میزبان مہمان سے یہ کہتا ہے کہ مجھے آپ کی آمد پر خوشی ہے اور میرے دل میں آپ کے لئے وسعت ہے آپ وسیع اور آرام دہ جگہ تشریف لائے،

غیر خزایا ولا ندائی: خزایا: خزی سے بنا ہے، یعنی رسوائی، اور یہ خزیان کی جمع ہے۔ ندائی، ندمان کی جمع ہے مگر یہاں ندمان کی جمع ماننا درست نہیں کیونکہ ندان کے معنی مجلس شراب کے مصاحب کے ہیں، وہ یہاں مریو نہیں اور اگر ندائی کو نام کی جمع مان لیں تو معنی درست ہو جائے گا، لیکن سوال یہ پیدا ہو گا کہ ندامت سے نام کی جمع نامون آتی ہے، جیسا کہ نسائی شریف میں لیس خزایا ولا النادمین، ہے تو پھر نام کی جمع ندائی ماننا کیونکر صحیح ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کلام عرب میں تحمیں کلام کیلئے علی سبیل الاجماع خلاف قیاس جمع لائی جاتی ہے، جیسے العشایا والغدایا کہا جاتا ہے، حالانکہ غدا کی جمع غداوات آتی ہے، لیکن عشایا کی مناسبت سے علی سبیل الاجماع خلاف قیاس جمع لے آئے، اسی طرح کہتے ہیں "لادیت، ولا تلیت" حالانکہ تلوت ہونا چاہئے، غرض تحمیں کلام کے پیش نظر خلاف قیاس الفاظ استعمال ہوتے ہیں، لہذا اگرچہ یہاں نادمین ہونا چاہئے مگر ما قبل کی مناسبت سے ندائی کہہ دیا گیا، یہ جواب مشہور قول پر مبنی ہے۔

مگر علامہ نوویؒ نے جوہری کی صحاح اور تزار کی جامع المفہ کے حوالہ سے یہی لکھا ہے کہ نام اور ندمان دونوں شرمندگی کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں، تو اس صورت میں ندائی خلاف قیاس نہیں بلکہ قاعدہ کے مطابق ندمان کی جمع ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ نام اور ندمان دونوں پشیمان کے معنی میں آتے ہیں، جیسا کہ انجم الوسیط میں بھی ہے، لہذا نہ کوئی سوال وارد ہوتا ہے اور نہ کسی جواب کی ضرورت ہے،

اس جملہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ تم لوگ مسلمان ہو کر آئے ہو اس لئے نہ تو تم کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑے اور نہ کسی قسم کی شرمندگی پیش آئی،

قوله شقة: شین پر ضمہ اور کسر دونوں ہو سکتا ہے البتہ زیادہ فصیح ضمہ ہے، اور قرآن میں ضمہ کے ساتھ ہی ہے دور دراز مسافت کے معنی میں ہے اس لئے کہ مشقت کا باعث ہوتا ہے۔

فصل: یعنی واضح بیان جس سے مریو واضح کرنے میں کسی طرح کی دشواری نہ ہو،

نزار ابن معد کا انوکھا انداز تقسیم

ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ نزار ابن معد کے چار لڑکے تھے، معمر، ربیعہ، یلاد، انمار، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے اپنا مال و دولت وغیرہ ان چاروں لڑکے میں تقسیم کیا، اور ایک انوکھا طرز تقسیم اپنایا، پہلے انہوں نے لڑکوں کو بلایا اور کہا کہ جو سرخ ٹوپی ہے، یا اس قسم کا مال ہو وہ معمر کا ہے، اور کالی گدڑی اور جو اسکے مشابہ مال ہو، وہ ربیعہ کا ہے، اور یہ نوکر وغیرہ اور جو اس کے مشابہ ہو یا د کیلئے ہے، اور یہ تمہلی اور نشست گا انمار کے لئے ہے، اس طرح تقسیم کے بعد انہوں نے وصیت کی کہ اگر میرے مرنے کے بعد کسی قسم کی پیچیدگی ہو تو جھگڑا نمٹانے کے لئے تم لوگ فوراً انصی شاہ نجران کے پاس جا کر فیصلہ کر لینا، چنانچہ جب شیخ نزار کا انتقال ہوا اور ان لوگوں میں اختلاف ہوا تو مقدمہ لیکر انصی شاہ نجران کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنا اختلافی مسئلہ پیش کیا، تو انصی نے جواب دیا کہ جو مال سرخ ٹوپی کے قبیل سے ہو وہ معمر کا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے حصہ میں دانیہ اور اونٹ وغیرہ ہوں گے کیونکہ دینار سرخ ہوتے ہیں اور کچھ لونٹ بھی سرخ ہوتے ہیں، وہ مال جو کالی گدڑی یا اس کے مشابہ ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ درگ جانور، مال اور گھوڑے وغیرہ بھی ربیعہ کے حصہ میں آئیں گے،

کیونکہ بعض گھوڑے کالے بھی ہوتے ہیں، اور جمال غلام کے ہم محل ہو اور تمہارا خادم چونکہ کچھڑی بالوں جیسا ہے اس لئے اس کا مطلب یہ ہے کہ مونشی جانور اور چنگوڑے گھوڑے لادو کے حصے میں جائیں گے، اسی طرح انصی نے انمار کیلئے دراہم اور زمیں وغیرہ کا فیصلہ کیا یہ فیصلہ سن کر سب مطمئن ہو کر انصی کے پاس سے چلے گئے، لام کیلٹی نے لکھا ہے کہ ربیعہ اور معمر دونوں مسلمان ہو گئے تھے، چونکہ سرخ مال، معمر کو ملا تھا اس لئے اس کو معمر الحمرہ بھی کہتے ہیں۔ (۱)

### سردار قوم کی درخصلت

حدثني عبيد الله ابن معاذ ..... الى قوله وقال رسول الله ﷺ للأشج، اشج عبد القيس، (۲)  
 "اشج" ان کو اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان کے چہرے پر خراش تھا، ان کا نام منذر بن عاذ تھا ان کے پردلو کا نام عصر تھا، اسی لئے ان کو راج عصری کہا جاتا ہے۔

اشج عبد القیس کو خطاب کر کے آپ نے فرمایا تمہارے اندر دو خصلت ہے جس کو اللہ پسند کرتا ہے، (۱) ایک تو آتے ہی انہوں نے غلٹ سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنی اور ساتھیوں کی سواری پہلے باندھی اور کپڑے وغیرہ بدل کر آپ کی خدمت میں پہنچے، (۲) دوسری بات، جب آپ سے گفتگو ہو چکی اور آپ دین کی ضروری باتیں بتا چکے تو آپ نے فرمایا کہ آؤ ہمارے ہاتھ پر بیعت ہو جاؤ، یہ بیعت تمہاری طرف سے اور تمہارے ان بھائیوں کی طرف سے ہوگی جو یہاں نہیں آ سکے، جماعت کے کبھی افراد اپنی طرف سے اور اپنے بھائیوں کی طرف سے بیعت ہو گئے، مگر اشج نے ازراہ ادب کہا کہ یا رسول اللہ ہم غیر کے کیسے ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ اپنی طرف سے تو ہم تیار ہیں مگر چونکہ آباء و اجداد کے دین کو چھوڑنا بہت دشوار ہے ممکن ہے کہ ہم ان کی طرف سے بیعت ہو جائیں اور وہ لوگ قبول نہ کریں اس لئے ہماری رائے یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی طرف سے بیعت کر لیں، اور جو نہیں آئے ہیں ان کو ہم تبلیغ کریں گے، اگر وہ مسلمان ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ان کا فیصلہ تمہارے کریں گے، اس پر آپ نے ان کی بہت تعریف فرمائی، اور ارشاد فرمایا کہ تمہارے اندر دو خصلت یعنی بردباری اور انجام بخیر پائی جاتی ہے۔

علم کے معنی: غم کو ضبط کرنا، آنا کے معنی معاملہ نہی، اور انجام پیش نظر رکھ کر قدم اٹھانے کو کہتے ہیں، اس پر انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ یہ صفت ہم میں کسی ہے یا خلق؟ تو آپ نے فرمایا کہ خلق، اس پر وہ شکر اٹھی، بجالائے۔

### حدیث ﴿ حدیثنا یحییٰ بن ایوب ..... ﴾ (ص ۳۵)

قالوا یا نبی اللہ ما علمک بالنقیص، جب آپ نے لوگوں کے سامنے ان برتنوں کا تذکرہ کیا جو ان کے یہاں رائج تھے تو ان لوگوں کو سن کر حیرت ہوئی، کہ جب آپ کبھی اس علاقہ میں تشریف نہیں لائے تو آپ کو معلوم کیونکر ہوا؟ اپنی حیرت کو دور کرنے کے لئے سوال کیا تو آپ نے اس کی تفسیر فرمادی کہ تھیر سے مراد وہ برتن جو درخت کی جڑ کو کھود کر بناتے ہو، پھر اس میں کچھ پانی ڈالتے ہو، جب اس میں جوش مارنا بند ہو جاتا ہے یعنی فیزد مسکرم بن جاتا ہے اور تھیر پی لیتے ہو تو تم ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہو، حتیٰ کہ اپنے بیگانہ کی تمیز نہیں ہوتی اور اپنے چچا زاد بھائی کو بھی قتل کر ڈالتے ہو، ہرادی کا بیان ہے کہ اس ارشاد کے بعد وفد کے ایک شخص جن کا نام جم تھا، اور جن کی پٹلی میں زخم کا خراش تھا، اور حیا

کی وجہ سے چھپائے ہوئے تھے انہوں نے پوچھا کہ پھر ہم کن برتنوں میں نبیذ پیا کریں؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ چڑے کے برتن میں جس کے منہ کو دھاگے سے باندھ دیا جاتا ہے، اس پر ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے دیار میں چوہے بہت پائے جاتے ہیں، اس لئے اندیشہ ہے کہ چوہے اس کو کاٹ دیں لہذا بوجہ مجبوری برتن کے استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمادیں تو آپ نے فرمایا کہ چوہے گرچہ کاٹ دیں مگر اسی میں نبیذ پتاؤ، دوسرے میں نہیں۔

اس سے ایک اصول نکلا کہ اگر ایک طرف دینی فائدہ ہو اور دوسری طرف دنیاوی فائدہ، تو دینی فائدہ کے لئے دنیاوی فائدہ کو قربان کیا جائے گا، چونکہ معاملہ ابتدہ کا تھا اور ابتدہ میں ختی برتی ہی جاتی ہے اس لئے اس عذر کو قبول نہیں کیا گیا۔  
**حل لغات:-** یلات بمعنى يلف الخيط، یعنی جس دھاگہ سے منہ بند کیا جائے۔ قطيعاء: ایک خاص قسم کی چھوٹی کجور جسکو شہریز کہا جاتا ہے۔ ادیم: دباغت دیا ہوا ٹھنڈا۔ جردان: بکسر الجیم وضما، جرد کی جمع ہے معنی چوہ۔  
**حدیث ۱۰۰۰** حدثني محمد بن بكار ..... قال عبد الرزاق قال انا ابن جريج قال اخبرني

ابوقزعة ان ابا نصره اخبره وحسنا اخبرهما،

شارحین نے مسلم شریف کی مذکورہ بالا سند کو مشکل ترین سند شمار کیا ہے، اور اس کی شرح میں بہت لوگوں سے غلطی بھی ہوئی ہے، سب سے عمدہ اور صحیح بات وہ ہے جس کو حافظ ابو موسیٰ اصفہانی نے ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ اس سند میں حسن سے مروی حسن بن مسلم بن یثاق ہیں، جو ابن جریج کے استاذ ہیں، ابو نصرہ نے اس حدیث کو ابو قزعة اور حسن بن مسلم سے بیان کیا ہے، (یعنی ابو قزعة اور حسن بن مسلم کے شاگرد ہیں) اور اسی بات کی تاکید کی غرض سے اخیر ہما لا کر مکرر ذکر کیا ہے، کیونکہ اخیر کا قائل ابو نصرہ اور ہما کا مرجع حسن اور ابو قزعة دونوں ہیں تو اخیر ہما کا مقصد بالکل وہی ہے جو "ان ابانصره اخبره وحسنا کا مقصد ہے، لہذا یہ ترکیب بالکل "ان زیدا جاءني وعمراً جاءني کی طرح ہوگی، عمر اور زید دونوں ان کا ام ہیں اس میں زید اور عمر دونوں کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اور اسی بات کو جاء انی میں دہرایا گیا ہے، "موکا" میم مضموم اور دو ساکن بغیر ہمزہ کے، "وکا" وہر سی جس سے مشکیزہ کا منہ باندھا جائے، "موکا" وہ مشکیزہ جس کا منہ باندھ دیا گیا ہو۔

## باب الدعاء الى الشهادتين وشرائع الاسلام

لوگوں کو شہادتین اور احکام اسلام کی طرف بلانے کا بیان

**حدیث ۱۰۰۱** حدثنا ابو بكر بن شيبه وابو كريب واسحاق بن ابراهيم جميعاً عن وكيع قال ابو بكر نا وكيع عن زكريا بن اسحاق، قال حدثني يحيى بن عبد الله بن صيفي عن ابي معبد عن ابن عباس عن معاذ بن جبل قال: ابو بكر وزبنا قال وكيع عن ابن عباس ان معاذاً قال بعثني رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: انك تأتي قوماً من اهل الكتاب فادعهم الى شهادة ان لا اله الا الله واتى رسول الله فانهم اطاعوا لذلك فاعلنهم ان الله افترض عليهم خمس صلوات في كل يوم وليلة فانهم اطاعوا لذلك فاعلنهم ان الله افترض عليهم صدقة تؤخذ من اغنيائهم فتوزل في فقرائهم، فانهم اطاعوا لذلك فاتيكم

وَكَذَٰلِكَ أَمَّا إِلَهُكُمْ ، وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهُ لَيَسَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللَّهِ حِجَابٌ، (۵)

ترجمہ | حضرت ابو عبد اللہ ابن عباسؓ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاذ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو یمن بھیجا، اور فرمایا تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں ان کو دعوت دینا کہ کوئی معبود نہیں سوائے خدا کے، اور میں اللہ کا رسول ہوں اگر وہ لوگ اس کو مان لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ نے شب و روز میں ان پر پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے، اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو ان کو بتانا کہ خداوند قدوس نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے مالداروں سے لیکر خود ان کے فقراء کو دیا جائے گا، اگر وہ لوگ اس کو مان لیں تو سنو (ان سے زکوٰۃ لینے میں) ان کے عہد مال کو لینے اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ بددعا اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا،

ما قبل سے ربط | ما قبل میں ارکان اسلام کا تذکرہ اور اس کی اہمیت کا بیان تھا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ خود اس کو معلوم کیا جائے، اور اگر کوئی معلوم کرنے نہ آ سکے تو ان تک پہنچا دی جائے امام مسلمؒ مزید ایک قدم آگے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ جہاں انہوں کو بتایا جائے وہیں کافروں کو بھی دعوت دی جائے، چنانچہ وفد عبدالقیس کی روایت میں مسلمانوں تک پہنچانے کا تذکرہ تھا اور اب حضرت معاذ کی حدیث باب میں غیر مسلم تک دعوت پہنچانے کا ذکر ہے، غیر مسلم کو اسلام نے دو طبقہ میں تقسیم کیا ہے (۱) اہل کتاب (۲) مشرکین، حدیث باب میں اہل کتاب کو دعوت دینے کا حکم ہے، اور اگلے باب میں مشرکین و کفار کو، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم شریف میں ابواب اس طرح مربوط و مرتب ہیں کہ گویا لکھنؤ پر دریا ہو۔

### نقل سند میں امام مسلمؒ کا احتیاط

امام مسلمؒ سند و متن دونوں میں بہت زیادہ احتیاط کا پہلو پیش نظر رکھتے ہیں، جس استاذ سے جن الفاظ میں سند و حدیث انہی الفاظ میں نقل کرتا، یا سند و متن میں ادنیٰ فرق ہو تو اس کا اظہار کرتا یہ ان کا امتیاز ہے، مذکورہ سند حدیث میں امام مسلمؒ کے تین استاذ ہیں، (۱) ابو بکر بن ابی شیبہ (۲) ابو کریب (۳) اسحاق ابن ابراہیم، امام مسلمؒ کے آخر الذکر دونوں استاذ نے سند الفاظ "عن ابن عباس عن معاذ بن جبل" یعنی حضرت معاذ سے بصیغہ "عن" نقل کیا ہے، اور اول الذکر حضرت ابو بکر بن ابی شیبہ نے "عن ابن عباس عن معاذ بن جبل" بصیغہ "عن" کے ساتھ روایت کی ہے، روایت قولہ بصیغہ "عن" ہوا، ان، جمہور کے نزدیک حدیث کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا دونوں ہی اتصال پر دلالت کرتے ہیں، تاہم کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان نقطہ نظر پر دلالت کرتا ہے، لہذا بصیغہ "عن" کی روایت مرسل کہلائے گی، گویا حضرت ابن عباسؓ کو حضرت معاذؓ سے یہ روایت کسی واسطہ سے پہنچی، تاہم چونکہ یہ مرسل صحابی ہے جو متصل کے حکم میں ہوتا ہے، اور سبھی کے نزدیک قابل حجت ہے، امام مسلمؒ نے اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے دونوں لفظ "عن"، "ان" کو ذکر فرمایا ہے۔

اس حدیث میں چند باتیں قابل ذکر ہیں: (۱) حضرت معاذ کو یمن کس سن میں حضور نے بھیجا؟ (۲) ان کو تنہا بھیجا کسی کے ساتھ؟

حضرت معاذ کی روانگی کے سلسلہ میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے، ابن جریر کا خیال ہے جہ ابوداع سے قبل ۱۰ھ میں (۱۱) مشہور مؤرخ وادی کا کہنا ہے کہ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ میں، ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ۱۰ھ ربيع الآخر میں (۱۱) ایک قول یہ بھی ہے کہ ۸ھ میں فتح مکہ کے سال روایت کیا (۱۲) تاہم اس اختلاف کے ساتھ مؤرخین و محدثین کا اجماع ہے کہ حضرت معاذ برابر یمن میں مقیم رہے، اور دو صدیقی میں مدینہ منورہ واپس تشریف لائے، بعد میں شام منتقل ہوئے، اور وہیں رحلت فرما گئے، حدیث باب کا اندازہ کچھ اس قسم کا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت معاذ کو آخری نصیحت فرما رہے ہوں۔

(ب) آپ نے ان کو تنہا بھیجا کسی کے ساتھ؟ اس سلسلہ میں مسلم شریف کی روایت سے تنہا جانے کا ثبوت ملتا ہے، اگر واقعہ یہی ہے کہ تنہا گئے تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ خبر واحد حجت ہے، لیکن صاحب تلمیح نے لکھا ہے (۱۳) کہ یہاں خبر واحد نہیں کیونکہ بعض روایت میں حضرت موسیٰ اشعری کی روانگی کا بھی تذکرہ ہے جیسا کہ روایت میں "بشرا ولا تنفرا، یسترا ولا تعسرا" کے الفاظ اس پر شاہد ہیں، بلکہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک یمن کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا تھا (۱) صنعاء (۲) کندہ (۳) حضر موت (۴) جند (۵) زبید، یمن کا صدر مقام جند تھا، حضرت معاذ اسی صدر مقام پر فائز کئے گئے، اور بقیہ چار علاقوں میں مندرجہ ذیل افراد مامور کئے گئے: حضرت خالد بن سعید صنعاء میں، حضرت مہاجب بن ابی امیہ کندہ میں، حضرت زیاد بن لبید حضر موت میں، حضرت موسیٰ اشعری زبید اور سائل میں، یہی وجہ ہے علامہ ابن عبد البر نے دعویٰ کیا ہے کہ پانچ افراد پر مشتمل یہ قافلہ تھا جو حضرت معاذ کی لہارت میں روانہ کیا گیا۔ (۵)

انک تاتنی قوماً من اهل الکتاب: "حضرت معاذ کی روانگی کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی وصیتیں اور ہدایتیں فرمائیں، مگر جب روانہ ہونے لگے اور سواری پر سوار ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشابہت فرمائی اس وقت کا منظر یہ تھا کہ حضرت معاذ سوار تھے، اور سرکار دو جہاں پیادہ پاؤں چل رہے تھے، اسی حالت میں آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا، منشاء یہ نہیں تھا کہ تمہارا سابقہ صرف اہل کتاب سے ہو گا بلکہ ان کی ذہن سازی مقصود تھی، کہ مشرکین کے دونوں طبقے تمہارے سامنے ہوں گے تاہم ان میں اہل کتاب بڑھی لکھی قوم ہے، مشرکین کے مقابلہ میں معلومات رکھتے ہیں ممکن ہے اعتراض بھی کریں اس لئے ان کو پورے غور و فکر اور علمی انداز میں دعوت دینا، اور ان کی علمی فہم کے معیار کے مطابق گفتگو کرنا۔" تم

### حج اور روزہ کا ذکر کیوں نہیں؟

حج اور روزہ اسلام کے دو اہم رکن ہیں، تو پھر حدیث باب میں اس کا ذکر کیوں نہیں محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں:

(۱) امام نووی کا خیال ہے کہ راوی نے سہواً انسیا یا چھوڑ دیا ہے، ورنہ حدیث میں ان دونوں کا ذکر تھا، لیکن یہ جواب کمزور ہے کیونکہ ایسی اہم چیز کے متروک ہونے کو لسیان پر محمول کریں تو راویوں سے اعتماد اٹھ جائے گا، اور ہر روایت میں سہو



و نسیان کا احتمال پیدا ہو تا رہے گا۔ (مسلم ص ۲۷) (۱)

(۲) حج اور روزہ دونوں ارکان اسلام میں شامل ہیں لیکن شریعت نے نماز اور زکوٰۃ کو جتنی اہمیت دی ہے نسبتاً ان دونوں کو نہیں دی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جا بجا نماز اور زکوٰۃ کا ذکر زیادہ ہے نیز یہ بھی اس کی اہمیت کی علامت ہے کہ یہ ہر مکلف پر واجب ہونے کے بعد خود انجام دینا پڑتا ہے، اس میں فدیہ دینا نایاب سے سبکدوشی نہیں ہوتی (الائی وجہ خاص) برخلاف صوم و حج میں فدیہ یا نایاب قائم مقام ہو جاتی ہے،

(۳) حج کا تذکرہ اس لئے نہیں کہ حضرت معاذ کی بعثت کے وقت حج فرض نہ ہوا تھا، کیونکہ ایک قول کے مطابق حضرت معاذؓ ۸۰ میں گئے، جبکہ حج ۹۰ میں فرض ہوا، مگر یہ جواب اس وقت کمزور ہو جاتا ہے، جبکہ راجح قول ان کی روانگی کا ۱۰۰ کا ملتا ہے۔

(۴) شارح کا مقصود جہاں ارکان اسلام کی تعلیم دینا ہوتا ہے وہاں کبھی ارکان اسلام کو ذکر کرتے ہیں، جیسے حضرت عبد اللہ ابن عمر کی روایت میں "بنی الاسلام علی خمس" میں تمام ارکان مذکور ہیں، تاکہ تمام ارکان متحضر ہو جائیں، لیکن جہاں غیروں میں دعوت دینے کی بات آئی تو وہاں صرف تین کا ذکر کیا شہادتین، نماز اور زکوٰۃ، چنانچہ قرآن کریم نے "فان تابوا و اقاموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلہم" اس آیت میں صوم و حج کا تذکرہ نہیں، حالانکہ ان دونوں کی فرضیت کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہے، اسی طرح حدیث میں "أمرت ان یقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ و ان محمداً رسول اللہ و یقیموا الصلوٰۃ و یؤتوا الزکوٰۃ، فاذا فعلوا عصموا منی دماءہم، اس میں بھی صوم و حج کا تذکرہ نہیں، غرض جہاں بھی غیر مسلم کو دعوت اسلام کا طریقہ بتایا گیا وہاں صرف تین مذکور ہیں اسی اصول کے پیش نظر حدیث باب میں بھی تین ہی کا تذکرہ ہے۔

اس کی دو وجہ ہے (۱) اصولی طور پر ارکان اسلام تین طرح کے ہیں، قولی، فعلی، پھر فعلی کی دو قسم ہے، بدنی، اور مالی، شہادتین قولی رکن ہے، اور نماز فعلی بدنی رکن ہے، اور زکوٰۃ فعلی مالی کی مثال ہے، گویا نماز بول کر بدنی عبادت مراد ہے، لہذا روزہ جو بدنی عبادت ہے وہ اس میں خود بخور شامل ہو گیا، اسی طرح نماز اور زکوٰۃ جو بدنی اور مالی دور رکن ہے تو ان دونوں میں حج جو بدنی اور مالی دونوں کا مجموعہ ہے وہ اس میں اشارہ شامل ہو گیا، تو شہادتین اور نماز و روزہ انہیں اصول کی اہم مثال ہے، گویا تین رکن کے پردہ میں ساری شریعت کا تعارف کرا دیا گیا، دعوت و تبلیغ میں اس طریقہ کو اختیار کرنے میں دو حکمت ہے کہ اگر مذہب کے سامنے یکدم پوری فہرست رکھ دی جائے تو لمبی فہرست سے گھبرا نہیں گئے، اور دعوت موثر ہونے کے بجائے غیر موثر ہو جائے گی، دوسری وجہ یہ ہے کہ دراصل یہی تین کفار کیلئے گڑاں اور مشکل کام ہے، کیونکہ شہادتین کا اقرار گویا آپو و اجداد کے مذہب کے غلط ہونے کا اقرار کرنا ہے، اور یہ کہ وہ سب جہنمی ہیں، فطری طور پر یہ کہنا کچھ آسان نہیں، پھر دوسرا مشکل کام یہ کہ رات دن میں اپنے کام و کاج اور ضروریات کو چھوڑ کر پابندی کے ساتھ پنجگانہ نماز ادا کرنا پڑے گا، یہ بھی طبعی طور پر مشکل، تیسرا مشکل کام یہ کہ اپنی محنت اور پسینے کی کمائی میں غریبوں کا حق سمجھنا، غرض اگر دو لوگ ان تین اہم ارکان پر عمل پیرا ہو جائیں تو پھر دوسرے ارکان

اور اعمال کا منوانا بہت آسان ہوگا، اسی مصلحت کے پیش نظر حسب موقع دعوت میں صرف تین چیزوں کو ملحوظ رکھا گیا۔

(۵) حج اور روزہ کو ذکر کرنے کا پانچواں جواب یہ ہے کہ حدیث باب میں حضرت معاذ کو ارکان اسلام بتانا اور استیعاب کرنا مقصود نہ تھا کیونکہ حضرت معاذ تو اہل علم اور مجتہدین صحابہ میں شمار ہوتے ہیں، وہ اب تک ارکان اسلام سے بے خبر کیونکر ہو سکتے ہیں؟ بلکہ مقصود یہ تھا کہ ان کے سامنے شہادتین، نماز، زکوٰۃ، کو مرتب مربوط انداز میں ذکر کر کے درحقیقت ان کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں، کہ دعوت کا انداز حکیمانہ، وعظ و خطابت کا انداز، مشفقانہ اور بیان اعمال میں تدریجی پہلو ہو تو دعوت موثر ہوگی، اور اگر اوہام و خیالات کے عقیدہ مند قوم کے سامنے یکدم پوری فہرست رکھ دی تو ان کی سہولت پسند طبیعت گھبرا اٹھے گی اور مبادا دعوت کا رگرنہ ہو سکے گی، لہذا پہلے خدا کی وحدانیت اس طرح ثابت کرو، کہ ان کا دل و دماغ اُسے قبول کر لے اور جب وحدانیت رگ و پے میں سما جائے اور کلمہ توحید کا اقرار کر لے تو پھر میری رسالت کا اقرار کرنا، اس کے بعد انہیں باور کرو کہ جب وحدہ لا شریک نہ کی بادشاہت و حکومت کا دل و زبان سے اقرار کر لیا تو اس کی حکومت و عظمت کا اظہار عمل سے بھی کرو، کہ کبھی دست و بست کھڑے ہو جاؤ کبھی اس کی عظمت کے اظہار میں جھک جاؤ، کبھی نیاز جبین زمین پر ٹیک دو، اسی کا نام نماز ہے، جب عملی طور پر بھی اس کی حکومت کو مان لیا تو یہ یقین دلاؤ کہ تمہارے مال و متاع اور جان کا مالک و مختار وہی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسکی بارگاہ میں کچھ مان پیش کرو، اس سے مال کی محبت اور بخل دور ہوگا، ہاں خیال رہے کہ اس سے ظلم کرنا، مالدار کا مال بوزرنا مقصود نہیں، بلکہ تم سے لیکر تمہارے ہی غریب بھائیوں پر تقسیم ہوگا، غرض دعوت و تبلیغ کو موثر بنانے کا ایک نمونہ پیش فرمایا کہ انداز تبلیغ جتنا مرتب و مربوط اور تدریجی ہو گا اتنا ہی غیر مانوس افراد و کفار پر موثر ہوگا۔

دعوت کا یہ موثر انداز اور حکیمانہ اسلوب درحقیقت قرآن سے ماخوذ ہے،

(۱) ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ، وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، اس پہلو کی طرف حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی رہنمائی کی گئی قولاً له قولاً لیتنا لعلنا یتذکر او یخشی، (۲) اسی طرح خود حضرت معاذ اور حضرت موسیٰ اشعریؑ سے ارشاد فرمایا یسراء، ولا تعسرا بشراً ولا تنفرا،

ایمان کیلئے اقرار رسالت ضروری ہے؟

انہی رسول اللہ: اس دعوتی مضمون میں شہادتین کو لانے کا مقصود یہ ہے کہ ایمان کیلئے توحید کے ساتھ اقرار رسالت بھی ضروری ہے، اس کے بغیر مسلمان نہیں ہو سکتا، یہی جمہور کا مسلک ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ محض اقرار توحید سے مسلمان ہو جائے گا مگر اسکے بعد اقرار رسالت کا مطالبہ کیا جائے اگر اقرار کر لے تو فیہا و نعمت ورنہ مرتد متصور ہوگا، اس کا شرعاً اختلاف وہاں ظاہر ہوگا کہ جب عند الجمہور وہ کافر ہی ہے تو جزیہ دیکر رہائی دی جاسکتی ہے، لیکن ان کے بقول یا تو اقرار رسالت پر مجبور کیا جائے گا یا پھر حکم مرتد یعنی قتل کر دیا جائے، یہ جملہ جمہور کی متدل دموید ہے۔

کیا کفار فروع کے مخاطب ہیں؟

فان ہم اطاعوا لذلک فاعلمہم ان اللہ افترض علیہم الخ: کفار فردعات کے مخاطب ہیں یا نہیں؟

یہ عقائد کا اہم ترین مسئلہ ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ خالق کائنات نے چند باتوں کا مطالبہ بندوں سے کیا ہے، ایک ایمان

کا پھر اعمال کا باب اعمال تین طرح کے ہیں عبادت، معاملات، عقوبات، گویا پورا دین انہی چار باتوں کا مجموعہ ہے، امت کا اتفاق ہے کہ کفار مخاطب بالایمان بھی ہیں، اور مخاطب بالعقوبات والمعاملات بھی، البتہ عقوبات ومعاملات کے بعض مسائل میں مشکلی ہیں مثلاً ذی وہ الاسلام میں شراب پی لے تو حد جاری نہ ہوگی، کیونکہ للضعف لهم کلخل لنا، سے ان کے حق میں اجابت فراہم ہوتی ہے، اسی طرح ذی اگر آپس میں شراب یا خنزیر کی خرید و فروخت کا معاملہ کریں تو ان کیلئے جائز ہوگا، (۱) اسی طرح کافر نے بلاگواہی مقدمہ سے نکاح کر لیا، اور یہ لگے مذہب میں جائز تھا، تو عند الایمان مسلمان ہونے کے بعد تجدید نکاح کی حاجت نہیں، بلکہ سابقہ نکاح باقی رہے گا، (۲) غرض عقوبات، ہوں یا معاملات، (بعض مسائل کے علاوہ) ورنہ عام حالات میں مسلمان کی طرح کفار بھی ان کے مخاطب ہیں مثلاً چوری، زنا، وغیرہ پر حد شرعی کے مستحق ہوں گے، اسی طرح معاملات کے قوانین اور مسائل سود کے مخاطب ہیں جیسا کہ وفد نجران سے بوقت مصالحت تصریح کر دی گئی تھی کہ سودی کاروبار نہیں کر سکتے۔ پھر اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب کافر مشرف باسلام ہو جائے تو پچھلی نمازوں اور دیگر فرائض و واجبات کی قضا لازم نہ ہوگی، البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کفار حالت کفر میں نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ وغیرہ جیسے فرائض و واجبات کے مخاطب و مکلف ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں امام صاحب اور صاحبین سے کوئی صراحت نہیں ملتی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ علمائے احناف میں اس سلسلہ میں تین قول ہیں، علماء سمرقند اور مشائخ بلور و انہم کا خیال ہے کہ اعتقاد مخاطب ہیں اور وہ نہیں، لہذا بروز قیامت ان کو اعتقاد کی حیثیت سے عذاب ہوگا عدم ادائیگی کی وجہ سے نہیں۔

علماء عراقیین کفار کو اعتقاد اور دونوں وجہ سے مخاطب مانتے ہیں لہذا قیامت کے دن ان کو عبادت پر عدم اعتقاد اور عدم ادائیگی دونوں پر عذاب ہوگا۔

جبکہ حنفیہ ہی کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ کفار عبادات کے مخاطب ہی نہیں نہ تو ادنیٰ اور نہ ہی اعتقاد ان حضرات کے مسلک پر کفار کو عدم ایمان پر تو عذاب ہوگا، لیکن عبادت پر عدم اعتقاد اور عدم ادائیگی ان دونوں پر عذاب نہ ہوگا، علامہ شافعیؒ نے عراقیین کے قول کو ترجیح دی ہے اور بھی قول مالکیہ اور شافعیہ کا ہے، (۳)

**ان حضرات کے دلائل** | فویل للمشرکین الذین لایؤتون الزکوٰۃ، یہاں ویل و ہلاکت کی وعید زکوٰۃ کی عدم ادائیگی پر ہے، (۲) جب جنتی جہنمی سے پوچھیں گے ماسلکم فی سفر؟ کہ کس عمل نے جہنم میں پہنچایا؟ تو ان کا جواب ہوگا لم نك من المصلین ولم نك نطعم المسکین وکننا نخوض مع الخائضین، یعنی نماز نہ پڑھنے پر ہلاکت آئی، (۳) یا ایہا الناس اعبدوا ربکم، اس میں لفظ تاس عام ہے کفار و مؤمنین کو شامل ہے،

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ اعتقاد اور دونوں کے مکلف ہیں اور دونوں کے ترک پر عذاب ہوں گے، علماء سمرقند اور علمائے بلور و انہم نے اپنے مسلک پر اسی حدیث کے مذکورہ جملہ "فان هم اطاعوا الذلک الخ" سے استدلال کیا ہے کہ پہلے صرف ایمان کی دعوت دینے کو فرمایا، پھر اعمال کی دعوت، اور یہ دونوں ترتیب کے ساتھ مذکور ہیں اور دونوں کی ترتیب ان

شرطیہ کے ساتھ ہے، تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر مان لیں تو اعمال بتلائے، کیونکہ اعمال کے اب مکلف بن چکے اور اگر نہ مانیں تو پھر اعمال بتلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

لیکن خود احتلاف نے اس دلیل کی تردید کی ہے، کہ مضمون مختلف ہمارے یہاں معتبر نہیں، جبکہ یہ استدلال مضمون مختلف ہی پر مبنی ہے، نیز یہ استدلال اسلئے بھی کمزور ہے کہ حدیث باب میں، ترتیب دعوت تبلیغ میں ہے، کہ غیر مسلم کو دعوت مرتب انداز میں دیا جائے، پہلے توحید و رسالت پھر فرد و احکام کے متعلق بتلایا جائے، اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ وجوب میں بھی ترتیب ہو، جیسا کہ حدیث میں نماز اور زکوٰۃ کے درمیان ترتیب ہے اور شرط و جزاء کے ساتھ مذکور ہے، مگر اس کے باوجود وجوب کے اعتبار سے ان دونوں میں ترتیب ملحوظ نہیں، کیونکہ اگر نماز اولاد کی تو زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی، ہاں نماز زکوٰۃ کے ترتیب کی مقول وجہ یہ ہے کہ نماز اس لحاظ سے اہم ہے کہ ہر مکلف پر فرض ہے، ہر بار بار فرض ہوتی ہے، جبکہ زکوٰۃ صرف افسانہ پر وہ بھی سال میں ایک دفعہ اس اہمیت کی وجہ سے نماز کو مقدم کیا، اسی طرح چونکہ اعمال میں ایمان اہم ہے اسلئے اسکو مقدم کیا۔ ان کی طرف سے عقلی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اگر کفار فروعات کے مکلف ہیں تو پھر کافر اگر ان فروعات کو ادا کریں تو صحیح ہونا چاہئے، حالانکہ اس کا وہ عمل باطل ہے، لہذا مکلف بالفردوع ہونا بھی باطل ٹھہرے۔

**الزامی جواب** بالاتفاق جنبی فرض نماز کا مکلف ہے، تو اگر نفس مکلف ہونے سے یہ لازم ہو کہ لواٹنگی بھی صحیح ہو تو کہنا چاہئے کہ جنبی کی نماز حالت جنابت میں بھی صحیح ہو، حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں، جب نماز صحیح نہیں تو بقول آپ کے مکلف بنانا بھی صحیح نہ ہونا چاہئے، درحقیقت بات یہ ہے کہ ان فروعات کا صحیح ہونا موقوف ہے ایک شرط پر، جیسا کہ حدیث کی نماز موقوف ہے طہارت پر، صاحب بحر نے بھی عراقیوں کے قول کو ہی اختیار کیا ہے۔

### زکوٰۃ وصول کرنے کا حق کسکو؟

توخذ من اغنیائہم: اس جملہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے اور تقسیم کرنے کا حق امام وقت کو ہے، علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ دور نبوی اور حضرات شیعین کے زمانہ میں ہر قسم کے مال کی زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی، اس دور میں اموال ظاہرہ اور اموال باطنیہ کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ لیکن حضرت عثمان کے زمانہ میں فتوحات کا دروازہ کھلا، مال کی کثرت ہوئی، تو آپ کو خیال آیا کہ اگر ہر قسم کا مال سرکاری سطح پر وصول کیا جائے گے تو لوگوں کی دکان، مخصوص مکان وغیرہ کی تلاشیں لگتی پڑے گی، بلکہ ممکن ہے اس سے فتنے رونما ہوں تو آپ نے فرق پیدا کر دیا کہ اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ حکومت وصول کرے گی، اور اموال باطنیہ اپنے طور پر لوگ ادا کریں۔ (۱)

حضرت عثمان کے زمانہ میں اموال ظاہرہ میں صرف پیداوار اور جانور کو شامل کیا گیا، اس کے علاوہ سونا چاندی، سامان تجارت اموال باطنیہ میں شمار کیا گیا، لیکن جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور آیا تو انہوں نے اس مالی خجارت کو بھی اموال ظاہرہ میں شامل کیا، جو ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کیا جائے، غرض اسلام کا نظام زکوٰۃ یہ ہے کہ اموال ظاہرہ حکومتی سطح پر اور الاسلام میں وصول کیا جائے، لہذا اگر کوئی مالدار سپرد نہ کرے تو زبردستی اس سے وصول کی جائے، ہاں اموال باطنیہ

در اہم و دینار اپنے طور پر تقسیم کی جائے۔

فقر في فقرائهم: اس جملہ کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ جس شہر اور جس علاقہ کی زکوٰۃ ہو اسکو اسی علاقہ کے فقراء پر صرف کی جائے، دوسری جگہ نہ بھیجی جائے، اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ منتقل کرنا جائز نہیں، اگر منتقل کر دی تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، ولایہ کہ اس علاقہ میں کوئی مستحق زکوٰۃ نہ ہو، حضرت امام مالکؒ کے نزدیک بھی منتقل کرنا جائز نہیں، مگر منتقل کر دی تو ادا ہو جائے گی۔

احناف کے نزدیک زکوٰۃ صدقات کی منتقلی جائز ہے، تاہم افضل یہی ہے کہ ایک علاقہ کی زکوٰۃ بلا ضرورت دوسرے علاقہ میں منتقل نہ کی جائے، ہاں اگر دوسرے شہر کے فقراء کی ضرورت شدید ہو یا اپنے اعزہ اور اقرباء مستحق زکوٰۃ ہوں تو پھر منتقل کر سکتے ہیں، بلکہ دوسری شکل (اعزہ و اقرباء کیلئے) میں دوسرے اجر کی بشارت ہے۔ (۱)

حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کا استدلال اسی جملہ سے ہے لیکن علامہ بدر الدینؒ فرماتے ہیں کہ اس جملہ سے استدلال صحیح نہیں، کیونکہ یہ استدلال اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ فقرائہم میں ہم کامر جمع فقراء و بیلہ کو ٹھہرایا جائے، حالانکہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کامر جمع مسکین ہو، اور وہ عام ہے۔ (۲)

علامہ طبریؒ کہتے ہیں جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ مستحقین کی موجودگی میں اگرچہ دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے، لیکن اگر کوئی کر دے تو فرض ادا ہو جائے گا، صرف حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، کیونکہ ان کے زمانہ میں خراسان کی زکوٰۃ شام لائی گئی، تو انہوں نے خراسان واپس کر دی، لیکن ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ان کے اس فعل سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ جمہور کے خلاف تھے صحیح نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ خراسان کی زکوٰۃ دیں واپس کرنا عدل و انصاف کو ظاہر کرنے کے لئے ہو۔

### کیا غیر مسلموں کو زکوٰۃ، صدقہ فطر دیا جاسکتا ہے؟

ترد علی فقرائہم: اس جملہ سے اشارۃ النص کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ صرف مسلمان کو دی جاسکتی ہے، غیر مسلموں کو نہیں یہی جمہور کا مسلک ہے، صاحب بدایہؒ فرماتے ہیں کہ اگر حدیث معاذ نہیں ہوتی تو ہم ذمیوں کو زکوٰۃ دینے کی اجازت دیدیتے، جیسا کہ صدقات نافذہ ذمیوں کو دینا جائز ہے، مگر "فترۃ علی فقرائہم" سے معلوم ہوا کہ مستحق زکوٰۃ صرف فقرائہ مسکین ہی ہیں، امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ذمیوں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ (۳)

صدقہ فطر کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک صدقہ فطر بھی ذمیوں کو دے سکتے ہیں، اگرچہ افضل مسلمانوں کو دینا ہے، لیکن امام ابو یوسفؒ امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں دے سکتے۔

فایاک و کرائم اموالہم: کرائم، کریمۃ کی جمع ہے ناقۃ کریمۃ نفیس اونچی کو کہا جاتا ہے، یا نفیس اور عمدہ مال کے معنی میں ہے، ویسے اس کے اصل معنی کثیر الخیر اور کثیر المنفعت کے ہیں، یہاں مطلب یہ ہے کہ سائی کو چاہئے کہ زکوٰۃ میں لوگ، مال کا بہترین اور عمدہ مال نہ لے، بلکہ متوسط درجہ کا، ہاں اصحاب مال اپنی خوشی سے دیں تو یہ الگ بات ہے، لیکن اس کا یہ



ترجمہ

حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا اور ان کے بعد حضرت ابو بکر خلیفہ بنائے گئے، اور عرب میں جن جن قبائل کو کافر ہونا تھا وہ کافر ہو گئے تو حضرت ابو بکر نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ فرمایا، حضرت عمر نے فرمایا کہ اے ابو بکر! آپ ان سے کس طرح جنگ کریں گے؟ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شاد ہے کہ میں اس بات کا حکم دیا گیا ہوں کہ مشرکین سے جنگ جاری رکھوں، یہاں تک کہ وہ اقرار کر لیں کہ کوئی معبود نہیں، خدا کے سوا جس نے یہ اقرار کر لیا اس نے جان نال کو مجھ سے محفوظ کر لیا، ہاں جو باز پرس اسلامی ضابطہ کے تحت ہوگی وہ اب بھی باقی رہے گی، رہی یہ بات کہ اس کا یہ اقرار زبان سے تھا یا دل سے اس کا حساب خدا کے پر ہے حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ خدا کی قسم جو شخص نماز اور روزہ کے درمیان فرق کرے گا یعنی نماز پڑھے گا اور روزہ کو کھانا انکار کرے گا میں اس کے ساتھ بھی ضرور جنگ کروں گا، کیونکہ (جس طرح نماز بدنی عبادت ہے اسی طرح) زکوٰۃ مالی عبادت ہے، خدا کی قسم اگر یہ لوگ مجھے اس رسی کے حوالہ کرنے سے انکار کریں گے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حوالہ کیا کرتے تھے، تو میں اس پر جنگ کروں گا، حضرت عمر کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میں سمجھ گیا کہ اللہ نے ان سے جنگ کے معاملہ میں حضرت ابو بکر کے دل کو پورے طور پر منشرح فرمادیا ہے، بالآخر مجھے بھی یقین ہو گیا کہ حق بات یہی ہے۔

اس باب میں غیر مسلم کو دعوت دینے کے علاوہ اس بات کا بیان ہے کہ غیر مسلم مسلمان ہو جائے تو ایمان پر قائم رہنا ہو گا اور دین کے تمام ارکان کو تسلیم کرتے رہنا ہو گا، اگر دین کے ایک رکن کا بھی انکار کر دے تو پھر کفر لوٹ آجیگا، اور دین اسلام پر لانے کیلئے کفار پر فوج کشی کی جائیگی، اگر وہ مان لیں تو بہتر ورنہ ان سے قتال کیا جائے گا، جیسا کہ حضرت ابو بکر کو ابتدائی دور خلافت میں مرتدین کی سرکوبی کیلئے فوج بھیجنا پڑا، اور ان لوگوں سے باضابطہ جنگ کرنی پڑی۔

شرح حدیث | اس حدیث میں چند باتیں تفصیل طلب ہیں (۱) حضرت ابو ہریرہ کے قول کفر من کفر من العرب، کا صدق کون لوگ ہیں؟ (۲) حضرت ابو بکر کے فیصلہ جہاد پر حضرت عمر کا اشکال کن لوگوں سے متعلق تھا؟

ان دونوں باتوں کو سمجھنے کیلئے اس پس منظر کو سامنے لانا ہو گا جو وصال نبوی کے بعد قبائل عرب میں پیش آیا، اور وہ ہے فتنہ کربندوں۔ فتنہ کربندوں کے کچھ جراثیم تو عہد نبوت کے بالکل آخری ایام میں پھیلنے لگے تھے، اور پھر وفات نبوی کے بعد عام ہو کر پورے جزیرہ عرب میں اس کا طوفان کھڑا ہو گیا، اور یہ طوفان ارتداد اس زور شور سے اٹھا کہ اسلام کی عمارت کے در و دیوار مل گئے، اور اس فتنہ میں شامل ہونے والے چار حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

(۱) ایک طبقہ نے دین اسلام سے نکل کر بت پرستی شروع کر دی، اور سابقہ مذہب پر لوٹ آیا (۲) دوسرا طبقہ جنہوں نے سابقہ دین اختیار تو نہیں کیا، بلکہ اقرار توحید کے باوجود سید الکونین کی رسالت کے منکر ہو گئے، اور دوسرے مدعی نبوت کو نبی تسلیم کر لیا، چنانچہ یمن میں اسود غسی اس تحریک کی قیادت کر رہا تھا، اور علاقہ یمامہ کے قبیلہ حنیفہ میں مسلمہ، اور قبیلہ اسد، غطفان میں ظہیر، اور قبیلہ بنی تمیم میں سراج، قیادت کر رہا تھا، اول الذکر تینوں قبیلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرغی

وفات میں ہی مرتد ہو چکے تھے، جب یمن کے متعلق آپ کو معلوم ہوا تو وہاں کے گورنر کو مقابلہ کا حکم جاری فرمایا جس رات وہ قتل کیا گیا اتفاق یہ کہ اس کے لگے دن سید الکونین رخصت ہو گئے۔

علاقہ یمامہ میں مسیلہ کذاب کی سرکوبی کیلئے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں ایک جماعت روانہ کیا، سخت معرکے ہوئے بالآخر مسیلہ کذاب حضرت وحشیؓ کے ہاتھ مارا گیا، اسکے کچھ افراد تائب ہو کر مسلمان ہو گئے، اور کچھ کو قلام بنالیا گیا، اسی طرح طلحہؓ کی سرکوبی کیلئے حضرت خالد روانہ ہوئے اس وقت تو روبرو اقرار اختیار کر لیا، لیکن پھر بعد میں مسلمان ہو گئے ان دونوں گروہوں کا کفر و ارتداد متحقق علیہ ہے۔

تیسرا طبقہ وہ تھا جس نے توحید و رسالت اور احکام اسلامی کے اقرار کے ساتھ صرف زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا لیکن کسی اور حکم شرعی کا انکار نہیں کیا، ان کا کہنا تھا خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم و تزکیہم بہا و صل علیہم ان صلواتک سکون لہم، اس میں مخصوص انداز میں پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ زکوٰۃ دینے والوں کیلئے سلام و رحمت کی دعا کیجئے آپ کی دعا ان کیلئے سکون کا باعث ہے، ظاہر ہے کہ آپ کے بعد کون ایسا ہے جس کی دعا ہمارے لئے تسکین کا باعث ہو، لہذا زکوٰۃ ہم نہیں دیں گے۔

(۴) چوتھا طبقہ وہ تھا جس میں توحید و رسالت، احکام شرعی کی پابندی اور زکوٰۃ کی فرضیت کا اقرار بھی تھا مگر زکوٰۃ طیفہ وقت کو دینے سے انکار تھا اب غلیظہ کو وصولیابی کا کوئی حق نہیں، لہذا ہم ان کو نہ دیکر خود تقسیم کریں گے۔

اس میں منظر کو سامنے رکھ کر حافظ ابن حجرؒ کی وضاحت ملاحظہ ہو ان چار طبقوں پر حضرت ابو ہریرہؓ کا مصداق کفر قول کفر من کفر حقیقت و مجاز کے اعتبار سے ہے، کہ پہلے دونوں گروہ کے حق میں کفر چھوٹا ہے اور بقیہ دونوں گروہ پر مجاز آیا تخلیفاً ہے یا یہ کہ ان دونوں کو قاربوا الکفر، کے اعتبار سے یا انہم شابهوا الکفر کی بنا پر کفر کہا یا کفران نعمت کی بنا پر تعبیر کر دیا۔

### فتنہ ارتداد پر ایک شبہ کا ازالہ

”حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ لکھتے ہیں ایک طالب علم کو یہ خیال ضرور ہو سکتا ہے کہ آخر اسلام جو ایک دین حق اور مذہب فطرت ہے اس کا یہ نشہ کیسا تھا؟ کہ چڑھلاور فوراً ہی ہتر گیا، اس خیال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اہلکے مورخ اس فتنہ کو عام طور پر فتنہ ارتداد کے لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے ارتداد نہیں تھا بلکہ جو لوگ مسلمان کے خلاف معرکہ آرا ہوئے وہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جنہوں نے اگرچہ اسلام کو کسی طریقہ پر کسی لالچ یا دھوکے سے قبول کر لیا تھا، مگر قرآن کے لفظوں میں اسلام ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا، اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت راسخ العقیدہ مسلمانوں کے علاوہ جو مجاہد، طائف میں آباد تھے عام عرب قبائل دو قسم کے تھے، ایک قسم تو ان قبیلوں کی تھی جو مدینہ طیبہ کے قرب و جوار میں آباد تھے، مثلاً حبش، مذہیان، بنو کنانہ، غطفان، لہور فزہ۔ لیکن چونکہ ان کو براہ راست محبت نبویؐ میں رہنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لئے اسلام کی اصل روح سے وہ آشنا نہ ہو سکے تھے، اور ان کا ایمان پختہ نہ ہو سکا تھا قرآن نے ان کو اعراب سے تعبیر کیا ہے، قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا، ولما يدخل



الایمان فی قلوبکم، یہ وہی لوگ تھے جن کی خاطر خواہ تہذیب نفس نہیں ہو سکی تھی، اور اسلام کی پوری حقیقت ان کے ذہن نشین نہیں ہوئی تھی، اور اہل بدادت ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن امر حق کو فوراً (کما بینفی) قبول کرنے کی استعداد سے بے بہرہ تھا، قبائل عرب میں اعراب کا وہی طبقہ ہے جن کو ہمارے مؤرخین مرتد لکھتے ہیں، لیکن یہ درحقیقت مرتد نہیں تھے، بلکہ مسلمان تھے، ان اعراب کے علاوہ دوسرے وہ قبائل تھے جو مدینہ منورہ سے دور دراز جنوب میں یمن، اور عرب و شام کی سرحدوں پر آباد تھے، مؤرخین ان کو مرتدین کہتے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ یہ قبائل سرے سے اسلام کی لذت سے آشنائی نہ تھے۔

فتح مکہ کے بعد جب قریش بھی سب کے سب مسلمان ہو گئے اور اسلام کی ایک زبردست اسٹیٹ مدینہ میں قائم ہو گئی تو عرب کے ان قبائل نے آنحضرتؐ کی خدمت میں اس کثرت سے وفد بھیجے شروع کئے کہ ۹۰ کا نام ہی عام الوفود ہو گیا لیکن ان الوفود نے آنحضرتؐ سے جس طرح اگر گفتگو کی ہے اس سے صاف نظر آتا ہے کہ اگرچہ ہر قبیلہ کے دو چار سمجھدار آدمیوں نے اسلام کو صدقِ دل سے قبول کر لیا تھا، لیکن قبائل کا عام انداز یہ تھا کہ گویا وہ ایک سیاسی طاقت کے سامنے سر خم کر رہے ہیں، اور ایک فارغ سے اپنے معاملات طے کر کے اپنے قبیلہ کیلئے معاشی اور سیاسی مراعات حاصل کرنا چاہتے ہیں، دین اور روحانیت کا ان کی گفتگو میں بہت کم شائبہ تھا اس بنا پر اگرچہ ان قبائل نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیا لیکن یہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، اور اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب ان کو موقع ملے، اور یہ اسلام کے یا بالفاظِ صحیح ترمذیہ کی ریاست کے خلاف علم بغاوت بلند کریں، چنانچہ وفاتِ نبوی کے بعد ہی ان کو موقع ملا اور وہ جھٹ اسلام کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ "م

### کسی حکم شرعی کے انکار پر کفر کا حکم

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کی کس قسم کی بات کے انکار پر انسان کافر و مرتد ہوگا، اور کس قسم کے مسئلہ پر کفر و ارتداد کا حکم نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں پہلے ایمان کی تعریف ذہن نشین کر لینی چاہئے تاکہ جواب سمجھنے میں سہولت ہو، ایمان نام ہے تصدیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما علم مجیئہ بہ بالضرورة، یعنی تمام ضروریاتِ دین کے ماننے کا نام ایمان ہے، اور ضروریاتِ دین میں سے کسی بھی چیز کا انکار کفر ہے، اب ضروریاتِ دین کا مطلب سمجھیں اس کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ کسی بھی چیز کا دین میں سے ہونا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا تو اتنا اور دلیل قطعی سے ثابت ہو، اور وہ اس درجہ مشہور ہو چکی ہو کہ عامۃ الناس کی معتد بہ جماعت بھی اُسے مانتی ہو خواہ وہ بدیہی ہو یا نظری، تو اسکو ماننا ضروری ہے، مثلاً حشر، نشر، بعث بعد الموت، جزاء، سزا وغیرہ یہ ہے تو نظری لیکن ان چیزوں کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے اس لئے ضروریاتِ دین میں داخل ہے اسی طرح سواک کرنا، اگرچہ فرض نہیں بلکہ سنت ہے، لیکن اس کا ثبوت تو اتنا عملی سے ہے، لہذا ضروریاتِ دین میں شامل ہے۔

اب اصل جواب اور معیار ملاحظہ ہو کہ شریعت کا کوئی بھی حکم شرعی جو ضروریاتِ دین سے متعلق ہو اسکا منکر کافر و مرتد ہے خواہ اس کا انکار کسی تاویل و توجیہ کے ساتھ کیوں نہ ہو، ہاں کوئی مسلمان اگر نو مسلم ہے اور اس تک اسلام کے اصولی مسائل نہیں پہنچے ہیں تو اُسے معذور سمجھا جائے گا جیسا کہ دورِ صدیقی میں زکوٰۃ کے منکر نو مسلم تھے، اور ان کی تاویل نص قرآنی کے ذریعہ تھی، اس لئے ریک اور کمزور تاویل کی بنا پر ان کو فوراً مرتد اور کافر نہیں کہا گیا، لیکن اس دور میں جبکہ

احکامات دین محکم طریقہ پر لوگوں کے سامنے آچکے ہیں اس کے باوجود بھی کوئی رکب اور کمزور تاویل کر کے کسی حکم شرعی کا انکار کرے تو یہ تاویل اُسے کفر و ارتداد سے نہیں بچا سکے گی، بلکہ کافر ہو جائے گا، ہاں شریعت کی ہر وہ بات جو ضروریات دین میں سے نہ ہو اس کا کوئی منکر ہے تو وہ کافر نہیں بلکہ فاسق ہے، مثلاً کوئی معتزلی روایت باری کا انکار کرے تو وہ کافر نہیں کہلائے گا۔ (۱)

### جنگ اقدامی کی اجازت نہیں

أَمَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ، اگر آقا صلی اللہ علیہ وسلم لفظِ امرت فرمائیں تو امر کی نسبت خدا کی طرف، اور اگر کوئی صحابی کہے تو اس کی نسبت محبوب خدا کی طرف ہوگی، اس حدیث میں اَنْ اَقَاتِلَ کے بجائے اَقَاتِلَ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ قتال کی اجازت اس وقت ہے جبکہ اعلیٰ حکمہ اللہ میں مشرکین رکاوٹ ڈالیں، اور مسلمانوں سے آمادہ جنگ ہوں تو اب مسلمان دفاعی جنگ کیلئے تیار ہوں، ورنہ اگر علی العموم اجازت جنگ ہوتی تو امرت اَنْ اَقَاتِلَ کی عبارت ہوتی، اسی وجہ سے عہد نبوت میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جہاں محض اسلام پر مجبور کرنے کیلئے کسی پر چڑھائی کی گئی ہو۔۔۔ ملے جہاد و قتال پر جبر و ابرہہ کا کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔

### ایمان کیلئے دلائل جاننا ضروری نہیں

قوله حتی يقولوا لا اله الا الله: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے اعتقادِ جازم اور شریعت کی سچائی کا اجمالی اقرار کر لینا کافی ہے، خواہ دلائل سے بے خبر کیوں نہ ہو، یہی مسلک جمہور اہل سنت کا ہے، معتزلہ کے بقول صحتِ ایمان کے لئے دلائل سیکھنا ضروری ہے، ان کا کہنا ہے دلائل کے علم کے بغیر وہ ایمان حاصل نہیں ہو سکتا، جو ایمان شکوک و شبہات سے خالی ہو، مگر یہ بات حیرت انگیز ہے کیونکہ تب تو عہد نبوی میں کفار کا وہ طبقہ جو اسلام میں داخل ہوا، کیا ان کو اسلامی احکامات کے ساتھ نظر و استدلال سیکھنے پر بھی مکلف بنایا گیا؟ حالانکہ ایسا نہیں۔

### حضرت عمرؓ کا حضرت ابو بکرؓ سے علمی مکالمہ

”اس فتنہ آرتداد اور شورش و ہنگامہ پر حضرت ابو بکر کا جو اعلان و فرمان جاری ہوا وہ یہ تھا کہ ان چاروں طبقوں سے جہاد کرتا ہے، لیکن چونکہ مرکز اسلام ایک ایسے ماحول میں گھر چکا تھا کہ بعض صحابہ کو یہ فیصلہ مناسب نہیں معلوم ہوا، ادھر حضرت عمرؓ نے دربار صدیقی میں عرض کیا کہ پہلا دونوں طبقہ تو کافر و مرتد ہو چکا ہے، اس سے قتل و قتال تو عین شریعت ہے لیکن آخر الذکر دونوں طبقہ کو مرتد کیوں تصور کیا جائے؟ اور ان سے قتال کیوں کر روا ہو سکتا ہے؟ جبکہ فرمان نبوی ہے۔

کہ جس نے شہادتیں کا اقرار کیا تو اس کی جان و مال محفوظ ہو گئے، غرض قتال تو کفر و ارتداد کی بنا پر ہوتا ہے اور یہاں کفر تحقیق نہیں۔“

یہاں حضرت عمرؓ کے اس مناقشہ پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب امت کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ کسی بھی رکن کا انکار در حقیقت دین ہی کا انکار ہے اور جس طرح پورے دین کا انکار کفر ہے عینہ کسی رکن کا بھی انکار کفر ہے، تو انہیں زکوٰۃ کا پہلا طبقہ جو نفس

زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر کیا تھا، وہ تو بلاشبہ کافر ہو گیا، پھر اس گروہ کے کفر میں حضرت عمر کو کیونکر تردد رہا؟ اس شبہ کا حل یہ ہے کہ اسلام کے کسی حکم قطعی کا انکار اگر بلا تاویل کیا جائے، تو یہ کفر ہے لیکن کسی تاویل کے ساتھ ہو تو کفر نہیں کہلائے گا، جو حضرات زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر تھے، ان کی تاویل یہ تھی کہ اس کی فرضیت دور نبوی تک خاص تھی، لہذا دور نبوی کے اختتام پر اس کی فرضیت بھی ساقط ہو گئی، کیونکہ قرآنی آیت خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا وصل علیہم ان صلواتک سکون لہم، میں لفظ ”خذ“، ”تزکی“، ”تطہر“، ”صل“ کے میخذ و اسلوب سے محسوس ہوتا ہے کہ اس حکم کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، غرض جب تاویل کے ساتھ منکر ہیں تو پھر کافر و مرتد نہیں ہوئے، لہذا حضرت عمر کے مناقشہ پر کوئی شبہ نہیں۔

اسی طرح حضرت عمر کو جو تھے گروہ سے قتال پر اشکال یہ تھا کہ نفس زکوٰۃ کے منکر تو ہیں نہیں؟ بلکہ محض عمال کو سپرد کرنے سے انکار ہے، تو زیادہ سے زیادہ یہ لوگ باغی ہوئے اور یہ بھی صحیح ہے کہ بغاوت کی سرکوبی کے لئے قتال درست ہے، مگر اس وقت مصلحت اور وقتی نزاکت کا تقاضا یہ ہے کہ جنگ نہ کی جائے۔

### حضرت ابو بکرؓ کا جواب

(۱) جس حدیث سے آپ عدم قتال پر استدلال کر رہے ہیں درحقیقت اس سے ہمارے نظریہ کی تائید ہوتی ہے، اس میں اِلا بحقہ کے استثناء پر غور کریں تو معلوم ہوگا حقوق اسلام کے تحفظ کی خاطر جان و مال غیر محفوظ ہو سکتے ہیں، جیسا کہ قتل عمد میں، محسن کے زمان میں رجم، اور تلبس مال میں دجوب ضمان وغیرہ تو اسی طرح منکرین زکوٰۃ سے ہماری جنگ تحفظ دین ہی کے خاطر ہے اور اس سے دراصل اِلا بحقہ کے مطالبہ کو پورا کرنا ہے نہ کہ بے جا جان لینا ہے۔

(۲) اُمرو ان اُقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ و ان محمداً رسول اللہ و یقیموا الصلوٰۃ و یؤتوا الزکوٰۃ، اس حدیث کا مقضایہ ہے کہ شرع اسلامی میں سے کسی حکم کا انکار ہو اور دعوت دینے کے بعد بھی باز نہ رہے اور قتال کے درپے رہیں تو مقابلہ واجب ہے، اور چونکہ انکی طرف سے مقابلہ کی ہنگامی صورت حال پیدا ہو چکی ہے لہذا قتال واجب ہے۔

(۳) چونکہ انکار زکوٰۃ کے بعد پہلے خود ان کے وفود آئے، اور حضرت ابو بکرؓ سے رخصت چاہی، مگر حضرت ابو بکرؓ کے انکار پر مایوس لوٹ گئے، اور حضرت ابو بکرؓ کے عزم و حوصلہ کو دیکھ کر ان لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاری شروع کر دی، اور انکار زکوٰۃ پر معررہ ہے اور چونکہ دلائل سے سمجھا جا چکا تھا کہ فرضیت باقی ہے تو اب ان کا انکار جہل کی بنا پر نہیں بلکہ شرارت نفس کی بنا پر تھا اس لئے قتال کرنا ضروری ہوا۔

(۴) بالاتفاق منکر نماز کافر و مرتد ہے، تعظیم و فہمائش کے بعد بھی نہیں مانتا تو مستحق قتل ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ منکر زکوٰۃ مرتد اور مستحق قتل نہ ہو، جبکہ نماز بدنی عبادت ہے اور یہ مالی عبادت ہے اور دونوں کی ادا نیکی کا حکم قرآن میں مساوی طور پر ہے۔

(۵) حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی (۱) تحقیق یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو ابتداً اس معاملہ میں جو تردد رہا اس کا منشا صورت واقعہ کی تشخیص میں اختلاف تھا، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ منکر زکوٰۃ صرف ایک بغاوت کا جرم ہے، اور حالات کی نزاکت کا

تقاضا یہ ہے کہ ابھی باغیوں سے جنگ نہ چھیڑی جائے، حضرت ابو بکر کی تحقیق میں یہ معاملہ ارتداد کو "دفعہ" میں آتا تھا، اسی لئے انہوں نے فرمایا کہ منکر زکوٰۃ اور منکر صلوٰۃ میں آخر فرق کیا ہے؟ اگر منکر صلاۃ مرتد ہیں تو منکر زکوٰۃ کو مرتد کیوں نہیں کہا جائے؟ وہ عبادت بدنیہ ہے اور یہ عبادت مالیہ، حافظ زبلی فرماتے ہیں: وقد یقال ان عمر لم یتحقق ردہم یدل علی ذالک فی القصة ان ابابکر لما استشار فیہم قال لہ عمر یا خلیفۃ رسول اللہ انہم قوم مؤمنون وانما شحوا باموالہم، (۵)

یعنی اس اختلاف کی توجیہ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ حضرت عمر کے نزدیک ابھی تک ان کا مرتد ہونا ثابت ہی نہیں ہوا تھا، جیسا کہ اس قصہ میں ان کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ لیا تو حضرت عمر نے فرمایا اللہ کے رسول کے خلیفہ ایہ تو مومن لوگ ہیں صرف اپنا مال دینے سے بخل کرتے ہیں، اس بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت عمر کے نزدیک یہ جماعت مومن تھی، اور حضرت ابو بکر کو حالات کی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ ان کا جرم ارتداد کی حد تک پہنچ چکا ہے، جب گفتگو کے بعد یہ حالات واقعات حضرت عمر کے سامنے بھی واضح ہو گئے تو انہیں بھی حضرت ابو بکر کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔

حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: فعمرو وافق ابابکر علی قتال اهل الردۃ مانعی الزکوٰۃ وكذلك سائر الصحابة، (۲)

حضرت قیسہ فرماتے ہیں: هم المرتدون الذین ارتدوا علی عہد ابی بکر فقاتلہم ابوبکر، (۳)  
اشکال :- جواب نمبر دو پر جو حدیث گزری ہے، وہ جوہر قتال کے سلسلہ میں بہت صریح ہے پھر حضرت عمر کو اشکال کیونکر ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت حضرت عمر کو صرف لا الہ الا اللہ تک ہی سمجھتا تھا، امام مسلم نے جو جواب حضرت ابو بکر کا نقل کیا ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت ابو بکر کو بھی اس وقت یہ حدیث معلوم نہ تھی لیکن نسا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر نے تفصیلی روایت سنائی تھی، تو پھر حضرت ابو بکر کے جواب کا حاصل یہ نکلے گا کہ اگر حدیث سے قطع نظر کر لو تو عقل و قیاس کا بھی یہی تقاضا ہے کہ نماز و زکوٰۃ دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

### مانعین زکوٰۃ کے استدلال کا جواب

ان کا استدلال خذ من اموالہم صدقۃ، کے خصوصی خطاب سے ہے جو در حقیقت قرآن کے طرز بیان اور اصطلاح سے ناواقفیت کی بنا پر تھا۔ دراصل قرآن کریم میں تین طرح کے خطاب مذکور ہیں: (۱) خطاب عام جیسے، یا ایہا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ الخ یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام، (۲) خطاب خاص جس میں سید اکوین صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کی تصریح کردی گئی جیسے فتہجد بہ نافلۃ لک، خالصۃ لک، (۳) صیغہ خطاب توسید اکوین کو مگر پوری امت مخاطب ہے مثلاً اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس (۲) فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ، تو جس طرح ان دونوں آیتوں میں خطاب بظاہر آپ کو ہے مگر مخاطب پوری امت ہے اسی طرح خذ من اموالہم میں خطاب آپ کو ہے مگر مخاطب امت ہے۔

## جنگ بندی کی چند صورتیں

اس روایت میں مشرکین سے جنگ بند کرنے کی صرف ایک صورت بتائی گئی ہے، حالانکہ جس طرح اقرار توحید کے بعد جنگ بند کی جائے گی اسی طرح اگر کفار صلح کر لیں یا جزیہ دینا منظور کر لیں تو ان صورتوں میں بھی جنگ بند ہو سکتی ہے تو پھر یہاں ایک ہی صورت جنگ بندی کی کیونکر ذکر کی گئی؟ اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں،

(۱) جزیہ اور صلح کا حکم اس حدیث کے بعد نازل ہوا کیونکہ صلح کا حکم ۶ھ اور جزیہ کا حکم ۹ھ کا ہے، لہذا لفظ کورہ بالا روایت کا یہ مفہوم کہ صرف اقرار شہادتین ترک قتال کی صورت ہے، بعد کی روایت سے منسوخ ہو چکا، فلا اشکال۔

(۲) شوافع کے اصول کے مطابق ما من عام الا وقد خص منه البعض، کے قبیل سے ہے، چونکہ دوسری آیات و روایات تخصیص چاہتی ہیں، لفظ "ناس" عرب، عجم، مشرکین، اہل کتاب سب کو شامل تھا لیکن اس میں تخصیص کر لی گئی، یعنی یہ عام خص عنہ البعض کے قبیل سے ہے۔

(۳) لفظ اگرچہ عام استعمال کیا گیا، مگر مراد خاص ہے، لہذا اقاتل الناس سے مشرکین غیر اہل کتاب مراد ہیں، نسائی میں امرت أن اقاتل المشركين، کا لفظ صراحتاً مذکور ہے، جزیہ کا قانون صرف اہل کتاب کیلئے ہے رہ گئی صلح تو وہ اس لئے بحث سے خارج ہے کہ اس میں قتال ختم نہیں ہوتا، بلکہ ایک مدت تک کے لئے موقوف کر دیا جاتا ہے۔

(۴) لفظ قتال سے معنی عام مراد لیا جائے خو لو قتال ہو یا قتال کے قائم مقام جزیہ اور صلح ہو، کیونکہ قتال کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور اس راستہ میں کفار رکاوٹ بنے ہوئے ہیں یہ راستہ تینوں صورتوں میں صاف ہو جاتا ہے اور مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

(۵) حدیث میں حتیٰ یشهدوا، کے معنی حتیٰ یذعنوا للاسلام، کے لئے جائیں، یعنی گردن جھکانے اور بارہا منہ سے کہنا یہ ہے۔

(۶) سب سے عمدہ جواب یہ ہے کہ صلح اور جزیہ بھی اگرچہ جنگ ختم کرنے کا سبب ہے، مگر یہ دونوں صورتیں طریقین کی رضامندی پر موقوف ہیں، فریق مخالف صلح کی درخواست کرے گا، یا جزیہ دینا قبول کرے گا، تو اس کی درخواست قبول کی جاسکتی ہے، مگر جنگ ختم کرنے کا حتیٰ اور یقینی سبب جو صرف دشمن کے ہاتھ میں ہے وہ اسلام ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس روایت میں جنگ ختم کرنے کا صرف وہ طریقہ بتلایا گیا ہے جو دشمن کے قبضہ میں ہے، اور وہ ہے صرف قبول اسلام۔

اشکال :- "حدیث پاک میں ارکان اسلام میں سے صرف اقامت صلاۃ اور ایتہام زکوٰۃ کا ذکر ہے بقیہ ارکان اسلام کا کوئی تذکرہ نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب :- حدیث میں گو کہ ارکان اسلام کے صرف دو جز کا ذکر ہے، لیکن درحقیقت صلوٰۃ سے عبادت بدنیہ کی جانب اشارہ ہے اور زکوٰۃ سے عبادت مالیہ کی طرف، نماز کو عمار الدین اور زکوٰۃ کو قطرۃ الاسلام کہا گیا ہے، لہذا دونوں کی اہمیت کے پیش نظر ان کو بیان کیا گیا، ورنہ تو تمام احکامات شرعیہ علی حسب المراتب مبرا ہیں، یہاں بھی کہا جاسکتا ہے نماز اور زکوٰۃ پر اکتفا اس لئے کیا گیا کہ روزہ کو معیار وفاداری نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ ممکن ہے لوگوں کے سامنے کوئی اپنے کو روزہ دار ظاہر کرے، اور تنہائی میں کھاپی لے، اسی طرح حج کو بھی معیار وفاداری نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ حج سب پر فرض نہیں، پھر پوری زندگی میں صرف

ایک دفعہ فرض ہے اسلئے توحید و رسالت کے اقرار کیساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایثارِ زکوٰۃ کو عصمتِ دم قرار دیا گیا۔ ”م (۱۵)“  
**الابحہ:** مطلب یہ ہے کہ اسلام کے تحفظ کی خاطر مسلمان کی جان و مال غیر محفوظ سمجھا جائے گا، جیسے قصاص، دیال، تلف کر دینے کی صورت میں تاوان، علامہ کرمائی کہتے ہیں **إلا بحق الاسلام**، میں قتل نفس، ترکِ صلوٰۃ اور منعِ زکوٰۃ تینوں شامل ہے، جس طرح قتل نفس سے قاتل کی جان غیر محفوظ ہو جاتی ہے، اسی طرح ترکِ صلوٰۃ اور منعِ زکوٰۃ سے بھی جان و مال غیر محفوظ ہو جاتے ہیں مگر علامہ کرمائی کی یہ تحقیق محلِ نظر ہے، جہاں تک قتل نفس پر قاتل کی جان غیر محفوظ ہونے کی بات ہے، تو وہ مسلم ہے، ترکِ صلوٰۃ سے جان کی عصمت کا ختم ہونا یہ شوافع کا مسلک ہے، مگر منعِ زکوٰۃ سے جان کی عصمت کا ختم ہونا یہ تونہ سب شافعی کے بھی خلاف ہے، کیونکہ امام شافعی کا نہ سب یہ ہے کہ مانعِ زکوٰۃ کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ زبردستی اس سے زکوٰۃ لی جائے گی، ہاں اگر مانعِ زکوٰۃ قتل و قتل کے لئے آمادہ ہو جائے تو پھر اس سے جنگ کی جائے گی۔  
**قوله وحسابہ علی اللہ:** یعنی جو شخص توحید و رسالت کا اقرار کرے مسلمان ہونا ظاہر کرے، ہم اسکو مسلمان سمجھیں گے، اب ہمیں تحقیق و تفتیش سے کوئی سروکار نہیں، کہ اسکا اسلام دل سے ہے یا جان بچانے کیلئے، اگر وہ صرف زبان سے ہے تو چونکہ دل کا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے، اسلئے خدا کے یہاں منافی ہے، مگر ہم اس کو مسلمان سمجھیں گے۔

### زندیق کا حکم

”اس موقع پر زندیق کا مسئلہ زیر بحث آسکتا ہے کہ کیا اس کو مسلمان مانا جائے؟ زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو اسلام ظاہر تو کر تا ہو لیکن دل میں کفر چھپا رکھا ہو، اور قرآن سے اس کا پتہ چلتا ہو۔  
 حضرت انور شاہ کشمیریؒ نے نقل فرمایا ہے کہ **إن كان مع اعترافه بنبوة النبي صلى الله عليه وسلم و اظهاره شعائر الاسلام يبطن عقائد هي كفر بالاتفاق**، (۱)  
 منافی اور زندیق میں فرق یہ ہے کہ منافی رسالت کا بھی معترف نہیں تھا اور زندیق نفس توحید و رسالت کا معترف تو ہوتا ہے لیکن کفریہ عقائد دل میں چھپا رکھتا ہے، تو ایسا شخص کافر ہے۔ ”م (۱۶)“  
**منکر فرائض کا حکم**

**واللہ لا قاتلن الخ** علامہ نے اس سے یہ مسئلہ مستحب کیا ہے کہ جو شخص اسلامی فرائض کو قبول کرنے سے انکار کرے تو اُسے مہلت دی جائے گی، مثلاً اگر وہ جو زکوٰۃ کا اقرار کر لے تو اس سے زکوٰۃ کی مقدار زبردستی لیں گے، اُسے قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر وہ انکار کے ساتھ جنگ کیلئے آمادہ ہو تو اسے جنگ کریں گے، تاوقتیکہ وہ تائب نہ ہو جائے، امام مالکؒ نے مؤطا (ص ۱۱۶) میں اسکی تصریح کی ہے کہ جو شخص دین کے کسی فرض کا منکر ہو جائے، اور مسلمان اسکو منوانہ سکتے ہوں تو پھر ان سے قتال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ علامہ بدر الدین عینیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے اسی طرح مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا تھا کہ وہ لوگ جنگ کیلئے آمادہ ہو گئے تھے اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ ابو بکر صدیقؓ نے کسی منکر زکوٰۃ کو پکڑ کر قتل کیا ہو، (۱۷) اگر کوئی شخص رمضان کا روزہ ترک کر دے تو دن میں کھانا پینا روک دیا جائے گا، چونکہ جب وہ شخص

(۱) امداد الباری ص ۴۸۸، ۴۔ (۲) اکفار الملحدين ص ۱۳۔ (۳) حریذ فیصل کے لئے ملاحظہ ہو شامی باب المرتد ص ۳۸۳، ۶۔

(۱۷) یعنی ص ۲۳، ۸۔

روزہ کی فرضیت کا معتقد ہے تو کھانا پینا روک لینے پر وہ روزہ کی نیت کر ہی لے گا، لہذا فی کتب الشافعیۃ، (۱) امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کسی جگہ کے لوگ ترکِ بوان پر اتفاق کر لیں تو امام وقت پر ان سے جنگ کرنا ضروری ہو جاتا ہے (۲) بہر حال اسلام کے کسی بھی فرض کے انکار کرنے سے قتال واجب ہو جاتا ہے۔

من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ: — امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ابو بکر صدیقؓ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کیا، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ منکر صلوٰۃ سے جنگ کرنا صحابہ کے مابین متفق علیہ تھا، ابو بکر صدیقؓ نے مختلف ذمہ کو متفق علیہ پر قیاس کیا، گویا حضرت ابو بکرؓ کا استدلال قیاس سے تھا، مگر نسائی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے صریحی نص سے بھی استدلال کیا تھا، نسائی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: اخبرنا محمد بن بشر حدثنا عمرو بن عاصم حدثنا عمران ابو العوام حدثنا معمر عن الزہری عن انس بن مالک قال لما توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم ارتدت العرب فقال عمرو يا ابا بکر كيف تقاتل العرب فقال ابو بکر انما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: امرت ان اقاتل الناس حتى يشهدوا ان لا اله الا الله واني رسول الله وقيموا الصلوٰۃ ويؤتوا الزکوٰۃ، (۳) اس روایت کو بیعتی نے بھی اپنی سنن میں ذکر کیا ہے، ممکن ہے قول ابو بکرؓ واللہ لا قاتلن من فرق بین ما جمع رسول الله صلى الله عليه وسلم، (۴) میں اسی طرف اشارہ ہو۔

غرض اس طرح حضرت ابو بکرؓ کا استدلال فاروق اعظمؓ پر تین طرح سے ہوا (۱) نص صریح سے (۲) لایحیہ کے عموم سے (۳) اور نماز پر زکوٰۃ کو قیاس کرنے سے۔

### ترکِ صلوٰۃ کا حکم

حضرت علیؓ اور ایک روایت امام احمد کی، حضرت عبداللہ بن مبارک، اسحاق بن راہویہ، اور کچھ شوافع کا مسلک یہ ہے کہ جان بوجھ کر نماز کا تارک کا فر ہے، اور ارتداد کی وجہ سے اس کا قتل واجب ہے، امام مالکؒ امام شافعیؒ تارکِ صلوٰۃ کی تکفیر نہیں کرتے، البتہ اس کو فاسق کہتے ہیں، اگر وہ توبہ کر لے تو فیہا ورنہ حد اُس کو قتل کیا جائے گا، جیسے شادی شدہ زانی کو رجم کیا جاتا ہے، تارکِ صلوٰۃ کو تلوار سے مارا جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنیؒ اور اہل کوفہ کا مذہب یہ ہے کہ نہ کافر ہے اور نہ مستحقِ قتل، بلکہ تعزیراً اسکو اتنا مارا جائے کہ بدن لہو لہان ہو جائے، اور اس وقت تک قید خانہ میں رکھا جائے جب تک کہ نماز شروع نہ کر دے، یا اسی طرح قید خانہ میں مر جائے، البتہ امام کو اختیار ہے کہ دو سیارہ اگر قتل کرنا مناسب سمجھے تو قتل بھی کر سکتا ہے۔ ایضاً البخاری میں مخدوم ہاشم سندھی کے بیاض کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سیارہ تارکِ صلوٰۃ کے قتل کی اجازت دیتے ہیں، جیسے بدعتی کا قتل سیارہ جائز ہے، اس سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ تارکِ صلوٰۃ عہد آ کے قتل پر کسی نہ کسی درجہ میں امر متفق ہیں۔ (مزید معلومات کیلئے انتہار کیجئے آگے باب من ترک الصلوٰۃ فقد کفر کا، اور دیکھئے اداء الباری ص ۳۹۱/۳۹۲)

فان الزکوٰۃ حق الصال: نماز حق نفس اور زکوٰۃ حق مال ہے، جس نے نماز پڑھی اس نے اپنی جان محفوظ کر لی، اور

جس نے زکوٰۃ دیدی تو اس نے مال محفوظ کر لیا، لہذا جب نماز نہ پڑھنے پر جان غیر محفوظ تو اسی طرح جس نے زکوٰۃ ادا نہ کی اس کا مال بھی غیر محفوظ۔

قوله واللہ لومنعونی عقالا: بعض روایت میں عقاق کا لفظ آیا ہے، عقاق کے معنی بکری کا بچہ، اور عقاق وہ رسی جس سے اونٹ کو باندھا جاتا ہے، امام بخاریؒ کے استاد یحییٰ بن بکیر اور ابن صراح نے عقاق ہی کو ترجیح دی ہے، امام نوویؒ کہتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے دوبار اس لفظ کا استعمال کیا ہو، ایک بار عقاق، اور ایک بار عقاق۔

سوال:- یہاں سوال یہ ہے کہ نہ اونٹ کی رسی پر زکوٰۃ ہے اور نہ صرف بکری کے بچہ پر، تو پھر واللہ لومنعونی عقالا کے کیا معنی؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) بعض لوگ عقاق کے معنی صدقہ عام سے کرتے ہیں، چنانچہ بولا جاتا ہے آخذ منہ عقاق لهذا الغلام، یعنی اس سال کا عام صدقہ لیا، یہ معنی کسان کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے، اسی طرح نضر بن شمیل وغیرہ بھی اس کا ترجمہ زکوٰۃ عام سے کرتے ہیں، مگر محدثین نے اس تاویل کو کمزور ٹھہرایا ہے۔

(۲) درحقیقت اس کلام سے حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے عزم کا اظہار فرما رہے ہیں کہ جب تک یہ لوگ زمانہ نبوت کے طریقہ پر نہ آجائیں اور جو چیز آپ کے زمانہ میں دیتے رہے ہیں، اس کو آج بھی دینا منظور نہ کر لیں اس وقت تک میں ان سے قتال جاری رکھوں گا، اگر وہ لوگ رسی جیسی معمولی چیز بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زکوٰۃ کے ساتھ دیا کرتے تھے آج ان کو وہ رسی بھی دینی ہوگی، اسی وجہ سے حضرت ابو بکرؓ نے ”لو“ شرطیہ کا استعمال کیا ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز شرط کے ساتھ ذکر کی جائے اس کا وقوع ضروری نہیں ہے، بلکہ لو شرطیہ تو مستحب اور محال موقع پر بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے قرآن میں ایک جگہ ہے لو کان فیہما آلۃ الا للہ لفسدتا، دوسری جگہ ہے: لو کان للرحمن ولد فانا اول العابدین، اس لئے لو منعونی عقالا باعتبار الفا کے لفظ سے رسی یا بکری کے بچہ میں زکوٰۃ کے وجوب یا عدم وجوب کی بحث قائم کرنا خارج از بحث ہے اس کو مبالغہ پر محمول کرنا مناسب ہے، اور یہی حضرت ابو بکرؓ کے کلام کا مقصد ہے۔

قد شرح صدر ابی بکر: بذریعہ الہام الہی شرح صدر ہوا، فرایض انہ الحق، حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ کی اصابت رائے اور قوت دلیل دیکھ کر متاثر ہوئے، بلا دلیل قائل نہیں ہوئے، اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ جب کسی پر حق واضح ہو جائے تو اس کو تسلیم کر لینا چاہئے اور اس سے حضرت ابو بکرؓ کی فوقیت اور علمی برتری کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (تم اللہ ریث)

❦ حدیث ❦ حدثنا عبدة..... ویؤمنوا ہی وبما جئت بہ۔ اس حدیث کے مختلف الفاظ ہیں، بعض میں صرف توحید کا ذکر ہے اور بعض میں توحید کے ساتھ رسالت کا بھی ذکر ہے، اور بعض میں توحید و رسالت کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا بھی تذکرہ ہے (مسلم ص ۱۷۳/۱) یہ سب ایک ہی مقصد کی مختلف تعبیرات ہیں، اصل یہ ہے کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے تمام دین کو تسلیم نہ کیا جائے، ایمان حاصل نہیں ہوتا، اب اس حقیقت کی طرف کہیں تو اسلام کے دو مشہور ارکان، نماز اور زکوٰۃ کو ذکر کر کے اشارہ کیا، کہیں تمام دین کو شہادتین کے ضمن میں لپیٹ دیا گیا، اور کہیں



یہ دیکھ کر کہ صحیح توحید رسول پر ایمان لائے بغیر میری نہیں آسکتی، صرف کلمہ توحید پر کفایت کر لی گئی ہے، اور مدعی ان سب کا وہی ایک بات ہے یعنی آپ کے تمام دین کی تصدیق و تسلیم۔

حدثنا ابو بکر بن ابی شیبۃ قال حدثنا وکیع ..... ثم قرأ إنما انت مذکر، لست علیہم بمصیطر، لفظ مصیطر، صادر اور سین دونوں طرح مستعمل ہے، مصیطر بمعنی مجبور کرنیوالا، اور رب مالک،

ایک اہم اشکال:- اُمروث ان اقاتل الناس، کی تائید میں اس آیت کی تلاوت کرنے کا کیا جوڑ ہے؟ بظاہر دونوں بے ربط معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ اُمروث ان اقاتل سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آپ لوگوں کو مسلمان بنانے پر مسلط ہیں اگر اسلام قبول نہ کرے تو تلوار تک اٹھانے کا حکم ہے، اور ”لست علیہم بمصیطر“ کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کو مسلمان بنانے پر مسلط نہیں ہیں، کسی کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کر سکتے، تو ایک ہی موقع پر بے جوڑ بات کیوں کہی گئی؟ اس اشکال کے تین جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) ممکن ہے کہ آیت مذکورہ حکم قتال اترنے سے پہلے کی ہو، اور متضاد ہو، یعنی اس آیت کا تعلق اس زمانہ سے ہو جبکہ مسلمانوں کو مشرکین سے لڑنے کی اجازت نہیں تھی صرف مشرکین کی اذیت سہنے اور برداشت کرنے کا حکم تھا، پھر بعد میں اجازت قتال ہو گئی، یہ جواب امام نوویؒ نے نقل کیا ہے مگر یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ آیت تو اُمروث ان اقاتل کی تائید میں لائی گئی ہے، ظاہر ہے تائید میں منسوخ آیت کیونکر ذکر کی جاسکتی ہے۔

(۲) آیت دروایت میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ روایت میں قتال کا لفظ ہے، قتل کا نہیں، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اعلاء کلمۃ اللہ کرنے پر مامور ہیں، اور ان کو تبلیغ کے ذریعہ مسلمان بنانے کی کوشش کریں گے، اگر وہ لوگ اعلاء کلمۃ اللہ میں رکاوٹ ڈالتے ہوئے میدان میں نکل آئیں اور جنگ کیلئے تیار ہو جائیں تو پھر ہم ان سے اسوقت تک لڑائی کرتے رہیں گے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں، مگر روایت میں غیر مسلم کو جبراً مسلمان بنانے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ تبلیغ دین کی اشاعت میں جب حاکم بن جائیں اور جنگ کی تیاری کریں تو پھر ان سے لڑائی کی جائے گی۔

(۳) حدیث میں وحسبکم علی اللہ کہہ کر بتلایا گیا تھا کہ جب مشرکین دوران جنگ میں لا الہ الا اللہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں تو اب جنگ کو موقوف کرنے کیلئے اس تحقیق کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ وہ دل سے مسلمان ہوئے، یا اپنی جان بچانے کیلئے اگر توحید کا اقرار کریں تو ان کو مسلمان سمجھ کر ان کے ساتھ مسلمان جیسا برتاؤ کریں اور اگر دل سے نہیں ہوئے تو اس کا محاسبہ خدا کرے گا، اور وہ بروز قیامت عند اللہ منافق ہو گا اور منافقوں کو سزا بھی دی دیگا۔

اس تفصیل کی روشنی میں لست علیہم بمصیطر کا تعلق حسابہم علی اللہ سے ہوا، کہ ان کے حساب و کتاب کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔

اور مصیطر کا تعلق قلوب سے ہوا کہ چونکہ آپ ان کے قلوب پر مسلط نہیں، لہذا ان کی قلبی کیفیت کی ذمہ داری آپ پر نہیں، تو اس کا تعلق اُمروث ان اقاتل سے نہیں کہ کوئی اشکال لازم آئے۔

اس باب کے اختتام پر علامہ نوویؒ نے چند مفید باتوں کا استخراج کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ (تم الباب)

## باب الدلیل علی صحة الاسلام من حضره الموت مالم یشرع فی النزع وهو الغرغرة الخ

اس بات کا بیان جو مرتے وقت مسلمان ہو تو اس کا ایمان صحیح ہے جب تک حالہ نزع نہ ہو یعنی جاگتی نہ ہو اور مشرکین کیلئے دعائے مغفرت کرتا ممنوع ہے جو شرک پر مرے گا وہ جہنمی ہے کوئی وسیلہ اس کے کام نہیں آئیگا۔

❦ حدیث ❦ حَدَّثَنِي حَزْمَةُ بْنُ يَحْيَى التَّجِيبِيُّ قَالَ اَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ وَهَبٍ، قَالَ اخْبَرَنِي يُونُسُ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ اخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ لَقَا حَضْرَتَ ابِاطَالِبِ الْوَفَاةَ جَاءَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ عِنْدَهُ ابَا جَهْلٍ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنُ أَبِي أُمَيَّةَ ابْنَ الْمُغِيرَةِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَمِّ! قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَلِمَةً أَشْهَدُ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللَّهِ، فَقَالَ أَبُو جَهْلٍ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ أُمَيَّةَ يَا ابِاطَالِبِ! أُرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَلَمْ يَزَلْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْزِضُهَا عَلَيْهِ وَيُعِيدُ لَهُ تِلْكَ التَّمَقَّالَةَ حَتَّى قَالَ: ابِاطَالِبِ! آخِرُ مَا كَلِمَتُهُمْ هُوَ عَلَى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ وَأَمَّا أَنْ يَقُولَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَا وَاللَّهِ لَا سَتَغْفِرُونَ لَكَ مَا لَمْ أَنَا عَنْكَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى "مَنْ كَانَتْ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولَى قُرْبَى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ" وَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى فِي أَبِي طَالِبٍ فَقَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ" ❦ (۵)

ترجمہ | حضرت سعید بن مسیب اپنے والد مسیب سے روایت کرتے ہیں کہ جب خواجہ ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور ابوطالب کے پاس ابو جہل، اور عبد اللہ بن ابی امیہ کو موجود پایا، آپ نے ابوطالب سے فرمایا کہ اے چچا جان! آپ لا الہ الا اللہ کہہ لیجئے، میں آپ کے حق میں خدا کے روبرو گواہی دوں گا، اس پر ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ بول پڑے کہ اے ابوطالب کیا آپ کو اپنے باپ عبد المطلب کے مذہب سے نفرت ہے؟ اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کلمہ شہادت ان پر پیش کرتے رہے، اور ابو جہل و عبد اللہ بن ابی امیہ بھی اپنی بات ان پر دہراتے رہے، یہاں تک کہ ابوطالب کی آخری بات ان سے یہ تھی کہ میں عبد المطلب کے مذہب پر ہوں، اور ابوطالب نے لا الہ الا اللہ سے انکار کر دیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں آپ کے بارے میں اس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے آپ کے استغفار سے منع نہ کر دیا جائے، اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ نبی اور مومنوں کو زیبا نہیں کہ وہ مشرکین کے حق میں استغفار کریں، اگرچہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان لوگوں پر واضح ہو چکا کہ مشرکین جہنمی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے خواجہ ابوطالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی جس

میں آنحضور ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ جسے ہدایت دینا چاہیں نہیں دے سکتے، ہاں اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں سے خوب اچھی طرح واقف ہے۔

ربط :- باب سابق میں مشرکین کو دعوت دینے کا بیان تھا اور اس باب میں اس بات کا بیان ہے کہ مشرکین کو نزع اور غرغره کی حد شروع ہونے تک دعوت دی جائیگی، اور اس وقت بھی وہ ایمان قبول کر لیں تو مؤمن کہلائیں گے، اور اس وقت کا ایمان دین و دنیا دونوں جگہ میں کار آمد ہو گا، اسی لئے آپ نے نزع سے قبل ابوطالب پر کلمہ کو حید پیش فرمایا۔ (۱)

### شرح حدیث

اس روایت کے راوی مسیب بن حزن مخزومی ہیں، ابوطالب کی وفات کے وقت مسیب کافر تھے، ممکن ہے ابو جہل کے ساتھ یہ بھی اس واقعہ میں شریک ہوں پھر مسلمان ہونے کے بعد، مسیب نے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہو، ان سے صرف یہی ایک روایت منقول ہے۔ (۲)

قوله لما حضرت الخ حضرت بمعنی قربت، یعنی وفات کا وقت قریب ہو اور موت کے آثار ظاہر ہونے لگے، تلقین ایمان کا یہ واقعہ نزع اور عالم غیب کے مشکف ہونے سے پہلے ہی کا ہو سکتا ہے، کیونکہ غرغره اور نزع کے وقت کا ایمان معتبر نہیں، جیسا کہ قرآن کریم نشانہ ہی کر رہا ہے، وليست التوبة للذين يعملون السيئات حتى اذا حضر احدهم الموت قال اني تبت الآن، (۳)

نیز اگر ابوطالب پر نزع کی کیفیت طاری ہوتی تو پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل وغیرہ سے وہ بات کس طرح کر سکتے تھے، اس وقت انسان اس عالم سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے، ابوطالب کا لوگوں سے بات کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو حید کے وقت نزع کی کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی، مگر حافظ ابن حجر کی رائے یہ ہے کہ ایسا تو ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کی ابتدا نزع سے پہلے کی ہو، اور آپ برابر دعوت دیتے رہے، حتیٰ کہ نزع کی کیفیت طاری ہونے کے بعد بھی دعوت پیش کرتے رہے چونکہ ابوطالب اپنی زندگی بھر دین اسلام کیلئے قربانیاں پیش کرتے رہے اگر اس وقت بھی ابوطالب ایمان لے آتے تو ان کا ایمان قبول ہو جاتا اور اس میں ابوطالب کی خصوصیت ہوتی۔ (۴)

### کیفیت نزع کی ایک جھلک

عارف باللہ شیخ عبد الوہاب شعرانی اپنی کتاب البیوات والجوہر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ ہر مکلف کو موت سے قبل حالت نزع میں خدا کی وحدانیت، آخرت وغیرہ کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے، اور وہ ان مغیبات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے، اور اس پر اس کو اعتقاد قائم ہو جاتا ہے (اسی کو ایمان غرغره، ایمان یاس کہتے ہیں) مگر یہ ایمان نافع نہیں ہوتا، قرآن کریم میں ہے فلم يك ينفعهم ايمانهم لما راوا باسنا، (پ ۲۴ آیت ۸۴ ع ۱۴) ایک

(۱) یہ حدیث بخاری شریف میں کی جگہ ہے بہترین تخریج کے لئے دیکھئے فتح الباری ص ۵۰۶/۸۔ (۲) تہذیب المعذیب ص ۲۲۳/۵۔

(۳) پ ۱۴، آیت ۱۷، ع ۱۴۔ (۴) فتح الباری ص ۲۲۲/۳۔

جگہ فرعون کی بات ہاں الفاظ نقل کیا ہے: آمَنْتُ اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْ آمَنْتُ بِهِ بَنُوۤاۤ اِسْرَآئِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (پ ۱۱، آیت ۹۰ ع ۱۶)

مگر فرعون کے اس وقت کا ایمان اس کے لئے کار آمد نہیں ہوا یہ بات شیخ محی الدین بن عربی نے فتوحات مکہ میں ذکر فرمائی ہے، مگر شیخ عبد الوہاب فتوحات کی اس عبارت کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ جو لوگ شیخ ابن عربی کے بارے میں یہ مشہور کئے ہوئے ہیں کہ وہ ایمان فرعون کے قائل تھے یہ شیخ پر افتراء اور بہتان ہے، اور ایمان فرعون کی بات شیخ کی طرف غلط منسوب کرتے ہیں، فتوحات کی عبارت نے واضح کر دیا کہ شیخ اکبر فرعون کو کافر کہتے ہیں اور جمہور کے ساتھ ہیں جس طرح جمہور علامہ ایمان یاس کو کار آمد نہیں مانتے، شیخ اکبر بھی غیر مانع ہونے کے قائل ہیں، لیکن اس سلسلہ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے فتوحات مکہ کو دیکھا تو اس میں ایمان فرعون کا تذکرہ بصراحت موجود ہے، مگر شیخ عبد الوہاب شعرانی جیسے معتبر شیخ کی تردید سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکبر محی الدین عربی نے لوگوں کو بدگمان کرنے کیلئے ان کے مخالفین نے فتوحات مکہ میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہوگا، اس طرح کی تحریف و تمسیس کا ہونا کوئی بعید نہیں۔ (۱)

### اچھے نام کا اثر

یہ امر حقیقت ہے کہ نام کا اثر عموماً صاحب نام پر ضرور پڑتا ہے، اسی لئے اس نام کو زیادہ پسند کیا گیا ہے جس میں عبدیت کا معنی ظاہر ہوتا ہو، کہ تخلیق انسانیت کا منشا یہی ہے لہذا کچھ نہ کچھ اس میں نام کا اثر ظاہر ہوگا، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: آنحضور ﷺ کے چار چچا تھے، دو مسلمان ہوئے اور دو کافر ہی رہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ جن دو چچا کے نام غیر اسلامی تھے وہی دونوں اسلام سے محروم رہے، ایک ابو طالب جن کا نام عبد مناف تھا اور دوسرا ابو لہب، جن کا نام عبد العزیٰ تھا اور حضرت حمزہ عباس ان دونوں کے نام اسلامی تھے، تو اللہ نے ان دونوں کو اسلام سے نوازا۔ (فتح الباری)

ابا طالب الوفاء: ان کا نام عبد مناف تھا مگر کنیت سے مشہور تھے، حضرت عبد اللہ کے حقیقی بھائی تھے، اسی مناسبت سے عبد المطلب نے آنحضور کو ابو طالب کے حوالہ کیا تھا، ابو طالب برابر آپ کے جانثار، معاون و نمکسار رہے آپ پر آج نہیں آنے دیا، مگر شرف اسلام سے مشرف نہ ہو سکے، ابو طالب نے آپ کی حمایت میں بہت ہی فصیح اشعار کہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: وَاللّٰہُ لَنْ یَّصْلُوْا اِلَیْکَ بِجَمْعِهِمْ حَتّٰی اَوْسَدَ فِی التُّرَابِ دَفِیْنًا (۵)

ان کی وفات ہجرت سے پہلے ہوئی، اس وقت آپ کی عمر مبارک کے انچاس (۳۹) سال آٹھ ماہ گیارہ دن ہوئے تھے، ابو طالب کے تین دن بعد ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ کا وصال ہوا۔

### در خواجہ پر حضرت کی آمد اور تلقین ایمان

قوله جاءہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بعض روایت میں اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے کہ جب ابو طالب مرض الوفا میں مبتلا ہوئے تو قریش نے طنزاً ابو طالب سے کہا کہ اپنے بھتیجا محمد کے پاس کسی شخص کو بھیج کر کہلا بھیجے کہ وہ جس جنت کی خبر دیتے ہیں وہاں کی دوامجھے بھیج دو تاکہ مجھے اس بیماری سے نجات مل جائے، ان لوگوں کے کہنے

پر ابوطالب نے ایک شخص کو آپ کی خدمت میں بھیجا آپ نے سنتے ہی فرمایا کہ جنت کی نعمت کا فردوں پر حرام ہے، پھر آپ ابوطالب کے پاس تشریف لا کر ایمان کی دعوت دینے لگے۔

قوله عبد الله بن ابي أمية: یہ حضرت أم المؤمنين حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بھائی ہیں، فتح مکہ سے پہلے مشرف باسلام ہوئے اور جام شہادت نوش فرمایا۔ (۵)

قوله اشهد لك بها عند الله: بخاری شریف (ص ۲/۷۰۳) کی ایک روایت میں أحاج لك بها عند الله، کے الفاظ ہیں، اور طبرانی میں زہری کے حوالہ سے یہ بھی آیا ہے قال ای عم انك اعظم الناس على حقا واحسنهم عندي بدأ فقل كلمة تجب لي بها الشفاعة فيك يوم القيامة، (۶)

قوله ويعيد له تلك المقالة: ایک نسخہ میں ویعیدان له "بسیخہ کشنیہ ہے، (بخاری ص ۱/۱۸۱) مرجع ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ ہے۔

قوله وابی ان يقول لا اله الا الله: راوی نے بطور تاکید اس کا اضافہ کیا ہے، ابو ذر و نساء وغیرہ میں اتنا اضافہ اور ہے کہ جب ابوطالب کی موت ہوئی تو حضرت علی آپ کے پاس آکر بولے یا رسول اللہ! ان عمك الشيخ الضال قد مات، تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور گڑھا کھود کر مٹی سے چھپا دو (نسائی ص ۱/۲۸۳) بعض روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ ابوطالب کی وفات کے بعد حضرت عباسؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ ابوطالب جو زندگی بھر آپ کی پشت پناہی کرتے رہے اس کا آپ نے کیا بدلہ دیا؟ در آپ کی ذات سے ان کو کیا فائدہ پہونچا؟ تو آپ نے فرمایا کہ ان کو معمولی عذاب دیا گیا، اگر میں نہیں ہوتا تو وہ جہنم کے سب سے نچلے پلٹے میں ہوتے۔ (۷)

### عقیدہ شیعہ کہ ابوطالب مسلمان تھے

مذکورہ بالا تفصیل سے ابن اسحاق کی اس حدیث کا ضعف واضح ہو گیا، جس کا مضمون یہ ہے کہ جب ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو اس کے بعد حضرت عباسؓ نے ابوطالب کے ہونٹ پلٹے ہوئے دیکھا اور جب ان کے پاس پہنچ کر کان لگا کر سنا تو ابوطالب کو کلمہ پڑھتے ہوئے سنا، اور پھر حضرت عباسؓ آنحضور کو خوشخبری سنانے لگے، کہ خدا کی قسم میرے بھائی ابوطالب نے آپ کا پیش کیا ہوا کلمہ پڑھ لیا (فتح المسلم) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث کی سند صحیح ہوتی، تو مسلم کی اصح روایت سے محارض ہونے کی بنا پر قابل رد ہوتی، جبکہ ابن اسحاق کی روایت صحیح بھی نہیں، بلکہ اس میں مجہول راوی ہے، اس لئے جن لوگوں نے ضعیف روایتوں سے ابوطالب کا اسلام ثابت کیا ہے وہ غلط اور ناقابل قبول ہے، (فتح الباری)۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں: لا یعول علی روایاتہم، ثم انه علی القول بعدم اسلامه لا ینبغی سميہ والتکلم فیہ بفضول الکلام فان ذالك مما یتأذى به العلویون، (۸)

قوله أم والله: یہاں ام بغیر الف ہے جبکہ اکثر جگہوں پر "أما والله" الف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ دونوں صحیح ہے، بازائد ہے تاکید کیلئے بڑھایا گیا ہے، اور امر استفہام کے ساتھ جوڑا گیا ہے، اور اب دونوں کا مجموعہ دو موقع پر

استعمال ہوتا ہے، (۱) مضمون جملہ کی تحقیق و تاکید کیلئے جیسے اما واللہ لا فعلن کذا (۲) کسی کلام کو شروع کرنے کیلئے، مثل الا کے جیسے اما ان زیداً منطلق، اس صورت میں الا کی طرف اما بھی صدارت کلام کا تقاضا کرے گا، جب اما کے بعد قسم مذکور ہو تو عموماً الف کو حذف کر کے ام استعمال کیا جاتا ہے، حدیث میں یہی قاعدہ ملحوظ ہے کہ ام واللہ بغیر الف کے استعمال ہوا ہے۔

قوله فانزل الله عز وجل ماكان للنبي الخ: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت حضرت ابوطالب کی شان میں اتری ہے، مگر اس میں اشکال یہ ہے کہ ابوطالب کی وفات بالاتفاق مکہ میں ہوئی، اور ملک ان للنبي کی آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد اپنی والدہ مکرمہ کی قبر پر تشریف لائے، اور اللہ تعالیٰ سے اپنی والدہ کے حق میں استغفار کی اجازت چاہی، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حاکم نے عبد اللہ بن مسعود کے واسطہ سے روایت ذکر کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک بار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان تشریف لائے ہملوگ آپ کے ساتھ ہو گئے ایک قبر کے پاس بیٹھ گئے، اور دیر تک مناجات کرتے رہے پھر رونے لگے، ہم لوگ آپ کو روتے ہوئے دیکھ کر رونے لگے، اس کے بعد آپ نے خود فرمایا کہ میں اپنی والدہ کی قبر کے پاس بیٹھا تھا، اور میں نے ان کے حق میں دعا کے لئے اللہ تعالیٰ سے اجازت چاہی تو ہمیں دعا کی اجازت نہیں ملی، اور یہ آیت مجھ پر اتری ملک ان للنبي، (۳) اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت ابوطالب کی وفات کے بہت دنوں بعد اتری پس دونوں قول میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے یہ آیت بعد میں اتری ہو اگرچہ اس کا سبب پہلے وجود میں آچکا ہو، اور اس آیت کا شان نزول دونوں کو ٹھہرایا جاسکتا ہے، اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت دونوں کے بارے میں اتری ہو، ایک ابوطالب کے بارے میں اور دوسری حضرت آمنہ کے بارے میں، اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ ایک آیت کا شان نزول کئی واقعہ کو ٹھہرایا جاسکتا ہے، مثلاً کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تو قیامت تک اس طرح کے جتنے واقعات رونما ہوں گے سب کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت اس واقعہ کے بارے میں اتری، کیونکہ قاعدہ بنا ہوا ہے العبرة بعموم الالفاظ لا بخصوص الواقعة، اور اسکی تائید مسند احمد کی روایت سے ہوتی ہے، حضرت علی فرماتے ہیں میں نے ایک شخص کو اپنے مشرک والدین کیلئے استغفار کرتے سنا تو میں نے اس سے کہا کہ تمہارے والدین تو مشرک ہیں پھر تو استغفار کرتا ہے، اس نے کہا کہ حضرت ابراہیم نے مشرک والدین کیلئے استغفار کیا تھا، یہ معاملہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (۴)

اسی طرح طبرانی میں مجاہد کے حوالہ سے منقول ہے کہ مسلمانوں نے یہ دریافت کیا کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ کے حق میں استغفار کیا تھا، کیا ہم لوگ اپنے مشرک آباد اجداد کے حق میں بھی استغفار کر سکتے ہیں؟ اس پر ملک ان للنبي کی آیت نازل ہوئی، (۵) بہر کیف ایک آیت کا شان نزول متعدد واقعات کو ٹھہرایا جاسکتا ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ مذکورہ آیت ابوطالب کی شان میں اتری اور حضرت آمنہ کی شان میں بھی اتری، فلا تنقض بينهما۔

قوله انك لاتهدى من احببت: مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت ابوطالب کی شان میں نازل ہوئی۔

ہدایت کے دو معنی مشہور ہیں (۱) ایصال الی المطلوب (۲) ارادۃ الطريق، جو لوگ آیت میں ایصال الی المطلوب مراد لیتے ہیں ان پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، کیونکہ آیت میں نفی ایصال الی المطلوب کی ہے، جسکا مطلب یہ ہوگا کہ آپ جس کو چاہیں منزل تک پہنچا نہیں سکتے، کیونکہ آپ کا کام راستہ دکھلانے کا ہے، منزل تک پہنچانا خدا کا کام ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے ابوطالب کی رہنمائی کی، مگر وہ منزل تک نہیں پہنچ سکے، ہاں جو لوگ ہدایت کے معنی ارادۃ الطريق کے لیتے ہیں ان پر اعتراض یہ ہوگا کہ آیت میں نفی ارادۃ الطريق کی ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ لوگوں کو راستہ نہیں دکھلا سکتے حالانکہ نبی دنیا میں گمراہ لوگوں کو راستہ دکھلانے کیلئے ہی آتے ہیں، اور ان کا کام رہنمائی کا ہی ہوتا ہے لہذا آیت میں ارادۃ الطريق کی نفی کیسے کی گئی؟ اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے ان لوگوں کو دور ازکار تاویلات کرنی پڑی ہیں جبکہ کوئی بھی تکلف سے خالی نہیں، جیسا کہ شارح تہذیب نے تفکرات کئے ہیں۔

سب سے عمدہ اور آسان جواب یہ ہے کہ آیت میں ہدایت کے معنی ارادۃ الطريق کے لئے جائیں اور یہ کہا جائے کہ آیت میں نفی مطلق ارادۃ الطريق کی نہیں ہے بلکہ ارادۃ من احببت کی نفی ہے، اور شیخ عبدالقادر جرجانی نے یہ ضابطہ بتلایا ہے کہ جب نفی کلام مفید پر داخل ہو تو نفی قید کی ہوتی ہے، مقید کی نہیں مثلاً کوئی شخص یہ کہے حاضر بٹ زیداً فی الدار تو اس میں نفی ضرب کی نہیں ہے بلکہ مطلق ضرب کا اثبات ہے اور ضرب فی الدار کی نفی ہے، معنی یہ ہیں کہ میں نے زید کو مارا ہے، مگر گھر میں نہیں مارا، اسی طرح انک لا تہدی میں نفی من احببت کی ہے، نفس ہدایت کی نفی ہرگز نہیں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی کا کام ہر مومن و کافر کو راہ راست دکھلانا ہے، اور ایسے اسباب و وسائل مہیا کرنا جس سے ہدایت یاب ہو جائیں مگر رہنمائی وہی قبول کرتا ہے جس میں قبول کرنے کی صلاحیت ہو، اور یہ صلاحیت اور قبول کرنے کی استعداد آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے، پس آپ کی طرف سے ارادۃ الطريق ہوا مگر ان کی طرف سے قبولیت نہ ہوئی، اور ان کے نہ قبول کرنے سے آپ کے ارادۃ الطريق میں کوئی فرق نہیں آیا، جیسا کہ سورج تو پوری تابانی کے ساتھ پوری دنیا کو روشنی دے رہا ہے مگر چمکاؤ کو پھر بھی نظر نہیں آتا تو سورج کا کیا قصور؟

### ہدایت کی قسمیں

”لفظ ہدایت کی بہترین تشریح امام رافع اصنہانی نے کی ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصلی معنی کسی شخص کو منزل مقصود کی رہنمائی کرنا مہربانی کے ساتھ، ہدایت در حقیقت صرف اللہ ہی کا فعل ہے جسکے مختلف درجات ہیں۔

(۱) ہدایت عامہ :- ایسی ہدایت جو کائنات کی تمام مخلوق، جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ کو شامل ہے، اسی ہدایت کا تذکرہ اعطی کل شئی خلقہ ثم ہدی، میں فرمایا گیا ہے، اس ہدایت کا فائدہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر ہر چیز اپنا فریضہ نہایت سلیقہ سے ادا کر رہی ہے، جو جس کام میں لگادی گئی وہ حسن و خوبی کے ساتھ لگی ہے۔

(۲) ہدایت خاصہ :- یہ ہدایت ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے یعنی انسان، جنات، یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر انسان کو پہنچتی ہے، پھر کوئی مسلمان ہو اور کوئی بوجہ انکار کافر۔

(۳) ہدایت خاص الخاص :- یہ مؤمنین متقین کے ساتھ خاص ہے، یہ ہدایت بھی من جانب اللہ بلا واسطہ انسان

پر فائز ہوتی ہے، اسی ہدایت کا نام توفیق ہے، یعنی ایسے حالات و اسباب پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایت کا قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا آسان ہو جائے، اور انکی خلاف ورزی و شواہد ہو جائے۔ یہی تیسرے درجہ ترقی کا میدان ہے اور اس میں زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ ہدایت کی اس قسم کو سامنے رکھ کر ان آیات پر نظر ڈالئے جن میں ہدایت کا تذکرہ ہے، تو کہیں ہدایت ہر مومن و کافر بلکہ پوری کائنات کیلئے فرمایا، اور کہیں ہدیٰ للمتقین کہہ کر خاص کر دیا، مگر اس میں کوئی اشکال نہیں کہ دوسری آیت میں ہدایت خاص کا تذکرہ ہے، اسی طرح کہیں ہے کہ فاسقین کو ہدایت نہیں دی جاتی، اور کہیں مکرر ہے کہ یہ کتاب ہدایت سب کے لئے ہدایت ہے، تو مطلب یہ ہے کہ یہ ہدایت عامہ ہے، اور جہاں ہے کہ خالصین کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی وہاں ہدایت خاص الخالص کی نفی ہے۔

غرض قرآن نے جہاں کہیں، انبیاء کرام کو ہدایٰ کہا ہے تو اس دوسرے درجہ کے اعتبار سے اور جہاں انک لا تہدیٰ کہا اس میں ہدایت کے تیسرے درجہ کی نفی ہے یعنی توفیق دینا آپ کا کام نہیں۔ (۱۰)

**حدیث** عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لِعَبِّ قُل لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ أَشْهَدُ لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ لَوْلَا أَنْ تَعْتَرِضَنِي قُرَيْشٌ يَقُولُونَ إِنَّمَا حَمَلَهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ الْجَزَعُ لَأَقَرُّزْتُ بِهَا عَيْنَكَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ - إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۱۱)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے فرمایا کہ آپ لا الہ الا اللہ کہہ لیجئے، تاکہ قیامت کے دن میں آپ کے حق میں گواہی دے سکوں انہوں نے کہا کہ اگر قریش میرے سر پر بدنامی کا دلوغ نہیں لگاتے کہ میں نے عذاب آخرت پر بے مبری کی وجہ سے یہ کلمہ پڑھ لیا ہے تو میں ضرور آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

**تشریح** تعترضی، عار اور بدنامی کا دلوغ لگانا، عتبر متعدی بنفس ہے، قوله انما حملة على ذالك الجزع، جزم اور زہ کے ساتھ، بمعنی موت سے ڈرنا، بعض لوگ خزع خاہ اور راء کے ساتھ پڑھتے ہیں، معنی کمزوری اور دہشت کے ہیں۔ قوله لا قدرت بها عينك: اقر الله عينه کے معنی اللہ تعالیٰ اس کی آرزو کو پورا کر دے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ خواجہ ابوطالب کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر مجھے خوف ملامت نہ ہو تا تو کلمہ توحید پڑھ کر تمہاری آرزو پوری کر دیتا، اور تمہیں خوش کر دیتا، ابوطالب کا یہ جملہ پیدیتا ہے کہ ابوطالب کو معرفت قلبی اور تصدیق منطقی حاصل تھی، خود ایک شعر میں انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے

ودعوتنی وزعمت انک ناصحی \* ولقد صدقت وكنت قبل امیناً (۱۲)

مگر اتنی معرفت ایمان کیلئے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ التزام شریعت کا عہد و اقرار ہونا ضروری ہے، اور ابوطالب نے اختیار باطنی، اسلام یا التزام شریعت سے انکار کر دیا تھا، اس لئے وہ مسلمان نہیں ہوئے اسی لئے التزام شریعت کو قرآن نے ہاں لفظ ظاہر کیا ہے، فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا من جاحداً ولا قاضياً و يسلموا تسليماً



## باب الدلیل علیٰ انّ من مات علی التوحید دخل الجنة قطعاً

جس کی موت توحید پر ہوئی وہ یقیناً جنت میں جائیگا

❦ حدیث ❦ حدثنا ابو بکر بن ابی شیبہ ..... عن عثمان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة.

ترجمہ: حضرت عثمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس یقین کے ساتھ مر جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یقیناً جنت میں جائے گا۔ (۱)

ربط :- ابھی باب سابق میں یہ معلوم ہوا کہ انسان کتنا ہی بڑا مجرم ہو اگر موت کے وقت ایمان لے آئے تو وہ شخص عند اللہ وعند الناس مومن سمجھا جائے گا، ابو طالب کو دعوت دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ اس وقت ایمان لانا کارآمد ہو گا، اور یہ باب اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت و دوزخ کی تقسیم کفر و ایمان کی بنیاد پر کیا ہے، اچھے اور برے اعمال پر نہیں۔ بقول امام غزالی انسان اگرچہ ازلی نہیں مگر ابدی ضرور ہے اس لئے اس کو ایک ابدی مستقر کی ضرورت ہے، دنیا بادی نہیں بلکہ عارضی مستقر ہے۔

لہذا جب کفر و ایمان پر جنت و دوزخ کی تقسیم ہے تو مومن خولہ کتنا ہی مجرم کیوں نہ ہو، اس کا ابدی مستقر جنت ہی رہے گا، اور کافر خواہ کتنے ہی اچھے اچھے کام کیوں نہ کریں ان کا ابدی مستقر دوزخ ہی رہے گا۔

یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں، کہ علم کا مفہوم کیا ہے؟ (۲) اور اس حدیث سے کس فرقہ کی تردید ہوتی ہے؟  
یہاں علم کے معنی صرف دانستن نہیں، صرف دانستن نہ تو شرعی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نہ اس پر دخول جنت کی بشارت ہے، اس لئے اس کے معنی مرادوی معرفت و یقین کے ہیں، کیونکہ نسانی کی روایت (۲/۲۶۲) میں یہ روایت صراحتاً مذکور ہے قال الایمان لا شک فیہ، معلوم ہوا کہ جو شخص یقین کا مل اور عقیدہ جازم کے ساتھ دنیا سے گزر جائے وہ ضرور جنت میں داخل ہو کر رہے گا، کیونکہ جنت و دوزخ کی تقسیم کفر و ایمان پر ہے نہ کہ اچھے اور برے اعمال پر۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ علم، معرفت اور یقین کبھی تو اپنے ظاہری معنی میں مستعمل ہوتے ہیں اور کبھی کبھی علم کا اطلاق "حالت" پر ہوتا ہے اور علم "حالت" اس وقت ہوا کرتا ہے، جبکہ علم غالب ہو، اور جب علم غالب ہوتا ہے تو وہ عین ایمان بن جاتا ہے، اس لئے ایسی حالت میں کوئی انسان بغیر تصدیق کے رہ نہیں سکتا، پس "من مات وهو يعلم" سے وہی علم مراد ہے جو "حالت" بن جائے۔ (۳)

### فرق باطلہ کی تردید

مومن مرتکب کبیرہ کے ایمان کو کفر اور نجات سے متعلق مختلف مذاہب ہیں :  
فرقہ مرجعہ معصیت کو مومن کیلئے معفرانے ہی نہیں، خوارج معفران کر مرتکب کبیرہ کی تکفیر کرتے ہیں، اور معتزلہ

اگرچہ کفر کا نام نہیں دیتے مگر مغلذ فی النار مانتے ہیں، اشاعرہ مر تکب کبیرہ کو مومن مانتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ اس کے گناہ پر سزا دے تو پھر جہنم سے نکال کر جنت میں ضرور داخل کرے گا، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف کر دے، اور ابتداء ہی میں معاف فرما دے، مذکورہ بالا حدیث معتزلہ، خوارج ہر دو فریق کے نظریے کی بھرپور تردید کرتی ہے، البتہ مرجعہ جن کا مذہب ہے کہ لا تنصر مع الایمان معصیۃ کما لا تنفع مع الکفر طاعة، تو ان کا استدلال اسی حدیث سے ہو سکتا ہے، کہ محض اقرار توحید پر دخول جنت کا وعدہ ہے، خواہ اسکے بعد گناہ کرے یا نہ کرے، ان کا دوسرا عقلی استدلال یہ ہے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی معصیت اور گناہ مفسر ہو اور تارک العمل کا کسی درجہ میں جہنم میں جانا تسلیم کر لیا جائے تو صاحب ایمان کے ساتھ ایمان کا جہنم میں جانا لازم آئے گا، اور یہ ایمان کی توہین ہے۔

جواب :- چونکہ گناہ کبیرہ کے متعلق کچھ ایسی بھی روایتیں ہیں جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مر تکب کبیرہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، مثلاً لا یدخل الجنة نفاق، لا یدخل الجنة قتات، من یقتل مومنًا متعمدًا فجزاؤه جہنم، جبکہ حدیث باب سے بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس حدیث اور مذکورہ روایات کو تضاد و تعارض سے بچانے کیلئے تاویلات ضروری ہیں،

- (۱) حدیث باب کا مصداق وہ مومن عاصی ہے جس کے گناہ خدا نے معاف کر دیئے ہوں
- (۲) بوجہ معصیت جہنم کا مستحق تو ہوگا، مگر بوجہ شفاعت جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا،
- (۳) اگر وہ مؤحد ہے تو بہر حال جنت میں جائے گا، خواہ حق تعالیٰ گناہ معاف کر دیں یا بقدر گناہ عذاب دیکر جنت میں داخل کریں
- (۴) اگر مرجعہ کے بقول نفس توحید پر ہی دخول جنت ہو، اور یہی توحید کافی ہو، جب تو یہ بشارت اور سارے احکامات بے سود ہوں گے، بلکہ پوری شریعت کے چھڑانے کا سبب بنے گی، یوں کہئے کہ پھر تو انزالی شریعت لغو ہوگا۔

عقلی دلیل کا جواب یہ دستور ہے کہ جب کسی قیدی کو جیل میں داخل کیا جاتا ہے تو اگر اس کے جسم پر شاہی لباس ہو تو پہلے اس کے لباس کو باہر اتار کر رکھ دیا جاتا ہے، اسی طرح (بلا تشبیہ) چونکہ ایمان شاہی لباس اور جنت کی چیز ہے اس لئے جب غنومن جہنم میں جائے گا تو اس کا لباس ایمانی حسب دستور باہر رکھ دیا جائے گا، سزا بھگتنے کے بعد ایمان کا لباس پہنا کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا اس لئے ایمان کی توہین نہ ہوگی۔

قولہ وهو یعلم: اس عبارت سے ان غالی فرقہ مرجعہ کی تردید ہوتی ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ محض زبان سے اقرار کافی ہے، خواہ دل میں اعتقاد رکھے یا نہ رکھے، جبکہ اس روایت سے ثابت ہوا کہ شہادتین کے اقرار کے ساتھ دل سے یقین و اذعان بھی ضروری ہے، خود دوسری روایت میں غیر شاک فیہما کا لفظ واضح دلیل ہے۔

فرقہ مجہم یہ اس کا عقیدہ ہے کہ ایمان اور دخول جنت کیلئے صرف معرفت بالقلب کافی ہے زبان سے اقرار کی حاجت نہیں، وہ اسی روایت "وہو یعلم" سے استدلال کرتے ہیں، اس میں کہیں تصدیق باللسان کی قید نہیں، جبکہ اہل سنت کے نزدیک تصدیق قلبی کے ساتھ زبانی اقرار بھی دخول جنت کیلئے ضروری ہے۔

مجہم کا یہ عقیدہ صحیح نہیں، کیونکہ دگر روایات میں زبان سے کہنے اور شہادت دینے کی صراحت ہے، مثلاً من قال لا الہ

اَلَا اِلَهَ، مِنْ شَهِدَ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اَللّٰهُ، حَدِیْثِ مُعَاذٍ مِنْ مَنْ كَانَ اٰخِرَ کَلَامِهِ لَا اِلَهَ اِلَّا اَللّٰهُ، مَا مِنْ عَبْدٍ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اَللّٰهُ، حَرَّمَ اَللّٰهُ مِنْ قَالِ لَا اِلَهَ اِلَّا اَللّٰهُ يَنْبَغِيْ بِذٰلِكَ وَجْهَ اَللّٰهِ. اِنْ اَحَادِیْثِ سِیِّئَةِ اَقْرَارِ کَاثِبُوْتِ هُوَ تَاہِیْ اِسْ لَیْ اَقْرَارِ بِاَلْسَانِ کَیْ بَغِیْرِ کُوْنِیْ مُوْمِنٍ نِیْسٍ هُوَ سَکَلِ،

الترامی جواب :- اگر جہمیہ کے بقول ایمان صرف علم و معرفت کا نام ہو تو کہنا پڑے گا، کہ العیاذ باللہ فرعون مومن تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا تھا..... ان دونوں آیات میں علم و معرفت کی نسبت ان لوگوں کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ بالاتفاق وہ لوگ کافر تھے اسلئے مذکورہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس علم و معرفت ایمان کیلئے کافی نہیں۔  
کلمہ رسالت کا ذکر کیوں نہیں؟

”یہاں اشکال ہوتا ہے کہ جب ایمان بغیر شہادت رسالت کے معتبر نہیں اور نجات کے لئے صرف توحید کافی نہیں تو پھر حدیث باب بلکہ اس قسم کی مذکورہ روایات میں صرف توحید کو ہی کیوں بیان کیا گیا اور کلمہ رسالت کو چھوڑ دیا گیا؟ اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں :

(۱) لَا اِلَهَ اِلَّا اَللّٰهُ یہ کلمہ سلم بن چکاکے، یہ بول کر پورا کلمہ مراد لیا جاتا ہے۔ (۲) چونکہ بذریعہ شفاعت ہر امت کے افراد جہنم سے نکلیں گے، اور کلمہ میں ہر امت کیلئے تصدیق رسالت کا جملہ علیحدہ ہے اس لئے صرف پہلے جملے پر اکتفا کیا گیا، اور دوسرے جملہ کو مخاطب کے فہم پر چھوڑ دیا گیا۔ (۳) یہ کلمہ درحقیقت ایک اجمالی عنوان ہے جس کے تحت پوری شریعت شامل ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کلمہ رسالت بھی ہے۔“

❦ حَدِیْثُ ❦ حَدَّثَنَا اَبُو بَكْرٍ بْنُ النُّضَرِ ..... عَنْ اَبِي صَالِحٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: كُنَّا

مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَسِيرٍ قَالَ نَفَذْتُ اَزْوَاجَ الْقَوْمِ حَتَّى هُمْ بَنَجَرٍ بَعْضُ حَمَائِلِهِمْ، قَالَ فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ لَوْ جَمَعْتُ مَا بَقِيَ مِنْ اَزْوَاجِ الْقَوْمِ فَدَعَوْتُ اللّٰهُ عَلَيْهَا، قَالَ فَفَعَلَ قَالَ فَجَلَّةٌ ذُو الْبَرِّ بَبْرِهِ وَ ذُو التَّمْرِ بَتَمْرِهِ قَالَ، وَقَالَ: مَجْلَعٌ وَ ذُو النُّوَاةِ بَنُوَاةٍ، قُلْتُ وَ مَا كُنَا نُوَاةٌ بَنُصْنَعُونَ بِالنُّوَاةِ قَالَ: كَانُوا يَنْصُونَهُ وَ يَشْرَبُونُ عَلَيْهِ الْمَلَّةَ قَالَ فَدَعَا عَلَيْهَا قَالَ حَتَّى مَلَأَ الْقَوْمُ اَزْوَاجَهُمْ قَالَ فَقَالَ عِنْدَ ذٰلِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ لَا يَلْقَى اللّٰهُ بِيَهْمًا عَبْدٌ غَيْرَ شَاكٍ فِيْهِمَا اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ.

ترجمہ | حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک سفر (غزوہ تبوک) میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ میں تھا لوگوں کے زوارہ ختم ہو گئے تھے، نوبت اس کی آگئی تھی کہ ان میں کسی نے اپنی اونٹنی ذبح کرنے کا ارادہ بھی کر لیا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! کاش آپ لوگوں کے باقی ماندہ زوارہ منگا کر ایک جگہ جمع کر لیتے، پھر اس میں دعاء برکت فرمادیتے (تو بہتر ہوتا) آپ نے ایسا ہی کیا، راوی کا بیان ہے کہ جس کے پاس گیسبوں تھا وہ گیسبوں لے آیا، اور جس کے پاس کھجوریں تھیں وہ کھجوریں لے آیا، مجاہد کہتے ہیں جس کے پاس کھجور کی گھٹلیاں تھیں وہ اپنی گھٹلیاں ہی لے آیا، میں نے پوچھا بھلا گھٹلیاں ان کے کس کام آتی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ انہیں ہم چوس لیتے، اور اسی پر پانی پی لیا کرتے تھے آپ نے ان

میں دعاء برکت فرمائی پھر اسی برکت ہوئی کہ لوگوں نے اپنے اپنے ناشتہ دان بھر لئے، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں کوئی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور اس بات کی کہ میں اللہ کا رسول ہوں، جو شخص بغیر شک و تردد کے ان دونوں باتوں کی گواہی دیتا ہو خدا کے حضور میں حاضر ہو گا وہ ضرور جنت میں جائے گا۔

**تشریح** نحر بعض حمائلہم: حال اور جیم دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اگر حاک کے ساتھ پڑھا جائے تو حائل جمع حوالہ کی ہے بار بردار اونٹ کو کہا جاتا ہے، اور اگر جیم کے ساتھ ہو تو جملہ بکسر الجیم کی جمع، اور جملہ جمل کی جمع، گویا جمع الجمع ہوئی، مذکر اونٹ کو کہا جاتا ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اونٹوں کے ذبح کرنے کا ارادہ تقدیم الایم، فالایم کے قبیل سے تھا، کیونکہ سوار یوں سے زیادہ ایم مجاہدین کی جان بچاتا تھا، اور اس سے یہ قاعدہ نکلا کہ جب آدمی دو ضرر میں گھر جائے اور ان میں سے ایک شدید اور ایک ضعیف ہو تو شدید کو دور کرنے کیلئے ضعیف کا ارتکاب کیا جاسکتا ہے۔ (۱)

قوله لو جمعت ما بقی: اس مشورہ سے معلوم ہوا کہ ادنیٰ اعلیٰ کے سامنے مصلحت آمیز بات پیش کر سکتا ہے اور افضل کو چاہئے کہ اگر اس میں بھلائی ہو تو کر لینا چاہئے۔ قوله کانوا یعضونہ: میم مفتوح کو فصیح بتلایا جاتا ہے، مص کو پانچ طرح پڑھا جاتا ہے، مص: بفتحہما، مص: بفتح المیم وکسر الصاد، مص: بضم المیم وفتح الصاد، مص: بضم المیم وکسر الصاد، مص: بضمہما، قوله: ملا القوم ازودتہم: ازودۃ یہ زاد کی جمع ہے اس سے قبل اوعیہ محذوف ہے اور تقدیر عبارت یہ ہے کہ ملا القوم اوعیہ ازودتہم، گویا مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اسکی جگہ رکھ دیا گیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ظرف کو مظروف کا نام دیدیا گیا ہو، ظرف و مظروف کے درمیان مناسبت کی وجہ سے۔

### اضافہ توشہ پر شہادتین کی فضیلت کا کیا جوڑ؟

”یہاں ایک طالب علمانہ سوال ہو سکتا ہے جب صحابہ کے توشے کم ہو گئے، اور آپ کی دعاء کی برکت سے غیر معمولی اضافہ ہوا تو اس موقع پر شہادتین کی فضیلت ذکر کرنے کا کیا موقع؟ اس سوال کے جواب سے پہلے ایک اصول سمجھیں کہ انسانی فطرت عام طور پر مشاہدہ، تجربہ پر جلدی یقین کرنے کا عادی ہے، اور عقلی طور پر اسی بات کو باور کرتا ہے جو مشاہدہ کا نتیجہ ہو، پھر دوسری طرف ایمان و شریعت کا پورا حاملہ ہی مغیبات پر ہے اس لئے ضروری ہوا کہ انبیاء کرام قوم کے سامنے وہ مثال اور نمونہ پیش کریں جو مغیبات کو ماننے اور یقین کرنے کیلئے انسانی فطرت کو مطمئن کر سکے، اور اس کی فطرت کے مطابق ایسی دلیل پیش کریں جن کا تعلق مشاہدات سے ہو اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے، پھر جب انسان معجزات کو دیکھتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ چیزوں کی خاصیت اور ناپ و تول کا وہ اصول جو اس کے ذہن میں بیٹھا ہے وہ باطل تھا، تو اس کے اندر کسی عظیم طاقت کے ماننے کا احساس پیدا ہوتا ہے، کہ کوئی تو ہے جو ان خاصیتوں کا خالق ہے اور رفتہ رفتہ مغیبات کے ماننے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، پھر جب مشاہدہ کرتا ہے کہ ہمارے ذہنی اصول کے برخلاف ان عجیب عجیب چیزوں کا (معجزہ) تعلق انبیاء کے اشارہ پر ہے تو اب اس کے لئے دعویٰ رسالت کی تصدیق کرنے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا، اس تمہید کے بعد اس حدیث باب میں تذکرہ شہادتین کا جوڑ سمجھ میں آ جاتا ہے، کہ دستر خوان پر غیر معمولی اضافہ ایک معجزہ ہی ہے، کہ اس جیسے معجزات کو دیکھ کر مغیبات

کہانا آسان ہو جاتا ہے لہذا اس کا تقاضا ہے کہ اقرار بھی کر لیا جائے، اور اقرار کا یہ قاعدہ ہے کہ جنت حاصل ہو۔“

**حدیث** ﴿ حَدَّثَنَا سُهَيْلُ بْنُ عَثْمَانَ وَغَيْرُهُمْ ..... عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَوْ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ شَكَ الْأَعْمَشُ، قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمَ غَزْوَةِ تَبُوكَ أَصَابَ النَّاسَ مَجَاعَةٌ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ أَذْنُكَ لَنَا فَتَحَرْنَا نَوَاضِحَنَا وَادَّهَنَّا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِفْعَلُوا قَالَ: فَجَلَّ عُمَرُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْ فَعَلْتُ قَلَّ الظُّهُرُ وَلَكِنْ أَدْعُهُمْ بِفَضْلِ أَرْوَادِهِمْ ثُمَّ أَدْعُ اللَّهَ لَهُمْ عَلَيْهَا بِالْبَرَكَةِ لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يَجْعَلَ فِي ذَلِكَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ، قَالَ فَدَعَا بِنَطْعٍ فَبَسَطَهُ ثُمَّ دَعَا بِفَضْلِ أَرْوَادِهِمْ قَالَ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيءُ بِكَفٍّ ذُرَّةً، قَالَ وَجَعَلَ يَجِيءُ الْآخَرُ بِكَفٍّ تَمْرٍ قَالَ وَيَجِيءُ الْآخَرُ بِكُسْرَةٍ حَتَّى اجْتَمَعَ عَلَى النَّطْعِ مِنْ ذَلِكَ شَيْءٌ يَسِيرٌ، قَالَ فَدَعَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْبَرَكَةِ ثُمَّ قَالَ خَذُوا فِي أَوْعِيَتِكُمْ قَالَ فَاخْذُوا فِي أَوْعِيَتِهِمْ حَتَّى مَا تَرَكُوا فِي الْعُسْكَرِ وَعَاءً إِلَّا مَلُئُوهُ قَالَ فَالْكُلُوا حَتَّى شَبِعُوا وَفَضَلْتُ فَضْلَةً فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللَّهِ لَا يَلْقَى اللَّهُ يَوْمًا عَبْدًا غَيْرَ شَاكٍ فَيُحْجَبَ عَنِ الْجَنَّةِ. (مسلم ص ۴۳)

ترجمہ

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ تبوک کے زمانہ میں جب لوگوں پر فاقہ ہوا تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم لوگ اپنے اپنے اونٹ کو ذبح کر کے کھائیں اور اس کی چربی سے قاعدہ اٹھائیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کر سکتے ہو، راوی کا بیان ہے کہ اتنے میں حضرت عمر آئے، اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ اگر آپ ایسا کریں گے تو سواری کم ہو جائے گی (بجائے اس کے) آپ لوگوں کے یا قیما نہ ز اور راہ کو منگوائیں اور پھر اس پر اللہ سے برکت کی دعا فرمائیں ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت عنایت فرمادیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے راوی کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چمڑے کا دسترخوان منگایا اور اسکو پھیلا دیا، پھر لوگوں کے زاور راہ منگوائے، راوی کا بیان ہے کہ کوئی ایک مٹھی چنا لیکر آیا، اور کوئی ایک مٹھی کھجور لیکر، اور کوئی روٹی کا ایک ٹکڑا لایا، یہاں تک کہ بچے ہوئے چمڑے پر تھوڑی سی مقدار جمع ہو گئی اس کے بعد آنحضور ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی، اور فرمایا کہ تم لوگ اپنے اپنے برتنوں میں لیتے جاؤ، راوی کہتے ہیں لوگوں نے اپنے اپنے برتنوں میں لیا، اور لشکر کے ہر فرد نے اپنا پناہ برتن بھر لیا، اور سبھوں نے شکم سیر ہو کر کھایا، اور اسکے بعد بھی کچھ بچ گیا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، جو شخص بغیر شک و تردید کے ان دونوں باتوں کی گواہی دیتا ہو خدا کے حضور میں حاضر ہو گا تو جنت میں جانے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

قوله شك الاعمش: اس قسم کے شک سے متن حدیث میں کسی قسم کا ضعف پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں شک عین صحابی میں ہے، خطیب بغدادی وغیرہ نے محدثین کا یہ قاعدہ نقل کیا ہے کہ جب کوئی راوی ”حدیثی فلان وفلان“ کہے اور وہ دونوں ثقہ ہوں تو ایسی روایت قابل حجت ہوتی ہے کیونکہ دو میں سے کسی ایک کا ثقہ سے روایت کرنا مقصود ہوتا ہے،

محمد شین کا یہ قاعدہ غیر صحابی کے بارے میں ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب غیر صحابی میں ”فلان او فلان“ سے کوئی اثر نہیں پڑتا تو صحابی میں اس قسم کے شک سے بدرجہ کوئی کوئی اثر نہ ہوگا، لان الصحابة کلهم عدول، لہذا ہندو سند ابو ہریرہ ہوں یا ابو سعید خدری، عین کی بحث سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں۔

قوله يوم غزوة تبوك: یوم سے مراد وقت اور زمانہ ہے، یوم شرعی طلوع فجر سے غروب شمس تک کا درمیانی حصہ مراد نہیں، قوله مجاعة: بفتح المیم تخت بھوک، فنحن نواضعنا الخ نواضع: وہ اونٹ جس سے آپاشی کا کام لیا جائے، مذکر کو ناضح اور مؤنث کو ناضحہ کہتے ہیں، واذھنا، اذھان کے مشہور معنی بدن میں تیل لگانا (مالش کرنا) مگر یہاں مراد چربی کو تیل کی طرح استعمال کرنا۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ معبط ہوتا ہے کہ جہاد میں جن جانوروں سے مدد لی جاتی ہے کسی فوج کے لئے بغیر سپہ سالار کی اجازت کے ذبح کرنے کی اجازت نہیں، اور سپہ سالار کے لئے بغیر کسی مصلحت اور ضرورت کے اجازت دینا جائز نہیں، قوله قتل الظہر، ظہر سے مراد چوپایہ ہے، ظہر اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی پیٹھ پر سواری کی جاتی ہے، یا اس لئے ظہر کہا جاتا ہے کہ سفر میں اس سے مدد لی جاتی ہے۔

قوله لعل الله ان يجعل الخ: حضرت عمرؓ کا ظہور معجزہ کیلئے ”لعل“ صیغہ شک استعمال کرنا اس حقیقت پر مبنی ہے کہ معجزہ نبی کے بس اور اختیار میں نہیں ہوتا، نبی جب چاہیں معجزہ دکھلا دیں، ایسا نہیں ہوتا، بلکہ وہ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے جب وہ چاہے نبی کے ہاتھ ظاہر کر دے۔

سحر اور معجزہ میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ ساحر کا سحر اس کا اختیاری ہوتا ہے، جب چاہے اپنا فن دکھلا دے، مگر نبی ایسا نہیں کر سکتا۔

ذرة: بضم الدال وتخفيف الراء، مشہور رائج جس کو ہندی میں چنا کہا جاتا ہے۔

کیا نبی کو اپنی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے؟

فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْخِ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی رسالت کی بھی شہادت دیتے ہیں، اور جس طرح دوسرے لوگ انبیاء کی نبوت پر ایمان لاتے ہیں نبی کو اپنی نبوت پر اسی طرح ایمان لانا پڑتا ہے۔

حَدِيثٌ ﴿ حَدَّثَنَا دَاوُدُ بْنُ رُشَيْدٍ ..... قَالَ نَا عِبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ وَأَنَّ عِيسَى عَبْدُ اللَّهِ وَابْنُ أَمَّتِهِ وَكَلِمَتُهُ الْقَاهَا إِلَى مَوْتِهِ وَرُوحُ مِنْهُ وَإِنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ وَالنَّارَ حَقٌّ أَدْخَلَهُ اللَّهُ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةِ شَاءَ، (مسلم ص ۱۳)

عبادہ بن صامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں جو شخص اس کی گواہی دے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ تنہا ہے اور اس بات کی کہ محمد ﷺ بلاشبہ اس کے بندے اور رسول ہیں اور عیسیٰ

ترجمہ

علیہ السلام بھی اس کے بندے ہیں اور اس کی بندی کے لڑکے اور اس کا کلمہ ہیں، جسے اس نے حضرت مریم پر القا فرمایا تھا اور اس کی طرف بھیجی ہوئی ایک روح ہیں، اور جنت حق ہے، جہنم حق ہے، (ان اصولی عقائد کو تسلیم کر لینے کے بعد) اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریگا، اور اُسے اختیار دیگا کہ وہ جنت کے آٹھ دروازوں میں سے جس سے چاہے داخل ہو جائے۔

قوله وان عیسیٰ عبد الله: بخاری شریف (۱/۴۸۸) میں در سولہ کا بھی اضافہ ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت میں ابن امہ لائے کا مقصد نصاریٰ پر تعریض ہے، اور ان کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ ان کا ایمان عقیدہ تثلیث کے ساتھ، شرک محض ہے نیز امتہ کی اضافت تشریفی سے، حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی پاکدامنی کا ثبوت پیش کرتا ہے، کیونکہ خدا کی بچی کی بندی اسی وقت ہو سکتی ہیں جبکہ وہ عقیفہ پاکدامن ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی رسولہ صفت لاکر یہودیوں کی تردید ہے، جو ان کو رسول تسلیم نہیں کرتے۔

در حقیقت حضرت عیسیٰ کے متعلق عیسائی اور یہودی کا عقیدہ افراط و تفریط پر مبنی ہے، عیسائیوں میں خود تین فرقہ اور جماعت تھی، ایک فرقہ کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ عین خدا ہیں، اور وہی خدا بشکل عیسیٰ مسیح دنیا میں اتر آئے، دوسرے فرقہ کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں اور تیسرے کا دعویٰ ہے کہ وحدتِ خدا کی کارائتین میں پوشیدہ ہے، (باپ، بیٹا اور مریم میں) پھر اس جماعت میں بھی دو پارٹی تھی، ان میں ایک جماعت حضرت مریم کی جگہ حضرت جبرئیل کو اقنوم ثالث مانتی تھی، غرض یہ لوگ حضرت عیسیٰ کو ثالث، علیہ تسلیم کرتے ہی تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہیں تو بتیوں کو علیحدہ علیحدہ، اور کہیں ایک ساتھ مخاطب کیا ہے، اور ان کے بطلان کو واضح کیا ہے، نیز اس سے یہودیوں کے عقیدہ فاسدہ اور الزام تراشی کہ وہ نعوذ باللہ شعبہ باز، ولد الزنا اور مفتری تھے دونوں کی تردید ہوتی ہے۔

### حضرت عیسیٰ کو کلمہ، روح اور ابن امہ کہنے کی حکمت

ابن امہ: ”خدا کی باندی کا صاحبزادہ“ کلام عرب میں کبھی کبھی کسی چیز کی نسبت و اضافت خدا کی طرف کر دی جاتی ہے جس کا مقصد اس کی شرافت و فضیلت اور اہمیت و حیثیت کو بظاہر ہوتا ہے، اور بس، یہاں بھی حضرت مریم کی نسبت خدا کی طرف اسی اظہارِ شرافت کے پیش نظر ہے، اور اس سے یہودیوں پر تعریض مقصود ہے کہ خدا کی طرف نسبت کا ہونا، بچی کی بندی ہونے کی علامت ہے، اور یہ اسی وقت ہو گا جبکہ پاکدامن اور عقیفہ ہو۔“

قوله وکلمته القاها: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے کلمہ ہیں، کلمہ کے کیا معنی؟ مفسرین نے اس کی مختلف توجہیں کی ہیں: امام غزالی فرماتے ہیں کہ خدائی تخلیق کا نظام یہ ہے کہ کسی بچے کی پیدائش میں دو عامل کار فرما ہوتے ہیں ایک نطفہ اور دوسرا خدا کا کلمہ ”کن“ جس کے بعد بچہ وجود میں آتا ہے، (۱) چونکہ حضرت عیسیٰ کی تخلیق میں پہلا عامل نہیں پایا گیا بلکہ صرف دوسرے عامل سے وجود میں آئے، اسی لئے اس عامل کی طرف نسبت کر کے آپ کو کلمہ اللہ سے تعبیر کیا گیا، کہ مادی اسباب کے بغیر کلمہ ”کن“ سے پیدا ہوئے، تو اس صورت میں القاھا الی مریم کا مطلب یہ ہو گا کہ حق تعالیٰ نے کلمہ ”کن“ حضرت مریم تک پہنچایا جس کے نتیجے میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش عمل میں آگئی۔

(۲) بعض نے کہا کہ کلمۃ اللہ بشارت اللہ کے معنی میں ہے، کیونکہ بذریعہ فرشتہ حضرت مریم کو اِذْ قَالَتْ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ دِی گئی، اس لئے کلمہ ہی حضرت عیسیٰ کا نام رکھا گیا، (۳) بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ چونکہ گہوارہ میں ہی ان کو قوت گویائی عطا ہوئی اس لئے ان کو کلمہ کہا گیا، بہر حال حضرت عیسیٰ کی تخلیق انسانوں پر خدائی قدرت کی مکمل دلیل ہے کہ بن باپ کے پیدا ہوئے، گہوارہ میں قوت گویائی عطا کی، اور ان کے کلمہ تم باذن اللہ کے ذریعہ مردوں کو زندہ کیا۔

روح منہ: اس میں دو باتیں قابل غور ہیں، کہ حضرت عیسیٰ کو روح کہنے کا کیا مطلب؟ خدا کی طرف روح کی نسبت کی گئی ہے اس کا کیا مفہوم؟

(۱) عرف کا قاعدہ ہے کہ جب کسی شئی کی پاکیزگی بیان کی جاتی ہے تو بطور مبالغہ روح کہہ دیا جاتا ہے، حضرت عیسیٰ کی پیدائش میں کسی انسانی نطفہ کا دخل نہیں، بلکہ ان کی ولادت صرف اللہ کے ارادہ اور کلمہ کن کے نتیجے میں ہوئی، اس لئے نظافت و پاکیزگی میں درجہ کمال کو پہنچے، اس لئے عرف کے محاورہ کے مطابق ان کو روح کہہ دیا گیا۔

(۲) بعض علماء نے یہ وجہ بتلائی ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے لہذا وہ خود مثل روح ہوئے۔

(۳) ایک قول یہ بھی ہے کہ روح نفع پھونکنے کے معنی میں ہے، حضرت جبرئیل نے حضرت مریم کے گریبان میں پھونک دیا تھا اسی سے حاملہ ہوئیں، جس میں نطفہ کی آمیزش نہیں تھی، اور نہ ہی علقہ، مضغہ کی نوبت آئی۔

(۴) حضرت عیسیٰ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ مردہ دلوں میں روحانی حیات و اللہ میں جس طرح روح جسمانی حیات کا ذریعہ ہے، اسی طرح یہ روحانی حیات کے ذریعہ تھے اس لئے ان کو تخلیق روح کہہ دیا گیا۔

(۵) اصل عبارت "ذو روح منہ" ہے روح والے، چونکہ روح میں بھی حیوان برابر ہیں مگر حضرت عیسیٰ کی روح کی آمد کو خصوصیت حاصل ہے اسلئے اس کا امتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا کہ اس روح کی نسبت خدا نے اپنی طرف کر دی۔ (۱)

لطیفہ:- ایک عیسائی نے کسی مسلمان قاری کی زبان سے جب روح منہ سنا تو کہنے لگا کہ یہ تو بالکل نصاریٰ کے عقیدہ

کی ترجمانی ہے، کیونکہ من جمع فیہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ کے جزء ہیں، اور یہی

مذہب نصاریٰ کا ہے، اس کا جواب علی بن حسین بن داؤد نے اس نصرائی کو اس طرح دیا کہ اگر روح منہ میں من جمع فیہ ہے تو

دوسری جگہ قرآن میں ہے، وَسَخَّرْنَاكُمْ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ، اس آیت میں منہ موجود ہے

لہذا اگر روح منہ کا تقاضا یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے جزء ہیں تو جمیعاً منہ کا تقاضا یہ ہے کہ پھر ساری مخلوق خدا کی جزء ہے،

پھر حضرت عیسیٰ کی خصوصیت ہی کیا رہ گئی؟ یہ جواب منکر وہ عیسائی مسلمان ہو گئے۔ اس آیت میں جمیعاً منہ کا مطلب یہ ہے کہ

تمام چیزوں کا موجد اور زمین و آسمان وغیرہ کو انسانوں کے لئے مخر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، خلاصہ یہ کہ عرب میں اضافت کی

بہت سی قسمیں ہیں، ان میں ایک قسم اضافت تشریف بھی ہے جیسے بیت اللہ میں اظہار شرافت مقصود ہے، روح اللہ، کلمۃ اللہ کا

مفہوم بھی تشریف سے زیادہ کچھ اور نہیں۔



اس جگہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے ایک لطیف تحقیق لکھی ہے فرماتے ہیں کہ یوم یثیق میں تمام ارواح سے عہد لیکر سب کو اصحابِ آباء میں واپس کر دیا گیا تھا، ایک حضرت عیسیٰ کی روح تھی جو واپس نہیں کی گئی، بلکہ اسکو حضرت جبرئیل کے حوالہ کر دیا گیا تھا تاکہ جب حضرت عیسیٰ کی ولادت کا زمانہ آئے تو وہ اس لمانتِ الہیہ کو براہِ راست حضرت مریم کے حوالہ کر دیں، چنانچہ جب ان کی ولادت کا زمانہ قریب آیا تو حضرت جبرئیل ایک خوبصورت انسان کی شکل میں متشکل ہوئے، اور یہ لمانت ان کے حوالہ کر دی، حضرت عیسیٰ کے روح اللہ اور روح منہ کی حقیقت یہ ہے۔ (۱)

**اعتراف:-** قوله ادخله اللہ: اس میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہر جنتی کے جنت میں جانے کیلئے ایک مخصوص دروازہ ہے اور وہ صرف اسی دروازہ سے جنت میں جائیگا، اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ دروازوں میں سے جس سے جانا چاہے اس کو اختیار ملے گا، اسکا جواب یہ ہے کہ اس کو اختیار تو دیا جائے گا، لیکن یہ بات اسکے ذہن میں ڈال دی جائیگی کہ تمہارے لئے افضل اور انسب وہی مخصوص دروازہ ہے جو تمہارے لئے پہلے سے متعین کر دیا گیا ہے، اسلئے تمام دروازوں سے داخلہ کی اجازت اسکی شرافت و کرامت کو ظاہر کرنے کیلئے ہے، اور اس کے بار میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس دروازہ سے وہ داخل ہوا ہے وہ اپنے ارادہ و اختیار سے داخل ہوا ہے، عام اجازت کے بعد دوسرے دروازہ سے بھی داخل ہو سکتا تھا۔

**خلاصہ حدیث:** اس حدیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ نجات ابدی کا دار و درایمان و عقائد کی اصلاح پر ہے، اس میں کوئی لاپرواہی کو تابعی بھی قابلِ درگزر نہیں ہو سکتی، ہاں اعمال کی ہر کمزوری قابلِ درگزر ہو سکتی ہے، اسلامی تمام عقائد کی روح توحید و رسالت ہے، مگر وہ توحید نہیں جس کو عقیدہ تثلیث کے ساتھ جوڑا جائے بلکہ وہ توحید جس میں مثال و نظیر کی گنجائش نہ ہو، اس لئے نصاریٰ کو یہ ماننا ہو گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں، بلکہ اس کے بندے ہیں، اور یہودی کو یہ اقرار کرنا ہو گا کہ عیسا بن اللہ وہ ملعون نہیں، بلکہ خدا کے مقدس رسول تھے۔ کلمہ اللہ اور روح اللہ بھی تھے، راہ اعتدال بس یہی ہے اس کے بغیر جنت میں داخلہ نہیں ہو سکتا۔

**حدیث:** ﴿ حَدَّثَنَا عَنْ الْاَوْزَاعِيِّ عَنْ عَمْرِو بْنِ هَانِي فِي هَذَا الْاِسْنَادِ وَبِمِثْلِهِ غَيْرَ اَنَّهُ قَالَ: اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلَى مَا كَانَ مِنْ عَمَلٍ وَلَمْ يَلْزَمْ مِنْ اَيِّ ابْوَابِ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةِ مِثْلَهُ. (۲) ﴾

علیٰ ماکان من عمل: خولہ کوئی بھی عمل ہو نیک ہو یا بد، جنت میں جائے گا، مطلب یہ ہے کہ اقرارِ توحید و رسالت کے بعد جنت کا وہ مستحق ضرور ہے خولہ نیک عمل ہو یا بد، لیکن اس مطلب پر اشکال لازم آتا ہے کہ بہت سی احادیث سے مومن موحّد کے معاصی پر مستحق عذاب ہونے کا ثبوت ملتا ہے، پھر یہ کیسے صحیح ہو گا کہ اقرارِ توحید کے بعد جو چاہے کرتا رہے، جنت میں یقینی طور پر جائے گا، اس طرح کی روایات جس میں مطلقاً کسی بھی عمل یا صرف کلمہ توحید پر دخولِ جنت کی بشارت ہے اس کے متعلق مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں جو آگے آرہے ہیں، یہاں ایک اصولی جواب نقل کیا جاتا ہے۔

”سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر من جانب اللہ دو حالات منکشف ہوا کرتے تھے کبھی تو خدائی رحم و کرم اور فضل و عنایت کے احوال منکشف ہوتے، اور کبھی خدا کے غیض و غضب، قہر و جلال کے احوال منکشف ہوتے، گویا خدا کی جو دو شان

ہے ایک شانِ جمالی اور ایک شانِ جلالی، یہ دونوں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوا کرتی، تو جب خدا کی رحمت و شفقت، لطف و کرم کا انکشاف اور غلبہ ہو تا اور امت کے حق میں بے پناہ رحمت و مسرت کی امید ہوتی تو فرماتے ادخلوا الجنة علی ماکان من عمل، کبھی فرماتے: من قال لا اِلهَ اِلاَّ اللهُ صدقاً من قلبه دخل الجنة وحرمة النار، تو کبھی فرماتے ما من عبد قال لا اِلهَ اِلاَّ اللهُ ثُمَّ ماتَ علی ذالک اِلاَّ دَخَلَ الجنةَ وَاِنْ سَرِقَ، غرض غلبہ رحمت کے عالم میں مطلق دخولِ جنت کی بشارت ارشاد فرماتے اسی میں سے علی ملکاً من عمل بھی ہے۔ لیکن جب خدائی تہر و جلال، غیض و غضب کے احوال منکشف ہوتے تو ”لا بدخل الجنة من لا یأمن جاره بوائقة“، ”ومن انتمی الی غیر ابیہ فالجنة علیہ حرام“ وغیرہ فرماتے غرض خدا کی دو شان پر نظر کر کے دو قسم کے احکام صادر ہوتے ہیں، لہذا رحمتِ الہی کے غلبہ کے وقت نفسِ توحید پر جنت کی بشارت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ معاصی پر عذاب نہ ہوگا۔

(۲) اس حدیث کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اقرارِ توحید و رسالت کے بعد جنت کا مستحق ہوگا، تاہم جنت کے مراتب حاصل کرنے کیلئے اعمال کی ضرورت ہے جس کا جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق جنت کے مرتبہ پر فائز ہوگا۔ ”م  
**حدیث** ﴿ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ ..... عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّهُ قَالَ دَخَلْتُ عَلَيْهِ وَهُوَ فِي الْمَوْتِ فَقَالَ: مَهْلًا لَمْ تَبْكِي فَوَاللَّهِ لَأَنْ أَسْتَشْهَدَ لَأَشْهَدَنَّ لَكَ وَلَئِنْ شَفَعْتُ لَأَشْفَعَنَّ لَكَ وَلَئِنْ اسْتَطَعْتُ لَأَنْفَعَنَّكَ، ثُمَّ قَالَ: وَاللَّهِ مَا مِنْ حَدِيثٍ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَكُمْ فِيهِ خَيْرٌ إِلَّا حَدَّثْتُكُمْوَهُ إِلَّا حَدِيثًا وَاحِدًا وَ سَوْفَ أَحْدِثُكُمْوَهُ الْيَوْمَ، وَقَدْ أُحِيطَ بِنَفْسِي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ شَهِدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ النَّارَ،

ترجمہ حضرت مناہجی حضرت عبادہ بن صامت سے نقل کرتے ہیں کہ میں عبادہ بن صامت کی خدمت میں ایسے وقت پہنچا جبکہ وہ نزع کی حالت میں تھے، ان کو دیکھ کر مجھ پر گریہ طاری ہو گیا انہوں نے فرمایا غم نہ کرو، کیوں روتے ہو؟ اگر تمہارے حق میں مجھ سے شہادت طلب کی گئی تو میں تمہارے لئے شہادت دوں گا اور اگر میری سفارش منظور کی گئی، تو تمہارے لئے ضرور سفارش کروں گا، اگر کوئی نفع رسائی میرے بس میں ہوگی تو میں ہر گز اس سے دریغ نہیں کروں گا، اس کے بعد فرمایا بخدا کوئی حدیث ایسی نہیں جس میں تمہارے لئے بہتری کی بات ہو اور میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو مگر میں نے تم سے بیان کر دیا ہے، مگر ایک حدیث باقی ہے، اور آج جبکہ میری جان موت کے پنجہ میں گرفتار ہے اُسے بھی تم سے بیان کر دیتا ہوں، میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ جو شخص اس کی گواہی دے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس بات کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر عذاب و دوزخ حرام کر دیگا۔

تشریح قولہ ما من حدیث لکم فیہ خیر: لکم فیہ خیر سے علمائے مستبط کیا ہے کہ جو بات لوگوں کی عقل سے بالاتر ہو اور اس کے تحت کوئی عمل ہو اور نہ اس میں حدود شرعی کا بیان ہو تو عوام کے فتنہ کے خیال سے ایسی باتوں کو چھپایا جاسکتا ہے، اس طرح کی مثال بہت سے صحابہ کرام کی ملتی ہے، کہ انہوں نے فتنہ کے خوف سے بعض

حدیثوں کو ظاہر نہیں کیا حضرت علی کا قول ہے حدثوا الناس بما يعرفون، أتحبون أن يكذب الله ورسوله، حضرت عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں ما انت محدثاً قوماً حديثاً لا تبلغه عقولهم إلا كان لبعضهم فتنة، (۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ کتمان علم یا کتمان رہایت اس وقت مطلوب ہے جبکہ روایت کے ظاہری لفظ سے بدعت کی تائید ہوتی ہو حالانکہ وہ ظاہری معنی مراد نہ ہو، تو ایسے موقع پر اس طرح کی بات بیان نہ کرنا پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ (۲) قولہ، قد احيط بنفسي: اس کے معنی قربت من الموت وانشئت من الحياة، احيط بنفسي کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جبکہ کسی کو ہر چار طرف سے دشمن نے گھیر رکھا ہو اور اس کو اس طرح گرفت میں لے لے کہ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو اسی مناسبت سے قرب موت کو احيط بنفسي سے تعبیر کیا گیا۔

### کیا صرف اقرار توحید دخول جنت کیلئے کافی ہے؟

حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ النَّارَ: اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایمان لے آنے کے بعد جہنم حرام کر دیا جائے گا، خواہ کیسا ہی گناہ اسکے بعد کرتا رہے، جہنم جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حالانکہ بہت سی روایتوں میں مومن ناسق کے جہنمی ہونے کا تذکرہ موجود ہے اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں،

(۱) اس روایت کے عموم کو مقید کر دیا جائے عمل صالح کے ساتھ، لہذا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی، من شهد أن لا إله إلا الله وعمل عملاً صالحاً یعنی جہنم اس وقت حرام ہوگی جبکہ عمل صالح بھی ہو۔  
(۲) اس حدیث کو مقید کر دیا جائے اس شخص کے ساتھ جنہوں نے اپنی زندگی میں معصیت کی اور آخری زندگی میں توبہ کی اور توبہ کے بعد ہی موت آگئی۔

(۳) جو ایمان لائے اور فوراً مر جائے اور اس کو کسی عمل کی مہلت نہ مل سکے وہ اس کا صدق ہے۔

(۴) ہو سکتا ہے یہ روایت اس زمانہ کی ہو، جس وقت اعمال کا نزول نہیں ہوا تھا، کیونکہ سب سے پہلے لوگوں پر صرف ایمان لانا فرض تھا، پھر دھیرے دھیرے اعمال نازل ہوئے، تو اس زمانے کے لوگوں کے نجات کا دار و مدار صرف ایمان پر تھا، لیکن یہ جواب حافظ ابن حجرؒ کو تسلیم نہیں ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس جیسی روایات کو ابتدائی زمانے پر کیسے محمول کیا جاسکتا ہے، جبکہ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ جیسے متاخر الاسلام افراد ہیں، مگر حافظ ابن حجرؒ کے اس اعتراض پر علامہ بدر الدین عینی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی متقدم الاسلام صحابی سے حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ نے روایت کی ہو، لیکن خود علامہ عینی کا یہ اعتراض محمل نظر ہے کیونکہ بعض روایت میں اس کی تصریح ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کو باغ میں اپنے نعلین مبارک دیکر اسی مضمون کی روایت کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تھا، اتفاق سے پہلی ملاقات حضرت عمرؓ سے ہو گئی اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو واپس کیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ اس قسم کی بات عوام الناس میں پھیلا نا مناسب نہیں، حیرت ہے کہ علامہ عینی کی نگاہ سے ایسی مشہور روایت کیسے مخفی رہ گئی؟ (۳)

(۵) اسکو حسن ظن پر محمول کیا جائے، مسلمانوں کے بارے میں نیک گمان کرتے ہوئے کہ جب ایمان لا چکا ہے تو

معصیت سے ضرور بچے گا حرم اللہ علیہ النار کا حکم لگا دیا گیا، لقولہ علیہ السلام ظنوا بالمؤمنین خیراً،  
(۶) حرمت نار کا تعلق جمیع اعضاء سے کر دیا جائے، اب اس کے معنی یہ ہوئے، کہ مسلمان اگر فاسق ہونے کی وجہ سے  
جہنم میں جائیں گے بھی، تو آگ اس کے پورے بدن کو نہیں جلا سکتی، کیونکہ حدیث ہے کہ اعضاء وجود کو جہنم جلا ہی نہیں  
سکتا، یعنی پیشانی، ناک، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے، دونوں قدم۔

(۷) کنارے مراد وہ خاص آگ جس میں مشرکین کا طبقہ ہوگا، مومن اگرچہ فسق کر چکا ہو جہنم کے اس طبقہ میں نہیں جائیگا۔  
(۸) یا حرمت کا تعلق خلودنی النار سے کیا جاسکتا ہے، یعنی ابدی جہنم مسلمانوں پر حرام ہے، اگر فسق کی وجہ سے داخل  
بھی ہوئے تو چند روز کے بعد میں خروج یقینی ہے۔ مزید دو جواب آگے آرہے ہیں۔

**حدیث** ﴿ حَدَّثَنَا ابُو بَكْرِ بْنُ اِبِي شَيْبَةَ ..... عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ كُنْتُ رِذْقَ رَسُولِ  
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى جِمَارٍ يُقَالُ لَهُ عُفَيْرٌ، فَقَالَ يَا مُعَاذُ تَدْرِي مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ،  
وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ قُلْتُ كَلْتُكَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ اَعْلَمُ، قَالَ: فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَعْبُدُوْا  
اللّٰهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا، وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَا يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهِ، قَالَ: قُلْتُ  
يَا رَسُولَ اللّٰهِ اَفَلَا اُبَشِّرُ النَّاسَ قَالَ لَا تَبَشِّرْهُمْ فَيَتَكَلَّفُوْا، (۵)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک گدھے پر سوار تھے، جس کو عفیر کہا جاتا  
ترجمہ تھا، میں آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ نے آواز دی، اے معاذ جانتے ہو؟ بندوں پر خدا کا اور خدا کا بندوں پر کیا  
حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے فرمایا اللہ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ صرف اُسی کی بندگی  
کریں، اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جو اس کا شریک نہ ٹھہرائے اس کو عذاب نہ دے،  
میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اجازت ہو تو یہ خوشخبری اور لوگوں کو بھی سنا دوں فرمایا نہیں کہیں وہ اُسی پر بھروسہ نہ کر لیں۔  
تشریح عفیر معفر، ماخوذ من العفر، مثلاً لارنگ، رنگ ہی کی مناسبت سے گدھے کا نام عفیر پڑ گیا، معفر دراصل  
دوسری ہے جس میں سفیدی ملی ہو۔

قوله لا تبشروهم فیتکلفوا: عام لوگوں کو اس بشارت کے سنانے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو  
صحابہ کرام کے متعلق فرائض چھوڑ بیٹھنے کا کوئی اندیشہ ہو، فرض و واجب جن کا شریعت مطالبہ کرتی ہے بھلا کون چھوڑ سکتا  
تھا، بلکہ یہاں صرف ان اعمال کے چھوڑنے کا اندیشہ ہے جہاں بندہ رغبت میں سرگرمی، اور اطمینان میں سستی دکھلانے کا  
خود مختار ہے، بات یہ ہے کہ انسان ایسا کمزور اور بے صبر ہے، کہ خوف جب زیادہ ہو تو عمل چھوڑ بیٹھتا ہے، اور اگر اطمینان  
زیادہ ہو تو بھی سست پڑ جاتا ہے، قدرت چاہتی ہے کہ ہر حال میں اتنا دے جتنا کوئی حریص سے حریص لے سکتا ہو، روزِ  
سے نجات بلاشبہ انسان کے لئے بڑی کامیابی ہے، مگر رحمت صرف اس پر راضی نہیں وہ چاہتی ہے کہ لینے والے زیادہ سے  
زیادہ لیں، اس لئے مقصود یہ ہے کہ عملی سرگرمی زیادہ سے زیادہ جاری رہے، خود بخاری شریف میں حضرت معاذ بن جبل کی

روایت کے الفاظ پر غور کیجئے الفاظ یہ ہے عن معاذ بن جبل قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من لقي الله لا يشرك به شيئاً ويصلي الخمس ويصوم رمضان غفر له قتل أفلاً أبشروهم قال دعهم يعملوا (۵)۔ غور کیجئے کہ اس میں کلمہ شہادت کے ساتھ نماز روزہ کا بھی ذکر ہے، اور یہاں بھی بشارت پر وہی سوال و جواب مذکور ہے، معلوم ہوا کہ نماز، روزہ جیسے فرائض میں سستی کا ذکر نہیں، بلکہ ان عبادات نافلہ کا ذکر ہے جس میں نفسانی تاثرات سے انسان سستی یا چستی دکھلانے کا عادی ہے، کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس صدر اول کے نو مسلموں کو صرف فرائض پر جنت کی بشارت سنائی جاتی تو ان میں نوافل کی ادائیگی کا جذبہ سست پڑ جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، کیونکہ انسان شروع میں جنت کی لالچ اور جہنم کی رہائی کے جذبہ سے عبادت کرتا ہے، جب اتنی بات فرائض کی ادائیگی سے حاصل ہونے کی خوشخبری سن لے گا تو ممکن ہے اتنی ہی بات پر قناعت کر لے، ہاں جب عبادت میں برابر لگا رہے تو بعد میں قرب در ضاکا جذبہ پیدا ہوتا ہے پھر ہر مقام پر اوپر کے مقام کو حاصل کرنے کی رغبت بڑھتی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنودہ گزر کر خبر لیغفور لك اللہ ما تقدم من ذنبك وما تأخر (سورۃ فتح) میں سنائی گئی، تو آپ عبادت میں اور چستی دکھلانے لگے، اور جب لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کو اتنی تکلیف جھیلنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو آپ نے فرمایا أفلاً اكون عبداً شكوراً، (۵) جب اللہ نے اتنا بڑا فضل مجھ پر فرمایا تو اس کے شکر یہ میں مجھے اور چستی دکھانی چاہئے، یہ بات خواص کو حاصل ہوتی ہے عوام اس سے عموماً محروم رہتے ہیں، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو تو سنایا کیونکہ ان کا شمار خواص میں تھا، اس حدیث کی یہی سبب سے عمدہ توجیہ ہے۔

❦ حدیث ❦ حدثنا هدا بن خالد..... معاذ بن جبل قال: كنت ردت النبي صلى الله

عليه وسلم ليس بيني وبينه إلا مؤخرة الرخل فقال: يا معاذ بن جبل قلت: لبيك يا رسول الله و سغديك، ثم سار ساعة ثم قال يا معاذ بن جبل قلت: لبيك يا رسول الله و سغديك، ثم سار ساعة ثم قال يا معاذ بن جبل قلت: لبيك يا رسول الله و سغديك قال هل تدري ما حق الله عز وجل على العباد قلت الله و رسوله اعلم قال فإن حق الله على العباد ان يعبدوه ولا يشركوا به شيئاً ثم سار ساعة ثم قال: يا معاذ بن جبل قلت: لبيك يا رسول الله و سغديك قال هل تدري ما حق العباد على الله إذا فعلوا ذلك قلت الله و رسوله اعلم، قال: ان لا يعذبهم،

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں آپ کے پیچھے سوار تھا میرے اور آپ کے درمیان صرف کجاوہ کے پچھلے حصے کا فاصلہ تھا، آپ نے آواز دی اے معاذ بن جبل! میں نے کہا میرے آقا حاضر ہوں، پھر تھوڑی دیر چلنے کے بعد آواز دی اے معاذ بن جبل! میں نے کہا لبيك وسعديك، پھر تھوڑی دیر چلنے کے بعد آواز دی، اے معاذ! میں نے جواب دیا لبيك وسعديك فرمایا کیا تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کابندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، آپ نے فرمایا اللہ کابندوں پر حق یہ ہے کہ لوگ اس کی عبادت کریں اور اس کی

عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کریں پھر تھوڑی دیر چلنے کے بعد فرمایا اے معاذ بن جبل! میں نے کہا بیک وسعد یک، پھر فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ بندوں کا خدا پر کیا حق ہے جب وہ سب کام کریں، میں نے عرض کیا اللہ ورسولہ اعلم، آپ نے فرمایا (جب بندہ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے تو) اس کو عذاب نہ دے۔

**تشریح** | کنت ردف النبی: ردف بکسر الراء وسکون الدال، سوار کے پیچھے سوار کو ردیف کہا جاتا ہے، رعل کا اکثر استعمال غیر کیلئے ہوتا ہے، مگر یہاں حضرت معاذ گدھے پر آپ کے پیچھے سوار ہیں جیسا کہ بعد کی روایت میں اس کی تصریح ہے۔

**قوله ليس بيني وبينه:** اس سے شدت قرب کو بتلاتا ہے تاکہ سننے والا یہ سمجھ لے کہ اس بات کو حضرت معاذ نے ٹھیک ٹھیک سنا ہے، **مؤخره:** وہ لکڑی جو سوار کے پیچھے ہوتی ہے، **قوله** یا معاذ، تین بار ندا کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ بہت ہی اہم اور پوری توجہ کے ساتھ سننے جانے کے لائق ہے، کیونکہ مضمون کچھ دقیق ہے اس لئے پوری بیدار مغزی کے ساتھ سنو۔

**قوله لبیک وسعدیک:** اللب معنی اجابت، قبولیت، سعد بمعنی موافقت، تقدیر عبارت ہے **لبنا لك واسعاداً لك** تاکید و تکثیر کی غرض سے حثیہ لایا گیا ہے اسی اجابۃ بعد اجابۃ واسعاداً بعد اسعاداً، **قوله** ان یعبدوه ولا یشرکوا به الخ اس میں شرکین کی تردید ہے کیونکہ وہ لوگ خدا کی عبادت کے ساتھ بتوں کی بھی پوجا کرتے تھے،

### کیا خدا پر بھی کچھ واجب ہے؟

**حق العباد علی اللہ:** اللہ نے عمل کرنے پر جو اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے، اس کو یہاں حق سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی اس کا ملنا ایسا ہی جتنی ہے جیسا کہ کسی واجب چیز کا ملنا جتنی ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی کرتے نہیں **إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْلِفُ الْبَيْعَاتِ**، ورنہ تو بندہ کی طرف سے کوئی چیز واجب ہی نہیں ہوتی، اگر خدا پر بھی کوئی چیز ضروری ہو جائے تو وہ پھر خدا ہی کی راہ جائے، اس لئے کہ آمر یا مور سے بڑی ہستی ہوتی ہے، اور خدا سے برتر کوئی ہستی ہی نہیں، یا حق کے معنی تحقق، ثابت، لائق کے بھی لئے جاسکتے ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ شرک سے بچے رہیں، تقاضہ حکمت یہ ہے کہ اس کو عذاب نہ دیا جائے، یا اللہ کے لئے حق کا لفظ بر سبیل مقابلہ و مشاکلہ کہا گیا ہے، جیسے مکروا و مکر اللہ، جزاء سببۃ سببۃ، میں اللہ کی طرف مکر اور برائی کے بدلہ کو برائی کے ساتھ، مشاکلہ موسوم کر دیا گیا ہے، اس کا وہی معنی خدا کے ساتھ مراد نہیں، تو اسی طرح حق بمعنی یہاں واجب نہیں۔

**حدیث** ﴿ حَدَّثَنِي زُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ ..... قَالَ حَدَّثَنِي أَبُو هُرَيْرَةَ قَالَ: كُنَّا قُعُوداً

حولَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَنَا أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ فِي نَفَرٍ، فَقَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَيْنِ أَيْدِينَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا وَخَشِينَا أَنْ يُقْتَطِعَ دُونَنَا وَفَرَّغْنَا وَقُتْنَا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَرَّعَ فَخَرَجْتُ أَبْتَفِي رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى آتَيْتُ حَائِطًا لِلْأَنْصَارِ

لَبِنِي النَّجَارَ فَنَزَرْتُ بِهِ هَلْ أَحَدٌ لَهُ بَابٌ فَلَمْ أَجِدْ فَإِذَا رَبِيعٌ يَدْخُلُ فِي جُوفِ حَائِطٍ مِنْ بَيْتٍ خَارِجِهِ، وَالرَّبِيعُ الْجَدُولُ، فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ابْهَرِيرَةَ فَقُلْتُ نَعَمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ مَا شَأْنُكَ قُلْتُ كُنْتُ بَيْنَ الظُّهْرِ نَا فَفُتْتُ فَاثْبُتْتُ عَلَيْهَا فَخَشِينَا أَنْ تُقْتَلَعَ فَوَتْنَا فَفَزَعْنَا فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزَعَ، فَأَتَيْتُ هَذَا الْحَائِطَ فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّغْلَبُ، وَهَؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَائِي، فَقَالَ يَا ابْهَرِيرَةَ وَاعْطَانِي نَعْلَيْهِ قَالَ إِذْهَبْ بِنَعْلَيْ هَاتَيْنِ فَمَنْ لَقِيتَ مِنْ وَرَاءِ هَذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُسْتَقِيمًا بِهَا قَلْبُهُ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ، فَكَانَ أَوَّلَ مَنْ لَقِيتُ عُمَرُ فَقَالَ مَا هَاتَانِ النِّعْلَانِ يَا ابْهَرِيرَةَ قُلْتُ هَاتَيْنِ نَعْلَانِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِي بِهِمَا مَنْ لَقِيتُ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُسْتَقِيمًا بِهَا قَلْبُهُ بَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ، قَالَ: فَضَرَبَ عُمَرُ بِيَدِهِ بَيْنَ ثَدْيَيْ ضَرْبَةً فَخَزَزْتُ لِاسْتَيْتِي فَقَالَ إِرْجِعْ يَا ابْهَرِيرَةَ فَرَجَعْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجْعَشْتُ بُكَاءً وَرَكِبْنِي عُمَرُ فَإِذَا هُوَ عَلَى إِثْرِي فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَكَ يَا ابْهَرِيرَةَ قُلْتُ: لَقِيتُ عُمَرَ فَاخْبَزْتُ بِالَّذِي بَعَثْتَنِي بِهِ فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَيْ ضَرْبَةً خَزَزْتُ لِاسْتَيْتِي، قَالَ إِرْجِعْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عُمَرُ مَا حَمَلَكَ عَلَى مَا فَعَلْتَ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ بَابِي أَنْتَ وَأَمِي أَبْعَثْتَ ابْهَرِيرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِيَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُسْتَقِيمًا بِهَا قَلْبُهُ بَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ فَقَالَ نَعَمْ، قَالَ فَلَا تَقُلْ فَإِنِّي أَخْشَى أَنْ يُكَلَّلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِيمٌ يَعْمَلُونَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَلِيمٌ ♦

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم چند صحابہؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے، ترجمہ ہمارے ساتھ ابو بکر و عمرؓ بھی تھے، یکایک آپ ہمارے درمیان سے اٹھ کھڑے ہوئے جب دیر ہو گئی تو ہمیں تشویش ہوئی کہ ہم سے علیحدہ ہو کر کہیں آپ پر کوئی حادثہ پیش نہ آجائے، اس خیال سے ہم سب گھبرا گئے، اور سب سے پہلے گھبرانے والوں میں میں تھا میں آپ کو دھوڑنے کیلئے لگا، قبیلہ بنی نجار کے ایک انصاری کے باغ پر پہنچا، اس کا دروازہ تلاش کیا مگر نہیں ملا، کیا دیکھتا ہوں کہ باہر ایک کنویں سے ایک ربیع باغ کو جا رہی ہے، ربیع نالی کو کہتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں سسڑ کر اسی میں گھس گیا، اور آپ کی خدمت میں پہنچا آپ نے فرمایا ابو ہریرہؓ! میں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ فرمایا کیا حال ہے؟ عرض کیا کہ آپ ہم میں تشریف فرما تھے پھر آپ اٹھے، جب بہت دیر ہو گئی تو ہمیں گھبراہٹ ہوئی کہ کہیں غائبانہ آپ پر کوئی حادثہ پیش نہ آجائے، سب سے پہلے میں گھبرایا، اور اس باغ تک آ گیا، (یہاں دروازہ نہیں ملا) تو لوہڑی کی طرح سسڑ کر (نالی کے راستہ سے) اندر گھس آیا، اور بقیہ لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں، آپ نے مجھے دونوں چہل عنایت فرمائے اور فرمایا اے ابو ہریرہؓ! جاؤ! ہمیں لے جاؤ اور باغ کے پیچھے جو شخص یقین کے ساتھ یہ گواہی دیتا ہوا مل جائے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اس کو جنت کی خوشخبری سنا دو، (یہ روانہ ہوئے) سب سے پہلے حضرت عمرؓ ملے پوچھا اے ابو ہریرہؓ یہ چہل کیسے ہیں؟ میں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور مجھے اس لئے بھیجا

ہے کہ مجھے راستہ میں یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہتا ہوا جو مل جائے اُسے جنت کی بشارت سنادوں اس پر حضرت عمرؓ میری چھاتیوں کے درمیان اس زور سے مارا کہ میں سرین کے بل پیچھے جا پڑا اور بولے، ابو ہریرہؓ جاؤ واپس جاؤ، میں آپ کی خدمت میں آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، عمر کا خوف میرے سر پر سوار ہی تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے وہ آہو نچے، آپ نے دریافت فرمایا ابو ہریرہؓ کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا راستہ میں عمرؓ نے تو جس کام کیلئے آپ نے مجھے بھیجا تھا، میں نے انہیں خبر کر دی، انہوں نے اس زور سے میرے سینہ پر ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل پیچھے جا پڑا، اور مجھ سے کہا واپس جاؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے والدین آپ پر قربان، کیا واقعی آپ نے ابو ہریرہؓ کو اس کے لئے بھیجا تھا کہ جو دل سے یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کی گواہی دیتا ہو اُسے اس کو جنت کی خوشخبری سنادیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! عرض کیا ایسا نہ سمجھئے، مجھے خطرہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں، انہیں عمل میں لگا رہے دیکھئے آپ نے فرمایا اچھا تو رہے دو۔

### تشریح الفاظ

”نفرو“ بمعنی جماعت، ”من بیننا“ اظہرنا لفظ اظہر زائد ہے، تاکید کی فرض سے لایا گیا ہے، اصل عبارت یہ ہوگی من بیننا، قولہ: وخشینا ان یقنطع، اقطاع، معیبت میں گرفتار ہونا، خولہ دشمن کے ہاتھ قید ہو کر یا اور کسی طرح، ”دونفا“ یعنی ہم سے دور اور علیحدہ ہو کر، کسی ناگہانی معیبت میں گرفتار ہو گئے، ”فرعننا“ ہم گھبرا اٹھے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کس درجہ خیال رہتا تھا، اور آپ کی حفاظت کیلئے ہر صحابی کس قدر مستعد رہا کرتے تھے۔

حائطاً للانصار: حائط وہ بارغ جس میں چھار دیواری ہو، قولہ بشر خارجہ: اس کو تین طرح پڑھا جاسکتا ہے، (۱) بشر اور خارجہ دونوں کو تنوین کے ساتھ، یعنی بشر کو موصوف اور خارجہ کو صفت بنا کر پڑھا جائے، (۲) بشر کو مضاف اور خارجہ کو مضاف الیہ بنا کر بشر خارجہ پڑھا جائے، (۳) بشر کو تنوین اور خارجہ کے آخر میں ہاء مضموم، یعنی بشر خارجہ پڑھا جائے، ضمیر کا مرجع حائط ہوگا اس صورت میں معنی البشر فی موضع خارج عن الحائط یعنی وہ کنواں بارغ سے باہر تھا، اور اضافت کی صورت میں خارجہ بانی ذکر کا نام ہوگا، یعنی خارجہ نامی شخص کا کنواں۔

”الربیع الجدول“: جدول بفتح الجیم چھوٹی نہر (نالی) ربیع کی جمع اربعہ آتی ہے، جیسے نبی کی جمع انبیاء آتی ہے، فاحتفظت احتفاظ سمینا، سکرنا۔ قولہ ابو ہریرہ: فقلت نعم، تقدیر عبارت أأنت ابو ہریرہ؟ یہ استفہام تقریری ہے اور تعجب کیلئے بھی ممکن ہے، چونکہ بارغ کے دروازے بند تھے، اس لئے ان کی آمد پر آپ کو تعجب ہوا، کہ کس طرح آگئے؟ اور استفہام کو اپنے حقیقی معنی پر بھی رکھا جاسکتا ہے، اور شروع میں نہ پہچاننے کی وجہ یہ ہوگی کہ نزول وحی کی وجہ سے آپ عالم بالا کی طرف متوجہ تھے، اسلئے اول دحلہ میں آپ انکو نہیں پہچان سکے، قولہ وهؤلاء الناس وراثی: یعنی میرے پیچھے دوسرے لوگ بھی آپ کی تلاش میں آرہے ہیں میں سب کے آگے تھا، اس لئے پہلے آپ کی خدمت میں پہنچا، قولہ اذهب بنعلی: حضرت ابو ہریرہؓ کو جو تے حوالہ کرنا ایک سند تھی، تاکہ لوگوں کی سمجھ میں آجائے کہ ابو ہریرہؓ ہر کار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر آرہے ہیں، اور جو بات نقل کریں گے اسکو حدیث رسول پاور کرنے میں



لوگوں کو متاثر نہ ہوگا، اگرچہ اسکے بغیر بھی لوگوں کو حضرت ابو ہریرہ کی بات پر اطمینان ہو جاتا، مگر اس علامت کے بعد وقوع فی النفس ہوگی، ملا علی قاری فرماتے ہیں چونکہ حضور ﷺ کیلئے اس مقام نوری میں تجلی طہوری ہوئی اس لئے نطفین عطا فرمائے جیسا کہ حضرت موسیٰ کو مقام نوری میں جانے کے بعد فاخلع نعلیک کا حکم ہوا تھا۔ (مرقات ص ۱۱۶/۱)

### کیا صرف کلمہ توحید پر دخول جنت

بشہد ان لا الہ الا اللہ الخ: یہاں بھی وہی اشکال ہوتا ہے کہ اس روایت کا تقاضا یہ ہے کہ معصیت کا ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا، حالانکہ کتاب اللہ اور احادیث رسول میں بہت سی جگہوں میں مومن عاصی کا جہنمی ہونا بصراحت موجود ہے، حضرت عبادہ بن صامت کی روایت کے ذیل میں اسکے آٹھ جوابات دیئے جا چکے ہیں، لیکن وہ تمام جوابات محض تاویلات ہیں اور اکثر جوابات نقض و اعتراض سے خالی نہیں، اس کا سب سے بہتر جواب حضرت ابن رجب حنبلی نے دیا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کو اپنے عموم پر ہی باقی رکھا جائے، اور اس کو ارتقا موانع کے ساتھ مقید کر دیا جائے، یعنی لا الہ الا اللہ اپنا پورا اثر اسی وقت دکھلائے گا، جبکہ اس کو مخالف چیزوں سے بچایا جائے، اور جب اس میں اس کے مخالف معصیت کی آمیزش ہوگی تو پھر اس کا کھل اثر ظاہر نہیں ہوگا، اس کو بالکل ایسا سمجھنا چاہئے کہ کوئی ماہر طبیب مقرر دو دلوں کی الگ الگ خاصیت بتلائے کہ فلاں دوا کا مزاج گرم ہے اور فلاں کا مزاج سرد ہے، فلاں دوا کا اثر، اور فلاں کا خشک، فلاں دوا کا قابض اور فلاں دوا کو ہلکا ہے، تو ان خواص کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جب فلاں دوا کو دوسری دوائیوں سے الگ رکھا جائے تو اس کا مزاج سرد اور فلاں کا گرم ظاہر ہوگا، اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گرم دوا کو سرد دوا کے ساتھ ملانے کے بعد بھی اس کا مزاج گرم ہی رہے گا، اور سرد کو گرم کے ساتھ مخلوط کرنے کے بعد بھی سرد ہی رہے گا، بلکہ دو متضاد مزاج کی دوائیوں کو ملانے کے بعد درمیانی اور معتدل مزاج پیدا ہوگا، جو پہلے سے بالکل جداگانہ ہی مزاج ہوگا، بالکل اسی طرح جہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ لا الہ الا اللہ پر دخول جنت کی بشارت سنائی ہے اس میں آپ نے کلمہ توحید کا مزاج، اس کا خاصہ بیان فرمایا ہے، اور اس کا یہ مزاج اسی وقت ظاہر ہوگا جبکہ معصیت سے اُسے محفوظ رکھا جائے اور جب اس میں معصیت کو بھی ملا دیا جائے تو پھر اس کا وہ پہلا مزاج نہیں رہے گا، بلکہ معصیت کی آمیزش کے بعد ایک دوسرا مزاج ظاہر ہوگا جو پہلے مزاج سے کچھ جداگانہ ہوگا۔

حضرت شیخ الہند اسی بات کو ذرا اور واضح طریقہ پر بیان فرماتے تھے، کہ جن افعال پر دخول جنت اور جہنم سے رہائی کی بشارت مومن کو سنائی گئی ہے، اس سے شارع علیہ السلام کا مقصد ان افعال کی تاثیر بیان کرتا ہے اور یہ تاثیر اسی وقت ظاہر ہوگی جبکہ وہ افعال عقلی بالطبع ہوں، اور دوسرے مخالف افعال کی آمیزش سے پاک ہوں، اور اگر مخالف افعال بھی اس کے ساتھ مل جائیں تو پھر اس کا ذاتی اور اصلی اثر ظاہر نہ ہوگا، بلکہ اس کا طبعی اثر مخالف کے اثر میں دب جائے گا، مثلاً پانی کا ذاتی اثر برودت ہے مگر جب اس کو آگ پر رکھ دیا جائے تو وہ گرم ہو جاتا ہے اور آگ ہی کی طرح اس میں جلانے کی خاصیت پیدا ہوتی ہے، اور اس وقت اس کی برودت دب جاتی ہے بلکہ ختم ہو جاتی ہے البتہ جب اُسے آگ سے اتار لیا جاتا ہے تو تھوڑی دیر بعد پھر اس کی برودت لوٹ جاتی ہے، کیونکہ آگ پر رہنے کی وجہ سے حرارت عارضی تھی ذاتی اور طبعی نہیں تھی، بالکل یہی حال ایمان کا ہے کہ اس کا اصلی اور طبعی اثر مومن کو جنت میں داخل کرنے اور جہنم سے رہائی دلانے کا ہے، ہاں جب اس پر

معاصی اور ذنوب خدج سے مل جاتے ہیں، اور معاصی غالب آجاتے ہیں تو ایمان کے اصلی اور طبعی اثر کو توڑی دیر کے لئے روک دیتے ہیں اور معاصی کا اثر غالب ہو کر مومن عاصی اس وقت تک جہنم میں پڑھتا ہے، جب تک معاصی کا اثر باقی رہتا ہے، اور جب جہنم کی آگ معصیت کی گندگی اور معصیت کی ناپاکی کو جلا کر دور کر دیتی ہے تو پھر ایمان کا پناہ داتی اور طبعی اثر ظاہر ہو جاتا ہے، پس مومن عاصی کو جہنم میں داخل کرنے کا مقصد گنہگار کے کھوٹ کو دور کرنا ہے، جیسے سونے چاندی کے کھوٹ کو دور کرنے کے لئے سونا ان دونوں کو بھیٹ میں ڈالا کرتا ہے، جب معصیت کے کھوٹ کو جہنم کی آگ جلا دے گی اور خالص ایمان باقی رہ جائے گا تو مومن کا ایمان اس کو جنت میں پہونچا دینگا اور چونکہ کافر مشرک نجاست کی طرح ناپاک ہیں تو ر کفر و شرک کی ذات ناپاک ہے، اور عین نجاست کو اگر سات سمندر سے بھی دھویا جائے تو اس کے پاک ہونے کی کوئی صورت نہیں لہذا جہنم میں ان کے جانے کے بعد بھی پاک نہیں گے۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کی نجاست عارضی ہے اور کافروں کے کفر کی نجاست ذاتی ہے، اس لئے کافر سدا جہنم میں ہی رہیں گے اور مسلمانوں کی معصیت دور کرنے کیلئے جہنم میں بھیجا جائے گا، اور عارضی نجاست دور ہونے کے بعد پھر ایمان کا پناہ اصلی اور ذاتی اثر ظاہر ہو گا، اور مومن کو جنت پہونچا دے گا، اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ اگر کسی شخص کو بادشاہ اپنے دربار میں طلب کرے اور وہ اپنے بدن پر نجاست لگا کر آئے تو شای دربار میں حاضر ہونے سے پہلے، اس کو غسل خانہ میں لے جا کر، نجاست کو مل کر دھویا جاتا ہے پھر شای جوڑا پہنا کر شای دربار میں حاضر کیا جاتا ہے، اسی طرح مومن عاصی کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے اس کی معصیت کی گندگی کو جہنم میں داخل کر کے دھویا جائے گا اور صاف ستھر کر کے جنت میں داخل کیا جائے گا۔

اصل سوال کا جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ قاعدہ ہے کہ اذا ثبت الشئ ثبت بلوازمہ جب کلمہ توحید میں خدا کی حاکمیت، اور اس کے معبود برحق ہونے کا اقرار کیا گیا، تو اب اس کے پورے لوازمات خود بخود آجائیں گے، نماز روزہ وغیرہ اعمال سب کلمہ توحید ہی کے لوازمات ہیں، پس کلمہ لا الہ الا اللہ افعال اس کی تفصیل ہیں، جس طرح کہ بیچ پورے درخت کی اصل ہے اور درخت کے تمام اجزاء شاخ، ڈال، پتہ، پھل، پھول، بیج ہی کے لوازمات ہیں، لہذا بیج کو مانا گیا ان تمام چیزوں کو ماننا ہے یا جس طرح مجلس نکاح میں نکاح خواں، زوج سے ایجاب و قبول کرتا ہے، بیوی کے نان نفقہ، سکنی اور کسود کا کوئی تذکرہ نہیں آتا، مگر زوج کے قبول ہی میں نان نفقہ وغیرہ سب کچھ آ جاتا ہے، اسی طرح مسلمان ہونے کیلئے کلمہ توحید کا اقرار اس کے تمام لوازمات کا اقرار سمجھا جائے گا، یہ جواب گزشتہ تمام جوابات سے عمدہ ہے، اور اس میں تکلفات کرنے کی حاجت نہیں۔

### حضرت عمرؓ کے ضرب کا مقصد

”حضرت عمرؓ کے حضرت ابوہریرہؓ کو مارنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر کسی قسم کا اعتراض مقصود نہ تھا، بلکہ حضرت عمرؓ کو اس بات کا شدت سے احساس تھا، کہ نو مسلم حضرات میں غفلت و کسلا غالب ہے، اس لئے علاج بالضد کے طور پر بشارت کے بجائے خوف سے متعلق بات کہی جائے، اور سردست اس کو صیغہ راز میں رکھ دیا جائے، مگر حضرت عمرؓ کو یہ بھی محسوس ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ واپس نہیں لوٹیں گے اس لئے بطور زجر ان کو ہمارا نہ کہ ایذا رسانی اور مگرانے کے

متقدم سے، جب حضرت عمرؓ نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر یہ مصلحت ذکر کی اور آپ کے ذہن میں وہ مصلحت نمودار ہوئی تو پھر آپ نے ان کی رائے پسند فرمائی۔ ”م

حدثني اسحاق بن منصور ..... عن قتادة قال قال انس بن مالك ان نبي الله صلى الله عليه وسلم ومعاذ بن جبل رديعة علي الرجل فقال يا معاذ قال لبيك يا رسول الله وسعدك قال يا معاذ قال لبيك يا رسول الله وسعدك قال ما من عبد يشهد أن لا اله الا الله وأن محمدا عبده ورسوله إلا حرمة الله على النار قال يا رسول الله أفلا أخبرها فيستبشروا قال إذن يتكلموا فاخبر بها معاذ عند موته تأملاً (بخاری ص ۲۴ حدیث ۱۲۸)

قوله تأملاً: باب تفعل کا مصدر ہے، باب تفعل کی ایک خاصیت اجتناب اور پرہیز کی ہے، اس لئے تأمل کے معنی گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کے ہیں، جیسے تحت کے معنی اجتناب، حنث کے، متقدم یہ ہے کہ حضرت معاذ نے اس حدیث کی خبر لوگوں کو اپنی موت کے وقت دی تاکہ کتمان علم کا گناہ نہ ہو، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو تبلیغ احادیث کی کس درجہ اہمیت تھی، کہ کوئی مشہور حدیث بھی اپنے سینہ میں لے جانا کتمان علم کے برابر سمجھتے تھے، اگر احادیث کی حیثیت تشریحی نہ ہوتی یا کتاب اللہ کے بعد یہ تشریحات غیر ضروری ہوتیں تو یہ اہتمام کس لئے تھا؟ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے نزدیک ان الذین ینکتمون ما أنزلنا من البینات والہدی (ب ۳۷) میں جس طرح آیات قرآنیہ داخل تھیں اسی طرح احادیث نبویہ بھی داخل تھیں، اور امت کا یہ فریضہ تھا کہ دین اپنی مجموعی تشریحات کے ساتھ ایک دوسرے سے دور تک پہنچایا جائے، یا جو لوگ احادیث سے بے نیازی کا ظہر کرتے ہیں وہ احادیث سے نہیں، خدا کے رسول سے بے نیازی چاہتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

قوله فاخبر بها معاذ عند موته: ضمیر کا مرجع حضرت معاذ ہیں، البتہ علامہ کرمانی نے اس کا مرجع حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے، مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے، دلیل میں مسند احمد کی روایت پیش کی ہے، جو صحیح سند کے ساتھ حضرت جابرؓ سے منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں، عن جابر بن عبد الله الانصاري قال اخبرني من شهد معاذاً حين حضرته الوفاة يقول: سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم حديثاً لم يمنعني أن احذثكموه الا مخافة أن تتكلموا فذكره۔

ایک اشکال:- یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب آنحضور ﷺ حضرت معاذ کو اس حدیث کی اشاعت سے روک چکے تھے، تو پھر انہوں نے اس کو موت کے وقت کیوں بیان کر دیا؟ جس طرح کتمان علم گناہ ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کرنے میں بھی گناہ ہے، لہذا پابندی لگا دینے کے بعد بیان کرنے میں گناہ ہو گا نہ کہ کتمان کرنے میں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ شروع میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کو حضرت معاذ نے عموم پر محمول کیا ہو، یعنی نہ اس کو خواص کے سامنے بیان کیا جائے، اور نہ عوام کے سامنے مگر بعد میں حضرت معاذ نے غور و فکر کیا تو ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کا تعلق عوام سے ہے، خواص سے نہیں، کیونکہ ممانعت عوام و خواص ہر ایک

کیلے ہوتی ہے، تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے بھی نہ فرماتے، آپ کا مجھ سے بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مجھ جیسے خواص کے سامنے بیان کی جا سکتی ہے، یہ بات ان کو اپنی آخری عمر میں سمجھ میں آئی، مگر اس جواب کی حافظ ابن حجر نے تردید کی ہے اور دلیل میں سند احمد کی روایت پیش کی ہے، الفاظ یہ ہیں: عن معاوية لما حضرته الوفاة قال ادخلوا علي الناس فادخلوا عليه فقال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من مات لا يشرك بالله شيئاً جعله الله في الجنة وما كنت احذثكموه الا عند الموت وشاهدي على ذلك ابو درداء فقال صدق اخي، (فتح الباری) اس سے یہ واضح ہوا کہ بوقت موت عوام و خواص سب کو بلوایا اور سب کو سنیلا اسلئے یہ جواب کمزور ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ جب آنحضور ﷺ نے منع کیا تھا اس وقت انہوں نے ”نہی“ نہی تحریم سمجھا تھا، مگر بعد میں غور و فکر کے بعد یہ سمجھا کہ نہی تحریم کیلئے نہیں تھی، بلکہ نہی مصلحت کی وجہ سے فرمائی تھی، اور اس بات کی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ والی روایت ہے کیونکہ اگر اس روایت کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا حرام ہوتا تو خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جوتیاں عنایت فرما کر حضرت ابو ہریرہؓ کو اعلان کرنے کیلئے کیسے بھیجے؟ اس سے اچھی طرح یہ بات سمجھ میں آگئی، کہ مجھے روکنا مصلحت کی وجہ سے تھا، حرام ہونے کی وجہ سے نہیں، مگر اس جواب پر بھی حافظ ابن حجر نے اشکال ظاہر کیا ہے، کہ جب یہی بات تھی تو پھر اس کو ظاہر کرنے کیلئے حضرت معاذ نے آخری عمر کیوں منتخب کیا؟ مگر اس اشکال کا دو طرح سے جواب دیا جاسکتا ہے۔

ممكن ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کا حضرت معاذ کو علم موت کے وقت ہوا ہو (۲) ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کا علم اگرچہ ان کو موت سے بہت پہلے ہو چکا تھا، مگر اس روایت کو بیان کرنے کیلئے آخری عمر کا انتخاب دو فضیلت حاصل کرنے کے لئے کیا ہو، کہ آخری عمر میں تبلیغ کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے اور آخری کلام ”لا الہ الا اللہ“ اور ”من کان آخر کلامه لا الہ الا اللہ فقد دخل الجنة“ پر بھی عمل ہو جائے، حضرت معاذ کے علاوہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے واقعہ میں آتا ہے کہ حضرت ابو ایوب جب روم میں بیمار ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو اکٹھا کر کے یہی روایت سنائی۔

ابن ابی حاتم نے ابو زرہ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب ان کی موت کا وقت آیا اور لوگوں نے تلقین کرنے کی غرض سے حضرت معاذ کی اسی روایت کو بیان کیا جس کو ان لوگوں نے خود ابو زرہ سے سنا تھا، تو ابو زرہ نے لا الہ الا اللہ پڑھا اور اسی کلمہ پر ان کی روح پرواز کر گئی، تو فرشتوں نے ان کے جواب میں فقد دخل الجنة کہا، بہر حال ممکن ہے آخری عمر کا انتخاب اسی فضیلت کو حاصل کرنے کی غرض سے کیا گیا ہو۔

❦ حدیث ❦ حدثنا شيبان بن فروخ قال نا سليمان يعني بن المغيرة قال حدثنا ثابت عن انس بن مالك قال حدثني محمود بن الزبيع عن عتبان بن عتبان قال قديمك المدينة فليقك عتبان فقلت حديثك بلغني عنك، قال: أصابني في بصرى بعض الشئ فبعثت إلى رسول الله ﷺ أن تأتيني تصلي منزلي فأتيتك مصلي، قال فأتى النبي صلى الله عليه وسلم و من شدة الله من أصحابه فدخل وهو يصلي في منزلي و أصحابه يتحدثون بينهم ثم اسندوا عظم ذلك وكبره إلى مالك بن نخشم، قال ولما أتته دعا عليه فهلك و ولما أتته أصابه شر ففقد رسول

اللَّهُ قَالُوا أَنَّهُ يَقُولُ ذَلِكَ وَمَا هُوَ فِي قَلْبِهِ قَالَ: لَا يَشْهَدُ أَحَدٌ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاتَّبَى رَسُولُ اللَّهِ  
فِي دَخْلِ النَّارِ، أَوْ تَطْعَمُهُ النَّارُ، قَالَ أَنَسٌ فَأَعَجَبَنِي هَذَا الْحَدِيثُ فَقُلْتُ لَا يَنْبِي أَلْتَبَنِي فَكَتَبَنِي.

ترجمہ

حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ محمود بن ربیع نے مجھ سے بیان کیا کہ میں مدینہ منورہ آیا تو عثمان بن مالک سے میری ملاقات ہوئی، میں نے کہا کہ آپ کی ایک حدیث مجھے بالواسطہ پہونچی ہے، انہوں نے فرمایا (کی ہاں سنئے) میری نگاہ میں کچھ نقصان آگیا، اس لئے میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلا بھیجا کہ میری تمنا ہے کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور کسی جگہ آکر نماز پڑھ لیں، اسی کو میں اپنی نماز پڑھنے کی جگہ مقرر کر لیتا، وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ تشریف لائے اور جن جن صحابہ کو اللہ نے چاہا وہ بھی آپ کے ہمراہ آگئے، آپ میرے مکان میں نماز ادا فرمانے لگے، ادھر صحابہ آپس میں کچھ باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے اور ان کا زیادہ تر ذمہ دار مالک ابن دخیلم کو قرار دیا، وہ لوگ چاہتے یہ تھے کہ آپ اس کے حق میں بددعا فرمادیں اور وہ تباہ و برباد ہو جائے، اور اس کو خوب نقصان پہونچے جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ کیا یہ شخص گواہی نہیں دیتا کہ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور میں اس کا رسول ہوں؟ انہوں نے عرض کیا کہ یہ گواہی تو دیتا ہے مگر دل سے نہیں، آپ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اس بات کی گواہی بھی دے اور پھر دوزخ میں داخل ہو یا یہ فرمایا آتش دوزخ اس کو جلا سکے، حضرت انس کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث بہت پسند آئی میں نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اُسے قلمبند کر لو، تو اس نے قلمبند کر لی۔

### روایت کی خصوصیت

اس روایت کی دو بڑی خصوصیت ہے: (۱) اس میں تین صحابی جمع ہیں جو بعض بعض سے روایت کرتے ہیں حضرت انس، محمود بن ربیع، عثمان بن مالک۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کا براہِ اصغر سے روایت کرتے ہیں، اس لئے کہ حضرت انس، عمر، علم اور رتبہ میں حضرت محمود بن ربیع سے بڑے ہیں۔

قوله أصابني في بصرى: ایک روایت میں ”ساء بصرى“ اور دوسری روایت میں ”انكروت بصرى“ ہے سب کا حاصل یہ ہے کہ نابینا نہیں تھے، بلکہ بینائی میں فتور آچکا تھا، بخاری شریف (ص ۱۹۲/۱) باب الرخصة في المطر کے ذیل میں ”ان عتبان كان يؤم قومه وهو أعمى“ سے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اوپر کی روایت میں بینائی میں فتور آنے کا ذکر ہے، اور بخاری کی روایت میں نابینا ہونے کا تذکرہ، تطبیق اس طرح دی جائے گی کہ جس وقت عتبان بن مالک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس درخواست لیکر آئے تھے، اس وقت پوری طرح نابینا نہیں ہوئے تھے، مسلم شریف کی روایت ”أصابني بصرى“ کا اسی زمانہ سے تعلق ہے، اور جب محمود بن ربیع کی عتبان بن مالک سے ملاقات ہوئی، تو اس وقت پوری طرح نابینا ہو چکے تھے، بخاری شریف کی روایت ”وهو أعمى“ کا اسی زمانہ سے تعلق ہے، فلا تعارض، ہاں! مسلم شریف کی ایک روایت میں ”انه أعمى“ کا لفظ ہے اس کو سامنے رکھ کر یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ قربِ اعمیٰ کو راوی نے اعمیٰ سے مجازاً تعبیر کر دیا۔

فبعثتني الى رسول الله الخ: بخاری شریف (ص ۱۹۰/۱) میں ”ان عتبان اتى رسول الله صلى الله عليه وسلم“ مذکور ہے، دونوں میں تطبیق اس طرح دی جائے گی کہ حضرت عتبان نے آپ کے پاس فرستادہ بھیجا تھا، چونکہ

عتبان کے فرستادہ ان کے حکم سے آئے تھے، اس لئے مجاز بخاری میں حضرت عتبان کی طرف نسبت کر دی گئی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے خود آئے ہوں اور بعد میں یاد دہانی کیلئے کسی اور کو بھیجا ہو، فاتخذہ مصلی، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نماز کیلئے کوئی جگہ متعین کر سکتے ہیں، جہاں مخصوص جگہ متعین کرنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے اس کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا، جہاں ریاکاری کا اندیشہ ہو یا یہ کہ مسجد میں ایسا کرنے سے روکا گیا، اور یہاں گھر میں اجازت دی گئی۔

واصحابہ يتحدثون: اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ مصلی کے قریب اس وقت گفتگو کی جاسکتی ہے، جبکہ مصلی کو نماز میں خلل نہ ہو، کیونکہ اگر یہ ناجائز ہو تا تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرات صحابہ کو سمجھا دیتے تو خاموشی جو اذکار و لیل ہے۔

ثم اسندوا عظم ذالك وكبره: عظم بضم العين واسكان الظاء، کبر بضم الكاف وکسر ہاء، یعنی آپس میں صحابہ کرام منافقین کی شرارتوں کا تذکرہ کرنے لگے، اور اس کا بڑا لازمہ دار مالک بن دخیشم کو ٹھہرایا۔

مالک بن دخیشم: دال مضموماً، خاء ساکن، پھر شین مضموماً میم ساکن، اور خاء اور شین کے درمیان یاء کا اضافہ بھی منقول ہے، یعنی دُخَيْشَم، میم کے بجائے نون کے ساتھ اخیر میں مکسر، اور مصغر دونوں طرح پڑھا گیا ہے، یعنی دُخْشَن و دُخْشَن، مالک بن دُخْشَم انصاری تھے غزوہ بدر اور دوسرے تمام معرکوں میں شریک رہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی طرف سے صفائی کرنا ان کے مومن و مخلص ہونے کی دلیل ہے، بخاری شریف (ص ۱۱/۱) میں ان کی صفائی میں "الّا تراہ" قال لا الہ الا اللہ یبتغی بہا وجہ اللہ تعالیٰ کی تصریح ہے، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کو جلانے کیلئے معن بن عدی کے ساتھ مالک بن دخیشم کو بھی بھیجا تھا، صحابہ کرام کو ان کے منافق ہونے کے بارے میں جو تردد تھا وہ نفاقِ حقیقی اور کفر والا نہیں تھا، ایسا ہو سکتا ہے کسی مجبوری اور مصلحت کی وجہ سے مالک بن دخیشم منافقین کے ساتھ رہتے ہوں، جیسا کہ حاطب بن بلعہ نے محض اپنی مصلحت کی خاطر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ پر چڑھائی کرنے کی اطلاع بذریعہ خط اہل مکہ کو دینے کی کوشش کی تھی۔

قوله فقلت لابنی اکتبه: اس سے حدیث کی کتابت کا جواز ثابت ہوا، شروع میں آپ نے منع فرمایا تھا بعد میں اجازت مل گئی تھی۔

فخط لی مسجداً: اس حدیث میں آثارِ صالحین سے برکت حاصل کرنا، نیز علماء و فضلاء کی زیارت وغیرہ کا ثبوت ہوتا ہے۔

## باب الدلیل علی ان من رضی باللہ رباً وبالاسلام دیناً وبمحمدٍ رسولاً وإن ارتکب المعاصی الکبائر

حدثنا محمد بن یحییٰ بن ابی عمر المکی و بشر بن الحکم ..... عن العباس بن عبد المطلب انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ذاق طعم الايمان من رضی باللہ رباً وبالاسلام دیناً و  
بمحمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم رسولاً (مسلم ص ۲۷، ترمذی ص ۱۰/۲، ع ۲۷۰۸، مستدرک امام احمد ۲۰۸/۱)

ترجمہ

حضرت عباس بن عبد المطلب سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایمان کا مزہ اس شخص نے چکھ لیا جو اللہ کی ربوبیت اور اسلام کے دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر دل سے راضی ہو گیا۔

### رابط اور مقصد باب

حدیث جبرئیل میں ایمان کے درجات بتلائے گئے تھے اعلیٰ، متوسط، ادنیٰ، یعنی ایمان، اسلام، احسان، اب تک تمام مسلم نے ایمان کی ابتدائی منزل کا تذکرہ کیا، جس کا ثمرہ دخول جنت ہے، خواہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو، مگر کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد گناہوں کا اور حکاب اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی وہ اس کلمہ کی حلاوت اور اس کی پوری حقیقت سے واقف نہیں ہوا، اور اس کے مزہ سے پوری طرح آشنا نہیں ہوا، اور یہ ایمانی حراج نہ بننے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، ورنہ اگر اس کا ایمانی حراج درست ہوتا تو خدا کی اطاعت میں مزہ آتا، اور محاسنی سے ایک گونہ نفرت ہوتی، جس طرح کہ تندرست اور صحیح المہراج کو ہر میٹھی اور عمدہ غذا اچھی، اور بد مذاق سے نفرت ہوتی ہے، اور اگر کسی کو کڑوی چیز اچھی لگے اور اچھی چیز بد مزہ تو یہ اس کے فساد مزاج کی علامت ہے جیسے سانپ کاٹے ہوئے شخص کو نیم کا پتہ بیٹھا، اور صفراوی مریض کو ہر عمدہ غذا بد مزہ معلوم ہوتی ہے، بالکل یہی حال ایمان کا ہے، کہ مومن کو ایمان کے ابتدائی مرحلہ میں عبادت کے اندر حلاوت محسوس نہیں ہوتی، اور جب ایمان کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے تو ہر عبادت میں حلاوت اور چاشنی محسوس کرنے لگتا ہے، اور پھر خدا کی اطاعت کو چھوڑنا اور محصیت کرنا مومن کے لئے سوا ہاں روح بن جاتا ہے، جیسے حضرت ماعز اسلمی اور حضرت غامدیہ سے زمانا کا صدور ہوا، اور ان دونوں نے از خود بارگاہ رسالت میں انتہائی بے تابی کے ساتھ اپنے جرم کا اعتراف کیا، اور اپنے آپ کو سستار کر لیا گویا اس جگہ پر انسان رضا کے مقام پر فائز ہوتا ہے اور ہر آن خدا کی خوشنودی اس کے پیش نظر ہوتی ہے، قرآن کریم کی مختصر سی آیت میں اس رضا کا تذکرہ اس انداز میں کیا گیا رضی اللہ عنہم وَ رَضُوا عَنْهُ،

صحابہ کرام میں یہ شان رضا اس درجہ غالب تھی کہ اب امت میں رضی اللہ عنہم ان کا ظفر امتیاز بن گیا، ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہم ایسا جزو لا یتفک بن چکا ہے جیسا کہ انبیاء کے ساتھ علیہم السلام۔

ذاق طعم الايمان: اسی صحیح ایمانہ و اطمأننت بہ نفسہ و خلسر باطنہ، یعنی ایمان درست ہو چکا، نفس کو طمانیت نصیب ہوئی، اور ایمان اس کے رگ وریشہ میں سما گیا، اور اسی وجہ سے عبادت اس کے لئے سہل ہو گئی اور اس سے لطف اندوز ہونے لگا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انسانی نفس لذیذ اشیاء سے لطف اندوز ہوتی ہے، ایسا ہی قلب انسانی جب مراضی غفلت سے محفوظ ہو تو وہ باطنی لذت سے محفوظ ہوتا ہے، لیکن قلب کا غفلت کے امراض سے محفوظ ہونا انہی مذکورہ تین چیزوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

قوله من رضي بالله: رضیت بالشیء کے معنی قَبِعْتُ بہ و اکتفیت بہ، یعنی اس طرح قناعت کرنا کہ اس کے ساتھ غیر کی طلب نہ ہو، معنی اس حدیث کا یہ ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے بعد دوسرے خدا کی طلب نہ ہو، اور ساری دوز

دھوپ صرف دین کے راستہ میں ہو، اور بیروی صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوئے طریقہ کی ہو، جن میں یہ باتیں پیدا ہو جائیں گی اس کے رنگ و ریشہ میں ایمانی حلاوت سرایت کر جائے گی، اور ایمان کے صحیح ذائقہ سے لطف اندوز ہوگا، ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ رضائے مقصود ظاہری باطنی امتیاد ہے اور اس میں کمال یہ ہے کہ ہر مصیبت پر صابر، نعمتوں پر شاکر اور فضیلت قدر پر راضی ہو، اور آداب و اخلاق اور معاشرت میں سنت کا پوری طرح قیام ہو، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طرف کامل توجہ ہو۔

### حدیث کی اہمیت

یہ حدیث اس لئے بھی اہم ہے کہ قبر کے سوال و جواب کو یاد دلاتی ہے، کیونکہ قبر میں انہیں تین چیزوں کا سوال ہوگا اور انہیں جوابات پر کا سیابی کا دار و مدار ہوگا، اسی لئے مسند الفردوس میں عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے انطقوا السننکم قول لا الہ الا اللہ ومحکم رسول اللہ وان اللہ ربنا والاسلام دیننا ومحکم نبینا فانکم تسئلون عنها فی قبورکم، (۵)

نیز یہ حدیث اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں منزل مقصود بھی ہے، اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی بتلایا گیا ہے اور اس راہ کے رہبر و رہنما کا بھی ذکر ہے، خدا سب کا منزل مقصود ہے، اور وصول الی اللہ کیلئے دین راستہ ہے، اور اس کے آخری رہبر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں، گویا ایک طالب کو جتنی چیزوں کی اس راہ میں ضرورت ہوتی ہے، یہ حدیث ان تمام چیزوں پر بالترتیب حاوی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

## باب بیان شعب الایمان و افضلها و ادناها فضیلة الحیاء و کونة من الایمان

ایمان کی شاخوں کا بیان، کوئی شاخ افضل اور کوئی اونی ہے، شرم و حیا کی فضیلت، اور اسکے ایمان میں سے ہونے کا بیان

❦ حدیث ❦ حدثنا عبید اللہ ..... عن امی صالح عن امی ہزیرة عن النبی صلی اللہ

علیہ وسلم الایمان بضع و سبعون شعبۃ والخیرۃ شعبۃ من الایمان، (۵)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایمان کی ستر سے کچھ زائد شاخیں ہیں اور شرم کرنا بھی ایمان کی بہت بڑی شاخ ہے۔

لفظ بضع کی تحقیق

بضع کا اطلاق دو معنوں میں ہوتا ہے ایک عدد کیلئے اس وقت باء کا سرہ اور فتح دونوں جائز ہے، اور دوسرے معنی کٹڑا، حصہ، بضعۃ من اللحم، ای قطعۃ من اللحم، اس صورت میں باء کا فتح متعین ہے، بضع کا اطلاق بعض کے نزدیک تین



سے دس تک کے اعداد پر ہوتا ہے، اور بعض کے نزدیک تین اور نو کے درمیانی اعداد پر، اور بعض کے نزدیک سات پر اور بعض دس سے دس تک کے درمیانی اعداد پر کرتے ہیں، اور ایک قول بارہ سے بیس تک کا بھی ہے۔ (مرقات ص ۶۹/۱)

### شعبہ ایمان میں اختلاف روایت

ایک روایت میں بضع و سبعون او بضع و ستون شک کے ساتھ ہے، اور بعض میں صرف سبعون، اور بعض روایت میں صرف ستون یقین کے ساتھ ہے بعض حضرات سبعون اور ستون کو تکثیر پر محمول کرتے ہیں یعنی تعداد میں در حقیقت کوئی تضاد اور اختلاف نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ ایمان کے بہت سے شعبے ہیں جیسے ان تستغفر لهم سبعین مرة، میں سبعین کو تکثیر پر محمول کرتے ہیں، یہاں بھی اس کو تکثیر کیلئے مانا جائے۔

(۲) بعض حضرات تحدید پر محمول کرتے ہیں، یہ حضرات ساتھ اور ستر کے اختلاف روایت کا کئی طرح جواب دیتے ہیں۔ (الف) تعداد کا اختلاف زمانہ کے اختلاف پر مبنی ہے، یعنی شروع میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ بتائے گئے تو آپ نے ساتھ ہی بتلائے، جب ستر بتلایا گیا تو آپ نے ستر بیان فرمایا۔

(ب) ستون یقینی ہے اور سبعون میں شک ہے، اس لئے یقینی مقدار کو لیا جائے۔

(ج) سبعون کو لیا جائے اور ستون کو ترک کر دیا جائے، کیونکہ سبعون کے ذیل میں ستون بھی داخل ہے، نیز عدد اقل عدد اکثر کی نفی نہیں کرتا، اور ایک وجہ یہ بھی ہے ثقہ کی روایت میں کوئی امر زائد ہو تو اس کو قبول کیا جاتا ہے، لان زیادة الثقة مقبولة،

### اہمیت حدیث

محدثین نے اس حدیث کو اتنی اہمیت دی ہے کہ شعبہ اسلامی کو جمع کرنے کیلئے مستقل تصنیفیں تالیف کی ہیں، ان میں امام بیہقی، ابو حاتم، ابو عبد اللہ طبری، شیخ عبد الجلیل اور اسحاق بن القریطی جیسے اجلہ محدثین شامل ہیں اس باب میں ابن حبان کی تحقیق قابل قدر ہے ان کا بیان ہے کہ میں نے اس حدیث کی روشنی میں قرآن کے تمام اسلامی اعمال کو جمع کیا تو ستر، اسی سے بہت زیادہ ہوئے، پھر میں نے قرآن کے صرف انہیں اعمال کو جمع کیا جس پر قرآن نے ایمان کا اطلاق کیا ہے تو ستر سے کم نکلے، پھر حدیث سے ان اعمال کو لیا جن پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے جب دونوں کو ملایا تو ساتھ ستر سے زائد نکلے، پھر ان میں سے کمرات کو حذف کر کے شمار کیا تو ٹھیک ستر نکلے، تو مجھے اسکا یقین ہو گیا کہ اس حدیث کی مراد یہی ہے۔

### رکن اور شعبہ کے درمیان فرق

احادیث میں بعض اعمال کو رکن، اور بعض کو شعبہ کہا گیا ہے، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی غرض اعمال کے درمیان باہمی تفاوت بتلانا ہے کہ جن کو ارکان کہا گیا ان کی حیثیت کچھ بلند ہے، اور جن کو شعبہ کہا گیا ان کی حیثیت ایک شاخ کی سی ہے، جس کے کٹنے سے اصل درخت کو چنداں نقصان نہیں پہونچتا، صرف اس کی زیبائش، حسن، کمال میں فرق پڑتا ہے، گویا ایمان ایک جڑ ہے اور اس سے جو اعمال صادر ہوتے ہیں وہ شاخ ہیں جس طرح درخت کا کمال شاخ پر موقوف ہے، اسی طرح ایمان کا کمال اعمال پر موقوف ہے اس روایت میں مرجیہ، معتزلہ وغیرہ کی بھرپور تردید ہوتی ہے،

## مرکب ایمان پر استدلال

اس حدیث سے ایمان کے مرکب ہونے پر محدثین نے استدلال کیا ہے، کیونکہ اس میں تصدیق اور عمل دونوں کے مجموعہ پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے، بسیط ماننے والے حضرات اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس حدیث میں شعبہ ایمان کا بیان ہے نفس ایمان کا بیان نہیں، اس لئے نفس ایمانی میں اجزاء نکلنے سے نفس ایمان کا ذواجزاء ہونا لازم نہیں آتا، لیکن حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس حدیث سے ایمان کے بسیط یا مرکب ہونے کی طرف اشارہ کرنا نہیں بلکہ ان دونوں کے علاوہ ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے اور وہ یہ کہ یہ سارے شاخ انسان کے ایمان کی حیات و موت کا معیار ہیں اور مقصد یہ ہے کہ ایمان صرف اس خشک تصدیق کا نام نہیں، جس میں عمل صالح کی ایک شاخ بھی نہ پھوٹے، بلکہ اس تر و تازہ یقین کا نام ہے جس میں اعمال صالحہ کی بہت سی شاخیں پھوٹیں، رنگ برنگ کی عبادت کے پھول کھلیں، اور ایسے اعمال کی کلیاں کھلیں کہ دوسروں کو بھی اس کی مہک لگے اور فائدہ پہنچے، اور اگر قلبی تصدیق تو ہے مگر اعمال صالحہ اس کے ساتھ موجود نہیں اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ نہیں تو مگر کہ رکن اسلام ایمان ہے مگر وہ کھوکھلی ہے اس میں حقیقت کی کوئی روح نہیں، اور زبانی اقرار بھی ہے مگر وہ رکھی ہے، غرض یہ کہ زندگی میں شعبائے اسلامی اس بات کی دلیل نہ ہے کہ ایک مومن کا ایمان زندہ ہے یا اس کی روح نکل چکی ہے اور اسی کی طرف اشارہ کرنے کیلئے شعبہ کا لفظ استعمال کیا گیا۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے ایک طبع انداز میں بیان کیا ہے، مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت و فرعہا فی السمۃ تؤتی اکلہا کل حین، اس آیت میں کلمۃ طیبۃ کو ایک درخت سے تشبیہ دی گئی ہے، مگر اس درخت سے نہیں جس میں پھول و پھل کی کوئی رونق نہ ہو اور دوسرے درختوں کی طرح نہیں جو سال میں ایک ہی بار پھل لاتے ہوں بلکہ موسم کی قید سے آزاد ہو کر پھل و پھول سے ہمیشہ لدے رہیں۔ (فیض البذی ص ۵۷/۱)

قوله الحیاء شعبۃ من الایمان: لفظ شعبہ میں تنوین تعظیم کی ہے اسی شعبۃ عظیمۃ

## حیاء کی تعریف

طبیعت کے اس انفعال کا نام ہے جو کسی ایسے خیال و فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے جسے عرفاً یا شرعاً مذموم سمجھا جاتا ہو، اور وہ کام کرنا جو خدا کی اطاعت اور لہ حقوق پر آمادہ کرنا ہو اس کا نام حیاء ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ اس کو ترک کر دینا ہے، اسی لئے بعض نے اس کا ترجمہ ترک سے کیا ہے۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو چیز شرعیاً عرفاً مذموم ہو اسے ترک کر دیا جائے، اور یہ تو مسلم ہے کہ محسن کی شکر گزاری کی جائے اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کیا جائے، انسان کا سب سے بڑا محسن حق سبحانہ و تعالیٰ ہے اس کی نافرمانی سب سے بڑی ناشکری ہے، تو جس میں حیاء ہو گی وہ عام محسنوں کی ناشکری سے پرہیز کرے گا، تو حق تعالیٰ کی ناشکری تو کبھی اس کو گوارہ بھی نہیں ہو سکتی، اس لئے حیاء آدمی کو ایمان پر آمادہ کرے گی اور جب ایمان سب سے عمدہ چیز ہے تو جو چیز ایمان پر آمادہ کرے یقیناً وہ بھی خیر ہی ہو گی اسی لئے ایک حدیث میں الحیاء کلمۃ خیر اور دوسری حدیث میں الحیاء لایأتی الا بالخیر آیا ہے اسی گہری مناسبت کی وجہ سے الحیاء شعبۃ من الایمان کو ایک مستقل جملہ میں ذکر کیا گیا کیونکہ حیاء منبع خیر ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو منع فرمایا جو اپنے بھائی کو حیاء سے روک رہا تھا۔

## حیاء شرعی کا معیار

شیخ محمد بن ابی بن عربی نے فتوحات مکیہ میں ایک اہم بات ذکر کی ہے کہ حیاء وہی محمود ہے جو شریعت کی حد میں رہ کر ہو، جو حیاء شرعی حد بندی سے باہر ہو اسے حیاء کہنا صحیح نہیں ہے، دیکھئے اپنی بیوی کے منہ پر پردہ ڈالنے کی تاکید کرنا عام حالات میں حیاء ہے مگر احرام کی حالت میں منہ کو چھپائے رکھنے کی تاکید حیاء سے خارج ہے، کیونکہ اس حال میں اگر غیرت و حیاء منہ چھپانے میں ہوتی تو شریعت منہ کھولنے کی ہرگز اجازت نہ دیتی، اس لئے کہ حیا حق تعالیٰ میں سب سے زیادہ ہے اسکے بعد آنحضور ﷺ کی ذات گرامی میں، چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے ان سعداً لغیور وانا اغیر من سعد واللہ اغیر منی ومن غیورته انہ تعالیٰ حرّم الفواحش ما ظہر منها وما بطن، (مشکوٰۃ ص ۲۸۶/۲) لہذا جو شخص شریعت کے خلاف حیاء کرتا ہے، گویا وہ ایک طرح اس بات کا مدعی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ باغیرت ہوں جس بات کی اللہ اجازت دیدے اس کا مطلب یہی ہو گا کہ وہ عند اللہ خجست نہیں ہوگی، لہذا ایسی چیز بلا جھجک کر گزرنا ایمان کی علامت ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں والذین ہم لغروہم حفظون الاعلیٰ ازواجہم ..... کے یہی معنی ہیں، بیوی کے بچے پاس بے ستر ہونے میں تامل کرنا حیاء نہیں، ورنہ حق تعالیٰ "الاعلیٰ ازواجہم" میں بیویوں کے پاس کشف عورت کی اجازت نہیں دیتے، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں نکاح ہی نہ فرماتے، اسی بنا پر صوفیاء نے علامہ شبلی کی اس بات پر مذمت کی ہے جو انہوں نے ایک قاری سے ..... سن کر کہا تھا "اللہم لاتجعلنی منہم" یہ دعوہ کر کے علامہ شبلی نے گویا اہل جنت پر طنز کیا، حالانکہ حق تعالیٰ نے اہل جنت کی مدح میں اس کو ذکر فرمایا ہے، ابن عربی فرماتے ہیں کہ اگر شبلی ولایت کے اونچے مقام پر ہوتے تو ایسی بات ہرگز نہیں کہتے، کیونکہ جنتیوں کا خدا کی نعمتوں میں مشغول ہونا توجہ الی اللہ ہی میں داخل ہے، کیونکہ انکا بہتوں میں منہمک ہونا خدائی انعامات کی وجہ سے ہے جس میں غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بہر حال باحیاء شخص دنیا و آخرت کی فضیلت و رسوائی کے ڈر سے برے کاموں سے اجتناب کرے گا، اور محسن کی فرمانبرداری میں لگا رہے گا۔

## حیاء پر تین اشکال

"حیاء ایک فطری اور غیر اختیاری چیز ہے، اور ایمان اختیاری چیز، تو سوال یہ ہے کہ ایک غیر اختیاری چیز، اختیاری چیز کا جزو شعبہ کیسے بن سکتی ہے؟ اشار جن نے اس کی تین جوابات دیئے ہیں،

- (۱) حیاء کی دو قسم ہے حیاء طبعی، حیاء شرعی، حیاء طبعی تو غیر اختیاری ہے، لیکن حیاء شرعی اختیاری ہے، اور چونکہ اس حدیث میں حیاء شرعی مطلوب ہے اور اسی کو جزء ایمان قرار دیا گیا ہے لہذا کوئی اشکال نہیں،
- (۲) اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حیاء طبعی اور حیاء اختیاری ایک ہی چیز ہے تب بھی کوئی اشکال نہیں، کیونکہ شریعت کے مطابق حیاء کا استعمال بغیر اختیار کے نہیں ہو سکتا، اس لحاظ سے حیاء اختیاری ہوا، جو جزء ایمان بننے کے لائق ہو گیا،
- (۳) ہدیۃ حیاء ایمان سے متعلق نہیں لیکن چونکہ حیاء معاصی سے اس طرح روکتی ہے جس طرح کہ ایمان، اس لئے تشبیہ اور مجازاً اسن الایمان کہا گیا، لیکن علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ حیاء کی یہ تقسیم درست نہیں کیونکہ حیاء تو نام ہے

اس انعامی ملکہ کا جو انسانی طبیعت میں پایا جاتا ہے، لہذا اگر اسے امور طبعیہ کی طرف منسوب کرو تو حیاء طبعی ہے اور اگر امور عقلیہ کی طرف منسوب کرو تو حیاء عقلی ہے، اور اگر امور عرفیہ کی طرف منسوب کرو تو حیاء عرفی ہے، اور امور شرعیہ کی طرف منسوب کرو تو حیاء شرعی ہے، گویا حیاء تو ایک ہی ہے لیکن نسبت الگ الگ ہے۔ (نفع الہادی ص ۸۳/۱)

### حیاء پر دوسرا اشکال

بوجہ حیاء انسان کبھی کبھی گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے مثلاً غسل جنابت کی نوبت آئی اور لوگوں سے شرم کی بنا پر غسل نہیں کیا اور نماز قضا کر دی، تو بظاہر یہ حیاء گناہ کا سبب بنا لہذا جو شکی گناہ کا سبب بنے اس کو ایمان کا شعبہ کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اس کے کئی جوابات ہیں۔

(۱) درحقیقت یہ حیاء نہیں بلکہ پست ہمتی، اور بزدلی ہے، کمزوری طبع کی بنا پر اس نے ایسا کیا، اس کو حیاء کی وجہ سے نہیں کہا جائے گا۔

(۲) اگر اس کو حیاء مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ حیاء عرفی ہے نہ کہ حیاء شرعی، اور حدیث میں شرعی حیاء مراد و مطلوب ہے۔

(۳) حقیقت یہ ہے کہ یہ حیاء نہیں، بلکہ بے حیائی ہے کہ شرم کی وجہ سے غسل جنابت چھوڑ کر نماز قضا کر دی، یہ بے حیائی ہے کہ اس نے رب کائنات سے شرم نہیں کی اور لوگوں سے شرم کی۔ (مودعاقلاری)

### تیسرا اشکال

کسی بھی روایت میں سارے شعبہ کا ذکر نہیں، تو پھر حیاء کو مستقلاً کیوں ذکر کیا؟  
جواب :- حیاء چونکہ وہ عظیم نعمت الہی ہے کہ وہ سارے شعبوں کیلئے داعی ہے، کیونکہ جس کے اندر حیاء ہوتی ہے وہ دنیا اور آخرت کی رسوائی سے ڈرتا ہے، اور تعمیل ارشاد میں کوتاہی نہیں کرتا، اسلئے اسکی عظمت کے پیش نظر مستقلاً ذکر کیا گیا۔  
(۲) جس طرح ایمان گناہوں سے روکتا ہے اسی طرح حیاء بھی گناہوں سے روکتی ہے، اس حیثیت سے حیاء ایمان کے قائم مقام ہوئی اس لئے اس کو مستقلاً ذکر کیا۔ ”م

### حیاء کی صورتیں

”حیاء کی چند صورتیں ہیں، (۱) حیاء جنابت جیسے حضرت آدمؑ کی حیاء، (۲) حیاء تقصیر جیسے فرشتوں کا کہنا ”عابدناک حق عبادناک“ (۳) حیاء اجلال، جیسے حضرت اسرافیلؑ کا پروں کو جھکائے رکھنا، (۴) حیاء کرم جیسے حضور اکرم ﷺ کا حیاء کرنا (۵) کسی کی عظمت کے پیش نظر حیاء، کحیاء علی عن سوال النذی، (۶) حیاء القائم۔ ”م (تعلیق الصبیح)

### حدیث کی جامعیت

اس حدیث میں مقام احسان کی تعلیم ہے، کیونکہ بری باتوں سے پرہیز کرنا اور اچھی باتوں پر عمل کرنا یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ خدا کو حاضر و ناظر تصور کرے اور یہی مقام احسان ہے۔

﴿ حَدَّثَنَا زُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ ..... عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ وَالْحَيْلَةُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ. ﴾

**تشریح** قولہ فافضلها قولہ لا الہ الا اللہ: چونکہ تمام اعمال کی صحت اسی پر موقوف ہے اس لئے اس کو افضل کہا گیا ہے، وادناھا: ادنیٰ، ماخوذ من الدنو، معنی اقرب، یعنی قدر و منزلت کے اعتبار سے قریب تر، اِمَاطَةُ الْاَذَى، اِمَاطَةُ بمعنی ازالہ، اذی مصدر بمعنی اسم قائل موزی، یا مصدر ہی کے معنی مڑا لئے جائیں، اور مبالغہ پر محمول کیا جائے، یا اذی اسم ہے تکلیف دہ چیز، کاٹنا، پتھر وغیرہ۔

**جامعیت حدیث** اس حدیث میں اجمالاً حدیث جبریل کی تمام باتیں آگئیں، افضلها قول لا الہ الا اللہ میں ایمان اور ”ادناھا اِمَاطَةُ الْاَذَى“ میں اسلام اور ”الحیاء شعبۃ من الایمان“ میں احسان آگیا، اور بھی کہا جاسکتا ہے کہ افضلها الخ میں عبادت توی، اور اِمَاطَةُ الْاَذَى میں طاعت و تقویٰ مراد ہے، یا افضلها الخ میں عبادت تقویٰ اور لہذا الاذی سے طاعت و ترک مراد ہے، یا افضلها الخ سے حقوق اللہ اور اِمَاطَةُ الْاَذَى سے حقوق العباد مراد ہے، غرض ہر جہت سے یہ حدیث بڑی جامعیت کی حامل ہے، جو اس پر عامل ہو جائے وہ صالحین کے زمرہ میں داخل ہو جائے گا۔

﴿ حَدَّثَنَا عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ قَالَ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يُعْطَى أَخَاهُ فِي الْحَيْلَةِ فَقَالَ: الْحَيْلَةُ مِنَ الْإِيمَانِ، (د) ﴾

**تشریح** یعنی نصیحت کر رہے تھے، اور بخاری شریف (۸/۱) میں يُعْطَى أَخَاهُ فِي الْحَيْلَةِ، کا لفظ ہے، یعنی اپنے بھائی کو حیاء کی وجہ سے ملامت کر رہا تھا، امام بخاری کا مقصد وہاں مزجیہ کی تردید ہے، کہ ایمان کیلئے اعمال کی ضرورت ہے خواہ قلب کا عمل ہو یا جوارج کا، بغیر عمل کے ایمان مکمل نہیں ہوگا۔

﴿ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُثَنَّى وَمُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ..... عَنْ قَتَادَةَ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا الشَّوَارِبِ حَدَّثَنَا أَنَّهُ سَمِعَ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ الْحَيْلَةُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِالْخَيْرِ فَقَالَ بَشِيرُ بْنُ كَعْبٍ أَنَّهُ مَكْتُوبٌ فِي الْحِكْمَةِ أَنْ مِنْهُ وَقَارًا وَمِنْهُ سَكِينَةٌ فَقَالَ عِمْرَانُ أَعْلَيْكَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَحَلَّيْنِي عَنْ صُحْبِكَ، (د) ﴾

قولہ ان منہ وقاراً ومنہ سکینۃ: اس سے نیچے کی روایت میں ان منہ سکینۃ ووقاراً اللہ ومنہ ضعف کے الفاظ مروی ہیں۔ حضرت عمران کے غصہ ہونے کی مختلف توجیہ محدثین بیان کرتے ہیں،

(۱) غصہ کی وجہ منہ کا من جمعیہ ہے جو محارض ہے انہ کلمۃ خیر، اور لایاتی الا بالخیر کے،  
(۲) کلام رسول میں کلام حکماء کے خط ملط ہو جانے کے اندیشہ سے خفا ہوئے جیسا کہ شروع میں کتب حدیث پر

آپ نے پابندی لگادی تھی، تاکہ قرآن سے غلط ملطنہ ہو جائے۔

(۳) لوب کے خلاف ہونے کی وجہ سے کیونکہ ادب یہ ہے کہ چھوٹوں کی بات کی تائید میں بڑوں کی بات کو پیش کیا جاتا ہے، یہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی تائید میں حکمہ کے کلام کو ذکر کیا گیا، جو لوب کے خلاف ہے۔

(۴) پیش بندی تھی کہ دین و شریعت کے بعد حکمہ کے کلام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

## باب بیان جامع اوصاف الاسلام

اسلام کے جامع اوصاف کا بیان

❦ حدیث ❦ حدثنا ابو بکر بن ابی شیبۃ ..... عن سفیان بن عبد اللہ الثقفی قال:

قلت یا رسول اللہ قل لی فی الاسلام قولاً لا اسأل عنہ احداً بعدک وفي حدیث ابی اسامۃ

غیرک قال: قل آمنت باللہ ثم استقم (مسلم ص ۴۸، مسند امام احمد ص ۱۱۲، ۳/۲۸۵ و ۱/۲۸۵)

ترجمہ: سفیان بن عبد اللہؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اسلام کے متعلق مجھے کوئی ایسی جامع بات فرمادیجئے کہ آپ کے بعد مجھے پھر کسی اور سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، ابو اسامہ کی حدیث میں ”بعدک“ کے بجائے ”غیرک“ کا لفظ ہے، یعنی آپ کے سوا کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے، آپ نے فرمایا آمنت باللہ کہو اس کے بعد اس قول پر پوری طرح قائم رہو۔

### استقامت کا مفہوم

قل لی فی الاسلام، قل آمنت باللہ ثم استقم: یعنی وہ باتیں بتلائیں جس سے اسلام میں کمال پیدا ہو جائے، استقامت ایک مختصر سا لفظ ہے اور اس مختصر لفظ میں شرعی تمام نزاکتیں لپٹی ہوئی ہیں، اسی لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا استقیموا ولن تحضوا، یعنی استقامت کے ساتھ دین پر قائم رہنا مگر مقتضائے استقامت سے عہدہ بر آئی کچھ مشکل ہے، جتنا ہو سکے، اس میں درپیش نہ کرنا قرآن کریم میں ارشاد ہے فاستقم كما أمرت،

کلک طیبہ پر جنت کی بشارت کی احادیث میں کہیں کلک طیبہ کیساتھ خالصاً من قلبہ کا لفظ، اور کہیں ”یبتغی بذلك وجہ اللہ“ کی قید اور کہیں ”ثم استقم“ کے الفاظ نہ کور ہیں، ان سب کا ماحاصل ایک ہے اور وہ ہے اسلام کی مجموعی تعلیم پر عمل کرنا۔

### حدیث کی جامعیت

اس حدیث کا شمار جوامع الکلم میں ہے، اسلامی تمام اصول پر یہ حدیث اجمالاً حاوی ہے، کیونکہ اسلامی اصول کا لب لباب دو چیزوں میں ہے (۱) توحید (۲) طاعت۔ آمنت باللہ میں توحید آجاتی ہے، اور طاعت کے جملہ اقسام استقامت میں آجاتے ہیں، کیونکہ استقامت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ تمام ماموریت پر عمل کیا جائے، اور منہیات سے بچا جائے اسی کے ذیل میں قلوب و ابدان سب کے اعمال آجاتے ہیں، اس لئے حدیث جبرئیل میں بیان کردہ ایمان، اسلام، احسان سب ہی امور پر یہ حدیث مشتمل ہے، استقامت کا تقاضا یہ ہے کہ ساری چیزیں درست ہو جائیں اور کسی جگہ بھی کبھی باقی نہ رہے اسی لئے

صوفیا کا یہ مشہور مقولہ ہے ”الاستقامة خير من الف كرامة“

اس حدیث کی جامعیت کو اس عنوان سے بھی بیان کر سکتے ہیں کہ آمت باللہ میں تمام اعمال خواہ اس کا تعلق اعتدال و اس سے ہو یا اجتناب منہیات سے سب ہی آجاتے ہیں، بقاعدہ اذا ثبت الشئ ثبت بلوازمہ (قواعد الفہم) اور ”استقامت“ میں اعمال پر ثبات قدمی کا بیان ہے، ایمان پر استقامت اور اعمال میں ثبات قدمی ایسا اہم اور دشوار گزار امر ہے کہ بغیر خدا کی مدد اور توفیق کے قائم رہنا مشکل ہے، اسی لئے ہر نماز میں ”اهدنا الصراط المستقیم“ کے ذریعہ استقامت کی دعا کا حکم دیا گیا ہے، اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات میں سب سے دشوار اور مشکل آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ”فاستقم كما أمرت“ ہے

امام فخر الدین رازیؒ نے تصریح کی ہے کہ استقامت کے دائرہ میں عقائد و اعمال سبھی آجاتے ہیں، عقائد میں استقامت یہ ہے کہ خدا کے بارے میں عقیدہ ٹھیک ہو، یہود و نصاریٰ اور دوسرے فرق ضالہ کی طرح تشبیہ و تعطیل وغیرہ کا عقیدہ نہ ہو، اور اعمال کی استقامت یہ ہے کہ اس کو اسی طرح کیا جائے جس طرح شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کرنا ثابت ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے، پس دنیا میں استقامت ایسی ہی دشوار گزار ہے جیسے قیامت میں پل صراط پر چلنا۔



## باب بیان تفاضل الاسلام وای امورہ افضل

اسلامی امور کی فضیلت کا بیان اور ان میں کون سا کام افضل ہے

❖ حدیث ❖ حدثنا قتیبہ بن سعید ..... عن عبد اللہ بن عمرو ان رجلاً سأل رسول اللہ

ﷺ ای الاسلام خیر، قال: تطعم الطعام وتقرأ السلام علی من عرفت و من لم تعرف، (۱)

ترجمہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اسلام میں سب سے بہتر عمل کونسا ہے؟ تو فرمایا (بھوکوں) کو کھانا کھانا اور آشنا ہو یا آشنا سب کو سلام کرنا۔

رابط اور شرح حدیث

ما قبل میں ایمان کے شعبہ کو بتلایا اور پھر ان شعبوں پر استقامت و مداومت کی روایت ذکر کی، لہذا اب ضرورت ہوئی کہ اسلام کے کچھ اہم شعبے کی اہمیت و حیثیت بتلائی جائے، اس لئے یہاں اسلام کے دو شعبے اطعام طعام اور افشاح سلام کی روایت ذکر کی گئی ہے۔

”ان رجلاً: حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ انکا نام معلوم نہ ہو سکا، البتہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ رجل سے مراد حضرت ابوذرؓ ہیں، ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ابن حبان کی روایت میں ہے کہ وہ قاضی شریع کے والد ماجد ہانی بن مرہ ہیں۔ (۲) ای الاسلام خیر: ضابطہ یہ ہے کہ ای کی اضافت متعدد چیز کی طرف کی جاتی ہے، مفرد کی طرف نہیں، اس لئے تقدیر عبارت یوں ہوگی ای خصال الاسلام خیر، یعنی اسلامی امور میں سے کونسا سب سے عمدہ و بہتر ہے، امام مسلمؒ اس

روایت میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلامی امور تو بہت سارے ہیں لیکن سب ایک طرح کے نہیں بلکہ بعض امور کو بعض پر فوقیت حاصل ہے، بعض اعلیٰ اور بعض اس سے کمتر، اور جب اسلامی امور میں فرق مراتب ہے تو اس سے خود بخود نتیجہ نکل آتا ہے کہ مومنوں میں بھی فرق مراتب ہے، گونا گونا گونہ انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں، لیکن باہمی فرق مراتب ایمانی اوصاف کے لحاظ سے ہے، اِنْ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰیَکُمْ کا یہی مطلب ہے۔“

### افضل اعمال کون؟

اس روایت میں بلکہ اکثر روایات میں سوال ایک ہے کہ اسلامی امور میں افضل و بہتر عمل کون ہے؟ لیکن آپ نے اسی ایک سوال کا جواب مختلف فرمایا، کسی نے جب ”ایّ الاسلام خیر“ کا سوال کیا تو اس کے جواب میں اطعام طعام اور اقربہ السلام فرمایا، کہیں ”ایّ المسلمین خیر؟“ کے جواب میں ”من سلّم المسلمون من لسانہ ویدہ“ ارشاد فرمایا، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِیّی الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: اَیْمَانُ بِاللّٰهِ قَبْلَ: ثُمَّ مَاذَا قَالَ الْجِهَادُ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ، قَبْلَ: ثُمَّ مَاذَا قَالَ حُجٌّ مَّہْرُورٌ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِیّی الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ، وَفِی رِوَاۃٍ اِیّی الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَیَّ اللّٰهِ؟ قَالَ الصَّلٰوۃُ لَوْ قُتِیَہَا، قَالَ ثُمَّ اِیّی قَالَ بَرُّ الْوَالِدَیْنِ قُلْتُ ثُمَّ اِیّی؟ قَالَ الْجِهَادُ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ، وارد ہے، غرض سوال ایک ہی ہے مگر جوابات مختلف ہیں حالانکہ خیر اسم تفضیل ہے، تو سب سے عمدہ تو کوئی ایک ہی چیز ہو سکتی ہے، متعدد چیزوں پر خیر، افضل، احب کا اطلاق کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) سائل کے احوال کے مختلف ہونے کی بنا پر جوابات مختلف ہیں یعنی اگر سائل میں اطعام طعام اور اقربہ السلام کی صفت میں کمی محسوس کی تو وہاں انہیں دو باتوں پر زور دیا، کہیں سائل میں حقوق والدین کی کمی محسوس کی تو وہاں حقوق والدین پر ہی زور دیا، کسی سائل میں وقت پر نماز ادا کرنے کی کوتاہی محسوس کی تو ان کے مناسب حال وقت پر نماز ادا کرنے کی ترغیب دلائی، غرض جن کے مناسب حال جو صفت معلوم ہوئی وہ آپ نے ارشاد فرمائی۔

(۲) جواب کا اختلاف زمانہ کے اختلاف پر مبنی ہے، کہ جس زمانہ میں جس بات کی زیادہ ضرورت تھی اسی پر زور دیا جنگ کے زمانہ میں جہاد فی سبیل اللہ، مسلمانوں کی غربت اور افلاس کے زمانہ میں جو دو سخا پر، انتشار و افتراق کے زمانہ میں کثرت سلام پر، گویا تقاضا وقت کا لحاظ کرتے ہوئے جواب عنایت فرمایا۔

(۳) ایمان باللہ جہاد فی سبیل اللہ، اطعام طعام، اقربہ السلام وغیرہ ان چیزوں پر اہمیت اور خیریت کا حکم لگا کر درحقیقت افضلیت کے مختلف وجوہات کی طرف رہنمائی کرتی ہے، کہ فضیلت کے مختلف وجوہات ہو سکتے ہیں، کسی وجہ سے بعض کو افضل کہا جائے، تو دوسری وجہ سے دوسرے کو افضل کہا جائے گا مثلاً بعض جہت سے ایمان افضل ہے، تو کسی جہت سے جہاد، اور کسی اور جہت سے اطعام طعام وغیرہ۔

(۴) طعام و سلام کو افضل کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سب کے نزدیک یہ امور ہیں خواہ مسلمان ہوں یا کافر، نیکوکار ہوں یا فاسق، اس کی اچھائی فطری ہے، اس کے برتنے سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے، دشمنی اور عداوت دور ہوتی ہے،



جیسے مجرم کو غفور و مہربان سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا، بیکسوں کے ساتھ رواداری اور غمخواری کرنا، بھوکوں کو کھانا کھانا، اور ہر شخص کو سلام کرنا یہ وہ امور ہیں کہ اس کو ہر طبقہ کے لوگ عمدہ اور اچھا سمجھتے ہیں، اور اگر اس جہت سے دیکھا جائے کہ سب سے زیادہ اجر و ثواب ایمان باللہ میں ہے اس لئے کہ ایمان باللہ ابتدائے اسلام میں سب سے زیادہ دشوار گزار تھا، اور جو کام جتنا مشقت آمیز ہوگا اس میں اتنا ہی اجر و ثواب ہوگا، اس کے بعد جہاد کا درجہ ہے، کیونکہ اپنی جان و مال کو قربان کر دینا، اعداء کفریہ اللہ کیلئے دشمنوں کے تلوار کے سامنے آنا، بہت بڑا ایثار اور بہت بڑی قربانی ہے، اس کے بعد حج میرور کا نمبر ہے، کہ سفر کی مشقت، وطن، بال و بچوں کو چھوڑ کر مال خرچ کر کے چنانچہ ہجر مشکل ہے، پھر یہ کہ تخلیق انسانی کا مقصد عبادت ہے، اور عبادت میں نماز، غایت درجہ تواضع و انکساری کا مظہر ہے اس لئے وقت پر نماز کی ادائیگی کو افضل کہا جائے گا پھر چونکہ اس دنیا میں انسان کے وجود کا سبب ظاہری والدین ہیں، اس لئے ان کے احسان کے صلہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا یہ افضل قرار پایا، غرض ہر قوم کی جہت سے افضل کام اطعام طعام اور افشاء سلام، و دشواری کے لحاظ سے ایمان، اسکے بعد جہاد، پھر حج میرور ہے، اور انسان کی افضلیت کے لحاظ سے وقت پر نماز افضل ہے، یہ جواب سب سے عمدہ ہے۔

### لفظ خیر، افضل اور احب میں فرق

افشاء سلام کی فضیلت کیلئے لفظ خیر استعمال کیا کیونکہ خیر کے مقابلے میں شر آتا ہے، چونکہ یہ چیز ہر قوم میں عمدہ ہے اس لئے اس میں شروعت کا احتمال نہیں، اور دوسری قسم یعنی ایمان باللہ، جہاد فی سبیل اللہ، اور حج میرور کی افضلیت کو افضل سے تعبیر کیا گیا، کیونکہ افضل، فضل سے ماخوذ ہے، اور اس کے معنی زیادہ کے ہیں، اور اسکے مقابلہ میں نقص آتا ہے چونکہ یہ امور محنت و مشقت سے حاصل ہوتے ہیں اسلئے اس میں اجر و ثواب بھی زیادہ ملتا ہے، اور تیسری قسم یعنی الصلوٰۃ لوقفتہا کی فضیلت کو احب سے تعبیر کیا گیا کیونکہ احب کے مقابلہ میں انقض آتا ہے، چونکہ نماز میں بندہ اپنی انتہائی خاکساری اور انکساری کا اظہار کرتا ہے، اور یہ چیز خدا کو بہت پسندیدہ ہے، اس کے مقابلے میں کبر اور سرکش خدا کو حد درجہ ناپسندیدہ ہے۔

**تطعم الطعام:** ”یہاں ایک اشکال تو یہ ہے کہ اسلام کا کونسا عمل افضل و بہتر ہے؟ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ کھانا کھلاؤ، تو اس صورت میں بظاہر سوال و جواب میں مطابقت معلوم نہیں ہوتی، جواب یہ ہے کہ یہاں اُن مصدر یہ مقدر بنے اس لئے تطعم الطعام بمعنی اطعام طعام ہے، لہذا کوئی اشکال نہیں، تاہم فعل مضارع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا تاکہ استمرار پر دلالت کرے، اور اشارہ ہو کہ اس عمل خیر کی عادت ڈالو۔

دوسری بات یہ ہے کہ تطعم دو مفعول کو چاہتا ہے، لیکن یہاں مفعول اول محذوف ہے تاکہ تعمیم کی طرف اشارہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اس لفظ میں اتنی وسعت ہے کہ نہ کسی وقت کی قید ہے نہ مسلمان اور کافر کا فرق، یہاں تک کہ انسان و حیوان میں بھی امتیاز نہیں۔ صحابہ کرام نے اس ارشاد کی تعمیل اس گرم جوشی کیساتھ کیا کہ اپنے پاس اپنے بچوں کی صرف ایک وقت کی خوراک رکھتے، خود کو بھوکا رکھنا اور دوسروں کو کھلا دینا پسند کیا، یوشرون علیٰ انفسہم ولو کان بہم خصاصة۔ ”م  
وتقرأ السلام علی من عرفت الخ: سلام میں جان پہچان کی تخصیص نہ کرنا اخلاص کی دلیل ہے، علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ علی من عرفت ومن لم تعرف، میں اشارہ ہے کہ تمہارا سلام اسلامی سلام ہونا چاہئے، جو خالصاً

لوجه الله ہو، تصنع اور حظ نفس سے خالی ہو، لہذا صرف پہچان والے سے سلام کرنے میں حظ نفس، دنیوی غرض کا احتمال و شبہ رہتا ہے، اس لئے ہر کس و تا کس کو سلام کرنا چاہئے (۱)۔ یہی نے روایت نقل کی ہے کہ قیامت کی علامت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صرف پہچان والوں کو ہی سلام کیا جائے اسی لئے افشاء سلام اس امت کا شعار ہے، سلام بخدا کی نقل فرمایا ہے کہ حضرت آدم کی پیدائش کے بعد خدا نے فرمایا کہ جا کر ان فرشتوں کو سلام کریں اور سنیں کہ کیا جواب دیتے ہیں، وہی آپ کی اولاد کا سلام ہو گا حضرت آدم تشریف لے گئے اور فرمایا ”السلام علیکم“ تو فرشتوں نے جواباً کہا ”وعلیک السلام ورحمۃ اللہ“ (۲) اس سے معلوم ہوا کہ سلام آدمیت کا تختہ ہے۔

### سلام کے چند اہم مسائل

”سلام میں پہل کرنا، سنتِ موکدہ ہے، مخاطب اگر تنہا ہو تو اس پر جواب دینا واجب ہے، اگر مخاطب جماعت ہے تو ایک فرد کے جواب دینے سے وجوب ساقط ہو جائے گا، سلام میں مسلمان کی تخصیص ہے غیر مسلموں کو سلام کرنا جائز نہیں، علامہ شامی نے تفصیل سے لکھا ہے کہ کن لوگوں کو سلام کرنا مکروہ ہے (۳) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کو اصولی انداز میں بیان فرمایا ہے (۱) ہر وہ شخص جو کسی معصیت میں مبتلا ہو جیسے شطرنج کے کھیل وغیرہ میں، (۲) نجاست کی حالت میں مشغول ہو جیسے پیشاب و پاخانہ کی حالت میں ہو (۳) طبعی حاجت میں مشغول ہو جیسے کھانا کھاتے وقت یا پانی پیتے وقت میں، (۴) یا طاعت میں مشغول ہو، جیسے تلاوت، نوافل، اقامت، نماز، درس، درمیان خطبہ، فقہی بحث و تحقیق وغیرہ، ان حالات میں سلام کرنا مکروہ ہے، تاہم اگر کسی نے سلام کر دیا تو مخاطب پر جواب دینا واجب نہیں، ہاں تلاوت کرنے والے کے بارے میں صاحبِ بزاز یہ کا کہنا ہے کہ اس کو جواب دینا چاہئے۔ (۵)“

### افشاء سلام کا حکم کس ماحول میں دیا گیا؟

عرب کی زندگی قتل و غارت سے ایسی خوف زدہ ہو گئی تھی، کہ جب کوئی اجنبی شخص کسی شخص سے ملتا، تو وہ اس کو موت کا خورشید نظر آتا، اور جب تک اس کی جانب سے اطمینان نہیں ہو جاتا خوف زدہ ہی رہتا، اسلام نے آکر یہ تعلیم دی، کہ خوف و ہراس کا دور ختم ہو اسلامی دامن کا دور آچکا ہے، انور اسکے اعلان کیلئے سب سے پہلے لفظ سلام مقرر کیا، تاکہ پہلی ہی ملاقات میں یہ بات صاف ہو جائے کہ اب تم میری طرف سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کرو، کیونکہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اس لفظ کو چلتے پھرتے اس کثرت سے استعمال کرنے کا حکم دیا کہ ہر طرف سے خوف دور اور سلامتی کی برکتیں پورے عالم میں انسان کو میسر ہوں۔

حدثنی ابو الطاهر احمد بن عمرو بن عبد اللہ بن عمرو بن سرح المصري ..... عن أبي  
الخير أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو بْنَ الْعَاصِ يَقُولُ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَقَالَ أَيُّ الْمُسْلِمِينَ خَيْرٌ؟ فَقَالَ: مَنْ سَلَّمَ الْمُتَسَلِّمِينَ مِنْ لِسَانِهِ وَبِهِ، (۶)

ترجمہ | حضرت عبد اللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کامل مسلمان وہ

(۱) فتح الباری ص ۵۶/۱۱ (۲) بخاری شریف ص ۹۱۹/۱۱ (۳) شامی ص ۴۰۷/۲ (۴) بزاز ص ۳۵۰/۲ (۵) ہندیہ  
لفظ ”السلام علیکم“ سے متعلق تحقیق کیلئے ملاحظہ ہو فیض الباری ص ۸۰/۱ (۶) بخاری ص ۶۱۱/۱۱ (۷) مسلم ص ۱۸۸/۱ (۸) ابوداؤد، ترمذی ص ۹۰/۲

ہے جو اپنے مسلمان بھائی کو اپنی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رکھے۔

**تشریح**

عرب کی قوم میں ایک زمانہ سے جو قتل و غارت اور جنگ کی عادت چلی آرہی تھی وہ قوم ابھی تازہ تازہ اسلام میں داخل ہوئی ہے تو خیر اسلام ان کو بتلانا چاہتے ہیں کہ صرف ارکان اسلام کو ادا کر لینے سے اور چند مخصوص عقائد پر یقین کرنے سے کوئی شخص مؤمن اور مسلم کے لقب کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کو یہ ثابت کر دینا ہوگا کہ اب پہلے کی طرح ان کی زندگی پیام موت نہیں رہی، بلکہ سر تا سر محدود سلامتی بن گئی ہے، یہ وہ شخص ہے جس کو اسلام مسلم کا خطاب دیتا ہے اس اسلوب بیان میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ملکہ شاعر گوئی کے بغیر کوئی شخص شاعر اور علم کے بغیر عالم نہیں کہا جاسکتا اسی طرح سلامتی کا پیکر بنے بغیر کسی کو مسلم نہیں کہا جاسکتا۔ (ترجمان السنہ ص ۱۷۱/۲)

**زبان و ہاتھ کی تخصیص کیوں؟**

قوله من سلم المسلمون من لسانه ويده: اس میں گالی، گھوج، لعن و طعن، غیبت و بہتان سب ہی آگئے، قوله ويده میں مارنا، قتل کرنا، مکان دوپوار وغیرہ کو منہدم کرنا، دھکا دینا، وغیرہ سب ہی چیزیں داخل ہیں ہاتھ و زبان کی تخصیص اس لئے کہ عام طور پر ایذا رسانی کے آلات یہی ہیں، ورنہ اصل مقصد ترک ایذا ہے، خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہو گیا سارے اعضاء مراد ہیں نیز زبان کو ہاتھ پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زبان کی ایذا ہاتھ کی تکلیف سے سخت ہوتی ہے مشہور شعر ہے: جراحات السنان لها التيام ولا يلتام ما جرح اللسان

(۲) نیز ہاتھ کی ایذا کا تعلق صرف حاضر کے ساتھ ہوتا ہے، جبکہ زبانی ایذا کا حاضر و غائب دونوں کے ساتھ بلکہ زبان کی ایذا میں زندہ و مردہ دونوں شامل ہیں، نیز زبان کی ایذا کثیر ہے، بمقابلہ ہاتھ کی ایذا کے کیونکہ اس میں تو اولاً تو کچھ کرنا نہیں پڑتا صرف زبان بلانی پڑتی ہے اور ضرر زیادہ پہنچ جاتا ہے، اور ایک کلمہ کے ذریعہ پورے عالم کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے، مزید یہ کہ لسان کا لفظ لائے قول نہیں کہا کیونکہ لسان عام ہے اس میں منہ چڑانا بھی شامل ہے اور قول صرف زبان کے کلمات ہی کو شامل ہے اسی طرح ید میں انگوٹھا دکھا کر چڑھانا بھی داخل ہے۔

اشکال:- "اس روایت میں مسلمین کی قید سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ صرف مسلمانوں کو ایذا نہ دی جائے، کفار کو دے سکتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے مفہوم میں کفار بھی شامل ہیں، مسلمین کی قید صرف اس لئے لگائی ہے کہ اس کو تکلیف پہنچانا زیادہ سنگین ہے، اپنے پی یا طالب علم کو لوہا سزا دینا اسی طرح تکلیف دہ جانور کو مارنا یہ اس روایت سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ درحقیقت ایذا نہیں میا عرفان ایذا نہیں سمجھا جاتا ہے۔

نیز یہاں یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ جب روایت میں مبتدئ اور خبر دونوں معرفہ ہیں جس سے حصر کا معنی مفہوم ہوتا ہے تو اس سے پتہ چلا کہ جس کے اندر خاص کر صرف سلامتی کی صفت ہو، کیا وہ کامل مسلمان ہو جائے گا؟ اگرچہ دوسرے اوصاف نہ ہوں۔ اس کا جواب یہاں مراد یہ ہے کہ کامل مسلمان وہ ہے جس میں باقی ارکان کی رعایت کے ساتھ یہ صفت ہو، یا یہ مراد ہے کہ کامل مسلمان میں تو یہ صفت سلامتی ہونی ہی چاہئے۔ "م

المسلم: "میں الف لام جنسی ہے کیونکہ الل عرب جس چیز کا کمال بیان کرنا چاہتے ہیں اس پر اسم جنس کا اطلاق کرتے

ہیں کما یقال البیت للکعبۃ والکتاب للکتاب سببویہ، گویا قلب لام کے ذریعہ ہی ملے ہو جاتا ہے کہ یہاں نفس مسلمان ہونے کا نہیں بلکہ کامل مومن ہونے کا بیان ہے، جب ضابطہ ہے کہ کوئی حکم کسی مشتق پر لگایا جاتا ہے تو اس حکم کی علت و مدارہ اشتقاق ہوتا ہے تو جب اس میں سلامتی کی صفت نہ ہوگی تو وہ کامل مومن نہ ہوگا۔ (م ل)

## باب بیان خصال من اتصف بہنَّ وَجَدَ حِلَاوَةَ الْإِيمَانِ

ان خصلتوں کا بیان جن سے ایمان کی حلاوت محسوس ہوتی ہے

حَدَّثَنَا اسْحَقُ بْنُ اِبْرَاهِيمَ وَمُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَىٰ بنِ عَمْرٍو وَمُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ..... عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ثَلَاثٌ مِنْ كُنْ فِيهِ وَجَدَ بِهِ حِلَاوَةَ الْإِيمَانِ، مِنْ كَلَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ وَأَنْ يَكُونَ لَنْ يَغُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ مَنَّا انْقَذَهُ اللَّهُ مِنْهُ كَمَا يَكُونُ أَنْ يَقْذَقَ فِي النَّارِ، (۱)

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا، (۱) اللہ اور رسولؐ اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوں ان دونوں کے ماسوا سے (۲) جب وہ کسی سے محبت کرے تو اللہ کیلئے کرے، (۳) کفر میں پھر واپس جانا اتنا ہی برا لگے جیسے آگ میں داخل ہونا۔

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب مومن کا ایمان درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہے، اور ایمان اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا ہے تو اس کا ایک ایمانی مزاج بن جاتا ہے اور اس منزل پر اس کی نگاہوں میں سب سے زیادہ محبوب اللہ و رسولؐ کی ذات ہوتی ہے، اللہ و رسولؐ سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ اس کے ماسوا کی طرف رخ ہی نہیں کرتا، اسی کو قرآن میں وَالَّذِينَ آمَنُوا اشْدُّ حُبًّا لِلَّهِ، (پ ۲۷: ۱) سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی اللہ سے اس کو عشق ہو جاتا ہے، اور ہر چیز میں اس کی رضا کا طالب ہوتا ہے حتیٰ کہ جب کسی انبیان سے دوستی کرتا ہے تو اس میں بھی کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی، بلکہ خدا کی رضا پیش نظر ہوتی ہے، ایمان کے خلاف ہر چیز سے بیزاری اور نفرت ہوتی ہے، چونکہ ایمان و کفر میں تضاد کی نسبت ہے اس لئے کفر سے ایسی طبعی نفرت ہوتی ہے جیسے آگ سے نفرت ہوتی ہے، حدیث مذکور کی اس آخری اور تیسری بات کو قرآن کریم نے اس طرح ادا کیا ہے، وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبِيبُ الْإِيمَانِ وَرِثْنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّةُ الْبَيْتِ الْكُفْرِ وَالْفُسُوقِ وَالْعِصْيَانِ، یعنی یہ خدا کا انعام ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت و الدی ہے اور اس کو خوشنما بنا دیا ہے اور کفر، گناہ اور نافرمانی کی نفرت پیدا کر دی ہے، حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ایمان کی تفصیل نماز، زکوٰۃ، صدقہ، حج و غیرہ سے نہیں کی گئی، جبکہ اس کے مقابلہ میں کفر، فسوق، عصیان کی تفصیل کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کامل، فرائض و مستحبات کے مجموعہ کا نام ہے اس لئے ایمان کی محبت یہ ہے کہ بلا تفصیل اس کے تمام احکام سے محبت ہو، اس کے مقابل حالت بعض مرتبہ کفر ہوگی، بعض مرتبہ صرف فسوق و عصیان کی حد تک

رہے گی تو مومن کامل کیلئے ضروری ہے کہ وہ صرف کفر سے نہیں بلکہ کفر و عصیان سے بھی نفرت رکھے، یہ تین الفاظ آیت میں اس لئے رکھے گئے کہ ہر فسق و عصیان کفر نہیں، اور نہ ہر عصیان فسق ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسلام اشخاص و افراد سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا ہاں بڑے افعال سے نفرت و بیزاری کی ضروری تعلیم دیتا ہے، حضرت سید الشہداء کے قاتل اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے بھائی بن سکتے ہیں، اور ایک کاتب و جی مرتد ہو کر زمین و آسمان کا مغنوخ بن سکتا ہے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ کفر سے نفرت کرنا اسلام کی تعلیم کا جزو ہے۔ (ترجمان ملت)

### ایمانی حلاوت سے کیا مراد ہے؟

**قوله: حلاوة الايمان:** علماء نے حلاوت کے معنی طاعت کی لذت اور خدا و رسول کی رضا کے لئے مشقت اٹھانا بیان کیا ہے، البتہ حلاوت کی مراد میں فقہاء اور صوفیاء کے درمیان اختلاف ہے، فقہاء حلاوت معنوی، روحانی مراد لیتے ہیں اور صوفیاء حلاوت حسی مراد لیتے ہیں، علماء کی ایک جماعت نے صوفیاء کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ صحابہ کرام اور سلف کے واقعات سے صوفیاء کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

ع ۱ حضرت بلالؓ کو کفار تہمی ہوئی ریت پر لٹا دیا کرتے اور طرح طرح کی جسمانی تکلیف ان کو دی جاتی لیکن وہ "احد" کی رٹ لگاتے رہتے، گویا جسمانی تکلیف کو احد کی چاشنی سے ملا دیا کرتے تھے، پس جس طرح کہ میٹھی چیز کو ملا کر دوا کی کڑواہٹ کو دور کیا جاتا ہے اسی طرح جسمانی تکلیف احد کی حلاوت سے کم ہو جاتی ہے۔

ع ۲ حضرت بلالؓ کی موت کے وقت لنگے گھردالوں نے روتے ہوئے ہائے افسوس کہا تو حضرت بلالؓ نے جواب دیا "واطرباه غداً النقی الأجنۃ محمداً وحزبه" یعنی یہ تو خوشی کا وقت ہے کہ جلد ہی اپنے محبوب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء سے ملاقات ہونے والی ہے، یہاں بھی حضرت بلالؓ نے موت کی تلخی کو لقاؤ محبوب کی حلاوت سے ملا دیا۔

ع ۳ ایک صحابی رات کے وقت نماز میں مشغول تھے اسی دوران چور آیا، اور ان کے سامنے ان کا گھوڑا لے بھاگا، لیکن انہوں نے اپنی نماز باقی رکھی، جب لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ نماز توڑ کر تم نے اپنا گھوڑا کیوں نہیں بچایا؟ تو فرمایا "ماکنٹ فیہ الذ من ذالک، نماز میں مجھے زیادہ لذت محسوس ہو رہی تھی، اس لئے گھوڑے کی حفاظت میں اس لذت کو ختم کر دینا مجھے تو گوارا نہوا، ظاہر ہے کہ یہ حالات حسی حلاوت کے بعد ہی ممکن ہے۔

ع ۴ حضرت عباد بن بشر جن کو آپؐ نے پہرہ داری کے لئے مقرر کیا تھا، وہ پہرہ کے درمیان تہجد میں مشغول ہو گئے، دشمن نے نماز کی حالت میں پے در پے تین تیر مارا، مگر ہر تیر کو وہ نکالتے گئے اور بعد میں انہوں نے نماز کو مختصر کر کے سلام پھیرا اور فرمایا "لولا انی خفت علی المسلمین ما قطعٹ صلاتی، یعنی اگر مسلمانوں کے نقصان کا خیال نہ ہوتا تو میں نماز مختصر نہیں کرتا، کیونکہ نماز میں جو سورت میں پڑھ رہا تھا، اس میں ایسی لذت محسوس ہو رہی تھی کہ نماز توڑنے کو جی چاہتا ہی نہیں تھا، اس سے حسی لذت و حلاوت کا پتہ چلتا ہے۔

بعض صوفیاء نے یہ کہا ہے کہ اگر انسان کے قلوب غفلت اور خواہشات نفسانی کے مرض سے پاک ہوں تو طاعات میں اُسے ایسی لذت محسوس ہونے لگتی ہے، جیسے لذیذ کھانوں میں۔ حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ فرماتے ہیں واللہ انا لفی لذة

لو علمها الملوك لجادلونا عليها بالسيوف، یعنی خدا کی قسم ہم اللہ والوں کو طاعت کی لذت کا احساس شاہان وقت کو ہو جائے تو اس کو حاصل کرنے کیلئے وہ جنگ و جدال کرنے لگیں۔

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ اهل اللیل فی لیلہم الذ من اهل اللہو من لہوہم، یعنی تہجد گزار کو تہجد میں لہو و لعب میں مشغول رہنے والوں سے زیادہ لذت کا احساس ہوتا ہے، غرض یہ سب اونچے مقامات کی بات ہے، جب مومن کے مدارج طے ہوتے ہیں اور اعلیٰ مقام پر فائز کئے جاتے ہیں تو اس کو حسی حلاوت محسوس ہونے لگتی ہے۔ (امداد الباری)

### اللہ اور رسول کو ایک ضمیر میں جمع کرنا ممنوع

قوله : احب اليه مما سواهما الخ: ”ہما“ کا مرجع اللہ اور رسول ہیں، اس واقعہ پر ایک اشکال یہ ہے کہ یہاں دونوں کو ایک ضمیر میں جمع کر دیا گیا ہے، حالانکہ رسول اکرم ﷺ کے سامنے جب ایک خطیب نے ”ومن يعصهما“ کہا تھا تو آپ نے ”بئس الخطيب انت“ کہہ کر ناگواری ظاہر فرمائی تھی، علامہ نے ناگواری کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ اس نے اللہ اور رسول کو ایک ضمیر میں جمع کیا تھا، تو پھر اس حدیث میں دونوں کیلئے ”ہما“ کی ضمیر کیوں کر لائی گئی؟ اس اشکال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں: (۱) ہر چیز اپنے اپنے موقعہ پر اچھی یا بری کہلاتی ہے، تعلیم کے موقعہ پر معلم کا کمال یہ ہے کہ اپنا مقصد محصل کے سامنے مختصر اور جامع الفاظ میں پیش کر دے، تاکہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے میں آسانی ہو، لیکن جب موقعہ خطبہ کا ہو تو خطبہ میں تفصیل اور وضاحت مطلوب ہوتی ہے، ایسے موقعہ پر اختصار و اجمال کبھی کبھی فساد معنی کا ذریعہ بن جاتا ہے، تو چونکہ خطیب کے لئے موقعہ خطبہ کا تھا انہوں نے اجمال سے کام لیا اس لئے آپ نے منع فرمایا۔

(۲) جب حظ و اباحت میں تعارض ہو تو حظ کو ترجیح دی جاتی ہے، (۳) ممکن ہے ”ہما“ ضمیر میں دونوں کو جمع کرنا آپ کی خصوصیت پر محمول ہو، دوسروں کو منع ہو (۴) ممانعت والی روایت قوی ہے، اور آپ کا استعمال کرنا فعل ہے، اور جب قول و فعل میں تضاد ہو تو قوی روایت کو ترجیح ہوتی ہے، لہذا ممانعت رائج ہوگی، خصوصیت کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب آپ کے سوا کوئی دوسرا شخص اللہ و رسول کو ایک ضمیر میں جمع کر دے تو مساوات کا دہم ہو سکتا ہے، کہ انہوں نے دونوں کو ایک درجہ دیدیا، اور آپ تو اس طرح کے دہم سے منزہ ہیں۔

(۵) بعض علامہ کا خیال ہے کہ حدیث مذکورہ میں اللہ و رسول کو محبت کے اندر جمع کیا ہے، جو درست ہے کیونکہ کسی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی محبت، نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتی، بلکہ دونوں کی محبت کا جمع ہونا ضروری ہے، اور خطیب نے معصیت کے معاملہ میں دونوں کو جمع کر دیا تھا، جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی عصیان کا مجموعہ نقصان کا باعث ہے کسی ایک کی معصیت میں نقصان نہیں، حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اس لئے کہ جس طرح خدا کی نافرمانی گمراہی ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی بھی گمراہی کا باعث ہے۔

(۶) امام طحاوی نے مشکل الآثار میں یہ جواب دیا ہے کہ خطیب کو تنبیہ کرنا اللہ اور رسول کو ایک ضمیر میں جمع کرنے کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس کے انداز خطبہ پر تھا، انہوں نے خطبہ اس طرح دیا تھا من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد و من یعصیہما، یہاں اس نے سانس توڑ دیا اور سکتہ کے بعد کہا ”فقد غوی“ اب ترجمہ یہ ہو گیا جو اللہ کی اطاعت کرے وہ ہدایت پر ہے، اور

جو معصیت پر ہے وہ بھی، اس انداز بیان سے معنی بالکل متخل ہو گیا، اسلئے آپ نے ”بئس الخطیب انت“ فرمایا۔

(۷) اس سے عمد جواب یہ ہے کہ اللہ و رسول سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو اسم ظاہر کی صورت میں لایا جائے جب انسان کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو محبوب کا بار بار نام لیتا ہے، اور اس کے نام میں اسے لذت محسوس ہوتی ہے۔

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ هو المسک ما کررتہ يتضوع

تو یہاں اللہ و رسول کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کو اسم ظاہر کے ساتھ ذکر کیا جائے اسی لئے جہاں بھی اللہ و رسول کا ذکر آیا ہے عموماً اسم ظاہر ہی ہے۔

(۸) ایک جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ خطیب کو ادب و احترام سکھانا تھا کہ اللہ و رسول کے ادب و احترام کا تقاضا ہے کہ دونوں کو الگ الگ ذکر کیا جائے، یہ تنبیہ حرمت یا کراہت کے لئے نہیں تھی جبکہ مذکورہ حدیث میں دونوں کا ایک ضمیر میں جمع کرنا بیان جواز کیلئے ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک جگہ آپ نے فرمایا ”لا تسموا العنب الکرم فانما الکرم الرجل المسلم“ ظاہر ہے کہ انگور کو کرم کہا حرام نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ کرم کے ساتھ موسوم ہونے کے مستحق مسلمان ہیں اس لئے ادب یہ ہے کہ جس نام کا جو مستحق ہو اس نام سے اسی کو موسوم کیا جائے۔

(۹) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں بعض صحیح حدیث میں تنبیہ کی ضمیر ثابت ہے، مثلاً ابو داؤد شریف کی روایت من یطعم اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعضہما فانه لا یضر الا نفسه، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افراد اور تنبیہ دونوں کی ضمیر لانا درست ہے۔

مشہور عالم دین شارح مسلم مولانا تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف کیفیت رہا کرتی تھی، کبھی احترام الہی کا غلبہ ہوتا تو الگ الگ بیان فرماتے اور جب رحمت الہی کا غلبہ ہوتا تو صیغہ تنبیہ کی بھی اجازت دیتے۔

قوله: وان یحب المرء لا یحبہ الا اللہ : جب قلب کا داعیہ اور ظاہری اعمال سب رضاء الہی کے تابع بن جائیں تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ اب ایمان اسکے ظاہر و باطن میں رچ چکا ہے قلب و زبان میں یک رنگی اور پوری صداقت پیدا ہو چکی ہے، اور اس میں نفاق کے کسی شعبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی، مومن کی دوستی بھی اللہیت پر مبنی ہوتی ہے، دنیوی کوئی غرض اس سے وابستہ نہیں ہوتی مجنون کا شعر اسی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

أمر علی الدیار دیار لیلیٰ اقبل ذا الجدار و ذا الجدارا

وما حب الدیار شغفن قلبی ولكن حب من سكن الدیارا

ان یعود فی الکفر بعد أن انقذه اللہ الخ: انقاذ کی دو صورت، کہ کفر کے بعد اسلام کی توفیق الہی ملی،

دوسری صورت یہ کہ اس کی ولادت ہی اسلام پر ہوئی اور اسلام پر پوری طرح ہمارا ہاں

دوسری صورت پر اشکال یہ ہوگا کہ عاد یعود کے معنی پہلی حالت کی طرف لوٹنا تو جب اس شخص کی پہلی حالت کفر کی نہ تھی تو ان یعود کہہ کر پہلی حالت کی طرف لوٹنے کو ناپسند کرنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے؟ تو شارحین نے اس جواب کی

طرف اشارہ کیا کہ دوسری صورت میں اصلی معنی نہیں، بلکہ یہ ضرورت کے معنی میں یعنی کافر ہونے کے معنی میں ہے اور پہلی صورت میں اپنے اصلی معنی پر ہے۔

قوله كما يكره ان يقذف في النار: علامہ نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ جس مسلمان کو کفر پر مجبور کیا جائے اور وہ کلمہ کفر بولنے سے احتراز کرے اور اپنی جان دیدے تو اس کا مرتبہ اس شخص سے زیادہ ہو گا جو اپنی جان کی حفاظت میں کلمہ کفر اپنی زبان سے کہہ دے۔ (لہ)

باب وجوب محبة رسول الله ﷺ اكثر من الاله والولد والوالد الخ  
رسول اکرم ﷺ سے اہل و عیال والدین اور سبھی لوگوں سے محبت کے واجب ہونے کا بیان اور جس کو ان سے ایسی محبت نہ ہو وہ مومن نہیں۔

حدثني زهير بن حرب ..... عن انس قال قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يؤمن عبد وفي حديث عبد الوارث الرجل حتى اكون احب اليه من اهله وماله والناس اجمعين، (لہ)  
حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا، اور عبد الوارث کی حدیث میں بجائے عبد کے رجل کا لفظ ہے، جب تک کہ میں اُسے اس کی اہل و مال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

### رابطہ اور اقسام محبت

اگلے باب میں خلاوت ایمانی پیدا کرنے کیلئے تین باتیں بتلائی گئیں، ان میں پہلی بات من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواہما، وہاں اللہ اور رسول سے محبت کا مطالبہ تھا لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہیں تھی کہ کوئی محبت کا مطالبہ ہے، محبت طبعی کا مطالبہ ہے یا عقلی کا؟ یا ایمانی کا؟ کسی چیز کی محبت تین طرح کی ہوتی ہے طبعی، عقلی، ایمانی۔ محبت طبعی ایک فطری محبت ہے، اس میں انسان کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہو تا بلکہ انسان مجبور ہوتا ہے جیسے باپ کی محبت اولاد سے، اگر باپ اولاد کی محبت دل سے نکالنا بھی چاہے تو اس پر اس کو قدرت نہیں ہوتی، اسی لئے محبت طبعی کیلئے محبوب میں کمال کا ہونا ضروری نہیں ہے، محبت عقلی میں طبیعت کا میلان محبوب کی طرف ہوتا ہے مگر محبوب کا کمال اور خود اس کا فائدہ ہمیشہ نظر نہیں ہوتا ہے، اگر وہ طبعاً ناگوار بھی ہو تو عقل کا فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو گوارا کر لیا جائے جیسے کہ کڑوی دوا سے مریض کو محبت ہوتی ہے۔ حب ایمانی، یہ ان دونوں سے اوپر کی چیز ہے اس میں نہ نفع کی تمنا ہے اور نہ نقصان کی، بلکہ صرف محبوب کی خوشنودی اور رضا پیش نظر ہوتی ہے، خواہ اس میں اپنا نقصان کیوں نہ ہو، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے، کہ محبت در حقیقت ایک ملکہ اور میلان قلب کا نام ہے، اور اس کی تقسیم دراصل فلسفیانہ موشگافی ہے ہاں تعلقات کے اختلاف کی وجہ سے اس کے نام مختلف ہو گئے، اگر قلب کا میلان امور طبعیہ کی طرف ہو تو اُسے محبت طبعی کہتے ہیں، اگر اس میلان کا



تعلق عقلی چیزوں سے ہو تو وہی محبت عقلی ہے، اور شریعت مطہرہ اور ایمان کا تعلق ہو تو وہی محبت ایمانی اور شرعی ہے (فیض الباری ص ۸۱/۱) بہر حال اوپر کے باب میں محبت کا مطالبہ تھا مگر اس کی کوئی تفصیل نہیں تھی کہ کونسی محبت کا مطالبہ ہے، امام مسلم اسی بات کی تفصیل اس میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

### حدیث کا مطلب

جس طرح تم کو اپنے مال، اہل و عیال اور والدین وغیرہ سے محبت طبعی ہوتی ہے، اور اسکی محبت میں اندھے اور دیوانے ہو جاتے ہو اسی طرح جب تک تمکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ان تمام چیزوں سے بھی زیادہ محبت نہ ہو جائے تمہارا ایمان کامل نہیں ہو سکتا، گویا تمہارے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہر چیز سے زیادہ جگہ ہونی چاہئے مگر رسول کی محبت حاصل کرنے کے لئے تم کو اپنی اولاد، جائیداد، والدین حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی دستبردار ہونا پڑے تو تمکو محبت رسول کے لئے ہر چیز کو قربان کرنا ہوگا، جب ہی تمہارا ایمان مکمل ہوگا، قرآن نے اس مضمون کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے، قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تُرَضُّونَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ، (پ ۱۰، ۹۷) اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے مگر تمہارے باپ، اولاد، بھائی، بیویاں، کنبد، تمہارا مال جو تم نے کمایا، تمہاری تجارت جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ ہے، تمہارے رہنے کا مکان جو تمہیں بہت پسند ہے، یہ سب چیزیں اللہ اور رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو خدا کو کرنا ہے تمہارے سامنے آجائے، خدا فاسقوں پر ہدایت کی راہ نہیں کھولتا۔

آیت مذکورہ میں ان تمام انجام کو ذکر کیا گیا جو اسلامی زندگی اختیار کرنے کے بعد، خلاف توقع نہیں ہوتے، یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ باپ بیٹے سے، اور بیٹا باپ سے، بھائی اپنے بھائی سے، شوہر اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جائے، کنبد، قبیلہ روٹھ جائے، اپنا جمع کیا ہوا مال ہاتھوں سے نکل جائے، چلتی ہوئی تجارت میں روزانہ کٹ جائے، رہائشی مکانات ترک کرنے پڑیں، مگر جملہ اذکار ایسے وقت میں تم کس کا ساتھ دو گے؟ اگر کہیں عزیز و اقارب کا ساتھ دیا تو یہ اس کا ثبوت ہوگا کہ جو ایثار و قربانی کا عہد تم نے اپنے خدا سے باندھا تھا وہ غلط ہے غرض اسلام بتاتا ہے کہ عزیز و اقارب کے بڑے حقوق ہیں، اور سب حقوق کی رعایت کرنا، انسان کا فرض ہے مگر خدا اور رسول کا حق سب سے مقدم ہے، اور اسی لئے جب کسی کے حق کی ادائیگی میں ان کا حق فوت ہو تو پھر ان کا حق مقدم کرنا ہوگا۔

### اسباب محبت

”مشہور ہے کہ محبت کے چار اسباب ہیں: جمال، کمال، احسان، قربت۔

جمال :- حسن و جمال کا تعلق صورت سے ہو یا سیرت سے، فصاحت و بلاغت سے ہو، یا حسن کتابت اور دلکش آواز سے، یا پھر خوش الحانی سے، حسن کلام سے ہو یا عظم کلام سے، بہر حال جالب محبت ہے، اگر شاکل نبوی کی روایت کو سامنے رکھیں تو یقین کرنا ہوگا کہ آپ کے چہرہ انور کی دل ربانی لب و لہجہ کی شیرینی، جسم کی گل افشانی، گفتار کی رعنائی، رنگ و رنگت کی

ملاحظت اور قد و قامت کی دل فرمائی نے آپ کی ذات گرامی کو کائنات میں سب سے عمدہ حسین و جمیل کا پیکر بنایا تھا۔

کمال :- عموماً کمال کا معیار علم ہے، یا عقل، علم کے متعلق تو خود زبان رسالت کے الفاظ ہیں اوتیثک علم الاولین والآخرین، ظاہر ہے کہ سب سے بڑا کمال علم ہے، عقل کے متعلق شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوالم المعارف میں نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے عقل کے سو حصے کئے ننانوے حصے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت فرمائے، اور بقیہ تمام مخلوقات پر تقسیم کی گئی، بعد از خدا بزرگ تو کی قصہ مختصر

احسان :- انسان کی فطرت ہے اپنے محسن کے احسان سے متاثر ہو کر محبت کرتا ہے، درحقیقت آپ تو پوری کائنات کے محسن ہیں، اور اشرف کائنات کے محسن ہدایت ہیں، کیونکہ جہنم کے قعر عیش سے نکالا اور صراطِ مستقیم کے جادو حق کی راہ نمائی فرمائی۔

قرابت :- بوجہ نسب و رشتہ آپس میں جو محبت ہوتی ہے اسکو قرابت کہتے ہیں، قرآن نے کہا النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم، کہ نسبی رشتہ کی بنا پر جتنی محبت ہوتی ہے اس سے زیادہ محبت ہونی چاہئے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نام ہے جسم اور روح کا جس میں جب تک روح ہے، جسم سڑتا نہیں، روح نکل گئی، تو جسم سڑ جاتا ہے، معلوم ہوا کہ روح اصل ہے اور جسم اس کے تابع، یہیں سے معلوم ہوا کہ روحانی تعلق جسمانی تعلق کے مقابلہ میں اعلیٰ اور ارفع ہو گا، ماں باپ مربی ہیں جسم کے، اور نبی مربی ہیں جسم و روح دونوں کے، لہذا رسول کی قرابت تمام مخلوق کی قرابت سے زیادہ ہوگی، اس لحاظ سے بھی رسول کی محبت سب سے زیادہ ہونی چاہئے۔ ”م

### کونسی محبت مطلوب ہے؟

”قوله احب الیہ: عام طور پر شرح نے وضاحت فرمائی ہے کہ محبت عقلی مراد ہے نہ کہ طبعی، کیونکہ محبت طبعی تو غیر اختیاری شئی ہے لہذا اس کا مکلف کیسے بتایا جاسکتا ہے؟ لیکن اس محبت عقلی کے ثبوت میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ قدرے کمزور ہے، کہ جیسے مریض کو کڑوی دوا پینا مکروہ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے، مگر چونکہ اس سے صحت حاصل ہوتی ہے اس لئے کڑوی دوا کو مریض دل و جان سے پیتا ہے، اور عقلاً پسند کرتا ہے، اسی طرح آپ کی محبت عقلاً ہے لیکن اس بے عمل مثال سے یہ نہ سمجھیں کہ العیاذ باللہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مجبوری کے درجہ میں ہے، کیونکہ دوا کوئی محبوب نہیں رکھتا، مگر مجبوری کی حالت میں، تو کیا اور درجہ کا تسلیم بھی یہ باور کر سکتا ہے؟ کہ اس کی محبت مثل دوا کے ہے، اس سے بہتر تو شیخ یہ ہے کہ محبت کے چار اسباب ہیں، اور چونکہ چاروں بدرجہ اتم آپ میں پائے جاتے ہیں، اس لئے تقاضا عقل یہی ہے کہ آپ کی محبت ساری مخلوق سے زیادہ ہو۔

حضرت شیخ الحدیث نے والد ماجد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ درحقیقت محبت طبعی ہی مراد ہے، اور ہر مومن کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت طبعی ہی سب سے زیادہ ہوتی ہے، یہاں اتنی بات ہے کہ آپ کی محبت طبعی کے ظہور کے مواقع بہت کم پیش آتے ہیں اور نولاد و اقارب کی محبت کے مواقع بکثرت پیش آتے ہیں، اس لئے نولاد و غیرہ کی محبت بظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہے، لیکن تقابل و تصادم کے وقت حقیقت سامنے آتی ہے، کہ نعوذ باللہ جب آپ کے اسم گرامی

پر اگر کوئی پاؤں رکھ دے تو ہر ممکن اسکو روکنے کی کوشش کرے گا، اس کا دل زخمی ہو جائے گا، اور فوراً اس کاغذ کو اٹھا کر چوم لے گا، یہاں ظاہر ہوا کہ محبت کس کی زیادہ ہے، مگر بعض اکابر سے بھی محبت طبعی ہی منقول ہے اور بظاہر قرین قیاس بھی ہے کیونکہ حدیث میں والد اور ولد کا ذکر ہے، اور ان سے محبت طبعی ہوتی ہے، اسی طرح محبت کے جو چار اسباب ہیں ان سے بھی محبت طبعی ہوتی ہے، لہذا اس کا بھی تقاضا ہے کہ طبعی ہو، جیسا کہ صحابہ کرام کی مثالی محبت سے اندازہ ہو گا۔ "م (۱۰)

### کثرت محبت نبوی کا معیار

بعض علماء نے لکھا ہے کہ کثرت محبت کی ظاہری علامت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کا جائزہ لے کہ اگر ایک ہی وقت میں اسے دنیا کا بہت گرانقدر سرمایہ ملے والا ہو اور ٹھیک اسی وقت اسکو رسول کی زیارت ہونے والی ہو، دونوں کا حاصل ہونا ایک ساتھ ناممکن ہو اگر زیارت رسول کو ترجیح دی جائے تو گرانقدر سرمایہ سے ہاتھ دھوٹا پڑیگا، اور اگر سرمایہ کو حاصل کرنے میں رہے گا تو دیدار رسول سے محروم رہ جائے گا، اگر ایسی حالت میں اس کا قلبی رجحان دیدار رسول کی طرف ہو اور اس بے بہاد دولت کے سامنے بڑا سے بڑا سرمایہ ترک کر دینا اس کیلئے آسان ہو اور زیارت کو ترک کر دینا بہت زیادہ شاق ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہو گا کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی لگاؤ زیادہ ہے، اسی طرح اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں دنیوی مفاد کو ترک کرنا پڑے، یا آپ کی سنت اور دین کی حفاظت میں دنیوی مفاد کو چھوڑنا آسان ہو تو یہ بھی آپ سے کثرت محبت کی علامت ہے۔

### محبت رسول حاصل کرنے کا طریقہ

اس حدیث میں حب رسول کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ بتلایا گیا ہے، کہ اگر انسان غور و فکر سے کام لے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ نفع حب رسول میں ہے، کیونکہ انسان کا محبوب خود اس کی ذات ہے یا مال و اسباب، اپنی جان سے محبت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مصائب اور آفات سے محفوظ رہے، اور مال و اسباب سے محبت اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے انسان کو نفع پہنچتا ہے، اگر انسان غور کرے تو جتنا فائدہ ہر شخص کو نبی کی ذات سے پہنچتا ہے، اتنا فائدہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں پہنچ سکتا، نبی نے کفر کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی بخشی، اور اسکی بدولت آخرت کی ایسی دائمی اور عیش و آرام والی زندگی میسر ہوگی جس میں تکلیف اور مصیبت کا ذرہ برابر شامل نہیں، ایسی دولت اور ایسا عیش و آرام کسی اور چیز سے حاصل ہو ہی نہیں سکتا، لہذا جب سب سے زیادہ نفع ذات رسول سے پہنچتا تو سب سے زیادہ محبت اسی ذات اقدس سے ہونی چاہئے، غرض انسان آپ کے احکامات کا جتنا زیادہ استحضار کرے گا محبت میں اضافہ ہو گا۔

### صحابہ کرام کی مثالی محبت

شفاء میں میر تقی محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جنگ احد میں ایک انصاری عورت کے باپ، بھائی، شوہر تینوں شہید ہو گئے جب اسے خبر ملی، تو اس نے دریافت کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بخیر ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں بخیر ہیں اس نے کہا چلو مجھے دکھاؤ، تاکہ میں خود آپ کے روئے انور کو دیکھ کر سکون حاصل کروں، اس نے آپ کو دیکھ لیا تو بول پڑی کلی مصیبت بعدک جلت، یعنی جب آپ زندہ ہیں تو پھر ہر مصیبت آسان ہے۔

(۲) حضرت علی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہمیں اپنے مال، اولاد، والدین، پیاس، میں سر دہانی سے بھی زیادہ پیاری تھی، اہل مکہ جب زید بن دہنہ کو قتل کرنے کے لئے حرم سے باہر نکلے تو ابوسفیان بن حرب بولا زید قسم کھا کر کہو کیا اس وقت تمہیں یہ پسند ہے کہ یہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے، حضرت زید نے قسم کھا کر کہا، مجھے تو یہ بھی گوارہ نہیں کہ میں گھر میں رہوں اور یہاں آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے، ابوسفیان کہنے لگے میں نے اتنی محبت کسی کو کرتے نہیں دیکھا، جتنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ان سے کرتے ہیں۔

(۳) ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بولا آپ مجھے اپنے اہل و عیال اور مال سب سے زیادہ محبوب ہیں، جب آپ کی یاد آتی ہے تو صبر نہیں آتا، جب تک یہاں آکر دیکھ نہیں لیتا، اب افسوس ایہ ہے کہ وفات کے بعد آپ تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوں گے وہاں میں آپ کو کیسے دیکھا کروں گا؟ اس پر یہ آیت اتری، وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّدِيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا آپ نے اُسے بلا کر یہ آیت سنائی، یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں معیت سے مراد صرف جنت میں معیت ہے جہاں ہر وقت حاضر ہو کر، آپ کا دیدار ممکن ہو گا، خاص آپ کے مقام پر معیت مراد نہیں۔

(۴) حضرت عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ جو صاحب الاذان کہے جاتے ہیں اپنے باغ میں کچھ کام کر رہے تھے دفعہ ان کے فرزند پہنچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنائی اُسی وقت انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور کہا اے اللہ مجھے نابینا کر دے کہ ان آنکھوں سے اب کسی کو نہ دیکھ سکوں۔

(۵) غزوہ احد کے دن حضرت ابو دجانہ نے اپنی پیٹھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنادیا تھا، تیر اس پر لگتے تھے اور حرکت نہیں کرتے تھے، مالک الحذری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زخم چوس کر صاف کر دیا تھا، ان سے آپ نے فرمایا تھوک دو تو انہوں نے کہا بخدا میں کبھی بھی نہ تھوکوں گا۔

اسی طرح کے واقعات کو سامنے رکھ کر علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے روایت میں محبت طبعی کا مطالبہ ہے لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مطالبہ محبت عقلی کا ہے، کیونکہ محبت طبعی غیر اختیاری ہے، جو انسان کے اختیار سے باہر ہے، اور انسان کو مکلف انہیں چیزوں کا بنایا جاتا ہے، جو اس کے اختیار میں ہو اس صورت میں روایت کا مطلب یہ ہو گا، کہ جب تک تمہاری عقلی محبت طبعی پر غالب نہ ہو، اس وقت تک تم کامل مومن نہیں ہو سکتے، اور ایک طرف تم کو اولاد کی محبت، اور اپنی بنائی بلڈنگ کی محبت، رسول سے رشتہ کاٹنے پر مجبور کر رہی ہو تو تم کو اپنی عقل سے فیصلہ کرنا ہو گا کہ رسول سے الگ ہو کر اولاد وغیرہ سے چند روز راحت مل سکتی ہے، لیکن مادی تمام چیزوں سے رشتہ کاٹ کر رسول سے وابستہ ہو جانے میں ہمیشہ کی راحت ملے گی، غرض اس سلسلہ میں علماء کے دو خیالات ہیں، تاہم دونوں کے درمیان تطبیق دی جاسکتی ہے، اور وہ اس طرح کہ ایمان کے دو درجہ ہیں ایک ابتدائی درجہ یعنی نفس ایمان، اور ایک انتہائی درجہ جسکو حدیث جبرئیل میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، ایمان کے ابتدائی درجہ میں محبت عقلی کا مطالبہ ہے، اور جب مومن کی محبت عقلی ترقی کرتی ہے تو پھر انتہاء میں اللہ اور رسول سے محبت طبعی ہو جاتی ہے، یہاں پہنچ کر مومن کو ہر وقت محبوب کی رضا کا خیال رہتا ہے، اسی کو مقام رضا سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس مقام پر حضرات صحابہ کرام فائز تھے۔

﴿ حدیث ﴾ "عن انس بن مالک لا یؤمن احدکم حتی اكون احب الیه من ولده ووالیده والناس اجتمعین۔"

اس روایت کو جوامع الکلم میں شہر کیا گیا ہے، کیونکہ محبت تین قسم کی ہوتی ہے، (۱) محبت عظمت، جیسے والدین کی محبت (۲) شفقت کی محبت جیسے بچے کی محبت (۳) محبت مشاکلت جیسے تمام انسانوں کی محبت، جتنی بھی محبت ہے اسی تین میں داخل ہے، محبت کی کوئی نوع اس سے خارج نہیں اس لئے جوامع الکلم سے ہونا ظاہر ہے۔ "م

اختلاف روایت

"حضرت انسؓ ہی کی روایت بخاری میں ہے اس میں والد مقدم ہے، اور یہاں ولد مقدم ہے، اور والد مؤخر ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ فتح الباری میں دونوں کی معقول وجہ لکھی ہے (۱) والد کو اس لئے مقدم کیا کہ وجود کے اعتبار سے والد مقدم ہے نیز مرئی ہونے کے اعتبار سے بھی قابل تکریم ہے، اور تکریم کا تقاضا ہے کہ اُسے مقدم کیا جائے،

(۲) وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ والد تو ہر شخص کا ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کو ولد بھی ہو، اسلئے والد کو مقدم کیا، لیکن جن روایتوں میں ولد ہی مقدم ہے اسکی یہ وجہ لکھی ہے کہ یہاں محبت کا معاملہ ہے عموماً جتنی والد کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے، اتنی اولاد کو والد سے نہیں ہوتی، لہذا ولد جب محبت میں مقدم ہے تو اس لئے اس کو مقدم کیا۔

سوال :- اس میں والدہ کا ذکر نہیں؟ ج: احکام شریعت میں عورتیں مردوں کے تابع ہیں تو جس طرح دیگر احکام میں مخاطب مرد ہیں مگر حکم میں عورتیں بھی شامل ہیں اسی طرح یہاں بھی حکماً عورتیں داخل ہیں، جیسا کہ خود ولد میں مذکور اور مؤنث دونوں شامل ہیں، یا والد کو فاعل ذکر کذا مان لیا جائے جیسے "لابن وقاتمہ" یعنی ذوالبن ذواتمہ کے معنی ہیں اسی طرح والد سے ذوالد لیا جائے، تو اس میں والدہ بھی آجاتی ہیں کیونکہ والدہ بھی والد کی طرح ذوالد کہلاتی ہیں۔

سوال :- انسان کو خود اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے تو اس کا تذکرہ کیوں نہیں؟

جواب :- الناس، اجمعین میں داخل ہے، اس لئے نفس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

(۲) یہاں دراصل والد یا ولد کا ذکر تمثیلاً ہے، ورنہ مراد سبھی محبوب افراد و اشیاء ہیں، ان دونوں کا ذکر محض اس لئے کیا

کہ عموماً سب سے قابل قدر مظہر محبت یہی دو چیزیں ہیں۔ "م

لفظ محبت کی نکتہ سنجی

"لفظ حب میں حرف حاء کو اختیار کیا جس کا عرَج اقصیٰ حلق ہے، اور اس ہا کو لیا جس کا عرَج آواز نکلنے کی انتہائی جگہ یعنی ہوٹ ہے، لہذا ابتدا و انتہا دونوں جانب کے آخری حصے کو دو حرف سے معنی محبت کو ادا کیا گیا، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محبت کی شان اور محبوب سے تعلق بھی ایسا ہی ہو کہ ابتدا و انتہا وہی ہو کوئی غیر نہ ہو، جیسا کہ هو الاول والآخِر والظاهر والباطن۔ (۵)

## باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان يحب لآخیه المسلم ما یحب لنفسه من الخیر

ایمان کی خصلتوں کی علامت یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کیلئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے

حدیث ﴿ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى وَابْنُ بَشَّارٍ قَالَا نَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ قَالَ سَمِعْتُ قَتَادَةَ يُحَدِّثُ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ أَوْ قَالَ لِجَارِهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ. (۱) ﴾

ترجمہ حضرت انسؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کیلئے وہی بات پسند نہ کرنے لگے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، ان کا لفظ فرمایا جارہا۔

رابط :- اس باب کا تعلق بھی کمال ایمان سے ہے، کمال ایمان کی ایک علامت حب رسول بتلائی گئی، دوسری علامت حب مسلم ہے، ان دونوں باب کی ترتیب سے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ جب مومن کے دل میں رسول کی محبت ہوگی تو اس کے نتیجہ میں عام مسلمانوں سے بھی محبت ہوگی، ان دونوں کو لام بخاری نے بھی ص ۶ پر ذکر فرمایا ہے، مگر ان کی ترتیب لام مسلم سے جداگانہ ہے، لام بخاری نے پہلا باب حب مسلم قائم کیا ہے، اس کے بعد حب رسول کا، اور لام مسلم نے اس کے برعکس، گویا لام بخاری نے صعود کیا ہے یعنی اوٹی سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی ہے، اور لام مسلم کی ترتیب میں نزول ہے، پہلے اعلیٰ مرتبہ حب رسول کا اور پھر نچلا مرتبہ حب مسلم کا، تاہم لام مسلم کی ترتیب عمدہ ہے، کیونکہ لام بخاری کی ترتیب سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ پہلے عام مسلمانوں سے محبت ہوگی، پھر اس کے بعد رسول سے محبت ہوگی، حالانکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے اللہ سے محبت ہو پھر رسول سے، پھر عام مسلمانوں سے، نیز حب رسول کے بعد حب مسلم کو لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حب مسلم نتیجہ ہے حب رسول کا، جس کو رسول کی ذات سے جتنی محبت ہوگی، ان کے واسطے سے اتنی ہی مسلمانوں سے محبت ہوگی، من احبہم فبیحی احبہم ومن ابغضہم فبیغضی ابغضہم، (۲) اس کی واضح دلیل ہے، خلاصہ یہ کہ جس کو رسول کی ذات سے محبت ہوگی اس کو تعلیم رسول سے بھی محبت ہوگی، اور مسلمانوں سے محبت کرنا رسول کی تعلیم ہے، لہذا اس تعلیم پر وہ ضرور عامل ہوگا، اور لام بخاری کی ترتیب کا مقصد یہ ہے کہ جب اسلام میں حب ناس کی اتنی اہمیت ہے تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں حب رسول کی کتنی اہمیت ہو سکتی ہے ولکل وجہ،

ترجمہ لایو من میں لائمی کمال کیلئے ہے، معنی یہ ہوگا کہ کامل درجہ کا مومن وہی شخص ہوگا جس کو مومنوں سے محبت ہوگی، یہاں نفی کمال کے دو قرینے ہیں (۱) علماء اللہ سنت وجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی کو مسلمان سے محبت ہو تو وہ دائرہ ایمان سے خارج نہ ہوگا، (دائر تفسیر ص ۱۴۲۰) (۲) ابن حبان کی روایت میں لا یبلغ عبد حقیقۃ الایمان

کی تصریح ہے اور حقیقتو ایمان سے مراد کمال ایمان ہے، لافنی کمال کے لئے کلام عرب میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، جیسے لاشجاع الازید، اسی طرح لاصلوة لجار المسجد الا فی المسجد، میں بھی بالاتفاق لافنی کمال کیلئے ہے۔

لایومن میں لافنی کمال کے لائنے سے مقصد مومن کو ابھارنا ہے کہ جب تم نے ایمان قبول کر لیا ہے تو تم کو کمال ایمان حاصل کرنا چاہئے، ناقص پر قناعت کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا، جبکہ دنیاوی معاملہ میں تمہارا جذبہ اعلیٰ درجہ کو حاصل کرنے کا ہوتا ہے، تو اخروی معاملہ میں یہی جذبہ کار فرما ہونا چاہئے اگر تم نے کمال ایمان کا درجہ حاصل نہیں کیا تو کہا جاسکتا ہے کہ گویا تم نے ایمان ہی قبول نہیں کیا، گویا اس تعبیر میں یہ بتلاتا ہے کہ جب ایمان کے بہت سے شعبے اور بیشمار درجات ہیں اور ہر نچلا درجہ اوپر کے درجہ سے کمتر ہے تو یوں سمجھنا چاہئے کہ نیچے کا درجہ کچھ ہے ہی نہیں۔

**قوله اخیه اولجارہ:** مسلم اور مسند عبد بن حمید میں اولجک کے ساتھ ہے اور بخاری (ص ۶) میں لاخیه بغیر شک کے ہے، الخ کے دو معنی بیان کرتے ہیں مطلقاً بھائی کا معنی خواہ مسلمان ہو یا ذمی، اور بعض لوگ مسلمان بھائی مراد لیتے ہیں، چونکہ اسلام افراہ و اشخاص سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ صفات ذمیرہ سے نفرت کی تعلیم دیتا ہے کافر سے کوئی نفرت نہیں، بلکہ اس کے کفر سے نفرت ہونی چاہئے، انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں، اس لئے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم اپنے بھائی کیلئے خواہ مسلمان ہو یا کافر وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، خواہ دنیوی چیز ہو یا اخروی، اگر تم اپنے لئے ایمان پسند کرتے ہو تو اپنے بھائی کا فرضی کیلئے بھی اسلام پسند کرو، اس کیلئے دعوہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اُسے بھی اسلام کی توفیق دے، اس معنی کی تائید ترمذی کی روایت سے ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَأْخُذْ عَنِّي هَؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ فليعمل بهنَّ او يعلم من يعمل بهن فقال ابو هريرة انا يا رسول الله فآخذ بيدي فعذ خمسا فقال اتق المحارم تكن اعبد الناس وارض بما قسم لك تكن اغنى الناس واحسن الى جارك تكن مومنا و اجب للناس ما تجب لنفسك تكن مسلما (ترمذی ص..... مشکوٰۃ ص ۴۱۰)

**قوله ما يحب لنفسه:** اسے مراد اچھی چیزیں ہیں، نسائی شریف (ص ۲۷۰) میں حتیٰ يحب لاخیه ما يحبه لنفسه الخیر کی تصریح ہے، اس سے منہیات اور منکرات نکل جائیں گے، کیونکہ خیر اسکو شامل نہیں، نیز محبوب وہی چیزیں کہلاتی ہیں جو اچھی سمجھی جاتی ہیں، لیکن اس سے بعض چیزوں کو مستثنیٰ کیا جائے گا (۱) ایسی چیزیں جنکا تعلق خصوصیات سے ہوں، مثلاً امامت، قرآن میں ایک جگہ ہے واجعلنا للمتقين اماما، (پ ۱۹، ع ۱۶) دعا کی تلقین کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کے سبھی لوگ امام بن جائیں تو پھر دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، اور بغیر مقتدی کے کوئی امام ہو بھی نہیں سکتا یا جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے لئے وسیلہ کی دعوہ کیا کرو، یہ مقام صرف آپ کیلئے مخصوص ہے (مسلم ص ۱۷۶) تو یہ بھی آپ کی خصوصیات میں سے ہے یا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعوہ کی رہب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی، (پ ۱۹، ع ۱۶) اگر یہ چیزیں دوسروں کو بھی حاصل ہو جائیں تو پھر خصوصیات میں اس کا شمار ہو گا ہی نہیں، اس لئے ایسی چیزوں کو مستثنیٰ کرنا ہو گا، کیونکہ حدیث کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے، کہ اس میں خصوصیات کا بھی خیال نہ کیا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس طرح اچھے امور کی تمنا اپنے لئے کرتے ہو اسی طرح دوسروں کیلئے بھی تمنا ہونی چاہئے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ترکِ حسد سے کتنا یہ ہے، چونکہ عموماً لوگوں میں خیر کے معاملہ میں حسد کیا جاتا ہے ہر حاسد کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ محسود علیہ سے یہ چیزیں چھین جائیں کیونکہ یہ دیکھنا پسند نہیں کرتا، اس لئے حدیث میں یہ تعلیم دی گئی کہ مومن کا کام حسد نہیں، بلکہ اس کی یہ خواہش ہو کہ خیر میں زیادہ سے زیادہ افراد شریک ہو جائیں، غیروں کیلئے خیر خواہی کا جذبہ ایمان کا تقاضا ہے اور حسد اور کینہ مذموم صفات ہیں، جس سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہئے۔

**حقوقِ پڑوسی پر ایک واقعہ:** امام غزالی نے احیاء العلوم میں ایک عجیب و غریب واقعہ ذکر کیا ہے کہ کسی کے گھر میں چوہوں کی کثرت ہو گئی تو کسی نے گھروالے کو بیٹا لانے کا مشورہ دیا کہ اس طرح چوہے تمہارے گھر سے بھاگ جائیں گے، تو گھروالے نے کہا کہ مجھے اس بات کا خطرہ ہے کہ بیٹی کی آواز سن کر چوہے میرے گھر سے نکل کر میرے پڑوسی کے گھر میں چلے جائیں گے اور میں جو چیز اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہی چیز اپنے پڑوسی کے لئے پسند کرنے لگوں؟ یہ مومن کی شان کے خلاف ہے۔

**خلاصہ حدیث:** کہنے کو تو یہ مختصر حدیث ہے لیکن اس پر عمل کی توفیق اس وقت تک میسر نہیں آسکتی جب تک کہ انسان کا ایمان کامل نہ ہو جائے، یہ صفت انسانی کمالات کی ایک معراج ہے، اور اس کی دلیل ہے کہ لب اس کا نفس پورے طور پر مدارج تہذیب طے کر چکا ہے، اس میں خود غرضی اور طمع کا شائبہ نہیں۔

## باب بیان تحریم ایذاء الجار

ہمسایہ کو ایذا دینا حرام ہے

❦ حدیث ❦ حدثنا یحییٰ بن ایوب ..... عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارَهُ بَوَاقٍ، (۱)

حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کی ایذا سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ رہ سکا ہو۔

مقصد حدیث

”اسلام، حسین و خوشگوار ماحول اور الفت بھرے معاشرہ کو نہ صرف یہ کہ پسند کرتا ہے بلکہ اس کی تعلیم و تاکید کرتا ہے، ظاہر ہے کہ ہر شخص کیلئے معاشرہ کا پہلا فرد اس کا پڑوسی ہے، جب ہر پڑوسی دوسرے پڑوسی کا خیال رکھے گا تو خود بخود اطمینان کی فضا قائم ہوگی، اور دین کا مقصد اجتماعیت کی صورت میں نمودار ہوگا، یہی وجہ ہے کہ پڑوسی کے حقوق اور اسکے ساتھ حسن سلوک کی حد درجہ تاکید کی گئی ہے، مسلم اور بخاری شریف کے الفاظ یہ ہیں عن عائشۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَا زَالَ جِبْرِئِيلُ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ اَنَّهُ سَيُورِثُنِي، (۲) یہاں آپ اسلام کی فراہمی کیلئے کہتے ہیں کہ پڑوسی کا فرہوا اسکے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی ہے، حافظ ابن حجر نے طبرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ پڑوسی تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو کافر پڑوسی، تو اس کا حق صرف حقِ جوار ہے، دوسرا وہ پڑوسی جو مسلمان ہو تو اسکے دو حق ہیں ایک حقِ جوار، اور ایک حقِ اسلام، تیسرا وہ پڑوسی جو مسلمان ہو اور شہ دار ہو تو اسکے تین حقوق ہیں حقِ جوار، حقِ اسلام، حقِ صلہ



رحمی، (۱) لیکن اگر کوئی شخص پڑوسی کے حقوق کو کیا ادا کرے، ایذا رسانی پر اتر آئے تو تہدیدِ انداز میں آپ نے اسکو بیان کیا کہ اس میں ایمانی شان نہیں، اور اس قابل نہیں کہ جنت میں علی الفور جاسکے، حضرت حسن بصری سے کسی نے پوچھا کہ پڑوس کی حد کہاں تک ہے تو انہوں نے فرمایا کہ چالیس مکان آگے کی جانب، چالیس پیچھے کی جانب، چالیس دائیں اور چالیس بائیں جانب۔“ (۲)

بخاری شریف کی روایت میں یہ الفاظ ہیں عن ابی شریح الخزاعی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یومن واللہ لا یومن قیل: ومن یا رسول اللہ قال الذی لا یامن جارہ بوائقہ، (۳) جنت میں نہ جانے کی اہل سنت والجماعت نے دو توجیہ کی ہے: (۱) جو اپنے پڑوسی کو حلال سمجھ کر تکلیف پہنچائے تو چونکہ ایسا شخص کافر ہے، اس لئے کبھی بھی جنت میں نہیں جائے گا، (۲) صالحین کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گا، بلکہ اپنے جرم کی پاداش بھگت کر بعد میں جائے گا ہاں اگر اللہ درگزر فرمادے ابتداءً تو پھر شروع میں بھی جاسکتا ہے۔

بوائق: مسند احمد میں اتنا اور اضافہ ہے قالوا وما بوائقہ؟ قال شرہ، بوائق جمع ہے بائقہ کی مصیبت، مہلک چیز، اور سخت چیزوں کو کہا جاتا ہے، قرآن میں ایک جگہ او یوبقہن بما کسبوا آیا ہے، حضرت ابو عبیدہ نے اس کا ترجمہ یہاں لکھنے سے کیا ہے، نیز وجعلنا بینہم موبقا کی تفسیر میں عبد اللہ بن عباس سے مہلکا کا ترجمہ منقول ہے۔

## بَابُ الْحَيِّ عَلَى أَكْرَامِ الْجَارِ وَالضَّيْفِ وَلِزُومِ الصَّمْتِ إِلَّا عَنِ الْخَيْرِ وَكَوْنِ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ

پڑوسی اور مہمان کی خاطر داری کی ترغیب کا بیان، اور خاموش رہنے کی فضیلت اور ان باتوں کا ایمان سے ہونا ﴿حَدِيثٌ﴾ حَدَّثَنِي حَرْمَلَةُ بْنُ يَحْيَى..... عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کا ایمان اللہ اور یوم آخرت پر ہوا اسکو چاہئے کہ بھلی بات کہے، یا خاموش رہے، اور جس کا ایمان اللہ اور یوم آخرت پر ہے اسکو اپنے پڑوسی کا اکرام کرنا چاہئے اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہئے۔ سوال:- اس باب کا تعلق بھی کمال ایمان سے ہے من کان یؤمن میں ایمان سے ایمان کا مل مراد ہے، اس حدیث میں ایمان کا تعلق دو چیزوں سے کیا گیا ہے، اللہ اور یوم آخرت سے تو کیا صرف انہیں دو چیزوں پر ایمان لانا کافی ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ ان دونوں سے مراد پوری شریعت ہے، البتہ خدا کی ذات مبدأ ہے اس لئے اس کو ذکر کر دیا، اور آخرت سے مراد ہے مبدأ اور معاد کو ماننا جمیع ما جلد بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے کو مستلزم ہے، دوسرا

(۱) حاشیہ بخاری ص ۱۸۹۔ (۲) فضائل اعمال ص ۱۰۳/۲۔ (۳) بخاری ص ۸۸۹/۲۔ (۴) (بخاری، مسلم

ص ۵۰، ابوداؤد ص ۷۰۱۔

جواب یہ ہے کہ مومن بہ میں خدا کے ذکر کے بعد صرف یوم آخرت کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا کہ اچھی یا بری زندگی کا نتیجہ وہیں ظاہر ہوگا، اور سناری کو ششیں وہیں کیلئے ہوتی ہیں، اس لئے اس کو ذکر کیا۔ (۱۵)

### پڑوسی کا اکرام

پڑوسی سے متعلق کچھ باتیں ماقبل کے باب میں گزر چکی ہیں، یہاں پڑوسی کے ساتھ اکرام اور حسن سلوک کی ہدایت ہے شیخ ابن ابوجرہ کے حوالہ سے علامہ عثمانی نے لکھا ہے کہ جب دو پڑوسی کے درمیان دیوار حائل ہوتی ہے جب بھی اکرام کرنے اور حسن سلوک کا حکم ہے، اور تکلیف دہ چیزوں سے گریز کرنے کا حکم ہے تو وہ دو فرشتے جو بغیر کسی فاصلہ کے انسانوں کے ساتھ ہوتے ہیں ان کا اکرام و لحاظ تو بدرجہ کوئی ہونا چاہئے کیونکہ ان کو طاعات سے خوشی اور سینات سے رنج پہنچتا ہے۔ (۱۶)

### کیا مہمان نوازی واجب ہے؟

مہمان نوازی اسلامی آداب میں داخل ہے، انبیاء کی سنت ہے، حضرت لیث ایک رات کی ضیافت کو واجب کہتے ہیں ان کی دلیل لیلة الضیف حق واجب علی کل مسلم وان نزلتم بقوم فامروا لکم بما ینبغی للضيف فاقبلوا وان لم یفعلوا فخذوا منهم حق الضیف الذی ینبغی لہم، جیسی روایات ہیں۔

مگر عام فقہاء کے یہاں اس کا شمار مکارم اخلاق میں ہے ان لوگوں کی دلیل جائزۃ یوم و لیلة، ہے اور جائزہ لغت میں صلہ اور عطیہ کے معنی میں آتا ہے اور یہ مستحب ہونے کی دلیل ہے، فلیکرم ولیحسن کے الفاظ بھی استحباب ہی کا پتہ دیتے ہیں، حضرت لیث کی حدیث کا جمہور یہ جواب دیتے ہیں کہ مذکورہ بالا حدیث ابتداء اسلام کی ہے، شروع میں مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک واجب تھا اسی لئے قربانی کے گوشت کو تین دن سے زیادہ رکھنے کی ممانعت تھی بعد میں منسوخ ہو گیا، حضرت امام شافعی اور محمد بن حکم مہمان نوازی کو شہری اور دیہاتی دونوں کے لئے مستحب مانتے ہیں حضرت امام صاحب کا بھی یہی مسلک ہے، اور امام مالک اور شہخون صرف دیہات کیلئے، وجہ تفریق یہ بتائی جاتی ہے کہ شہر میں کھانے کیلئے ہوٹل وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے، اس لئے مسافر اپنی ضرورت ان مقامات سے پورا کر سکتا ہے، اور دیہات میں یہ مواقع نہیں ہوتے، امام مالک کی دلیل میں یہ حدیث پیش کی جاسکتی ہے الضیافة علی اهل الوبہ ولیس علی اهل المدر، لیکن اس حدیث کے بارے میں امام نووی نے محدثین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ موضوع حدیث ہے۔

قاضی عیاض کی رائے یہ ہے کہ جو مہمان اتنا بھوکا ہے کہ مرجانے کا اندیشہ ہے تو ایسے شخص کی مہمان نوازی واجب ہو جاتی ہے، اسی طرح جس ذمی سے مسلمان حاکم یہ شرط ٹھہرائے کہ مسلمان مسافروں کی ضیافت کرنی ہوگی ایسے ذمیوں پر ضیافت واجب ہوگی۔ (۱۷)

غرض مہمان نوازی کا یہ سارا معاملہ خوشگوار ماحول اور اخلاقی کردار پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اسی سے معلوم ہوا کہ خود مہمان کو بھی اس کا خیال رکھنا چاہئے، کہ وہ میزبان پر بوجھ بن کر نہ رہ جائے، کہ اس سے اس کے اخلاق میں فرق آجائے۔ حدیث کا تیسرا جزء فلیقل خیراً او لیصمت اس کا مقصد یہ ہے کہ کمال ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کے تمام اعضاء سے دوسروں



## رابطہ اور مومن کی دوزمہ داری

پہلے باب میں مخلوق کو فائدہ پہنچانے کا ذکر تھا، وہاں مہمان نوازی اور زبان سے کلمہ خیر کہنے کی ہدایت بطور تمثیل مذکور تھی، اس باب میں زبان سے کلمہ خیر کا طریقہ بتلایا گیا، یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ بری باتوں کو دور کرنے کیلئے کوشاں رہے، طاقت ہو تو ہاتھ سے ورنہ زبان سے، اور آخری درجہ یہ ہے کہ دل تو اس پر ضرور کڑھے، کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تاملون بالمعروف وتنہون عن المنکر وتؤمنون باللہ، اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اس امت کی خیریت کا دار و مدار جن چیزوں پر ہے ان میں سب سے اہم ایمان باللہ ہے اور ایمان باللہ کے لوازمات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر داخل ہے، جس کا ایمان جتنا قوی ہوگا اس کا یہ جذبہ اسی قدر مضبوط ہوگا، اور جس کا ایمان کمزور ہوگا اس کا یہ جذبہ بھی کمزور ہوگا، اس جذبہ کی کمی زیادتی ایمان کی کمی زیادتی کی دلیل ہے۔

کتاب و سنت کا حاصل یہ نکلا کہ مومن کی دوزمہ داری ہے کہ اپنے ایمان کو کامل بنانا، یعنی اپنے نفس کی تکمیل، اور دوسری ذمہ داری یہ کہ دوسرے لوگوں کے نفس کی تکمیل جس طرح منکرات کو ترک کر کے اپنے اندر کمال پیدا کیا ہے اسی طرح دوسروں کو منکرات سے روکنے کے لئے کوشاں رہنا یہی کام انبیاء علیہم السلام کا تھا، اب یہ کام امت محمدیہ کے سپرد کیا گیا۔

## نہی عن المنکر کے درجات

نہی عن المنکر کے تین درجات کو امت کے تین طبقوں پر تقسیم کر سکتے ہیں، تغیر بالید، یہ ذمہ داری حکام، سلاطین پر ڈال دی گئی، ان کے ہاتھ میں اقتدار ہے، اس لئے وہ اپنے منکرات کو اپنے بازو کی طاقت سے مٹا لیں، اور فیلسانہ یہ ذمہ داری علماء امت پر ڈالی گئی کہ ان کے ہاتھوں اقتدار نہیں اس لئے منکرات کی قباحت کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کریں، اور فیقلبہ کی ذمہ داری عوام پر ڈالی گئی، کہ اقتدار اور علم سے محروم ہیں، تو کم از کم دل سے برائیاں، اور دل میں یہ جذبہ رکھیں کہ اگر قوت میرے ہاتھ آجائے تو ہاتھ سے مٹا دوں گا، علم کی دولت ہاتھ آجائے تو زبان سے خدمت کروں گا، مٹیوں طبقے اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس کر لیں تو پھر ماحول خوشگوار ہو جائے گا، اس جذبہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں مٹانے کی طاقت ہوگی، وہاں اس طاقت کو استعمال کیا جائے گا، مثلاً ہر شخص اپنے گھر کا ذمہ دار ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ، کا یہی مصداق ہے، اگر بیوی، بچے، میں کوئی چیز منکر نظر آئے تو یہاں ہر شخص کو اتنی طاقت ہے کہ اپنی طاقت کے زور سے مٹا ڈالے، صرف زبان سے خدمت کر دینا کافی نہ ہوگا، اور جہاں زبان سے خدمت کرنے کی طاقت ہو وہاں صرف دل سے برائیاں کاٹنی نہ ہوگا، کیونکہ حدیث میں نیچے والا درجہ اوپر والے کی قدرت نہ رکھنے پر مشروط ہے۔

وذلك اضعف الایمان: مطلب یہ ہے کہ جب قلب اس قدر بے حس ہو چکا کہ برائی کو دیکھ کر ناگواری کا احساس بھی نہ رہا تو اب رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی جزاء ایمان باقی نہ رہا، کہ اس پر ثواب ملے، یہ مراد نہیں کہ وہ مومن نہیں رہا۔

## کس قسم کے منکرات کا ازالہ واجب ہے؟

یہاں منکر سے مراد یہ ہے کہ اس کی قباحت پر ائمہ کا اتفاق ہو مگر کوئی چیز مختلف فیہ ہو تو وہ منکر نہیں کہلائے گا جیسے قرأت خلف الامام کہ شوافع احناف، اور احناف شوافع پر انکار نہیں کر سکتے اور اس میں کوئی گروہ بھی مخالف کے فعل کو منکر

نہیں کہہ سکتا، کیونکہ دلائل دونوں کے پاس ہیں، البتہ اگر کسی گروہ کے پاس کوئی معقول دلیل نہ ہو تو اس کو دوسرا گروہ منکر کہہ سکتا ہے، جیسے عند الذبح تسمیہ کو عمدہ ترک کر دینا اگرچہ شوافع ایسے ذبیحہ کو حلال سمجھتے ہیں مگر یہ ولا تأکلوا مما لم یُنکَر اسم اللہ علیہ کے خلاف ہے، اور اسکے مقابلے میں دلیل بالکل کمزور ہے، اسی طرح جواز تہ کے اگرچہ شیعہ قائل ہیں مگر اس کی حلت پر کوئی معقول دلیل نہیں، یہ اختلاف نہیں بلکہ اس کو خلاف کہا جائے گا اسی طرح غیر مقلدین کا مسلک کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی پڑتی ہے، یہ بالکل کمزور دلیل پر مبنی ہے، غرض اس طرح کے مسائل میں دوسرے گروہ کے فعل و عمل کو منکر کہا جائے گا۔ (لع)

### نہی عن المنکر کی شرعی حیثیت اور ترک پر وعید

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے، بعض افراد انجام دیدیں گے تو باقی لوگ بری الذمہ ہوں گے اگر تمام لوگ چھوڑ دیں تو جن لوگوں میں نہی عن المنکر کرنے کی طاقت تھی وہ تمام لوگ گنہگار ہوں گے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے، کہ اگر کسی جماعت اور قوم میں کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور وہ جماعت اور قوم باوجود قدرت کے اس شخص کو اس گناہ سے نہیں روکتی تو ان پر مرنے سے پہلے دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ دولت کدہ پر تشریف لائے تو میں نے چہرہ کا نور پر ایک خاص اثر دیکھ کر محسوس کیا کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے، آپ نے کسی سے کوئی گفتگو نہیں فرمائی، اور وہ حضور فرما کر مسجد تشریف لے گئے، میں حجرہ کی دیوار سے ٹیک لگا کر سننے کھڑی ہو گئی کہ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا، لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، مبارک وقت آجائے کہ تم دعا مانگو اور قبول نہ ہو تم سوال کرو اور سوال پورا نہ کیا جائے، تم دشمنوں کے خلاف مجھ سے مدد طلب کرو اور میں تمہاری مدد نہ کروں۔ (ابن ماجہ ص ۲۸۹)

### ایک اشکال

یا ایہا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم الخ: ”اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کر لینا کافی ہے، دوسروں کی گمراہی مضر نہیں، لہذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں، جبکہ دوسری آیت وانقوا فتنۃ لا تصیب الذین ظلموا منکم خاصۃ سے معلوم ہوا کہ گنہگاروں کو عذاب نہیں آئے گا، بلکہ وہ نیک لوگ جو عذاب سے نہیں ڈراتے وہ بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے، اس طرح بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

مفسرین نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں، پہلی آیت اذا اھتدیتم میں اجتہاد سے مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، یعنی اجتہاد کی تکمیل اسی وقت ہوگی جبکہ انسان اس فریضہ پر عمل کرے، تو اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تم اپنی اصلاح کر لو، اور دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو تو کسی کی گمراہی سے تم کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔

(۲) پہلی آیت میں اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی رخصت و اجازت مان لی جائے کہ ضروری نہیں، تو قرآن

(۱) ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی پڑتی ہے اس سلسلہ میں ملائے عرب کا متفقہ فیصلہ کے لئے ملاحظہ ہوا حسن الفتاویٰ جلد ہجتم۔

کی دوسری مذکورہ آیت اور احادیث کی روشنی میں اس کا محمل یہ ہے کہ اس آیت کا صدق اس زمانہ سے ہے جبکہ فسق و فجور کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ کوئی شخص وعظ و نصیحت قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہو، اور کسی پر اثر نہ ہوتا ہو تو اس وقت ایسی اصلاح کافی ہے۔ (۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ترک کی اجازت اس وقت ہے کہ یہ کرنے سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو ایسی حالت میں آدمی خود عمل کرتا رہے تو یہ فتنہ میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے۔ "م (۴)

### نہی عن المنکر اور موقعہ کی نزاکت

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جتنی اہمیت ہے، اس سے زیادہ اہمیت انکار کے موقعہ کی نزاکت کا جانتا ہے، بسا اوقات بے محل انکار خود ایک منکر کی صورت بن جاتا ہے، بلکہ فتنہ کو جنم لینے کا موقعہ مل جاتا ہے، یا پھر وہ دعوت و تبلیغ کے لئے رکاوٹ کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لئے موقعہ کی نزاکت منکر کے درجہ کا جانتا ضروری ہے، حافظ ابن قیم نے اس کی چار صورتیں لکھی ہیں:

(۱) منکر اور برائی کو روکنے سے اصلاح کی توقع ہو، اور اس کے بجائے نیکی پیدا ہونے کی امید ہو۔

(۲) اگر اس کے ازالہ کی توقع نہ ہو تو کم از کم اس میں کمی کی توقع ہو

(۳) یا اسی کے برابر دوسری برائی پیدا ہونے کا خطرہ ہو

(۴) یا اس سے زیادہ خطرناک برائی کا خطرہ ہو

ان سب میں پہلی دو صورتوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے، تیسری صورت خود انسان کے احساس و تمیز پر موقوف ہے، اور چوتھی صورت حرام ہے، اس تفصیل کی روشنی میں اگر ایک جماعت فطرتاً کھیل رہی ہے اور امید ہے کہ اس کو اس فعل سے روکا گیا تو وہ اس سے بہتر مشغلہ میں لگ جائے گی، تو اس کو منع کرنا ضروری ہو گا، ورنہ نہیں، اسی طرح اگر ایک شخص نادل دیکھتا ہے اور خطرہ یہ ہے کہ اگر اس کو روکا گیا تو اور بددین اور فاسد اعتقاد مصنفین کی کتابوں کو دیکھنے میں مشغول ہو جائے گا، تو اس کو نادل دیکھنے سے منع نہ کرنا ضروری ہو گا، حتیٰ کہ اگر ایک شخص شراب نوشی، اور جوا میں مشغول ہے اور اس کی فاسد فطرت سے یہ اندیشہ ہے کہ اس کو روکا گیا تو وہ قتل و غارت میں مشغول ہو جائے گا، تو ایسے شخص کو ان مشاغل میں رہنے دینا مناسب ہو گا۔ (۵)

من رای منکراً: اس میں رویت سے اور برائی کا ثبوت اور یقین ہے اسکا آنکھوں سے دیکھنا مراد نہیں، صاحب بحر الرائق نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی شخص کو کسی برائی میں مبتلا دیکھا تو اسکو اپنے ہاتھ سے روکے اور اگر وہ معصیت سے فارغ ہو چکا ہے تو اب اسکو صرف اتنا حق ہو گا کہ اس معاملہ کو قاضی کی عدالت میں پہنچا دے سزا دینا قاضی کا حق ہے، عوام کا حق نہیں۔

علامہ شافعیؒ نے وضاحت فرمائی ہے کہ کسی کو کسی برائی میں مشغول پائے تو دیکھنے والا اس کی تعزیر اپنائی کر سکتا ہے اس طور پر کہ ہڈی نہ ٹوٹنے پائے، ہاں اگر وہ معصیت کر چکا تو اب عوام الناس کو اس کی اجازت نہیں البتہ وہ شخص جس کو اختیار ہو مثلاً شہر کو بیوی پر، والد کو لولا پر، استاد کو شاگرد پر تو معصیت کے بعد بھی تعزیر اپنائی کر سکتا ہے۔

قوله اول من بدأ بالخطبة يوم العيد قبل الصلوة مروان الخ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عید میں سب سے پہلے خطبہ کو مقدم کرنے والا مروان ہے جبکہ بعض حضرات نے مقدم کرنے کی نسبت حضرت عثمان کی طرف، بعض نے حضرت عمرؓ، بعض نے امیر معاویہ اور بعض نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی طرف کی ہے، جبکہ بظاہر اس میں تعارض معلوم ہوتا ہے، اسکا جواب یہ ہے کہ ان اکابر صحابہ نے اگر نماز اور خطبہ کی ترتیب کو بدلا تھا تو کسی صحیح غرض سے اور مروان نے غرض فاسد سے توفہ و نیت کی بناء پر اس کی طرف نسبت کی گئی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں اسلامی دائرہ بہت وسیع ہو گیا، مسلمانوں کی آبادی بہت دور دور تک پھیل گئی، نماز عید پہلے پڑھنے کی بنا پر دور سے آنے والوں کی بعض مرتبہ نماز چھوٹ جاتی تھی اس لئے خطبہ کو مقدم کر دیا، تاکہ ہر ایک کو نماز مل جائے خطبہ کی اہمیت کو سمجھے، نیز بہت سے لوگ خطبہ سننے بغیر جانے لگے تو خطبہ مقدم کر دیا، تاکہ ہر ایک کو خطبہ سنا سکے، اس کے برخلاف مروان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ دور ان خطبہ اہل بیت کو برا بھلا کہتا تھا اس کی اس ناشائستہ حرکت کو دیکھ کر بہت سے لوگ نماز پڑھ کر چلے جاتے، تو مروان نے خطبہ مقدم کر دیا، تاکہ تمام لوگ نماز کے انتظار میں میرا خطبہ سنیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اکابر صحابہ نے کسی مصلحت کے پیش نظر خطبہ کو مقدم کر دیا تھا مگر ان کو اس پر اصرار نہ تھا اور مروان کو خطبہ کی تقدیم پر اصرار تھا، اس لئے مروان کی طرف ان جہتوں سے اولیت کا انتساب کیا گیا، اس کے اصرار کی تصریح خود روایت میں ہے کہ ایک شخص نے مروان کو اس پر ٹوکا تو یہ کہہ کر خاموش کرنا چاہا کہ عہد رسالت کا طریقہ متروک ہو چکا ہے، گویا اس نے اپنے اس طریقہ کو صحیح سمجھا جبکہ حضرت عثمانؓ نے تقدیم خطبہ کو واجب اور ضروری نہیں سمجھا تھا، تاہم جن روایتوں سے حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا تذکرہ ہے، ان کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی روایت رائج ہے، اس بناء پر اولیت کی نسبت حضرت عثمانؓ ہی کو حاصل ہوگی، نیز یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان حضرات نے بطور یاد رکھا ہوگا۔

فقام الیہ رجل: اس پر اشکال یہ ہے کہ مروان کے غلط طریقہ پر، حضرت ابوسعید خدریؓ نے انکار میں سبقت کیوں نہیں کی؟ پہلے ہی مروان کو ٹوکتے، اس کے کئی ایک جواب دیئے گئے ہیں :

(۱) شروع میں حضرت ابوسعیدؓ موجود نہ تھے، دونوں میں بات ہو رہی تھی کہ تشریف لائے، اور انہوں نے مروان کے ٹوکنے والے کی تصدیق و تائید کی، (۲) حضرت ابوسعیدؓ نے ٹوکنے کا ارادہ کیا تھا، اتنے میں اس شخص نے پہل کر دی، اور حضرت ابوسعیدؓ کو اولیت کا درجہ مل سکا، (۳) نبی عن المنکر اسی جگہ ضروری ہے جہاں اس کی وجہ سے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، یہ ایسا موقع تھا کہ حضرت ابوسعیدؓ ٹوکنے میں فتنہ کا اندیشہ محسوس کر رہے تھے، تاہم جس نے ٹوکنے میں پیش قدمی کی، ممکن ہے مروان کا کوئی قریبی رشتہ دار ہو یا اس کے حامی لوگ اس مجلس میں موجود ہوں اس امید پر ان کو ٹوکنے کی ہمت ہوئی، کہ مروان نے کوئی نازیبا حرکت کی تو اس سے نمٹا جاسکتا ہے، جب انہوں نے ٹوکا تو حضرت ابوسعید خدریؓ کو بھی ہمت ہوئی اور انہوں نے متنبہ کرنے والوں کی تائید میں حدیث پڑھ کر سنائی، متنبہ کرنے والے شخص ابوسعید انصاریؓ تھے، چونکہ مروان کے مقابلے میں طاقت کو استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے زبانی خدمت پر ہی اکتفا کیا گیا۔

لیکن اشکال مذکورہ اس وقت کمزور ہو جاتا ہے جبکہ ہمیں بخاری شریف کی روایت ملتی ہے کہ حضرت ابوسعیدؓ مروان

کیا تھا آئے، پور جب اس نے خطبہ دینا چاہا تو انہوں نے ہاتھ پکڑ لیا تو اس نے وہی جواب دیا جو اس شخص مذکور کو دیا تھا، گویا پہلی روایت اور اس میں ایک گونہ تضاد معلوم ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری کی اس روایت میں حضرت ابو سعید انصاریؓ مراد ہیں کہ یہ بھی حضرت ابو سعید کے ساتھ آئے تھے، اس سے بہتر جواب یہ ہے کہ نبی عن المنکر کے اس واقعہ کو تعدد پر محمول کر لیا جائے، یعنی دو دفعہ یہ واقعہ پیش آیا دوسری دفعہ میں خود حضرت ابو سعیدؓ ہی نے نوک دیا، تفصیل کیلئے فتح الملہم دیکھئے۔

﴿ حدیث ﴾ حدثنی عمرو الناقد ..... عن ابی رافع عن عبد اللہ بن مسعود ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما من نبی بعثہ اللہ تعالیٰ فی امتہ قبلی الا کان لہ من امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتلون بامرہ ثم انہا تخلت من بعدہم خلوف یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون الخ، (مسلم ص ۱۵۲، مستند امام احمد ۱/۴۵۸)

ترجمہ :- حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ مجھ سے پہلے کسی امت میں اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہیں بھیجا، مگر ان کی امت میں ایسے لوگ ضرور ہوئے جو اس کے معین و مددگار اسکے طریق کار کے قبیح و حیر و کار، اور اس کے ہر حکم کے پابند اور فرمانبردار ہوا کرتے۔ پھر ان کے بعد ان کے جانشین کچھ ایسے بد اطوار لوگ ہوئے، (جسکے قول و عمل میں بڑا فرق تھا) وہ جو بات اپنی زبان سے کہتے اس پر عمل نہ کرتے، اور وہ ایسی حرکتیں کرتے جن کا ان کو حکم نہیں دیا گیا، جو شخص بھی ایسے لوگوں کا اپنے ہاتھ سے مقابلہ کرے وہ مومن ہے اور جو زبان سے ان کی تردید کرے وہ مومن، اور جو صرف قلبی ناگواری پر اکتفا کرے وہ بھی ایک درجے کا مومن ہے، اسکے بعد ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان کا کوئی جزء نہیں، حضرت ابو رافعؓ کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث عبد اللہ بن عمرؓ سے بیان کی، تو انہوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا، اتفاق سے میرے پاس عبد اللہ بن مسعودؓ آئے، پور ”قناة“ مدینہ کی ولوی میں سے ایک ولوی میں اترے تو عبد اللہ بن عمرؓ مجھے اپنے ساتھ لے گئے، ان کی عیادت کیلئے، میں ان کے ساتھ گیا جب ہم بیٹھے تو میں نے عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اسی طرح بیان کیا، جیسے میں نے ابن عمرؓ سے بیان کیا تھا، صالح بن کیسان کہتے ہیں کہ یہ حدیث ابو رافعؓ سے اسی طرح بیان کی گئی ہے۔

حواریون: حواری کی مختلف تفسیر کی گئی ہے، (۱) کپڑے دھونے والے، چونکہ کپڑا دھو کر صاف شفاف کر دیا جاتا ہے، اس لئے وہ لوگ جن کے قلوب گناہوں کی آلودگی سے صاف ستھرے ہوں ان کو بھی حواری کہا جانے لگا۔ (۲) دوسرا معنی رازدار کے ہیں، تیسرا معنی معاون و مددگار، بہر حال عرف و اصطلاح میں ان لوگوں کیلئے خاص ہو گیا جو اپنے نبی کے معاون و مددگار بنیں، اور ان کی سنت و ہدایت پر چلتے رہیں۔

خلوف: یہ خلف کی جمع ہے، اسکے معنی ناخلف اور ناجہار کے ہیں یعنی برے پیر و کار، لیکن یہی لفظ فتح اسلام خلف استعمال ہو تو اسکے معنی بالکل برعکس سچے جانشین کے ہوتے ہیں، تو اس کی جمع اخلاف آئے گی جیسے سلف کی جمع اسلاف، برے پیر و کار کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جن کاموں کا حکم دیا گیا ان کو کرتے نہیں، اور اگلے بیان کرتے ہیں کہ میں نے کیا ہے، گویا نہ کرنے کے باوجود تعریف کے خواہاں ہوتے ہیں، قرآن نے بھی ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے، لَمْ تَقُولُوا مَالَا تَفْعَلُونَ،



ومن جاهدہم بقلبہ: ہمارے ذہنوں نے جو جہاد کا مفہوم سمجھ رکھا ہے اس سے اس کی حقیقت سٹ کر رہ گئی ہے، دراصل جہاد صرف جہاد بالسیف کا نام نہیں، بلکہ دین کی نصرت کیلئے زبان و قلم کی حرکت بھی اس میں داخل ہے، بلکہ مذکورہ جملہ میں تو جہاد بالقلب کی رہنمائی ہے کہ برے اور منکر اور شریعت کے خلاف کام کو دیکھ کر کم از کم دل سے غم نہ ہوتا اور جہاد میں داخل ہے، اور یہ پختہ ارادہ ہو کہ اگر قدرت ہوئی تو ہاتھ یا زبان سے روک ٹوک کرونگا۔

ولیس وراء ذلك: ایمانی تقاضے کا کوئی درجہ یہ ہے کہ کسی منکر کو دیکھ کر قلب سے برا جانے، اور استحسان کی نظر سے نہ دیکھے، لیکن اگر منکر کو دیکھ کر ذرہ برابر قلب میں اس کی قباحت و رو نما نہیں ہوئی تو یہ گویا استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے، اور جس کی یہ کیفیت ہو کہ معاصی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، تو گویا وہ دائرہ ایمان سے نکل گیا، اور ان لوگوں میں شامل ہو گیا، جو محرمات کو حلال سمجھتے ہیں۔

## باب تفاضل اهل الايمان فيه ورجحان اهل اليمن فيه

ایمان داروں کا ایک دوسرے سے کم زیادہ ہونا، اور یمن کے لوگوں کے ایمان کا زیادہ ہونا

❦ حدیث ❦ حدثنا ابو بکر بن ابی شیبۃ ..... قال سمعت قيساً يروى عن ابن مسعود

قال اشار النبي صلى الله عليه وسلم بيده نحو اليمن فقال ان الايمان ههنا وان القسوة وغلظ القلوب في الغزادين عند اصول اذنا بل حيث يطلع قرنا الشيطان في ربيعة ومضر.

ترجمہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے یمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بات کو خوب اچھی طرح یاد رکھو کہ ایمان وہاں ہے، اور دلوں کی سختی ان کسانوں میں ہے جو زیادہ تر اونٹ کی ذم کے پاس رہا کرتے ہیں یعنی رہجہ اور مسقر کے قبیلے، جہاں سے شیطان کے معین و مددگار رونما ہوں گے۔

رہب:۔ باب ربت میں ایمانی امور میں بعض کو بعض پر فوقیت دی گئی تھی، اس باب میں بعض مومن کو بعض پر فوقیت دینا مقصود ہے، مومن کی یہ برتری اور فوقیت ایمانی امور کی وجہ سے آئی ہے، کسی اور چیز کی وجہ سے نہیں، امام مسلمؒ ہر پہلو سے ان دونوں کو واضح کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کا کوئی بھی گوشہ نشہ نہ رہ جائے۔

### صحبت کا اثر ایمان پر

باب کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کامل پیدا کرنے کیلئے پاکیزہ اور خوشگوار ماحول رکھا ضروری ہے، اسی لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ترغیب دلائی گئی ہے، کہ اس سے ماحول میں پاکیزگی اور اسکے اچھے اثرات سے ایمان میں تازگی آتی ہے، ورنہ تو دل کے تاثر کا یہ حال ہے کہ زیادہ تر جانور کے ساتھ رہنے سے اس جانور کے مزاج کا اثر لے لیتا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے جن کا سابقہ جس قسم کے جانوروں سے ہوتا ہے ان کا ویسا ہی مزاج بن جاتا ہے، چنانچہ بکریوں میں رہ کر نرم مزاجی، اونٹوں میں رہ کر سنگدلی اور سخت مزاجی آ جاتی ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صالحین کے صحبت سے قلوب پر کیا خوشگوار اثر پڑے گا، اور بروں کی صحبت سے کیا برا اثر پڑ سکتا ہے، اسی لئے نماز کی ادائیگی کیلئے مسجد کا انتخاب کیا گیا کہ وہ پاکیزہ جگہ ہوتی ہے، اور کعبہ

کے گرد طواف کرنے کا حکم کہ اس کا اثر جمیل قلب و ایمان پر پڑتا ہے۔

**ان القسوة وغلظ القلوب:** یہ دونوں مترادف لفظ ہیں، جس طرح انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ میں اس سے دینی امور میں غفلت کی طرف اشارہ مقصود ہے، جس کا نتیجہ سنگدلی اور سخت مزاجی ہے۔

**فدادین:** جمع ہے فداد بالمشدید کی، تیل یا وہ جانور جس کے ذریعہ زمین جوتی جائے، اس صورت میں مضاف اصحاب محذوف ہے، یعنی اہل جوتے والے۔ مطلب یہ ہو گا کہ اکثرین، اور سنگدلی اہل جوتے والوں میں آ جاتی ہے، ایک خیال یہ بھی ہے کہ فدیہ زور سے آواز نکالنے والے جھڑکنے والے کو کہتے ہیں۔

پہلے معنی کے لحاظ سے اس موقع پر شبہ ہو سکتا ہے، کہ کاشکاری عرب میں رائج نہ تھی، بلکہ رومیوں میں تھی اور روم وفات نبوی کے بعد فتح ہوا، اس لئے اس کا اور ترجمہ ہونا چاہئے، جو اصل عرب پر بھی صادق آسکے، یعنی سرمایہ دہر، عرب میں سب سے عمدہ مال اونٹ سمجھا جاتا تھا، اس لئے فداد سے مراد وہ شخص ہو جس کے پاس بکثرت اونٹ ہو یا جہاں جس مال کا بکثرت رواج ہو، بہر حال مقصود کلام یہ ہے کہ جن کا وقت جانوروں میں زیادہ تر گذرتا ہے، وہ اہل خیر کی صحبت اور علم کی مجلس سے عموماً محروم رہتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ جو دنیوی کاموں کیلئے بکثرت پیچھے چلا تے رہتے ہیں ہمہ وقت شور کی جگہ مثلاً بازار میں رہتے ہیں، انکے قلوب بھی سخت ہو جاتے ہیں۔

**حيث يطلع قرونا الشيطان:** مراد اس سے اہل فارس ہیں، یہ مدینہ منورہ سے جانب شرق میں واقع ہے وہاں پہلے بت پرستی کا رواج تھا، اور بت پرستی شیطان کے اثر سے آتی ہے، اسی لئے شیطان تسلط کو قرنا شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے، خاص طور پر قبیلہ ربیعہ اور مضر کا تذکرہ اسی جملہ پر مذکور ہے، کہ وہ بھی مشرق کی جانب آباد تھے، اور بکثرت اونٹ کے مالک تھے جس کا اثر ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ غرور گھمنڈ اور قسوت قلبی میں مبتلا ہو گئے۔

اسی سے سوچنا چاہئے کہ شریر جانوروں کے پاس رہنے سے جب دل متاثر ہوتا ہے، تو طبیعت جانوروں کے کھانے سے دل پر کیا کچھ اثر پڑ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خنزیر کھانے والوں میں بے حیائی، اور فحش کاری زیادہ پائی جاتی ہے، اسلئے ایمان سے وہ لوگ محروم رہے، اور اہل یمن کا تعلق جانوروں سے کم تھا قلوب میں نرمی تھی اس لئے ان کے دلوں میں فقر و حکمت کی باتیں قبول کرنے کا زیادہ مادہ تھا۔

### حدیث کا شان و رورود

صحیح بخاری شریف میں اس حدیث کو زیادہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ قبیلہ بنو حنیم کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: بنو حنیم! تم کو بشارت ہو ان بد قسمتوں نے اس کو مال کی بشارت سمجھا اور کہا اچھا لو ایسے، کیا دلوں تے ہیں؟ آپ کو ان کی یہ پست ہمتی پسند نہ آئی اتنی دیر میں یمن کی ایک جماعت آپہنچی آپ نے ان سے فرمایا کہ بنو حنیم نے بشارت قبول نہ کی تم اسے قبول کر لو، انہوں نے کہا یا رسول اللہ ہم نے بسر و چشم قبول کیا، اس کے بعد کہا جتنا لنفقه فی الدین، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انداز گفتگو کو پسند فرمایا اور ان لوگوں کی وسعت ظرفی کو دیکھ کر فرمایا کہ ایمان اور فقر و حکمت تو درحقیقت انہیں لوگوں کا حصہ ہے، اسی کو آپ نے رقت قلب سے تعبیر فرمایا۔

## شیطان کے دو سینک

شیطان کے دو سینک جہاں طلوع ہوتے ہیں بعض حضرات نے اس کو حقیقت پر محمول کیا ہے، کیونکہ روایت سے یہ ثابت ہے کہ طلوع و غروب کے وقت سینک کو سورج کے کنارے پر لگا دیتا ہے، تاکہ اس وقت سورج پرستوں کی عبادت دیکھ کر خوش ہو، بعض نے مجاز پر محمول کیا ہے، کہ اس سے کفار کی رو بروی جماعت مراد ہے، علامہ نووی کہتے ہیں کہ خاص طور پر مشرق مراد ہے کہ وہاں شیطانی تسلط زیادہ رہے گا۔

## ایمان کو یمنی کہنے کی وجہ

ایمان کا مرکز تو مدینہ منورہ تھا نہ کہ یمن، تو پھر ایمان کو یمنی کیونکر کہا گیا؟ اس کے چند جوابات دیئے گئے ہیں (۱) الایمان ایمان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ایمان کا مبداء اور اول سرچشمہ مکہ ہے، وہ اس طرح کہ ایمان کے معنی نشی اور پست زمین کے ہیں، اور پست زمین کو تہامہ بھی کہتے ہیں اور علاقہ تہامہ میں مکہ بھی شامل ہے، تو یمنی اس طرح ایمان بول کر مکہ مراد لیا گیا، (۲) اس حدیث میں مکہ اور مدینہ دونوں شامل ہیں، کیونکہ یہ بات آپ نے تبوک میں ارشاد فرمائی جبکہ وہاں سے مکہ اور مدینہ دونوں یمن اور تبوک کے درمیان واقع ہے، تو آپ نے یمن کی جانب اشارہ فرما کر مکہ، مدینہ مراد لیا، اور فرمایا ”الایمان ایمان“ غرض یہاں یمن سے عمومی مراد جہت یمن ہے جیسا کہ رکن یمنی، کعبہ کے ساتھ مکہ میں ہے اسکے باوجود یمنی کہنا محض اس لئے ہے کہ وہ یمن کی جانب میں واقع ہے۔

(۳) ایمان سے مراد انصار مدینہ ہیں کیونکہ انصار اصل میں یمنی تھے، امام نوویؒ نے اس کو ابو عبیدہ کا پسندیدہ قول قرار دیا ہے (۴) ان تمام توجیہات کے علاوہ سب سے عمدہ توجیہ وہ ہے جس کو شیخ ابو عمرو بن صلاح نے ذکر کیا ہے، کہ الفاظ حدیث کا ظاہری معنی اور مسموم ہی مراد ہے، کوئی تاویل کی ضرورت نہیں یعنی اس سے اہل یمن کے کمال ایمان کو بیان کرنا مقصود ہے اور اس ظاہری معنی مراد لینے میں کوئی استحالہ نہیں، کیونکہ جو شخص کسی صفت کے ساتھ متصف ہو اور وہ صفت بدرجہ اتم اس میں پائی جاتی ہے تو اس صفت کو موصوف کی طرف منسوب کر دینا تاکہ دوسرے سے ممتاز ہو جائے اور ان کے خصوصی حالات کا اندازہ ہو جائے اور غیروں سے اس صفت کی نفی مقصود نہ ہو، تو ایسے موقعہ پر اس شیء کی نسبت اسکی طرف کر دی جاتی ہے۔

شیخ ابو عمرو بن صلاح فرماتے ہیں کہ حدیث کا سیاق و سباق بھی اسی ظاہری معنی کی تائید کرتا ہے، کہ خاص اہل یمن کی خصوصی صفت کے لحاظ سے مدح کرنا مقصود ہے، اور مذکورہ بالا توجیہات سر اسر خلاف قیاس ہیں، کیونکہ بعض روایت میں جاء اهل اليمن، ہے یعنی جس وقت اہل یمن آئے اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا اسی کو حضرت علامہ عثمانی نے مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا کہ ایمان کے مختلف رنگ ہیں اور وہ سبھی رنگ محمود و مطلوب ہیں تو جب کسی میں کوئی ایک رنگ بہت نمایاں اور حد درجہ غالب ہو تو اسکی تعریف اسی کے ساتھ کی جاتی ہے، لیکن دوسرے کی نفی بھی مقصود نہیں ہوتی، مثلاً امت کے ساتھ حد درجہ شفقت حضرت ابو بکر کو تھی اور عمرؓ کی معاملہ میں حد درجہ شدت حضرت عمرؓ تھی اور بے انتہا حیا حضرت عثمانؓ میں، اور مشکلات کا حد درجہ حل حضرت علیؓ کے پاس تھا، تو ان چیزوں کی نسبت ان حضرات کی طرف کر دی گئی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے میں نہیں اسی طرح مجموعی اعتبار سے اہل یمن میں لین القلب و رقت القلب اور

سرعت قبول کی صفت ہے انتہا نمایاں تھی، اس بناء پر آپ نے ایمان کے ان صفات پر تعریف فرمائی تھی اور ان صفات کے بجائے مطلقۃ ایمان کی نسبت یمن کی طرف فرمائی، نیز جب اعمال کفر پوری شدت کے ساتھ مشرق میں بکثرت رونما ہوئے اور ہوں گے تو کفر کی نسبت مشرق کی طرف فرمائی۔

تحقیق فقہ و حکمت — فقہ سے مراد یہاں دین کی سمجھ ہے، فقہ کا اصطلاحی معنی مراد نہیں، یہ معنی بعد کے فقہاء نے ایجاد کئے ہیں اور حکمت کے صاف اور واضح معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت پر مشتمل احکام کا علم جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، نفس مہذب بن جائے حق واضح ہو جائے، اور اس پر عمل کی توفیق ہو جائے خواہشات نفسانی اور باطل کی پیروی سے پرہیز کیا جائے ان خوبیوں سے آراستہ شخص حکیم کہلاتا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس بات سے انسان کو نصیحت حاصل ہو، شرافت و کرامت کی طرف دعوت دے، یا منہیات اور قباہت سے روک دے وہ حکمت ہے، ان من الشعر لحکمة میں حکمت سے یہی مراد ہے۔

قوله ارق افئدة: مشہور یہ ہے کہ فواد اور قلب دونوں ایک ہی چیز ہیں، بعض کا خیال ہے کہ فواد قلب کے اندرونی حصہ کو کہتے ہیں اور بعض نے قلب کی جملی کو فواد سے تعبیر کیا ہے۔  
فائدہ:۔ اس فضیلت میں ہر وہ افراد شامل ہوں گے جو یمن سے تعلق رکھتے ہوں اور یہ مشاہدہ بھی ہے کہ ہر دور میں اس علاقہ کے لوگ نرم دل نرم خو ہوئے ہیں۔

نام بخاری نے اس طرح کی حدیث کو اشعرین کے فضائل میں شمار کیا ہے تفصیل کیلئے فتح المسلم ملاحظہ کریں،

## باب بیان انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون وان محبة المؤمنین من الایمان وان افساء السلام سبب لحصولها

جنت میں ممکن ہی جائیں گے، اور مومنوں سے محبت رکھنا ایمان میں داخل ہے، سلام کو رواج دینا محبت کا ذریعہ ہے

حدیث ﴿ حَدَّثَنَا ابُو بَكْرٍ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ ..... عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قُلْتُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا أَوْ لَا أَذْلكُمْ عَلَى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ أَفْشَوْا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ، وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرَى، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا،

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بغیر ایمان جنت میں نہیں جاسکتے ہو اور بغیر اہمی محبت کے ایمان نہیں آسکتا، کیا میں تم کو ایسی چیز پر رہنمائی نہ کر دوں جس سے باہم انس و محبت پیدا ہو (اور وہ ہے) سلام کو آپس میں خوب عام کرو۔

مقصد:۔ اس باب کا مقصد بھی کمال ایمان کے اسباب و ذرائع کو بڑھانا ہے اور وہ ہے مسلمانوں سے محبت کرنا، جب

مسلمانوں سے محبت کا اثر ایمان پر پڑ سکتا ہے تو اندازہ کیا جائے کہ اللہ و رسول کی محبت کا ایمان پر کتنا اثر پڑے گا۔

### محبت بڑھانے کا طریقہ

محبت بڑھانے کا طریقہ سلام ہے، جب زبان سے سلام کیا جائے گا تو دل میں سلامتی کا جذبہ پیدا ہو گا اور اس کے نتیجے میں ایمان میں کمال آئے گا اور کمال ایمان اولیٰ و بلند میں دخولِ جنت کا مستحق بنادے گا، گویا سلام سے محبت پیدا ہوئی اور محبت سے ایمان میں کمال آیا، اور کمال ایمان دخولِ اولیٰ کا ذریعہ بنا، سلام میں الفت و محبت کی کشش ہے اور اس سے تواضع و انکساری پیدا ہوتی ہے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے یہ مقولہ نقل کیا ہے ثلاث من جمعہن فقد جمع الايمان الانصاف من نفسك، وبذل السلام للعالم، والانفاق من الاقتار، یعنی تین باتوں سے ایمان میں کمال پیدا ہوتا ہے، (۱) انصاف طبیعت بن جائے، یا اپنی ذات پر بھی انصاف نافذ کرنے لگے، (۲) شناسا اور نا آشنا سبھوں سے سلام کرے (۳) ضرورت مند ہوتے ہوئے دوسروں پر خرچ کرے، امام بخاریؒ کے علاوہ دوسرے حضرات نے اس مقولہ کو حدیث مرفوع بتایا ہے۔ (بخاری ص ۹)

### اسلام کا امتیازی تحفہ سلام

”اسلام کی ہر ادا میں اپنی ایک امتیازی شان ہے اور اس کے آداب میں جو جامعیت ہے وہ دوسرے میں نہیں،“ السلام علیکم ”میں جو جامعیت ہے وہ لفظِ مستے، گد مورنگ، گد نائٹ، صبح بخیر، شب بخیر میں ہر گز نہیں، اس کا سلسلہ جنت سے شروع ہوا، اور جنت تک پہنچے گا، فرشتے سلام کریں گے سلام علیکم فادخلوها خالدین۔

تسلیم کا اسم مصدر ہے، اس کا معنی کہ تو مجھ سے سلامتی میں ہے اور تو بھی مجھ کو سلامتی میں رکھ، بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ السلام اللہ کا نام ہے اس اعتبار سے دوسرا معنی ہو گا کہ خدا تمہاری حفاظت فرمائے اس میں الف لام استغراقی ہے، یعنی ہر قسم کی سلامتی ہو جان کی، مال کی، عزت کی، اہل و عیال اور آخرت کی، غرض کتنا مختصر لفظ مگر کتنا جامع اور معنی خیز ہے، گویا اس مختصر سے راستے سے خدا کی جنت تک آسانی انسان پہنچ سکتا ہے۔

### لفظ سلام کا معنی

ایک چیتاں | یہ تو آئینِ اخروی ہے کہ نفل کے مقابلہ میں فرض افضل ہے، صحیح ابن خزیمرہ میں ہے ان الواجب افضل من المندوب بسبعین درجۃ مگر بطور چیتاں یہ امتحانی سوال کتابوں میں مذکور ہے کہ وہ کونسی سنت ہے جس میں فرض سے زیادہ ثواب ہے اور وہ افضل ہے؟ صاحب در مختار نے لکھا ہے کہ ”الفرض افضل من النفل“ سے تین چیزیں مشتق ہیں، (۱) وضو قبل الوقت مستحب ہے، اور بعد الوقت فرض، لیکن بعد الوقت کے مقابلہ میں قبل الوقت افضل ہے (۲) کسی تنگ دست مقروض کو معاف کر دینا مندوب ہے، اور مہلت دینا فرض ہے، مگر اس نفل پر عمل کرنے میں زیادہ اجر و ثواب ہے، (۳) ابتدا بالسلام سنت اور جواب دینا فرض، مگر ابتدا بالسلام پر جواب کے مقابلے میں ثواب زیادہ ہے اس لئے سلام افضل ہوا، بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا بالسلام اخوت و مودت کا ذریعہ ہے، جبکہ جواب دینا اس لئے واجب ٹھہرا کہ عدم جواب پر عداوت و بغض کا خطرہ ہے، علامہ شامی نے تفصیلی کلام کیا ہے۔“ م

## باب بیان ان الدین النصیحة

دین خیر خواہی کا نام ہے

حدثنا محمد بن عباد المکی ..... عن تميم الداری، ان النبی ﷺ قال الدین النصیحة،

قلنا لمن؟ قال: لله ولكتابه، ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم، (۵)

حدثنا ابوبکر بن ابی شیبہ عن جریر قال: بايعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على

اقام الصلوة وابتداء الزكاة والنصح لكل مسلم،

حدثنا سريج بن يونس ويعقوب الدورقي عن جرير قال: بايعت النبي ﷺ على السمع

والطاعة فلقيني فيما استطعت، والنصح لكل مسلم، (۶)

ترجمہ:- حضرت تميم داریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیر خواہی کرتا دین ہے، ہم نے عرض کیا کس کی؟ تو آپؐ نے فرمایا اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، ائمہ مسلمین کی، اور سب مسلمانوں کی، حضرت جریرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے دست مبارک پر نماز پابندی کیساتھ کماحقہ پڑھنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیعت کیا۔ حضرت جریرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر سمع و طاعت پر بیعت کی تو آپؐ نے تلقین فرمائی کہ حسب استطاعت خیر خواہی کا ہر مسلمان کے ساتھ ہے۔

رابط:- اگلے باب سے منہیات کا بیان آئے گا، اوامر کے سلسلہ کی ابتداء حدیث جبرئیل سے ہوئی اور انتہاء الدین النصیحة پر ہو رہی ہے، حدیث جبرئیل میں تین باتیں ہیں ایمان، اسلام، احسان۔ اس حدیث کے آخر میں ان تینوں کے مجموعہ کو دین کہا گیا تھا اور اس باب میں ”الدین النصیحة“ کہا، گویا نصیحت ہی کا نام دین ہے اگر دونوں باب کا خلاصہ نکالا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ نصیحت ایمان، اسلام، احسان کا مجموعہ ہے اور انہی تین چیزوں کا مجموعہ دین ہے، مبداء اور معنی دونوں کا دین کے اوپر ہے۔ مسلم شریف کی ترتیب کا کمال دیکھو کہ جہاں سے چلے تھے پھر وہیں پہنچے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نصیحت کتنا جامع لفظ ہے اسی لئے علماء نے تصریح کی ہے کہ جس طرح لفظ فلاح دین اور دنیا دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے اسی طرح نصیحت دین و دنیا دونوں کی خیر خواہی پر مشتمل ہے، یہ تو ابواب کی ترتیب ہوئی۔

### لفظ نصیحت کی تحقیق

لفظ نصیحت یا تو ماخوذ ہے نصحت العسل سے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب شہد کو نوم سے جدا کر لیا جائے، لام رملی فرماتے ہیں نصح کے معنی کسی چیز کا کھوٹ نکال دینا، یہ معنی اسی محاورہ سے ماخوذ ہے، محکم میں ہے کہ نصح کھوٹ کی ضد ہے، ابن طریف نے کہا ہے کہ ”نصح قلب الانسان“ اس وقت بولتے ہیں جب دل میں کھوٹ باقی نہ رہے، اس مناسبت سے نصیحت کا ترجمہ اخلاص سے کیا جاسکتا ہے، اور بعض لوگ نصحت الثبوت عن المنصح سے ماخوذ مانتے ہیں، منصح

جوڑنے کا آکر یعنی سوئی، دونوں کا حاصل قریب قریب ایک ہے۔ (فتح الملہم) پہلی صورت میں ”الدين النصيحة“ کے معنی یہ ہوں گے کہ دین کو کفر، شرک، ریاہ کی آمیزش سے بچانا چاہئے، اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح پہنے ہوئے کپڑے کو سوئی سے درست کیا جاتا ہے، اسی طرح جب ایمان گناہوں سے پھٹ جاتا ہے تو اس کو توبہ سے درست کر لینا چاہئے، اسی لئے توبہ کی صفت قرآن میں نصوح آئی ہے، یا ایہا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحاً، عام طور پر ہمارے عرف میں نصیحت و خیر خواہی کا ایک خاص مفہوم ہے، وہ مراد نہیں، حدیث میں مبتدا اور خبر دونوں معروف باللام ہیں اسلئے حصر کیا تھ معنی ہوگا دین نصیحت ہی کا نام ہے، جیسے راجح عرفہ، تاہم نصیحت کے مختلف درجات ہیں۔

### خیر خواہی کی اہمیت

نصیحت و خیر خواہی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دوسرے بعض احکام، مجبوریوں کی حالت میں ساقط ہو جاتے ہیں، مگر نصیح و خیر خواہی اس وقت بھی ساقط نہیں ہوتی قرآن میں ہے ”اِذَا نَصَحُوا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهِ“ یہ آیت ان محذورین کے بارے میں اتری، جو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کر سکتے، تو ان پر کوئی حرج نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ دل میں نصیح و خیر خواہی کا جذبہ ہو، یعنی دل میں یہ جذبہ ہو کہ اگر سامانِ جہاد مل گیا تو جہاد میں شریک ہوں گا۔

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اہم جزء اسکو قرار دیا گیا ہے حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں: قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ اَتَّبِعْكُمْ رَسَالَاتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحْ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، (پ ۸ ع ۱۰) حضرت ہود علیہ السلام فرماتے ہیں: قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّيْ رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ اَتَّبِعْكُمْ رَسَالَاتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اٰمِيْن، (پ ۸ ع ۱۶) حضرت صالح علیہ السلام فرماتے ہیں: فَتَوَلَّيْ عَنْهُمْ وَقَالَ يٰ قَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رَسَالَاتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَا تُحِبُّوْنَ النَّاصِحِيْنَ، (پ ۸ ع ۱۷) غرض نصیح و خیر خواہی یہ ایسا جزء ہے کہ اس کے بغیر دعوت و تبلیغ مؤثر ہو ہی نہیں سکتی۔

### خدا، رسول کے ساتھ نصیحت کا کیا مفہوم

نصیحت اللہ کے معنی یہ ہیں کہ بندہ اپنے اور خدا کے مابین کوئی کھوٹ کا معاملہ نہ رکھے اس کا سب سے بڑا کھوٹ یہ ہے کہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے، اسکی صفات، جلال و جمال کا پوری تہذیب کے ساتھ اعتراف نہ کرے، اور اُسکے اوامر و نواہی میں پوری مستعدی کا اظہار نہ کرے، عللہ نے لکھا ہے کہ نصیحت اللہ کا حاصل بالفاظِ دیگر اپنے نفس کے ساتھ ہی خیر خواہی کرنا ہے۔

کتاب اللہ کی نصیحت کے معنی یہ ہیں کہ پورے آداب کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے، بدل و جان اس کے معافی کی تصدیق کی جائے، اسکے علوم کی نشر و اشاعت کی جائے، اس کی پیروی کی تمام عالم کو دعوت دی جائے، اور اسکے ہر امر و نہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے، رسول کی نصیحت یہ ہے کہ ان کی رسالت کی تصدیق کی جائے، جو دین لیکر وہ تشریف لائے اس کا ایک ایک حرف مانا جائے، ہر موقع پر اس کی مدد کے لئے سر یکف حاضر رہے، ان کے اصحاب، ان کے اہل بیت سے محبت، اور ان کا ادب پورے طور پر ملحوظ رکھے، احمدی المسلمین کی نصیحت یہ ہے کہ ہر حق معاملہ میں ان کی اعانت کی جائے، ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی جائے ان کے پیچھے نمازیں ادا کی جائیں جو بیت المال کا حق ہے وہ اس کو ایمانداری کے

ساتھ باسانی پہنچادیا جائے، اور ان کے ساتھ غداری نہ کی جائے، اہمۃ المسلمین سے بعض لوگوں نے علماء امت بھی مراد لیا ہے، اس صورت میں نصیحت علماء کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی مرویات قبول کی جائیں، دینی مسائل میں ان کی تقلید کی جائے، ان کے ساتھ اچھا گمان کیا جائے، ان کے علوم سے استفادہ کیا جائے اور ان کی توقیر و تکریم کی جائے۔

عام مسلمانوں کی نصیحت کا مفہوم ————— : یہ ہے کہ دنیوی اور آخری سب مصلحتیں ان کو بتادی جائیں، ان کو تکلیف نہ دی جائے، ان کے عیوب پر پردہ پوشی کی جائے، اور خیر خواہی میں ان کو اپنی ذات کے برابر سمجھا جائے، محمد بن نصر نے بعض علماء سے نقل کیا ہے، کہ نصح اللہ کی دو قسمیں ہیں (۱) فرض (۲) نفل۔ فرض یہ ہے کہ اس کی حرام کردہ چیزوں سے پرہیز کیا جائے، اور اسکے احکام کی بجا آوری میں بدل و جان سعی کی جائے، اگر کسی عذر کی وجہ سے ادا نہ کر سکے تو اس کا عزم رکھے کہ جب کبھی موقع ملے گا تو اسکی طاعتی کر لوں گا۔

قرآن عزیز میں ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَى الضَّعْفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يَنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (پ ۱۰ ع ۱۲) گویا جن لوگوں کے دلوں میں نصح خدا کا مضمون باقی رہا وہ جہاد میں شریک نہ ہو کر بھی محسنین کی فہرست سے خارج نہیں ہوں گے، آیت بالا سے معلوم ہوا کہ عذر کی بنا پر اعمال جوارح اور فریضہ جہاد جیسا اہم فرض بھی ساقط ہو سکتا ہے، مگر نصح خدا کا مطالبہ کسی وقت بھی قابل سقوط نہیں، ایک معذور شخص سے نماز جیسے اہم فرض کی ادائیگی، مؤخر ہو سکتی ہے، مگر قلبی ندامت اور آئندہ ادائیگی کا پورا پورا عزم اسکے ذمہ سے ساقط نہیں ہو سکتا، بس نصح اللہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکی رضا سے راضی، اور ناراضگی سے ناراض ہو جائے۔

نصیحت ناقلہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت نفس کی محبت پر اس قدر غالب کر دے کہ جب کسی چیز میں اپنے نفس اور شریعت کا مقابلہ آئے، تو شریعت ہی کو ترجیح دے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی تمام مرغوبات اللہ تعالیٰ کی محبت پر قربان کر ڈالے۔

حدیث ۴۰۰ حدثنا أبو بکر بن ابی شیبۃ ..... عن قیس عن جریر قال: بايعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على اقام الصلاة وابتداء الزكاة والنصح لكل مسلم،

شرح حدیث حضرت جریرؓ کی حدیث میں دگر فرائض کے بجائے صرف نماز روزہ پر اکتفاء کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کی اہمیت اور فضیلت کی بنا پر مستقلاً ذکر کیا گیا ہے، رہی دگر عبادات تو لفظ نصح و طاعت کے تحت آجاتی ہیں، اس لئے عدم ذکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حضرت جریرؓ نے اس عہد نبویؐ کو زندگی بھر، عملاً چنانچہ ان کے بارے میں قصہ نہ کو رہے کہ انہوں نے ایک دفعہ اپنے غلام کو تین سو درہم دیکر گھوڑا خریدنے کیلئے بھیجا وہ تین سو میں ایک گھوڑا لے آیا اور درہم پر کھنے کیلئے بائع کو بھی ساتھ لیکر آیا، حضرت جریرؓ نے گھوڑے کو دیکھنے کے بعد بائع سے فرمایا کہ تمہارا گھوڑا تین سو سے زائد قیمت کا معلوم ہوتا ہے، کیا تم چار سو میں فروخت کرو گے؟ اس طرح قیمت بڑھاتے بڑھاتے آٹھ سو تک پہنچ گئے بالآخر آٹھ سو دیکر گھوڑا خرید لیا۔ جب حضرت جریرؓ سے دریافت کیا گیا کہ جب تین سو میں گھوڑا خریدا جا چکا تو پھر پانچ سو زائد آپ نے کیوں دیا؟ تو فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ہر مسلمان کی خیر خواہی پر میں نے بیعت کیا تھا، اس نصح و خیر خواہی کا تقاضا تھا کہ صحیح قیمت اس کو ادا کروں۔



## باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی ونفیہ عن المتلبس بالمعصیۃ علی ارادۃ نفی کمالہ

گناہوں سے ایمان کے گھٹنے، اور بوقت گناہ گناہگار سے ایمان کی نفی یعنی ایمان کے نہ رہنے کا بیان  
**حدیث** ﴿ حَدَّثَنِي حَرْمَلَةُ بْنُ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عِمْرَانَ التَّجِيبِيُّ ..... قَالَ  
 أَبُو هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا  
 يَسْرِقُ السَّارِقُ حِينَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِينَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ قَالَ: ابْنُ  
 شِهَابٍ فَأَخْبَرَنِي عَبْدُ الْعَلِيِّ بْنِ أَبِي بَكْرٍ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ كَانَ يُحَدِّثُهُمْ هَؤُلَاءِ عَنْ أَبِي  
 هُرَيْرَةَ ثُمَّ يَقُولُ وَكَانَ أَبُو هُرَيْرَةَ يَلْحَقُ مَهْجُورًا وَلَا يَنْتَهَبُ نَهْيَةَ ذَاتِ شَرَفٍ، يَرْفَعُ النَّاسَ إِلَيْهِ فِيهَا  
 ابْصَارُهُمْ حِينَ يَنْتَهَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَفِي رِوَايَةٍ هَلَامُ يَرْفَعُ إِلَيْهِ الْمُؤْمِنُونَ أَعْيُنَهُمْ فِيهَا وَهُوَ حِينَ  
 يَنْتَهَبُهَا مُؤْمِنٌ، وَزَادَ وَلَا يَغْلُ احْذَرُكُمْ حِينَ يَغْلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَإِنَّكُمْ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْخَمْرِ حِينَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَالتَّوْبَةُ مَعْرُوضَةٌ بَعْدَ. (د)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زنا کرنے والا شخص بحالت زنا مومن نہیں ہوتا، اور چوری کرنی والا بحالت چوری مومن نہیں رہتا، اور شراب نوشی کرنی والا اس حالت میں مومن نہیں رہتا، ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ اتنا اور اضافہ کرتے ہیں اور نہ طیر اس وقت مومن رہتا ہے جبکہ وہ بڑی لوٹ میں مشغول رہتا ہے، کہ لوگ (بے بس ہو کر) اسے نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھا کریں (اور اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں) ایک اور روایت میں ہے مگر توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے ایک روایت میں اتنا اور اضافہ ہے کہ مال غنیمت میں خیانت کرنی والا اس حالت میں مومن نہیں ہوتا، اس سے بچتے رہو بچتے رہو۔

**ربط:** - کمال ایمان کا دوسرا جزء منہیات سے پرہیز کرنا ہے، حدیث جبریل میں بتلایا گیا تھا کہ کمال ایمان کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ہر وقت خدا کا استحضار ہو کسی آن بھی خدا نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا، ”ان تعبد اللہ کانک تراه“ اس استحضار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مومن کا کوئی قدم رضامندی کے خلاف نہیں اٹھے گا، زبان ہاتھ سب اطاعت حق کے لئے آمادہ رہیں گے، جب زبان سے لوگ محفوظ ہوں گے تو وہ مسلم کے لقب سے پکارے جانے کا مستحق ہوگا، اور ان کی طرف سے جان و مال عزت و آبرو کا طمینان ہوگا، تو مومن کے لقب سے ملقب ہوگا، اور بعد میں وہ سب کا خیر خواہ بن جائے گا، لیکن کبھی بعض عوارض کی وجہ سے مومن سے مسلم و مومن کا لقب چھین لیا جاتا ہے، اگر لوگوں کے مال پر دست درازی کرنے لگے شراب پینے لگے، زنا کا ارتکاب کرنے لگے تو اس کا نام سارق، معصوب، شرابی اور زانی رکھ دیا جاتا ہے اور چونکہ اس نے اپنے اعزاز کی نام کی خود لالچ نہیں رکھی اس لئے اس وقت وہ اس نام سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

## کیا معصیت کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے

اس حدیث کے مطابق معلوم ہوا کہ چوری، ڈکیتی کرتے وقت انسان مومن نہیں رہتا، اسی طرح وہ احادیث جن میں معصیت کے ارتکاب پر کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، مثلاً اِذَا كَفَرَ الرَّجُلُ اِذَا فَقَدَ بِلَهَا اِلٰهَهُمَا، مِنْ رَغَبٍ عَنْ اٰبِيهِ كَفَرَ، قتالہ کفر، ان سب کے ظاہر سے بھی محسوس ہوتا ہے کہ معصیت کبیرہ کے ارتکاب کے بعد انسان مومن نہیں رہتا، تو اس کا کیا مطلب؟ کیا واقعہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے؟ یا کچھ اور مفہوم ہے؟

## مسلک معتزلہ اور خوارج

حدیث کے ظاہری الفاظ کو دیکھ کر ان دونوں کا خیال ہے کہ اس قسم کے گناہوں سے مسلمان دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے، اس کے قلب میں ایمان باقی نہیں رہتا، کافر ہو گیا نہیں؟ تو معتزلہ کے نزدیک کافر نہیں ہو گا، اور خوارج کے بقول کافر بھی ہو جائے گا، معتزلہ منزلت بین المنزلتین کے قائل ہیں، اور خوارج کفر و ایمان کے درمیان واسطہ کے قائل ہیں، مگر نتیجہ میں دونوں گروہ مغلطی النار ہونے کا مسلک رکھتے ہیں، ایسے مقامات پر ان دونوں کو دھوکہ اس لئے لگا جو شخص بھی محض الفاظ کے شان و شوکت کو دیکھ کر مسائل کا استنباط کرنے بیٹھ جائے یقیناً وہ حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے گا، کیونکہ ہر زبان کا یہ اسلوب ہے کہ مدح و مذمت کے وقت مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے، مدح کا موقع ہو تو حوصلہ افزائی کیلئے معانقہ سے کام لیا جاتا ہے، مثلاً کسی کو فرشتہ یا شیر کہہ دیا جائے، اور مذمت کا موقع ہو تو گھٹیا قسم کے الفاظ استعمال کر کے اپنا مقام یاد دلایا جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی بیٹا شخص دن کے اجالے میں کسی سے ٹکرا جائے تو کہا جاتا ہے اندھے تو نہیں ہو گئے؟ قرآن پاک کا انداز بھی اس پر شاہد ہے کہ شرک کو انما المشرکون نجس کہا حالانکہ مشرک کے بدن پر ظاہری نجاست نہ ہو تو اس کا بدن اور سوڑ پاک ہے، اس کے باوجود نجس کہا گیا، تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے کسی کو کتا کہہ دیا جائے، غرض ایسے مقامات پر کوئی اس کے حقیقی معنی مرلو نہیں لیتا، بہر حال جب خدا نے مشرک کے دشمن ہونے کے باوجود مذمت کی ہے تو ایک مسلمان جو مشرکوں جیسا کام کرے، تو وہ اس سے زیادہ مذمت اور سرزنش کے لائق ہے، کیونکہ خدا کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہوئے جب دشمنوں جیسا کام کرے گا، تو اس کو مذمت آمیز خطاب دیکر عار دلایا جاسکتا ہے کہ تم میں اور کافر میں کیا فرق رہا؟ گویا عار دلا کر مسلمان کو اپنا مقام یاد دلایا جاتا ہے، یہی حال حدیث باب کا ہے، جہاں کہیں قرآن کریم میں انبیاء کے بارے میں اس قسم کے کلمات استعمال کئے گئے ہیں وہ اسی قبیل سے ہیں، مثلاً حضرت یونس اللہ کے برگزیدہ نبی ہیں، انہوں نے اللہ کی اجازت کے بغیر اپنی آبادی چھوڑ دی، اور باہر چلے گئے تو حق تعالیٰ نے انکی شان میں فرمایا فظن ان لن نقدر علیہ، کیا کوئی مسلمان یہ سوچ سکتا ہے؟ کہ خدا کی گرفت سے ہم باہر ہیں، پھر ایک نبی خدا کے بارے میں ایسا گمان کس طرح کر سکتے ہیں؟ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ گرچہ تم نے ایسا عقیدہ نہیں رکھا، مگر تمہارے فعل سے ایسا سمجھا جاسکتا ہے تمہارے مقام اور رتبہ کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح کا کام تم جیسوں سے ہرگز نہ ہونا چاہئے، غرض اس قسم کی بات کہہ کر ان کو اپنا مقام یاد دلایا جاتا ہے، اس قسم کی حدیثوں کا مطلب محاورے کو سامنے رکھ کر بیان کیا جائے گا، کہ حقیقی معنی مراد کو سامنے رکھ کر، ورنہ تو انسان حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

## توجیہات حدیث

(۱) حضرت حسن بصری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ان معاصی کی حالت میں ایمان اس سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے، اگر توبہ کر لے تو واپس کر دیا جاتا ہے۔

(۲) حضرت طاہر کہتے ہیں کہ ان حالات میں مومن کا ایمان زائل ہو جاتا ہے۔

(۳) حضرت ابو جعفر فرماتے ہیں کہ یہ شخص دائرہ ایمان سے نکل کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے، حضرت امام احمد سے بھی یہی منقول ہے۔

(۴) امام ابو بکر بن شبیبہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ شخص کامل مومن نہیں رہتا، اس کا ایمان ناقص ہو جاتا ہے۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جب اس کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے اس طرح بتایا کہ

پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں ڈال دیں پھر ان کو علیحدہ کر لیا، اسکے بعد فرمایا کہ اگر توبہ کر لیتا ہے تو پھر وہ اسی طرح واپس آ جاتا ہے، یہ کہہ کر پھر انگلیاں ملا لیں۔

(۶) امام بخاریؒ کی نظر میں اس کی توجیہ یہ ہے کہ ارتکاب معصیت کی حالت میں بندہ مومن کامل نہیں رہتا، اور اس کا

تو ایمانی نکل جاتا ہے، امام بخاری نے اپنی اس تحقیق کو خود ابن عباس سے بھی نقل کیا ہے، ینزع عنه نور الایمان فی

الدنیا، حافظ ابن تیمیہ نے ابن عباس سے روایت نقل کیا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں سے فرمایا کرتے تھے، جسے شادی کی ضرورت

ہو، ہم اس کی شادی کر دیں گے کیونکہ اگر تم میں کوئی زنا کار تکب ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ایمان کا نور چھین لے گا، پھر یہ اس

کی مرضی ہے خواہ واپس کرے یا نہ کرے، حضرت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان نکل کر اس کے سر

پر سائبان کی طرح معلق ہو جاتا ہے جب وہ اس معصیت سے فارغ ہو جاتا ہے تو پھر لوٹ جاتا ہے، مستدرک حاکم میں

حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً منقول ہے کہ جس نے زنا کیا یا شراب پی، اللہ تعالیٰ اس کا ایمان اس طرح نکال دیتا ہے جیسا

انسان اپنی قمیص سر کی طرف سے اتار لیتا ہے، حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس کو مرفوعاً ذکر کیا ہے، ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہؓ

سے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں انہ کان یقول انما الایمان کثوب احکم یلبسه مرة ویخلعه اخری، ایمان کی مثال

لباس کی سی ہے کبھی آدمی پہن لیتا ہے اور کبھی اتار لیتا ہے۔

(۸) فتح الباری میں ہے کہ گناہ سلب ایمان کا سبب بن سکتا ہے، بایں طور کہ اسکے قلب میں جرأت پیدا ہو اور یہ جرأت

اسے کفر تک پہنچا دے۔

(۹) اس طرح کہ روایات کا مصداق وہ شخص ہو گا جو ان حرام امور کو حلال سمجھ کر کرے۔

(۱۰) علامہ طہی کہتے ہیں کہ حیاء ایمان کا ایک شعبہ اور جزء ہے، اس طرح کی روایات میں ایمان کی نفی کر کے در

حقیقت شعبہ ایمان یعنی حیاء کی نفی مقصود ہے، نہ کہ نفس ایمان کی، بایں طور کہ وہ مومن خدا سے حیا نہیں کرتا، کیونکہ حیاء

ہوتی تو اس قسم کی جرأت نہ کرتا۔

(۱۱) علامہ تور پشٹی یہ کہتے ہیں کہ کلام عرب میں ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ نفی بول کر نفی مراد لیتے ہیں لایزنی در

حقیقت لایزال ہے جو صیغہ نہی ہے، لہذا اب کوئی اشکال نہیں۔

(۱۲) حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ایک عاصی کی مثال ایسی ہے جیسی آنکھیں بند کرنے کے بعد ایک پینا شخص کو کچھ بھی نظر نہیں آتا اور اس لحاظ سے ایک مینا اور نایبنا برابر ہو جاتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ نایبنا نور بصری نہیں رکھتا، اور مینا اگرچہ نور بصر تو رکھتا ہے، مگر غلاف چشم کی وجہ سے وہ نور کام نہیں آتا، اس لئے نایبنا کے برابر ہو جاتا ہے، اس طرح جب ایک مومن کے نور بصیرت پر بھیبت کا حجاب پڑ جاتا ہے تو وہ بھی کافر کی طرح معصیت و طاعت میں فرق نہیں پہچانتا، اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مومن جس حالت میں زنا کرتا ہے، اس کا نور تصدیق جوش بھیبت سے ایسا دم پڑ جاتا ہے کہ اسے معصیت کرنے میں کوئی باک نہیں رہتا، اور اس جرأت کے عالم میں اس پر مومن کا اطلاق بڑا مشکل ہو جاتا ہے، ہاں اگر توبہ کر لے تو حجاب بھیبت پھر چاک ہو جاتا ہے اور نور ایمان جگمگانے لگتا ہے۔

حضرات اہل سنت اس قسم کی حدیثوں میں تاویلات اس لئے کرتے ہیں تاکہ دوسرے نصوص ہاتھ سے نہ جانے پائیں جیسے ”وان زنی وان سرقی“ اور حدیث شفاعت وغیرہ جن سے سمجھ میں آتا ہے کہ مرتکب کبیرہ مومن ہیں، بعض علما نے بڑی اچھی بات کہی ہے، کہ زنا کرنے سے مومن اگر مرتد ہو جایا کرے تو مرتد کی سزا اسلام میں قتل ہے، مگر زانی کیلئے مذہب اسلام میں سزائیں مختلف ہیں، شادی شدہ کیلئے رجم اور غیر شادی شدہ کیلئے سو کوڑے، جو اس بات کی واضح علامت ہے کہ مرتد و کافر نہیں ہوتا۔

ایک سوال :- ”ذخیرہ احادیث میں بہت سے ایسے کبار گناہ ہیں جن کے ارتکاب سے مومن فسق و فجور میں مبتلا ہو کر نور ایمان سے محروم ہو جاتا ہے تو پھر حدیث میں چند کا ذکر کیوں؟

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں حدیث میں اگرچہ چند کا ذکر ہے، لیکن اس حدیث میں بطور مبالغہ اور تہدید کے ہر قسم کے گناہوں پر تنبیہ مقصود ہے کیونکہ زنا سے تمام شہوات پر، سرقہ سے رغبت فی الدنیا و حرص علی الحرام پر، اور خمر سے ہر اس چیز پر تنبیہ مقصود ہے جو خدا سے بعد پیدا کرے اور انتہاب و قتل سے مخلوق کو ہلکا سمجھنے اور ذلیل اور سوا کرنے پر تنبیہ مقصود ہے۔“

خلاصہ بحث | حدیث جبرئیل میں کمال ایمان کے لئے استحضار خداوندی کا طریقہ بتلایا گیا ہے، تو چونکہ زانی وغیرہ سے خدا کا استحضار باقی نہیں رہتا اور نہ کیا وجہ ہے کہ کسی انسان کی موجودگی میں زنا نہیں کیا جاتا اگر خدا کو حاضر سمجھتا تو زنا کیونکر کرتا؟ خواہشات نفسانی نے حاکم ہو کر خدا کے حضور کو ختم کر دیا، اور اس قصور کے ختم ہو جانے سے نفس ایمان تو رہتا ہے کمال ایمان نکل جاتا ہے۔

فائدہ :- ان تاویلات پر غور کیجئے کہ حدیث مذکور جب تک صحابہ کے مابین رہی انہوں نے اسکی تاویل میں بھی ایسا عنوان اختیار کیا جو لفظ حدیث کے زیادہ سے زیادہ قریب رہے اور جب دعائے کے مابین آگئی تو مسئلہ اگرچہ زیادہ صاف ہو گیا مگر الفاظ حدیث سے اتنا قرب باقی نہ رہا حضرت ابو ہریرہؓ چاہتے ہیں کہ اس قسم کے عاصی سے ایمان ہی کی نفی کر دی جائے، اس لئے فرماتے ہیں کہ اس کا ایمان اس کے قلب سے نکل کر اس کے اوپر سائبان کی طرح معلق ہو جاتا ہے حضرت ابن عباسؓ جو ان سے افتخار ہیں انہوں نے عنوان اگرچہ وہی رکھا مگر بات ذرا اور صاف کر دی، اور فرمایا ان معاصی کے ارتکاب کے وقت



اَخْلَفَ وَاِذَا اَوْتُمِنَ خَانَ وَفِي رِوَايَةٍ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ وَاِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ۔ (۵)

ترجمہ عبد اللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص میں یہ چاروں باتیں جمع ہو جائیں تو وہ پورا منافق ہے، اور جس میں کوئی ایک خصلت پائی جائے تو سمجھ لو اس میں نفاق کی ایک خصلت پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے (۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) اور جب عہد کرے تو توڑ ڈالے (۳) اور جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے (۴) اور جب جھگڑا کرے تو بے قابو ہو جائے، ایک روایت میں ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، ایک اور روایت میں ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں اگرچہ وہ نماز روزہ کا پابند ہو اور اپنے آپ کو مسلمان ہی خیال کرے (پھر بھی وہ منافق ہی ہے)

### شرح حدیث

نفاق کے لغوی اور شرعی معنی: نفاق بروزن کتاب ہے، دل میں جو کچھ ہو اس کے خلاف ظاہر کرنے کو لغت میں نفاق کہتے ہیں شریعت میں ایک خاص معنی کیلئے مستعمل ہے کہ دل میں تو کفر ہو لیکن اپنی زبان سے اسلام ظاہر کرے، ایسے شخص کو منافق کہتے ہیں۔

منافق کی وجہ تسمیہ: — تین ہیں (۱) نفاق سے شوق ہے بمعنی تہ خلانہ، جس میں انسان چھپ جاتا ہے، تو چونکہ منافقین بھی کفر کو چھپاتے ہیں اس لئے اس کو منافق کہا جاتا ہے، (۲) نفاق سے شوق ہے، گوہ اپنے لئے دوسور لٹ بناتا ہے ایک کھلا ہو اس کو قاصعہ کہتے ہیں اور دوسرا سور لٹ جو بھاگنے کیلئے اور پوشیدہ ہوتا ہے، اس کو نفاق کہتے ہیں جب شکاری اس کو تلاش کرتا ہے تو دھوکہ دیکر اسی نفاقہ راستہ سے بھاگ جاتا ہے تو اسی طرح منافق بھی کرتا ہے، اس لئے اسکو یہ نام دیا گیا (۳) گوہ بھی چھپتا کہیں ہے اور اپنے کو ظاہر کہیں اور کرتا ہے، اسی طرح منافق بھی کہیں اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے اور قلب میں کفر چھپا رکھتا ہے، انسان کی اچھائی اور خرابی کا دار و مدار تین چیزوں پر ہے، دل اچھا ہو، زبان اچھی ہو، اعضاء و جوارح اچھے ہوں، یہ انسان کے اچھے ہونے کی پہچان ہے، اور دل خراب ہو زبان بری ہو، اعضاء و جوارح خراب ہوں یہ برے انسان کی پہچان ہوتی ہے، حدیث میں منافقین کے اندر انہیں تین خرابیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

### نفاق کی قسمیں

جس طرح ایمان و کفر کی مختلف قسمیں ہیں اسی طرح نفاق کی بھی مختلف قسمیں ہیں، اور جس طرح ایک ایمان کامل اور دوسرا ناقص ہے، پھر کامل ایمان کے بعض شعبوں کو بھی ایمان کہا گیا ہے، یا جس طرح ایک کفر، کفر حقیقی ہے اور پھر بہت سی نافرمانیوں کو کفر سے تعبیر کیا گیا بالکل اسی طرح نفاق کی بھی چند قسم ہے، بعض کامل، بعض ناقص، ایک نفاق اعتقادی یہی حقیقی نفاق ہے، پھر اس کے جو خصائص بد ہیں ان کو نفاق سے تعبیر کیا گیا، یعنی جب منافق حقیقی کی خصلتیں ایک مسلم پر ظاہر ہونے لگتی ہیں کہ جب گفتگو کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو پورا نہیں کرتا ہے اور جھگڑے پر آمادہ ہوتا ہے تو حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتا، یہاں تک اعمال ظاہری کے اعتبار سے منافق سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا، سوائے اس کے کہ

کوشہ قلب میں ایمان ہوتا ہے اور منافق کے دل میں یہ نہیں ہوتا لیکن ظاہری شہادت ایسی چیز نہیں کہ آنکھوں سے نظر آسکے، اس لئے حدیث تو کفر کے اطلاق کی طرح کبھی کبھی ایسے مسلمانوں کو بھی منافق کہہ دیتی ہے، (۲) نفاق عملی، حضرت حسن بصری کے الفاظ میں انسان کے ظاہر و باطن کے اختلاف کا نام ہے اس بنا پر جو شخص باطنی طور پر اسلامی عقائد کا معتقد ہو مگر ظاہری اعمال میں کوتاہی کرتا ہو اسکو عملی نفاق کہا جاسکتا ہے، پھر تارک صلوٰۃ پر کفر کے اطلاق کا جو مقصد ہوتا ہے وہی مقصد اس کے منافق کہنے سے ہوگا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نفاق عملی کہنے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ نفاق عملی کبھی کبھی نفاق حقیقی کا سبب بھی بن سکتا ہے، جیسا کہ بعض اوقات مصفیوں کا ارتکاب کرتے کرتے کفر حقیقی کی نوبت بھی آجاتی ہے، بہر حال نفاق اعتقادی نفاق اکبر ہے اور نفاق عملی نفاق اصغر ہے۔

### کسی بھی تحریک کے لئے سب سے مضر کون؟

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے جب کوئی اصلاحی تحریک پیدا ہوتی ہے تو اس میں تین قسم کے گروہ پیدا ہوتے رہے ہیں، ایک اس کو پوری طرح تسلیم کر لیتا، دوسرا پورا ردِ مقابل، اور تیسرا اگر وہ جو اندرونی طور پر عداوت و دشمنی رکھے اور ظاہر میں شامل تحریک ہو، یہ تیسرا گروہ ہمیشہ انتہائی خطرناک رہا ہے، جس کو منافق کہا جاتا ہے، کفار تو اسلام کی دشمنی کھلم کھلا کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے، اور یہ ماہر آستین بن کر اندر ہی اندر اسکی جڑ کاٹنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں کفار جو مکہ پورے اقتدار کے مالک تھے، اسلئے یہاں تو انہیں اسلام کی بر ملا دشمنی پر کوئی امر مانع نہ تھا، لیکن مدینہ طیبہ میں اگر جب اسلام کو بھی طاقت و شوکت میسر آنے لگی تو پہلے کی طرح علی الاعلان دشمنی کرنے کا ان کو حوصلہ نہ رہا، اسلئے عداوت کی شکل بدل دینی پڑی، اور یہیں سے نفاق کی بنیاد پڑی لہذا نفاق کی حقیقت ایمان و کفر کے درمیان نہیں بلکہ کفر سے بھی بالاتر ہے، اسی وجہ سے قرآن نے ان کا مقام دوزخ میں کافروں سے بھی نیچے بتایا ہے۔

### کیا جھوٹ اور وعدہ خلافی کی اجازت ہے؟

اذا حدثت کذب النخ: یہ زبان کی خرابی کی دلیل ہے، ولذا وعدہ خلافی یہ دل کے خراب ہونے کی علامت ہے، تاہم اسلام کو یہ بالکل برداشت نہیں کہ زوجین کے درمیان کبیدگی پیدا ہو اور آپس میں جنگ و جدال کی نوبت آجائے، اس لئے بیوی کو خوش رکھنے کیلئے بقدر ضرورت خلاف واقعہ بات کہنے کی اجازت دی ہے اسی طرح شریعت جو پوری انسانیت کو اجتماعیت کے سایہ میں دیکھنا چاہتی ہے بالکل پسند نہیں کرتی کہ دو مسلمان دست و گریباں ہوں اس لئے ان میں مصالحت کرانے کی غرض سے جھوٹ بولنے کی اجازت دیدی۔

وعدہ خلافی وہی مذموم ہے جو وعدہ کرتے وقت ہی خلاف ورزی کرنے کی نیت ہو، لیکن جس وعدہ کو پورا کرنے کا عزم ہو اور بعد میں کسی مجبوری کی وجہ سے پورا نہ کر سکا وہ مذموم نہیں۔

وانذ أوتمن خان: یہ اعضاء و جوارح کے خراب ہونے کی دلیل ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کے پاس امانت رکھے تو اس کو ہضم کر جائے، خیانت جس طرح مال میں ہوتی ہے اسی طرح بات میں بھی ہوتی ہے کہ کسی کی بات امانت ہو اس کو

ظاہر کر دی جائے غرض اس سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مسلمان کامل وہی کہلائے گا جس کا قلب، زبان، اعضاء و جوارح سب ٹھیک ہوں تاہم امور مذکورہ پر نفاق عملی کا حکم اس وقت ہوگا جبکہ قصد اہو، اور اسکی علوت ہو اتفاقیہ ہو جائے تو منافق نہیں کہلائے گا، اسی طرح فتنہ و فساد سے متعلق کوئی بات بطور رہنمائی گئی تو دوسرے کو اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کا افشاء کر دینا خیانت میں داخل نہیں ہوگا۔

### نفاق کی علامت تین یا چار؟

ایک حدیث میں منافق کی تین اور دوسری حدیث میں چار علامتیں بتلائی گئی ہیں، بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، اس کے چند جوابات دیئے گئے ہیں :

(۱) حدیث کا یہ مشہور اصول ہے کہ اس فن میں مفہوم عدد کا اعتبار نہیں یعنی کم عدد زیادہ عدد کی نفی نہیں کرتا لہذا تین سے چار کی نفی نہیں ہوتی، اس لئے کوئی اشکال نہیں۔

(۲) بعض لوگوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ پہلے آپ کو تین اور بعد میں چار بتدریج بتلائی گئیں، لہذا دونوں عدد الگ الگ زمانہ سے متعلق ہیں۔

(۳) تیسرا جواب سب سے عمدہ ہے وہ یہ ہے کہ دونوں روایتوں کی علامتیں جمع کرنے سے پانچ علامات ہو جاتی ہیں، جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، معاہدہ کر کے توڑ دینا، امانت میں خیانت کرنا، جھگڑے میں گالی گلوچ کرنا، اگر ان پانچوں کو اصول کے تحت جانچا جائے تو کل تین علامتیں ہو جاتی ہیں، (۱) زبان کی خرابی اس کے ذیل میں اذا حدث کذب واذا خاصم فجر (۲) دل کی خرابی کے تحت واذا وعدہ اخلف اور اذا عاہذ غدر، (۳) اور اعضاء و جوارح کی خرابی میں اذا اوتمن خان، داخل ہے، گویا دل اور زبان کی خرابی کی اہمیت کے پیش نظر دو چیزیں بتادی گئیں، اور اعضاء و جوارح کی خرابی کیلئے صرف ایک چیز، وعدہ کی طرف ہوتا ہے اور معاہدہ جائز نہیں ہے۔

سوال :- جب اصولی طور پر تین ہی چیزیں نکلتی ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں تین کی تخصیص کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصلی دیانت تین میں منحصر ہے، قول فعل، نیت، اذا حدث کذب سے فساد قول پر آگاہی ہوئی، اور اذا اوتمن خان، سے فساد فعل کا، اور اذا وعدہ اخلف سے فساد نیت کا پتہ چلتا ہے، غرض انہیں تین چیزوں سے مسلمان کی دیانت کا پتہ چلتا ہے، اس لئے اصولاً ان تین کو ذکر کیا گیا۔

### علامت نفاق مومن میں ہوتی ہے تو کیا وہ بھی منافق؟

اس حدیث کو اس لحاظ سے مشکل سمجھا جاتا ہے کہ منافقین کی ذکر کردہ علامتیں بہت سے مسلمانوں میں بلکہ بہت سے علماء اور صلحاء میں پائی جاتی ہیں حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ دائرہ اسلام سے نکل جانا چاہئے، حالانکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک مسلمان ہی رہتے ہیں بشرطیکہ تصدیق باقی ہو، اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں

(۱) المنافق میں الف لام کو جنسی مانا جائے، یا عہد خارجی، جنسی یا شغرائی کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ علامتیں



ہر زمانے کے منافقین کیلئے ہیں، عہد خارجی کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ علامتیں خاص منافقین کے بارے میں بتائی گئی ہیں، یا اس زمانہ کے کسی خاص منافق کے بارے میں ہے نہ کہ مسلمانوں کے بارے میں۔

البتہ الف لام استغراقی ماننے کی صورت میں اشکال ہوگا علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں، محققین اور اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسا شخص منافق تو نہیں البتہ منافقوں کے مشابہ ضرور ہے، کیونکہ ظاہر و باطن کے لحاظ سے منافقین کے طریقہ کو اپنائے ہوا ہے۔

(۲) جس سے جھوٹ بولایا وعدہ خلافی کی یا جس کی امانت میں خیانت کی اس شخص کی نگاہ میں منافق ہو مسئلہ کی رو سے منافق نہیں ہوا۔

(۳) یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس میں یہ علامتیں اس کی عادت بن جائے اور ان ہی چیزوں کا مزاج بن جائے لفظ اذا سے یہی قہار ہوتا ہے، نہ کہ ایسے شخص کے متعلق جس کی عادت نہ ہو،

(۴) یہ چیزیں نفاق کے لئے علامت ہیں نہ کہ علت، علامت کا ذکر علامت سے انفکاک ہو سکتا ہے جیسے بارش کی علامت بادل ہے، بادل کے بغیر بارش نہیں ہوتی، اور کبھی بادل کے باوجود کسی عارض کی وجہ سے بارش نہیں ہوتی، اسی طرح سے مسلمان میں اگر یہ علامتیں پائی جائیں تو یہ ضروری نہیں کہ جہاں یہ علامتیں ہوں وہ منافق بھی ہو جائے، مسلمان کا ایمان اس کو منافق ہونے سے بچا لیتا ہے اگر دل میں ایمان نہ ہو تا تو منافق ہو جاتا ایمان ایک ایسا عارض ہے جو نفاق سے بچا لیتا ہے۔

(۵) امام ترمذی نے نفاق سے نفاق عملی مراد لیا ہے،

(۶) زجر و تہدید پر محمول کیا جائے، یعنی مسلمانوں کو ان خصلتوں کے ارتکاب سے روکنے کیلئے بیان کیا گیا، تاکہ نفاق کی خصلت سن کر اس سے متنفر ہو جائیں یا اس لئے روکا گیا تاکہ یہ عادت مسلمان کو حقیقی نفاق تک نہ پہنچا دے،

(۷) ان خصلتوں کی وجہ سے مسلمان مسلمان ہی رہتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں یہ تینوں خصلتیں پائی گئیں، حضرت یوسف کی حفاظت کا وعدہ کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی امانت (حضرت یوسف) سپرد کیا، انہوں نے خیانت کی بھیڑنے نہیں کھایا تھا پھر بھی جھوٹ بول پڑے مگر ان کو ان خصلتوں کی وجہ سے کافر اور منافق نہیں کہا گیا، نیز خود حدیث کے الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ کافر نہیں ہوگا، من کانت فیہ خلۃ منہن کانت فیہ خلۃ من نفاق حتی یدعھا، کیونکہ ان خصلتوں کا مرتکب دائرۃ اسلام سے نکل جاتا تو دوبارہ مسلمان ہونے کے لئے تجدید ایمان کی ضرورت پیش آتی، کان منافقاً خالصاً، کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص میں یہ تینوں خصلتیں جمع ہوں گی ان کو منافق سے بہت زیادہ مشابہت ہوگی۔

سوال : دور نبوی میں منافقوں کو قتل کیوں نہیں کیا گیا؟

”جب نفاقی اعتقادی کفر سے بالاتر ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں ان کو قتل کیوں نہیں کیا گیا؟ اور مسلمانوں جیسا معاملہ کیوں کیا گیا؟

۱۔ کا جواب یہ ہے کہ اعتقادی منافق کے ساتھ عدم قتل کا یہ حکم دور نبوی کے ساتھ خاص ہے آپ کے بعد اگر کسی شخص

میں اس قسم کا نفاق ظاہر ہو جائے تو اس پر احکام اسلام ہوں گے آپ کے دور میں چند مصلحت کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا۔  
 (۱) منافقین کو کفار عام طور پر مسلمان سمجھتے تھے اگر ان کو قتل کیا جاتا تو وہ کہتے کہ مسلمان خود مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں تو اس سے اسلام کی نفرت پھیلتی (۲) یا اس لئے کہ جب منافقین آپ کے اخلاق کو قریب سے دیکھیں گے تو امید ہے کہ ان کا نفاق ایمان سے بدل جائے، (۳) یا اس لئے کہ منافقین کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد میں زیادتی معلوم ہوتی تھی، اور اس زیادتی کی وجہ سے کفار مرعوب ہوتے ان مصلحتوں کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا۔“

## باب بیان حال ایمان من قال لاخیه المسلم یا کافر

مسلمان بھائی کو اے کافر! کہنے والے کے ایمان کا حال

حدیث ۴۰۰۰ حدثنی ابو بکر بن ابی شیبۃ ..... عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا کفر الرجل اخاه فقد باء بها احدهما وفي رواية ابن عمر يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ايما امرئ قال لاخيه كافر فقد باء بها احدهما ان كان كما قال، ولا رجعت عليه في رواية عن ابی ذر انہ سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ليس من رجل ادعى لغير ابيه وهو يعلمه الا كفر، ومن ادعى ما ليس له فليس منا وليتبتوا مقعده من النار، ومن دعا رجلاً بالكفر او قال عدوا لله وليس كذلك الا حار عليه،

ترجمہ میں سے ایک پر لوٹ جاتا ہے دوسری روایت میں ہے کہ جس کی تکفیر کی گئی اگر واقعی وہ ویسا ہی ہے تو کفر اس پر ورنہ کہنے والے پر لوٹ جائے گا، حضرت ابو ذر کی روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر غیر باپ کی طرف اپنی نسبت کرے تو وہ کفر کا مرتکب ہو، اور جس شخص نے کسی ایسی چیز کا دعویٰ کیا جو اس کی نہیں ہے تو وہ میری جماعت سے خارج ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے، اور جو شخص کسی دوسرے کو کافر بنائے یا اس کو خدا کا دشمن کہے حالانکہ وہ ایسا نہیں تو یہ باتیں خود کہنے والے پر لوٹ جائیں گی۔

مقصد حدیث زبان سے نکلی ہوئی باتوں کے متعلق آدمی سمجھتا ہے کہ وہ فضا میں فنا ہو جاتی ہے اور جب اس کا وجود ہی نہیں رہتا تو پھر اس پر گرفت اور مواخذہ کیسا؟ اس لئے جو کچھ منہ میں آتا ہے بک ڈالتا ہے، شارع کی نگاہ میں انسانی باتوں کی بڑی اہمیت ہے، وہ جو کچھ بولتا ہے وہ فضا میں محفوظ ہے اور کم سے کم ایک مسلمان کا عقیدہ تو ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر فرشتے کے پہرے مقرر کر دیے ہیں جو ان کے ہر قول و فعل کو قید کتابت میں لا رہے ہیں اور بروز جزا و سزا سب پیش ہوں گے اور اس پر جزا و سزا مرتب ہوگی، یہ تنبیہ اس لئے کی جا رہی ہے کہ ہر شخص اپنی زبان کی اہمیت محسوس کرے، باب سابق میں کذب بیانی کو نفاق کی علامتوں میں شمار کر لیا گیا تھا اگر منافق اس بارے میں قابل گرفت ہے تو مسلمان اس معاملہ میں کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

## تشریح حدیث

”جس طرح نیک اعمال کی بنا پر کسی کافر کو مسلمان کہنا صحیح نہیں اسی طرح کسی مسلمان کو صرف اس کے اعمال بد اور گناہوں کی وجہ سے کافر کہنا صحیح نہیں، اسلام میں کسی کافر کو مسلمان کہنے یا کسی مسلمان کو کافر کہنے کی ممانعت یکساں ہے غرض کسی مومن معاصی کی تکفیر سے ممانعت کرتا ہے۔“

## ضروریات دین کے منکر کو کافر کہا جائے گا

حدیث میں عملی فروگزاشتیں، ذنوب و معاصی کے مرتکب کی تکفیر سے ممانعت کی گئی ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان ضروریات دین کا منکر ہو یا دین کا مذاق و استخفاف کرنے لگے یا عقائد کفریہ رکھنے لگے، تو پھر اس کی تکفیر کی جائے گی، مسئلہ کذاب مدعی اسلام اور معترف نبوت بھی تھا مگر کیا مذکورہ حدیث کی بنا پر اسکو مسلمان سمجھا گیا؟ ہرگز نہیں، اسی طرح جن لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کیا تھا اگرچہ وہ اہل قبلہ نمازی تھے، ذبیحہ کھاتے تھے، مگر اس کے باوجود صحابہ نے مرتد سمجھ کر ان سے جہاد کیا یہی وجہ ہے کہ آج بھی اگر کوئی مسلمان ضروریات دین میں سے کسی امر کا انکار کر بیٹھے تو اس کو کافر کہا جائے گا۔

حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے ثَلَاثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِيْمَانِ الْكَفُّ عَنِ الْقَوْلِ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا تَكْفُرُهُ بِذَنْبٍ وَلَا تَخْرُجُهُ مِنَ الْاِسْلَامِ، وَالْجِهَادُ مَا بَيْنَ مَنْذُ بَعْثَنِ اللّٰهُ، اس حدیث میں تنبیہ ہے کہ جن افعال پر تکفیر کی ممانعت کی گئی ہے وہ عقائد کفریہ، ضروریات دین کا انکار، اور دین کا مذاق و استخفاف نہیں بلکہ عملی کوتاہی اور معصیت سے متعلق ہے۔

## اہل قبلہ کا مفہوم

فقہی کتابوں میں مذکور ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے، اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں اسلامی اصول سے کوئی اختلاف نہ ہو بلکہ سارے ہی اصول میں متفق ہوں، اگر اختلاف ہو تو صرف فروعات میں، لہذا جہاں بھی اہل قبلہ کہا جائے تو اس کا مفہوم کلی مراد ہو گا نہ یہ کہ اسلام کی چند چیزوں کو ماننا ہو، قبلہ کو بھی ماننا ہو، گویا یہ لفظ قبلہ ایک سرنامہ ہے، جس طرح کلمہ توحید اسلام کے لئے سرنامہ ہے اسی وجہ سے بہت سے مقامات پر توحید کے ساتھ رسالت کا بھی ذکر نہیں اور صرف توحید کے عقیدہ کی بشارت مذکور ہے تو جس طرح احادیث میں کلمہ توحید کے اقرار کا مطلب تمام اسلامی اصول کا اقرار ہے اسی طرح یہاں بھی اہل قبلہ کا مطلب سمجھنا چاہئے۔

## کیا تکفیر مسلم کفر ہے؟

اس حدیث کے پیش نظر ایک مشہور اشکال ہے اہل سنت و الجماعت تکفیر مسلم کو کفر نہیں سمجھتے حالانکہ ظاہر حدیث سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں کی تکفیر کرنے والا کافر ہو جاتا ہے اس اشکال سے بچنے کی مختلف توجیہات کی جاتی ہیں :

(۱) حدیث میں تکفیر کرنے والے کو کافر کہا وہ اس صورت میں جبکہ تکفیر کو حلال جانے لیکن یہ تاویل کمزور ہے

(۲) کفر لوٹ آئے گا اس سے مراد تکفیر کی معصیت لوٹ آئے گی، یہ مطلب نہیں کہ وہ کافر ہو جائے گا

(۳) قاضی عیاض نے امام مالک سے یہ توجیہ نقل کی ہے کہ یہ حدیث ان خوارج کے بارے میں ہے جو بر ملا مسلمانوں کی تکفیر

کرتے ہیں امام نووی نے اس جواب کو کمزور بتایا ہے، کیونکہ اہل سنت و الجماعت خوارج کو کافر نہیں مانتے بلکہ بدعتی ٹھہرتے ہیں۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی تحقیق یہ ہے کہ جو گروہ تمام صحابہ کی مذمت بیان کرے یا ان میں اکثری کو کافر ہے اور ایک دو صحابی کی مذمت فسق ہے، بعض لوگوں نے حضرات شیخین کے سب و شتم کو موجب کفر بتلایا ہے۔

فرقہ رافضی کے بارے میں علامہ شامی ان کے تکفیر کے قائل نہیں ہیں اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی تکفیر کے قائل ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس فرقہ کی تردید نہیں کی وہ ان کے عقائد سے واقف نہیں تھے اور انہوں نے مفتی بہ اس کو بتلایا ہے کہ اس کی تکفیر کی جائے، (محض الباری ص ۱۲۰/۱)

بخاری (ص ۹۸/۱) کی روایت میں کفر باللہ ہے یعنی اس نے اللہ کا انکار کیا، اس روایت کے پیش نظر مطلب یہ ہو گا کہ جو حلال سمجھ کر اپنی نسبت غیر باپ کی طرف کرے وہ کافر ہے۔

(۴) یہ مطلب نہیں کہ وہ خود کافر ہو گیا بلکہ یہ قول کفر تک پہنچا دے اسکا امکان ہے، مشہور مقولہ ہے المعاصی جریث الکفر،

(۵) بولنے والے پر کفر لازم نہیں آئے گا البتہ تکفیر اس کی طرف لوٹ آئے گی یعنی جب اس نے ہم عقیدہ مسلمان کی تکفیر کی تو گویا خود اس نے اپنی تکفیر کر ڈالی۔

ان ساری تاویلات میں بہتر بات یہ ہے کہ مسلمان کی زبان پر بندش لگانا مقصود ہے کہ کسی کو کافر نہ کہو ورنہ اس جملہ کے کہنے پر گناہ کے سزاوار ہو جاوے گا، اسی قسم کی روایت امام ابو داؤد نے نقل فرمائی ہے، کہ جب کوئی مسلمان کسی مسلمان پر لعنت بھیجتا ہے تو لعنت آسمان پر جاتی ہے جب وہاں دروازہ بند دیکھتی ہے تو اس پر آتی ہے جسے کہا گیا ہے، اگر وہ اس کا مستحق نہیں تو پھر کہنے والے پر لوٹ آتی ہے، یعنی اس کا اثر کہنے والے پر ظاہر ہوتا ہے۔

قوله فيمن ادعى لغير ابيه وهو يعلم انه كافر: ”بخاری کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں صرف کفر ہے جیسا کہ مسلم میں ہے تو اس لحاظ سے بھی یہی تاویل کی جاسکتی ہے، اور دوسری تاویل یہ ہے کہ نعمت و احسان کا انکار مراد ہے، جیسا کہ بکفرون العشير میں کفر سے یہی مراد ہے، بطور زبرد تو بیخ کافر کہنا گیا، یعنی کافروں جیسی اس نے حرکت کی۔

ومن ادعى ما ليس له: بخاری شریف میں من ادعى قوماً ما ليس له منهم نسب ہے یعنی جس نے اپنے آپ کو کسی ایسی قوم کی طرف منسوب کیا جس میں سے وہ نہیں ہے تو وہ کافر ہے لیکن امام مسلم کی روایت عام ہے، بایں طور کہ اس میں برقم کے جھوٹے دعوے شامل ہیں، خواہ اس دعویٰ کا تعلق مال سے ہو یا علم سے یا نسب سے یا نعمت و ولایت سے۔

فليبتوا مقعده: یعنی اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے، اس جملے میں کئی احتمال ہیں، یا تو یہ بددعا ہے جملہ ہے یا صیغہ امر کے اسلوب میں خبر کے معنی میں ہے، اس صورت میں معنی ہو گا کہ اس کی سزا جہنم ہے اگر سزا دی جائے والا یہ کہ معاف کر دیا جائے یا تو یہ سے ساقط ہو جائے تو الگ بات ہے۔

سوال :- یہ تو صحیح ہے کہ کسی کو کافر کہنے والا کافر نہ ہو گا لیکن اس طرح کے الفاظ مثلاً یا کافر یا فاسق وغیرہ کہنے والا شخص حاکم وقت کی طرف سے مستحق سزا ہو گا یا نہیں؟

جواب :- اگر کسی شخص کو کافر یا ہندو زندق، فاجر، فاسق کہہ دیا تو وہ شخص مستحق تعزیر ہے، یعنی حاکم وقت اسے حسب مصلحت کوئی بھی سزا دے سکتا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، شامی ص ۲۰۰/۲ سو”م

## باب بیان حال ایمان من رغب عن ابيه وهو يعلم

اس شخص کے ایمانی حال کا بیان جو جانتے ہوئے اپنے باپ سے پھر جائے اور دوسرے کو باپ بنائے

﴿حدیث ۱﴾ حَدَّثَنِي هُرُؤُ بْنُ سَعِيدٍ الْإِيلِيُّ ..... عَنْ عِرَاقِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا

هُرَيْرَةَ يَقُولُ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ أَبِيهِ فَهُوَ كَفَرٌ،

﴿حدیث ۲﴾ حَدَّثَنِي عمرو الناقد ..... عن أبي عثمان قال: لَمَّا لُذِيَ زِيَادُ لَقِيْتُ أَبَا بَكْرَةَ فَقُلْتُ مَا

هَذَا الَّذِي صَنَعْتُمْ أَنِي سَمِعْتُ سَعْدَ بْنَ وَقَّاصٍ يَقُولُ سَمِعَ أَذْنَاءَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ وَهُوَ يَقُولُ مِنَ الدَّعَى أَبَا فِي الْإِسْلَامِ غَيْرَ أَبِيهِ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرَ أَبِيهِ فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ فَقَالَ

أَبُو بَكْرَةَ وَأَنَا سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ،

﴿حدیث ۳﴾ حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ ..... عَنْ سَعْدِ وَأَبِي بَكْرَةَ كِلَاهُمَا يَقُولُ سَمِعْتُهُ أَذْنَاءَ وَ

وَعَاءَ قُلُوبِي مُحْتَدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرَ أَبِيهِ

فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ، (حدیث (۳) بخاری ص ۱۰۰۱، ۶۷۶۶، مسلم ص ۵۷، ابوداؤد ص ۶۹۷)

**ترجمہ** عراق بن مالک کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے والد کی طرف اشتباہ کرنے سے نفرت نہ کیا کرو، جس شخص نے (صرف فخر و مباہات کیلئے) اپنے والد سے رشتہ توڑا تو یہ بھی کفر ہے، ابو عثمان سے روایت ہے کہ جب زیاد کے بارے میں (ابو سفیان کے لڑکے ہونے کا دعویٰ کیا گیا) اور میری ملاقات ابو بکرہ سے ہوئی تو میں نے دریافت کیا یہ تم لوگوں نے کیا کیا؟ مروان کو ابو سفیان کی طرف منسوب کر دیا؟ میں نے سعد بن وقاص سے سنا ہے وہ فرما رہے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے میرے کانوں نے سنا کہ جو شخص اسلام لانے کے بعد جان بوجھ کر غیر باپ کی طرف نسبت کرے اس پر جنت حرام ہے، اس پر ابو بکرہ نے فرمایا یہ ارشاد میں نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

**مقصد حدیث** سب سے بڑا کفر یہ ہے کہ انسان اپنا رشتہ مخلوقیت خالق سے توڑ کر غیر خالق سے جوڑے اور دوسرے نمبر کا کفر یہ ہے کہ محض بڑائی کی نیت سے رشتہ ابیت اپنے والد کے بجائے غیر والد کیساتھ قائم کرے، اس میں احسان فراموشی کے ساتھ کذب بیانی بھی ہے۔

### زیاد کے نسب پر اعتراض کیوں؟

زیاد ابو بکرہ کے ماں شریک بھائی تھے اور یہ زیاد بن عبید ثقفی کے نام سے مشہور تھے، حضرت امیر معاویہ نے ان کے بارے میں دعویٰ کیا کہ یہ میرے والد ابو سفیان کے لڑکے ہیں، جنگ صفین میں پہلے یہ حضرت علی کے ساتھ تھے، بعد میں حضرت معاویہ کے گروہ میں شامل ہو گئے، ممکن ہے کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت ابو سفیان کا زیاد کی ماں سے ناجائز تعلق رہا ہو اور اسی تعلق سے زیاد پیدا ہوئے ہوں اور جاہلیت میں زمانے سے بھی نسب ثابت ہو تا تھا، اس لئے حضرت معاویہ نے ابو سفیان کا لڑکا کہا تو اس پر ابو عثمان نے ابو بکرہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے گھر میں جاہلیت کی رسم کیوں زندہ ہو رہی ہے؟

حضرت ابو بکرہؓ زیاد کو ان باتوں سے منع کر چکے تھے، اور نہ ماننے پر قطع تعلیق کر لیا تھا، اور قسم کھائی تھی کہ اس سے بات نہ کروں گا ابو عثمان کو ابو بکرہؓ کے اس انکار کی اطلاع نہیں ہوئی اس لئے اعتراض کیا، یا مطلع ہونے کے بعد بھی اس ناگوار بات کا اظہار کر رہے ہوں کہ تمہارے بھائی زیاد نے وہ کام کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ان پر جنت حرام ہے، ادنیٰ بھول پڑھنے کی صورت میں مدعی حضرت معاویہ ہیں اور معروف پڑھنے کی صورت میں بھی، اگرچہ مدعی حضرت معاویہ ہیں لیکن زیاد نے اس دعویٰ کی تصدیق کی اس لئے زیاد کو مدعی بنادیا تھا۔

### توجیہ حدیث

اس حرکت پر جنت کے حرام ہونے کی دعویٰ توجیہ کی جاتی ہے جو عام طور پر اس قسم کی احادیث پر کی جاتی ہے یعنی (۱) جو شخص اس عمل کو حلال سمجھے وہ چونکہ کافر ہو گیا اور جو کافر ہو اس کیلئے جنت حرام ہے، (۲) یا مراد یہ ہے کہ دخول دہلی سے محروم رہے گا کہ اولاً جو لوگ جنت میں داخل ہوں گے ان کے ساتھ نہ جاسکے گا بلکہ اپنے اس جرم کی سزا بھگت کر جاسکتا ہے۔



## باب بیان قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا بیان کہ مسلمانوں کو گالی دینا گناہ ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے

حدثنا محمد بن بکّار بن الزّیّان ..... عن عبد اللّٰہ بن مسعود قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر، قال زبید فقلت لابی وائل انت سبعتہ من عبد اللّٰہ یرویہ عن رسول اللّٰہ ﷺ قال نعم، ولیس فی حدیث شعبۃ قول زبید لابی وائل، (۵)

ترجمہ | حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو برا بھلا کہنا فسق ہے، اور اس سے لڑنا کفر ہے۔

شرح حدیث | سباب المسلم فسوق ایک قول کے مطابق سباب اور سب دونوں ہم معنی لفظ ہیں، بعض کے بقول لفظ سب میں معنی کی زیادتی پائی جاتی ہے، یعنی ایسی گالی جو اس میں پائی جائے اور کچھ نہ پائی جائے، فسق کے معنی خدا اور رسول کی اطاعت سے نکل جانا۔

قتالہ کفر الخ: یہاں کفر فسوق کے مقابلے میں ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قتال مومن موجب کفر ہے، مگر یہ مراد نہیں، علماء نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ قتال پر کفر کا اطلاق زجر و تہدید کیلئے ہے کیونکہ قتال کو بھی فسق ہی کہا جاتا ہے، تو سب دشم اور قتال دونوں قباحت میں مساوی ہو جاتے، حالانکہ قتال کی قباحت گالی، گورج سے کہیں زیادہ ہے، اسی قباحت کو واضح کرنے کیلئے کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث کی یہ تعبیر قرآنی آیت من قتل مؤمناً متعمداً الخ سے ملتی جلتی ہے۔



## بَابُ بَيَانِ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ

حدثنا ابوبكر بن ابي شيبة و محمد بن مثنى وابن بشار جميعاً عن جرير قال: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم في حجة الوداع استنصت الناس ثم قال لا ترجعوا بعدي كفراً يضرب بعضكم رقاب بعض، وفي رواية ويحكم او قال ويلكم لا ترجعوا بعدي كفراً

ترجمہ | حضرت جریر کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ لوگوں کو خاموش کرو، پھر آپ نے فرمایا کہ میرے بعد پھر کافروں کی حرکتیں نہ کرنے لگنا کہ آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

تشریح

حجۃ الوداع کے موقع پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تاریخی خطبہ دیا وہ کتب احادیث میں ابواب کی مناسبت سے آگے آتے رہیں گے یہاں اس کا ایک جملہ مذکور ہے۔  
”اولاً آپ نے حضرت جریر سے فرمایا استنصت الناس، یعنی لوگوں کو خاموش کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عوام اور محققین پر علماء کے کلام و خطاب کے وقت سکوت لازم ہے، کیونکہ یہ وارثین نبی ہیں نیز جس وقت حدیث پڑھی جائے اس وقت بھی خاموش رہنا واجب ہے، فقہاء کرام نے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے کہ عیدین و جمعہ اسی طرح نکاح کے خطبہ کو سناوا واجب ہے۔“

حضرت سفیان ثوری کا قول مشہور ہے کہ علم کے پانچ درجے ہیں سب سے پہلے استماع، پھر انصات، پھر یاد کرنا، پھر اس پر عمل کرنا اور اسکے بعد نشر و تبلیغ۔“

تشریح

پہلی حدیث حجۃ الوداع کے موقع کی ہے، حضرت جریر سے آپ نے فرمایا کہ لوگوں کو خاموش کرو، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میرے بعد کفر کی طرف مت لوٹ جانا۔  
”بعدي“ کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ منی کے میدان سے الگ ہونے کے بعد ایسا نہ کریں جتنا اور دوسرا مطلب کہ میری موت کے بعد ایسا نہ کرنا۔

توجیہ بہ حدیث

(۱) کافر ہونے کی ایک صورت یہ بتائی جا رہی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو مطلب یہ ہے کہ تم پر مسلمانوں کا حق ہے تم بجائے اس کا حق ادا کرنے کے اس کو قتل کرنے لگو، یہ سراسر ناپاسی، ناشکری ہے، اسی حق ناپاسی کو کفر سے تعبیر کیا گیا، غرض کافر کہنا تقویٰ معنی کے اعتبار سے ہے نہ کہ حقیر۔  
(۲) امام نووی نے خطاب کے حوالہ سے یہ توجیہ بھی نقل کی ہے کہ کافر اس صورت میں ہو گا جبکہ ایک دوسرے کی تکفیر



کر کے باہمی قتل کو مباح سمجھ بیٹھے، (۳) اس سے مراد یہ ہے کہ میرے بعد ایسا عمل، قتل و قتال مت کر لینا، جو کفر اور سوء خاتمہ تک پہنچا دے (۴) یا یہ مراد ہے کہ کافر کی مشابہت مت کرنا، کہ قتل و خونریزی کافروں کا فعل ہے، قاتل کو کفار سے مشابہت ہو جاتی ہے، (۵) کفر کے ایک معنی لبس کے ہیں اس لحاظ سے معنی ہوگا "لابسین السلاح" یعنی میرے بعد ہتھیار مت لیٹا، (۶) یا یہ کہ "کفرون کفر" کے قبیل سے ہے، یعنی یہ کفر خلودنی النار والے کفر سے کتر درجہ کا کفر ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ "دون" کے دو معنی، ایک معنی ادنیٰ یعنی وہ کفر جو کفر حقیقی سے ادنیٰ ہو، گویا کفر کی دو قسم ہے اعلیٰ ادنیٰ، اعلیٰ وہ جس سے انسان مذہب سے نکل جاتا ہے، اور ایک ادنیٰ یہ بھی ایک قسم کا کفر ہے، لیکن اس کا مرتکب مذہب سے نہیں نکلتا تو اس قسم کا کفر مراد ہے، دوسرا معنی "دون" کے اقرب کے ہیں یعنی کفر کے قریب پہنچ گیا، تو اس صورت میں حاصل یہ نکلے گا کہ کفر کے مختلف درجات ہیں ایک کفر وہ جو داعی جہنم میں پہنچانے کا ذریعہ بنے، دوسرا وہ کفر جو جہنم میں تو نہیں لے جائے گا، مگر کفر اول کے قریب کر دے گا، تو یہ عمل کفر کے قریب کر دے گا۔

و یحکم او ویلکم: "قاضی عیاض" کہتے ہیں کہ یہ دونوں لفظ مقام تعجب یا بموقعہ درد مستعمل ہوتے ہیں، امام سیبویہ کا خیال ہے کہ جو شخص ہلاکت میں پڑ جائے، اس کے لئے دلیل کہتے ہیں، اور روح مقام ترحم کے موقعہ پر اس شخص کے لئے جو ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو، غرض ان دونوں سے شفقت اور تعجب مقصود ہے، نہ کہ بددعا۔ ہر دو کا قول امام نووی نے یہ نقل کیا ہے کہ وہ لفظ ایسے شخص کیلئے بولتے ہیں جو کسی ایسی معیبت میں پڑ جائے جس کا وہ مستحق نہ ہو، اور دلیل اسکے لئے جو اس کا سزاوار ہو، تو روح سے مقصود ترحم ہو گا لیکن دلیل سے نہیں۔"م

## باب اطلاق اسم الکفر علی الطعن فی النسب والنیاحة

نسب میں طعن دینے والے اور فوج کرنے والے پر کفر کا اطلاق

عن ابی ہریرۃ قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اثنان فی الناس لهما بہم کفر الطعن

فی النسب والنیاحة علی المیت، (مسلم ص ۵۸، احمد ۱۹۶/۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو چیزیں لوگوں میں کفر کی ہیں ایک نسب میں طعن دینا، دوسری

میت پر چلا کر دنا۔

نسب میں طعن دینا یہ ہے کہ کسی کی ذات پر دھبہ لگانا کہ وہ شریف خاندان کا نہیں یا یہ کہ اس کا خاندان شریفانہ نہیں، یا یہ کہ لوٹڈی اور ولد الزنا ہے۔

در حقیقت یہ زمانہ جاہلیت کا تصور ہے کہ اپنے نسب پر فخر اور دوسرے کے نسب پر طعن و تشنیع کیا جائے اس لئے اس کی قہارت و شاعت زیادہ سے زیادہ بٹھانے کیلئے کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

نوحہ خوانی یہ ہے کہ میت کے مرنے کے بعد اسکے اوصاف بیان کر کے رونایہ بھی ممنوع ہے، ان دونوں حرکت کو کفر سے تعبیر کیا گیا، اسکے متعلق علامہ نووی لکھتے ہیں (۱) یہ دراصل دونوں عمل کافروں کا عمل ہے (۲) یہ اس لئے کہ ان کاموں کو حلال سمجھ کر کرے تو بلاشبہ کفر ہے (۳) یا یہ کہ یہ دونوں عمل میں بھی یہ خاصیت ہے کہ کفر تک پہنچا دینے والے ہیں۔

## باب تسمية العبد الأبق كافرا

بھاگے ہوئے غلام کو کافر کہنے کا بیان

حدیث ۱۰۱۲: حَدَّثَنِي عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ السَّعْدِيُّ ..... عَنْ جَرِيرٍ أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُولُ أَيْمًا عَبْدٌ أَبْقٍ مِنْ مَوَالِيهِ فَقَدْ كَفَرَ حَتَّى يَرْجَعَ إِلَيْهِمْ، قَالَ مَنْصُورٌ، قَدْ وَاللَّهِ رَوَى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنِّي أَكْثَرُهُ أَنْ يَرَوِيَ عَنِّي هَهُنَا بِالْبَصْرَةِ وَفِي رِوَايَةٍ عَنْ جَرِيرٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيْمًا عَبْدٌ أَبْقٍ فَقَدْ بَرَأَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ، وَفِي رِوَايَةٍ كَانَ جَرِيرٌ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا أَبْقَ الْعَبْدُ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَواتُهُ، (مسلم شریف ص ۵۸، ابوداؤد، نسائی ۱۰۱۲/۷)

ترجمہ: حضرت جریر بیان کرتے ہیں کہ جو غلام اپنے آقاؤں سے بھاگ کر چلا جائے تو وہ کافر ہو جاتا ہے، جب تک کہ وہ پھر اسکے پاس واپس نہ آجائے، منصور کہتے ہیں کہ جریر نے اس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے بیان کیا، لیکن مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میری طرف نسبت کر کے یہ روایت بصرہ میں بیان کی جائے، ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہو جاتا ہے، ایک روایت میں ہے کہ اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔

شرح حدیث: سب سے بڑا کفر یہ ہے کہ انسان اپنا رشتہ مخلوقیت خالق سے توڑ کر غیر خالق سے جوڑے اسی کے قریب وہ غلام ہے جو اپنے آقا اور مالک کو چھوڑ کر بھاگ جائے یا رشتہ موالیات اپنے مالک کے سوا غیر کے ساتھ قائم کرے۔

غلام پر اللہ نے ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ مولیٰ کی خدمت کیا کرے، اگر وہ بھاگ جائے تو یہ بھی ایک طرح حق ناسپاسی ہے اور محسن مجازی کی ناشکری ہے، اور اسکے احسان کا انکار ہے، گویا کفر کا لغوی معنی ناشکری مراد ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کفر شرعی ہو تو محض مولا کے پاس لوٹ آنے سے کفر ختم نہیں ہوتا، بلکہ تجدید اسلام ضروری ہوگا۔

برئت منه الذمة النخ: اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مولیٰ پر شریعت نے مروت و ہمدردی اور حسن سلوک کی ذمہ داری ڈالی ہے، غلام کے بھاگ جانے سے وہ ذمہ داری مولیٰ کی ختم ہو جاتی ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حفظ و امان سے نکل جائے گا۔

قوله لم تقبل له صلواته: قبول دو معنی میں مستعمل ہے، ایک قبول اصابت دوسرے قبول اجابت، قبول اصابت کا مطلب یہ ہے کہ کون الشئی مجتمعا بجميع الشرائط والارکان، اس معنی کے لحاظ سے یہ صحت و وجوب کا مترادف ہے، اور اس کا نتیجہ دنیاوی اعتبار سے فراغ ذمہ ہے۔

اور قبول اجابت کا مطلب ہے "وقوع الشئی فی حیض مرضاة الرب" اس کا نتیجہ آخرت کا ثواب ہے، قرآن و حدیث میں یہ لفظ دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے، یہاں بالاتفاق قبول اجابت مراد ہے یعنی قبولیت کی نفی ہے صحت کی نہیں، یعنی خوشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرے گا، یعنی اس پر ثواب مرتب نہیں ہوگا، البتہ فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ نماز کی صحت پر ثواب ملے گا، بھاگنے کا گناہ الگ ہو گا یہی حکم ارض مخصوبہ کا ہے کہ

نماز ہو جاتی ہے مگر ثواب نہیں ملتا۔“

قوله قال منصور قد والله روى عنى النبى صلى الله عليه وسلم الخ: مقصد یہ ہے کہ منصور راوی نے اس روایت کو موقوفاً ذکر کیا، حالانکہ ان کا حلیہ بیان ہے کہ یہ روایت مرفوع ہے مگر مرفوع ہونے کی تصریح اس لئے نہیں کی کہ بصرہ کے خوارج اور معتزلہ اس حدیث کو میرے حوالے سے مرفوعاً نقل کریں گے، اور اہل معاصی کے مقلد فی النار ہونے پر استدلال کریں گے، میں نہیں چاہتا کہ معتزلہ خوارج کی تائید کے لئے اس قسم کا مواد فراہم کروں، مگر چونکہ ان کا استدلال ظاہر الفاظ سے ہی ہوگا، مگر میں اتنا موقع بھی دینا نہیں چاہتا۔

## باب بیان کفر من قال مطرنا بالنوء

اس شخص کے کفر کا بیان جو یہ کہے کہ ہمیں ستاروں کی گردش نے پانی دیا

عن زيد بن خالد الجهني قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة الصبح بالحديبية في إثر سماء كانت من الليل فلما انصرف أقبل على الناس فقال هل تذكرون ماذا قال ربكم قالوا الله ورسوله اعلم قال: قال أصبح من عبادي مؤمنٌ بي وكافرٌ، فاتا من قال مطرنا بفضل الله ورحمته فذلك مؤمنٌ بي وكافرٌ بالكوكب، واتا من قال مطرنا بنوء كذا وكذا فذلك كافرٌ بي مؤمنٌ بالكوكب، وفي رواية ان اباهريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألم تروا ما قال ربكم عز وجل قال ما انعمت على عبادي من نعمتي إلا أصبح فريقٌ بها كافرين يقولون الكوكب والكوكب، وفي رواية عن ابى هريرة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ما انزل الله من السَّمَاء من بَرَكَةٍ إلا أصبح فريقٌ من الناس بها كافرين ينزل الله الغيث فيقولون الكوكب كذا وكذا، وفي رواية قال مطر الناس على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال النبي صلى الله عليه وسلم أصبح من الناس شاكِرٌ ومنهم كافرٌ قالوا هذه رحمة الله وقال بعضهم لقد صدق نوء كذا وكذا قال فنزلت هذه الآية قَلَّا أَقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ حَتَّىٰ بَلَغَ "وَتَجْعَلُون رِزْقَكُمْ أَنْكُمْ تَكْفُرُونَ"، (۱)

ترجمہ حضرت زید بن خالد جہنی کہتے ہیں کہ شب کو بارش ہو چکی تھی، اس کی صبح کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام حدیبیہ میں ہم لوگوں کو نماز پڑھائی جب نماز سے فارغ ہو چکے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے، کچھ جانتے بھی ہو؟ تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ سب نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں، آپ نے فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ آج میرے بندوں میں ایک گروہ کی صبح ایمان پر ہوئی اور ایک کی کفر پر، جس نے یہ کہا کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے پانی برسا وہ ہم پر ایمان لایا اور ستاروں کا منکر ہوا، اور جس نے یہ کہا کہ فلاں فلاں ستاروں کی وجہ سے پانی برسا وہ ہمارا منکر ہو گیا، اور ستاروں پر ایمان لے آیا، حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کیا وہ بات تمہیں معلوم نہیں جو تمہارے رب نے فرمائی اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب بھی اپنے بندوں پر اپنی نعمت نازل کرتا ہوں تو ایک گروہ اس کے صبح کے وقت منکر ہو جاتے ہیں، اور ستاروں کی باتیں کرنے لگتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بارش ہوئی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کچھ تو صبح کی، خدا کا شکر کرتے ہوئے، اور کچھ لوگ ناشکرے ہوئے، شکر گذاروں نے کہا یہ تو خدا کی مہربانی ہے اور بعض لوگوں نے کہا فلاں فلاں ستاروں کا اثر ٹھیک ظاہر ہوا، اس پر یہ آیت اتری فلا اقسم بـمواقع النجوم، لفظ نوع کی تحقیق و مصداق

نوع کے متضاد معنی ہیں یعنی طلوع اور غروب، ناء ینوء، نوء باب نصر ینصر، اجوف ولوی مہموز الہام بمعنی غاب اور طلع، آسمان پر اٹھائیں ستارے ہیں جو پورے سال میں مخصوص اوقات اور مخصوص مقامات میں نکلتے اور ڈوبتے ہیں ہر تیرہ رات میں مغرب میں طلوع صبح صادق کیساتھ ایک ستارہ ڈوبتا ہے اور اسی وقت مشرق میں دوسرا طلوع ہوتا ہے، طلوع و غروب کے وقت بارش ہو جانے پر مشرکین مکہ بارش کو غروب ہونے والے ستاروں کی طرف منسوب کرتے تھے، اصمعی کا خیال ہے کہ طلوع ہونے والے ستارے کی طرف منسوب کرتے تھے زجاج نے لکھا ہے کہ غروب ہونے والے ستارے کو انوار اور طلوع ہونے والے ستارے کو بوارج کہتے ہیں۔

**شرح حدیث**۔ اس حدیث میں ان ستاروں کو بارش کیلئے مؤثر بالذات سمجھنے کے غلط عقیدہ کو باطل کرنا مقصود ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی کمزور طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے، قدرت نے عالم اسباب میں مسببات کو اسباب کے ساتھ جوڑ رکھا ہے، اسباب محض ایک واسطہ ہے، جو انسان کی تسلی کیلئے مسبب کو اس سے وابستہ کر رکھا ہے، مؤثر حقیقی اللہ کی ذات ہے اسی لئے معمولی معمولی اور کمزور سے کمزور تر اسباب سے اللہ تعالیٰ بڑے بڑے مسببات کو رد نما کر دیتا ہے، شریعت نے انسان کو اسباب و وسائل اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، مگر اس کی تاکید کر دی گئی ہے کہ مؤثر سوائے خدا کے کسی کو نہ سمجھو، اور اس حقیقت کو اتنا ذہن نشین کر لیا ہے کہ اس سے بعض کو تاہ نظر کو یہ شبہ گزرنے لگا کہ شاید دین اسلام سلسلہ اسباب ہی کا منکر ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں پر صرف وہم پرستی ہو وہاں ایسا ہی ہونا چاہئے، اگر ایسے مقامات پر شریعت تعبیرات میں اتنی شدت اختیار نہ کرتی تو جو قوم مخلوقات کی ہی تاثیر میں الجھ کر رہ گئی تھی وہ مؤثر حقیقی تک کیسے پہنچتی عرب میں اپنے حقیقی خالق کی طرف کیا کشش باقی رہ جاتی، اس لئے اس قسم کے مقامات پر مؤثر حقیقی کا اثر ذہن نشین کرانے کیلئے زیادہ سے زیادہ پر زور الفاظ استعمال کئے گئے تاکہ جاہلیت کا غلط نظریہ ذہن سے نکل جائے،

### اسباب کی طرف نسبت موجب کفر کب؟

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں اسباب عادیہ میں کوئی نہ کوئی خدا داد اثر ہے، مثلاً پانی میں رطوبت و برودت کا اثر بارشیں حرارت و احراق کا اثر، بد بھڑ حسا ثابت ہے، اس کا اقرار یہ شان ایمان کے خلاف نہیں، ہاں ان اسباب کو مجبور بالذات سمجھنا کفر ہے۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ بارش کی نسبت ستاروں کی طرف اسی اعتقاد کے ساتھ کی جائے تو صریح کفر ہے اور اگر بارش

کی نسبت ستاروں کی طرف صرف ایک علامت کے طور پر کی جائے تو کفر نہیں لیکن پھر بھی ایسے لفظ کے استعمال کرنے کی ضرورت کیا ہے جو کفر اور غیر کفر دونوں کا محتمل ہو، اور کم از کم شعائر جاہلیت سے مشابہت تو ضرور رکھتی ہے،

### توجیہ حدیث

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ روایت میں کفر حقیقی اور کفر مجازی یعنی ناشکری دونوں کا احتمال ہے اور دونوں کی تائید روایات سے ہوتی ہے، کفر حقیقی ماننے کی صورت میں فیصحبوا مشرکین جیسے الفاظ دلیل ہیں، تاہم یہ اس وقت ہے جبکہ ان ستاروں کو مؤثر بالذات تسلیم کیا جائے۔

اور کفر یعنی ناشکری، تو اسکی تائید نسائی کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جس میں کفر نعمتی کا لفظ ہے یہ اس وقت ہوگا جبکہ مؤثر بالذات نہ سمجھے۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ عرب دو طرح کے تھے بعض مؤثر بالذات سمجھتے تھے، اور بعض تجربہ کے طور پر محض علامت سمجھتے تھے، پہلی قسم کو کفر و شرک سے تعبیر کیا، اور دوسری قسم کے افراد کے حق میں کفر ان نعمت کے معنی میں استعمال کیا، وہ فرماتے ہیں کہ لفظ کفر کا یہاں دونوں محمل اس لئے اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ عرب کے دونوں طبقہ کو شامل ہو۔ "م

اشکال :- یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ جب تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آسمانی سیارات بعض چیزوں کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں یا یہ چیز فلاں سیارہ کی بنا پر پیش آتی ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ جبکہ ڈاکٹر خود مریض کی ایک کیفیت کو دیکھ کر آئندہ پیش آنے والے حالات کی خبر دیتا ہے اسی طرح کسی مرض کے متعلق کہہ دیتا ہے کہ فلاں سبب سے یہ بات پیش آئی ہے تو یہ نہ مذموم ہے اور نہ اس کی ممانعت، تو اسی طرح اگر سبب کے درجہ میں اگر نجومی بتا دے تو مذموم نہ ہونا چاہئے؟

جواب :- یہ ممکن ہے کہ تجربہ سے ثابت ہو کہ فلاں سیارہ فلاں کام کے لئے سبب ہے، لیکن اس کی کوئی دلیل یقینی نہیں، کہ سیارہ کسی بھی کام کے لئے سبب یا علت ہو، یا کسی کی سعادت یا نحوست کی علت ہو، نہ تو حسی طور پر اور نہ عقلی طور پر اور نہ سماجی طور پر کسی طرح بھی نہیں، حقائق ظاہر ہے سیارے عقلا اس کے سبب نہیں کہے جاسکتے کہ علم نجوم کا معاملہ سراسر ظن و تخمین پر ہے کیونکہ اس کے جو اصول و ضوابط ہیں وہ سراسر عقل و ظن پر مبنی ہیں اور ظاہر ہے جس شے کا نام ار ظن پر ہو اس کو سبب کیونکر کہہ سکتے ہیں، شرعاً اس لئے اس کو سبب نہیں کہہ سکتے کہ شریعت اس قسم کے توہمات کی اجازت نہیں دیتی، نیز ڈاکٹر جن علامتوں کو دیکھ کر کسی چیز کی خبر دیتا ہے تو اس میں فساد عقیدہ کا خطرہ نہیں جبکہ سیاروں کو سبب ماننے میں یا تو فساد عقیدہ ہے یا پھر اس کا خطرہ اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں فنزلت "فلا اقسّم بمواقع النجوم" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کل یہ آیت اس موقع پر اتری بلکہ اس موقع پر صرف وتجعلون رزقکم انکم تکذبون ہی کا ذکر ہے۔

آیت میں رزقکم کی تفسیر عبداللہ بن عباسؓ نے "شکرکم" سے کی ہے، مواقع النجوم سے ستاروں کے مطالع اور بعض کے نزدیک مغارب مراد ہیں، اور بعض اس کے مہم پڑنے اور بعض نے اس کے پھیلنے کو مراد لیا ہے، اور بعض نے تو نجوم قرآن مراد لیا ہے۔ "م

### سیارہ کے ساتھ توہم پرستی کیوں؟

فائدہ :- "گندہ زمانوں میں جب تک آلات اور خوردبین مشینیں نہیں بنی تھیں اس وقت تک کسی بھی چیز کو پرکھنے

کامعیاں آنکھ تھی، جب حکماء قدیم نے دیکھا کہ آسمان پر چمکتے سیارے لگے ڈوبنے، اگلے سے زمین کے حالات میں تبدیلی آتی ہے تو یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ سیارے عقل و نفس رکھتی ہے، پھر یہ کہ ان سیاروں کا حجم اور سائز حیرت انگیز حد تک بڑا ہے، مثلاً پانچ سیارے مشہور ہیں عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ، زحل۔ ان میں مشتری ہماری زمین سے ہزار حصے بڑا ہے، اور اس کا قطر نو لاکھ میل ہے، زحل زمین سے تقریباً چھ سو درجے بڑا ہے، اور اس کا قطر اتنی ہی ہزار میل ہے، چاند کا قطر دو ہزار میل سے زیادہ ہے۔

پھر آفتاب جو ان سیاروں کا مرکز ہے وہ زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے، اور زمین سے نو کروڑ چھپیس لاکھ میل بعد رکھتا ہے، گویا کہ آفتاب کو منکے کے برابر مانا جائے تو یہ زمین ایک مڑکے دانے کے برابر مانا ہوگا، لیکن یہ زمین اٹھاون ہزار میل ایک گھنٹہ میں گھومتی ہے، ان سیاروں کے اس عظیم حجم سے مرعوب ہو کر کفار نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یقیناً یہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ طاقت و قوت رکھتے ہیں، جو کسی کو بھی نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں، لیکن یہ تصور سراسر توحید کے خلاف ہے، کیونکہ اصل طاقت و قوت انہی سیاروں کے خالق کے پاس سے ہے، لہذا موثر حقیقی اس کو مانو نہ کہ مخلوق کو جو اپنی ہر حرکت میں خالق کا محتاج ہے۔“

## باب الدلیل علی ان حب الانصار وعلی رضی اللہ عنہم من الایمان وعلاماتہ، وبغضہم من علامات النفاق

انصار اور حضرت علیؑ سے محبت رکھنا، ایمان میں داخل ہے اور ان سے بغض نفاق کی علامت ہے

(۱) عن عبد اللہ بن عبد اللہ بن جبر قال سمعت انساً قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آية المنافق بغض الانصار و آية المؤمن حب الانصار،

(۲) وفي رواية: عن انس رضي الله عنه عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم انه قال حب الانصار آية الايمان وبغضهم آية النفاق،

(۳) وفي رواية عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم انه قال في الانصار لا يحبهم الا مؤمن ولا يبغضهم الا منافق من احبهم احب الله ومن ابغضه ابغض الله،

(۴) وفي رواية: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا يبغض الانصار رجل يؤمن بالله واليوم الآخر،

(۵) وفي رواية: قال عليؑ والذي فلق الحبة وبرأ النسمة انه لعهد النبي صلی اللہ علیہ وسلم إلى ان لا يحبني الا مؤمن ولا يبغضني الا منافق،

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ انصار سے بغض رکھنا منافق کی پہچان ہے، اور انصار سے محبت رکھنا مومن کی پہچان ہے۔

اور ایک روایت میں انصار کی محبت کو ایمان کی نشانی اور بغض انصار کو نفاق کی نشانی بتایا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انصار سے کوئی محبت نہیں رکھے گا مگر مومن، اور ان سے بغض نہیں رکھے گا، مگر منافق، جو ان سے محبت رکھے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ تعالیٰ بھی ان سے بغض رکھے گا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ انصار سے بغض نہیں رکھے گا، اور ایک روایت میں ہے حضرت علیؓ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے درخت سے دانہ پیدا کیا، اور جس نے جاندار کو پیدا کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ مجھ سے یعنی علی سے مسلمان ہی محبت کریں گے، اور مجھ سے منافق بغض رکھیں گے۔

انصار ناصر کی جمع، جیسا کہ اصحاب صاحب کی جمع ہے، یا یہ کہ نصیر کی جمع ہے جیسا کہ شریف کی جمع اشرف ہے، مراد اوس و خزرج کے قبائل ہیں، جنکا علم ہی انصار ہو گیا تھا۔

مہاجرین تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ اور خاندان کے افراد تھے، انصار نے غیر ہو کر جو آپ کی مدد کی اس کو خدا کے رسول سے محبت کے سوا اور کیا جذبہ کہا جاسکتا ہے، اس لئے ہر موقع پر آپ بھی ان سے محبت آمیز کلمات فرما کر ان کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے، اور یہ بتلایا کرتے کہ خدا کے رسول کو ان کی اس جانثاری کی کتنی قدر ہے، اسی طرح حضرت علیؓ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قرب اور دین کے لئے ان کی جو قربانیاں ہیں اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ اس ہستی سے محبت کی جائے گویا انصار و علی سے محبت کے لئے رسول کی ذات کو سامنے رکھنا چاہئے، تو ان کی محبت خود بخود پیدا ہو جائے گی جیسا کہ رسول کی محبت، خدا کی ذات کے پیش نظر رکھنا چاہئے۔

### انصار سے محبت کی وجہ

خلاصہ یہ کہ حضرات انصار اور اہل بیت وغیرہ نے اسلام کی اشاعت میں جو قربانیاں پیش کی ہیں ان سے محبت رکھنا، دین و ایمان سے محبت کی دلیل ہے، اور ان لوگوں سے بغض دین و ایمان سے بغض کی علامت سمجھی جائے گی۔

کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب کسی شئی پر حکم ہوتا ہے تو مشتق منہ اس حکم کی علت ہوتی ہے، جیسے السخی حبیب اللہ، کہ سخاوت علت محبوبیت ہے اسی طرح جب یہ کہا گیا کہ دین کے مددگاروں سے محبت علامت ایمان ہے تو اس کا مطلب یہی نکلا کہ دین کے معاون ہونے کی بنا پر محبت رکھنا علامت ایمان ہے، اور اسی حیثیت سے ان سے بغض رکھنا علامت نفاق ہے۔

### چند اشکال

سوال :- ”یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نصرت و مدد کی بنا پر انصار سے محبت کو علامت قرار دیا گیا تو مہاجرین نے بھی تومد کی تھی پھر ان سے محبت کو علامت ایمان کیوں نہیں کہا گیا؟“

جواب :- چونکہ ہجرت کی فضیلت ظاہر تھی رضاء الہی کے لئے ان حضرات نے وطن مال اقرباء سب کچھ خیر آباد کر دیا تھا، راحت و آسائش کو چھوڑ دیا تھا، اس طرح ان کی عظمت لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو چکی تھی اس کے اظہار کی حاجت نہ تھی، لیکن انصار نے جو کچھ کیا وہ وطن میں رہتے ہوئے اس لئے ان کے مناقب کو اجاگر کرنے کیلئے گویا جب ان کی محبت

ایمان کی علامت ہے تو پھر مہاجرین سے محبت بدرجہ کوئی علامت محبت ہوگی۔

سوال :- لیکن یہاں ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے آیۃ الایمان حبّ الانصار مبتدا و خبر دونوں معرفہ ہیں اور دونوں کی تعریف مفید لکھر ہوتی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جس کے دل میں انصار کی محبت نہ ہو وہ مومن نہیں؟ حالانکہ ایسا نہیں اس کے چند جوابات دیئے گئے ہیں :

- (۱) حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس دور کے لحاظ سے تھا جس میں منافقین انصار کے کارناموں کو دیکھ کر چلتے تھے،
- (۲) اس حدیث میں ان کی محبت کو علامت ایمان قرار دیا گیا ہے جبکہ علامت اور علت میں بڑا فرق ہے، کیونکہ علت تامہ کے وجود اور عدم پر معلول کا وجود اور عدم موقوف ہوتا ہے لیکن علامت کے وجود پر یا عدم پر دو علامت کا وجود یا عدم موقوف نہیں ہوتا، بلکہ یہ محض نشانی ہوتی ہے، تو محبت کا نہ ہونا علامت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایمان ہو گا ہی نہیں۔
- (۳) انصار کی محبت کو من حیث النصرۃ ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس حیثیت سے انصار کی محبت ایک مومن کو ہی ہو سکتی ہے، لہذا اس پر کوئی ناشکال نہیں۔

سوال :- یہاں بغض انصار کو علامت نفاق قرار دیا لیکن علامت کفر قرار نہیں دیا حالانکہ تقابل کا تقاضا تو یہ تھا کہ علامت کفر کہا جاتا؟

جواب :- ضابطہ یہ ہے کہ دو متضاد چیزوں کے درمیان امتیاز کیلئے علامت بتائی جاتی ہے، اور کافر مجاہد کا کفر ظاہر ہوتا ہے اس لئے امتیازی علامت کی ضرورت نہیں لیکن چونکہ منافقین مسلمانوں ہی میں رہتے تھے اس لئے علامت کی ضرورت تھی، پھر یہ کہ وہ ظاہر میں مسلمان تھے اس لئے آیۃ الکفر کہنا جانا درست نہ ہوتا۔

سوال :- اگر کوئی شخص ان حضرات انصار سے بغض رکھے تو کیا اس کو منافق کہا جاسکتا ہے؟

جواب :- اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بغض کی علت نصرت دین ہے تب تو یقیناً یہ نفاق حقیقی کے مترادف ہے، اور اگر بغض کی وجہ کچھ اور ہے تو پھر جزو تہدید کے طور پر منافق کہا گیا، علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ کبھی سے بغض علامت نفاق ہے کسی ایک سے کسی خارجی بناؤ پر بغض رکھنا نفاق کی علامت نہیں، حافظ ابن حجرؒ نے اسی کو پسند کیا ہے۔ ”م

❦ **حَدِیْثُ** ❦ عَنْ زَبْرِ قَالَ: قَالَ عَلِيٌّ وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسْعَةَ اِنَّهُ لَعَنَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى اَنْ لَا يُجِئْنِي الْاُمُوْمَنُ وَلَا يُبَغِضُنِي اِلَّا مُنَافِقٌ.

ترجمہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ تم سے اس ذات کی جس نے دانہ چیرا اور جان بتائی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ مجھ سے نہیں محبت رکھے گا مگر مومن اور دشمنی نہیں رکھے گا مگر منافق۔

حبۃ کے معنی دانہ، برأ کے معنی خلق، نسعہ کے چند معانی ہیں: انسان، نفس، امام اہل بیتؑ فرماتے ہیں کہ نسعہ کا اطلاق ہر اس مخلوق پر ہوتا ہے جس میں روح ہو تو گویا ذی روح کے معنی کیا جائے،

اس حدیث کے تحت علامہ قرطبی نے منہم میں اشارہ کیا ہے کہ حضرت علیؑ سے بغض و عناد اگر اس بناؤ پر ہے کہ ان کو کائنات کے سردار سے وہ قرب کیوں حاصل ہے؟ اور انہوں نے دین حق کی اتنی نصرت کیوں کی؟ اگر یہ صورت ہے تب تو



نفاق ہے، لیکن اگر کوئی خارجی سبب ہو تو ہے تو مذموم لیکن اس شخص کو منافق نہیں کہا جائے گا، اسی سے اس جنگ کے متعلق واضح ہو گیا کہ جب حضرت علیؑ اور حضرت عائشہؓ یا حضرت معاویہ کے درمیان جنگ ہوئی تو کسی نے کسی کو منافق نہیں کہا، کیونکہ نفاق کی علت یہاں نہیں پائی گئی۔

اب ایک طالب علم کے ذہن میں ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ کے درمیان اس طرح کے واقعات کیونکر رونما ہوئے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان حضرات کا ارادہ جنگ و جدال کا نہیں تھا بلکہ ہر ایک کے سامنے کوئی شرعی قانون یا شرعی مصلحت تھی، لیکن منافقین نے اس کو جنگ کی صورت بنا دی، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مشاجرات صحابہ۔

## باب نقصان الایمان بنقص الطاعات و بیان اطلاق لفظ الکفر علی غیر الکفر

عبادت کی کمی سے ایمان کا گھٹنا، اور ناشکری پر کفر حقیقی کے علاوہ لفظ کفر کا استعمال کرنا

حدثنا محمد بن رافع عن عبد الله بن عمر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال: يا معشر النسل! تصدقوا و اكثروا الاستغفار فاني رأيتكم اكثر اهل النار فقالت امرأة منهم بزلة، وما لنا يا رسول الله اكثر اهل النار قال تكثرون اللعن، وتكثرون العشيير ما رأيتم من ناقصات عقل ودين اغلب لدي لب منكم، قالت يا رسول الله وما نقصان العقل والدين؟ قال اما نقصان العقل فشهادة امرأتين تعدل شهادة رجل فهذا نقصان العقل وتمكث الليالي ما تصلي وتطهر في رمضان فهذا نقصان الدين، (۵)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عورتوں کی جماعت! تم لوگ صدقہ کیا کرو، اور کثرت سے استغفار کرو، کیونکہ میں نے تم لوگوں کو مردوں کے مقابلہ میں جہنم میں زیادہ دیکھا، یہ سکر ایک سمجھدار عورت بولی کہ عورتوں کے بکثرت جہنم ہونے کے کیا اسباب ہیں؟ آپ نے فرمایا تم لوگ بکثرت لعن کرتی ہو، اور محسن کے احسان کا انکار کر بیٹھتی ہو، عقل و دین کے ناقص ہونے کے باوجود عقلمندوں پر بھی غالب آجاتی ہو، انہوں نے دریافت کیا کہ ہمارے اندر عقل و دین کا نقصان کس طرح ہے؟ تو آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہونا، نقصان عقل کی دلیل ہے اور (حیض کے ایام میں) نماز نہ پڑھنا اور (حیض کی وجہ سے) رمضان کے روزے نہ رکھنا یہ دین کے کم ہونے کی دلیل ہے۔

### مقصد باب

ہام مسلم علیہ الرحمہ نے مختلف شعبہ ایمانی پر گفتگو کی ہے اور اس کے اعلیٰ و اعلیٰ شعبوں کو شمار کیا ہے اسی طرح ایمان کے

مقابل کفر کے مختلف شعبوں پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں، (جس کو امام بخاری نے کفر زون کفر سے تعبیر کیا ہے) کہ جس طرح ایمان کے شعبوں پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح کفر کے بعض شعبوں پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، جیسے شوہر کے حقوق اور احسانات کا انکار، ترک نماز وغیرہ غرض بہت دور تک کفر کے شعبوں پر گفتگو آ رہی ہے۔

### کفر کے اقسام

امام مسلم وضع کرنا چاہتے ہیں کہ بہت سے معاصی پر حقیقی کفر کے علاوہ لفظ کفر کا استعمال ہوتا ہے، لہذا پہلے کفر کے اقسام ملاحظہ ہوں، کفر کی چار قسمیں ہیں: کفر انکار، کفر جحد، کفر عناد، کفر نفاق۔

**کفر انکار** —: کا مطلب یہ ہے کہ دل و زبان دونوں سے اللہ کا اسکے رسول کا انکار کیا جائے اور کفر کی اس حد پر انسان پہنچ جائے کہ توحید کی بات اس کی سمجھ میں ہی نہ آئے، کفر کے اسی مقام کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح ہے سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاذَنَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ، یعنی کفر نے ان کے حواس کو اس درجہ مفلوج کر دیا کہ اب ایمان کی باتوں کو سمجھنے کی بھی اس میں صلاحیت باقی نہ رہی۔

**کفر جحد** —: دل سے خدا کو مانے لیکن زبان سے اس کے خلاف بولے جیسے ابلیس کا کفر، اہل کتاب کا کفر، جیسا کہ ”جَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّاۤ اِیْنَ وَاسْتَكْبَرُوا۟ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِیْنَ“ وغیرہ آیات میں اسی قسم کے کفر کا ذکر ہے، یہ لوگ اللہ کی قدرت، علم، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وغیرہ کو دل سے جانتے پہچانتے تھے مگر زبان سے اس کے خلاف بولتے تھے۔

**کفر عناد** —: دل سے بھی مانے اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرے، مگر دینی احکام بجالانے کیلئے تیار نہ ہو جیسے ابوطالب۔

**کفر نفاق** —: دل سے انکار لیکن زبان سے اقرار ہو،

### کفر اعتقادی اور عملی میں فرق

کفر کی ان چار قسموں میں سے کسی ایک کا بھی اجتماع ایمان کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا، ان چاروں کو کفر اعتقادی کہا جاسکتا ہے ان چاروں کے علاوہ ایک اور قسم پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، کہ دل سے مانا جائے اور زبان سے اقرار بھی کیا جائے مگر عمل اسکے خلاف ہو، جیسے نماز نہ پڑھنا، جموٹ بولنا، غداری کرنا وغیرہ تو ان کبار پر بھی کفر کا اطلاق ہوا ہے، غرض حدیث میں جہاں جہاں ایمان کے ساتھ کفر جمع ہوا ہے وہ کفر اعتقادی نہیں بلکہ کفر عملی ہے، جس کی توجیہات بار بار گزر چکی ہیں، اس کو اس طرح بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح محض اعمال سے ایک کافر مسلمان نہیں ہو سکتا تو قلیکہ کفر یہ عقیدہ ختم نہ ہو جائے اسی طرح کوئی مسلمان محض کفر یہ اعمال سے کافر نہیں ہو سکتا جب تک کہ کفر کا عقیدہ نہ ہو جائے، ایمان و کفر کا تعلق عقیدہ سے ہے نہ کہ عمل سے اور نفس جنت و دوزخ کی تقسیم کفر و ایمان پر ہے نہ کہ عمل پر اسی لئے ابوطالب ہزار حمایت کے باوجود مسلمان نہیں ہوئے اور مسلمان بد عملی کے بعد بھی کافر نہیں ہو گا، اسکی مکمل بحث باب نقصان الایمان عن المعاصی میں گزر چکی ہے ملاحظہ کر لیا جائے!

## شرح حدیث

عورتوں کو عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے موقع پر حدیث میں مذکور نصیحت کی گئی ہے،

قوله فانی رأیتک: آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ وحی کے ذریعہ آپ کو معلوم ہوا یا بذریعہ کشف، لیلۃ المعراج میں، یا صلاۃ کسوف میں، جیسا کہ بخاری شریف (ص ۱۳۲/۱) کی روایت ہے کہ نماز میں جنت و دوزخ آپ کے سامنے کر دیئے گئے، عورتوں کے کثرت سے جہنم میں جانے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ عورتوں کو دنیا سے زیادہ محبت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کو زینب و زینت اور دوسرے سامانوں سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے، صدمہ کے ذریعہ کل سے نجات مل جائے گی اور اس کی خاصیت غضب الہی کو دور کرتا ہے لہذا جہنم سے بچ جائے گی۔

تکفرون العشیر: عشیرہ شریک زندگی، یعنی شوہر، یہاں کفران کا مطلب شوہر کے احسانات کا انکار ہے، حدیث میں ہے کہ ”من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ“ اکثر و بیشتر کفر کا استعمال انکار دین پر ہوتا ہے، اور کبھی نعمت کے انکار پر بھی اس کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جب انسان کے احسان پر شکر ادا نہیں کرتا جبکہ اس کا احسان محسوس و مشاہد ہے تو ذلت باری تو غیر مشاہد ہے تو پھر اس کا شکر کیونکر بجالا سکتا ہے؟

قوله مارأیت من ناقصات عقل و دین: ممکن ہے کہ اس جملہ میں من بیان نہ ہو یعنی احدا کن کا بیان ہو، جزاء: ”کے معنی لفظ، ہوش مند کے ہیں انصاری صحابیات کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوشمندی کی بنا پر مدح فرمائی ”نعم النساء نساء الانصار لم یمنعنہن الحیاء ان یتفقہن فی الدین“ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث باب میں سوال کرنے والی انصاری صحابیہ تھیں۔

تکثرون اللعن: لعنت کہتے ہیں خدا کی رحمت سے دوری کی بددعا کرنا، حالانکہ رحمت الہی کا تقاضا ہے کہ کثرت سے لوگ اس کی رحمت سے ہمکنار ہوں اور لعنت کرنے والے کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ رحمت خداوندی سے دور رہیں، یہ منشاء باری کے خلاف ہے، اسی لئے علماء کرام نے کسی خاص کافر کیلئے بھی لعنت کی اجازت نہیں دی، کیا معلوم کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو جائے، ہاں جس کے بارے میں شارع نے کفر پر خاتمہ کی خبر دی ہے جیسے ابو جہل یا بعد میں کفر پر مرتانص سے معلوم ہو جائے جیسا کہ ابلیس کے بارے میں تو پھر اس پر لعنت کی جاسکتی ہے، اسی طرح برے اوصاف سے متصف ہونے والوں پر عام لفظوں کے ساتھ لعنت کی جاسکتی ہے، جیسے لعنة الله علی الکاذبین، عورتوں میں لعنت کرنے کا ایک حرج بنا ہوا ہے، اسی لئے اس کی طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے نفس لعنت دخول جہنم کا باعث نہیں بلکہ کثرت لعنت کو سبب بنایا گیا ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں ونظیرہ ما قال بعض الاثمة ان الغيبة صغیرة و وجہوہ بان الناس اقبلوا بہا فلو كانت کبیرة علی الاطلاق کما جری علیہ کثیرون بل حکى علیہ الاجماع للزم تفسیق الناس کلهم او غلبہم وفی ذالک حرج، (مرقات جن ۸۱/۱) لیکن حضرت عثمانؓ کو کثرت لعنت پر ملا علی قاری کی توجیہ سے اتفاق نہیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر صرف لعنت ہو تو نفس استغفر کانی ہے اگر لعنت بکثرت ہے تو استغفر بھی بکثرت کرنی ہوگی، تو تکثیر سے اشارہ ہے کہ بکثرت لعنت کی تلافی بکثرت استغفار سے ہوگی۔ ”م

اذھب للرب الرجل الحازم: لب بمعنی عقل، "العقل غزيرة يدرك بها المعنى ويمنع عن القبائح" یعنی عقل انسانی اس فطرت کا نام ہے جس سے معانی کا ادراک اور قہرغ سے اجتناب کیا جاتا ہے، وهو نور الله في قلب المؤمن، حازم مختاط، سمجھدار انسان، حازم کی قید سے یہ بتاتا ہے کہ عورتوں کا فتنہ بڑا ہی زبردست ہے، عقلمندوں کی عقل کو بھی غائب کر دیتی ہے، کم سمجھ اور نا سمجھ کا کیا پوچھا؟ اور یہ جملہ بطور تعجب فرمایا کہ ناقص العقل ہونے کے باوجود عقلمند مردوں کو حیران کر دیتی ہے۔

قوله من احداكن: یہ اذھب کے متعلق ہے، منكن کے بجائے احداكن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عقلمندوں کی عقل ٹھکانے لگانے کیلئے ایک عورت بھی کافی ہے، جب ایک میں یہ صفت موجود ہے تو جماعت میں بدرجہ اولیٰ، عورتوں کے عیوب کے سلسلے میں جریر کا یہ کلام بہت ہی عمدہ ہے۔

يصرعن ذاللب حتى لا تراك به وهن اضعف خلق الله اركاناً

قوله قلن وما نقصان ديننا وعقلنا يا رسول الله: "یعنی جب ہمارا اور مردوں کا دین ایک ہی ہے تو پھر ہمارے دین کے ناقص ہونے کا کیا مطلب؟ آنحضرت ﷺ کے کلام میں عقل مقدم تھا دین سے، اور سوال کرنے والی نے دین کو عقل پر مقدم کیا یا تو دین کی اہمیت کی وجہ سے کہ دین ہی ایسی چیز ہے کہ جس کے ذریعہ سے نقصان کا تدارک کیا جاسکتا ہے، یا نقصان عقل کی وجہ سے کلام نبوی کی ترتیب محفوظ نہ رکھ سکیں، اور نہ اس ترتیب کی خوبی کو سمجھ سکیں، حضور ﷺ کے کلام میں عقل کو مقدم رکھنے کی خاص وجہ یا تو یہ ہے کہ نقصان عقل ایک فطری چیز ہے، اور وجود میں دین سے مقدم ہے اور دین وجود کے لحاظ سے بعد کی چیز ہے، یا اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں نقصان عقل کے نقصان کی وجہ سے آتا ہے۔

ان عورتوں کا یہ سوال ہی ظاہر کرتا ہے کہ ناقصات العقل ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے کثرت لعنت، کفران نعت اور مردوں کی عقل کو ختم کرنے کی صفت، ان تینوں صفت کو تسلیم کیا، تب تو نقصان عقل دو دین کا سوال کیا، اس سوال پر آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے لطیف جواب پر غور کریں کہ کس قدر نرم لہجہ میں جواب عنایت فرمایا، واما نقصان العقل، اس سے عقل کے ناقص ہونے کی طرف اشارہ کیا، وہ اس طرح کہ مردوں کے مقابلے میں تمہاری گواہی آدمی ہے جیسا کہ قرآن نے وضاحت کی ہے، فرجل و امرأتان ممن ترضون من الشهداء ان تضل احدهما الخ، "م

فهذا نقصان الدين: یعنی مجموعی طور پر یہ دو چیزیں نقصان دین کا سبب ہیں، کیونکہ یام حیض میں نماز کے ثواب سے محروم رہتی ہے، اور ورزہ رکھ تو لیتی ہے لیکن یام مہارک کی فضیلت سے محروم رہتی ہے، لیکن خیال رہے کہ اس سے عورت کی حقارت یا عار دلانا مقصود نہیں کیونکہ عار و ملامت اس چیز پر کی جاتی ہے جو کسی ہو اور یہ تو غیر اختیاری خلقی ہے، اور یہ بھی اسلئے ظاہر کیا گیا تاکہ ان چیزوں کے فتنہ میں جلا ہو کر ہلاکت کے دہانے پہنچ جائیں، بلکہ خاص طور پر ان چیزوں سے بچتی رہیں۔ "م

حيض ونفاس من نماز نہ پڑھنے پر ثواب

سوال :- "اب یہاں ایک سوال یہ ہے کہ جب مریض یا مسافر حالت مرض اور حالت سفر میں نوافل اور اپنے معمولات پر اور نہیں کر پاتا تب بھی اسکو ثواب ملتا ہے تو پھر حائضہ نفساء عذر سنہوی کی بناء پر نماز نہیں پڑھ پاتیں تو اسکو ثواب ملے گا یا نہیں؟

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس کو ثواب نہیں ملے گا، کیونکہ مریض و مسافر و حائضہ کے درمیان فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ مریض و مسافر صحت و وطن میں اس نیت کے ساتھ اپنے معمولات پورے کرتے ہیں کہ دوام کے ساتھ اس کو کرتے رہیں گے، تو اولاً دوام کی نیت ہوتی ہے، اور اس نیت کی اہلیت بھی ہوتی ہے، جبکہ حائضہ کا معاملہ اسکے برعکس ہے اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ ایام طہارت میں پڑھوں گی، لیکن ایام حیض میں نہ پڑھوں گی، تو اس کی مثال اس مریض و مسافر کی ہوتی جو نوافل کو دوام کے ساتھ نہ ادا کرتا ہو، اور اگر نیت بھی رکھے تو یہ نیت معتبر نہیں کیونکہ حالت حیض میں حرام ہے۔ ”م

### بظاہر جنت میں عورتیں زیادہ ہوں گی

اشکال :- ”اس روایت سے معلوم ہوا کہ جہنم میں عورتیں زیادہ ہوں گی حالانکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کو جنت میں دودو عورتیں ملیں گی، اس لحاظ سے جنت میں عورتیں زیادہ ہوں گی تو گویا دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے؟“  
(۱) حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ جس روایت میں دو عورتوں کے ملنے کا تذکرہ ہے اس میں اس کی بھی صراحت ہے کہ وہ عورتیں دنیا کی نہ ہوں گی بلکہ وہ حور عین ہوں گی۔ لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ طہرائی کی حدیث میں ”ان ادنیٰ اهل الجنة ..... علی زوجتین من نساء الدنیا“ دنیا کی عورت کی صراحت ہے لہذا مذکورہ جواب درست نہیں؟ ملا علی قاریؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ ابتدائے عورتیں جہنم میں ناشکری کی وجہ سے زیادہ ہوں گی مگر پھر بعد لعذاب جنت میں آجائیں گی، پھر ان کی تعداد بمقابلہ جہنم کے زیادہ ہو جائے گی۔

(۲) تجربہ ہے کہ لڑکیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں لہذا اس کی کثرت کی بنا پر ممکن ہے کہ دودو ملنے کے باوجود بھی جہنم میں ان کی تعداد زیادہ رہے۔ ”م

### کیا سبھی عورتیں کم عقل ہیں؟

”حدیث کے عمومی لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ سبھی عورتیں ناقصات العقل میں شامل ہیں حالانکہ بعض روایت میں حضرت مریم، حضرت آسیہ کو کامل العقل، اور ترمذی (ص ۲۳/۲) کی روایت میں چار عورت حضرت مریم، حضرت آسیہ، حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہ کو کامل العقل کہا گیا ہے، تو ان دونوں روایتوں سے بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ حدیث باب میں عام عورتوں کے حالات بتائے گئے ہیں بعض اس سے مستثنیٰ ہو جائیں تو اس کو نادر اور شاذ کہا جائے گا، دوسرا جواب یہ ہے کہ جب کسی چیز کے کل پر حکم لگایا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ہر فرد کو وہ شامل ہو کوئی خارج نہ ہو سکے، ایسا نہیں۔

تو اسی طرح یہاں بعض عورتیں اس سے خارج ہیں، جس کی تعیین حدیث نے کر دی، یا یہ کہ یہ نقصان و کمال کا حکم صنف پر ہے لہذا صنف کے بعض افراد اس حکم سے خارج ہو جائیں تو صنف کے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

فائدہ - علامہ نوویؒ نے اس حدیث کے تحت بعض قیمتی باتیں نقل کی ہیں (۱) نعمت کا انکار حرام ہے (۲) قبیح کلام بکثرت بولنا لعنت کی طرح ہے (۳) صدقہ سے عذاب ہٹ جاتا ہے (۴) عقل میں کمی زیادتی ہوتی ہے۔ ”م

## باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوٰۃ

جو شخص نماز ترک کرے اس پر کفر کا اطلاق

﴿حَدِیثٌ﴾ حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ ..... عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَرَأَ ابْنُ آدَمَ السُّجْدَةَ فَسَجَدَ اعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِي يَقُولُ يَا وَيْلَهُ، وَفِي رَوَايَةٍ أَبِي كُرَيْبٍ يَا وَيْلَى، أَمَرَ ابْنُ آدَمَ بِالسُّجُودِ فَسَجَدَ فَلَمَّا الْجَنَّةُ وَأُمِرْتُ بِالسُّجُودِ فَأَبَيْتُ فَلَمَّا الْغَارُ، وَفِي رَوَايَةٍ عَنْ أَبِي سَفْيَانَ قَالُوا: سَمِعْتُ جَابِرًا يَقُولُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكَفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ،

ترجمہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت بنو آدم آیت سجدہ کی تلاوت کر کے سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتے ہوئے دور چلا جاتا ہے، اور کہتا ہے کہ ہائے میری بربادی! کہ ابن آدم کو سجدہ کا حکم ملا اور اس نے سجدہ کیا تو اس کو اسکے صلہ میں جنت نصیب ہوئی، اور مجھے حکم ملا اور میں نے انکار کر دیا تو اسکے صلہ میں جہنم ملا، ایک روایت میں حضرت جابر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اور کفر کے درمیان واسطہ نماز چھوڑ دینا ہے۔

### ترک صلوٰۃ پر وعید

نماز دین کا اہم شعبہ ہے، نماز میں انسان کی طرف سے انتہائی تذلل کا اظہار ہوتا ہے اس کے صلہ میں خدا کی طرف سے انتہائی اعزاز ملتا ہے، حدیث ”امر بالسجود“ سے مراد نماز ہے، قسمیہ الکفر باسم الجزء کے قبیل سے ہے، حدیث باب میں مومن اور کفر کے درمیان واسطہ ترک صلوٰۃ کو قرار دیا گیا ہے۔

ابن ماجہ کی روایت میں ابو ہریرہ کے حوالہ سے یہ الفاظ ہیں قَالَ اَوْصَانِي خَلِيلِي اَنْ لَا تَشْرِكَ بِاللّٰهِ وَاَنْ قَطَعْتَ اَوْ حَرَقْتَ وَلَا تَتْرَكَ صَلَاةً مَكْتُوبَةً مُتَعَدًّا فَمَنْ تَرَكَهَا مُتَعَدًّا فَقَدْ بَرِثَ مِنْهُ الذَّمُّ، وَلَا تَشْرَبِ الْخَمْرَ فَانَهَا مُفْتَاَحُ كُلِّ شَرٍّ (ابن ماجہ)

اس حدیث میں شرب خمر اور ترک صلوٰۃ کو ایک ہی جگہ ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ شراب اگر تمام برائیوں کی کنجی ہے تو نماز تمام برائیوں کا قتل ہے، جس نے نماز پابندی کے ساتھ شروع کر دی اس نے گویا برائیوں کے دوزخہ پر قتل ڈال دیا، آمنا مبارکہ میں نماز کی اسی خصوصیت کا ذکر ہے، اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ الْخ، اسکے برخلاف شراب کی خاصیت ہے، حضرت بریدہ کی روایت میں ہے قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَهْدُ الْوَدِيُّ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ، (۵)

بعض علما کا خیال ہے کہ ابن ماجہ کی اس روایت میں ضمیر منہ کا مرجع منافقین ہیں چونکہ یہ جماعت دراصل کافر تھی مگر مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک بھی رہتی تھی، اس لئے اس روشن عمل کے بعد ان کو کھلا کافر کہنا آئین اسلام کے تحت نہ

آسکا تھا، جب ان سے میل چھوٹ گیا تو اب ان کے کافر کہنے میں کوئی امر مانع نہیں رہتا، عقیدہ کے لحاظ سے تو پہلے ہی کافر تھے اب عمل کے لحاظ سے بھی کافر ہو گئے لہذا ان کے ساتھ وہی معاملہ ہو گا جو ایک کافر کے ساتھ ہونا چاہئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کا جو نقشہ ہے اسکے مطابق تو ان حدیثوں میں کوئی اشکال ہی نہیں، کیونکہ وہی قسم کی جماعتیں نظر آتی ہیں، یا تو نمازی مومن میا پھر کافر بعد میں چل کر مومن کی جماعت سے ایک طبقہ وہ پیدا ہوا جو تارک صلا ہے، اب اسکے بارے میں خلیفان پیدا ہوا کہ حدیث بالاکا روشنی میں ان کو کیا کہا جائے چنانچہ اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا۔

### اختلاف ائمہ اور تاویل حدیث

حضرت امام احمد کا مشہور مسلک اور مفتی پہ قول یہ ہے کہ تارک صلا کافر ہو جاتا ہے ان کی دلیل من ترک الصلوۃ فقد کفر ہے، اسی طرح حدیث باب بھی ان کا مستدل ہے۔

جبکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک کافر نہیں ہو گا، ان حضرات کی طرف سے مذکورہ حدیث کے چند جوابات دیئے جاتے ہیں :  
(۱) یہ حدیث اس شخص سے متعلق ہے جو ترک صلا کو حلال جانتا ہو یا نمازی کا منکر ہو (۲) کفر سے مراد فعل الکفر ہے یعنی یہ تو کافر جیسا عمل ہوا کہ اس کی قبیل میں قصد اکو تاہی کی جائے (۳) مایوکل کے اعتبار سے کہا گیا کہ ترک صلا کفر پر مدح و تحسین سے خطر ہے کہ کہیں اس کا خاتمہ کفر نہ ہو، (۴) فقد کفر ای قرب من الکفر مراد ہے (۵) فقد کفر "کفر دون کفر" کے قبیل سے ہے جسکی تفصیل گذر چکی۔ (۶) تھعلی کافر کہا گیا جیسے کسی انسان کو زجر کے موقع پر نیل کہہ دیا جاتا ہے۔

لطیفہ :- "ایک دفعہ حضرت امام شافعیؒ نے حضرت امام احمدؒ سے فرمایا کہ تارک صلا اگر کافر و مرتد ہو گیا تو پھر وہ مسلمان کیسے ہو گا؟ تو اس پر امام احمدؒ نے جواب دیا کہ وہ نماز پڑھ لے تو مسلمان ہو جائے گا، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کافر کی تو نماز نہیں ہوتی تو اس پر امام احمدؒ نے فرمایا کہ کلمہ پڑھ لے، حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کلمہ تو وہ پہلے ہی سے پڑھتا ہے اس نے کلمہ چھوڑا ہی کب؟ مورخین کے بقول حضرت امام احمدؒ اس دلیل کو سن کر خاموش ہو گئے۔"م

### ترک صلا پر قتل و سزا کی تفصیل

"حضرت امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمدؒ تارک صلا کو موجب قتل قرار دیتے ہیں یہ ایک بات ہے کہ امام احمد کے یہاں کفر و مرتد کی بنا پر، اور ان دونوں حضرات کے یہاں بطور حد اقل کیا جائے گا، اس مسلک کے استدلال میں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ما قبل میں حدیث گذر چکی کہ فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دملہم و اموالہم، (مسلم ص ۳۷) یعنی جب وہ مذکورہ چیزیں کرنے لگیں تو ان کے جان و مال محفوظ ہو گئے، اس میں جان کی عصمت کا موقوف علیہ تین باتیں ہیں، شہادت، اقامت صلا، ایستخارہ کوا، گویا ان میں سے جو بھی معذور ہو گا اسی کے مناسب جان یا مال کی عصمت بھی ملتی ہو جائیگی۔  
حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ تارک صلا نہ تو مرتد ہو گا اور نہ ہی مستحق قتل، ہاں بطور سزا قید کر دیا جائے، اگر تین دن کے اندر توبہ کر کے نماز شروع کرے تو فیہا ورنہ کوڑوں سے مار مار کر لہو لہان کیا جائے۔

احناف کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ تارک صلا کے قتل پر ائمہ کرام حدیث کے جس کٹڑے سے استدلال کرتے ہیں اس میں ایک جملہ امر ان اقلیل الناس بھی ہے اس میں لفظ قتل استعمال کیا گیا ہے نہ کہ لفظ قتل جبکہ دونوں میں فرق





## باب بیان کون الایمان باللہ تعالیٰ افضل الاعمال

اللہ پر ایمان لانا سب کاموں سے افضل ہے

❦ حدیث ❦ حدثنا منصور بن ابی مزاحم ..... عن ابی ہریرۃ قال: قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ائی الاعمال افضل قال الایمان باللہ عز وجل قيل ثم ماذا؟ قال الجہاد فی سبیل اللہ، قيل ثم ماذا؟ قال حج مبرور، وفي رواية محقق بن جعفر ایمان باللہ ورسولہ، وفي رواية عن ابی ذر قال: قلت یا رسول اللہ ائی الاعمال افضل قال: الایمان باللہ والجہاد فی سبیلہ، قال قلت ائی الرقاب افضل قال انفسها عند اهلها واكثرها ثمنًا، قال: قلت فإن لم افعل، قال تعین صانعاً وتصنع لاخرق قال قلت یا رسول اللہ ارایک ان ضعفک عن بعض القتل قلت تکف شرک عن الناس فإنها صدقة منك علی نفسك.

وفي رواية عن عبد اللہ بن مسعود قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ائی العمل افضل قال: الصلوة لوقتها، قال قلت ثم ائی؟ قال بر الوالدين، قال قلت ثم ائی قال الجہاد فی سبیل اللہ فتا ترکک استزید إلا ارعة علیہ، وفي رواية عن عبد اللہ بن مسعود قال: قلت یا نبی اللہ ائی الاعمال اقرب الی الجنة؟ قال الصلوة علی مواقيتها قلت وماذا یا نبی اللہ؟ قال بر الوالدين قلت وماذا یا نبی اللہ؟ قال الجہاد فی سبیل اللہ، وفي رواية سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ائی الاعمال احب الی اللہ؟ قال الصلوة علی وقتها قلت ثم ائی قال ثم بر الوالدين قلت ثم ائی قال ثم الجہاد فی سبیل اللہ قال حدثنی بہن ولو استزددت لزللتی، وفي رواية عنه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال افضل الاعمال لو القتل الصلوة لوقتها وبر الوالدين.

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر عمل کونسا ہے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا پوچھا گیا پھر کونسا عمل بہتر ہے؟ تو آپ نے فرمایا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا اور دریافت کیا گیا پھر کونسا عمل؟ تو فرمایا مقبول حج۔

ایک روایت میں ہے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کونسا عمل عمدہ ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ کا یقین اور خدا کے راستہ میں جہاد کرنا، میں نے پوچھا کس غلام کو آزاد کرنا زیادہ بہتر ہے، تو آپ نے فرمایا جو عمدہ ترین زیادہ قیمتی ہو، میں نے عرض کیا یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے تو؟ آپ نے فرمایا کہ کسی کام کو دینے والے کی مدد کر دینا، یا آپ نے فرمایا کسی نا تجربہ کار ناکارہ کے کام میں مدد کر دینا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھے یہ بتادیں کہ اگر میں بعض کام کو انجام دینے سے عاجز

(۱) حدیث (۱) بخاری ۵۰۰، مسلم ۶۳، ترمذی ۲۹۵، حدیث (۲) بخاری ۳۴۲، ۲۵۱۸، مسلم ۶۳، نسائی ۱۱۹/۶، حدیث (۳) بخاری ۱۱۲۴، ۷۵۳، مسلم ۶۳، ترمذی.

رہوں تو آپ نے فرمایا لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھنا کیونکہ یہ بھی تمہارے لئے بہتر اور کار ثواب ہی ہوگا، حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا عمل سب سے اچھا ہے؟ تو آپ نے فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا، میں نے عرض کیا پھر کونسا عمل؟ تو آپ نے فرمایا والدین کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرنا، میں نے عرض کیا پھر کونسا عمل؟ تو آپ نے فرمایا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا، میں نے حضور کی رعایت کرتے ہوئے اس سے زیادہ سوال نہیں کیا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی کونسا عمل جنت سے بہت زیادہ قریب کرنے والا ہے؟ تو آپ نے فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا، میں نے کہا پھر کونسا عمل؟ تو آپ نے فرمایا والدین کے ساتھ اچھا سلوک، میں نے عرض کیا پھر کونسا؟ تو آپ نے فرمایا خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔

مقصد باب :- جس طرح ایمانی اعمال میں فرق مراتب ہیں اسی طرح کفریہ اعمال میں بھی فرق مراتب ہیں

### سب سے افضل عمل کون؟

یہ بات کہ اعمال ایمانی میں سب سے عمدہ عمل کونسا ہے؟ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے مطابق سب سے عمدہ ایمان پھر جہاد، پھر اسکے بعد حج ہے۔

حضرت ابو ذرؓ کی حدیث میں ایمان اور جہاد کا افضل ہونا مذکور ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت میں نماز، اسکے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک، پھر جہاد کا تذکرہ ہے، حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت میں اطعام طعام اور اقران سلام، حدیث ابو موسیٰؓ کی حدیث میں من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، اور حضرت عثمانؓ کی روایت میں خیرکم من تعلم القرآن وعلّمہ مذکور ہے، تو آخر ان میں افضل تو کوئی ایک ہی ہوگا پھر سب کو افضل کیوں کہا گیا؟ محدثین نے ان متدرج روایتوں میں باہمی تطبیق کے لئے مختلف توجیہات ذکر کی ہیں۔ ابو بکر نقاش شامی سے دو توجیہات منقول ہیں

(۱) آپ کے جواب کا اختلاف ساکّل کے حالات کے اختلاف پر مبنی ہے یعنی جس ساکّل میں جس چیز کی کمی تھی اسی کو نمایاں کر کے ذکر کیا گیا، تاکہ اس کی کوودور کر لیں اس کی تائید حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے، جس میں ان کا بیان ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج نہ کرنے والے سے فرمایا کہ حج کرتا چالیس غزوہ سے افضل ہے، اور غزوہ نہ کرنے والے سے فرمایا کہ ایک غزوہ چالیس حج سے افضل ہے۔

(۲) ممکن ہے کہ ان اعمال کے تذکرے سے آپ کی مراد یہ ہو کہ تمام اعمال عمدہ ترین اعمال ہیں، رہا یہ کہ ان میں سب سے عمدہ کونسا عمل ہے؟ تو ایمان کو سب پر فوقیت دی گئی، اور دیگر اعمال کو اشخاص و حالات کو سامنے رکھ کر فوقیت دی جائے گی، اس توجیہ پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ بعض روایات میں اعمال کو ثم کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اس سے بظاہر اعمال کی ترتیب رتبی کا شبہ ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ثم ترتیب رتبی کے لئے نہیں ہے بلکہ ترتیب ذکر کی کیلئے ہے جیسا کہ قرآن میں ہے، ”فَكَ رَقِبَةً

او اطلعنا فی یوم نذی مسغبۃ یتیمًا ذا مقربۃ او مسکینًا ذا تربۃ ثم کان من الذین آمنوا، یا جیسا کہ ایک اور جگہ قرآن میں ہے قل تعالوا اقل ما حرم علیکم ربکم ان لا تشرکوا بہ شیئًا وبالوالدین احسانًا ولا تقتلوا (الی قولہ) ثم آتینا موسیٰ الكتاب،

اسی طرح ایک اور جگہ ہے ولقد خلقناکم ثم صودناکم ثم لنا للملائكة اسجدوا لآدم، ان تمام جگہوں میں شہرتیب ذکر کی کیلئے ہے نہ کہ رتی کیلئے، لہذا یہاں بھی ذکر کی کیلئے ہے۔ استشہاد میں یہ شعر بھی نقل کیا جاتا ہے۔

قل لمن ساد ثم ساد ابوه ثم قد ساد قبل ذلك جدہ

جہاد کوچ پر مقدم کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جہاد کی مشروعیت حج سے مقدم ہے اسی طرح نفیر عام کے وقت جہاد کوچ پر فوقیت ہوگی، نیز جہاد سے عام مسلمانوں کا فائدہ ہے اور حج سے۔ شخص فائدہ ہے، اس کی باقی تفصیل ای السلام خیر؟ ای المسلمین خیر؟ کے تحت ملاحظہ کر لی جائے۔

قوله عليه السلام في الرقاب افضلها انفسها هنداهلها: یہ اس صورت میں ہے جب ایک غلام آزاد کرنے کا ارادہ ہو یا اگر کوئی ایک ہزار روپے کا غلام خریدنا چاہے اور ایک ہزار کا عمدہ غلام ایک، اور گھٹیا قسم کے دو مل سکتے ہوں تو ایسی صورت میں بجائے ایک کے دو خرید کر آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے، البتہ قربانی میں ایک عمدہ جانور دو گھٹیا جانور قربانی کرنے سے زیادہ افضل ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ قربانی میں مقصود گوشت ہے اور عمدہ گوشت گھٹیا گوشت سے بہتر ہے اور حق کا مقصد انسان کو غلامی سے رہا کر کے انسانیت کے اصلی مقام پر پہنچانا ہے لہذا دو کو ذلت سے نکالنا ایک کے نکالنے سے بہر حال بہتر ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

## باب بیان کون الشرب اقبح الذنوب وبيان اعظمها بعده

شرک سبھی گناہ سے بڑا گناہ ہے اور اسکے بعد کونسا گناہ بڑا ہے اس کا بیان

حدثنا عثمان بن ابي شيبة ..... عن عبد الله قال سالت رسول الله صلى الله عليه وسلم ائ الذنب اعظم عند الله قال ان تجعل لله ندا وهو خلقك قال قلت له ان ذلك عظيم قال قلت ثم ائ قال ثم ان تقتل ولدك مخافة ان يطعم معك قال قلت ثم ائ قال ان تزني خيلة جارك، وفي رواية قال عبد الله قال رجل يا رسول الله ائ الذنب اكبر عند الله قال ان تدعو لله ندا وهو خلقك قال ثم ائ قال ان تقتل ولدك مخافة ان يطعم معك قال قلت ثم ائ قال ان تزني خيلة جارك، فانزل الله عز وجل تصديقها والذين لا يدعون مع الله الها آخر ولا يقتلون النفس التي حرم الله الا بالحق ولا يذنون ومن يفعل ذلك يلق آثاما،

ترجمہ عبد اللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ تو فرمایا کہ تو اس خدا کا کسی کو شریک ٹھہرائے، جس نے تجھ کو پیدا کیا، میں نے کہا بے شک، یہ تو بہت بڑا جرم ہے، وہ فرماتے ہیں میں نے کہا پھر اس کے بعد کونسا؟ تو فرمایا تو اپنے گوشہ جگر کو اس خوف سے مار ڈالے کہ کہیں تیرے ساتھ وہ (بڑا ہو کر) کھانے میں شریک نہ ہو جائے، میں نے عرض کیا پھر؟ فرمایا تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے، دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس ارشاد کی تصدیق اس آیت میں فرمائی والذین لا يدعون مع الله،

تشریح

قوله ای الذنب، ذنب : مایذم الآتی به شرعاً، جس مذموم کام پر کرنے والے کی شرعاً مذمت کی جائے، وہ ذنب کہلاتا ہے، اس کی چار قسمیں ہیں :

## گناہ کی چار قسم

- (۱) جو بلا توبہ معاف نہ ہو، جیسے شرک و کفر، قرآن میں ہے فاعترفوا بذنوبهم فسحقاً لأصحاب السعیر،
- (۲) جو استغفار اور دوسرے نیک کاموں سے معاف ہو جاتے ہیں جیسے صغائر،
- (۳) جو توبہ سے معاف ہوتے ہوں، یا خدا کی مشیت پر موقوف ہوں جیسا کہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء، سے معلوم ہوتا ہے، یہ وہ گناہ کبیرہ ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو،
- (۴) حقوق العباد، اس کے معافی کی ایک شکل توبہ ہے کہ صاحب حق کو حق واپس کر دیا جائے، عین موجود ہو تو عین ورنہ اس کا بدل دیکر اس سے معاف کر لیا جائے، ورنہ آخرت میں ظالم کے نیک کاموں کا ثواب منہوم کو دیا جائے گا، یا مظلوم کا گناہ ظالم کے سر ڈالا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے صاحب حق کو عوض دیکر بھی راضی کر سکتا ہے، حضرت علامہ النور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ مومن کی نافرمانی کے سلسلے میں چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جنکے درجات مختلف ہیں (۱) ذنب (۲) خطیئہ (۳) سیئہ (۴) معصیۃ۔ ان میں شدت کے اعتبار سے یہی ترتیب ہے یعنی سب سے ہلکے درجہ ذنب ہے، پھر خطیئہ، پھر سیئہ، پھر معصیۃ، ان میں سب سے کبیرہ معصیت کہلاتا ہے، باقی الفاظ عموماً صغیرہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ وضو کی فضیلت خرجت من وجه کل خطیئہ، حتیٰ یخرج نقیاً من الذنوب، ہے غرض عام طور پر لفظ معصیت گناہ کبیرہ کیلئے مستعمل ہے، اور بھی کبھی صغیرہ کے لئے بھی جیسا کہ حدیث باب میں۔ (۵)

## شرح حدیث

نداء: نظیر، مماثل، قوله خشية ان يطعم مملک، مال کم ہونے کی صورت میں مار ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اولاد کیلئے ایثار نہیں کرنا چاہتا، اور مالدار ہونے کی صورت میں قتل اولاد کا سبب عموماً بخل ہوتا ہے، قتل اولاد بڑا گناہ اس لئے ہے کہ قتل کے جرم کے ساتھ اس میں اعتقاد کی خرابی کو بھی دخل ہے کہ خدا کے رزاق ہونے کا پورا یقین نہیں، قرآن میں ہے ولا تقتلوا اولادکم خشية املاق،

## پڑوسن سے زنا دس زنا کے برابر

قوله ان تزانی: یعنی اپنی پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا، انہیں ایک خرابی زنا کی، دوسری خرابی پڑوسی کی حق تلفی ہے کیونکہ زنا کر کے زوجین کے تعلقات کو خراب کرنا چاہتا ہے، ہر پڑوسی کو اپنے پڑوسیوں سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں ان پر اطمینان ہوتا ہے، زنا کر کے اس نے انکی امیدیں پامال کر دی، اعتماد کھو دیا، حالانکہ پڑوسی کے اکرام و عزاز کی بڑی تاکید آئی ہے، سند احمد میں مقدار ابن اسود سے روایت ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما تقولون فی الزنا؟ قالوا حرام، قال لأن یزنی الرجل بعشرة نسوة ایسر علیہ من أن یزنی بامرأة جارہ، (۷)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم زنا کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ سب نے کہا حرام، تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا دوسری دس عورتوں سے زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔  
حلیلہ، فعیلہ کے وزن پر نیا تو جل سے ماخوذ ہے، تو حلیلہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ شوہر کے لئے حلال ہوتی ہے، یا طول سے ماخوذ ہے تو وجہ یہ ہے کہ میاں بیوی کی آمد و رفت ایک دوسرے کے ساتھ رہتی ہے۔  
قوله فانزل الله تصديقها: شبہ:- آیت اور روایت میں بظاہر مطابقت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ آیت میں زنا اور قتل دونوں مطلق ہیں، اور روایت میں قتل مقید ہے، اولاد کے ساتھ اور زنا پڑوسی کی بیوی کے ساتھ،  
جواب:- آیت میں اگرچہ قتل وزنا مطلق ہے مگر اس سے یہ بات آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ کم عمر بچوں کو قتل کرنا اور پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا بدرجہ کوئی قبیح ہے۔

## باب الكبائر واكبرها

❦ حدیث ❦ (۱) حَدَّثَنِي عَمْرُو بْنُ مُحَمَّدٍ بْنُ بُكَيْرٍ بْنُ الْفَائِدِ ..... عَنْ أَبِي بَكْرَةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَلَا أَنْتَبَهُكُمْ بِالْكَبَائِرِ ثَلَاثًا، الْإِشْرَاقُ بِاللَّهِ، وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ، وَشَهَادَةُ الزُّورِ، أَوْ قَالَ الزُّورِ، وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَكِنًا فَجَلَسَ فَمَا زَالَ يُكْرِزُهَا حَتَّى قُلْنَا لَيْتَهُ سَكَتَ،

(۲) وَفِي رَوَايَةٍ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْكَبَائِرِ قَالَ الشِّرْكَ بِاللَّهِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَقَوْلُ الزُّورِ، وَفِي رَوَايَةٍ قَالَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ ذَكَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْكَبَائِرَ أَوْ سِئَلَ عَنِ الْكَبَائِرِ فَقَالَ الشِّرْكَ بِاللَّهِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَالَ أَلَا أَنْتَبَهُكُمْ بِالْكَبَائِرِ قَالَ قَوْلُ الزُّورِ أَوْ قَالَ شَهَادَةُ الزُّورِ، قَالَ شُعْبَةُ وَكَبِيرُ ظَنِّي أَنَّ شَهَادَةَ الزُّورِ. (۳)

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا هُنَّ؟ قَالَ الشِّرْكَ بِاللَّهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَأَكْلُ الرِّبَا وَالتَّوَلَّى يَوْمَ الرَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ، (۴)

وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مِنَ الْكَبَائِرِ شَتَمُ الرَّجُلِ وَالِدِيهِ، قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَهَلْ يَشْتَمُ الرَّجُلُ وَالِدِيهِ قَالَ نَعَمْ، يَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ وَيَسُبُّ أُمَّهُ فَيَسُبُّ أُمَّهُ، (۵)

یو بکرہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو تین بڑے بڑے گناہوں سے باخبر نہ کروں؟ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، اور جموئی

ترجمہ

(۱) بخاری ص ۳۶۲، مسلم ۱۲۶۵۴، ترمذی ص ۵۶/۲۔ (۲) بخاری ص ۲۷۶۶، مسلم ص ۶۶، ابوداؤد ص ۳۹۶، نسائی ۲۵۷/۶۔ (۳) بخاری ص ۸۸۳، مسلم ۵۹۷۳، ابوداؤد ص ۷۰۰، ترمذی ص ۱۲/۲۔

کو ای دیتا یا آپ نے فرمایا جھوٹ بولنا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے تھے، (شہادۃ الزور فرماتے وقت) اٹھ کر بیٹھ گئے، اور بار بار اس لفظ کو دہراتے رہے، یہاں تک کہ ہم لوگ (دل میں) کہنے لگے کہ کاش آپ خاموش ہو جاتے، حضرت انسؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبار کے بارے میں نقل کیا آپ نے ارشاد فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی کو قتل کر ڈالنا، اور جھوٹی بات بولنا، اور حضرت انسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ذکر فرمایا آپ سے کبار کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، اور کسی کو مار ڈالنا، اور والدین کی نافرمانی کرنا، اور آپ نے ارشاد فرمایا کیا میں اکبر کبار کے بارے میں تم کو یا خبر نہ کروں؟ آپ نے فرمایا: جھوٹی بات بولنا، یا فرمایا جھوٹی گواہی دینا، شعبہ کہتے ہیں کہ میرا غالب گمان یہ ہے کہ شہادۃ الزور فرمایا، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات مہلک گناہوں سے پرہیز کرو، دریافت کیا گیا کہ اسے اللہ کے رسول وہ کون سے گناہ ہیں، آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، اور کسی کو ناحق قتل کرنا، اور یتیم کا مال کھانا اور سود کھانا، اور لڑائی سے پشت پھیر کر بھاگنا، اور بھولی بھالی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانا۔

عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں والدین کو گالی دینا ہے لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے، اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں دوسرے کے باپ کو گالی دینا تاکہ وہ بھی اسکے باپ کو گالی دے، دوسرے کی ماں کو گالی دینا تاکہ وہ بھی اس کی ماں کو گالی دے (خود اپنے والدین کو گالی دینے کے حکم میں ہے)

## کبیرہ اور صغیرہ کے متعلق علماء کے خیالات

صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم میں علماء کی رائیں

اس باب کے تحت کبیرہ گناہوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے،

گناہ کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم میں اختلاف ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جن جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو منع کر دیا ہے وہ سب گناہ کبیرہ میں داخل ہیں، ابو اسحاق اسفراکینی بھی اسکے قائل ہیں اور قاضی عیاض نے محققین علماء کا یہی مذہب نقل کیا ہے، ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ادنیٰ مخالفت بھی بڑا بھاری جرم بن جانا چاہئے، اگر ایک ہی جرم باپ، بھائی کے فرق سے چھوٹا بڑا ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت تو سب سے بالا و برتر ہے، اس کی ادنیٰ مخالفت بھی بڑا ہی جرم کہلائے گا، ان لوگوں نے کل گناہوں کو کبیرہ کی نہرست میں داخل کر دیا ہے، ان کے یہاں صغیرہ گناہ ہے ہی نہیں۔

مگر جمہور علماء صفار و کبار دونوں کے قائل ہیں اور عبداللہ بن عباسؓ کا دوسرا قول بھی جمہور کی تائید میں ہے امام غزالی صفار کے انکار کو کتاب وسنت اور تفقہ کے خلاف کہتے ہیں،

اتنی بات تو مسلم ہے کہ خدا کی مخالفت ادنیٰ درجہ کی بہت سنگین جرم ہے مگر بعض جرائم (گناہ) بعض سے قباحت اور برائی

میں بڑھے ہوئے ہیں اس لئے روایتوں میں اس کی تصریح ہے کہ بعض گناہ بچکانہ نماز، صوم رمضان، حج، عمرہ، وضوء، صوم عرفہ و عاشوراء اور دوسرے نیک کاموں سے معاف ہو جاتے ہیں جیسا کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ کا تقاضا ہے، اور بعض گناہ نیکوں سے معاف نہیں ہوتے، پہلی قسم صغائر کی ہے اور دوسری قسم کبائر کی ہے، جب کتاب و سنت سے صغائر و کبائر کا ثبوت ملتا ہے تو پھر اس کا انکار مناسب نہیں۔

### کبیرہ اور صغیرہ کی تعریف میں اقوال علماء

(۱) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں پر جہنم، غضب، لعنت، عذاب وغیرہ کی مہر لگادی ہے وہ گناہ کبیرہ ہے، اور جن پر اس طرح کے الفاظ وارد نہیں وہ گناہ صغیرہ ہے۔

(۲) جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے آخرت میں جہنم یا دنیا میں حد کی دھمکی دی ہے وہ کبیرہ ہے

(۳) امام غزالیؒ فرماتے ہیں جن گناہوں کو بلا خوف و خطر اور بلا ندامت کیا جائے وہ کبیرہ ہے اور جن گناہوں کے ساتھ خوف و امن گیر ہو اور جس کو ایسی ندامت کے ساتھ کیا جائے جو گناہ کی لذت کو کم کر دے تو وہ صغیرہ میں داخل ہے،

(۴) ابو عمرو بن صلاح نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ کبیرہ وہ بڑا گناہ ہے جس کو کبیرہ کہا جاسکتا ہو اور اسکے کبیرہ ہونے

کی علامت یہ ہے کہ اس پر حد واجب ہو، جس پر کتاب و سنت میں جہنم کی وعید سنائی گئی ہو، اسکے کرنے والے کو فاسق کہا جاسکتا ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، ابو محمد بن عبد السلام نے اپنی کتاب ”قواعد“ میں صغیرہ اور کبیرہ کے فرق کو معلوم

کرنے کے لئے یہ ضابطہ تحریر فرمایا ہے کہ گناہوں کو ان کبائر پر پیش کر دو جو منصوص ہیں اگر اس گناہ (غیر منصوص) کی خرابی کبائر (منصوص) کے مفاسد سے بھی کم نظر آئے تو وہ صغیرہ کہلائے گا، اور اگر کبائر (منصوص) کے مفاسد کے برابر ہو یا اس سے

بھی زائد تو یہ (غیر منصوص) گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہو گا، اس قاعدہ کی رو سے اگر کوئی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو چلی دے (العیاذ باللہ) یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یا رسولوں کی توہین کرے یا کسی ایک رسول کی تکذیب کرے یا خانہ کعبہ پر گندگی ڈال دے یا

قرآن پاک کو ناپاک جگہ میں ڈال دے تو یہ تمام چیزیں اکبر کبائر میں شمار کی جائیں گی، اسی طرح کسی نے پاکدامن عورت کو پکڑ رکھا اور دوسرے شخص نے زنا کیا یا کسی مسلمان کو پکڑا تاکہ کوئی اور اس کو قتل کرے، ظاہر ہے کہ اس کا یہ جرم یتیم کے مال

کھانے سے بڑھا ہوا ہے، اسی طرح کافروں کو مسلمانوں کے اندر دینی حالات بٹلانا تاکہ یہ مسلمانوں کا امتیصال کریں تو یہ جرم بھی میدان جنگ سے پشت پھیر کر بھاگنے سے بڑھا ہوا ہے اس لئے یہ سب کبائر میں شامل ہوں گے۔

ہاں اگر کسی ایسی بات کی رہنمائی کی کہ اس کی وجہ سے مسلمان کی کوئی معمولی چیز جیسے ایک دو کھجور ضائع ہو گئی تو یہ صغیرہ میں داخل ہو گا، اسی طرح حاکم کا ناحق فیصلہ کرنا، گناہ کبیرہ ہے کیونکہ جب جھوٹی گواہی کو گناہ کبیرہ کہا گیا تو ناحق فیصلہ کرنے کا

جرم تو اس سے بڑھا ہوا ہے، لہذا یہ بھی بدرجہ کوئی کبیرہ ہو گا۔

بعض احتیاف کا خیال یہ ہے کہ جو کام بے حیائی کا ہو جیسے لواطت، باپ کی منکوحہ سے نکاح، یا کسی نص میں اس گناہ پر دنیا یا آخرت میں سزا کی دھمکی دی گئی ہو وہ کبائر ہیں، شمس الائمہ حنوفی کی تحقیق یہ ہے کہ جو کام مسلمانوں کے درمیان برا سمجھا جاتا

ہو، اس میں اللہ تعالیٰ اور دین کی بے حرمتی ہو وہ کبیرہ ہے، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی تحقیق یہ ہے کہ علماء کے اقوال اور

دلائل کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صغیرہ اور کبیرہ کا اطلاق دو طرح پر ہوتا ہے (۱) صغائر و کبائر حقیقی (۲) صغائر و کبائر اضافی، ہر گناہ اپنے مانوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے اور وہی گناہ اپنے نیچے کے لحاظ سے کبیرہ ہے۔ مثلاً اجنبی عورت سے لپٹنا دیکھنے کے اعتبار سے کبیرہ ہے، اور زنا کے اعتبار سے صغیرہ ہے، کسی مسلمان کا ہاتھ کاٹنا مارنے کے لحاظ سے کبیرہ ہے اور قتل کے لحاظ سے صغیرہ ہے۔

اسی وجہ سے سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ جس جرم کا تعلق بندوں سے ہو وہ کبیرہ ہے اور جس کا تعلق خدا سے ہو وہ صغیرہ ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کریم ہیں وہ بندوں کے گناہوں کو معاف کرتے رہتے ہیں، سفیان ثوریؒ کے اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ضائع کرنا بندوں کے حقوق ضائع کرنے سے آسان ہے کیونکہ پہلے قسم کے گناہ تو بہ واستغفار و شفاعت کے ذریعہ معاف ہو جائیں گے اور بندوں کی حق تلفی وہ بغیر اس کو حوالہ کئے ہوئے ختم نہیں ہوں گے۔ (رحمہم اللہ ص ۱۰۲)

مجم طبرانی میں ہے کہ قیامت کے روز بندوں کے گناہ تین طرح کے ہوں گے (۱) جس کی مغفرت نہیں ہوگی جیسے شرک لقولہ تعالیٰ: **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ لِمَن يَشْرِكْ بِهِ**،

(۲) جس کو چھوڑا نہیں جائے گا وہ حقوق العباد ہیں

(۳) جس کی خدا کو پروا نہ ہوگی اور وہ ہیں حقوق اللہ لقولہ تعالیٰ: **وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ**، مالک بن معقول کی تحقیق یہ ہے کہ اہل بدع کے گناہ کبائر ہیں، اور اہل سنت کے گناہ صغائر ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ بدعت کا شمار کبائر میں ہے، اور یہ جرم اہل سنت کے کبائر گناہ کے جرموں سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

بعض سلف نے فرمایا البدعة احب الی ابلیس من المعصية لان البدعة لا یتاب والمعصية یتاب، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی بدعت کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے، اس لئے اس سے توبہ کی امید نہیں ہوتی، اور گناہ برا سمجھ کر کیا جاتا ہے اس لئے اس سے توبہ کی توقع ہوتی ہے۔

### علامہ ابن قیم کی تحقیق

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں منہیات دو طرح کے ہیں،

(۱) جس کی ذات میں قباحت ہو، جیسے خود کشی، چوری، زنا، تہمت

(۲) جو گناہ کے مبادی و مقدمات ہوں جیسے لاجبیہ کو دیکھنا، چھوٹا بات چیت کرنا اس قسم کے گناہ صغائر میں داخل ہیں

حضرت مانو توئیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کی رائے بھی یہی تھی، امام نوویؒ کی تحقیق یہ ہے کہ استغفار کرنے سے کبیرہ بھی

صغیرہ ہو جاتا ہے، اور اصرار سے صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے، علامہ ابن قیمؒ نے مدارج النبوة میں لکھا ہے بندہ جس گناہ کو چھوٹا سمجھے وہ خدا کے نزدیک بڑا ہے، اور جس کو بندہ بڑا سمجھے وہ خدا کے نزدیک چھوٹا ہے، صغائر و کبائر کے بارے میں یہ علماء کے اقوال ہیں، جن کو اختصار کے ساتھ تحریر کیا گیا۔

### شرح حدیث

قوله ثلاثا: یعنی یہ جملہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کے سامنے تین بار بغرض تاکید ذکر فرمائی



قوله الاشرک باللہ: اس میں کفر بھی داخل ہے، خصوصیت کے ساتھ اس کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مرض عرب میں بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔

قوله وعقوق الوالدین: عقوق، عن سے ماخوذ ہے اس کے معنی قطع کے ہیں یعنی اچھا برتاؤ نہ کرنا، نافرمانی کرنا، اشرک باللہ کے ساتھ عقوق الوالدین اور شہادت الزور ایک ساتھ قرآن پاک میں بھی مذکور ہے، وقضی ربک الا تعبدوا الا ایتاء وبالوالدین احساناً، فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور،

### والدین کی نافرمانی کب جائز کب ناجائز؟

(۱) جن باتوں کے نہ جاننے سے دین میں نقصان ہو ان کا حاصل کرنا ضروری ہے، والدین اگر ان باتوں کے حاصل کرنے سے منع بھی کریں تو ان کی باتوں کو ماننا درست نہیں، خواہ اس علم کا تعلق اعتقاد سے ہو یا اس کا تعلق ظاہر اعمال سے ہو، جیسے وضو، نماز، روزہ وغیرہ یا باطن سے تعلق ہو، جیسے نیت، اخلاص، توکل، صبر، و شکر وغیرہ، یا اس علم کا معاصی سے تعلق ہو، جیسے شراب نوشی، سود خوری وغیرہ، یا عصمت و عفت سے ہو، جیسے زانیہ ہاتھ ہو جیسے چوری، یا باطن سے اس کا تعلق ہو، جیسے حسد، کبر، بدگمانی وغیرہ، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا علم فرض عین ہے، فرض عین کا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے، لہذا ان علوم کے حاصل کرنے سے والدین منع بھی کریں تو ان کی بات کو ماننا درست نہیں۔

اگر ان علوم کو حاصل کرنے کیلئے سفر کی ضرورت درپیش ہو تو سفر کیلئے والدین کی اجازت ضروری ہے، یا ان کی عدم اجازت کے باوجود سفر میں جانا جائز ہے؟

فقہانہ نے صراحت کی ہے کہ علم کی تین قسمیں ہیں: فرض عین، فرض کفایہ، مندوب، ضروریات دین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور روزمرہ کے معاملات کے مسائل کا علم ہر انسان پر فرض عین ہے اس سے زائد فرض کفایہ ہے اور علم دین میں گہرائی، تجربہ پیدا کرنا مندوب ہے، لہذا فرض عین اور فرض کفایہ علم حاصل کرنے کیلئے سفر کرنا ہو تو والدین کی اجازت ضروری نہیں، بشرطیکہ راستہ مامون ہو، اسی حکم میں سفر حج، اور سفر تجارت ہے، ہاں جہاد میں چونکہ غالب گمان ہلاکت کا ہوتا ہے اس لئے اس میں والدین کی اجازت ضروری ہے، کیونکہ والدین کی اجازت کا ثواب جہاد سے زیادہ ہے۔

(۲) اگر والدین سنت یا سبھ کو ترک کرنے کا حکم دیں یا کسی مکروہ کے کرنے کا حکم دیں تو اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ہمیشہ کے لئے ترک سنت کا حکم دیں تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی، کیونکہ اس میں شریعت کی تبدیلی ہوگی، جو حرام ہے، اس طرح حکم دینے سے والدین گنہگار ہوں گے اس لئے نہ ماننے ہی میں ان دونوں کے لئے خیر ہے، ہاں اگر اتفاقاً بھی ترک سنت کا حکم دیں اور وہ غیر مکروہ ہو تو والدین کی اطاعت ضروری ہے،

اور اگر سنت مکروہ کے ترک کرنے کا حکم دیں تو اگر ان کا یہ حکم اپنی ذاتی مصلحت اور فائدہ کے پیش نظر ہے تو ان کے مفاد کیلئے کبھی سنت مکروہ کو ترک کیا جاسکتا ہے، اور اگر ان کا کوئی مفاد نہیں بلکہ اولاد کے آرام کے خیال سے ترک سنت کا حکم دیا ہو تو ایسی حالت میں والدین کا حکم مان لینا ضروری نہیں بلکہ مستحب ہے ہاں اگر نہ ماننے میں والدین کو اذیت ہو تو پھر مان لینا ضروری ہوگا۔

اگر والدین اولاد کو اول وقت میں نماز پڑھنے سے روک دیں تو اگر ہمیشہ کے لئے روک دیں تو اطاعت نہیں کی جائے

کی، ہاں اگر کبھی اس طرح کا حکم دیدیں تو مان لینا ضروری ہوگا۔

بخاری شریف میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ اگر ماں بچہ کے راحت و آرام کا خیال کرتے ہوئے عشاء کی جماعت میں شرکت سے روک دے تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اس حکم کا ماننا ضروری نہیں ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمہ کے لئے روک دے تو پھر اس کے حکم کو نہ ماننا ضروری ہوگا، اسی طرح والدین کے پاس حلال اور پاکیزہ مال ہے والدین اپنے ہی ساتھ اولاد کو کھانے کا حکم دیں جبکہ اولاد جو مال استعمال کر رہی ہے وہ مشتبہ ہے تو ایسی صورت میں مشتبہ مال کو چھوڑ کر والدین کے ساتھ ہی کھانے کا حکم ماننا ضروری ہوگا۔

(۳) اسی طرح اولاد کو کسی مباح بات یا فعل نہ کرنے سے والدین کو تکلیف ہو تو ان کو راضی کرنے کیلئے وہ قول و فعل اولاد کیلئے ضروری ہو جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ والدین کے اوامر و نواہی کا اقتضال اس وقت ضروری ہے جبکہ معصیت نہ ہو

**قوله وشهادة الزور الخ:** زور، غلط باتوں کو اس انداز میں پیش کرنا کہ سننے والا اس کو صحیح باور کر لے، قرآن کا مقصد یہ ہے کہ باطل چیزوں کی بالکل شہادت نہ دی جائے، شہادۃ الزور کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹی شہادت دی جائے تاکہ اس کے ذریعہ کسی کا ناحق مال یا جان تباہ و برباد ہو جائے، ظاہر ہے کہ یہ شرک کے بعد بہت بڑا جرم ہے،

**قوله وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم متكثراً:** علماء نے اس سے یہ مسئلہ مستحفظ کیا ہے کہ امام، مفتی، اسی طرح اور معزز لوگ کسی تکلیف کی وجہ سے یا آرام کی غرض سے عوام کے سامنے فیک لگا کر بیٹھنا چاہیں تو ایسا کرنا جائز ہے، ہاں اس کی عادت نہیں بنانا چاہئے، مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے۔

**قوله الشراك بالله:** شرک کی دو قسمیں ہیں (۱) اکبر (۲) اصغر

شرک اکبر بلا تو بہ کے معاف نہیں ہو سکتا، اکبر سے مراد اللہ کی ذات صفات میں کسی کو شریک کر دینا، شرک اصغر جیسے ربوا، غیر اللہ کی قسم، حدیث میں ہے من حلف بغیر اللہ فقد اشرك، اس کی معافی ہو سکتی ہے

**لقوله تعالى ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء:**

**قوله الموبقات:** ہلاک کرنے والی چیزیں،

**کیا سحر سے حقیقت بدل سکتی ہے؟**

**قوله السحر:** سحر کی حقیقت میں اختلاف ہے، بعض لوگ اس کو ایک خیالی چیز مانتے ہیں، ابو بکر رازی، معتزلہ، ابن حزم ظاہری کا یہی خیال ہے، امام نووی کی تحقیق یہ ہے کہ سحر کی ایک حقیقت ہے، محض خیالی نہیں کہا جاسکتا، جمہور کی بھی یہی رائے ہے، کتاب و سنت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد اختلاف اس بات میں ہے کہ کیا سحر میں اتنی طاقت ہے کہ دو چیزوں کے حقائق کو بدل ڈالے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا اثر بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ حراج میں تبدیلی آ جاتی ہے، مثلاً تندرست آدمی بیمار ہو جاتا ہے، جمہور کا یہی نظریہ ہے، البتہ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ اسکے ذریعہ حیوانات کو جمادات سے، جمادات کو حیوانات سے بدلا جاسکتا ہے، مگر اس دعویٰ پر کوئی معقول دلیل نہیں ہے، سحر کی قسموں سے متعلق تفصیل مذاہب اور کچھ اصول و واقعات کے لئے دیکھئے مظاہر حق۔

## معجزہ و سحر میں فرق

معجزہ اور سحر میں کوئی التباس ہی نہیں، یہ دونوں چیزیں اپنی ماہیت اپنے فاعل اور اپنی غایت ہر لحاظ سے ممتاز ہیں، معجزہ کا ظہور، تضرع و اجتہاد اور کلک طیبہ سے ہوتا ہے، اور سحر کا کلمات شرکیہ، نفسی توجہ، اور وادح خبیثہ کی استعانت سے، صاحب معجزہ قدسی صفات ہوتا ہے اور ساحر خبیث النفس، معجزہ کی غرض و غایت معرفت ربوبیت اور نجات آخرت ہوتی ہے، جبکہ سحر کا مقصد متاع دنیا، صاحب معجزہ کا انجام نجات و فلاح ہے اور ساحرین کا ناکامی اور نامرادی، دونوں کا فرق مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے

(۱) معجزہ قدرت کا فعل اور ایک آیت ربانیہ ہوتا ہے، اور سحر ساحر کا اپنا ہوا کھیل

(۲) معجزہ نبی کے ارادہ کے تابع نہیں ہوتا، کہ جب وہ چاہے دکھائے اور سحر ساحر کے اپنے ارادہ کے تابع ہوتا ہے وہ جب چاہے دکھا سکتا ہے، اسی لئے حضرت موسیٰ کے معجزہ کو ساحرین نے آکر دیکھ لیا تو ان کو اعتراف کرنا پڑا کہ معجزہ قدرت بشری سے خارج ہوا کرتا ہے، چنانچہ وہ فوراً رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لانے کے لئے مجبور ہو گئے، پھر اس فیصلہ کیلئے کوئی مدت خرچ نہیں ہوئی، بلکہ جو نبی دونوں مقابل ہوئے بس فوراً ہی وقت دونوں حقیقتیں نور و ظلمت کی طرح ممتاز ہو گئیں۔ (۱)

## سحر کی شرعی حیثیت

لام مالکؒ اور ایک جماعت نے ساحر پر کفر کا فتویٰ دیا ہے مگر دوسرے حضرات کے یہاں تفصیل ہے ہمارا مسلک یہ ہے کہ ساحر فاسق ہے اور سحر سیکھنا حرام ہے، ہاں اگر اس میں غیر اللہ کی عبادت کرنا پڑے یا خدا کی طرح اس کی تعظیم کرنی پڑے، یا اعتقاد ہو کہ وہ مؤثر بالذات ہے اور اسکی تمام قسموں کو مباح سمجھے تو وہ کفر ہے ورنہ فسق۔ (۲)

لام مالک کے نزدیک سحر کا سیکھنا مکھانا کفر ہے، اور ان کے یہاں ساحر کو قتل کر دیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، خواہ کسی مسلمان پر سحر کرے یا نہی پر، (۳)

قوله والتولی يوم الزحف: ”زحف“ مشقت سے چلنا، زحف الصبی سے ماخوذ ہے اس بچہ کے لئے بولا جاتا ہے جو سرین کے بل چلے قرآن میں ہے ومن یولیہم یومئذ ذبۃ، اس کی تفسیر سید علامہ آلوسی نے روح المعانی میں ان لفظوں کے ساتھ کی ہے۔

## میدان جنگ سے بھاگنا کب جائز ہے؟

اس آیت میں لڑائی سے بھاگنے کو حرام بتلایا گیا ہے، یہ اس صورت میں ہے جب کافروں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلہ میں دگنی سے زیادہ ہو، ورنہ فرار جائز ہے، لقولہ تعالیٰ اللہ خفف عنکم وعلیم ان فیکم ضعفاً، اس سے معلوم ہوا کہ پہلی آیت اپنے عموم پر باقی نہیں ہے، اکثر علماء کا یہی خیال ہے۔ (۴)

لام شافعیؒ اور ابن ابی شیبہؒ نے عبد اللہ ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے جو شخص ۳/ کافر کے مقابلے میں بھاگ جائے وہ فرار میں داخل نہیں ہے اور جو شخص دو کے مقابلہ میں بھاگ جائے وہ فرار کے تحت آجاتا ہے،

لام محمدؒ فرماتے ہیں مسلمان جب بارہ ہزار کی تعداد میں ہوں تو پھر فرار جائز نہیں ہے، اتنی تعداد ہوتے ہوئے پھر قلت

کی وجہ سے ہزیمت نہیں ہو سکتی، بلکہ ہزیمت ہوئی بھی تو اس کے کچھ اور اسباب ہو سکتے ہیں،

قوله وقذف المحصنات: محصن، پاکدامن عورت، یعنی پاکدامن عورت کو زنا کی تہمت لگانا، محصن بفتح الصاد ہے اور بالکسر اسم فاعل بھی ہو سکتا ہے، یعنی جس کو خدا نے پاکدامن بنایا اور جس نے اپنی شرمگاہ کو زنا سے محفوظ رکھا۔  
قوله المؤمنات: مومنات کی قید سے کافر عورتیں نکل گئیں کافر عورتوں کو تہمت لگانا گناہ کبیرہ میں داخل نہیں ہے، اگر ذمیہ ہو تو اس کو معہم کرنا گناہ صغیرہ ہے، اور حد واجب نہیں ہے، مومنہ باندی کو تہمت لگانے سے تحریر واجب ہے، حد نہیں، مام جو سزا جو بیز کر دے پاکدامن مرد کو معہم کرنے کا حکم بھی یہی ہے۔

قوله ویسب ابی الرجل: سب فتح چیزوں کو صاف صریح لفظوں میں ظاہر کرنا، کدے اخلاق کے لوگ اس قسم کے الفاظ کو بے تحجک استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں، شریف لوگ ان باتوں سے گریز کرتے ہیں، اور بوقت ضرورت، اشارات، کنایات سے ظاہر کرتے ہیں گندے الفاظ کے استعمال کی وجہ یا تو کسی کو اذیت پہنچانا ہوتا ہے، یا خراب لوگوں کی صحبت میں رہنے سے اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، ایک اعرابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے اللہ سے ڈرنے کی ہدایت فرمائی اور فرمایا کہ اگر کوئی تمہاری شان میں نامناسب الفاظ استعمال کرے جو واقعی تمہارے اندر پائے جاتے ہیں تو تم اس کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال نہ کرنا، اگرچہ ان باتوں کا علم تم کو کیوں نہ ہو، اگر ایسا کر لو گے تو یہ ان کے لئے وبال ہو گا، اور تمہارے ثواب کا باعث ہو گا کسی کو بھی سب و شتم ہرگز ہرگز مت کرنا، اعرابی کا بیان ہے کہ میں نے اس کے بعد کسی کو برا بھلا نہیں کہا۔

عیاض بن حماد کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری برادری کے کتر لوگ بچہ کو گالی دیدیں تو کیا میں ان سے بدلہ لے سکتا ہوں تو آپ نے فرمایا المتسابان شیطانان، (۱) معلوم ہوا کہ گالی کا بدلہ گالی سے نہیں دینا چاہئے (۲) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بدلہ لیا جاسکتا ہے روایت میں جو ممانعت ہے وہ نہی تنزیہی ہے ان کی دلیل قوله علیہ السلام، المتسابان ما قالا فعلی البادی حتی یقتدی المظلوم وفي رواية ما لم یقتد المظلوم، (۳)

## باب تحريم الکبر و بیانه

کبر کی حرمت اور اس کا بیان

وحدثنا محمد بن مثنی ..... عن عبد الله بن مسعود عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر قال رجل ان الرجل يحب ان يكون ثوبه حسنا ونعله حسنة قال ان الله جميل يحب الجمال، الكبر بطر الحق وغمط الناس،  
وفي رواية عن عبد الله لا يدخل النار احد في قلبه مثقال حبة خردل من ايمان ولا يدخل الجنة احد في قلبه حبة خردل من كبرياء،

وفی روایۃ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ

مثقال ذرۃ من کبر، (مسلم ص ۶۵، ابوداؤد ص ۵۶۶، ترمذی ص ۲۰/۲، احمد ۱/۳۹۹)

ترجمہ عبد اللہ بن مسعودؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس کے دل میں کبر ذرہ برابر بھی ہو گا وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا، ایک شخص نے کہا کہ آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کپڑا عہدہ اور اس کا جو نامعہ ہو، تو آپ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال اس کو پسند ہے کبر: حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو وہ جہنم میں نہیں جائے گا اور جس کے دل میں رائی کے برابر کبر ہو تو وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔

مقصد :- اس کے بعد ہی امام مسلم نے ”من مات لا یشرک باللہ شیئاً دخل الجنۃ“ کے باب کو ذکر فرمایا ہے، ان دونوں بابوں میں اللہ تعالیٰ کی دو متضاد صفوں کو ظاہر کرتا ہے (۱) صفت انتقام جسکو صفت جلال کہا جاتا ہے (۲) اور دوسری صفت عنایت و نوازش جس کو صفت جمال کہا جاتا ہے، بندوں کو چاہئے کہ اللہ کی دونوں صفوں پر نگاہ رکھیں صرف جلال پر نظر رہے گی تو مت ٹوٹ جائے گی، اور صرف جمال پر نظر ہوگی تو دلیر اور جری ہو جائے گا، اسی لئے ان دونوں صفوں کو ایک جگہ قرآن میں جمع کر دیا گیا ہے، نبی عبادی انی انا الغفور الرحیم وان عذابی هو العذاب الالیم،

### کبر اور خود پسندی

خود پسندی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اچھی حالت میں اپنے کو اچھا سمجھنے لگے اور خدائی عنایتوں کو بھول جائے یعنی خود پر نظر ہو، خدا پر نظر نہ ہو اور اگر اپنی اچھائی کے ساتھ غیروں کو حقیر بھی سمجھنے لگے تو اسی کا نام کبر ہے، کبر کا لائق درجہ یہ ہے کہ اپنے سوا دوسری خلق خدا کو حقیر سمجھے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اللہ سے بھی اپنے کو بڑا سمجھنے لگے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دے، قولہ قال رجل: قاتل سولہ ابن عمرو انصاری ہیں۔

### عمدہ کپڑا پہننے کی حد

قولہ یحب ان یکون ثوبہ حسنا الخ: حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ جو شخص اچھا لباس محض اس مقصد سے استعمال کرے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہو، اور اسکے نتیجے میں خدا کا شکر ادا کیا جائے اور جسکے پاس اس قسم کا لباس نہ ہو اس کو حقیر نہ سمجھا جائے تو اگر اس لباس کا استعمال مباح ہو تو انتہائی نفیس ہونے کے بعد بھی اس کا استعمال جائز ہو گا، جیسا کہ ترمذی میں اسی مضمون کی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ان اللہ یحب ان یرى اثر نعمته علی عبده،

عوف ابن مالک کا بیان ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے والد کو معمولی لباس میں دیکھا تو فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو مال عنایت فرمادیں تو اچھے لباس استعمال کرنا چاہئے، تاکہ خدا کی نعمتوں کا اثر بھی اس پر ظاہر ہو، اور غریب و مساکین ان کو دودل سے سمجھ کر اپنی ضروریات ان سے مانگ کر پوری کریں ہاں اہراف کی حد سے بچنا چاہئے، اعتدال کو باقی رکھنا چاہئے، روح البعانی میں ہے کہ امام ابو حنیفہ چار سو دینار کی چادر استعمال کرتے تھے، اور اپنے والد ارشاد کروں کو اس کی تاکید فرماتے تھے امام محمد نفیس لباس استعمال کرتے تھے، اور اس کی وجہ بیان کرتے تھے کہ میں اس لئے ایسا کرتا ہوں کہ میری بیویوں اور

باندیوں کی نگاہ غیروں پر نہ اٹھے۔

رہا حضرت عمرؓ کا بیوہ لگے کپڑوں کا استعمال کرنا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المومنین تھے اگر آپ قیمتی لباس استعمال کرتے تو آپ کے عمال بھی آپ کی پیروی میں قیمتی لباس استعمال کرتے اور جب اپنے پاس مال نہ ہوتا تو مسلمانوں کے مال سے پورا کرنے لگتے، اس مصلحت سے حضرت عمرؓ معمولی لباس استعمال کرتے تھے۔

### جمیل کا معنی اور مصداق

قوله ان الله جميل يحب الجمال:

قاموس میں ہے جمال ظاہری، باطنی اچھائیوں کا نام ہے قرآن میں ایک جگہ آیا ہے ولکم فیہا جمال، اس کے معنی حسن اور خوبی کے ہیں، ممکن ہے اونٹ کو جمل اس لئے کہا جاتا ہے کہ اہل عرب اونٹوں کو جمال کا سبب سمجھتے ہوں، سیبویہ جمال کا ترجمہ اعلیٰ حسن سے کرتے ہیں، راغب حسن کثیر کو جمال کہتے ہیں۔

اس کی دو قسمیں ہیں (۱) صرف اپنے ہی بدن اور اپنے ہی ذات و فعل تک محدود ہو (۲) ان اچھائیوں سے دوسرے لوگ مستفید ہوں ان الله جميل يحب الجمال سے یہی دوسرے معنی مراد ہیں، کیونکہ اللہ کے فیوض و نکالات سے بندے مستفید ہو رہے ہیں، (کذا فی قاج العروس)

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ جمال کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ اس کا اطلاق رنگ کی اچھائی اور اعضاء کے تناسب پر ہوتا ہے، اخلاق پر جمیل کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جبکہ صفات اچھے ہوں اور افعال پر اس وقت جبکہ مصلحت کے مناسب فعل ہو، یعنی جو فعل دفع مضرت اور جلب منفعت پر مشتمل ہو، امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جمیل کا اطلاق مسلم کی صحیح حدیث میں مذکور ہے البتہ یہ خبر واحد ہے، اور اسلمہ حسنی کے بعض حکم فیہ روایات میں بھی جمیل کا نام ملتا ہے، اس لئے علماء مذہب یہ ہے کہ جمیل کا اطلاق خدا پر ہو سکتا ہے، اگرچہ بعض علماء اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔

قوله غمط الناس: غمط بفتح الغین وسكون الميم، کسی کو حقیر سمجھنا۔

بطر: بفتح الباء والطاء، اصل ترجمہ اس کا لغت کے وقت سرکشی کرنا، اور تکبر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، بطر الحق کے معنی اپنے کو بڑا سمجھ کر حق بات کو دفع کر دینا، انکار کر دینا۔

### کیا متکبر جنت میں نہیں جائے گا؟

حدیث میں مذکور دو عید کہ ذرہ برابر کبر کے ہوتے ہوئے جنت میں داخل نہ ہونے کی اہل سنت والجماعت کے یہاں مختلف توجیہات ہیں،

علامہ خطابی سے دو توجیہیں منقول ہیں

(۱) کبر سے مراد اگر ایمان سے تکبر کرنا مراد لیا جائے یعنی ایمان نہ لانا، تو ظاہر ہے کہ تکبر کی موت اسی حالت میں اگر واقع ہو گئی تو کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا،

(۲) اللہ تعالیٰ دخول جنت سے قبل کبر کو دل سے نکال دیں گے جیسا کہ قرآن میں ہے ونزعنا ما فی صدورهم

من غلّ، لیکن علامہ خطابی کی دونوں تاویل میں بعد ہے، کیونکہ یہ حدیث اس کبر کی مذمت میں آئی ہے، جو معروف و مشہور ہے یعنی اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا اس لئے بہتر وہ تاویل ہے جس کو قاضی عیاض نے ذکر فرمائی ہے، (۳) کہ اگر اللہ کبر کا بدلہ دیتا چاہیں گے تو بغیر سزا جنت میں داخلہ ممکن نہ ہو گا۔ (۴) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبر کی خاصیت اور اس کا مزاج بتلایا گیا ہو، یعنی کبر کی خاصیت یہ ہے کہ تکبر کو جنت میں جانے نہ دے گا، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ اپنے فضل و کرم سے داخل کر دیں تو یہ اس کا احسان ہو گا، بعض لوگ کہتے ہیں متقیوں کے ساتھ اول و ہلہ میں تکبر جنت میں نہیں جائیں گے اس قسم کے جوابات پہلے بھی گزر چکے ہیں، ان کو پیش نظر رکھا جائے،

## باب الدلیل علی ان من مات لا یشرک باللہ شیئاً دخل الجنة وان مات مشرکاً دخل النار

جو شخص شرک سے پاک ہو کر فوت ہو جائے تو وہ جنت میں جائے گا اور جو شرک کی حالت میں مرے وہ جہنم میں جائے گا

❦ حدیث ❦ وحدثنا محمد بن عبد الله بن نمير ..... عن عبد الله قال وكيع قال رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال ابن نمير سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من مات يشرک بالله شیئاً دخل النار وقلت انا ومن مات لا یشرک بالله دخل الجنة،

حدثنا ابو بکر بن ابی شیبہ عن جابر قال اتی النبی ﷺ رجل فقال یا رسول الله ما الفوجبتلن؟ قال من مات لا یشرک بالله شیئاً دخل الجنة، ومن مات یشرک بالله شیئاً دخل النار وحدثنی محمد بن مثنی وابن بشار ..... عن المعزود بن سويد قال سمعت ابا ذر یحدث عن النبی ﷺ انه قال اتانی جبرئیل علیه السلام فبشّرني انه من مات من اتقک لا یشرک بالله شیئاً دخل الجنة قلت وان زنی وان سرق، قال: وان زنی وان سرق، وفي رواية قال ابو ذر قال: اتیت النبی ﷺ علیه وسلم وهو قائم علیه ثوب ابيض ثم اتیت فاذا هو قائم ثم اتیت وقد استیقظ فجلسک اليه فقال ما من عبد قال لا اله الا الله ثم مات علی ذالك الا دخل الجنة قلت وان زنی وان سرق؟ قال: وان زنی وان سرق ثلاثاً ثم قال فی الرابعة علی رغم انف ابی ذر قال فخرج ابو ذر وهو یقول وان رغم انف ابی ذر،

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جس کی موت شرک کی حالت میں ہو وہ جہنمی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ میں یہ کہہ دوں کہ جس کی موت ایمان پر ہو جائے وہ جنتی ہے

حضرت جابر سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ وہ کون سی دو چیزیں واجب کرنے والی ہیں؟ آپ نے فرمایا جس شخص کی موت ایمان پر ہو وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس کی موت

شرک پر ہو وہ جہنم میں جائے گا۔

حضرت ابوذرؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل علیہ السلام نے آکر دشخبری دی کہ آپ کی امت میں جس فرد کی موت اس حالت میں ہو جائے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو تو وہ بنتی ہے (ابوذر کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا اگرچہ اس سے زنا اور چوری کا بھی صدور ہو، آپ نے فرمایا اگرچہ زنا اور چوری صدور ہی کیوں نہ ہو۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آرام فرما رہے تھے، اور آپ کے بدن مبارک پر سفید کپڑا تھا، پھر میں آیا تو آپ بیدار ہو چکے تھے، میں آپ کے پاس بیٹھ گیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس بندہ کی موت لا الہ الا اللہ پر ہوئی وہ جنتی ہے، میں نے عرض کیا اگرچہ اس نے چوری اور زنا (جیسے کبائر کا) ارتکاب کیا ہو، آپ نے فرمایا اگرچہ چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو، میں نے پھر عرض کیا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو، آپ نے پھر عرض فرمایا، چوتھی مرتبہ میرے اصحاب پر فرمایا ہاں اگرچہ ابوذر کو کتنا ہی ناگوار گزرے، راوی کا بیان ہے کہ ابوذر نکلے تو (وان دغم انف ای ذل) ان کی زبان پر باری تھا۔

### مقصد حدیث

(مقصد) آدمی بچا رہے کی پروا نہ کی جائے یہ غریب رحمت کی وسعت کا اندازہ لگائے بھی تو کیا لگائے، ایک کلمہ سے عمر بھر کے جرم کی معافی کا اعلان سنتا ہے تو حیرت میں پڑ جاتا ہے، لوہر دیکھتا ہے کہ جو زبان اس کا اعلان کر رہی ہے وہ مبالغہ آمیزی کی عادی نہیں ہے، اس لئے مسرت و حیرت کے درمیان وہ اس سوال کو بار بار دہرانے کے لئے مضطرب ہو جاتا ہے کہ کیا بڑے سے بڑا پالی جنت میں چلا جائے گا؟

حضرت ابوذرؓ کی زبانی ابھی آپ نے پڑھا وہ چاہتے ہیں کہ اپنے کانوں کے ناز سائی اور قصور فہم کے جتنے بھی سوانح ہو سکتے ہیں سب کو صاف کریں اور یقین کریں کہ ان کے کانوں نے سننے میں غلطی تو نہیں کی؟ عقل نے سمجھنے میں ٹھوکر نہیں کھائی، حضرت ابوذرؓ کے اس عالم حیرت کو ختم کرنے کیلئے یہی ایک تدبیر کارگر ہو سکتی تھی کہ ان سے ایسا محبت بھرا کلمہ سرزنش کے طور پر کہہ دیا جائے جو ان کی حیرت کو ختم کر دے، اور اپنی لذت کو ان کے سینہ میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ جائے اسی لئے جب حضرت ابوذرؓ اس روایت کو بیان فرماتے تو ساتھ ہی اس کتاب آمیز تلمظ کو بھی ذکر کر دیتے خود مخطوط ہوتے اور ذوق محبت رکھنے والوں کو بھی محبت کی ان تلمیخوں کو لہجہ لادلا کر مخطوط کرتے۔

### تفصیلی حدیث

بخاری کتاب الرقاق میں حضرت ابوذرؓ کی روایت تفصیل سے بیان کی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں رملت میں باہر نکلا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا جاتے ہوئے دیکھا میں چاندنی سے ہٹ کر اندھیرے اندھیرے میں چلا رہا، آپ نے رخ پھیرا تو مجھے دیکھ کر فرمایا کون ہو؟ میں نے کہا آپ پر قربان میں ہوں ابوذر، فرمایا اے ابوذر یہاں آؤ، میں کچھ دیر آپ کے ساتھ ساتھ چلا رہا، پھر آپ نے فرمایا جو لوگ یہاں بہت



مالدار ہیں قیامت میں وہی سب سے زیادہ نادار ہوں گے، مگر صرف وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا تو اس کے دامن بائیں آگے پیچھے چاروں طرف خرج کیا، اور خوب اچھے اچھے کام کئے پھر میں تھوڑی دیر ساتھ چلا تو مجھ سے فرمایا یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے ایک صاف میدان میں بٹھادیا، جس کے ارد گرد پتھر ہی پتھر تھے، اور فرمایا جب تک میں واپس نہ آؤں یہیں بیٹھے رہنا، اسکے بعد آپ سنگستان کی طرف تشریف لے گئے، یہاں تک کہ میری نظروں سے غائب ہو گئے، آپ کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی واپس آئے تو میں نے سنا آپ یہ کہتے ہوئے آرہے تھے اگرچہ چوری کی ہو، اگرچہ زنا کیا ہو، جب میرے پاس تشریف لائے تو مجھ سے رہنا گیا آخر میں نے پوچھ ہی لیا یا نبی اللہ آپ پر قربان ہوں اس سنگستان میں آپ کس سے بات چیت کرتے آرہے تھے، میں نے تو آپ کو جواب دیتے ہوئے کسی کی آواز نہیں سنی، فرمایا یہ جبرئیل تھے اس سنگستان میں میرے پاس آئے تھے یہ کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جو شرک سے پاک و صاف ہو کر مرے وہ ضرور جنتی ہے، میں نے کہا لے جبرئیل اگرچہ اس نے چوری اور زنا کیا ہو، انہوں نے کہا جی ہاں میں نے پھر کہا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کیا ہو، انہوں نے فرمایا جی ہاں اگرچہ شراب بھی کیوں نہ پی ہو۔ (بخاری ص ۹۵۳)

**شرح** زنا سے مراد وہ گناہ ہے جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو اور سرقہ سے حق العباد مراد ہے ممکن ہے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے داخل اولیٰ مراد لے رہے ہوں، حالانکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد مطلق دخول ہے چاہے سزا بھگت کر جنت میں داخل ہو یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے معاف کر دیں، اور ابتداء ہی جنت میں داخل فرمادیں۔ اس روایت سے یہ بات صراحتہ معلوم ہوتی ہے کہ مرکب کبیرہ دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا، جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔

رغم: بالفتح خاک آلود ہونے کے معنی میں ہیں، اور مجازاً ناکواری اور ذلت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، قال وکیع قال رسول اللہ وقال ابن نمیر سمع رسول اللہ الخ: ”سند میں اس عبارت کے ذریعہ امام مسلمؒ راوی حدیث حضرت وکیع اور حضرت ابن نمیر کے اختلاف الفاظ کو واضح کرنا چاہتے ہیں، کہ ابن نمیر نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول سماعت لا کر اس روایت کو متصل ظاہر کیا، جبکہ حضرت وکیع انہی سے نقل کرتے ہوئے قال رسول اللہ کہا، اب غور طلب یہ بات ہے کہ صحابی خود قال کے ذریعہ حدیث نقل کرے، تو وہ حدیث متصل کہلائے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ محشر کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ متصل کہی جائے یا منقطع، جمہور متصل مانتے ہیں جس طرح کہ سماعت کے ذریعہ، مگر ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ جب تک اتصال پر کوئی دلیل نہ ہو اس وقت تک متصل نہیں کہہ سکتے، گویا اس مذہب کے مطابق یہ حدیث مرسل کہلائے گی، اب پھر دوسرا اختلاف ان کے درمیان یہ ہے کہ مرسل صحابی حجت ہے یا نہیں؟ جمہور کے نزدیک حجت ہے جبکہ ابواسحاق اسرافینی کے نزدیک حجت نہیں، اب یہ حدیث تو حصلاً و مرسلانوں طریق سے مروی ہوئی، تو ایسی روایت جو متصل بسند ہو اور مرسل بسند ہو تو اس کے حجت ہونے میں بھی اختلاف ہے، غرض امام مسلمؒ نے احتیاط کے طور پر دونوں سند ذکر کر دی۔“ م

من مات یشرک باللہ شیئاً دخل النار: ”اس حدیث میں شرک پر دخول ناری کی وعید مرفوعاً مذکور ہے، جبکہ ایمان پر دخول جنت کا وعدہ ”وقلت انا ومن مات ولا یشرک باللہ شیئاً دخل الجنة“ کے الفاظ سے موقوفاً مذکور ہیں،

علامہ حمیدی فرماتے ہیں کہ حضرت وکیع کی سند میں وہم راوی ہے ورنہ دراصل دخول جنت کا وعدہ مرفوعاً اور دخول نارہی وعید موقوفاً نہ کر ہے، امام نووی وہم راوی کا قول قبول نہیں کرتے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے یہ دونوں جملے حضور سے دو دفعہ سنا لیکن ایک دفعہ ایک یاد رہا، اور دوسرے پر شبہ رہا، تو یقینی طور پر محفوظ جملہ کو مرفوعاً اور دوسرے کو موقوفاً کر فرمایا، ورنہ دوسری دفعہ اس کے برعکس معاملہ رہا، تو اس طرح بیان فرمایا مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فتح المکرم، ص ۲۵۸/۱۔ "م

﴿ حَدِیْثٌ ﴾ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مِثْنَى وَابْنُ بَشَّارٍ ..... عَنْ مَعْرُورٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا ذَرٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَتَانِي جِبْرِئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَبَشَّرَنِي ..... قُلْتُ: وَإِنْ زَنَيْتُ وَإِنْ سَرَقْتُ،

اس روایت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان پر دخول جنت کی بشارت کو سن کر "وَإِنْ زَنَيْتُ وَإِنْ سَرَقْتُ" کا لفظ خود حضرت آقا ﷺ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا جبکہ ما قبل کی روایت سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ حضرت ابو ذرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا، اس طرح گویا ایک قسم کا تضاد معلوم ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جب حضرت جبرئیل نے یہ بشارت سنائی تو آپ نے یہ جملہ بطور طلب وضاحت ارشاد فرمایا، اور جب آپ نے یہ بشارت ابو ذرؓ کو سنائی تو انہوں نے یہ جملہ بطور تعجب و حیرت عرض کیا، اس طرح دونوں حضرات کی طرف اس کی نسبت الگ الگ موقع پر بھیج ہو جاتی ہے۔ "م

## باب تحریم قتل الکافر بعد قوله لا اله الا الله

کافر کو لا اله الا الله کہنے کے بعد قتل کرنا حرام ہے

(۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ ..... عَنْ الْمَقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ قَالَ: يَارَسُولَ اللَّهِ! إِنْ لَقِيتُ رَجُلًا مِنَ الْكُفَّارِ فَقَاتَلَنِي فَضَرَبَ إِحْدَى يَدَيَّ بِالسَّيْفِ فَطَعَنَنِي ثُمَّ لَازِمَنِي بِشَجَرَةٍ فَقَالَ: أَسْلَمْتُ لِلَّهِ أَفَأَقْتُلُكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! بَعْدَ أَنْ قَاتَلَهَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقْتُلْهُ قَالَ فَقُلْتُ يَارَسُولَ اللَّهِ! إِنَّهُ قَدْ قَطَعَ يَدَيَّ ثُمَّ قَالَ ذَلِكَ بَعْدَ أَنْ قَطَعَهَا أَفَأَقْتُلُكَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقْتُلْهُ فَإِنْ قَتَلْتَهُ فَإِنَّهُ بِسَنَائِكَ قَبْلَ أَنْ تَقْتُلَهُ وَإِنَّكَ بِمَنْزِلَتِهِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ كَلِمَتَهُ الَّتِي قَالَ.

(۱) وَحَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ ..... عَنْ أَسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ وَهَذَا حَدِيثُ ابْنِ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ لَقِينَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَرِيَّةٍ فَصَبَّحْنَا الْخُرْقَاتِ مِنْ جُهِينَةٍ فَأَذْرَكْتُ رَجُلًا فَقَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَطَعَنَنِي فَوَقَعَ فِي نَفْسِي مِنْ ذَلِكَ فَذَكَرْتُهُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقَالَ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَقَتَلْتَهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّمَا قَاتَلَهَا خَوْفًا مِنَ السَّلَاحِ قَالَ أَفَلَا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهِ حَتَّى تَعْلَمَ أَقَالَهَا أَمْ لَا، فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا عَلَيَّ حَتَّى تَتَبَّيْتُ أَنِّي أَسْلَمْتُ يَوْمَئِذٍ، قَالَ فَقَالَ سَعْدٌ وَإِنَّا وَاللَّهِ لَا أَقْتُلُ مُسْلِمًا حَتَّى يَقْتُلَهُ ذُو النُّطَيْنِ يَعْنِي أَسَامَةَ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ أَلَمْ يَقُلْ اللَّهُ وَقَاتَلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونُوا فِتْنَةً وَ يَكُونُوا لِلدِّينِ كَلَّةً لِلَّهِ فَقَالَ سَعْدٌ قَدْ قَاتَلْنَا حَتَّى لَا تَكُونُوا فِتْنَةً وَأَنْتَ وَأَصْحَابُكَ تَرِيدُونَ أَنْ تَقَاتِلُوا حَتَّى تَكُونُوا فِتْنَةً.

(۳) وفي رواية قال فكيف تصنع بلاء الله إلا الله إذا جلت يوم القيامة فقال يا رسول الله استغفر لي قال فكيف تصنع بلاء الله إلا الله إذا جلت يوم القيامة قل لا يزيدك على أن يقول كيف تصنع بلاء الله إلا الله إذا جلت يوم القيامة، قال ففعل لا يزيدك على أن يقول كيف تصنع بلاء الله إلا الله إذا جلت يوم القيامة.

ترجمہ مقداد ابن اسود سے روایت ہے انہوں نے کہا یا رسول اللہ اگر کافروں میں سے کسی شخص سے میرا مقابلہ ہو جائے اور وہ مجھ سے جنگ کرنے لگے اور میرا ایک ہاتھ تنکوار سے کاٹ دے پھر مجھ سے ایک درخت کی پناہ لے اور کہے کہ میں خالص اللہ کے واسطے اسلام قبول کرتا ہوں تو یا رسول اللہ اس کلمہ کے بعد کیا میں اس کو قتل کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا ہرگز نہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ اس نے تو یہ کلمہ اس وقت کہا ہے جب پہلے میرا ہاتھ کاٹ لیا ہے، پھر میں اسے کیسے قتل نہ کروں؟ آپ نے فرمایا ہرگز قتل نہ کرنا، کیونکہ اگر اسے قتل کر دو گے تو اب چونکہ وہ ویسا ہی قاتل احرام مسلمان ہو گیا ہے جیسا تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم اب اسی طرح مباح الدم ہو جاؤ گے جیسا وہ اس کلمہ کے پڑھنے سے پہلے تھا۔

اسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قبیلہ حرقہ سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہم نے صبح صبح ان پر چھاپ مارا میں نے ایک شخص کو پایا جس نے لا الہ الا اللہ کہا، اس کے باوجود میں نے اس کو نیزہ مارا میرے دل میں شبہ ہوا تو اس کا تذکرہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کر ڈالا؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس نے ہتھیار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تو آپ نے فرمایا پھر تم نے ان کے دل کو چیر کر کیوں نہیں دیکھا؟ یہاں تک کہ تم کو حقیقت حال کا علم ہو جاتا، کہ کلمہ اس کے دل میں ہے یا نہیں؟ اس کلمہ کا بار بار آپ تکرار فرماتے رہے یہاں تک کہ مجھے ترنا ہونے لگی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوتا (راوی کہتے ہیں) حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ بخدا میں مسلمان کو اس وقت تک قتل نہ کروں گا جب تک کہ پیٹ والے یعنی حضرت اسامہؓ قتل نہ کریں راوی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ کیا اللہ کا یہ فرمان نہیں ہے ”تم لوگ جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کا باقی رہ جائے“ اس پر حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ ہم نے جنگ کر کے فتنے کا قلع قمع کر دیا، اور حیر اور خیرے ساتھیوں کا مقصد ہے کہ جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ پیدا ہو جائے۔

اس سے قبل بتایا گیا کہ اقرار توحید و رسالت، انسان کو جنت کا مستحق بنادیتا ہے، اور اسلام اس کو مقصد حدیث مسلمان کے لقب سے نوازتا ہے، یہاں اس امر کو واضح کرتا ہے یہ اقرار ہر حال میں معتبر ہے، اور ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اس کو اپنے جیسا مسلمان سمجھے خواہ ظاہر حال اس کے مخلص نہ ہونے کی غمازی کرتا ہو، شرح حدیث سے پہلے وجود ایمان کی شکلوں پر غور کریں،

### وجود ایمان کی تین شکلیں

کسی چیز کے عالم میں وجود کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) معنی۔ ان تینوں قسموں میں لفظی وجود سب سے کمزور وجود ہے، کیونکہ جو مقاصد و اغراض کسی شئی کے وجود میں ملحوظ ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس وجود

لفظی پر مرتب نہیں ہوتے، اس لئے اس وجود کو اگر عدم کے برابر کہا جائے تو بے جا نہیں ہو گا، پانی کا لفظی وجود کسی پلاس کی پیاس نہیں بجھاتا، اور نہ روٹی کا صرف ذہانی تذکرہ کسی بھوکے کے پیٹ کو بھر سکتا ہے۔

(۲) وجود ذہنی گو لفظی وجود سے قوی تر ہے مگر شکی کے تمام آثار و احکام مرتب ہونے کے لئے یہ بھی نا کافی ہے،

(۳) وجود معنی جو خارج میں کسی کے اعتبار کے بغیر موجود ہوتا ہے اسی وجود کو درحقیقت وجود کہا جاسکتا ہے، اسی لئے جب

کوئی پیاس پانی مانگتا ہے تو اس کا مقصد یہی معنی وجود سمجھا جاتا ہے اور اس کا لفظی بلا ذہنی وجود کسی کے خواب و خیال میں نہیں آتا۔ اسی طرح ایمان کے وجود کی تین صورتیں ہیں: (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) معنی،

سابق تمہید کی بنا پر ایمان کا لفظی وجود بیکار ہونا چاہئے جب کسی شخص کیلئے پانی کا لفظی وجود کار آمد نہیں ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے جواب میں ایمان کا لفظی وجود کیا کار آمد ہو سکتا ہے؟ مگر یہاں ایک سخت مشکل یہ درپیش ہے کہ عالم بشریت کی سر تا سر محتاجی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی مانی الضمیر کو الفاظ و حروف کا جامہ پہنائے بغیر لو کر سکے، اس کی قلبی ترجمانی کا بھی ایک ناقص نام آکر ہے اگر وہ بھی ناقابل اعتبار ظہرے تو عالم انسانی کا تمام کار و بار معطل اور بیکار محض ہو جائے، اس لئے چار و ناچار ایمان کا لفظی وجود شریعت میں ایک حد تک قابل اعتبار سمجھا گیا ہے، جیسا کہ اس حدیث امرئ ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ النع میں کہا گیا ہے، اب اسے ایمان کی رفعت و بلندی کہئے یا فیاضی سے تعبیر کیجئے کہ محض کلمہ توحید پر اس نے جان بخشی کا اعلان کر دیا ہے، اور کسی کے دل کے راز سے کوئی بحث نہیں کی، اگر زبان اقرار کر لیتی ہے اور دوسری کوئی دلیل جو قلبی انحراف پر دلالت کر سکے ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتی تو اس وقت ہم اس بات کے مامور ہیں کہ اس اقرار ہی کو قلبی تصدیق کی دلیل سمجھیں۔

### میدان جنگ میں بھی اسلام کی فیاضی

اسلام جو بلند اخلاق کا سب سے پہلا معلم ہے کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان کو بلا وجہ جھوٹا قرار دے، یا اسکے متعلق کسی اندرونی کمزوری کی بنا پر اپنے ضمیر کے خلاف بولنے کا تصور لائے، دنیا میں ایک بڑے سے بڑا انسان خواہ اخلاق کے کتنے ہی بلند مقام تک کیوں نہ پہنچ چکا ہو کبھی اپنے حریف پر وہ بھی جھوٹا جنگ اٹھو نہیں کر سکتا، یہ اسلام ہے جو یہ دعوت دیتا ہے کہ تم اپنے حریفوں کی زبان پر بھی اٹھو کر لو، اور اس تشویش میں نہ پڑو کہ ان کے دلوں میں کیا ہے؟ اگر ان میں کوئی روح سعید ہوگی تو ایک نہ ایک دن اپنے صدق و نما کذب پر ضرور تادم ہوگی، اور دل بھی زبان کی طرح اسلام کا کلہ پڑھ لینے پر مجبور ہو جائے گا، حضرت مقدس کی حدیث میں دیکھو کہ انسان کی کمزور فطرت کس طرح اپنے حریف کا اسلام معجم کر رہی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کے انتقام میں یہ لفظی اسلام حائل نہ ہونے پائے، مگر یہ اسلام ہے جو اپنے حریفوں کی سینکڑوں حریفوں کی ایک زبان پر فخر کراتا ہے۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام نے کافر کو بکریاں چراتے دیکھا اور ابن ربیع ایک فریق دوسرے فریق کی گھات میں لگا کر رہتا ہے صحابہ نے ارادہ کیا کہ اس کی بکریاں چھین لیں، اس نے اپنا پلہ کمزور دیکھا اور وہ وقت آگیا کہ جو اسلام مدت سے اس کے سینہ میں گھوم رہا تھا اب دل میں اتر آئے وہ اسلام لے آیا، مگر اس حال میں دشمن کا اقرار و فداوری، انسان کی کمزور فطرت کب

قبول کرتی؟ اس لئے صحابہ کرام نے اس کے اسلام کو صرف مال کے بچاؤ کا ذریعہ سمجھا چنانچہ اسکی بکریاں غنیمت کا مال بنالیا، اسلام اسکو کیسے برداشت کر سکتا تھا اس واقعہ کی اہمیت محسوس کی گئی اور اتنی کی گئی کہ وحی الہی کو دخل دینا پڑا، اور نہایت تنبیہ آمیز لہجہ میں ارشاد ہوا **وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ الْفَنَ الْيَكُمُ السَّلَامُ لَسْتُ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا** اس حدیث کا یہی مقصد ہے۔

**ترجمہ** **قوله** **ارأيت ان لقيت:** حافظ ابن حجر نے اس سے ایک مسئلہ کا استنباط کیا ہے کہ واقعات کے پیش آنے سے قبل کسی مسئلہ کا حکم دریافت کیا جاسکتا ہے، جہاں بعض سلف سے کراہت منقول ہے وہ ایسے واقعات کے متعلق جو تدارق وقوع ہوں مگر جو عادات پیش آسکتے ہیں، اسکے متعلق حکم معلوم کرنا وقوع سے قبل درست ہے۔

**قوله** **لاذمنی:** باب نصر سے بمعنی اعتصم

**قوله** **فان قتلته فانه بمنزلة ان تقتله الخ:** یعنی تم اسکے قتل کرنے سے قبل ایک معصوم الدم مسلمان تھے اور اب اسکے قتل کے بعد ایک مباح الدم انسان ہو چکے، جیسا کہ وہ کلمہ اسلام پڑھنے سے قبل ایک مباح الدم کافر تھا، اور اب اس کلمہ کی بدولت ایک معصوم الدم مسلمان بن گیا ہے، مگر چہ تاویل کے عذر کی وجہ سے قصاص ساقط ہو جائے یہ اور بات ہے۔ قاضی عیاض اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ حق کی مخالفت اور گناہ کے ارتکاب میں تم اس کے مثل ہو گئے، مگر چہ دونوں کے گناہ کی نوعیت مختلف ہے، اسلام سے قبل اس کا گناہ کفر کا تھا، اور اسلام قبول کرنے کے بعد قتل کرنے کی وجہ سے تمہارا گناہ فسق کا ہے، یہاں ایک بات یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ پر نہ قصاص واجب کیا اور نہ دیت اور نہ کفارہ، اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ ایسی حالت میں دیت، کفارہ، قصاص میں سے کوئی چیز بھی نہیں آئیگی، کیونکہ آپ نے ان چیزوں کا تذکرہ نہیں فرمایا لیکن تحقیقی بات تو یہ ہے کہ کفارہ تو واجب ہے البتہ شہر کی وجہ سے قصاص ساقط ہے، کیونکہ حضرت اسامہ نے کافر سمجھ کر قتل کیا اور اس وقت کے اسلام کو انہوں نے معتبر نہیں جانا۔

وجوب دیت کے بارے میں امام شافعیؒ سے دو قول منقول ہے (۱) ایک قول میں واجب، اور ایک قول میں غیر واجب، رہا کفارہ کا ذکر نہ ہونا تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کا حکم فی الفور بیان کر دینا ضروری نہیں ہے، تاخیر کے ساتھ بھی بیان کی گنجائش ہے جو لوگ دیت کو واجب کہتے ہیں اسکو ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ حضرت اسامہؓ اس وقت تک نہ ہوں اس لئے اس وقت بیان نہیں کیا گیا۔

**ہویت و ہویت:** بمعنی مائل ہونا، جھکنا۔ **قوله** **سرية** سین مفتوح راہ مکسور، اور یاہ مشدد کے ساتھ، لشکر کا ایک حصہ، جس کا اطلاق ایک سو سے پانچ سو پر ہوتا ہے، پانچ سو سے زائد کو محاصر کہا جاتا ہے، اور آٹھ سو سے زائد کو جیش، پانچ سو اور آٹھ سو کی درمیانی تعداد کو حیلہ، اور چار ہزار سے زائد کو جھل، **قوله** **فصبحنا** صبح کے وقت اپنا یک حملہ آور ہونا، یہی معنی ہیں **وصبحهم بكرة عذاب مستقر**، **قوله** **الحروقات من جهينة الخ:** حاء مضموم، راہ مفتوحہ حرّہ کی طرف منسوب ہے حرّہ کا نام تجش بن عامر بن ثعلبہ بن مودعہ بن حمیدہ تھا، حرّہ کے ساتھ موسوم کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے ایک قوم کو قتل کر کے جلا دیا تھا، **قوله** **فطعنته** ایک روایت میں **برمحي** حتی قتلته، اور حضرت جندبؓ کی حدیث

میں فلما رجع علیہ السیف قال لا إله الا الله فقتلته کے الفاظ ہیں، حافظ ابن حجر نے دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ پہلے حضرت اسامہؓ نے تلوار کے ذریعہ مارتا چاہا لیکن تلوار سے مار نہ سکے تو نیزہ کے ذریعہ مار ڈالا۔  
 قوله حتى نعلم أقالها أم لا: قالها کا قائل قلب ہے، مطلب یہ ہے کہ تم کو ظاہر عمل کا مکلف بنایا گیا ہے، قلبی حالات تک تمہاری رسائی نہیں ہو سکتی، لہذا جب باطنی حالات تم کو معلوم ہو نہیں سکتے تو تم زبانی اقرار کو کافی کیوں نہیں سمجھ لیتے ہو، قوله فقال سعد: یعنی سعد بن ابی وقاص،

ذو البطين: حضرت اسامہؓ کا پیٹ بڑا تھا اس لئے ان کو ذوالبطن کہا جاتا تھا  
 قوله یعنی اسامة: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرزنش کے بعد حضرت اسامہؓ نے مسلمانوں سے قتال نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، اس وجہ سے جب جمل اور صفین میں یہ شریک نہیں ہوئے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ اسلام)  
 قوله قال رجل الم يقل الله تعالى وقاتلوهم: قرآن کی اس آیت کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی باہمی جنگ میں حصہ لینا چاہئے، جن لوگوں نے حصہ نہیں لیا تھا جیسے حضرت اسامہؓ، عمرو بن سعد وغیرہ ان لوگوں کی تردید کرتا چاہتے ہیں اس کا جواب حضرت سعدؓ نے دیا کہ قاتلوہم میں ہم کا مرجع کفار ہیں نہ کہ مسلمان۔

### مسلمانوں کی آپسی لڑائی میں شرکت

بخاری کتاب التفسیر میں تافع نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ایک مفصل مکالمہ ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس آیا، اور کہا کہ اے ابو عبد الرحمن کیا وجہ ہے کہ آپ حج و عمرہ تو ہر سال کرتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ نہیں کرتے، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اللہ نے جہاد کی کیسی ترغیب دلائی ہے، ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ اے بھائی اسلام تو پانچ چیزوں کا نام ہے، اللہ کی توحید اور رسول کی تصدیق، بیچ وقت نماز، رمضان کے روئے، زکوٰۃ، بیت اللہ کا حج، (اور آج کل جو لڑائی ہے اس میں شریک ہونا کچھ اسلام کا جزء نہیں جو نہ کرنے سے کچھ نقصان ہو) اس نے کہا اے ابو عبد الرحمن! کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہیں مانتے؟ وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بينهما الخ، وقاتلوہو حتی لا تكون فتنة، ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے حضرت پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں جب اسلام کمزور تھا ایسا ہی کیا، جو شخص فتنہ اٹھاتا اس کو مار دیا جاتا، تکلیف دی جاتی، یہاں تک کہ اسلام بکثرت پھیل گیا، اور کوئی فتنہ باقی نہ رہا۔

حضرت ابن عمرؓ کو جس جنگ کی دعوت دی جا رہی تھی وہ عبد اللہ بن زبیر کی خلافت پر جنگ کا واقعہ ہے حضرت ابن عمرؓ کا جواب کتنا ہی عبرت آمیز ہے کہ کفار سے جنگ فتنہ فرو کرنے کے لئے ہوتی ہے، اور مسلمانوں سے جنگ فتنہ پیدا کرنے کے لئے ہوگی، تم جس آیت کو میری تردید کیلئے پڑھ رہے ہو درحقیقت وہی میری تائید کیلئے ہے، یہی جواب حضرت سعدؓ نے دیا، اس سلسلے میں جمہور کی رائے یہ ہے کہ اگر مسلمان کے دو گروہ میں جنگ ہو جائے اور ایک حق پر ہو اور دوسرا باحق پر تو حق پرستوں کا ساتھ اس وقت تک دینا چاہئے جب تک دوسرا گروہ حق پر نہ آجائے، حضرت سعدؓ کی رائے جمہور کے خلاف تھی، حتی تعینت انی لم اکن اسلمت الخ: چونکہ اسلام سابقہ تمام گناہوں کو محو کر دیتا ہے اس لئے تمنا ہونے لگی کہ اگر آج مسلمان ہوتا تو ایک مسلمان کے گناہ محو ہو جاتا، قتل مسلم کا گناہ حضرت اسامہؓ کو اتنا بڑا معلوم ہوا کہ اسکے

مقابلے میں سارے نیک اعمال بچ نظر آنے لگے، غلبہ خوف میں یہ کلمہ ان کی زبان سے نکلا ورنہ حقیقت مراد نہیں ہے جس سے سابق زمانہ میں کفر کی تنہا شبہ قائم کیا جائے۔

## باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حمل علینا السلاح فلیس منا

❦ حدیث زہید بن حرب ..... عن نافع عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ

علیہ وسلم قال من حمل علینا السلاح فلیس منا.

ترجمہ عبد اللہ بن عمرؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص مسلمانوں پر ہتھیار اٹھائے (حملہ کرے) وہ ہم میں سے نہیں۔

مقصد حدیث جب کلمہ اسلام کی بنا پر تم کو سلامتی دی گئی تو تجھے ہی سلامتی کا پرچم لہراتا چاہئے نہ کہ بد امنی کے درپے ہو جاؤ۔

”علیٰ ضرر کے لئے ہے یعنی جو ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائے ہم کو نقصان پہونچانے کیلئے وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے، کیونکہ مسلمانوں پر ہتھیار اٹھانا غیر مسلموں کا شعار ہے۔“

### تشبہ بالکفار کا معیار

تشبہ بالکفار کی تفصیل کرتے ہوئے حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ تشبہ بالکفار امور مذہبی میں تو حرام، اور شعار قوی میں مکروہ تحریمی، اور باقی عبادات و انتظامات میں جائز ہے، وہ درحقیقت تشبہ ہی نہیں۔

حافظ ابن قیمؒ کی کتاب اتقان الصراط المستقیم سے معلوم ہوتا ہے کہ تشبہ بالکفار کا تعلق اضطرابی یا ان اختیاری افعال کے ساتھ نہیں ہے، جو انسان کے فطری تقاضے سے سرزد ہوتے ہیں، بلکہ یا تو صرف عبادات کے ساتھ ہے یا اگر وہ عادات اور معاشرت سے متعلق ہیں تو پھر ان کی دو قسمیں ہیں (۱) یا تو وہ افعال ایسے ہیں جو خود قبیح ہیں، جیسے ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہننا، یا ریشمی کپڑا پہننا یا کوئی اور ایسی حرکت کرنا جس سے باطل معبودوں کی عظمت ظاہر ہوتی ہو، اس قسم کے امور تو فی نفسہ بھی ممنوع ہوں گے اور ان میں تشبہ بالکفار ان کے لئے دوسری وجہ ممانعت رہے گی، اور اگر وہ ایسے امور ہیں جن میں فی نفسہ کوئی قباحت نہ ہو تو اگر وہ کسی قوم کا شعار بن چکے ہوں یعنی کسی قوم کے ساتھ اس طرح مخصوص ہو چکے ہوں کہ ان کا اختیار کرنے والا بظاہر اسی قوم کا فرد معلوم ہوتا ہو تو ان میں تشبہ ممنوع ہو گا، اور اگر وہ امور مباح ہیں اور کسی قوم کا شعار نہیں تو پھر اگر ہمارے پاس ان کا بدلہ موجود ہے تو ان کا ترک کر دینا اولیٰ و انسب ہو گا۔ یہی اسلامی غیرت کا تقاضا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے ہاتھ میں ایک فارسی طرز کی کمان دیکھی تو فرمایا اپنے ہاتھ میں کیا لئے ہوئے ہو؟ ایسی عربی طرز کی کمان رکھو جیسی میرے ہاتھ میں ہے، جسکے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں فتوحات نصیب فرمائی ہیں اور اگر وہ چیزیں ایسی ہیں جن کا ہمارے پاس کوئی بدلہ نہیں جیسا کہ جدید مصنوعات، تو ان کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان میں

گنہ کی نیت نہ ہو، اور اگر ان کے استعمال میں کفار کے ساتھ گنہ کی نیت ہو تو وہ بھی ممنوع ہوں گے۔

قال فی البحر: اعلم ان التشبه بالكفار لا یکره فی کل شئی فانما نکل ونشرب کما یفعلون، انما الحرام التشبه فیما کان مذموماً وفيما یقصد به التشبه،

### احتراز عن التشبه کی حکمت

اس باب کی اصل روح یہ ہے کہ قوموں کی معاشرت، اور ان کا تمدن، جب مشترک ہو جاتا ہے تو پھر اس کی سرحدیں بہت جلد مذہب اور دین سے بھی گرا کر لگتی ہیں، کیونکہ اسلام کا دائرہ ایسا وسیع ہے جس سے ہمارا تمدن بھی خارج نہیں ہے، اسی لئے معاشرت کے عام شعبوں میں گنہ بالکفار سے بھی اسلامی معاشرت کے ساتھ گھر و پیدا ہونا گزیر ہو جاتا ہے، پھر رفتہ رفتہ یہ گھر و عبادات کی حدود میں بھی ہونے لگتی ہے، اور شدہ شدہ دین اسلام کی صورت ہی مسخ ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، یہی حکمت ہے کہ شریعت نے ان امور سے بھی احتراز کرنا لازمی قرار دیا ہے جو کسی پہلو سے مشتبہ الحکم ہوں خواہ ان میں کفار کے ساتھ کوئی گنہ بھی نہ پایا جائے اس لئے مسئلہ گنہ کی بنیاد صرف کفار کے ساتھ مخالفت پر نہیں بلکہ دراصل دین کے حدود کے تحفظ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عورت کو مرد کے ساتھ اور ایک مرد کو عورت کے ساتھ گنہ کی ممانعت کی گئی ہے، اگرچہ وہ دونوں مسلمان ہوں اسی طرح اس کی بنیاد کسی تنگ نظری پر نہیں ہے بلکہ اگر کوئی حقیقت اپنی کوئی صورت رکھتی ہے تو جب تک اسکے حدود ممتاز و متمیز نہ ہوں وہ دوسری حقیقت سے ممتاز ہو ہی نہیں سکتی، چنانچہ خارجی اشیاء کا باہم امتیاز بھی ان حدود کے تحفظ ہی پر موقوف ہے۔

ایک ملک دوسرے ملک سے، ایک دریا دوسرے دریا سے، ایک درخت دوسرے درخت سے اور ایک حیوان دوسرے حیوان سے اپنی الگ الگ شکل و صورت کی بدولت ہی ممتاز نظر آتے ہیں، اسی طرح ان کے یہ امتیازات کسی تعصب یا مخالفت کی بنا پر نہیں، بلکہ اپنی اپنی حقیقت کے تحفظ کی بنیاد پر ہیں، اسی طرح دین و مذہب کے حدود کا تحفظ بھی کسی تعصب پر مبنی نہیں، بلکہ صرف اپنی حقیقی شکل و صورت کے تحفظ پر مبنی ہے، اور اگر بالفرض اسلام کے لئے کفر کے ساتھ گنہ کی کوئی وجہ مجوز پیدا کر لی جائے تو پھر ان دو دینوں کو ایک دین کہنے کیلئے کوئی وجہ ممانعت نہیں نکل سکتی، الحاصل مسئلہ گنہ کی مخالفت نہ تو کسی دلیل پر مبنی ہے اور نہ کسی گہری سیاست پر، بلکہ صرف اس حقیقت کی گہرائی سے ناواقف پر مبنی ہے جس سے لوہان کا امتیاز قائم رہ سکتا ہے، غالباً علامہ ابن خلدون نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب کسی قوم سے قومی تعصب نکل جاتا ہے تو وہ بہت جلد فنا ہو جاتی ہے، لیکن اسلام نے عصیت سے تو روکا ہے، مگر گنہ بالکفار کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔

ابودود میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم سلام کے موقعہ پر یوں کہا کرتے تھے انعم اللہ بک عیناً وانعم صباحاً، خدا تعالیٰ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی رکھیں، اور چین و آرام کیساتھ صبح نصیب ہو، جب اسلام کا دور آیا تو اس نے ہم کو اس طریقہ سے روک دیا اسلئے کہ اس میں ایک بری رسم کی یاد تازہ ہوتی ہے، آج کل انگریزی زبان میں سلام کے موقعہ پر جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ بھی اسی کے ہم معنی ہیں، اس کا فیصلہ خود کر لیجئے کہ جب یہ مضمون عربی زبان میں پسندیدہ نہیں تو کیا انگریزی زبان میں پسندیدہ ہوگا، بہر حال باب کی حدیث میں مسلمانوں پر ہتھیار اٹھانے کو غیر اسلامی شعار بتلایا گیا ہے، یعنی جو شخص معاشرتی



زندگی کو گندہ کرنے کے درپے ہو، وہ اسلام کیلئے ایک بد نماد اے ہے، اسلام میں تمدنی اور معاشرتی زندگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اسی لئے وہ شخص جو اسلام کی اجتماعی وحدت میں خلل انداز ہو مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔

حضرات محدثین نے لیس منا کی مختلف تاویلات کی ہیں، ابی لیس لیبو تنایاز جروتہد یہ کیلئے ہے، یا مستحل کیلئے ہے، یہ بھی اس شخص کے لئے ہے جو بلا وجہ ہتھیار اٹھائے، اگر کوئی باغی بغاوت پر تل جائے تو اس کی بغاوت کو دور کرنے کیلئے ہتھیار اٹھانا جائز ہے، مسل یسئل: سونتقا، کھینچتا۔

## باب تحریم ضرب الخدود و شق الجیوب والدعاء بدعوی الجاہلیۃ

رخسار پر مارنا، گریبان پھاڑنا، اور جاہلیت کی سی باتیں کرنا حرام ہے

❦ حدیث ❦ حدثني يحيى بن يحيى قال ابو معاوية ..... عن عبد الله قال: قال النبي صَلَّى الله عليه وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ أَوْ شَقَّ الْجُيُوبَ أَوْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ هَذَا حَدِيثٌ يَحْيَى وَأَمَّا ابْنُ نُمَيْرٍ وَأَبُو بَكْرِ فَقَالَا وَشَقَّ وَدَعَا بِغَيْرِ الْف، (۲) وَفِي رَوَايَةٍ قَالَ: قَالَ أَبُو بُرْدَةَ بْنُ أَبِي مُوسَى قَالَ وَجَعَ أَبُو مُوسَى وَجَعًا فَفَقَشَنِي عَلَيْهِ وَرَأْسُهُ فِي حَجَرٍ إِمْرَةٍ مِنْ أَهْلِ فَصَاحَتْ امْرَأَةٌ مِنْ أَهْلِ فَلَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يَرُدَّ عَلَيْهَا شَيْئًا فَلَتَا أَفْلَقَ قَالَ أَنَا بَرِيءٌ مِمَّا بَرِيءَ مِنْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَرِيءٌ مِنَ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَةِ، (۳) وَفِي رَوَايَةٍ أَقْبَلْتُ امْرَأَتَهُ أُمَ عَبْدِ اللَّهِ يَصْحَبُ بَرْنَةً قَالَا ثُمَّ أَفْلَقَ فَقَالَ أَلَمْ تَعْلَمِي وَكَانَ يُحَدِّثُهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَنَا بَرِيءٌ مِنْ حَلْقٍ وَسَلْقٍ وَخُرْقٍ، (۴)

ترجمہ: عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنے رخساروں کو پیٹے، گریبان چاک کرے اور جاہلیت کے زمانہ کی طرح چیخ دیکار کی آوازیں نکالے اسکا ہم سے کوئی واسطہ نہیں، ایک دوسری روایت میں ہے ابو بردہ بن ابی موسیٰ کہتے ہیں کہ ابو موسیٰ کو کوئی تکلیف لاحق ہوئی، اور سخت تکلیف کی وجہ سے وہ بیہوش ہو گئے اور ان کا سر انکے خاندان کی ایک عورت کے گود میں تھا، ان کا یہ حال دیکھ کر ان کے گھر کی ایک عورت چلائی، حضرت ابو موسیٰ کو اس عورت کی حرکت پر روکنے کی طاقت نہیں تھی جب ان کو ہوش آیا تو کہنے لگے کہ میں ان سے بری ہوں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برأت ظاہر کی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصیبت کے وقت زور زور سے رونے والی اور بال نوچنے والی اور گریبان پھاڑنے والی عورتوں سے برأت ظاہر کی ہے، ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ پر جب غشی طاری ہوئی تو ان کی اہلیہ حضرت ام عبد اللہ گاگا کر رہتے ہوئے آئی، دونوں راوی کا کہنا ہے کہ پھر جب ان کو اتفاق ہوا تو کہا کیا تم کو معلوم نہیں؟ پھر اس کو سناتے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بڑی ہوں اس شخص سے جو مصیبت کے وقت بال نوچے اور زور زور سے روتے اور کپڑے پھاڑے۔

(۱) حدیث (۱) بحاری ص ۱۱۷۲ ع ۱۲۹۹۴ مسلم ص ۷۰ قرطبی ص ۹۵ نسائی ۹ / ۲

حدیث (۳) بحری ص ۱۱۷۲ ع ۱۲۹۹۶ ابوداؤد ص ۱۴۷ ابن ماجہ ۵۸۶

## مقصد حدیث

اوپر کے ابواب میں بتلایا گیا کہ جس طرح کفر و ایمان باہم ممتاز ہیں اسی طرح دونوں کے کام بھی ایک دوسرے سے ممتاز ہونے چاہئے، اگر کوئی مسلمان جاہلیت کے کاموں سے پرہیز نہیں کرتا ہے تو گمان ہوتا ہے کہ وہ ان کاموں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے، لہذا جاہلیت کے کاموں سے پرہیز نہ کرنے والوں کو جاہلیت سے موسوم کر دیا جاتا ہے، یہی صورت حال یہاں بھی ہے۔

”شرح حدیث سے پہلے چند الفاظ حدیث کے بھی سنئے: صالقة، بالصاد والسين دونوں لغت ہے وہ عورت جو بوقت مصیبت زور زور سے روئے، حالقة بوقت مصیبت بال نوچنے والی عورت، شاقہ کپڑا پھاڑنے والی، دعوی الجاہلیۃ جاہلانہ پکار، مثلاً میت پر فوج کرنا، یا کسی مصیبت میں آہ و لوہا پھاننا، ولجلاء کہنا، یا ہلاکت کی بددعا کرنا، جاہلیت سے مراد نفرت کا زمانہ ہے، تصبیح برنہ اس کے معنی ترجیع کے ساتھ رونا یعنی گانا کر دنا۔“

لیس منا من ضرب الخدود: حدیث میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ بہت سے وہ امور جو زمانہ جاہلیت سے تعلق رکھتے ہیں یا شریعت اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے، ایسے امور کے مرتکب کو لیس منا سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، اس طرح کی تعبیر سے یہ ہرگز مقصود نہیں ہوتا کہ دائرہ اسلام سے اسکو خارج کرنا ہے، بلکہ مزاج شریعت یہ ہے کہ جب کسی چیز کو سختی کیساتھ روکتی ہے تو بطور زجر و مبالغہ اس قسم کا اسلوب اختیار کرتی ہے، اور یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ ہمارے عرف میں والد اپنے بیٹے سے بطور زجر کہہ دیتا ہے، کہ تم میری اولاد نہیں، اور میں تمہارا باپ نہیں، اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ وہ ہمارے دین کامل پر نہیں، لیکن حضرت سفیان ثوری سے منقول ہے، کہ اس طرح کی احادیث میں، تاویل و توجیہ کرنے سے کلام کا زور ختم ہو جاتا ہے، اسلئے تاویل و توجیہ تلاش کرنا ایک عمل عبث اور مکروہ ہے، تیسری توجیہ یہ ہے کہ ان کاموں کو شرعاً حرام جانتے ہوئے بھی، حلال سمجھے اور پھر حلال سمجھ کر کرے، تو لیس منا کا حصاد حقیقتاً ہو گا۔

فانابری ممابری: برأت کے لفظی، معنی جدائی کے ہیں، قاضی عیاض فرماتے ہیں، کہ مراد امور جاہلیت کے کرنے سے بری ہوں، یا اس سزا سے، جس کا یہ مستحق ہوگی، یا یہ کہ میں اس ذمہ داری سے بری ہو گیا، جس کا بیان کرنا میرے اوپر لازم ہے۔ مذکورہ چیزوں سے برأت اس لئے ظاہر کی گئی ہے، کہ بندہ کا حق یہ ہے کہ ہمیشہ قضا و قدر پر راضی رہے جب کہ ان چیزوں کے ارتکاب سے محسوس ہوتا ہے کہ قضا و قدر پر وہ رضامند نہیں۔

## باب بیان غلط تحریم النمیمۃ

چٹل خورمی کی حرمت کی شدت کا بیان

حدیث ﴿ حَدَّثَنَا شَيْبَانُ بْنُ فَرُّوخَ - عَنْ حَظِيفَةَ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَجُلًا يَنْتُمِي الْحَدِيثَ فَقَالَ

حَظِيفَةُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَتَامٌ وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرَى لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَاتٌ. (۱)

حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ ایک شخص چٹل خوری کرتا ہے، تو حضرت حذیفہ نے فرمایا، کہ میں نے آنحضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جنت میں چٹل خور نہیں جائے گا۔

ترجمہ

**حل لغات :-** قنات۔ باب نصر سے قنۃ، یقنۃ، قنات، نقام کو کہتے ہیں، نقام باب نصر سے نتم۔ نتم۔ نقام۔ چٹخوری۔

**نہیمہ کی تعریف** ”نقل کلام الناس بعضهم الی بعض علی جهة الافساد بینهم“، یعنی کسی کی بات دوسرے کے پاس اس غرض سے نقل کرنا، کہ باہمی فتنہ و فساد پیدا ہو جائے، مابغرائی فرماتے ہیں، کہ عام طور پر مشہور یہ ہے کہ جن کے بارے میں کوئی بات کہی گئی، ان کے سامنے وہ بات نقل کر دینے کو نہیمہ کہتے ہیں۔۔۔ جیسے عمرو زید سے کہے کہ بکر تمہارے بارے میں ایسی ایسی باتیں کر رہا تھا، لام غزالی کی رائے یہ ہے، کہ نہیم صرف اسی صورت کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ کوئی بھی ایسی ناگوار بات نقل کرنا، نہیمہ میں داخل ہے جس سے خولہ ناگواری اس شخص کو ہو، جن کی بات نقل کی گئی ہے یا اس شخص کو ہو جن کے بارے میں کہی گئی ہے، یا کسی تیسرے شخص کو ہو۔۔۔ خولہ یہ اظہار صراحت ہو یا کنایہ، اشارہ سے ہو یا آنکھ کی تنکھیوں سے، یہ تمام صورتیں نہیمہ میں داخل ہیں، گو نہیمہ کی حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ کسی کے ایسے راز کو فاش کر دینا، جس کو ظاہر کرنے سے ناگواری ہو۔

### چٹخوری کے گناہ سے بچنے کی صورت

جس کے سامنے چٹخوری کی گئی ہے، اس پر گناہ سے بچنے کے لئے چھ باتیں لازم ہیں۔  
(۱) چٹخور کے بات کی تصدیق نہ کرے، کیونکہ چٹخور قاسق ہے، (۲) تمام کو چٹخوری سے روک دے اسکو نصیحت کرے اور اسکی مذمت کرے، (۳) اللہ ایسے شخص سے بغض رکھے، کیونکہ ایسا شخص اللہ کے نزدیک مفسد ہے۔ اور جس سے خدا کو بغض ہو اس سے بغض رکھنا ضروری ہے، (۴) جس کی چٹلی کی گئی ہے اس سے بدگمان نہ ہو (۵) ان باتوں کی تصدیق نہ جتو میں نہ لگے (۶) چٹلی دوسروں کے سامنے نقل نہ کرے کیونکہ اگر اس کی بات دوسروں کے سامنے نقل کرے گا تو وہ خود چٹخور ہو جائے گا۔

**نہیمہ اور غیبت میں فرق** نہیمہ کہتے ہیں کسی شخص کی بات، یا اس کی حالت کو، کسی دوسرے سے نقل کرنا خولہ اس کو معلوم ہو، یا نہ ہو۔ گو یا نہیمہ میں جس کی چٹلی کی جائے، اس کے غائب ہونے کی

شرط نہیں، اور غیبت میں یہ شرط ہے، کہ وہ غائب ہو دوسری شرط نہیمہ میں یہ ہے، کہ علی وجہ الافساد ہو، اور غیبت میں یہ شرط نہیں، نہیمہ حرام ہے الا یہ کہ بیعت اصلاح ہو، اگر اصلاح کی غرض سے ہو تو کہیں واجب، کہیں مستحب، کہیں مباح ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کا بچہ غلط راستہ پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے، تو اس کے سر پر ستوں سے، بغرض اصلاح شکایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اگر کوئی شخص کسی کو در پردہ قتل کرنا چاہتا ہے، تو اس کی اس اسکیم سے مطلع کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

لاناوئی نے غیبت کی بہت ہی جامع تعریف کی ہے، تفہیمک المخاطب نقص انسان بعینه او جماعۃ متعینین او غیر متعینین اذا کان المخاطب بفہمہ

بعینہ الہ یعنی کسی متعین انسان، یا غیر متعین جماعت کا نام بطور عیب بیان کرنا مخاطب متعین طور سے سمجھ لے، خولہ وہ عیب گوئی زبانی ہو یا تحریری، یا اشارہ سے ہو، یا مجروح عیب اس کے دین کے متعلق ہو یا دنیا سے، فعل و صورت سے متعلق ہو، یا عادات

واخلاص سے ماں باپ سے متعلق ہو، یا بیوی سے، خدام کے متعلق ہو، یا چال ڈھال اور اسواں سے، یہ غیبت ہے۔ اس تعریف کے بعد غیبت کی چھ صورتوں کو جائز قرار دیا ہے۔

(۱) ظالم کے ظلم کو بیان کرنا (۲) منکر و معاصی کے ازالہ کی نیت سے، ایسے شخص سے بیان کرنا جو اس کے ازالہ پر قدرت رکھتا ہو، (۳) استفادہ کے طور پر کسی کے عیب کو بیان کرنا، جیسا کہ حضرت ہندہؓ حضور ﷺ کے دربار میں کیا تھا، ان اباسفیان رجل شحیح (۴) کسی کے شر سے مسلمانوں کو بچانے کیلئے بیان کر دینا (۵) جو شخص اپنے فسق و بدعت کو برملا اعلان کرتا پھر سے تو ایسے شخص کے فسق و بدعت کو علی الاعلان بیان کرنا (۶) کسی مصلحت کے وقت، لوگوں کے تعارف کے لئے ناپسندیدہ صفت بیان کر دینا، جیسے اعمیٰ، اعرج، اصم وغیرہ ان مواقع پر بیان کرنے کو غیبت میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

**توجیہ حدیث** یہ بھی کافروں کے اعمال میں سے ہیں، الدین النصیحة کے خلاف ہے، غمہ میں حالت بگڑتی ہے۔ یہ مسلمانوں کا شعار نہیں ہے، بلکہ ان کا کام سدھار، نصیحت، خیر خواہی ہے، لایدخل الجنة نمام کی مشہور توجیہ یہ ہے کہ غمہ کی خاصیت دخول نار ہے، جیسے ایمان کی خاصیت دخول جنت ہے، البتہ عوارض کی وجہ سے خاصیت ظاہر نہیں ہوتی، اگر نمام میں ایمان نہ ہوتا، تو غمہ کا خاصہ اپنا اثر دکھاتا، اور وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہتا، لیکن ایمان کی وجہ سے خلود فی النار کا اثر ظاہر نہ ہوگا۔

باب بيان غلط تحريم اسبال الازار والمن بالعطية وتنفيق السلعة بالحلف وبيان الثلاثة الذين لا يكلمهم الله تعالى يوم القيامة ولا ينظر اليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب اليم

انہیں بچے رکھنے احسان جتانے مال جھوٹی قسم کے ساتھ بیچنے کی سخت حرمت کا بیان، اور ان تین آدمیوں کا بیان جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ بات کرے گا، اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

﴿ حَدِيث ﴾ عن ابي نر عن النبي ﷺ قال ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر اليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب اليم قال فقراها رسول الله ﷺ ثلاث مرات قال ابو ذر خابوا و

خَسِرُوا مِنْهُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ الْمُسْبِلُ وَالْمَتَّانُ وَالْمُنْفِقُ سَلَعَتَهُ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ

ترجمہ حضرت ابوذرؓ حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا، تین قسم کے آدمی سے اللہ قیامت کے روز (خوشی سے) بات نہیں کرے گا، ان کی طرف رحمت کی نظر نہ ڈالے گا، اور ان کو گناہوں سے پاک نہ کرے گا اور ان کو دردناک عذاب ہوگا، حضرت ابوذرؓ نے کہا کہ آنحضور ﷺ نے اس کو تین بار پڑھا، حضرت

ابو ذرؓ نے فرمایا کہ وہ لوگ تو ناکام و نامراد ٹھہرے، وہ کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا (۱) ٹخنے سے نیچے ازار لٹکانے والا (۲) احسان جٹلانے والا (۳) اور جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سامان فروخت کرنے والا۔

### حرمت اسبال کی علت اور حد

اس بات کے تحت، تین آدمیوں کو وعید سنائی جا رہی ہے، ان میں ایک مسل یعنی ٹخنے سے نیچے پانچامہ لٹکانے والا، اس کا مقصد یہ ہے کہ جب مومن اللہ کی بڑائی، عظمت کا اظہار کر چکا، تو اب اسے

### شرح حدیث

ایسی تواضع اور خاکساری اختیار کرنی چاہئے، کہ اس کے لباس سے بھی خاکساری ظاہر ہو، جب صورت خاکساری کی ہوگی، تو اس کا اثر باطن پر بھی ہوگا، کیونکہ قدرت نے ظاہر کو باطن، اور باطن کو ظاہر کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس کا ایک طریقہ یہ ہے، کہ ازار پانچامہ، اسی طرح دوسرے لباس کو ٹخنہ کے نیچے نہ لٹکائے۔ اس میں ہمارے نزدیک یہ بھی ضروری نہیں، کہ تکبر کی نیت سے، جب ہی ناجائز ہوگا بلکہ بغیر نیت کبر بھی، لٹکایا ہو تب بھی ممنوع ہوگا کیونکہ اس میں متکبرین کے ساتھ مشابہت پائی جا رہی ہے، اور جس طرح حقیقت کبر اللہ کو ناپسند ہے، صورت کبر بھی ناپسند ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صورت بھی حقیقت تکسہ ہو نچانے کا سبب بن جاتی ہے، یعنی شروع میں اگرچہ کبر کا خیال نہ ہو، مگر اس کا عادی بن جانے سے متکبر بن سکتا ہے۔

البتہ اگر کوئی عذر ہو، یا غفلت کی بنا پر ہو، تو موجب عتاب نہیں، مثلاً توند کی وجہ سے ازار کھسک جاتی ہو، یا چلتے ہوئے بے خیالی میں لٹک جائے، تو مسامحت میں داخل نہیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ کی روایت اس کی دلیل ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ اس حدیث کو سن کر دریافت کرنے لگے کہ یا رسول اللہؐ کبھی بے خیالی میں ازار ٹخنہ کے نیچے آ جاتا ہے، تو کیا ایسی صورت میں بھی وعید ہوگی، آپؐ نے فرمایا کہ آپؐ اس سے مستثنیٰ ہیں (ابوداؤد کتاب اللباس ص ۵۶۳/۲) معلوم ہوا کہ بغیر عذر و غفلت کے اتنی بھی منجائش نہیں۔

اسبال کا تعلق، صرف تہبند اور پانچامہ ہی کیساتھ خاص نہیں ہے بلکہ قمیص اور عمامہ کا بھی یہی حکم ہے ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ میں صحیح سند سے روایت آئی ہے۔

عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال الاسبال في الازار و القميص و العمامة . (الحديث)

**تنبیہ :-** عورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے وہ اپنا لباس ٹخنے کے نیچے استعمال کرے کیونکہ اس کا ٹخنہ بھی عورت ہے۔

### مرد و زن کے لئے اسباب کی دو حالت

”حافظ ابن حجرؒ اسبال کی حد متعین فرمائی ہے، کہ مرد کی دو حالت ہے، ایک حالت استحباب، اور ایک حالت جواز، حالت استحباب یہ ہے کہ نصف ساق تک ہو، اور جواز کی حالت یہ ہے کہ ٹخنہ تک ہو، اسی طرح عورتوں کے لئے بھی حالت استحباب اور حالت جواز ہے، حالت استحباب یہ ہے کہ ٹخنہ سے ایک بالشت نیچی ہو، اور حالت جواز یہ ہے کہ ایک ذراع لمبی ہو۔“ م حدیث میں دوسرے نمبر پر موجب عتاب، احسان جٹلانا ہے، ایک طرف تو احسان کر کے ضرورت مند کو آرام پہنچایا، اور دوسری طرف احسان جٹلا کر لذت پہنچادی، متضاد کاموں کو جمع کرنا عقل کے بھی خلاف ہے، تو شریعت اس کو کس

طرح برداشت کر سکتی ہے، اسی لئے قرآن میں اسی اتفاق پر اجرو ثواب کا وعدہ ہے، جسکے بعد لازمتاً پہنچائی گئی ہو۔  
 ”حضرت قرطبی فرماتے ہیں، عام طور پر احسان جتنا نادو آدمیوں کی طرف سے ہوتا ہے، ایک تو بخیل کہ وہ کچھ دیتا ہے، اس کو بہت سمجھتا ہے، گو کہ حقیر ہو، اسی طرح خود پسندی میں جلا انسان، جب دیتا ہے تو تعجب کی نگاہ سے اس کو دیکھتا ہے، کہ ہم نے اس پر احسان کر دیا، فرماتے ہیں کہ احسان جتانے کی وجہ جہالت اور نعمت الہی سے غفلت کا ثمرہ ہے، کہ اگر اس کے انجام کو سمجھتا تو خود لینے والے کا احسان ماننا۔“

تیسرے نمبر پر وہ شخص وعید کا مستحق ہے جو تجارت میں اپنا مال فروخت کرنے کے لئے جھوٹی قسمیں کھاتا ہو، حالانکہ عام حالات میں بھی سچی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے، تاکہ ذاتِ باری کی ہیبت قائم رہے، جب کہ یہ شخص مالی منفعت کے لئے اللہ کا نام غلط استعمال کر رہا ہے، اس کا یہ عمل بتلاتا ہے کہ اسکے دل میں جتنی اہمیت دنیاوی سامان کی ہے، اتنی اسمِ الہی کی نہیں۔ اس لئے دنیا کمانے کے لئے آخرت تباہ کر رہا ہے۔ تقاضا تو یہ تھا کہ آخرت کی نیکی کیلئے دنیا کو ذریعہ بنایا جاتا حالانکہ وہ دنیا کے لئے آخرت کو ذریعہ بنا رہا ہے، جو عقل و دانش کے بھی خلاف ہے۔

عالمِ حضرت جنید بغدادیؒ اپنے مریدین کے ساتھ کہیں جا رہے تھے راستہ میں ایک مداری کو دیکھا کہ لوگوں کو اپنا کرتب دکھا رہا ہے، مریدین کو حیرت ہوئی کہ کتنا کم پست حوصلہ انسان ہے کہ دنیا کے لئے اس قسم کا ذہندہ جار چارہا ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ آخرت کی فکر کرنی چاہئے تو حضرت جنید بغدادیؒ نے مریدین سے فرمایا کہ مداری پر حیرت نہ کرو، کیونکہ دین سے دنیا کا رہا ہے، معمولی چیز کو معمولی چیز سے حاصل کرنے کے لئے ذریعہ بنانا کوئی حیرت کی بات نہیں، حیرت تو اس انسان پر ہے جو آخرت کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنالے، ایسے شخص کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی غلیظ اور ناپاک چیز کو سونے کے چمچے سے اٹھائے، اور اس مداری کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے کوئی شخص غلیظ چیز کو غلیظ چیز کے بنے ہوئے چمچے سے اٹھائے۔

ان تینوں کے بارے میں فرمایا گیا،

”لَا يَكْلَمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ وَلَا يَزْكِيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابُ الْإِيمِ“ : لَا يَكْلَمُهُمُ اللَّهُ  
 ہے کہ صالحین سے جیسی گفتگو کی جائے گی، ویسی ان لوگوں سے نہیں ہوگی، ان لوگوں سے گفتگو ڈانٹ، ڈپٹ زبرد تو بخ کے انداز میں ہوگی، دوسری توجیہ بات نہ کرنا، کنایہ ہے اعراض سے، یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے اپنا رخ پھیر لے گا، جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان لوگوں سے ایسی بات نہیں کرے گا، جس سے ان کو نفع اور خوشی ہو، ایک توجیہ یہ بھی ہے، کہ ان لوگوں کے پاس سلام کے لئے فرشتہ رحمت بھیجے نہیں جائیں گے، لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمُ اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرف نظر کرنا، یہ کنایہ ہے لطف و کرم سے، یعنی ان لوگوں پر مہربانی نہیں کی جائے گی۔ لَا يَزْكِيهِمْ۔ یعنی ان کو گناہوں کی گندگی سے صاف ستھرا نہیں کیا جائے گا، وَلَهُمْ عَذَابُ الْإِيمِ، الیم بمعنی مولم یعنی ایسا عذاب، جس کی تکلف کا احساس دل کو بھی ہوسنے لگے۔

عذاب ہر ایسی چیز کو کہا جاتا ہے، جو انسان کو شاق گذرنے لگے کلامِ عرب میں، یہ عذاب سے ماخوذ ہے عذاب کا معنی | جس کے معنی منع کے ہیں، جب کسی کو کسی چیز سے روک دو تو کہا جائے گا، عذبتہ عذاباً اور کسی چیز سے رک جائے تو بولا جائے گا عذب عذاباً، مثلاً پانی کو مٹا عذب کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ پیاس کو روک دیتا ہے، اور

عذاب کو عذاب اس لئے کہتے ہیں، کہ مجرم کو دو بارہ ارکاب جرم سے روک دیتا ہے، اور دوسرے لوگوں کو بھی اس قسم کے جرم سے روک دیتا ہے۔

**حدیث** ﴿عن ابی ہریرۃ قال قال النبی ﷺ ثلاث لا یکلہم اللہ یوم القیامۃ ولا یشکرہم﴾

قلل معاویۃ ولا ینظر الیہم ولہم عذاب الیم شیخ زان و ملکہ کذاب و عائل متکبر۔

اس روایت میں مزید تین آدمیوں کا تذکرہ ہے جن پر قیامت کے دن نظر رحمت نہیں ڈالی جائے گی (۱) بوڑھا زانی (۲) جھوٹا بادشاہ (۳) متکبر فقیر، ان تینوں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان لوگوں میں معصیت کے دوائی کمزور ہیں، اس کے باوجود ان لوگوں سے معصیت کا صدور، ان کے کمال خبث باطن کی دلیل ہے، بوڑھا شخص، کمال عقل اور شہوات نفسانی کے کمزور ہونے کے باوجود، اگر زمانا کرے تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ حق اللہ کی اس کے دل میں، کوئی اہمیت نہیں ہے، جو ان شخص زمانا کرے، تو ایک وجہ ہو سکتی ہے، کہ غلبہ شہوت، اور عقل کی کمی کی وجہ سے کر گذرا، اسی طرح رعیت بادشاہ کے ڈر، اور خوف کی وجہ سے، جھوٹ بول دے تو ایک طرح وہ مجبور سمجھا جاسکتا ہے، مگر بادشاہ کو کس کا ڈر، کہ وہ جھوٹ بول پڑا؟ بالداروں کے پاس دولت ہوتی ہے اور دولت کبر کا سبب ہے، کیونکہ ضرور تمند ان کے پاس آتے جاتے ہیں، اگر دولت مند متکبر ہو تو ایک طرح سے وہ مجبور سمجھا جاسکتا ہے، مگر محتاج تنگ دست کے پاس، تو اسباب کبر نہیں، بلکہ فقر، نیاز مندی، خاکساری کا سبب ہے، اس کے باوجود اس کا متکبر کرنا حد درجہ خبث باطن کی دلیل ہے۔

**حدیث** ﴿عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ثلاث لا یکلہم اللہ یوم القیامۃ﴾

ولا ینظر الیہم ولا یشکرہم ولہم عذاب الیم رجل علی فضل ماء بالقلۃ ویمنعہ من ابن السبیل ورجل یبائع رجلاً بسلعة بعد العصر فخلت لرب اللہ لا یشترها بکذا أو کذا فصلاۃ و هو علی غیر ذلک ورجل یبائع اماماً لا یبائعہ الا لدنیا فان اعطاه منها وافی وان لم یعطہ منها لم یف وفی روایۃ عن ابی ہریرۃ قال أراه مرفوعاً قال ثلاث لا یکلہم اللہ ولا ینظر الیہم ولہم عذاب الیم رجل حلف علی یمین بعد صلوة القصر علی مال مسلم فأقتطعہ وباقی حدیثہ نحو حدیث الاعمش۔

اس روایت میں مزید تین شخص کا تذکرہ ہے، (۱) جو جنگل یا باغ میں فاضل از ضرورت پانی مسافر کو نہ دے (۲) دوسرا وہ شخص جو عصر کے بعد کسی کے ہاتھ سامان فروخت کرے، اور قسم کھائے کہ میں نے اسکو اتنے دام میں خریدا ہے، خریدار اس کی قسم کا اعتبار کر لے حالانکہ بائع نے جھوٹی قسم کھائی ہے، (۳) تیسرا وہ شخص جو کسی امیر کے لئے ہاتھ پر صرف دنیوی غرض لے لئے بیعت کرے اگر وہ چیز اس کو دے تو بیعت کو پورا کرے اور اگر نہ دے تو نہ پورا کرے۔

جب ضرورت سے زیادہ پانی جانوروں کو نہ دینا، شرعاً جرم ہے تو پھر انسان کو اس سے محروم کر دینا، کتنا بڑا جرم ہو گا اور وہ بھی مسلمان، جو ایسی جگہ میں ہو جو آبادی سے باہر ہو، اس کے سوا اس پاس میں کہیں پانی میسر نہیں ہاں اگر مسافر غیر قوم سے ہو، جیسے عربی اور مرتد ہو، تو اس کو پانی سے محروم کر سکتے ہیں، (قالہ النووی) عصر کے بعد جھوٹی قسم

**تشریح**

کھانے والا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عصر کے وقت دن و رات کے فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ وقت محترم ہو جاتا ہے ایسے وقت میں جھوٹی قسم کھانا، دوجہ سے جرم ہے، وقت کی بے حرمتی، (۲) اللہ کے نام کی بے حرمتی، دنیوی اغراض کے لئے امام کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور پھر دنیوی غرض کے پورا نہ ہونے پر اس کو توڑ دینا لام وقت کو دھوکہ دینا ہے، اور اس کا یہ فعل ملک میں فتنہ و فساد اور بغاوت پھیلانے کا سبب ہے۔

الفلاة : بیان جہاں کوئی مونس و معنوار نہ ہو، (تم شرح الحديث)



## باب بیان غلط تحریم قتل الانسان نفسه وان من قتل نفسه بشئ عذب به في النار وانه لا يدخل الجنة الا نفس مسلمة

خودکشی کی سخت حرمت جس نے اپنے آپ کو قتل کر لیا تو اسی سے جہنم کا عذاب دیا جائے گا، اور وہ جنت میں نہیں داخل ہوگا مگر مسلمان

❦ حدیث ❦ حدثنا ابو بکر بن امی شیبہ وابو سعید الاشج — عن امی هريرة قتل قال رسول الله ﷺ مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيثَةٍ فَحَدِيثُهُ فِي يَدِهِ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مَخْلُودًا فِيهَا اَبَدًا وَمَنْ شَرَبَ سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مَخْلُودًا فِيهَا اَبَدًا وَمَنْ تَرَدَّى مِنْ جَبَلٍ وَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَرَدَّى فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مَخْلُودًا فِيهَا اَبَدًا.

ترجمہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، کہ جو شخص اپنی جان کسی آگے دھار دے ہلاک کر لے تو وہ اٹھار جہنم میں اس کے ہاتھ میں ہوگا اور اس کو اپنے پیٹ میں ہمیشہ گھونپتا رہے گا، اور جو شخص زہر پی لے، اور اپنی جان ہلاک کر لے، تو ہمیشہ جہنم میں زہر پیتا رہے گا، اور جو شخص پہاڑ سے گر جائے، اور اپنی جان ہلاک کر لے، تو وہ ہمیشہ جہنم میں گرتا رہے گا۔

مقصد حدیث یہ باب بڑا اہم ہے، اس باب کی روایتوں سے، شارح کا مقصد یہ ہے، کہ مومن کو مانند ارہونا چاہئے، اور یہ کہ مسلمانوں کو یہ عقیدہ قائم کرنا ہوگا، کہ اللہ نے جو جان اس کو دی ہے، وہ اسکی نہیں بلکہ خدا کی لانت اور مملوک ہے، اور خدا کی لانت و مملوک کی حفاظت کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے، اسی لئے قرآن کریم میں جان کی حفاظت کی، خصوصی تلقین کی گئی ہے، اور اس کو ضائع کرنے سے سختی سے روکا گیا ہے، ولا تلقوا ابائیدیکم الی التهلكة۔

### ”خودکشی اور جہاد میں فرق“

جان کو ہلاک کرنا ایسا ہوا جیسا کہ کوئی شخص کسی کو کا شکاری کے لئے مل تیل دے اور وہ شخص بجائے کا شکاری کے مل توڑ دے، اور تیل کا گھونٹ کر مار دے، تو ظاہر ہے کہ یہ شخص قانون عدالت کے سامنے مجرم ہے، ہاں اگر کا شکاری کرتے ہوئے مل ٹوٹ جائے، اور تیل مر جائے، تو وہ مجرم نہیں، کیونکہ جس کام کے لئے دیا گیا تھا، اسی میں وہ ہلاک ہوا خودکشی اور جہاد میں یہی فرق ہے، مجاہد اگر جہاد کرتے ہوئے مر جائے، تو کہا جائے گا کہ عبادت کرتے ہوئے اس کی جان کام آگئی۔



## انسانی جان کی عظمت

انسانی جان کی عظمت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ انسان اپنی خوراک اور علاج و دوا کے لئے، بیشتر چیزوں کو کاٹ چھانٹ کر، یا کوٹ پیس کر اپنے کام میں لاسکتا ہے مگر کسی انسان کے جزو عضو کے ساتھ یہ معاملہ جائز نہیں۔ کیونکہ وہ مکریم انسان کے منافی ہے، اسی لئے انسانی اعضاء کا لین دین، بیع و شراء حرام ہے، انسانی جان اتنی بڑی امانت ہے کہ اس کو بچانے کیلئے، غذاؤں کا استعمال نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اضطراری حالت میں جان بچانے کے لئے خاص شرائط کے ساتھ بہت سے وہ کام اور وہ چیزیں جائز کر دی گئیں ہیں جو عام حالت میں حرام ہیں، جان بچانے کے لئے زبان سے کلمہ کفر بولنے کی اجازت من کفر باللہ من بعد ایمانہ الامن اکبرہ و قلبہ مطمئن بالايمان (بخاری شریف ج ۲/ ص ۱۰۲۶) کے ذریعہ دی گئی ہے، جو عام حالت میں سنگین جرم ہے، اسی طرح جو شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے مر رہا ہو اس کے لئے خاص شرائط اور حدود کے ساتھ، حرام اور نجس چیزوں کا استعمال کرے، جان بچالینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے، فمن اضطر غیر باغ و لاعاد فلاثم علیہ، دوسرے جگہ ارشاد ہے فمن اضطر فی مخصصة غیر متجانف لاثم فان الله غفور رحیم، جب جان بچانے کے لئے حرام مال بھی حلال ہو جاتا ہے تو پھر حلال غذا کے رہتے ہوئے اپنی جان ہلاک کر دینا بدرجہ اولیٰ تا جائز اور حرام ہو گا۔

اسی سے مراد بت، بھوک بڑھنا کی قباح و شامت معلوم ہو جاتی ہے، کہ بھوک بڑھنا اس حد تک کہ جان چلی جائے یا عبادت کے قابل نہ رہ سکے، جائز نہیں ہے۔ (شامی ص ۵۶۲، مسو ص ۲۶۵/ ۳)

اس باب میں امام مسلم نے اسی مسئلہ کو حل کیا ہے، کہ جب مخلوق کی امانت میں خیانت قبیح ہے، تو خالق کی امانت میں خیانت قبیح تر ہے، جو شخص خود کشی کرے گا وہ جہنم کے عذاب کا مستحق ہو گا۔

**حل لغات**۔ ہنزہ کے ساتھ اور ہمزہ کو الف سے بدل کر، تو جا بھی پڑھا جاسکتا ہے زخمی کرنے کے معنی میں ہے، یمنودی یعنی یمنزل، (کوونا) جہنم آخرت کی آگ کا نام ہے، (عافانا اللہ تعالیٰ منها) یونس کہتے ہیں کہ اکثر نوحین اس کو بھی مانتے ہیں، اور عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف کہتے ہیں، اور دوسرے نوحین اس کو عربی مان کر، تانیث اور علیت کی وجہ سے غیر منصرف کہتے ہیں، جہنم کو جہنم اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں گہرائی بہت زیادہ ہے، بیہر جہنم بہت گہرے کنویں کو کہا جاتا ہے بعض لوگوں نے جہنم سے مشتق مانا ہے، جس کے معنی تختی کے ہیں جہنم الوجہ، غلیظ الوجہ کو کہا جاتا ہے، اس صورت میں وجہ تسمیہ یہ ہے، کہ جہنم اور اس کی تمام تکلیفیں سخت ہیں، سم، سین مفتوح، مضموم، کمور متیوں طرح پڑھا جاسکتا ہے، البعد مفتوح فصیح مانا گیا ہے جمع اسکی سام آتی ہے بمعنی زہر، یتحسہ گھونٹ کر پینا۔

**شرح حدیث**۔ قولہ علیہ السلام فهو فی نار جہنم خالد افخلد فیہا ابدًا: اس سے بظاہر سمجھ میں آتا ہے کہ خود کشی ایسا مذموم فعل ہے، کہ اس سے خود کشی کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو کر، ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، کیونکہ خلود فی النار کافر کے لئے ہے، مسلمانوں کے لئے خلود نہیں ہے، اس سے معتزلہ اور خوارج کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے، کہ مرتکب کبیرہ مہملہ فی النار ہے اہل سنت والجماعت اس کے قائل نہیں ہیں، اہل سنت والجماعت کی دلیل ان الله لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء (۱) ہے خود کشی

بھی مادیون ذلك لمن يشاء میں داخل ہے، اور مسلم شریف کی مفصل روایت سے بھی جمہور کی تائید، اور خوارج کی تردید ہوتی ہے، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ طفیل بن عمرو وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ مضبوط قلعہ اور محافظ جماعت کی طرف ہجرت کرنا منظور فرما سکتے ہیں، راوی کا بیان ہے، کہ زمانہ جاہلیت میں قبیلہ دوس کے پاس، ایک قلعہ تھا رسول اللہ ﷺ اس خوش نصیبی کی وجہ سے جو انصار کے حق میں مقدر تھا ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا، جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو طفیل بن عمرو اور ان کی قوم کے ایک اور شخص نے ساتھ ساتھ ہجرت کی، اتفاق یہ کہ مدینہ کی آب و ہوا، ان کو اُس نہیں آئی، ان کا رفیق بیمار پڑ گیا، اور تکلیف برداشت نہ کر سکا اس نے اپنے تیر کا پیکان نکال کر اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ ڈالے، اس کے ہاتھوں سے خون بہہ نکلا یہاں تک کہ، ان کی وفات ہو گئی، طفیل بن عمرو نے انہیں خواب میں دیکھا، تو صورت ان کی بہت اچھی تھی، مگر ہاتھ ڈھکے ہوئے تھے، دریافت کیا کہ تمہارے پروردگار نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا، تو جواب دیا کہ حضورؐ کے ساتھ، ہجرت کرنے کی برکت سے مجھے بخش دیا پھر ان سے دریافت کیا کہ تم اپنے ہاتھ ڈھانکے ہوئے کیوں نظر آرہے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھ سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ تم نے جس کو خود سے بگاڑا، ہم اسے ٹھیک نہیں کریں گے، طفیلؓ نے یہ خواب آنحضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا آپ نے دعا فرمائی، اے اللہ اسکے ہاتھوں کی بخشش فرما دیجئے۔ (مسلم شریف ص ۷۴)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مغفرت میں بھی تجزیہ ہو سکتا ہے، یہاں مغفرت نے، حضرت طفیل کے ریش کے سارے جسم کو تو گھیر لیا تھا، مگر امانت الہیہ میں بیجا دست اندازی کی وجہ سے، اسکے ہاتھوں کو چھوڑ دیا تھا۔ یہ شخص کیا ہی خوش نصیب تھا، کہ اس کا مقدمہ رحمۃ اللعالمین کے سامنے آگیا، اور آپ کے مبارک ہاتھ اسکی سفارش کے لئے اٹھ گئے، پھر کیا تھا رحمت نے اس کی رگ رگ کو گھیر لیا، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خود کشی کفر نہیں ہے، ورنہ اس کی مغفرت ہی نہیں ہوتی، نیز آنحضور ﷺ کا فرکیلئے دعا بھی نہ فرماتے، یہ حدیث زبردست دلیل ہے اہل سنت والجماعت کی۔

**خالد ام مخلصہ کی توجیہ:** (۱) ایک جواب امام نوویؒ نے دیا ہے، کہ خلود کی سزا اس شخص کے لئے ہے، جو خود کشی کو حرام جانتے ہوئے حلال ہونے کا عقیدہ رکھے، ظاہر ہے کہ حرام کو حلال سمجھنے والا کافر ہے،

حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری کتاب الجنائز ص ۲۲/۳) علامہ بدر الدین عینیؒ، اور جلال الدین سیوطیؒ نے بھی اس جواب سے اتفاق کیا ہے، لیکن اس جواب پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مستحل حرام کو اس وقت کافر کہا جاتا ہے جبکہ ایسے قطعی حرام شی کا انکار کرے، جس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو، اور وہ حرام لعینہ ہو، بغیر نہ ہو، اور جس چیز کی حرمت قطعی الدلالت، یا ظنی الثبوت ہو اسکو حلال سمجھنے والا کافر نہ ہو گا۔ (شی باب الخیص ص ۳۹۳)

(۲) دوسرا جواب امام ترمذیؒ نے دیا ہے، قال الترمذی رواہ محمد بن عجلانی عن سعید المقبری عن ابی ہریرۃ فلم یذکر خالد ام مخلصہ وکذا رواہ ابوالزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃ، اس سے امام ترمذیؒ اس روایت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، جس کو امام بخاریؒ نے جنائز کے اخیر میں ہائیں الفاظ ذکر کیا ہے۔ الذی یختنق نفسه یختنق فی النار والذی یطعنہا یطعنہا فی النار (بخاری شریف ص ۱۸۲/۱) امام ترمذیؒ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

جس میں خالد ا مخلص کا ذکر نہیں ہے، وہی اصح ہے، کیونکہ صحیح روایات سے ثابت ہے، کہ موحّد، عاصی عذاب کے بعد جہنم سے نکالے جائیں گے۔ (ترمذی ص ۳)

(۴) تیسرا جواب زجر و توبخ پر محمول کیا جائے، اس کے حقیقی معنی امر لا نہیں، چوتھا جواب خود کشی کا خاصہ بتلایا گیا ہے، اصل سزا تو اسکی یہی ہے، کہ خلود فی النار ہو، البتہ ایمان کی صفت آجانے سے اس کی اصل سزا مرتب نہ ہوگی، جیسے پانی کا مزاج ٹھنڈک ہے، اور آگ پر رکھنے کی وجہ سے گرم ہو جاتا ہے۔

(۵) پانچواں جواب یہاں عبارت محذوف ہے، اصل عبارت یہ ہے مخلص افیہا الی ان یشاء اللہ، چھٹا جواب خالد ا مخلص کا تعلق یتوجا اور یتہیا سے کر دیا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ جب تک جہنم میں رہے گا، اتنے زمانہ میں ہمیشہ، زہر کھوٹتا رہے گا، ساتواں جواب خلود سے مراد، دوام نس، بلکہ لمبی مدت ہے، مگر لفظ ابد اسے یہ تاویل کمزور ہو جاتی ہے۔

❦ حدیث ❦ قال رسول اللہ ﷺ من حلف علی یعین بملۃ غیر الاسلام کاذبا فهو

کما قال، ومن قتل نفسه بشئ عذب به يوم القيامة وليس على رجل نذر في شئ لا يملكه۔

جو شخص غیر اسلام کی جھوٹی قسم کھائے، تو وہ دوسرا ہی ہوگا، جیسا اس نے کہا، اور جس نے اپنی جان کو کسی چیز سے ہلاک کر دیا، اسکو قیامت کے دن اسی سے عذاب دیا جائے گا، اور انسان کا غیر کی مملوکہ چیز میں، نذر کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

ترجمہ

کاذباً کی قید احترازی نہیں ہے، کیونکہ غیر اسلام کی قسم ہر صورت میں کذب ہے، اس لئے کہ قسم اسی کی کھائی جاتی ہے، جس کی عظمت قلب میں ہوتی ہے، تو اگر واقعی اس کے دل میں دوسرے مذہب کی عظمت ہے، تو وہ یقیناً خلاف واقعہ اور جھوٹ ہے، اور اگر اس کی عظمت نہیں تو صورتاً کذب ہے کیونکہ غیر اسلام کو مقسم بہ بتانے سے اس کی عظمت کا ایہام ہوتا ہے، بہر صورت یہ کذب سے خالی نہیں، حقیقتاً کذب یا صورتاً کذب، اسلئے کذب کی قید اتفاقی ہے، اور اس کی مثالیں بکثرت ہیں، کہ کوئی قید محض قید اتفاقی ہوا کرتی ہے، جیسے قوله تعالیٰ ویقتلون الانبیاء بغیر حق ولا تقتلوا ولاکم من اطلاق۔ وریثکم اللاتی فی حجورکم اسی طرح قول باری تعالیٰ فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوة ان خفتم وقوله تعالیٰ ولا تکرهوا فتیانکم علی البغاء ان اردن تحصناً وقوله تعالیٰ لاتاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفة وغیرہ۔ پہلی آیت میں بغیر حق اور دوسری آیت میں من اطلاق، تیسری میں فی حجورکم، چوتھی میں ان خفتم، پانچویں میں ان اردن تحصناً اور چھٹی میں اضعافاً مضاعفة قید اتفاقی ہے، اسی طرح حدیث میں کذب قید اتفاقی ہے یا مزید قباحت اور شاعت ظاہر کرنے کے لئے یہ قید مذکور ہے۔

کسی کام کے کرنے پر یہودی یا کافر ہونے کی قسم کھائی تو؟

حدیث کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، (۱) یہودیت اور نصرانیت کی قسم کھانا، جیسے کہا جائے قسم ہے یہودیت کی قسم ہے نصرانیت کی، (۲) اگر میں ایسا کروں تو یہودی ہو جاؤں، ایسا کروں تو نصرانی وغیرہ ہو جاؤں، امام ابوودود کار، حمان دوسرے معنی کی طرف سمجھ میں آتا ہے حضرت بریدہ کی ایک روایت میں اسکی تصریح ہے۔ قال علیہ السلام من حلف قفال انی بری من الاسلام فهو کما قال ان کان کاذباً وان کان صادقاً فلن یراجع الی الاسلام مالماً،

”اگر کسی نے اس طرح کی قسم کھائی، اور اس کے خلاف کیا، تو حدیث کے مطابق کیا وہ یہودی یا نصرانی ہو جائے گا؟ قاضی عیاض فرماتے ہیں، کہ نہیں ہوگا، حدیث میں زجر و توبخ کو بطور مبالغہ بیان کرنا مقصود ہے، اور یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ من ترك الصلوة فقد كفر ہے۔

علامہ نوویؒ اس مقام پر لکھتے ہیں کہ اگر قسم کھانے والا، یہودیت و نصرانیت کی عظمت، دل میں رکھتا ہے تو کافر ہوگا اور اسکا دل، مذہب اسلام پر مطمئن ہو، تو گنہگار ہوگا، مگر دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا، اور ممکن ہے کہ یہاں کفر سے، کفرانِ نعمت مراد ہو، کیونکہ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ اس طرح کی قسم نہ کھائی جائے اور امام بخاری کے کہنے کے مطابق کفر دونوں کفر کے قبیل سے ہوگا، ”م

علامہ شامیؒ نے اس موقع پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر اس شخص کا یہ عقیدہ تھا، کہ اس قسم کے خلاف کرنے پر انسان کافر ہو جاتا ہے اور پھر اس نے اس طرح کی قسم کھائی، تو کافر ہو جائے گا، اور اگر اسکا یہ عقیدہ تھا، بلکہ قسم کی نیت سے اس طرح کے الفاظ کہے، تو کفر لازم نہ ہوگا، البتہ اگر قسم یحییٰ غوس ہوگا، تو عتاب الہی کا مستحق ہوگا، اور اگر یحییٰ منعقدہ ہو تو خلاف قسم کرنے پر عندنا کفارہ لازم آئے گا۔ ”م

یہاں ایک بحث یہ بھی پیدا ہوگی، کہ عرفِ شرع میں، اس طرح کی قسم قسم کھلانے کی یا نہیں؟ یعنی حائث ہو جانے کی وجہ سے کفارہ لازم ہو گیا نہیں؟

تو امام حنفی، امام اوزاعی، سفیان ثوری اور احناف، امام احمد اطلق بن راہویہؒ، یہ تمام لوگ اس کو یحییٰ مانتے ہیں، امام شافعی، مالک، ابو عبیدہ اس کو یحییٰ میں شمار نہیں کرتے ہیں، ان لوگوں کے یہاں اس کے حائث ہونے کی صورت میں کفارہ واجب نہ ہوگا، البتہ گنہگار ہوگا، صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی ان فعلت کذا فہو یہودی، او نصرانی او کافر کہے، تو اسکو یحییٰ سمجھا جائے گا اگر حائث ہو جائے تو اس پر کفارہ یحییٰ لازم آئے گا، اور اسکی دلیل یہ ہے کہ اس کو تحریم حلال پر قیاس کیا جائے گا اور یہ یحییٰ قرآنی یحییٰ ہے، قال اللہ یتابھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لك اس کے بعد فرمایا قد فرض اللہ لكم تحلة ایمانکم۔ (۱) ابو داؤد شریف ص ۱۶۱ (۲) شامی (۳) ہدایہ ج ۲ (۴) قرآنی آیات۔

(۳) شارح کا مقصد یہ ہے کہ غیر مذہب کی قسم کھانے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے نزدیک اسلام کسی نہ کسی صورت میں قابل ترک ہے جب کہ اسلام بے تعلقی کی اتنی سی جھلک بھی برداشت نہیں کرتا، اسی طرح یوں قسم کھانا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو مجھ پر مرتے دم تک ایمان نصیب نہ ہو، یہ تو بہت بے جا جرأت ہے اسلام سے محرومی کسی صورت میں بھی قابل برداشت نہ ہونی چاہئے۔ بلکہ کامل مسلمان تو وہ ہے جو ہر بات کا تصور کر سکتا ہے مگر ترک ایمان کا تصور ہرگز نہیں کر سکتا، ولا تموتن الا وانتم مسلمون میں بھی ملحوظ ہے۔

قوله عليه السلام: وليس علي رجل نذر في شئ لا يملكه،

نذر کے شرائط میں ایک یہ بھی ہے کہ جس چیز کی نذر مانی گئی ہے وہ نذر کے وقت ناذر کی ملکیت میں ہو یا کم از کم ناذر کی اضافت ملک یا سبب ملک کی طرف کی ہو، نسبت الی الملك کی صورت یہ ہے کہ ناذر کہے کل مال املکھ فیما استقبل

فہو ہدی او صدقہ سبب ملک کی طرح اضافت کی صورت یہ ہے کہ نذر کہے کلمہ اشتريت اوارثہ فہو صدقہ اگر نذر نے نسبت الی الملک یا اضافت الی سبب الملک بھی نہیں کی، اور نہ نذر کے وقت وہ اس کا مالک ہے، تو بالا اتفاق نذر صحیح نہیں، اور اگر اضافت الی الملک یا سبب ملک پائی جائے تو امام ابو حنیفہ کے یہاں یہ نذر صحیح ہے، اور امام شافعی کے نزدیک یہ صورت بھی صحیح نہیں ہے، اس کی مفصل بحث باب النذر میں آئے گی انشاء اللہ۔

❦ حدیث ❦ حدثنا ابو عسنان المصنف۔۔۔ عن ثابت بن الضحاک عن النبی ﷺ۔۔۔ ومن

ادعی دعوا کا ذبا لیتکثر بہالم یزده اللہ تعالیٰ الا قلة ومن حلف علی یمین صبر فاجرة (۱)

”مومن پر لعنت کرنا، اس کے قتل کی طرح ہے، یعنی جب کوئی مومن، کسی مومن پر لعنت کرتا ہے، تو گویا ہلاکت کی بددعا کرتا ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ حرمت میں بظاہر دونوں یکساں محسوس ہوتے ہیں لیکن قتل یہ لفظ ہے، اور وہاں ہونے ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان، بلکہ کسی جانور اور فاسق و فاجر پر متعین طور پر بلکہ کسی کافر، خواہ مردہ ہو، یا زندہ لعنت کرنا جائز نہیں۔ ہاں جس کافر کا، نص شرعی سے کفر پر سرنا معلوم ہو، جیسے ابو جہل، ابو لہب، تو ایسے افراد پر اسی طرح عام صیغہ کے ساتھ کافر وغیرہ پر لعنت بھیجنا جائز ہے، مثلاً لعنة الله على الکافرين، علی الظالمین، علی الفاسقین وغیرہ، ”م۔“

یمین صبر سے مراد وہ یمین ہے جو قسم کھانے والا اسکو اپنے اوپر لازم کرے، اور اس پر جم جائے، فاجرہ سے مراد جھوٹی قسم ہے روایت کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص جھوٹا دعویٰ کرے، اس سے مقصد دولت کو بڑھانا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس پر غربت اور افلاس مسلط کر دیتا ہے، اسی طرح جھوٹی قسم پر جم جانے کا انجام غربت اور افلاس ہے۔

”قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں جھوٹے دعویٰ کا تعلق محض مال سے نہیں، بلکہ یہ عام ہے، ہر قسم کے جھوٹے دعویٰ کو، اور اس کا انجام ہدیہ ہو گا کہ جس چیز کا جھوٹا دعویٰ کیا، اس میں کمی واقع ہو جائے گی، مثلاً کسی نے بڑائی اور اپنی قدر قیمت جانے کے لئے یہ ذبک دیا کہ ہمیں تو اتنا مال ملا، یا یہ کہ اعلیٰ نصب کا دعویٰ کر لیا، یا جس علم و فن کو نہیں جانتا، اس کا دعویٰ کیا تو جس قدر بھی، اس کے پاس موجود ہے، نہ تو اس میں برکت ہو گی، اور نہ اضافہ، بلکہ اور بھی بے عزتی کے راستہ کھلیں گے، ”لیتکثر بہا کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹے دعویٰ کے ذریعہ اپنا مال زیادہ کرے یا اپنی عزت۔ ومن حلف علی یمین جھوٹی قسم پر کیا سزا مرتب ہو گی، حدیث میں جزا و محذوف ہے قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اس کا عطف ما قبل کے جزا پر ہے اس لئے محذوف ہے۔ ”م۔“ جہاں حدیث میں حلف کے ساتھ علی یمین کا لفظ آئے تو حلف کے معنی قسم کھانے کے اور یمین کے معنی مخلوف علیہ کے لئے جاتے ہیں۔

❦ حدیث ❦ حدثنا محمد بن رافع وعبد بن حمید۔۔۔ عن ابی ہریرۃ قال شہدنا مع رسول

اللہ ﷺ حنیناً فقال لرجل ممن یدعی بالاسلام هذا من اهل النار فلما حضرنا القتال قاتل الرجل

قتلاً شديداً فاصابتہ جراحة فقیل یا رسول اللہ الرجل الذی قلت لہ انفاً انه من اهل النار فانه

قاتل اليوم قتلاً شديداً وقد مات فقال النبی ﷺ الی النار فکاد بعض المسلمین ان یرتاب فبینام

عَلَىٰ ذَلِكَ إِذْ قِيلَ فَإِنَّهُ لَمْ يَمُتْ وَلَكِنْ بِهِ جِرَاحٌ شَدِيدٌ أَلْقَيْنَاكَ مِنَ اللَّيْلِ لَمْ يَضْبِرْ عَلَى الْجِرَاحِ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَأَخْبَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِذَلِكَ فَقَالَ اللَّهُ أَكْبَرُ أَشْهَدُ أَنِّي عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ ثُمَّ أَمَرَ بِإِلَاقَةِ فَنَادَىٰ فِي النَّاسِ إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا أَنْفُسٌ مُّسْلِمَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ يُؤَيِّدُ هَٰذِلَيْنِ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ۔

ترجمہ آسان ہے۔ ”بخاری شریف میں یہی روایت مذکور ہے جس میں حنینا کے بجائے خیبر ہے، قاضی عیاض کا رجحان اسی طرف ہے، فکاد بعض المسلمین، اس جملہ سے معلوم ہوا کہ کار جو افعال مقار بہ میں سے ہے اس کی خبر پر ان کا دخول جائز ہے۔ لا یدخل الجنة الانفس مسلمہ۔ اس شخص کے مرجانے پر یہ اعلان کہ مسلمان ہی جنت میں جائے گا، اس سے علامہ سندھیدہ اتھ کرتے ہیں، کہ وہ شخص اصلاً مسلمان تھا ہی نہیں، یا اس اسلوب سے در حقیقت ان لوگوں کو تمہید مقصود تھی، جن کو اس شخص کے بارے میں، کلام رسول میں شک پیدا ہو گیا تھا کہ کلام رسول میں شکوک و شبہات کرنا اسلام کے خلاف ہے، لہذا یہ چیز دخول جنت سے مانع ہے۔“

با الرجل الفاجر: اہل لغت کا بیان ہے کہ فاجر، کافر اور فاسق دونوں کے لئے مستعمل ہے۔

﴿حَدِيثٌ﴾ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ ————— وَفِي أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ

لَا يَدْخُلُ لَهُمْ شَاذَةٌ إِلَّا اتَّبَعَهَا يَضْرِبُهَا بِسَيْفِهِ فَقَالُوا مَا أَجْزَأْنَا مِنَ الْيَوْمِ أَحَدُكُمَا أَجْزَأَ

فُلَانٍ..... فَاسْتَعْجَلَ الْمَوْتَ فَوَضَعَ سَيْفَهُ بِالْأَرْضِ وَذَبَابُهُ بَيْنَ ثَدْيَيْهِ ثُمَّ تَحَامَلُ

”لا یدع لهم شاذة (فاذة) شاذة کے لفظی معنی جو جماعت سے الگ ہو جائے یہاں مقصود اس شخص کی صفت بیان کرنی ہے، کہ کسی بھی کافر سے نہیں ملتا، مگر اسکو قتل کر دیتا تھا، دوسری توجیہ یہ ہے کہ ہر چھوٹے اور بڑے کو قتل کر دیتا تھا اس سے اس کی جو انردی کو مٹاتا مقصود ہے،

ما اجزاء۔ یعنی ہم سے کوئی بھی اس کے بقدر کام نہ کر سکا۔

جب اس کی بہادری کا تذکرہ حضور ﷺ سے کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ وہ تو جہنمی ہے طبرانی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس بن ابی الجونی الخزاعی نے فرمایا کہ پھر ہم لوگوں کا کیا حشر ہوگا؟ تو آپ نے اسکی وجہ بتادی کہ وہ شخص خبیث منافق ہے۔ یہ فرماتے ہیں کہ ہم اس تلاش میں لگے رہے کہ آخر کس سبب سے اس کو یہ وعید سنائی گئی ہے جب کہ بظاہر اس کے اعمال تو بہت اچھے ہیں سقینا اس کا کوئی عجیب سبب ہوگا، چنانچہ میں اس کے ساتھ لگا رہا، تو یہ دیکھا کہ اس کو سخت زخم لگا، جس پر صبر نہ کر سکا، اور موت کو اس نے جلد طلب کر لی چنانچہ نکوار کو زمین پر رکھ کر، اس کے ذباب یعنی نکوار کے نوک والے حصہ پر، سینہ رکھ کر اسپر لیٹ گیا، اور اپنے آپ کو ہلاک کر لیا، جب اسکی اطلاع آپ کو ہوئی، تو آپ نے ارشاد فرمایا ان الرجل لیعمل عمل اهل الجنة فیما یدنو الناس وهو من اهل النار۔ یعنی ایک شخص لوگوں کو جنتی جیسا عمل کرتا نظر آتا ہے حالانکہ وہ جہنمی ہوتا ہے،

مقصد حدیث اس کا مقصد یہ ہے کہ اصل فیعلہ وہی ہوتا ہے، جو قضا و قدر کر چکی ہے اعمال ظاہری تو انسان کے اچھے ہونے کی، ظاہری نشانیاں ہیں، ابھی اوپر آپ حدیث پڑھ چکے ہیں کہ کسی شخص کی راہ خدا میں،

جانبازی دیکھ کر بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے، ہاں اچھے اعمال سے حسن خاتمہ کی امید، اور برے اعمال سے سوء خاتمہ کا اندیشہ ضرور ہونا چاہئے، اور نیز یہ بھی معلوم ہونا چاہئے، کہ اس جہاں میں بیشتر فیصلہ عمل کے تابع رکھا گیا ہے، لہذا جس کو جنت عطا فرمائیں گے، اس سے عمل بھی اہل جنت کے کرائیں گے، اور جس کو بخش منظور نہیں، اس سے بھی اعمال اسی کے مناسب کرائے جائیں گے، تاکہ اعمال اور جزاء کے درمیان ظاہری مناسبت بھی باقی رہے، اس حدیث سے یہ سبق بھی ملتا ہے، کہ کسی کو اپنے عمل پر ناز نہیں کرنا چاہئے، نہ معلوم نوشتہ تقدیر کیا ہے؟

قوله عليه السلام ان رجلاً يمتن كان قبلكم خَرَجَتْ بِهِ قَرْحَةٌ فَلَمَّا آذَتْهُ انْتَزَعَ سَهْمًا مِّنْ كِنَانَتِهِ فَلَمْ يَرْقَأْ لَدِمَ حَتَّى مَاتَ قَالَ رَبِّكُمْ قَدْ حَرَمْتَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ (بخاری شریف ص ۱۸۲، ع ۱۳۶۴ مسلم ص ۷۲)

قاضی عیاض اسکی توجیہ میں ذکر کرتے ہیں، کہ ہو سکتا ہے کہ اس نے حلال سمجھ کر کیا ہو یا ساقین کے دخول کے وقت اس کو داخلہ سے روک دیا گیا ہو، یا اس کے حساب کا وقت لمبا ہو گیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسکو اعراف میں روک لیا گیا ہو، یہ تمام توجیہات قاضی عیاض کی ہیں۔

لام نوٹی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اس کی شریعت میں ایسا ہو کہ کبیرہ کے ارتکاب سے کفر آجاتا ہو اس لئے حرمت جنت کا مستحق ہو۔

## باب غلظ تحريم الغلول وانه لا يدخل الجنة الا المؤمنون

مال غنیمت چوری کرنا سخت حرام ہے اور جنت میں صرف مومن ہی داخل ہوں گے

❦ حدیث ❦ حَدَّثَنِي زُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ... قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ حَدَّثَنِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ لَمَّا كَانَتِوُمُ خَيْبَرَ أَقْبَلَ نَفَرٌ مِّنْ صَحَابَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالُوا فُلَانٌ شَهِيدٌ وَفُلَانٌ شَهِيدٌ حَتَّى مَرُّوا عَلَى رَجُلٍ فَقَالُوا فُلَانٌ شَهِيدٌ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ كَلَّا إِنِّي رَأَيْتُهُ فِي النَّارِ فِي بُزْدَةٍ غُلِّهَا أَوْعِيَاءَةٌ ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اذْهَبْ فَنَادِ فِي النَّاسِ أَنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا الْمُؤْمِنُونَ قَالَ فَخَرَجْتُ فَنَادَيْتُ أَلَا إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا الْمُؤْمِنُونَ۔ (مسلم ص ۷۴ ترمذی ص ۲۸۶ احمد ص ۳۰۶)

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمرؓ نے بیان کیا، کہ خیبر کی لڑائی کے دن آنحضور ﷺ کے ترجمہ | کچھ اصحاب، آپ کے سامنے کہنے لگے، کہ فلاں شخص شہید ہے، اور فلاں شہید ہے، یہاں تک کہ ایک تیسرے شخص کے پاس گذرے، تو کہنے لگے کہ فلاں شہید ہے، تو آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہرگز نہیں، میں نے اس کو مال غنیمت کی چادر یا عبا چوری کرنے کی وجہ سے جہنم میں دیکھا ہے، پھر حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے آنحضور ﷺ نے فرمایا، کہ اے خطاب کے بیٹے! جاؤ اور لوگوں میں اعلان کرو کہ مومنوں کے سوا جنت میں کوئی نہیں جائے گا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، کہ میں نکلا اور اعلان کر دیا کہ مومن کے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔

مقصد :- خیانت کی وجہ سے مومن کا ایمان کھوتا ہو جاتا ہے، اس سے مرجعہ کے اس باطل عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے کہ نیک عمل سے ایمان میں نہ تو کوئی کمال آتا ہے، اور نہ بد عمل سے ایمان میں، کسی طرح کا نقص آتا ہے، جب کہ اس

روایت سے معلوم ہوا کہ ایمان کے باوجود خیانت کی وجہ سے، مسلمان کو جہنم میں بھی جانا پڑتا ہے، یہ دخول دائمی نہیں، مگر عارضی طور پر جہنم میں جانا، اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ بد عملی کی وجہ سے ایمان کمزور پڑ جاتا ہے، اور برے عمل کا اثر شہادت پر بھی پڑتا ہے۔

**حل لغات :** غلول باب نصر سے آتا ہے، غل یغل غلولا۔ ابو عبیدہ کا خیال ہے کہ خاص طور پر مال غنیمت کے خیانت کو غلول کہا جاتا ہے، البتہ دوسرے حضرات ہر چیز کی خیانت کو غلول کہتے ہیں، بعض علما حنفی کا خیال ہے کہ غلول سے مراد بروکھائی ہے، جو ناجائز طریقہ سے حاصل ہوئی ہو، بڑا دھاری دار چادر، اس کو شملہ اور نمرہ بھی کہتے ہیں، ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ بڑا وہ کالی چادر ہے، جس میں تصویر ہو، جمع اس کی بزد بفتح الراء آتی ہے۔ عبادہ اس کو عباہ بھی کہتے ہیں، نفی بڑا عباہ سوسہ ہے، نقدیری عبارت بسببہا ہے، میدان جہاد میں، اگر کوئی شخص خیانت کرتا ہے، تو ایسا شخص اگر شہید بھی ہو جائے، تو شہادت کا ثواب نہیں پاسکتا، فقہاء نے شہید کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

### شہداء کے اقسام

”شہید تین طرح کے ہیں (۱) دنیا و آخرت دونوں عالم میں شہید، جیسے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے کسی کی جان چلی جائے، اس کو غسل دیئے بغیر، دفن کر دیا جائے گا، اور آخرت میں شہادت کا درجہ ملے گا، (۲) جو نام و نمود یا کسی اور غرض فاسد کے لئے جنگ میں شریک ہو، اور قتل ہو جائے، تو دنیا میں شہید سمجھا جائے گا اس کو بغیر غسل دیئے دفن کر دیا جائے گا البتہ آخرت میں درجہ شہادت سے محروم ہوگا (۳) جو آخرت میں شہید ہو، اور دنیا میں غیر شہید، جیسے پانی میں ڈوب کر مر جانا، ظالموں کی بیماری میں مر جانا، حلق نفاس کی موت، دیوار میں دھب کر مر جانا وغیرہ ان لوگوں کو دنیا میں نہلا کر دفن کر دیا جائے گا، جیسے غیر شہیدوں کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، البتہ آخرت میں شہید کا مرتبہ ملے گا، یہ مست محمدیہ پر خصوصی رحمت الہی ہے، کہ بہت سے اسباب موت کو، شہادت اخروی کا درجہ دیا گیا ہے، علامہ شامی نے علامہ سیوطی کے حوالہ سے تیس ایسے افراد کو شمار کیا ہے جو اخروی شہادت کا درجہ پاتے ہیں، علامہ شامی نے مزید اضافہ بھی کیا ہے۔“ (شامی ص ۱۶۷۳)

**حدیث** ﴿ حَدَّثَنِي أَبُو الطَّاهِرِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ إِلَى خَيْبَرَ فَفَتَحَ اللَّهُ عَلَيْنَا فَلَمْ تَغْنَمْ ذَهَبًا وَلَا وَرَقًا غَنِمْنَا الْمَتَاعَ وَالطَّعَامَ وَالْقِيَابَ ثُمَّ انْطَلَقْنَا إِلَى الْوَادِي وَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَبْدٌ لَهُ وَهَبَةٌ رَجُلٌ مِنْ جُدَامٍ يُدْعَى رِفَاعَةَ بْنِ زَيْدٍ مِنْ بَنِي الصُّنَيْبِ فَلَمَّا نَزَلْنَا الْوَادِي قَالَ عَبْدُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَحُلْ رَحْلَهُ فَرَمَى بِسَهْمٍ فِيهِ حَتَفَةٌ فَقُلْنَا خَيْبَتُنَا لَهُ الشَّهَادَةُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَلَّا وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ إِنْ الشَّمْلَةَ لَتَلْتَهَبُ عَلَيْهِ نَارًا أَخَذَهَا مِنَ الْغَنَائِمِ يَوْمَ خَيْبَرَ لَمْ تَصِبْهَا الْقَمَاسِمُ قَالَ فَفَزِعَ النَّاسُ فَجَاءَ رَجُلٌ بِشَرَاكِ أَوْ شَرَاكَيْنِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَصَبْتَ خَيْبَرَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ شَرَاكٌ مِنْ نَارٍ أَوْ شَرَاكَيْنِ مِنْ نَارٍ.

ابو ہریرہ کا بیان ہے، کہ ہم لوگ آنحضور ﷺ کے ہمراہ، خیبر گئے، اللہ تعالیٰ نے فتح و کامرانی نصیب فرمائی،

ترجمہ غنیمت میں سونا چاندی کے بجائے، سامان غلہ اور کپڑے، ہاتھ میں آئے، پھر ہم لوگ وادی کی طرف چلے



اور آنحضور ﷺ کے ساتھ، آپ کا ایک غلام تھا جو قلیلہ جذام کے رفاعہ بن یزید نامی شخص نے آپ کو ہبہ دیا تھا، جب ہم لوگ دہلی میں اترے، تو آنحضور ﷺ کا وہ غلام کجاوہ کھولنے کے لئے کھڑا ہوا، اس کو ایک تیرا کر لگا، اور اسی میں اسکی موت ہو گئی، ہم لوگوں نے کہا، ان کو شہادت مبارک ہو، یا رسول اللہ ﷺ (اس کے جواب میں) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ایسی بات ہرگز نہیں قسم ہے، اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، جو چادر خیر کے دن، اس نے تقسیم سے قبل لے لی تھی، وہ اس پر جہنم کی آگ بھڑکارتی ہے، ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ یہ سکر لوگ گھبرا گئے، اور ایک شخص ایک یادو تسمہ لیکر آیا اور بولا کہ یا رسول اللہ خیر کے دن میں نے لے لیا تھا، اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک تسمہ یادو تسمہ جہنم کے ہیں۔

### تحقیق الفاظ

بنی الضبیب بضم الضاد و بفتح الباء، رحل، اونٹ کا کجاوہ، جس پر لوگ سوار ہوتے ہیں، حنف، جمع ہے اس کی حتوف، طبعی موت، شراک اور شرکا کان من نار، میں انجام پر متنبہ ہے، ممکن ہے، انہیں تسموں سے عذاب دیا جائے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عذاب کا سبب ہوں اسلئے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے، اس غلام کا نام مدغم تھا، جیسا کہ مؤطالام مالک (ص ۱۷۲) میں اس کی تصریح موجود ہے بعض کا خیال ہے کہ مدغم کے علاوہ کوئی اور غلام تھا، بخاری میں اسی طرح کی حدیث میں اس کا نام کرکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ (بخاری ص ۴۳۲/۱)

فوائد :- دونوں حدیثوں سے محدثین نے بہت سی باتوں کا استنباط کیا ہے، (۱) غنیمت میں خیانت کی حرمت (۲) تھوڑے اور زیادہ میں کوئی فرق نہیں (۳) خیانت کی وجہ سے مقتول کو شہید نہیں کہا جائے گا (۴) کافر جنت میں داخل نہیں ہوگا، اس پر جمہور امت کا اجماع ہے (۵) بلا ضرورت قسم کھا سکتے ہیں لقولہ علیہ السلام والذی نفس محمد بیدہ (۶) غنیمت کی جو چیز چرائی جائے اس کا واپس کرنا ضروری ہے، اور واپسی پر اس کو امیر وقت قبول کرے، یہی حکم اس مال کا ہے، جو حرام طریقہ پر حاصل ہو، لیکن اگر مالک معلوم نہ ہو تو اس کا صدقہ کرنا واجب ہے، اور اس میں نیت ثواب نہ ہونی چاہئے بلکہ فراغ عن الذمہ کی نیت ہو (۷) کسی حال میں بھی خائن کا سامان جلایا نہیں جائے گا کیونکہ آنحضور ﷺ نے چادر والے اور تسمہ والے کا سامان جلایا نہیں، اور اگر جلانا ضروری ہوتا، تو آپ ﷺ جلاتے اور صحابہ اس کو ضرور نقل فرماتے، بعض حدیث میں جو آیا ہے، اذا وجدتم الرجل قد غل فاحرقوا متاعه واضربوه اور ایک روایت میں ہے واضربوه عنقه (ابوداؤد ص ۳۷۷) اس کے بارے میں ابن عبد البر وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے لام طحاوی فرماتے ہیں کہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ حدیث منسوخ ہے اور یہ حکم اس زمانے کا ہے جب جرم نامہ مال جائز تھا۔

## باب الدلیل علی ان قاتل نفسہ لا یکفر

خودکشی کرنے والا کافر نہ ہوگا

❦ حدیث ❦ حدثنا ابوبکر بن ابی شیبۃ — عن جابر أن العفیل بن عمرو الذؤبسی أتى النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ هل لك فی حصن حصین ومنقۃ قال حصن کان لدوس فی الجاہلیۃ فانی ذالک النبی ﷺ للذی دَخَرَ اللہُ لِلْأَنْصَارِ فَلَمَّا جَرَّ النبی ﷺ إِلَى

الْمَدِينَةِ هَاجَرَ إِلَيْهِ الطُّفِيلُ بْنُ عَمْرٍو وَهَاجَرَ مَعَهُ رَجُلٌ مِنْ قَوْمِهِ فَأَخْتَفَوْا الْمَدِينَةَ فَمَرَحَ مَجْرَحَ  
فَأَخَذَ مَشَاقِصَ لَهُ فَقَطَعَ بِهَا بَرَاجِمَهُ فَشَخَبَتْ يَدَاهُ حَتَّى مَاتَ فَرَأَاهُ الطُّفِيلُ بْنُ عَمْرٍو فِي مَنَامِهِ  
فَرَأَاهُ وَهَيْئَتُهُ حَسَنَةً وَرَأَاهُ مُغَطِّيًّا يَدَيْهِ فَقَالَ لَهُ مَا صَنَعَ بِكَ رُبُّكَ فَقَالَ غَفَرْتُ لِي بِهَجْرَتِي إِلَيْهِ نَبِيِّهِ  
ﷺ فَقَالَ لَهُ مَا لِي أَرَاكَ مُغَطِّيًّا يَدَيْكَ قَالَ قِيلَ لِي لَنْ تَصْلَحَ مِنْكَ مَا فَسَدَتْ فَقَضَاهَا الطُّفِيلُ عَلَى  
النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اللَّهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ. (مسلم ص ۷۴ سند امام احمد ۲ / ۳۷۱)

**تحقیق الفاظ** حصن حصین کے معنی مضبوط قلعہ، منفعہ، محافظ جماعت میں اور نون دونوں کے فقر کے ساتھ  
اجتہد کیا کی ایک قسم جو آب و ہوا کی ناموافقیت کی وجہ سے پیٹ میں پیدا ہوتی ہے،  
مشاقص، مشق کی جمع ہے اس کا معنی تیر کا پیکان وہ تیر جو لمبا چوڑا ہو۔ براجیم جمع ہے برجمۃ انگلیوں کے جوڑ، شخب  
یعنی سال بعض لوگ چیز کی ساتھ بہہ جانے کا ترجمہ کرتے ہیں،

اس حدیث کا ترجمہ اور تحقیق باب بیان غلط تحریم قتل الانسان نفسہ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔  
اللهم وليدیه فاعفرو: اس سے ایک شرعی ضابطہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کہ جس کسی نے خود کشی کر لی یا معصیت  
کبیرہ کا ارتکاب کر لیا، اور بغیر توبہ اس کی موت آگئی، تو وہ کافر نہیں ہوگا، بلکہ قطعی طور پر اس کا جہنمی ہونا بھی نہیں کہا جاسکتا  
ہے، بلکہ مثبت الٰہی پر اس کا معاملہ موقوف رہے گا، اس حدیث سے مرید اور معتزلہ دونوں کی تردید ہوتی ہے۔ ”م

## باب فی الريح التي تكون قرب القيامة تقبض من في قلبه شيء من الايمان

اس ہو اکیان جو قرب قیامت میں چلے گی اور ہر اُس شخص کو مار دے گی جس کے دل میں کچھ بھی ایمان ہو

❦ حدیث ❦ حدثنا احمد بن عبد الصبی ..... عن ابی ہریرۃ قال قال رسول  
الله ﷺ ان الله عز وجل يبعث ريحا من بين التين التين من الحرير فلا تدع احدا في قلبه قال ابو  
علقمة مثقال حبه وقال عبد العزيز مثقال ذرة من ايمان الا قبضته. (مسلم ص ۷۵)

**ترجمہ** حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ، آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یمن سے ایک  
ایسی ہوا بھیجے گی، جو ریشم سے زیادہ نرم ہوگی، جس کے دل میں دلتہ کے برابر، اور عبد العزیز راوی نے کہا زورہ  
برابر ایمان ہوگا، اس کی روح قبض کر لے گی۔

## ”علامت قیامت“ ہو اکا چلنا کب ہوگا

قرب قیامت میں دجال پوری دنیا میں فتنہ برپا کرتا ہوگا، اور اسکے کمر و فریب میں بہت لوگ آچکے ہونگے اور وہ طرح  
طرح کی شعبہ بازیوں دکھاتا ہوگا، ادھر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو بھیجے گا، وہ دمشق کے مشرقی سفید منارہ پر اترے گئے اور دوزر  
ذعفرانی رنگ کی چادریں، اوڑھے ہوئے دوفرشتوں کے بازوؤں پر، اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ہونگے، سر جھکا کیں گے

توبانی کے قطرے ٹپکتے معلوم ہو گئے، اور جب سر اٹھائیں گے تو بالوں میں سے چاندی کے سے سونے گرتے محسوس ہو گئے، جس کافر کو ان کے سانس لگ جائیں گے وہ زندہ نہ رہ سکے گا، اور ان کے سانس کا اثر اتنے فاصلہ تک پڑے گا، جہاں تک کہ ان کی نظر جائے گی، وہ جال کا بیچھا کریں گے اور باب لد جو بیت المقدس میں ایک مقام ہے اس جگہ اسکو پڑ لیں گے، اور اسی جگہ اس کو قتل کر دیں گے اس کے قتل سے فارغ ہو کر، حضرت عیسیٰ ان لوگوں کے پاس آئیں گے جو اس کے فتنہ سے محفوظ ہو گئے ان کو تسلی دیں گے، اور جنت میں ان کے مراتب کا حال بیان کریں گے، پھر عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آئے گی کہ اب میری ایک ایسی مخلوق نکلتے گی، جس کے مقابلہ کی کسی میں طاقت نہیں، لہذا میرے بندوں کو کوہ طور کی طرف لیجا کر جمع کر دو، پھر راجوہ جہاں ہر پست زمین سے نکل پڑیں گے، پہلے انکا گذر طبریہ کے پانی پر ہو گا، وہ اس کو پی کر اس طرح ختم کر دیں گے، کہ جب ان کا آخری کردہ ادھر سے گزرے گا، تو یوں کہے گا کبھی یہاں پانی تھا، پھر بیت المقدس کے خمرہ پہاڑ پر پہنچیں گے، اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں کہیں گے ہم زمین والوں کو ختم کر چکے، آداب آسمان والوں کا بھی کام تمام کر دیں، اور اپنا تیر آسمان کی طرف بھیکینگے قدرت ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کر دے گی، ادھر حضرت عیسیٰ اور ان کی جماعت کوہ طور میں محصور ہو گی یہاں تک کہ بتل کا ایک سر اتنا جیتی ہو جائے گا جیسا آج تمہارے نزدیک سودینا ہیں، اس تنگی کی حالت میں، عیسیٰ اور ان کی جماعت مل کر، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گی، انکی دعا سے ان کی گردنوں میں پھوڑے نکل آئیں گے، اور وہ سب کے سب ایک دم میں اس طرح پھول پھٹ کر مر جائیں گے، جیسے ایک آدمی مرتا ہے جب عیسیٰ کوہ طور سے اتر کر آئیں گے تو زمین پر کہیں بالشت بھر جگہ نہ ہو گی، جہاں ان کے سڑے ہوئے گوشت کی بدبو اور چربی کا اثر نہ ہو، عیسیٰ اور ان کی جماعت، پھر، اللہ تعالیٰ کے سامنے آہ و زاری کرے گی، اس پر اللہ تعالیٰ ایک قسم کا پرندہ بھیجے گا، جن کی گردنیں بختی لونٹ کی طرح لمبی لمبی ہو گی، وہ ان کو اٹھا اٹھا کر جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا ڈال دیں گے، اور ایک روایت میں یہ ہے کہ مقام نہیل میں بھیں گے، پھر مسلمان ان کے تیر و کمان اور ترکشوں سے سات سال تک آگ جلاتے رہیں گے، اور آسمان سے اس زور کی بارش ہو گی، کہ کوئی بستی نہ رہے گی، اور جنگل میں کوئی خیمہ نہ بچے گا، جس میں بارش نہ ہو، یہاں تک کہ تمام زمین میں پانی کی تالیوں کی طرح پانی ہی پانی ہو گا، پھر زمین کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گا، اپنے پھل اور اپنی سب برکت ظاہر کر دے تو وہ برکت ظاہر ہو گی کہ ایک اتار سے ایک جماعت کا پیٹ بھر جائے گا اور اسکا چھلکا انکے سایہ کے لئے کافی ہو گا، اور اونٹنی کا ایک مرتبہ کے دودھ میں اتنی برکت ہو گی کہ ایک دودھ والی اونٹنی کئی کئی جماعتوں کے لئے کافی ہو گی، اور ایک دودھ کی گائے ایک قبیلہ کو، اور ایک دودھ کی بکری ایک چھوٹے خاندان کو، کافی ہو گی، مخلوق خدا اسی فراغت اور عیش کی حالت میں ہو گی، کہ ایک اچھی ہوا چلے گی، اور اس سے مسلمانوں کی بغلوں میں پھوڑے پھنسی نکل آئیں گے، اور ان سب کو موت آ جائے گی، اور صرف بدترین قسم کے کافر بچ رہیں گے، جو گدہوں کی طرح منظر عام پر نہ آئیں گے، ان ہی پر قیامت ہو گی، یہ روایت مسلم شریف (۲/۴۰۲) کی ہے جو اپنے موقع پر آئیگی البتہ جو حصہ مقام نہیل کے بعد سے سات سال تک تیر و کمان چلانے کا ہے، وہ امام ترمذی کی روایت کردہ ہے، (ص ۴۹/۲) ترجمہ الباب کی ذیل کی روایت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

بعض روایت میں لا تقوم الساعة حتی لا یقال فی الارض اللہ اللہ، اور بعض میں لا تقوم علی احد یقول

اللہ اور بعض لا تقوم الا علی شرار الخلق، کے الفاظ ہیں جو قریب قریب ہم معنی ہیں البتہ جس حدیث میں لا تزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق الی یوم القيامة لا یضرهم من خذلهم حتی یاتی امر اللہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام قیامت تک مومن زندہ رہیں گے اس روایت کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جماعت حق یعنی ہوا چلنے تک غالب رہے گی یعنی الی یوم القيامة سے مراد علامات قیامت، اور قرب قیامت ہے، قولہ علیہ السلام ریحالین من الحریر میں اشارہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور اکرام کا معاملہ ہو گا۔ بعض روایت میں ریحاً من قبل الشام ہے۔ (ترمذی ص ۲۷۲) اس سے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حدیث باب میں یعنی ہوا کا ذکر ہے جب کہ اس حدیث میں شامی ہوا کا ذکر ہے، تو پھر اس تضاد کا کیا جواب؟ اس کا دو طرح سے جواب دیا جاتا ہے، (۱) ہو سکتا ہے کہ شامی اور یعنی دونوں ہوا چلے (۲) ممکن ہے کہ اس کی ابتدا شام یا یمن میں سے کسی ایک جگہ سے ہو، پھر دوسری جگہ سے چلے گی، اور پھر دونوں ہوائیں بھیل جائیں گی، اس روایت کو لایا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اس سے پہلے عمل خیر کر لینا چاہیے، اور موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، واللہ اعلم بالصواب

## باب الحث علی المبادرة بالاعمال قبل تظاهر الفتن

فتن پھیلنے سے پہلے نیک اعمال کو جلد بجالانے کی ترغیب کا بیان

حدثنی یحییٰ بن ائیوب وقتیبہ و زبائن حجد جَمِیعاً..... عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ

ﷺ قَالَ بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ فَإِنَّا كَقَطْعِ اللَّيْلِ النَّظْمُ يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُفْصِي كَافِرًا أَوْ مُنْصِي

مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا يَبْغِعُ دَيْنَهُ بِعَرْضٍ مِنَ الدَّنِيْلِ (مسلم ص ۷۵ ترمذی ج ۲۲۲ احمد ج ۲۰۶)

ترجمہ سے قبل، نیک کام کر لو، ایک ایسا وقت آئے گا کہ انسان بوقت صبح مومن ہو گا، اور شام کے وقت کافر ہو جائے گا یا شام کو مسلمان ہو گا تو صبح کو کافر بن جائے گا، اپنا دین دنیا کی سامان کے بدلے بچا ڈالے گا۔

مقصد :- اس تغیر پذیر دنیا کو، کسی ایک رخ اور سمت پر قرار نہیں، لہذا جب تک حالات سازگار ہیں جو بھی موقع ملے اس میں اچھے اور نیک علم کرنے میں، جلدی کرنی چاہئے، کیونکہ یہ کوئی نرس جانتا کہ آنے والا وقت کیا فتنے لیکر آئے گا، اور پھر اعمال صالحہ کرنے کا موقع بھی مل سکے گا یا نہیں؟

شرح حدیث حدیث باب میں فتنوں کو اندھیری رات کے ٹکڑوں سے تعبیر کیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا، کہ وہ کب، اور کہاں اور کیوں نمودار ہو سکے، اور ان سے چھٹکارے کی کیا راہ ہوگی، لہذا پہلے ہی اعمال صالحہ کے ذریعہ، اپنی دینی زندگی کو مستحکم بناؤ، ورنہ کہیں ان فتنوں میں، اس طرح گم ہو کر نہ رہ جاؤ، کہ نیک عمل کا موقع مل نہ سکے، کیونکہ وہ فتنے، اس قدر سریع الاثر ہوں گے۔ اور اس سے ایسا انقلاب رونما ہو گا، کہ ایک حال پر باقی رہنا مشکل ہو گا۔ چنانچہ کہا گیا یصبح الرجل مؤمنًا یفصی کافرًا الخ کہ شام ہوتے ہی کفر کے اندھیروں میں پہنچ جائے گا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ کفر سے مراد کیا ہے؟ (۱) ممکن ہے واقعہ وہ شخص کافر ہو جائے گا یا پھر کفر ان نعمت میں

مشغول ہو جائے گا، (۳) یا کافر ہو نیکاً مطلب یہ ہے کہ کافروں جیسی مشابہت اختیار کر لے گا (۴) یا یہ کہا جائے گا کہ اس فتنہ سے متاثر ہونے کے بعد، وہی کام کرنے لگے گا جو کافر ہی کیا کرتے ہیں، (۵) بعض حضرات نے کہا ہے کہ بوقت صبح حرام اشیاء کو حرام جانتا ہوگا، لیکن اس قدر جلدی تبدیلی پیدا ہوگی کہ شام ہوتے ہوتے حرام کو حلال سمجھنے لگے گا۔

شرعین نے اس پہلو پر بھی گفتگو کی ہے کہ ان حالات کے اسباب کیا ہونگے؟ مسلمانوں کا آپس میں ہٹ جانا، دست و گریباں ہونا اور محض عصبیت اور عناد کی بنا پر، ایک دوسرے کے خون کو حلال سمجھنا، دوسرے یہ کہ حاکم و امراء ظلم و ستم کو شیوہ بنالیں گے، شراب، زنا کاری، غضب اور حرام کاموں کے مرتکب ہونے کے باوجود، امراء کو برحق بلکہ علماء سوء ان کو سبب جواز دیں گے، تیسری وجہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں میں عام جہالت کی بنا پر عبادات و معاملات میں شریعت کی خلاف ورزی کو حلال جاننے لگیں گے۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لکھا ہے کہ مذکورہ صورت حال اسلئے پیدا ہوگی، کہ اپنے دنیوی اغراض کی خاطر، لوگ، امراء، حکام اور اہل دولت و ثروت سے، تعلق اور ان کی حاشیہ نشینی کو باعث اعزاز سمجھیں گے، اور شرعی امور میں ان کی غلط تائید کریں گے، غرض جب اس طرح کے حالات ہوں گے تو دین خطرہ میں پڑ جائے گا۔ ”م

## باب مخافة المومن ان يحبط عمله

مومن کو اپنے اعمال مٹ جانے سے ڈرنے کا بیان

❦ حدیث ❦ حدثنا ابوبکر بن ابی شیبہ ..... عن انس بن مالک انه قال لما نزلت هذه الآية يا ايها الذين آمنوا لا ترفعوا اصواتكم الى آخر الآية جلس ثابت في بيتي وقال انا من اهل النار واحتبس عن النبي ﷺ فسأل النبي ﷺ سعد بن معاذ فقال يا ابا عمرو ما شان ثابت اشتكى قال سعد انة لجاري وما علمت له بشكوى قال فانا سعد فذكر له قول رسول الله فقال ثابت انزلت هذه الآية ولقد علمتم اني من ارفعكم صوتاً على رسول الله ﷺ فانا من اهل النار فذكر ذلك سعد للنبي ﷺ فقال النبي ﷺ بل هو من اهل الجنة .

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، اے ایمان والو اپنی آواز بلند مت کرو، اپنی آواز بلند مت کرو (آخر آیت تک) تو حضرت ثابتؓ اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور آپؐ کی خدمت میں آنا جانا بند کر دیا، آپؐ نے سعد بن معاذؓ سے دریافت کیا، کہ اے ابو عمر (کنیت سعد کی) ثابت کیسے ہیں؟ کیا بیمار ہو گئے ہیں؟ تو حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ وہ تو میرے پڑوسی ہیں اور مجھے ان کی بیماری کا کوئی علم نہیں راوی کہتے ہیں کہ سعد ان کے پاس آئے، اور آنحضرت ﷺ کے دریافت کرنے کا معاملہ ان سے بیان کیا تو حضرت ثابتؓ بولے، کہ اونچی آواز سے بولنے کی ممانعت نازل ہو چکی ہے، ابوہم تم لوگ جانتے ہو کہ آنحضرت ﷺ کے دربار میں، تم سب میں، میری ہی آواز بلند ہو جاتی ہے، تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں میں روزِ نہ ہو جاؤں، سعدؓ نے اگر یہ بات آنحضرت ﷺ سے ذکر کی، آپؐ نے فرمایا کہ وہ روزِ نہ نہیں، بلکہ جنتی شخص ہے۔

مقصود: مومن کی شان یہ ہے، کہ وہ ہر وقت ڈرتا رہے، کہ کہیں اسکے عملِ اکارت نہ کر دیئے جائیں اور اس کو پتہ

بھی نہ چلے، اس لئے معصیت پر جری ہونا مومن کی شان نہیں، بلکہ ہمیشہ اس کی نظر خاتمہ پر ہونا چاہئے، اور ہرگز موجودہ حالت پر مطمئن نہ ہونا چاہئے، کیونکہ کفر کبھی درمیانی عمر میں بھی آجاتا ہے، اور کبھی موت کے وقت (عیاذ باللہ) یہ کفر نکوئی ہوتا ہے، مقصد یہ ہے کہ کبھی انسان معصیت کا ارتکاب کرتا ہے، اگرچہ اس معصیت کی وجہ سے، موجودہ حالت میں، اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، مگر یہ معصیت منجانب اللہ نکوئی طور پر سلب ایمان کا سبب بن جاتی ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس روایت کا مقصد مرجیہ کی تردید ہو جو معصیت کو ایمان میں مضمر نہیں مانتے۔

### کیا گناہ محیط اعمال ہیں؟

یہاں ایک اشکال ہو سکتا ہے کہ کفر کا محیط اعمال ہونا تو درست ہے، مگر سید کا محیط اعمال ہونا، اہل سنت والجماعت کا مسلک نہیں، بلکہ معتزلہ کا مسلک ہے، حالانکہ قرآن میں تصریح ہے، کہ معصیت محیط اعمال ہے، اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے، بہت عمدہ توجیہ پیش کی ہے، کہ بعض گناہوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے، کہ اس کے کرنے والے سے توبہ، اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہک ہو کر، انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے، جو سبب ہے محیط اعمال کا، اس طرح یہ افعال یعنی تقدم علی النبی ﷺ، اور رفع صوت ایسی معصیت ٹھہریں، کہ جن سے خطرہ ہے، کہ توفیق سلب ہو جائے، اور یہ جرم آخر، کفر تک پہنچا دے، جس سے تمام اعمال صالحہ ضائع ہو جائیں، اور کرنے والے نے چونکہ قصد، ایذا، لو کا نہ کیا تھا اس لئے اس کو خیر بھی نہ ہوگی کہ اس ابتلاء کفر اور محیط اعمال کا اصل سبب کیا تھا۔ (۱)

(۲) دوسرا جواب امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ نبی کو عداۃ ایذا ہو نہ چاہئے، اور محیط اعمال، گویا ایذا سبب ہے، محیط اعمال کا اسی لئے رفع صوت اور قول بالجبر کو، مطلقاً ممنوع قرار دیا، کیونکہ بعض مرتبہ رفع صوت سے ایذا ہو جاتی ہے، اور بعض مرتبہ نہیں لیکن اس کا معیار کیا ہے، کسی کو معلوم نہیں، اس لئے مطلقاً ممانعت فرمائی گئی، غرض سداً للذریعة مطلقاً ممنوع ہے، (۳)۔ مرجیہ کے دلائل میں ایک قوی دلیل یہ ہے کہ، جس طرح کفر جنت میں نہیں جائے گا، اسی طرح ایمان جہنم میں نہیں جائے گا، یعنی جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے کوئی حسن مقبول نہیں، اسی طرح ایمان کے ہوتے ہوئے، کوئی سیدہ بھی مضر نہیں، اور صرف لا الہ الا اللہ جنت میں پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ جواب اس کا یہ ہے، کہ فرض کرو ایک شخص سنگھیا کھالے تو اس کا اثر پورے بدن میں فوراً ہو جاتا ہے، اسی طرح سانپ کاٹ لے، تو سارا بدن سیاہ ہو جاتا ہے، مگر ہر زہر یکساں نہیں، اگر بھیڑ کاٹ لے، تو تمام بدن اس سے متاثر نہ ہوگا، اس کے برعکس اگر کوئی خمیرہ گاؤ زبان کھالے، تو تمام اعضاء کو تقویت ہوگی، تو کفر کی مثال بھی سنگھیا کی ہے، جہاں ذرا سا بھی کھایا تو ایسا ہو گیا، جیسے سانپ نے کاٹ لیا، اور حیات جاتی رہی، اس کے برعکس ایمان کفر کے مقابلہ میں، بمنزلہ حیات کے ہے، اور حیات میں کمزوری و ضعف کے باوجود، حیات باقی رہتی ہے، تو جس طرح مرض و ضعف زندگی کے منافی نہیں، اسی طرح معصیت، ایمان کے منافی نہیں، مرجیہ کا یہ جملہ کہ ایمان دوزخ میں نہ جائے گا، اور کفر جنت میں نہیں جائے گا، بڑا موثر ہے۔

وہ کہتے ہیں ایک شخص مثلاً زانی ہے، تو دوزخ میں اس کا ایمان کیسے جائیگا؟ محدثین و مفسرین کے یہاں اس کا کوئی حل نظر

سے نہیں گذرا، وہاں اربابِ حق نے لکھا ہے کہ جب ایسے مجرم کو دوزخ میں لے جائیں گے، تو اس کے حسنت اور اس کا ایمان، دروازہ جہنم پر اتار کر رکھ دیا جائے گا، جیسا کہ یہاں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے، اور مرجیہ کا یہ کہنا کوئی سید جنت میں نہ جائے گا تو جنت میں جب موحّد جائے گا، تو تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو کر جیسے سونا سونے کو کندن بناتا ہے حدیث میں آتا ہے کہ مومن جب جہنم سے نکالا جائے گا، تو پہلے نہر حیات میں ڈالا جائے گا، پھر وہاں "فَتَنْبِتُونَ كَمَا تَنْبِت الْحَبَّةُ فِي جَانِبِ السَّيْلِ" معلوم ہوا کہ جنت میں داخلہ کے وقت کوئی سید باقی نہ رہے گا، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مکی رائے یہ ہے کہ مومن کے عذاب کا تعلق صرف جسم کے ساتھ ہو گا قلب چونکہ محل ایمان ہے، اس لئے وہ محفوظ رہے گا، اور نار اللہ الموقدة التي تطلع على الافئدة (قرآن شریف پارہ ۳۰۰) یہ صرف کفار کے لئے ہے، مومن کو عذاب صرف جسم پر ہو گا، الملل والنحل لابن حزم میں مرجیہ کا ایک فرقہ ایسا بھی بتایا گیا ہے، جو اس کا قائل تھا کہ اگر دل میں ایمان باقی رہے، تو زبان سے کلمہ کفر تک دینے سے بھی ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

### سبیل النبی ﷺ سعد بن معاذ

"شارحین نے یہاں ایک الجھن یہ پیش کی ہے، کہ اس آیت کا نزول ۹ھ میں ہوا، جب کہ سعد بن معاذ کی وفات ۵ھ میں ہو چکی تھی، تو پھر سعد بن معاذ سے دریافت کرنا کیونکر ممکن ہو گا؟

اس اشکال کا ایک جواب یہ ہے کہ اس آیت کا ایک جزء لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ یقیناً ۹ھ میں نازل ہوئی، لیکن رفع صوت سے متعلق آیت ۵ھ سے قبل اتری تھی، اس لئے کوئی تضاد باقی نہ رہا دوسرا جواب ابن المنذر نے اس آیت کی تفسیر میں یہ پیش کیا ہے کہ بعض روایات میں سعد بن معاذ کے بجائے سعد بن عبادہ ہے، جس ۹ھ میں بقیہ حیات تھے لہذا نام میں قدرے ترمیم ہو گئی ہے، اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ حضرت سعد بن معاذ ان کے قبیلہ کے نہیں، بلکہ سعد ابن عبادہ ان کے قبیلہ کے ہیں، اس بنا پر ان کو اپنا پڑوسی کہنا اس بات کی علامت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ ہی ہیں لہذا کوئی اشکال نہیں، "م

### "نزول آیت کا مقصد"

سورہ حجرات کی ابتدائی آیتیں بارگاہ نبوت کا ادب سکھانے کے لئے اتری ہیں، عرب اپنی سادہ فطرت سے، ان دقیق آداب سے، اب تک نا آشنا تھے، جس کو نبوت کا نازک مقام مقتضی تھا، اسلام نے اگر جہاں ان کو رفتہ رفتہ، بھائی بھائی ماں باپ، اور تمام باہم رشتوں کے آداب بتائے، اسکے ساتھ ہی، اب وقت آگیا تھا، کہ انہیں خدا اور رسول کے وہ آداب بھی بتادئے جائیں، جن سے غفلت اختیار کرنا، کئے کرائے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے، ان میں سے ایک ادب یہ تھا کہ رسول کے سامنے، اس طرح زور زور سے بے باکانہ گفتگو نہ کی جائے، جیسے باہم ایک دوسرے کے سامنے کی جاتی ہے، اور نہ اس طرح ان کو پکارا جائے، جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں، یہ طور و طریق احترام نبوت کے منافی ہے، اور احترام نبوت کا نہ کرنا خطرہ ہے، کہ اس کا عمل اکارت نہ ہو جائے، ثابت بن قیسؒ نے یہ تاہلند آواز تھے، یہ سن کر ڈر گئے، اور سمجھے کہ بارگاہ نبوت میں یہ گستاخی مجھ سے بارہا سرزد ہو چکی ہے، اس لئے میرا اب کہاں ٹھکانا ہو گا؟ رحمۃ للعالمین کو جب یہ خبر ملی تو ان کی ادھر آپ کا دل بھر آیا آپ نے اس ادب کی وجہ سے، جن سے ان کا قلب معمور تھا، ان کو جنت کی بشارت دی اور ان کی اس بلند

آوازی کو، جو قدرۃً محض قابلِ غلو سمجھا، معلوم ہوا کہ ادب کا اصل مدار قلب پر ہے، پھر ظاہر میں اس کیلئے کچھ علامات بھی مقرر ہیں، اگر قلب کی گہرائیوں میں ادب موجود ہے، تو ظاہر کو فرو گذاشت سے اغماض کیا جاسکتا ہے آنحضور ﷺ کے بعد اب آپ ﷺ کا کلام یعنی، حدیث شریف کو سن کر اس کا معارضہ و مقابلہ کرنا، اس کا مذاق اڑانا، تن آسانی اور ہوا پرستی کے لئے، تاویلات کرنا یہ سب آپ کی ہی گستاخی کے برابر ہے، دنیا اگر کسی شاعر کا احترام کرتی ہے، تو اس کے کلام کو بھی ہنظر احترام دیکھتی ہے۔ پھر انصاف کرو کہ کیا رسول اللہ ﷺ کا مرتبہ ایک شاعر سے بھی کم ہے، اللہ تعالیٰ ہم سمجھوں کو اپنے اور اپنے رسول کے احترام کا ادب سکھائے، آمین۔

اس روایت میں حضرت ثابت کی بڑی منقبت کا تذکرہ ہے، نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑے لوگوں کو چاہئے کہ اپنے چھوٹوں کو یاد رکھیں اگر وہ غائب ہو جائیں، تو ان کے حالات دریافت کئے جائیں، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاگرد استاد کے سامنے اور مرید شیخ کے سامنے بے تحاشائے ادب آواز بلند نہ کرے، البتہ علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ بوقت ضرورت شرعی جبر صورت ممنوع نہیں، بلکہ مطلوب ہے، مثلاً دشمنوں کو میدانِ جہاد میں لاکارنا، مجاہدین کو آواز بلند بلانا وغیرہ۔ حدیث باب کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضور ﷺ کی بشارت کے بعد صحابہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے درمیان ایک جنتی آدمی چل پھر رہا ہے، ایک روایت میں ان کے حق میں یہ الفاظ منقول ہیں۔ أما ترضی ان تعیش سعیداً وتقتل شهیداً وتدخل الجنة ، (فتح الملمہ ص ۲۷۱)

## باب هل یؤاخذ بالعمال الجاہلیۃ

(مسلمان ہونے کے بعد) کیا جاہلیت (کفر) کے وقت کے اعمال پر مواخذہ ہوگا؟

حدیث ﴿ حدَّثَنَا عُمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ ..... عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالِ انَّا سَمِعْنَا

لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُؤَاخَذَ بِمَا عَمِلْنَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ قُلُ أَمَّا مَنْ أَحْسَنَ مِنْكُمْ فِي الْإِسْلَامِ فَلَا يُؤَاخَذُ بِهَا وَمَنْ أَسْلَمَ أَخَذَ بِمَقْلِهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَالْإِسْلَامِ. (۱)

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے، آنحضور ﷺ سے دریافت کیا، ہم سے ان افعال کی ترجمہ بھی باز پرس ہوگی، جو ہم نے اپنے کفر کے زمانہ میں کئے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا جس نے اسلام میں اچھے کام کئے اس سے تو کچھ باز پرس نہ ہوگی لیکن جس نے اپنے اسلام میں، بد نمائی پیدا کی، اور برے کام کئے اس سے کفر و اسلام دونوں زمانوں کے افعال کی باز پرس کی جائے گی۔

کیا بعد الاسلام زمانہ کفر کے گناہوں کا مواخذہ ہوگا؟

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صورت میں زمانہ کفر میں کئے ہوئے گناہوں پر مواخذہ ہوگا، جبکہ اہل سنت والجماعت کے یہاں، اسلام زمانہ جاہلیت کے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، الاسلام یهدم مملکتان قبلۃ، دونوں روایتوں میں بظاہر تعارض ہے، اس تعارض کو دور کرنے کے لئے اہل سنت کی طرف سے چار جوابات دیئے گئے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے گناہ



پر مواخذہ کا مطلب، زجر و توبیح ہے، یعنی مسلمان ہو کر جو گناہ کیا ہے، اس پر تو سزا کا مستحق ہے ہی، جاہلیت کے گناہ پر بھی عار دلایا جائے گا، جیسا کہ ان المعیت لیعذب ببکلمہ اہلہ، کا ایک مطلب یہ بھی بتایا جاتا ہے، کہ گھر والے کے رونے پر میت کو عار دلایا جائے گا، (۲) احسان فی الاسلام کا مطلب یہ ہے، کہ دل سے مانے زبان سے اقرار کرے، اس کے تقاضہ پر عمل کرے، اور خاتمہ بھی اسلام پر ہو جائے، اور اسلۃ فی الاسلام کا، مطلب یہ ہے، کہ مسلمان تو ہو گیا، مگر اس کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتا، غور یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ مسلمان ہونے کے بعد پھر مرتد ہو جائے، تو ایسی صورت میں زمانہ اسلام اور کفر کے سارے گناہوں پر، مواخذہ ہوگا۔ غرض اسلۃ فی الاسلام سے مراد ارتداد ہے، (۳) احسان فی الاسلام کا مطلب، دل و زبان سے مسلمان ہونا اور اسلۃ فی الاسلام کا مطلب، زبان سے اسلام کا اقرار اور دل میں کفر چھپانا، جس کو نفاق کہا جاتا ہے، تو اس قسم کا اسلام دنیا میں اسلام کہلائے گا، مگر آخرت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، اس لئے اس سے سارے گناہوں کا مواخذہ ہوگا، علامہ نوویؒ نے اس کو جمہور کا پسندیدہ قول قرار دیا ہے، (۴) مسلمان ہونے کے بعد زمانہ کفر کے گناہوں کو نہ چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کفر سے توبہ کی مگر زمانہ کفر کے گناہوں سے تائب نہیں ہوا، اس لئے اسلام کو قبول کر لیا جائے گا، البتہ گناہوں پر مواخذہ ہوگا۔

(۵) حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے تھے، کہ اسلام دنیا میں تہذیب اخلاق بڑھانے برائیاں مٹانے، اور بھلائیاں پھیلانے کیلئے آیا ہے، وہ روز اول ہی سے مسلمانوں سے تقاضا کرتا ہے، کہ وہ اپنے عمل سے اس دعویٰ کا ثبوت پیش کرنے لگے، جو لوگ اس تقاضہ کو پورا کرتے ہیں ان کا اسلام، یہدم ملکین قبلہ کا مصداق ہے، ورنہ اس کا اسلام اس کا مصداق نہ ہوگا۔ ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں توبہ کی بحث میں نقل کیا ہے، اور وہ محققین کا قول ہے۔ (۱) کہ اگر اسلام کے ساتھ گذشتہ گناہوں پر، توبہ بھی کیا جائے، تو ایسا اسلام تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، اور اگر ان معاصی سے توبہ نہ کرے، اور اسلام کے بعد اسی طرح گناہ کرتا رہے، تو اس سے تمام گناہوں کا مواخذہ ہوگا، بعض حنابلہ آیت مبارکہ قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفرلھم ما قد سلف۔ پ ۹ ع ۱۸ آیت ۸۳ کی بھی تاویل نقل کرتے ہیں، کہ ما قد سلف سے وہ گناہ مراد ہیں، جس سے وہ باز آجائے۔ (شرح فقہ اکبر ص ۱۹۳)

## باب کون الاسلام یہدم ما قبلہ وکذا الحج والہجرة

❦ حدیث ❦ حدثنا محمد بن المثنی الثعنی عن ابن شماسۃ التھری قال: حَضَرْنَا عَمْرَوْنَ الْقَاصِ وَهُوَ فِي سَبَاقَةِ الْمَوْتِ يَبْكِي طَوِيلًا، وَحَوَّلَ وَجْهَهُ إِلَى الْجَذَارِ فَجَعَلَ ابْنُهُ يَقُولُ يَا أَبَتَاكَ: أَمَا بُشِّرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِكَذَا، أَمَا بُشِّرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِكَذَا، قَالَ: فَأَقْبَلَ بَوَّجَهُ وَقَالَ إِنَّ أَفْضَلَ مَا نَعِدُ شَهَادَةً أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ إِنْ كُنْتُ عَلَى أَطْبَاقِ ثَلَاثٍ لَقَدْ رَأَيْتَنِي وَمَا أَحَدٌ أَشَدَّ بُغْضًا لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنِّي، وَلَا أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ أَكُونُ قَدْ اسْتَمْتَكَنْتَ مِنْهُ فَقَتَلْتَهُ فَلَوْ مَثَ عَلَى بَيْتِكَ الْخَالِ لَكُنْتُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَلَمَّا جَعَلَ اللَّهُ الْإِسْلَامَ فِي قُلُوبِ آتِيَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَقُلْتُ أَنَبَسْتُ بَيْتِيكَ فَلَا بَاطِيَتِكَ فَبَسَطْتُ يَمِينَهُ قَالَ فَقَبَضْتُ يَدِي، قَالَ مَالِكُ

يَا عَمْرُو قَالَ قُلْتُ ارْتَدُّ أَنْ اشْتَرَطَ قُلْتُ تَشْتَرِكُ بِمَاذَا؟ قُلْتُ أَنْ يَغْفِرَ لِي قُلْتُ أَمَا عَلِمْتَ يَا عَمْرُو أَنْ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَلَكَانَ قَبْلَهُ وَإِنَّ الْهَجْرَةَ تَهْدِمُ مَلَكَانَ قَبْلَهَا، وَإِنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَلَكَانَ قَبْلَهُ وَمَلَكَانَ أَحَدَاكُم إِلَى مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَلَا أَجَلَ فِي عَيْنِي مِنْهُ ، وَمَا كُنْتُ أَطِيقُ أَنْ أَمْلَأَ عَيْنِي مِنْهُ إِجْلَالًا لَهُ وَلَوْ سَمِعْتُ أَنْ لَصِفَهُ مَا أَطْلَقْتُ لِأَنِّي لَمْ أَكُنْ أَمْلَأُ عَيْنِي مِنْهُ وَ لَوْ مَكَ عَلَى تِلْكَ الْحَالِ لَوَجُوتُ أَنْ أَكُونُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ وَلَيْنَا أَشْيَاءُ ثَلَاثَةٌ مَحَالِي فِيهَا ، فَإِذَا انْأَمْتُ فَلَا تَصْحَبَنِي نَائِمَةٌ وَلَا نَارٌ فَإِذَا دَفَنْتُنِي فَشْنُو عَلَى التُّرَابِ شَنْأَكُمْ أَقْبِمُوا حَوْلَ قَبْرِي قَدْزَ مَا تَنْخَرُجُورُ وَيَقْسَمُ لَحْهَاحْتِي أَسْتَأْنِسَ بِكُمْ وَأَنْظُرَ مَاذَا أُرَاجِعُ بِهِ رَسُولَ رَبِّي . (مسلم ص ۷۶)

**ترجمہ** ابن شامہ مہری سے روایت ہے، کہ ہم عمرو بن عاص کے پاس، لگے دم واپس کے وقت حاضر تھے، وہ زار و قطار رو رہے تھے اور دیوار کی طرف اپنا رخ کئے ہوئے تھے، ان کے صاحبزادے ان کو سمجھانے لگے، اے والد ماجد آنحضرت ﷺ نے آپکو تو بڑی بڑی بشارتیں دی ہیں، یہ سن کر انہوں نے دیوار کی طرف سے، اپنا رخ پھیر لاور فرمایا کہ سب سے افضل چیز جو ہم آخرت کے لئے تیار کی ہے، وہ ہے توحید و رسالت..... میری زندگی کے تین دور گزرے ہیں، ایک دور تو وہ تھا، جبکہ آپ سے بغض رکھنے والا مجھ سے زیادہ کوئی اور شخص نہ تھا، اور اس وقت میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح آپ پر میرا قابو چل جائے تو میں آپ کو مہر ڈالوں، یہ تو میری زندگی کا سب سے بدتر دور تھا، مگر (خدا انخواست) اسی حال پر مر جاتا، تو یقیناً روزِ قیامت اس کے بعد جب اللہ نے میرے دل میں، اسلام کی حقانیت ڈالی تو میں آپ کے پاس آیا، اور میں نے کہا دست مبارک بڑھائیے، میں آپ سے بیعت ہوتا ہوں، آپ نے ہاتھ بڑھایا، میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آپ نے فرمایا اے عمر یہ کیا؟ میں نے عرض کیا کچھ شرط لگانا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا کیا شرط لگاتا چاہے؟ ہو؟ میں نے کہا کہ میرے سب گناہوں کی مغفرت ہو جائے،..... اے عمرو تمہیں خبر نہیں کہ اسلام زمانہ کفر کے تمام گناہوں کو پاک کر دیتا ہے، اور ہجرت بھی پہلے کے تمام گناہ ساقط کر دیتی ہے، اور حج بھی پہلے کے تمام گناہ ختم کر دیتا ہے، یہ دور وہ تھا، جب کہ آپ سے زیادہ پیارا آپ سے زیادہ بزرگ و برتر، میری نظروں میں کوئی اور نہ تھا، آپ کی عظمت کی وجہ سے میری یہ تاب نہ تھی، کہ کبھی آپکو نظر بھر دیکھ سکوں، اگر مجھ سے آپ کی صورت پوچھی جائے، تو میں کچھ نہیں بتا سکتا، کیونکہ میں نے کبھی پوری طرح دیکھا ہی نہیں، کاش اگر میں اس حال میں مر جاتا تو امید ہے کہ جنتی ہوتا، اس کے بعد ہم کچھ چیزوں کے متولی ہو گئے اور نہیں کہہ سکتے کہ اس میں ہمارا کیا حال رہا..... اچھا دیکھو، جب میری وفات ہو جائے تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت نہ جائے، اور نہ زمانہ جاہلیت کی طرح میرے ساتھ آگ ہو، اور جب مجھے دفن کر چکو، تو میری قبر میں اچھی طرح مٹی ڈال دینا اور جب فارغ ہو جاؤ تو میری قبر کے پاس اتنی دیر ٹھہرنا، کہ جتنی دیر میں لونٹ نحر کر کے، اس کا گوشت تقسیم ہو سکتا ہو تاکہ تمہاری وجہ سے مجھے انیسیت رہے، اور یہ میں معلوم کر لوں کہ اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے فرشتوں کے سوالات کے جوابات، کیا دیتا ہوں؟

### حضرت عمرو بن العاص کا تعارف

حضرت عمرو بن العاص، عرب کے ذی دلائے، باہوش، اور نفع دینے شخص مانے جاتے تھے، دس سال اور تین ماہ مصر

کے حاکم رہے، چار سال خلافت فاروقی میں، اور چار سال عہد عثمانی میں، اور دو سال تین ماہ، حضرت معاویہ کے دور میں،..... وفات کے وقت اپنے مال کو دیکھ کر فرمانے لگے، کاش تو میٹھی ہوتا، کاش، غزوہ ذات السلاسل میں میری موت ہو جاتی، مجھ سے کچھ کام صادر ہوئے، جن کی بابت میں نہیں جاسکتا، کہ اپنے رب کو کیا جواب دوں گا؟ میں نے اپنی آخرت کو خراب کر کے معاویہ کے لئے دنیا بنائی، پھر اس کے بعد اپنے صاحبزادے سے فرمایا کہ ایک رسی کے ذریعہ میرے ہاتھ میری گردن کی طرف باندھ دو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، پھر انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر یہ دعا کی، اے اللہ تو نے مجھے حکم دیا اور میں نے حکم عدولی کی، اور آپ نے بعض کام سے منع کیا اور میں نے تجاوز کیا، میں کمزور ہوں میری مدد فرما، میں گنہگار ہوں، مجھے معاف فرما ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ صدق دل سے تیری وحدانیت اور محمد ﷺ کی عہدیت اور رسالت کا قائل ہوں، پھر شکر اور تادم انسان کی طرح، اپنی انگلی منہ میں رکھی، اور اسی حالت میں ان کی موت آگئی بہر حال ان کی روایت سے معلوم ہوا کہ مردہ کو دفن کرنے کے بعد قبر کے پاس اتنی دیر ٹھہرنا مستحب ہے، جسکا تخمینہ مقدار حدیث میں مذکور ہے۔

**مقصد حدیث** جو دین تمام ادیان کو، ایک دین، اور سب ملتوں کو، ایک ملت بنانے آیا تھا، اس کے لئے ضروری تھا، کہ تمام اہل مل کی سب سے زیادہ مشترک، خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے، ظاہر ہے کہ، مذہب کی تلاش صرف اس لئے ہے، کہ بندہ کو خالق کے قہر سے نجات حاصل ہو جائے، اور فطرۃً ہی ایک گنہگار کی، سب سے بڑی خواہش ہونی چاہئے، اس لئے اسلام اس کا اعلان کرتا ہے، کہ ہر ملک و ملت، ہر نسل و رنگ کا جو گنہگار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا، وہ اسکے گناہوں کی مغفرت اور ابدی نجات کا ضامن ہو گا۔

### اعمال کی ضرورت کیوں؟

کفر ایک روحانی موت ہے، اور اسلام اس کے بعد حیات نو، لیکن ایک تندرست جس طرح بیمار ہو سکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہو سکتے ہیں، اس لئے اس کو، اپنے اعمال کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے، جو اسکے اس جدید زندگی کے فرو گذاشتوں کا، کفارہ بن جائیں، حدیث مذکورہ میں اس کے لئے دو عمل بتائے گئے، ہجرت، حج، یہ دونوں افعال اگر اپنے پورے شرائط کے ساتھ ادا کئے جائیں، تو یہ حقوق اللہ کے لئے کفارہ بن جاتے ہیں، اور خاص حج کے متعلق یہ بھی امید ہے کہ وہ حقوق العباد کا بھی کفارہ بن جائے، اللہ قادر ہے کہ صاحب حق کو اپنے خزانہ غیب سے، ان کے حقوق کا عوض دیکر، ان سے رہائی دلا دے، اور اسے معاف کر دے۔

غرض مشہور ہجرت تو ختم ہو چکی، حج روز ادا نہیں ہو سکتا، اس لئے کمزور فطرت انسان کو، قدم قدم پر ایسے اعمال کی ضرورت ہے جو اس کی کوتاہیوں کے لئے کفارہ بنے رہیں، اس لئے اسلام میں اور بھی بہت سے اعمال، ہیں جو کفارہ بننے ہیں، لیکن وہ اعمال کفارہ کے باب میں فردی حیثیت رکھتے ہیں۔

### ہجرت و حج سے کس قسم کے گناہ معاف ہونگے

قبولیت اسلام پر مغفرت کا تعلق، گناہوں کے ساتھ ہے، ان حقوق کے ساتھ نہیں، جو قرض، عاریت، امانت، خرید و فروخت کے سلسلہ میں، ابھی اس کے ذمہ باقی ہیں، اسلام ان سے سبکدوش نہیں کرتا، بلکہ اسکی ذمہ داری کو اور بڑھا دیتا ہے، قرآن

میں عفو سے متعلق آیت، (آیت ۳۸ رکوع ۸ ارب ۹) اور حدیث باب کا تعلق زنا، سرقت، قتل و غارت جیسے جرائم، اور صرف ان حقوق العباد کے ساتھ ہے جو کفر کے زمانے میں تاقی تلف کر دئے گئے تھے، اسلام کے بعد اب وہ سب عفو ہو جائیں گے۔  
شیخ تورپشٹی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے، کہ اسلام زمانہ کفر کے ہر گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، خواہ ظلم ہو یا کچھ اور؟ صغیرہ ہو یا کبیرہ، البتہ ہجرت و حج تو ان دونوں سے نہ تو مظالم ختم ہوتے ہیں، اور نہ ان کبائر کی معافی کا یقین کیا جاسکتا ہے، جو حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں، ہاں صغائر کے ساتھ، اس کا تعلق ہے، اور جو کبائر حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں، وہ بشرط توبہ معاف ہوں گے، اصل اور ضابطہ کے تحت یہ تفصیل ضروری ہے، اور شارحین حدیث اتنی بات میں متفق ہیں، ہمارے بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ اسلام، کفر و معاصی، اور حقوق اللہ کی کوتاہیوں پر جو سزا ہے اس کو ختم کر دیتا ہے، حقوق العباد، حج اور ہجرت سے معاف نہیں ہوتے، اس پر تو امت کا اجماع ہے، اور اسلام کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس پر مسلمان نذی کا کوئی مالی حق ہو یا غیر مالی حق، جیسے قصاص، یا حربی مسلمان، کامالی حق، قرض، بیع و شراہ کی وجہ سے رہ گیا ہو، اور وہ مال خمر کے علاوہ ہو تو وہ بھی معاف نہیں ہوگا،

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ حج کے ذریعہ پہلے کے گناہ معاف ہو جائیں گے، مگر اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ، وہ حج ہر دور ہو، جو فسق و فجور سے پاک ہو، اور اصول کا تقاضا ہے کہ گناہ کبیرہ بھی معاف نہ ہو، اسکے لئے توبہ کی ضرورت ہے، بعض شارحین کی عبارتوں سے پتہ چلتا ہے، کہ حقوق مالی، حج و ہجرت سے معاف نہیں ہوتے، اور اسلام کے ذریعہ تو اسمیں اختلاف ہے بعض شوافع کا دعویٰ ہے کہ حج، حقوق مالی کو بھی معاف کر دیتا ہے، اور دلیل میں ابن ماجہ کی روایت پیش کرتے ہیں، کہ آنحضور ﷺ نے یوم عرفہ کی شام کو اپنی امت کی مغفرت کے لئے دعا فرمائی، تو مظالم کے سوا سارے گناہوں کی معافی کی دعا قبول ہو گئی، پھر مزدلفہ کی صبح دعا فرمائی تو مظالم بھی معاف ہو گئے، اس پر شیطان کو بہت پریشانی ہوئی، آپ اس کو دیکھ کر مسکرائے (۲) ابن ماجہ باب الدعاء ص ۲۲۲۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے، کہ ابن ماجہ کی یہ حدیث ضعیف ہے، اگر صحیح مان لیا جائے، تو پھر توبہ کے ساتھ مقید کرنا ہوگا، رہا اس کی معافی کا تعلق خاص ان لوگوں کیساتھ مانا جائے، جو اس حج میں آپ کے ساتھ شریک تھے۔

❦ حدیث ❦ حدثني محمد بن حاتم ..... عن ابن عباس أن ناساً من أهل الشَّركِ

قَتَلُوا فَأَکْثَرُوا وَزَنُوا فَأَکْثَرُوا ثُمَّ أَتَوْا مُحَمَّدًا عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالُوا: إِنَّ الَّذِي تَقُولُ وَتَدْعُوا لِحَسَنٍ وَلَوْ نَحْبَرْنَا أَنَّ لِمَاعِمْ لِنَا كُفْرًا، فَنَزَلَ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ إِثْمًا، وَنَزَلَ: يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ.

(بخاری شریف ص ۷۱۰، ع ۸۱۰، مسلم ص ۷۶، ابوداؤد، نسائی ۸۶۷)

”ابن عباس کی روایت ہے، کہ کچھ مشرکوں نے خوب قتل کیا، اور خوب زنا کیا، پھر آپ کے پاس حاضر ہوئے، اور بولے جو باتیں آپ فرماتے ہیں، اور جن کی دعوت دیتے ہیں، وہ سب ٹھیک ہیں، کاش ہمیں آپ اس کا بھی یقین دلا دیتے، جو بدکاریاں ہم پہلے کر چکے ہیں، ان کی بخشش کی بھی کوئی صورت ہے، تو اس پر یہ آیت اتری، جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا نہیں مانتے، اور جس کا خون اللہ نے حرام کیا ہے، اس کو قتل نہیں کرتے، مگر جو ضابطہ

ترجمہ

میں جائز ہے، اور زنا نہیں کرتے، اور جو یہ باتیں کرے وہ بڑے گناہ میں جا پڑے، اور یہ آیت بھی اتنی اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ایسے نہ ہو۔“

### قاتل کی مغفرت ہوگی؟

”جمہور کی رائے یہ ہے، کہ مومن اگر کسی کو قصداً قتل کر دیتا ہے، تو وہ دنیا و آخرت میں سزا کا مستحق ہوگا، لیکن مخلد فی النار نہ ہوگا، جہاں تک حدیث باب، اور آیت قرآنی، ومن یقتل مؤمناً متعمداً فجزاءہ جہنم ہے، اس کی چار تاویلیں کی جاتی ہیں۔

(۱) خلود فی النار کی وغیرہ جزو توبیح پر محمول ہے، یعنی خلود فی النار مقصود نہیں، (۲) قتل مومن عداً کی سزا، درحقیقت ہے تو، خلود فی النار، خدا چاہے تو دہائی سزا دیدے، مگر یہ حق تعالیٰ کے رحم و کرم کی بات ہے، کہ اسکو جہنم سے نکال دے، چنانچہ ابوداؤد میں اسکی تفسیر میں یہ الفاظ منقول ہیں، قال ہی جزاءہ فان شاء اللہ ان یتجاوز عن جزاءہ فعل، (ابوداؤد) اور وعید کے بعد اس کے خلاف کرنا، کذب نہیں کہا جاتا، جیسا کہ کوئی کہے اگر ایسا کیا تو نکال دوںگا، مگر اس کے کرنے پر نہ نکالنا، کذب نہیں کہلاتا، تو خدا وعدہ خلافی نہیں کرتے، البتہ خلاف وعید کر سکتے ہیں، (۳) استحلال پر محمول ہے، یعنی کوئی شخص کسی مومن کے قتل کو حلال سمجھ کر قتل کرے وہ مخلد فی النار ہوگا، (۴) جو شخص کسی مومن کو اس کے مومن ہونے کی وجہ سے قتل کرے، وہ مخلد فی النار ہوگا۔“

### حضرت ابن عباس کا مسلک

حضرت ابن عباس کا مشہور قول یہ ہے، کہ مومن قاتل عداً کیلئے توبہ نہیں، اس کی دلیل امام احمد، ابن ماجہ، اور نسائی کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس کے ناچینا ہونے کے بعد، ایک شخص ان کے پاس آیا اور انہوں نے کہا، آپ کا کیا خیال ہے، اس مومن کے بارے میں جو جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کر دے، تو فرمایا جزاءہ جہنم خالداً غیہا، اور پھر فرمایا کہ یہ آخری آیت ہے، اور کوئی تاریخ آیت اس کے بعد نہیں اتنی، یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا، یعنی محکم آیت ہے، مسائل نے کہا کہ اگر توبہ کر لے، تو انہوں نے کہا اسکے لئے توبہ کہاں؟ اسی مضمون کی حدیث نسائی میں ہے سئل ذنب عسی اللہ

ان یغفر لہ الا الرجل یغفر لکافر أو الرجل یقتل مؤمناً متعمداً۔ (نسائی ج ۲ ص ۱۶۳)

اسی طرح آیت باب، جس میں قتل کی معافی کا تذکرہ ہے، اسکو زمانہ کفر کے قتل پر محمول کرتے ہیں، اور بعد از اسلام نقل کرنے پر سورہ نساء کی آیت ومن قتل مؤمناً متعمداً سے استدلال کرتے ہیں، گویا آیت اپنے موقع کے لحاظ سے صحیح ہے، کوئی تاریخ و منسوخ نہیں، لیکن جمہور اس حدیث، اور آیت مذکورہ کو جزو توبیح پر محمول کرتے ہیں، حتیٰ کہ خود حضرت ابن عباس کے قول کو بھی زجر پر ہی محمول کرتے ہیں، نہ کہ حقیقت پر، اور دلیل میں روایت پیش کرتے ہیں، ایک شخص نے سوال کیا تو فرمایا کہ اس کی توبہ نہیں، اس کے لئے صرف جہنم ہے اہل مجلس نے اس کے جانے کے بعد پوچھا کہ ایسا فتویٰ تو آپ نہیں دیتے، بلکہ آپ تو ہم سے فرماتے تھے کہ توبہ قبول ہو جاتی ہے، آج کیا بات ہے؟ تو فرمایا کہ یہ شخص غصہ میں مجھرا ہوا تھا وہ معلوم کرنے آیا تھا کہ قتل کے بعد قبولیت کی گنجائش ہوگی؟ اگر ہوگی تو بعد میں توبہ کر لوں گا، میں نے کہہ دیا کہ

توبہ قبول نہیں ہوتی، تاکہ رک جائے، اس سے صاف واضح ہوتا ہے، کہ زجر کے طور پر ہی فرمایا کرتے تھے حضرت سفیان فرماتے ہیں، کہ اہل علم کا دستور تھا کہ لائوبہ کا فتویٰ دیتے، اور اگر کوئی مرتکب ہو جاتا تو کہتے توبہ کر لو۔ (۱)

## باب بیان حکم عمل الکافر اذا اسلم بعدہ

حدیث ﴿ حدیثی حرملہ بن یحییٰ ..... أن حکیم بن جزام أخبرہ انه قال

لرسول اللہ ﷺ ارایت اموراً کنت اَتَخَنَّتْ بها فی الجاہلیۃ هل لی فیہا من شئی فقال لہ رسول اللہ ﷺ اسلمت علی ما اسلفت من خیر ، وَاَلْتَخَنْتُ التَّعْبِدَ. (۲)

ترجمہ حضرت حکیم بن حزام سے روایت ہے، کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ، فرمائیے، میرے وہ نیک کام جو جاہلیت کے زمانہ میں، میں کیا کرتا تھا، کیا اس میں مجھ کو اجر ملے گا، تو آنحضور ﷺ نے فرمایا، جتنی نیکیاں پہلے کر چکے ہو ان سب کے ساتھ ہی مسلمان ہوئے ہو، یعنی ان کا بھی ثواب ملے گا۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے، کہ کافر کے نیک اعمال، اسلام لانے کے بعد معتبر ہو سکتے ہیں، امام بخاریؒ نے اس حدیث کو زکوٰۃ، عقیق، اور صلہ رحمی کے مختلف ابواب میں نقل کیا ہے، اور ہر جگہ اس پر صدقہ مشرک، اور عقیق مشرک کا عنوان قائم کر کے ثم اسلم کی قید لگائی ہے، (بخاری ۱۹۳ زکوٰۃ)، حافظ ابن حجر نے شاید اسی لئے یہ تفصیل اختیار فرمائی کہ کافر اگر اسلام قبول کر لے جب تو اسکے زمانہ کفر کی نیکیاں باعث اجر ہوں گی، ورنہ نہیں،

مولانا بدر عالم میرٹھی کا خیال ہے کہ امام بخاری نے، ان تراجم میں، اس مسئلہ کے فیصلہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں فرمایا، بلکہ اس کے پیچیدہ اور مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے کسی ایک جانب جزم کرنا خلاف احتیاط سمجھا، اس لئے الفاظ حدیث ہی کو عنوان باب بنادیا ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کافر کے طاعات معتبر ہونے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے، کہ اس کے عذاب میں تخفیف ہو جائے، یہی اس کے حق میں، بہت بڑی بات ہے، اس کے سوائے حق میں نجات ابدی کا تصور، فضول، اور لغو تصور ہے۔

## کافر کی نیکی آخرت میں کار آمد ہوگی؟

یہ بات تقریباً طے شدہ ہے، کہ کافر کی نیکیاں اس کے اسلام لانے کے بعد معتبر ہو سکتی ہے، یعنی رحمت الہی ان پر بھی اس کو ثواب دے سکتی ہے، بحث طلب یہ مسئلہ ہے کہ اگر کافر مسلمان نہ ہو تو کیا پھر بھی اس کی نیکیوں کا کوئی ثمرہ آخرت میں ظاہر ہو سکے گا یا نہیں؟ دوسری بحث یہ ہے کہ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ ان کی نیکیاں کس درجہ میں قابل اعتبار ہوں گی، کیا یہ حکم ان کی عبادتوں کو بھی شامل ہے، یا عبادتیں اس سے مستثنیٰ ہیں، ان دونوں مسئلوں میں علماء کا اختلاف ہے۔

## پہلے مسئلہ میں متحققین کے مختلف اقوال ہیں

ابن بطل، اور دوسرے متحققین کا مختار قول یہ ہے کہ کافر اگر مسلمان ہو جائے اور اسی حالت پر اس کا انتقال ہو جائے تو جو نیک کام وہ کفر کے زمانہ میں کر چکا ہے اس کا ثواب بھی اس کو ملتا ہے، اس کی دلیل ابو سعید خدری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب

کافر مسلمان ہو جائے، اور خوب اچھی طرح مسلمان ہو جائے تو جو جو نیکیاں وہ پہلے کر چکا ہے، اللہ تعالیٰ وہ سب نیکیاں لکھ دیتا ہے۔  
 دوا قطنی نے اس حدیث کو مالک کی غریب حدیثوں میں ذکر کیا ہے، اور نو طریقوں سے صحیح طور پر یہ مضمون نقل کیا ہے۔ (۱)  
 حافظ ابن حجر فرماتے ہیں، کہ حدیث میں کافر کے متعلق، اسکے مسلمان ہونے کے بعد، اس کی نیکی کا ثواب لکھے جانے کا ذکر ہے، اس سے زمانہ کفر کے عمل کا مقبول ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ ہو سکتا کہ اسلام کے بعد، یہ کتاب اللہ کی طرف سے اس پر صرف انعام و احسان ہے، اور یہ بھی ممکن ہے، کہ اس کی مقبولیت اسلام لانے پر موقوف رہے، یہی جواب زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے، ابن مزیر کہتے ہیں، کہ جو بات قواعد شریعت کے خلاف ہے، وہ صرف یہ ہے کہ کافر کی نیکیاں، کفر ہی کے زمانہ میں لکھی جائیں، یہ بات کہ مسلمان ہونے کے بعد، اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں میں ان نیکیوں کے ثواب کا بھی اضافہ فرمادے، جن کو وہ زمانہ کفر میں اچھے عمل سمجھ کر کر چکا ہے، تو اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، جب کہ اس کو یہ قدرت حاصل ہے، کہ کسی کو عمل کے بغیر یونہی ابتداً ثواب دیدے، یا مجرم و مرض کے زمانہ میں، اس کی صحت و قدرت کے اعمال کے برابر ثواب بخش دے، تو اس کے اسلام کے بعد زمانہ کفر کے کئے ہوئے اعمال پر ثواب دینے کی قدرت کیوں نہیں، مگر چونکہ ان کی قبولیت کے شرائط اس وقت موجود نہ تھے، یعنی اسلام۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ، کافر کی نیکیاں، اسلام کے بعد، تو معتبر ہو سکتی ہیں، لیکن اگر وہ مسلمان نہ ہوا، تو پھر اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ (۲)

### دوسرا مسئلہ

دوسرے مسئلہ میں امام نووی کی رائے یہ ہے، کہ کافر کی عبادات و طاعات اور ہر قسم کی نیکیاں معتبر ہو سکتی ہیں، ان کو اس پر یہاں تک اصرار ہے، کہ وہ فقہاء کے قول میں تاویل کے لئے تیار ہیں، فقہاء فرماتے ہیں، لا تصح عبادة الکافر ولو اسلم لم يعتد بها، امام نووی اس کی یہ تاویل فرماتے ہیں، مراد ہم انہ لا يعتد له بها فی احکام الدنیا، وليس الغرض لثواب الآخرة۔ (۳)

حضرت علامہ شاہ انور کشمیری کا فیصلہ یہ ہے کہ کافر کے نیک کام آخرت میں نفع بخش ہو سکتے ہیں، ان کو اس کی صورت صرف تخفیف عذاب ہو، ایک منصف اور ظالم کافر کے عذاب میں فرق بدیہی ہے،..... اس فرق کی وجہ اسکے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی، کہ منصف کافر کا انصاف ہی اس کے حق میں، تخفیف عذاب کا باعث ہو، ورنہ اصل کفر میں تو دونوں برابر ہیں، لہذا حافظ ابن حجر کا حدیثوں کی تاویل کرنا اور یہ فرمانا کہ کافر کے اعمال کا نفع تو ہو سکتا ہے، مگر یہ نفع اسی وقت ظاہر ہوگا، جب کہ وہ مسلمان ہو جائے، ظاہر کے خلاف ہے،..... ہاں شیخ محمد الدین نووی کی اتنی تعلیم کہ ان کی سب نیکیاں معتبر ہیں، یہاں تک کہ عبادتیں بھی اتنی تعلیم قابل قبول نہیں، متوسط فیصلہ یہ ہے کہ کافر کی عام نیکیاں تو معتبر ہو سکتی ہیں، مگر اس کی کوئی عبادت معتبر نہیں ہو سکتی..... عبادات اور دوسرے اچھے کاموں میں فرق یہ ہے، عبادات خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے، عبادت میں نیت اور صاحب حق کی معرفت بھی درکار ہے، کافر کو خدا کی معرفت کا ایک ذرہ بھی نصیب نہیں ہوتا، اس لئے اس کی عبادت خدا کی عبادت ہی نہیں ہوتی، وہ صرف اپنے خیالی معبود کی عبادت کرتے ہیں،..... اور نیک کاموں سے مراد وہ کام ہیں، جن کو

انسان اپنی فطرت سے، مذہب کی قید و بند سے آزاد ہو کر بھی اچھا سمجھتا ہے، ان میں نیت کرنا، شرط نہیں، احادیث بالا میں انہیں اقسام کے اعمال کا ذکر ہے، جیسے نوع انسان کی ہمدردی، عدل و انصاف، صدقہ خیرات، صلہ رحمی، مہمان نوازی غلام آزاد کرنا، اس قسم کے اور اعمال ہیں۔ (فیض الباری)

شیخ محی الدین نودی امام بیہقی سے نقل فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابن جعدان کی حدیث اور دوسری حدیثیں جن میں کافر کے بحالت کفر مر جانے کے بعد اس کی نیکیوں کے برباد ہونے کا ذکر ہے، اس پر محمول ہوں کہ ان نیکیوں کا نتیجہ اس کے حق میں عذاب و دوزخ سے نجات اور جنت میں داخلہ نہیں ہو سکتا ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس کی نیکیوں کی وجہ سے کفر کے علاوہ اس کے اور برے اعمال کی سزا میں ایک گونہ تخفیف ہو جائے، امام بیہقی کی عبارت میں اور یہ وضاحت ہو گئی کہ تخفیف عذاب سے مراد بھی اس کے گناہوں کے عذاب میں تخفیف ہے، کفر کے عذاب میں نہیں گویا نیکیوں کا اثر کفر کے معاملہ میں کچھ نہیں ہو گا۔ امام نوویؒ ایک حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ کافر کی نیکیوں کا بدلہ اس کو دنیا میں ہی دیدیا جاتا ہے اس میں اسی قسم کی نیکیوں کا ذکر ہے جن کو انسان ثواب کے لئے کیا کرتا ہے مگر ان میں نیت شرط نہیں ہوتی جیسے صدقہ، عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ۔

قوله عليه السلام اسلمت على ما اسلفت: اس جملہ کی محدثین سے چار توجہیں منقول ہیں (۱) زمانہ جاہلیت میں نیک کام کر کے جو مزاج بنا ہے مسلمان ہو کر وہ مزاج باقی رہے گا، اور سابقہ عادت سے تم کو اسلام لانے کے بعد فائدہ ہو گا (۲) زمانہ کفر میں نیکی کر کے جو شہرت حاصل کی ہے اسلام لا کر وہ ختم نہیں ہو گی، بلکہ وہ برقرار رہے گی (۳) زمانہ کفر میں نیک طبیعت کی وجہ سے نیک کام انجام دیتے تھے، مسلمان ہونے کے بعد اس طبیعت سے جو کچھ بھی نیک کام کرو گے اس پر دوہرا اجر ملے گا (۴) زمانہ کفر کے نیک کاموں ہی کی بدولت تم کو اسلام نصیب ہوا، جو سب سے بڑا فائدہ ہے گویا نیک طبیعت اور نیک کام اسلام کا سبب بنا۔

ایک اشکال :- ”علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ یہاں ایک اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ سوال تو یہ تھا کہ زمانہ کفر کے اعمال خیر پر ثواب ملے گا یا نہیں؟ تو اس کا واضح جواب ہاں یا نہیں یا کسی شرط کے ساتھ نہ دیکر یہ فرمایا کہ تم جتنی نیکیاں کر چکے ہو اس کے ساتھ مسلمان ہوئے ہو، آخر اس اسلوب میں تو یہ کہ ساتھ جواب کیوں دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو جاتا ہے کہ زمانہ کفر کے نیک کام اسے قابل تعریف بنا دیتا ہے اور دنیا میں کم از کم اچھے ثمرات کا ذریعہ بنتا ہے اور مطلقاً جواب میں یہ اشارہ نہ ہو پاتا۔“

## باب صدق الایمان و اخلاصہ

ایمان کی سچائی اور غلو ص کا بیان

حدیث ﴿ حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ ..... عَنْ الْأَعْمَشِ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ: الَّذِينَ آمَنُوا لَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ شَقَّ ذَلِكَ عَلَى أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ



وَقَالُوا إِنَّا لَا نُظَلِّمُ نَفْسَنَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّونَ إِنَّمَا هُوَ قَالُ لِقَمَانٍ لَا يَبْنِي لَا تُشْرِكُ بِاللَّهِ إِنْ الشُّرُكَ لَظَلَمَ عَظِيمٌ . (۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب آیت قرآنی الذین آمنوا الخ (جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے اپنے ایمان میں کسی قسم کا ظلم شامل نہیں کیا) نازل ہوئی تو آپ کے صحابہ کو پریشانی لاحق ہوئی، اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ بھلا ہم میں کون ایسا شخص ہوگا؟ جس نے اپنے اوپر ظلم (گناہ) نہ کیا ہو، آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے دو ظلم مراد نہیں، جیسا کہ تم لوگوں کا خیال ہے، یہاں تو ظلم سے مراد وہ ظلم ہے، جو حضرت نعمان نے اپنے فرزند سے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا، کہ اے ولد عزیز دیکھو شرک نہ کرنا، کیونکہ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

### سند کے متعلق ایک اہم بات

سند میں مشہور راوی حضرت اعمش کا ذکر ہے، جب کہ یہ تدلیس کے ساتھ مشہور و معروف ہیں اور ضابطہ حدیث ہے، کہ تدلیس کا معنی معتبر نہیں، جب تک کسی اور سند میں سماع کی تصریح نہ ہو، الا عمش عن ابراہیم میں امام اعمش کا ابراہیم سے بصیغہ عن نقل کرنا انقطاع کا شبہ پیدا کرتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ روایت عن معنی امام مسلم نے کیونکر ذکر کیا؟ اس کا جواب حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے، کہ بخاری شریف میں حفص بن غیاث کی روایت میں، بجائے عن ابراہیم کے، حدثنا ابراہیم کی تصریح ہے، جو انقطاع کے احتمال کو ختم کر دیتا ہے۔ (۲)

شرح حدیث: ایمان میں شرک ملانے کی مختلف صورتیں ہیں، سب سے خطرناک یہ ہے کہ، دعویٰ توحید کے ساتھ، اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے، جیسا کہ قرآن نے اس کا شکوہ کیا ہے، وَمَا يَوْمُنَا كَثُرَهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ، حالانکہ ایمان کے قبول اور نافع ہونے کے لئے، بنیادی شرط یہ ہے کہ شرک کی آمیزش سے پاک ہو، حتیٰ کہ جس عمل میں، شرک خفی (ریا) کی بھی بو ہو وہ بھی آخرت میں کالعدم ہوگا۔

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں، جو عقائد ہیں، اس طرح کا کوئی عقیدہ کسی مخلوق کے لئے رکھنا یہ شرک ہے، اس کی کچھ تفصیلات یہ ہیں، (۱) علم میں شریک ٹھہرانا، یعنی کسی بزرگ سیاحیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا، کہ ہمارے سب حال کی اس کو ہر وقت خبر ہے، نجومی، پنڈت، سے غیب کھجریں دریافت کرنا، یا کسی بزرگ کے کلام میں، فال دیکھ کر اس کو یقینی سمجھنا، یا کسی کو دور سے پکارنا، اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہوگئی، یا کسی کے نام کا روزہ رکھنا (۲) اشراک فی التصرف یعنی کسی کو نفع و نقصان کا مختار سمجھنا، کسی سے مراد اس ماٹھنار روزی اور لولاد ماٹھنار، (۳) اور عبادت میں شریک ٹھہرانا، کسی کو سجدہ (عبادت) کرنا کسی کے نام کا جانور چھوڑنا، چیز ہاواچڑھانا، کسی کے نام کی منت ماننا، کس کی قبر یا مکان کا طواف کرنا دنیا کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سے سمجھنا (معارف القرآن ص ۳۳۰/۲) اس سے معلوم ہوا کہ شرک صرف یہی نہیں کہ انسان بت پرست ہو بلکہ وہ آدمی بھی شرک میں داخل ہے جو بت کی پوجا پاٹ گرچہ نہیں کرتا اور کلمہ اسلام پڑھتا ہے، مگر رسول یا ولی کو اللہ کی بعض صفات کا شریک ٹھہرائے، اس میں عوام کے لئے سخت تنبیہ ہے، جو اولیاء اللہ اور انکے مزار کو

حاجت روا سمجھتے ہیں، اور عملاً ایسا سمجھتے ہیں، کہ گویا خدا کی اختیارات لکے جا رہے گئے۔ " (م) (۱۵)

### صحابہ کرام کا اشکال اور حضور ﷺ کا جواب

"سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ لبس یلبس جب باب ضرب سے آئے، تو اس کا معنی ہوگا، کسی چیز کو اس طرح غلط اور گڈمڈ کر دینا، کہ امتیاز باقی نہ رہے، اور جب باب سمع سے آئے تو پہننے کے معنی میں آئیگا، یہاں لم یلبسوا کا معنی ہوگا، وہ لوگ جو ایمان لائے، اور ایمان کو ظلم کے ساتھ غلط مطلق نہیں کیا، تو انہیں کے لئے امن و نجات ہے۔ اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام کو جو اشکال ہوئے، اس کی وجہ علامہ خطابی فرماتے ہیں، کہ ظلم کا لفظ گرچہ عام ہے، لیکن اس دور میں بھی متعارف یہی تھا کہ ظلم کا لفظ معصیت پر بولا جاتا تھا، اور کفر و شرک کو اتنا بڑا سمجھا جاتا تھا، کہ اس پر ان کے عرف میں ظلم کا اطلاق ہوتا ہی نہیں تھا، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے ظلم کے متعارف معنی پر محمول کیا، اس لئے ان کو پریشانی ہوئی کہ ہم سب سے کسی نہ کسی گناہ کا ارتکاب ہوا ہے، اور سوائے انبیاء کے کوئی ہے جو گناہوں سے معصوم ہو؟ اس پریشانی اور الجھن کو دربار رسالت میں پیش فرمایا تو خداوند قدوس کی نازل کردہ آیت ان الشُّرَکَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ سنار مضمّن فرمایا، کہ یہاں ظلم کا عمومی معنی نہیں بلکہ خاص معنی شرک مراد ہے، جس کا حاصل یہ نکلا کہ جس نے ایمان قبول کیا اور اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا، وہ عذاب سے مامون اور ہدایت یافتہ ہے، علامہ انور شاہ کشمیری نے اسی تقریر کو پسند فرمایا ہے، "م (۱۵)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں، کہ صحابہ کرام ظلم کے لفظ کو، کفر و شرک اور معصیت دونوں کے لئے عام سمجھتے تھے، لیکن چونکہ نکرہ تحت اللفظی واقع ہوا ہے، اس کے عموم کو ملحوظ رکھکر یہ سمجھا کہ جس نے کسی قسم کا ظلم و شرک اور گناہ نہ کیا ہو، اسی کو اسن ملے گا، اور مسلمان کفر و شرک سے محفوظ تو ہو سکتا ہے لیکن معصیت سے محفوظ کیونکر ہوگا؟ لہذا اس کی نجات بھی کیسے ہوگی، اس لئے اشکال پیش آیا، جس کا جواب آنحضرت ﷺ نے اس طرح دیا، کہ یہاں ظلم کی تین تہیں تھیں، بلکہ تنظیم کے لئے ہے، کہ ظلم کا جو سب سے اعلیٰ فرد ہے، یعنی شرک، وہ مراد ہے۔ (۱۵)

### ظلم بمعنی شرک یا معصیت؟

اس آیت میں جمہور کے نزدیک ظلم سے شرک مراد ہے، جب کہ معتزلہ کے نزدیک اعمال بد مراد ہیں، بعض علماء نے یہاں سوال قائم کیا ہے، کہ کیا اس تفسیر پر کوئی ایسا قرآنی قرینہ ہے؟ کہ ظلم سے مراد شرک ہے، یا کہ براہ راست حضور پاک ﷺ نے تفسیر فرمائی ہے؟

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے لکھا ہے کہ آیت میں ہی اس کا قرینہ موجود ہے، اور وہ ہے لفظ لبس، کہ مراد کفر ہے، نہ کہ اعمال جوارح، زنا، چوری وغیرہ، کیونکہ لبس کے معنی ہیں ایک برتن میں دو چیزوں کو اس طرح مخلوط کر دینا کہ امتیاز باقی نہ رہ سکے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جبکہ دونوں کا ظرف محل ایک ہو، جیسے شربت کہ یہ اسی وقت بن سکتا ہے جب پانی میں شربت ملا دی جائے، لہذا یہاں اگر ظلم سے مراد اعمال جوارح لئے جائیں، تو ظرف کا اتحاد باقی نہ رہے گا، کیونکہ اعمال کا ظرف محل، جوارح ہیں اور ایمان کا قلب، لہذا اتحاد کے لئے ضروری ہے، کہ ظلم کے وہ معنی ہوں جو ایمان کے ساتھ ایک ظرف

اور محل میں جمع ہو جائیں۔ (۵)

(۲) القرآن یفسر بعضہ بعضاً، جب صحابہ کو اشکال ہوا، تو اس پر یہ آیت نازل ہو کر، اسکی تفسیر کر دی کہ مراد شرک ہے، تو دوسری آیت قرینہ ہے، ظلم بمعنی شرک کے لئے۔

(۳) حضرت گنگوہی نے عجیب تقریر فرمائی ہے، کہ سمندر میں جو چیز بھی پڑتی ہے، ٹھہرتی نہیں، بلکہ پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، ہاں اگر ٹٹل ہو تو تہہ میں بیٹھ جاتی ہے، اسی طرح ایمان کے سمندر میں، چھوٹے چھوٹے گناہوں کے ٹھہرنے کا سوال ہی کیا؟ ان الحسنات یذهبن السيئات اور الامن تاب و عمل عملاً صالحاً الخ کے مطابق وہ محاف ہو جاتے ہیں، رہا کبائر گناہ، تو وہ یغفر مادون ذلک لمن یشاء کے بحر ناپید اکناہ کے سامنے ایمان کے مقابلے میں انہیں بھی استقرار نہیں، البتہ کفر و شرک جو ایمان کی ضد ہیں، وہ ایمان کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں، اور ایمان کے ساتھ کفر و شرک ہی کا خلط ملط ہو سکتا ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ لیس کا لفظ قرینہ ہے اس بات کے لئے، کہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ (۷)

### مسئلہ معترکہ

علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے، کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک نہیں، بلکہ معصیت مراد ہے، اور معصیت مراد لینے کی صورت میں یہ آیت میرا استدلال بن سکتی ہے، کہ مرتکب کبیرہ کبھی نجات نہیں پاسکتا کیونکہ اگر شرک مراد لیا جائے تو ایک محل میں ایمان و شرک کا اجتماع لازم آئے گا، جبکہ یہ محال ہے، کیونکہ دونوں تو نقیض ہیں اور دو نقیض کا ایک محل میں، جمع ہونا ناممکن ہے۔

جوابات:- یہ تفسیر تو خود آنحضور ﷺ سے منقول ہے، پھر کیوں نہیں مانتے؟ تو اس پر وہ یہ کہتے ہیں، کہ جو خبر واحد خلاف عقل ہو اس کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔

(۲) مفسرین نے الزامی جواب دیا ہے، کہ بقول تمہارے ظلم سے مراد گناہ، اور اعمال بد ہیں، اور تمہارا نظریہ ہے کہ مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، تو جب اس نے کوئی گناہ کیا، تو اس کا ایمان خارج ہو گیا، لہذا ایمان و شرک کا اجتماع تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ جب ایمان ہو گا تو لازم ہو گا کہ ہر گناہ سے پاک ہو۔ فہا ہو جو اکم فہو جو اینا، اس الزامی جواب سے گھبرا کر علامہ زختری معترکہ نے کہا کہ یہاں ایمان کے لغوی معنی یعنی تصدیق مراد ہے، نہ کہ شرعی معنی، ہم کہتے ہیں کہ جب ایمان کے لغوی معنی مراد ہیں، تو بظلم سے شرک مراد لینے میں کیا قباحت ہے؟

(۳) ہمیں تسلیم نہیں کہ کفر و ایمان کا اجتماع مطلقاً محال ہے، دیکھئے سورہ یوسف میں مایومن اکثرهم باللہ الا وہم مشرکون، یعنی ان میں سے اکثر اللہ پر یقین نہیں لاتے، مگر شرک کرتے ہوئے، لہذا جس طرح اس آیت میں کفر و ایمان کا اجتماع ہے اسی طرح الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم الخ میں بھی اجتماع ہو سکتا ہے۔

اب ہم اس حدیث سے قطع نظر کرتے ہوئے تمہاری تفسیر لیتے ہیں، اور ظلم سے مراد عمل بد لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ امن اسے ہے جو مرتکب معصیت نہ ہو، تو سوال یہ ہے کہ امن کس چیز سے؟ ہم کہیں گے، دخول نادر سے، اور تم کہو گے خلود فی النار سے، قرآن کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن میں امن نہ دخول سے ہے، نہ خلود سے، قرآن میں غور

کرد، ارشاد ہے، و حَاجَہُ قَوْمُهُ حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے ان سے جھگڑنے کی، قَالَ اتَّخَذُونِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ، اللہ کے معاملہ میں جھگڑتے ہو، حالانکہ اس نے مجھے ہدایت دی ہے، کیا میں تمہارے اس جھگڑے سے متاثر ہو چکا ہوں؟ وَلَا اخَافُ مَا تَشْكُونَ کہ میں اس چیز سے ہرگز خوف نہیں کھوں گا، جس کو تم شریک کرتے ہو، الا ان يَشَاءَ رَبِّي، اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا، وسبح ربِّي کلَّ شئٍ علما، کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے، وہ دیکھ کر کسی کو نبی بناتا ہے، یہ بت کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ وکیف اخاف ما تشركتم یعنی میں کیوں گھبراؤں، ڈرنا تم کو چاہئے، کہ تم اللہ کا شر یکبانتے ہو، اور پھر بھی خدا کے قہر سے نہیں ڈرتے، فای الفرقین احق بالامن، ان کنتم تعلمون، بتاؤ کون سا فریق احق ہے، مامون وہ خوف رہنے کا، اگر جانتے ہو پھر خود بتلایا، الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم الخ، یہ امن تو وہی ہے، جو پہلی آیت سے مفہوم ہوتا ہے، یعنی جس چیز سے وہ ڈرا رہے تھے، اس سے بے خوفی مراد ہے، تو معلوم ہوا، کہ ظلم کے معنی شرک کے ہیں، یہاں کوئی دوسرے بن ہی نہیں سکتے، جس چیز کا سوال ہے، اسی کا جواب ہے، الحمد للہ بالکل شرح صدر ہو گیا، اس سے امن کی تفسیر ہو گئی، کہ امن دنیا کا مراد ہے، نہ کہ آخرت کا، مگر دوسرا جملہ وہم مہندون آخرت سے متعلق ہے، یا پھر امن کو عام رکھو مگر اس وقت بھی امن دنیوی، اولاً معتبر ہے، نہ اس میں معتزلہ کی کچھ چلتی ہے، نہ اور کسی کی، زخشری نے مذہب کے تعصب میں آکر ایسا کہہ دیا، ورنہ کوئی معمولی شخص بھی پورے رکوع پر نظر رکھتے ہوئے وہ بات نہیں کہہ سکتا جو زخشری نے کہہ دی ہے۔

### ایک اشکال

”مسلم شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ جب صحابہ کرام نے اینالہم یظلم کہا تو آپ نے حضرت لقمانؑ کا وہ قول سنایا، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ پہلے سے وہ آیت نازل ہو چکی تھی، جب کہ بخاری شریف میں سوال کے بعد مذکور ہے، فانزل الله عز وجل ان الشرك لظلم عظیم، جس سے معلوم ہوا کہ بروقت نازل ہوئی، ..... حافظ ابن حجرؒ نے اس تضاد کو اس طرح دور فرمایا ہے، کہ ممکن ہے، آیت مذکورہ اسی قصہ میں اتاری ہو، اور ساتھ ہی حضور اکرم ﷺ نے اس سے استشہاد بھی فرمایا ہو، اس طرح دونوں میں مطابقت ہو جاتی ہے، لیکن حضرت انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں صحیح جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ، اس واقعہ سے پہلے نازل ہو چکی تھی، اور یہاں آپ ﷺ نے اس کی تلاوت صحابہ کے استبعاد کو دفع کرنے، اور صحابہ کے غم و فکر کو دور کرنے کے لئے فرمائی تھی، اسی کو راوی نے نزول سے تعبیر کر دیا جس طرح ابو بکرؓ نے آپ کی وفات کے بعد اپنے خطبہ میں، صحابہ کرام کے استبعاد کو دفع کرنے اور ان کو تسلی دینے کے لئے، وما محمد الا رسول تلاوت فرمائی تھی، چنانچہ اس سے سب کا تردد زائل ہو گیا، اور کسی نے کہا بھی کہ ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ آیت ابھی نازل ہوئی، غرض یہ راوی کے طرز بیان کا توسع ہے۔“ (انوار الباری ج ۲ ص ۱۳۱)

### دوسرا اشکال

”آیت مذکورہ میں ایمان والوں کے لئے، امن و سلامتی کا وعدہ ہے، تو پھر گنہگار مومنوں کو عذاب کیوں دیا جائے گا؟ یہ تو امن و سلامتی کے خلاف ہے، اس کا جواب حافظ ابن حجرؒ نے یہ دیا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ دائمی عذاب جہنم سے مامون ہونگے، نہ کہ عارضی عذاب سے، اور ہدایت یافتہ کا مطلب یہ ہے کہ، بہر حال طریق جنت کی طرف تو ہدایت پائے ہوئے ہیں۔“ (فتح الباری ج ۱ ص ۶۷)

### تیسرا اشکال

”ایمان اور شرک باہم ایک دوسرے کی ضد ہیں، تو ایک جگہ جمع کیسے ہو سکتے ہیں؟ کہ لم یلبسوا

کی بات کہی گئی، اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں لبس کا لفظ ہے، جس کے معنی ظاہری صورت میں، رہنا، ایک دوسرے سے قریب ہونا ہے، اور ایک لفظ غلط ہے جس کے معنی ہرگز دو چیزوں کا باہم ملنا متحد ہونا ہے، غرض جس طرح اردو میں رلے اور ملے میں فرق ہے، اسی طرح لبس، اور غلط میں بھی فرق ہے، لہذا ایمان کے ساتھ شرک کا لبس اور رلنا قلب کے اندر ہو سکتا ہے۔“ م (انوار الباری ج ۲ ص ۳۱۶)

**فائدہ :-** حضرت لقمان حکیم کی نبوت میں اختلاف ہے، امام ابو اسحاق ثعلبی فرماتے ہیں، کے علماء اس بات پر متفق ہیں، کہ حضرت لقمان صرف حکیم تھے، نبی نہیں تھے، صرف حضرت عمرؓ ان کی نبوت کے قائل ہیں، اور وہ اس بات میں منفرد ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ حضرت لقمان حضرت دود علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔

## باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس و الخواطر بالقلب اذا لم تستقر الخ

اللہ تعالیٰ کا در گذر کر دینا حدیث نفس اور قلبی خطرات کو جبکہ وہ قلب میں نہ ٹھہریں، اور اس بات کا بیان کہ خدا نے ایسی بات کا حکم نہیں دیا، جو طاقت سے باہر ہو، الخ

❦ حدیث ❦ حدثنی محمد بنُ العِنهالِ الضَّریرِ وأُمیَّةُ بنِ سَطَامٍ القِیسی وَ اللَّفْظُ لِأُمیَّةٍ ..... عن ابی ہریرۃ قال لما أُنزلت علی رسول اللہ ﷺ مافی السموات ومافی الارض وان تبدوا مافی انفسکم او تخفوه یحاسبکم بہ اللہ ، ینفیر لمن یشاء ویعذب من یشاء واللہ علی کل شیء قَدیر، قال فاشتدَّ ذالک علی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، قال فَأَتُوا رسول اللہ ﷺ ثم بَرَّکُوا علی الرُّکَبِ فقالوا ای رسول اللہ کُلُّنَا مِنَ الاعمالِ مانطیقُ الصلوٰۃ والصیامِ والجهادِ والصدقةِ وقد انزلت علیک هذه الآیۃ وَلَآتِیْقُهَا قال رسولُ اللہ ﷺ اتریدون ان تقولوا کما قال اهلُ الْکِتَابِینِ مَنْ قَبْلَکُمْ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا بَلْ قَوْلُوا سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبِّنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ قالوا سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبِّنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ فلما اقْتَرَأَها الْقَوْمُ ذَلَّتْ بِهَا اَلْسِنَتُهُمْ اَنْزَلَ اللہ عزوجل فی اثرها امن الرسول بما اَنْزَلَ اِلَیْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ، کل آمن باللہ وملککته وکتبه ورساله لا نفرق بین احد من رسله . وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر فلما فعلوا ذلک نسخها اللہ تعالیٰ فانزل اللہ لایکلف اللہ نفساً الا وسعها لها ما کسبت وعليها ما کتسبت ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا، قال نعم ربنا لا تحمل علینا اصرًا کما حملته علی الذین من قبلنا قال نعم، ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا بہ قال نعم واعف عنا واغفر لنا وارحمنا، انت مولانا فانصرنا علی القوم الکفرین قال نعم :- (۱)

## ترجمہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا، کہ جب حضور ﷺ پر، اللہ مافی السفوت اتاری یعنی اللہ ہی کی وہ تمام چیزیں ہیں جو آسمان اور زمین میں ہیں، اگر تم دل کی باتوں کو ظاہر کرو، یا چھپائے رکھو، تو اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں، تم سے محاسبہ کرے گا، اس کے بعد جس کو چاہے گا، بخش دے گا، اور جس کو چاہے گا، عذاب دے گا، اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، تو اس آیت سے، صحابہ کرام کو پریشانی ہوئی، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، کہ صحابہ آپ کی خدمت میں آئے، اور گھسنے لگے، اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول، ہم لوگ بہت سے ایسے اعمال کے مکلف بنائے گئے ہیں، جس کو بجالانے کی ہم میں طاقت ہے، جیسے نماز روزہ جہاد صدقہ، اور اب جو یہ آیت اتری ہے، وہ ہماری طاقت سے باہر ہے، آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ، کیا تم وہی کہنا چاہتے ہو، جو تم سے پہلے دونوں اہل کتاب نے (یہود و نصاریٰ) کہا تھا، کہ ہم نے سن لیا، اور ہم نے نافرمانی کی، (ایسا ہر گز مت کہو) بلکہ کہو سنا، اور اطاعت کی، ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں اے ہمارے رب، اور آپ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، تو صحابہ نے کہا کہ سنا اور مانا، آپ کی مغفرت کے طالب ہیں اے ہمارے رب، جب صحابہ نے اس کو پڑھا (اسوقت کی حالت یہ تھی کہ) ان کی زبانیں دل کی موافقت کر رہی تھیں، تو اللہ تعالیٰ نے اسکے بعد نازل فرمایا، رسول ان باتوں پر ایمان لائے جو ان پر ان کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور سبھی مسلمان اللہ فرشتوں، کتابوں، اور رسولوں پر ایمان لائے، ہم اپنے رسولوں کے معاملہ میں تفریق نہیں کرتے ہیں، اور سبھوں نے کہا، سمعنا و اطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر، جب صحابہ نے یہ کام کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ فرمادیا، اور آیت نازل فرمائی، کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو تکلیف دیتا ہے، اسکی طاقت کے مطابق، ان کے کئے ہوئے کاموں کا فائدہ نقصان انہیں کو پہنچتا ہے، اے ہمارے رب ہمارے بھول یا چوک پر ہم سے مواخذہ نہ کرنا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، نعم اے ہمارے رب ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا، جیسا بوجھ ہم سے پہلے پڑا تھا، تو حق تعالیٰ نے فرمایا ٹھیک ہے، اور ہم پر ایسی چیزیں نہ ڈالنے، جو ہماری طاقت سے باہر ہو، حق تعالیٰ نے فرمایا، ٹھیک ہے ہم کو معاف کر دے، اور ہماری مغفرت فرما، اور ہم پر مہربانی فرما، آپ ہمارے مالک ہیں، کافروں پر غلبہ عطا فرما، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ٹھیک ہے۔

## دوسرے کے اقسام و احکام

انسان کے دل میں دو طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں، اچھے، یا برے، اچھے خیالات کو الہام کہا جاتا ہے، اور برے خیالات کو دوسوسہ، پھر دوسوسہ کی دو قسم ہے، اختیاری، اضطراری، دوسوسہ کی بعض حضرات نے پانچ قسمیں بتائی ہیں، حاجس، خاطر، حدیث نفس، ہم، عزم، ان سب کی تعریف سنئے۔

حاجس :- دل میں برے خیالات آئیں، اور بلا قصد و ارادہ ناگہانی طور پر آجائیں تو اسکا پہلا درجہ یہ ہے کہ دل میں وہ ٹھہرے نہیں، بلکہ آئیں، اور نکل جائیں، اسکو حاجس کہتے ہیں، یہ بالاتفاق سبھی امت سے معاف ہے۔

خاطر :- اگر برے خیالات کچھ دیر دل میں ٹھہر جائے، اور دل میں خلجان پیدا ہونے لگے، مگر اس کا دل برے خیالات سے محفوظ نہ ہو رہا ہو، تو اسکو خاطر کہا جاتا ہے، یہ درجہ بھی اس امت سے معاف ہے۔

حدیث نفس :- اور اگر برا خیال دل میں کچھ دیر ٹھہر کر نکل جائے، اور پھر بار بار آتا اور جاتا رہے، تو اسی کو حدیث

فمن کہا جاتا ہے۔

ہم :- اور اگر دل میں برا خیال آیا اور اس پر غور و فکر کرنے لگا، اور اس سے دل محفوظ ہونے لگا، اور لذت لینے لگا، لیکن برائی کرنے کا ارادہ نہیں کیا، تو اس درجہ کا نام ہم ہے، یہ دونوں بھی اس امت سے معاف ہیں۔

عزم :- اور اگر خیالات سے لذت حاصل کرنے لگے، اور برائی کرنے کا عزم محکم کر لے، پھر یا تو اس کو کر گذرے، یا

کسی ایسی رکاوٹ کی وجہ سے نہ کر سکا، کہ وہ رکاوٹ نہ ہوتی، تو کر گذرنا، اس کو عزم کہا جاتا ہے،..... اس پر بالاتفاق مواخذہ

ہوگا، ہاں اگر ارشکاب کر لیا، تو عزم اور فعل دونوں کا گناہ ہوگا، اور رکاوٹ کی وجہ سے متروک ہو جانے پر، صرف عزم کا گناہ

ہوگا، کیونکہ عزم کو فعل میں نہیں لاسکا، اسی کی طرف قرآن میں اشارہ ہے، و لکن یواخذکم بما کسبت قلوبکم، یعنی تمہارے

قلب میں پیدا ہونے والے، وہ برے دوسو سے جسے تم نے اپنے اختیار سے عزم تک پہنچایا، اس پر مواخذہ ہوگا۔ اور اسی درجہ کا

ذکر، حدیث اذا التقى المسلمان بسيفهما فالقاتل والمقتول كلاهما في النار میں ہے، اس حدیث کے سننے کے

بعد صحابہ نے عرض کیا کہ قاتل کا جہنمی ہونا، تو مطابق عقل ہے، مگر مقتول کے جہنمی ہونے کی بات سمجھ میں نہیں آتی، اس

کو تو جنتی ہونا چاہئے، تو جواب میں ارشاد فرمایا، فانہ حریص علی قتله یعنی مقتول بھی چونکہ مسلمان بھائی کے قتل کا ارادہ

لیکر چلا، یہ دوسری بات ہے، کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا، اس لئے وہ ارادہ قتل کی وجہ سے جہنمی ہوگا،

البتہ اتنا ضرور ملحوظ رہے کہ قاتل کو بمقابلہ مقتول دوہرا گناہ ہوگا، ایک عزم قتل، اور ایک فعل قتل کا، اور حقوق کو

صرف عزم قتل کا، حدیث میں حریص علی قتله اسی عزم کا ذکر ہے،..... غرض عزم کے سوا باقی چاروں قسم پر اس امت

سے مواخذہ نہیں ہے، اور اگر خوف خدا کی بنا پر عزم معصیت کو ترک کر دے تو اس پر ثواب ہوگا۔

### عمل قلب پر مواخذہ؟

حدیث ان الله تجاوز لامني ما حدثت انفسها ما لم يتكلموا او يعملوا به میں، جن وساوس و

خطرات کے معاصی کا تذکرہ ہے، اس سے وہی قسم مراد ہے، جو کسی قول یا عمل کے ابتدائی مراحل میں، پیش آتی ہیں، عقائد

فاسدہ، یا اخلاق ترذیلہ جن کا تعلق، صرف قلب سے ہے، جو ارجح سے نہیں، وہ یہاں مراد نہیں، لہذا اگر کسی کو خدا کی

وحدانیت، رسول کی رسالت، میں دوسو سے داخل ہو کر تردد کی حد تک پہنچ جائے، تو وہ قابل مواخذہ، بلکہ اس کے حق میں

خطرہ ایمان ہے، اسی طرح حسد، کینہ، کبر، فریب، بدگمانی، یہ سب اعمال قلبیہ اور قابل مواخذہ ہیں، حدیث مذکورہ، کا تعلق زنا،

سرقت، غیبت، سے ہے، کہ ان کے دوسو سے جب تک عزم تک نہ پہنچے، شان رحمت ان کے معافی کا اعلان کرتی ہے۔

سورہ بقرہ کی آخری سورہ میں "لله مافی السموات ومافی الارض" اس بات کا اعلان ہے، زمین و

شرح حدیث

آسمان سب کا مالک خدا ہے، اور مالک کو اپنے مملوک میں، مکمل تصرف کا حق حاصل ہے، تو اب اس پر

یہ اعتراض نہیں ہو سکتا، کہ کیوں کسی کو بخش دیا؟ اور کسی کو پکڑ لیا؟ اسکے بعد وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوه

یحااسبکم بہ اللہ کے ذریعہ ظاہر فرمایا کہ تم اپنے قلبی خیالات ظاہر کرو یا چھپاؤ؟ اس پر مواخذہ ہوگا، اس پر صحابہ کرام کو

اشکال ہوا کہ یہ تو ظاہر تکلیف مالا یطاق ہے، وجہ اشکال یہ تھا کہ مافی انفسکم میں ماعام ہے، جو دوسو کی پانچوں قسموں کو

شامل ہے، گویا انچوں پر مواخذہ ہوگا، نیز ان پانچوں میں بعض تو غیر اختیاری ہیں، تو غیر اختیاری چیزوں پر دوسرے تکلیف مالا بطلاق ہے، بلکہ خدا غیر اختیاری چیزوں پر بھی مواخذہ کرنے لگے، تو کون ہے جو چاہے؟ اسی سوال کو لیکر، دربار رسالت میں پہنچے، اور عرض کیا تو آپ نے پہلے تنبیہ فرمائی، کہ یہود و نصاریٰ کی طرح تم بھی وہی کہنا چاہتے ہو، جو انہوں نے سمعنا و عصینا، کہہ کر ظاہر کیا تھا تمہیں تو جذبہ اطاعت میں سمعنا و اطعنا کہہ دینا چاہئے، اس کے بعد جب صحابہ نے علی الغر سمعنا و اطعنا کہا تو: رائے لو پر کی آیت لا یکلف الله نفساً الا وسعها کی آیت، نازل فرما کر مراد واضح فرمادی، گویا یہ آیت ناسخ بن گئی۔

### دونوں متضاد آیتوں کی توجیہ و تطبیق

مفسرین کی ایک بڑی جماعت کا خیال ہے، کہ ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض ہی نہیں، کہ ناسخ و منسوخ ماننے کی ضرورت پڑے، ان کے بقول ان تبدوا مافی انفسکم اپنے عمل کے لحاظ سے صحیح ہے، اور لا یکلف الله دلی آیت بھی صحیح ہے، یہ حضرات ان دونوں آیتوں کے درمیان کئی طرح تطبیق دیتے ہیں، (۱) ماکو اپنے عموم پر رکھ کر دوسرے کی پانچوں قسموں کو شامل مان لیں، البتہ بحساب کم میں، حساب بمعنی مواخذہ نہیں، بلکہ محض عرض و اظہار کے لئے جائیں بایں صورت معنی ہوگا، کہ خدا بروز قیامت تمام دوسو سو کو ظاہر کر دیا، ہاں اس پر مواخذہ نہ کرے گا، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت بعض بندوں سے حساب نہیں لے گا، اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قدامن اومتی کتابہ بیعینہ فی حساب حسبا یسیراً سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سبھی سے حساب ہوگا، تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ آیت میں حساب بمعنی عرض ہے، یعنی ان چیزوں کو محض پیش کر دیا جائے گا، تو اس طرح دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں رہ جاتا۔

(۲) ماکو اپنے عموم پر رکھا جائے اور حساب کو مواخذہ ہی کے معنی میں لیا جائے، مگر چونکہ مواخذہ کی دو صورت ہے، دنیوی، اخروی، دنیوی جیسے، بیماری، معیبت، حادثہ، اور اخروی مواخذہ صرف جہنم ہے، اب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے ہر دوسو سو پر مواخذہ ہوگا، البتہ بعض پر دنیا میں ہی، اور بعض پر آخرت میں، صحابہ کرام نے صرف اخروی مواخذہ مراد لیا اس لئے اشکال ہوا۔

(۳) لفظ ما گرچہ عام ہے، لیکن ہے خاص، اور عام خص عند البعض کی قبیل سے ہے، اس صورت میں معنی ہوگا جو برے خیالات تمہارے دل میں ہیں، اس کو عملی جامہ چاہے لوگوں کے سامنے پہناؤ، یا لوگوں سے چھپا کر، خدا بہر صورت مواخذہ کرے گا، مثلاً کسی نے دل میں کسی کے قتل کا ارادہ کیا، اب خود اعلان قتل کرے یا خفیہ دونوں صورتوں میں محاسب ہوگا، اس توجیہ میں اگرچہ فعل نفس اور فعل جوارح دونوں کو عام تھا، مگر اس کو عمل جوارح کے ساتھ خاص کر دیا، یہی ہے عام خص عند البعض۔

(۴) ما گرچہ عام، لیکن مراد خاص شہادت و گواہی ہے، شہادت مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے جو بیان آیت میں چل رہا ہے، وہ شہادت ہی ہے۔ ومن ینکتمہا فانیہ آثم قلبہ تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا، کہ قاضی کے سامنے جس شہادت کے نہ دینے کا تم نے ارادہ کیا ہے، اس ارادہ کو تم ظاہر کرو، یا چھپاؤ، اس پر مواخذہ ہوگا، مثلاً جب اولہ شہادت کا



وقت ہو تو کہد کہ میں جانتا ہی نہیں، یا جانتا تو ہوں مگر گواہی نہ دوں گا۔

(۵) مآ کا تعلق افعال نفس کیساتھ کر دیا جائے، مثلاً کینہ، حسد، عدوت، شرک، نفاق، تو مطلب یہ ہوگا، کہ افعال نفس یعنی کینہ وغیرہ ظاہر کر دیا چھپا، بہر صورت اس پر مواخذہ ہوگا، رہا معاملہ عمل جوارح کا، تو اس پر مواخذہ فعل کے بعد ہوگا۔ یہاں تک ان مفسرین کے اقوال تھے، جن کا یہ کہنا ہے کہ دونوں آیتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان میں ہر توجیہ کی صورت میں تضاد ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن ان تاویلات پر ایک شبہ یہ گذرتا ہے، کہ اگر دونوں میں کوئی تضاد نہیں، تو صحابہ کرام جو اہل لسان، اور واقف بحالہ تھے، ان حضرات کا سوال کرنا، واضح دلیل ہے، کہ انہوں نے دونوں میں تعارض سمجھا، نیز ان کے سوال کی تردید و تظلیف، حضور نے نہیں فرمائی، بلکہ محض تنبیہ فرمائی کہ سمعنا و اطعنا کہنا چاہئے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ تعارض ہے۔ (الف) اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حضور بعض مرتبہ غلطیوں کی نشاندہی فرمادیتے، اور بعض مرتبہ نہیں فرماتے، بلکہ کسی اور اسلوب میں جواب مرحمت فرماتے، لہذا یہاں بھی کہا جاسکتا ہے، کہ اگر تمہیں آیت میں تعارض بھی نظر آئے پھر بھی تم سر پا مطیع و فرمانبردار بن جاؤ تو غلطی کی نشاندہی نہ کرنے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے۔

(ب) اگر بالفرض تعارض مان کر ان تبدوا الخ کو منسوخ مانیں، اور لا یکلف اللہ کو ناخ، تو یہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ نسخ کا معاملہ انشاء کیساتھ ہوتا ہے، جب کہ یہ دونوں خبر ہے، تو آنحضور ﷺ کا غلطی کی نشاندہی نہ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ تعارض کو آپ نے تسلیم فرمایا، بلکہ آپ نے اس کو ایک مفید نسخہ بنا دیا کہ انسان کو ہمیشہ خدا کی فرمانبرداری کا جذبہ رکھنا چاہئے۔

### ”نسخ کی قسمیں“

رہا معاملہ حدیث کا، جس میں نسخها اللہ ہے، اس کا کیا مطلب؟ اس سے آیت کا منسوخ ہونا لازم آتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصولیین کے یہاں نسخ کی دو قسمیں ہیں، (۱) رفع حکم۔ (۲) دوسری قسم کسی مبہم اور مجمل چیز کو واضح کر دینا۔ (۳) حدیث میں نسخ سے مراد دوسری قسم ہے، یعنی اس کا تقاضا یہی ہے، کہ اس کا تعلق ہر چیز سے ہو مگر لا یکلف اللہ میں اللہ نے ظاہر فرمایا، کہ مواخذہ انہیں کاموں پر ہوگا، جو تمہارے اختیار میں ہیں، گویا مآ کے ایہام کو لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا سے دور کر دیا گیا، تو اس دوسرے معنی کے لحاظ سے نسخ کہا گیا ہے، اور مفسرین نے جس نسخ کا انکار کیا ہے اس سے اول نسخ مراد ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ نسخ کا ایک اور معنی عام کو خاص کر دینا مراد لیا جائے، حقدین کے یہاں یہ معنی رائج بھی ہے، تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا، جو اختیاری اور غیر اختیاری دونوں دساؤں کو شامل تھا، لا یکلف اللہ میں اس کو اختیاری کے ساتھ خاص کر دیا گیا، اور اسی کو روایت میں نسخ سے تعبیر کر لیا گیا۔ (۴)

لیکن جن لوگوں نے دونوں آیتوں کے درمیان ناخ و منسوخ تسلیم کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ ہمیں یہ تسلیم ہے، کہ نسخ انشاء میں ہوتا ہے، خبر میں نہیں، لیکن اگر کوئی کلام لفظاً خبر ہو مگر معنی انشاء ہو تو اس میں نسخ واقع ہو سکتا ہے، لہذا ان تبدوا

(۱) فوز الکبیر ص ۲۰ فصل ثانی، اتفاق ج ۲ ص ۲۰، (۲) مزید وضاحت کے لئے دیکھئے فتح الملہم ص ۲۷۷، اور مشکلات

القرآن ص ۸۵ تا ص ۹۰ مطبوعہ گنگوہ۔

الح اگرچہ خبر ہے، مگر اس کا مقصود یہ ہے کہ تم اپنے دلوں میں برے خیالات نہ آنے دو، ورنہ گرفت ہوگی، اور یہ مفہوم از قبیل نہیں ہے، جو انشاءات میں سے ہے۔ بس اس میں نسخہ جاری ہوتا قابل اشکال نہیں۔ (لہ)

### اہم فائدہ

یہ بات یاد رکھنے کی ہے، کہ قرآن کا انداز بیان فطری ہے، اور یہ فطرت انسانی ہے، کہ اپنی حاکمیت و حکمرانی ظاہر کرنے کے لئے وہ بات کہہ گذرتا ہے، جس کے کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا، جیسا کہ کوئی آقا کہے کہ یہ میرا نوکر ہے، میں اسکا آقا ہوں، میں اس کے ساتھ جو چاہوں کر سکتا ہوں، قتل بھی کر سکتا ہوں، ہاتھ پاؤں توڑ سکتا ہوں، لیکن قطعاً اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا، کہ یہ سب کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، بلکہ محض اپنی حاکمیت ظاہر کرتا ہے، اسی طرح آیت کا مقصد یہ ہے کہ خداوند قدوس فرماتے ہیں، کہ مالک کل ہونے کی وجہ سے تمہارے غیر اختیاری فعل پر بھی مواخذہ کر سکتا ہوں لیکن یہ مطلب نہیں کہ مواخذہ بھی کروں گا۔ (یہ الگ سی بات ہے، کہ غیر اختیاری فعل پر اگر مواخذہ ہوا ہے، تو وہ بڑوں کا معاملہ ہے، جیسا کہ حضرت آدم پر شجرۂ ممنوعہ کے کھانے پر) غرض خدا نے بطور اظہار حاکمیت وہ بات ارشاد فرمائی ہے، جیسا کہ بطور حاکمیت فاما الذین شقوا ففی النار لهم فیہا زفیر وشہیق واما الذین سعدوا ففی الجنة خالدین فیہا مادامت السموات والارض ماشاء ربک۔ غرض یہ احسانیکم بغرض حاکمیت ہے، ابھی جو آیت بطور استشہاد پیش کی، اس آیت میں ایک اشکال یہ ہے، کہ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ جنت میں داخلہ کے بعد کوئی اس سے نکالا نہیں جائے گا، مگر ففی الجنة خالدین فیہا، الخ میں استشہاد سے بظاہر سمجھا جاتا ہے، کہ کچھ لوگ جنت سے نکالے بھی جائیں گے، اس پر علماء سخت حیران ہیں، اور ہر شخص نے اپنی سمجھ کے مطابق تاویلیں کی ہیں، مگر عمدہ تاویل وہ ہے جس کو شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اپنے فوائد قرآن میں ذکر فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں الاما شاہ ربک میں خدا نے اپنی حاکمیت و مالکیت کو بتلایا ہے، کہ جنتی کو میں نکالنا چاہوں تو یہ میری قدرت سے باہر نہیں ہے، خلود فی الجنة کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے نکالنے کی قدرت ختم ہو گئی، یہ الگ بات ہے کہ میں نکالوں گا نہیں، جیسے کوئی بادشاہ اپنی رعیت سے کہے جب چاہوں اپنے ملک سے نکال باہر کر سکتا ہوں نکالنا مقصد نہیں ہوتا۔

❦ حدیث ❦ حدثنا سعید بن منصور..... عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ

ان الله تجاوز لامتی ما حدثت به انفسها ما لم يتكلموا او يعملوا به، (۵)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میری امت کے حق میں وہ سوا اس جو صرف ان کے دلوں میں گزریں، معاف کر دے ہیں، جب تک وہ اپنی زبان سے وہ اس کو ادا نہ کریں، یا عملی جامہ نہ پہنائیں۔

”عظائم کرمائی کہتے ہیں کہ اس روایت سے معلوم ہوا، کہ کسی چیز کے محض وجود ذہنی کا کوئی اعتبار مقصد حدیث نہیں، البتہ اگر اس کا تعلق قول سے ہو، تو تکلم کرنے پر اور اگر عمل سے ہو، تو فعل پر مواخذہ ہوگا، غرض اس کا تعلق، افعال جو ارجح سے ہے، افعال قلب سے نہیں، تفصیل پہلے گذر چکی ہے،..... اس حدیث میں ایک راوی حضرت زرارہ بن اوئی ہیں، جن کی وفات عین حالت سجدہ میں ہوئی ہے۔“م

حدثنا ابو بكر بن ابي شيبة عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ قال الله عز وجل اِذَا هُمْ عَبْدِي بِسَيِّئَةٍ فَلَا تَكْتُبُوهَا عَلَيْهِ، فَإِنْ عَمِلَهَا فَلَا تَكْتُبُوهَا سَيِّئَةً وَإِذَا هُمْ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَلَا تَكْتُبُوهَا حَسَنَةً فَإِنْ عَمِلَهَا فَلَا تَكْتُبُوهَا حَسَنَةً وَفِي رَوَايَةٍ أُخْرَى عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ إِذَا هُمْ عَبْدِي بِحَسَنَةٍ وَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبْتُهَا لَهُ حَسَنَةً فَإِنْ عَمِلَهَا كَتَبْتُهَا لَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلَى سَبْعِ مِائَةٍ ضِعْفٍ وَإِذَا هُمْ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا لَمْ أَكْتُبْهَا عَلَيْهِ فَإِنْ عَمِلَهَا كَتَبْتُهَا سَيِّئَةً وَاحِدَةً.

وَفِي رَوَايَةٍ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى إِذَا تَخَذْتُ عَبْدِي بِأَنْ يَفْعَلَ حَسَنَةً فَأَنَا أَكْتُبُهَا لَهُ حَسَنَةً مَا لَمْ يَفْعَلْ فَإِنْ عَمِلَهَا فَأَنَا أَكْتُبُهَا بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا وَإِذَا تَخَذْتُ بِأَنْ يَفْعَلَ سَيِّئَةً فَأَنَا أَغْفِرُ هَالِكًا مَا لَمْ يَفْعَلْهَا فَإِذَا عَمِلَهَا فَأَنَا أَكْتُبُهَا لَهُ بِمِثْلِهَا وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ رَبِّ ذَاكَ عَبْدُكَ يُرِيدُ أَنْ يَفْعَلَ سَيِّئَةً وَهُوَ أَبْصَرُ بِهِ فَقَالَ ارْقُبُوهُ فَإِنْ عَمِلَهَا فَلَا تَكْتُبُوهَا لَهُ بِمِثْلِهَا وَإِنْ تَزَكَّهَا فَلَا تَكْتُبُوهَا لَهُ حَسَنَةً إِنَّمَا تَزَكَّهَا مَنْ جَزَّاهُ

(مسلم ص ۷۸، مسند امام احمد ۲/ ۳۱۵)

**ترجمہ** | حضرت ابو ہریرہؓ ایک حدیث قدسی میں نقل کرتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، کہ میرا بندہ جب اپنے دل میں کسی برے کام کا خیال کرتا ہے، (تو کراما کاتبین سے کہا جاتا ہے) کہ اس کو مت لکھو پھر اگر کر لیتا ہے (تو کراما کاتبین کو حکم ہوتا ہے) ایک گناہ لکھ لو، اور جب نیک کام کا خیال کرتا ہے، تو حکم ہوتا ہے، اس کو ایک نیکی لکھ لے اور اگر کر لیتا ہے تو حکم ہوتا ہے، کہ دس نیکیاں لکھ لو..... دوسری روایت میں اتنا اضافہ ہے، کہ اگر نیک کام کر لیتا ہے تو دس سے سو گنا تک نیکیاں لکھ لیتا ہوں۔

(دوسری روایت میں اتنا اضافہ ہے) فرشتے عرض کرتے ہیں، کہ یہ تیرا بندہ برائی کرنے کا قصد کر رہا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ان سے زیادہ ہوتا ہے، ارشاد ہوتا ہے، ابھی اسے دیکھتے رہو، اگر کرے تو اس کی صرف ایک برائی لکھ لو اور اگر چھوڑ دے تو اب اس کے حق میں اسے بھی ایک نیکی لکھ لو، کہ اس نے میرے ہی خوف سے اس برائی کو چھوڑا ہے۔

### ایک نیکی پر دس گنے ثواب کی حکمت

حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے، کہ ارادہ نیکی پر ایک نیکی اور اس پر عمل پیرا ہو جائے تو دس نیکی کا ثواب ملتا ہے، صحیح مسلم میں (ص ۹۱) معراج کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایک نیکی پر دس گنا ثواب ملنے کا ضابطہ، ان خصوصی انعامات میں داخل ہے، جو معراج کی شب میں آپ پر کئے گئے تھے اس خاص کرم و احسان اور اضافہ ثواب کا مقصد یہ ہے، کہ دوسری امتوں کو جن کو بہت لمبی عمریں ملیں اور اس کو بہت کم، ان امتوں پر اسکو فائق کرنا تھا، تو اس کی صورت یہی ہو سکتی تھی، کہ اس کے قلیل عمل کے لئے اجر و ثواب کا ضابطہ بنادیا جائے، تاکہ اس نئے قانون کے تحت اسکے ٹھوڑے عمل پر بھی دوسری امت کے طویل عمل سے بڑھ جائیں۔ اس روایت کے آخری جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ معصیت کے بعد عمل نہ کرنے پر نیکی صرف اس صورت میں لکھی جاتی ہے جبکہ اس معصیت کا نہ کرنا خوف خدا پر مبنی ہو، لہذا اگر رکاوٹ کی وجہ سے معصیت کو وجود میں نہ لاسکیا کسی سہو و نسیان کی بنا پر ذہن سے نکل گیا تو اس طرح ترک معصیت پر وہ نیکی کا حقدار نہیں ہوگا۔

## نیکی یا بدی کی چار شکل

مجموعی طور پر حدیث باب میں، کسی نیک یا برے کام کے کرنے یا محض ارادہ کرنے کی چار صورتیں مذکور ہیں (۱) نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کر لے (۲) نیکی کا صرف ارادہ کیا اس پر عمل نہ کر سکا، ارادہ اور عمل کے اعتبار سے بھی بدی کی یہی دو صورت بنتی ہے، اس طرح یہ چار صورت ہو جاتی ہے پہلی صورت میں ایک نیکی، دس گنا، سات سو گنا، اور کبھی مراتب اخلاص کے اعتبار سے بے شمار ثواب ملتا ہے۔ دوسری صورت میں صرف ارادہ پر پوری ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، لیکن بدی کا یہ حکم نہیں، یہاں عمل کی صورت میں، صرف ایک بدی لکھی جاتی ہے، اور ارادہ کے بعد نہ کرنے پر، (بوجہ خوف الہی) بدی کے بجائے ایک نیکی لکھی جاتی ہے،..... حدیث میں لفظ جزائی سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں صرف خطرہ کا درجہ مراد نہیں، بلکہ ارادہ کا وہ مرتبہ مراد ہے جس کے بعد عمل کے لئے دل میں فکر پیدا ہو جائے، غرض صرف دوسرے خیال مراد نہیں، نیز ارادہ معصیت کی وہ صورت جس سے شریعت کا مذاق اڑاتا ہو، یہ تو کھلا ہوا کفر ہے، اس لئے یہ صورت اس معافی کے تحت نہیں آئے گی۔

## عزم معصیت پر مواخذہ کا معیار

غور طلب صورت یہ ہے کہ عزم معصیت کے بعد انسان خود بخود اس ارادہ میں سست پڑ جائے، عمل کی نوبت ہی نہ آ سکے، تو کیا اس کا یہ عزم بھی معصیت میں شمار ہو گا، یا جیسا کہ عمل کی حد تک پہنچائی نہیں، معاف ہو جائے گا؟ اس سلسلہ میں فقہاء متکلمین اور محدثین کا مختار قول یہ ہے کہ چونکہ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا اس لئے اس پر مواخذہ ہو گا، مگر چہ یہ مواخذہ خود اس معصیت کے مواخذہ سے ہلکا رہے گا، ابن مبارک نے سفیان ثوری سے دریافت کیا، کہ کیا آدمی کے ارادہ پر بھی مواخذہ ہوتا ہے، فرمایا ہاں جب ارادہ پختہ ہو جائے۔

حضرت امام شافعیؒ اس طرف ہیں، کہ صرف عزم پر کوئی مواخذہ نہیں جب تک کہ اس کو منہ سے نہ نکالے، یا اس پر عمل نہ کرے، یہ تمام تفصیل ان معاصی کے ارادہ کے بارے میں ہے، جن کا تعلق جوارج کے ساتھ ہے، زنا، چوری، وغیرہ گئے وہ اعمال جن کو اعمالِ قلیبہ کہتے ہیں، کفر، حسد، ان صورتوں میں صرف عزم بلکہ ہم پر بھی مواخذہ ہو گا، اس موقع پر حافظ ابن رجب حنبلی کی تفسیر، بہت دلنیز ہے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی معصیت کا پہلی مرتبہ ارادہ کرتا ہے، یعنی اس نا فرمانی کی عمر بھر میں کبھی نوبت ہی نہیں آئی تو پہلی مرتبہ عزم پر اس سے مواخذہ ہو گا، لیکن اگر کبھی اس معصیت کا ذائقہ چکھ چکا ہے، اور اب پھر اس کا عزم کر رہا ہے، تو اس کے اس عزم پر بھی مواخذہ ہونا چاہئے، کیونکہ اسے عزم کے بجائے اصرار کہا جائیگا، اسی لئے قاتل اور مقتول کے متعلق جب وعید جہنم بیان فرمائی تو سامعین نے سوال کیا کہ مقتول کا کیا قصور؟ آپ نے فرمایا انہ کان حریص علی قتل صاحبہ، لیکن یہ مطلب کہ گناہ میں دونوں برابر ہوں گے ایسا نہیں بلکہ قاتل کا جرم شدید لہذا سزا بھی شدید لیکن چونکہ مقتول بھی پورا عزم کر چکا تھا، قدم اٹھا چکا تھا اس لئے عزم کی بنا پر مستحق سزا ہوں۔

## کیا تکلیف مالا یطاق ممکن ہے

”یہاں ایک ضمنی بحث یہ سامنے آتی ہے، آیت میں مذکور جملہ ”وَلَا تَحْمِلُنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ“ واضح طور پر بتا رہا ہے، کہ ایسی چیزوں کا مکلف بنانا، ممکن ہے جس کی قدرت و طاقت نہ ہو کیونکہ قرآن کریم میں بھی، خود خداوند قدوس نے دعا سکھائی کہ اے پروردگار ہمارے اوپر ان امور کا بوجھ مت ڈال، جن کی ہم میں طاقت نہیں، ظاہر ہے، ایسی دعا اسی وقت کی جاسکتی ہے، جب کہ حق تعالیٰ مالا یطاق کا مکلف بنائے ہوں اگر اس کا مکلف نہ بنایا جاتا تو پھر یہ دعا کیوں سکھائی جاتی، لیکن دوسری طرف لَا يَكْفِيكَ اللَّهُ نَفْسًا وَلَا وَسْعَهَا اِی طرح لَا تَكْفِيكَ نَفْسًا وَلَا وَسْعَهَا سے پتہ چلتا ہے، کہ جس چیز کی قدرت نہ ہو اس کا حکم نہیں دیا جاتا، اس طرح دونوں آیتوں کے درمیان تضاد و تعارض نظر آتا ہے،

(۱) پہلی آیت یعنی رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ میں اثبات تکمیل کا ہے، جب کہ دوسری اور تیسری آیت میں تکلیف کی نفی ہے، اور تکمیل و تکلیف کے درمیان فرق ہے، ..... تکلیف و مکلف کرنے کے معنی، الزام مافیہ کلفة و مشقة کے ہیں یعنی ایسی چیز کو لازم کر دینا کہ اس میں کلفت و مشقت ہو، جیسے فرائض و واجبات کو لازم کرنا، اور تکمیل کے معنی حوادث و عوارضات اور سزاؤں کا نازل کرنا لہذا دوسری اور تیسری آیت کا مطلب یہ ہوگا، کہ ہم ایسے فرائض و واجبات لازم نہیں کرتے، جو بندے کی قدرت میں نہ ہو، اور پہلی آیت کا مطلب یہ ہوگا، کہ اے خدا ہمارے اوپر حوادث اور سزاؤں کا نازل نہ کیجئے، اگرچہ آپ کی قدرت میں ہے، غرض جس چیز کا ثبوت ہوتا ہے، اس کی دوسری آیت سے نفی نہیں ہوتی، اور دوسری آیت میں جس کی نفی ہوتی ہے، پہلی آیت میں اس کا اثبات نہیں ہوتا، بلکہ دونوں کا محمل و مصداق الگ الگ ہے، اس لئے کوئی تضاد نہیں۔

(۲) اور اگر تکمیل کو تکلیف کے معنی میں لیا جائے، تو جواب یہ ہوگا، کہ دوسری اور تیسری آیت میں تکلیف مالا یطاق کے وقوع کی نفی ہے، کہ خدا اس طرح کا حکم نازل نہیں فرماتے، اور پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ تکلیف مالا یطاق کے امکان کا اثبات ہے، یعنی اے رب، آپ اگرچہ مالا یطاق کا مکلف بنا سکتے ہیں، مگر آپ مالا یطاق کا مکلف نہ بنائیے لہذا نفی و وقوع کی ہے، اور اثبات امکان کا ہے، اس لیکوئی تعارض نہیں۔ ”م (مشکلات القرآن ص ۹۱، ۹۰)

## ایک اشکال

إِذَا هُمْ عَبْدِي بِسَبِيَّةٍ فَلَا تَكْتَبُوهَا عَلَيْهِ اس جملہ پر حافظ ابن حجرؒ نے ایک اشکال قائم کیا ہے، کہ ترمذی شریف میں یہ الفاظ حدیث ہیں۔ انما الدنيا لاربعة ..... عبد رزقه الله مالا ولم يرزقه علما فهو يعمل في ماله بغير علم، لا يتقى ربه ولا يصل فيه رحمه ولا يرى الله فيه حقاقه هذا باخبت المنازل ورجل لم يرزقه الله مالا وعلما فهو يقول لو ان لي مالا لعلمت فيه بعمل فلان فهما في الزور سواء. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معصیت کے نفس ارادہ پر بھی مواخذہ ہوگا۔

اس کا جواب خود انہوں نے یہ دیا ہے، کہ حدیث باب کا تعلق، اس صورت سے نہیں ہے، جبکہ معصیت کا محض ارادہ پیدا ہوا اس پر عزم بالجزم نہیں ہوا، بلکہ اس روایت کا تعلق اس صورت سے ہے، جب کہ ارادہ عزم بالجزم کی حد تک پہنچ چکا ہو، لہذا دونوں میں کوئی اشکال نہیں ..... حضرت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں، کہ یہاں ترمذی کی روایت سے اشکال ہی نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا تعلق عزم معصیت سے نہیں، بلکہ اسباب معصیت کے عدم حصول اور فقدان سے ہے، کہ عدم حصول پر، جبرانی

پریشانی ہونے سے ہے، اور یہ نفسانی کیفیات ہیں، جیسا کہ حسد، کینہ، وغیرہ کا معاملہ ہے، اور اس پر مواخذہ ہوتا ہے۔

## باب بیان الوسوسة فی الایمان وما یقولہ من وجدھا

(۱) حدثنی زُهَیْرُ بْنُ حَرْبٍ ..... عن ابی ہریرۃ قال: جاءَ ناسٌ من اصحاب النبی ﷺ الی النبی ﷺ فسألوه ، انا نجد فی أنفسنا ما يتعاظم أحدنا أن يتكلّم به قال أو قد وجدتموه قالوا نعم قال ذلک صریحُ الْإِيْمَانِ ..... (۲) وفی روایۃ عن عبد اللہ قال سئل عن النبی ﷺ عن الوسوسة قال تلك محضُ الْإِيْمَانِ ..... (۳) وفی روایۃ عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا يزالُ النَّاسُ يَنْسَآءُ لَوْنٌ حَتّٰی يُقَالَ هذا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهُ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ..... (۴) وفی روایۃ أُخْرٰی قالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ الشَّيْطَانُ أَخَذَكُمْ فَيَقُولُ مَنْ خَلَقَ كَذَا وَكَذَا حَتّٰی يَقُولَ لَهُ مَنْ خَلَقَ رَبُّكَ فَإِذَا بَلَغَ ذٰلِكَ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَبِهْ . (۵) وفی روایۃ أُخْرٰی عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا يَزَالُ الْوَنُّ يَسْقُلُوكَ يَا اباہریرۃ حَتّٰی يَقُولَ هذا اللّٰهُ ، فمن خَلَقَ اللّٰهُ ، قال فَبَيْنَا اَنَا فِي الْمَسْجِدِ اِذْ جَاءَ نِي نَاسٌ مِنَ الْاَعْرَابِ فَقَالُوا يَا اباہریرۃ هذا اللّٰهُ ، فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهُ قال فَآخَذَ حِصًى بِكَفِّهِ فَرَمَاهُمْ بِهِ ثُمَّ قال قُومُوا قُومُوا صدق خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم . (۵)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، کہ آنحضرت ﷺ کے چند صحابہ، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دریافت کیا کہ ہم اپنے دلوں میں ایسے خطرات محسوس کرتے ہیں، کہ زبان سے ادا کرنا پہاڑ معلوم ہوتا ہے، آپ نے جواب دیا کہ کیا تمہیں یہ ناگواری ہوتی ہے، بولے جی ہاں، آپ نے فرمایا یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے، اور ایک روایت میں ہے خالص ایمان ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت میں محض الایمان کے معنی خالص ایمان کے ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں میں باہمی سوالات کا سلسلہ قائم ہوتا ہے، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے، کہ اللہ نے ساری مخلوق کو پیدا کیا، تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ اس طرح کی بات محسوس کرے، تو کہہ دیا کرے امنت با اللہ۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، شیطان تمہارے پاس آتا ہے، اور کہتا ہے کس نے پیدا کیا، یہ چیز کس نے بنائی، یہاں تک کہ کہتا ہے کہ اچھا تمہارے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہاں تک نوبت پہنچے، تو خدا کی پناہ لینا چاہئے، اور اس کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ ختم کر دینا چاہئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ اے ابو ہریرہؓ لوگ تم سے برابر سوالات کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ یہ سوال کریں گے کہ یہ تو اللہ ہے، (جس نے مخلوق بنائی) تو اللہ کو کس نے بنایا ہے؟ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا، دفعہ ایک دیہاتی میرے پاس آیا اور بولا اے ابو ہریرہؓ یہ تو اللہ ہے، پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا؟

کیا؟ ابو سلمہ رلوی نے کہا کہ حضرت ابو ہریرہ نے اپنی مٹھی میں گنگریاں لیکر ان پر پھینکیں اور فرمایا اٹھو، اٹھو میرے پیارے رسول نے سچ فرمایا تھا۔

### مقصد حدیث

حدیث باب میں امام مسلمؒ اس بات کا سبق دینا چاہتے ہیں، کہ ایمان کی حفاظت صاحب ایمان کے لئے نہایت ضروری ہے، کیونکہ انسان کے پاس جب کوئی قیمتی سامان ہوتا ہے، تو اس کے لٹیرے بہت سارے ہوتے ہیں، اسی طرح ایمان نہایت قیمتی چیز ہے، جس کو کوٹنے کے لئے نفس اور شیطان برے وساوس پیدا کر کے، ایمان کو ختم کرنے کے درپے رہتا ہے، لہذا ان لٹیروں سے ایمان کی حفاظت نہایت ضروری ہے، حدیث باب میں امت کا لفظ ہے، اس سے مراد امت دعوت ہے، امت اجابت کے بعض وہ افراد بھی مراد ہو سکتے ہیں، جن کو جہالت یا وسوسہ کی وجہ سے، اس قسم کے شبہات پیش آجاتے ہیں، خدا نے آپ کو بتلادیا کہ آپ کی امت میں اس طرح کے لوگ پیدا ہوں گے، یہ اطلاع اس لئے دی، تاکہ آپ لوگوں کو متنبہ کر سکیں اس کے بعد آپ نے پیشینگوئی کے طور پر، جو کچھ فرمایا تھا خود صحابہ کرام کے زمانہ میں یہ پیشین گوئی پوری ہونے لگی، اور حضرت ابو ہریرہ اور دیگر حضرات سے اس طرح کے مہمل سوالات کئے جانے لگے، جیسا کہ روایت میں آ رہا ہے۔

### علاج وسوسہ

وسوسہ بلا دلیل برے خیالات کو کہتے ہیں، وسوسہ در حقیقت خود انسان کی اپنی تراشی ہوئی بات ہوتی ہے، اسی لئے وسوسہ کو کتنا ہی ختم کیجئے ختم نہیں ہوتا، اگر وسوسہ کا مخاطب دوسرا ہو، تو دلائل سے اس کا منہ بند کیا جاسکتا ہے، لیکن یہاں تو دل ہی دل میں کیے بعد دیگرے لائینی سوالات کا ایک سلسلہ کھینچتا چلا جاتا ہے، اسی لئے اللہ اور رسول اکرمؐ نے چار باتوں کا حکم فرمایا ہے، جس سے اس نادیدہ دشمن پر فتح پائی جاسکتا ہے۔

(۱) خدا کی پناہ چاہنا کیونکہ جو اس کی پناہ میں آجائے اسے پناہ مل جاتی ہے۔

(۲) دشمن کو ذلیل کرنا یعنی اس طرح کے خیالات سے بے توجہی برتنا، بلقہ دیگر جواب جاہل یا باشد خاموشی، حدیث

میں فاذا بلغ ذالك فليستعذ بالله ولينته سے یہی معلوم ہوتا ہے،

(۳) ذکر میں مشغول ہو جانا، ان الذين اتقوا اذا مسهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون

(۴) تجدید ایمان مباد و وساوس نے ایمان کو زخمی نہ کر دیا ہو، تاکہ اس کی تلاقی ہو جائے۔

علامہ مازنیؒ فرماتے ہیں وسوسہ کی دو قسم ہے، ایک یہ کہ وہ وسوسہ اس کے قلب میں جم نہ سکے بلکہ فوراً گزر جائے، تو اس کے علاج کے لئے اس کی طرف سے بے رخی اور اعراض کافی ہے لیکن اگر وساوس اپنی حد سے گزر کر دلائل کے ساتھ دل میں گھر جائے، تو پھر ان کو ختم کرنے کے لئے دلائل سے بھی مقابلہ کرنا ہوگا، کیونکہ اس کو محض وسوسہ نہیں بلکہ عقیدہ کی حد تک کہا جائے گا۔ لیکن حدیث میں جو علاج بتلایا گیا وہی دونوں قسم کے وسوسے کے علاج کیلئے کافی ہے، وسوسہ کا معاملہ ایسا ہے کہ جتنا نظر و استدلال میں پڑیں گے تو اور زیادہ وساوس پیدا ہوتے ہیں جن کا دور کرنا خیر میں محال ہوتا ہے۔

لام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں وساوس پیدا کرنے کے لئے شیطان کے داخل ہونے کے راستوں کو بتلاتے ہوئے بڑی

تفصیلی بحث کی ہے، حدیث کو سمجھنے کے لئے ان کی تفصیل کا اتنا حصہ نقل کرنا کافی ہے، کہ اس کے بہکانے کا ایک راستہ یہ ہے، کہ پہلے دماغ میں سوالات کا ایک مرتب سلسلہ قائم کرتا ہے، اور نہایت سادگی کے ساتھ اس ضمن میں ایک غلط بات ذہن نشین کر دیتا ہے، جس میں بظاہر کوئی کمزوری نظر نہیں آتی۔

### وجود باری پرستی استدلال

دیکھئے کہ یہ کتنی سیدھی اور سچی بات ہے، کہ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھیں خالق کائنات کا پتہ چلتا ہے، اس لئے یہ بات بدیہی ہو جاتی ہے، کہ جو چیز بھی ہے، اس کا کوئی خالق ضرور ہے، اس کا قاعدہ کلیہ کو حلیم کرنے کے بعد، اب یہ سوال اٹھاتا ہے، کہ جب ہر چیز کے لئے خالق ہونا مسلم ہو گیا، تو پھر خدا کے لئے کوئی خالق ہونا چاہئے، یہ دوسوہ اور سوال گرچہ سراسر غلط، اور متناقض ہے، کیونکہ اللہ کہتے ہی ہیں اس کو، جو سب کا خالق ہو، وہ کسی کا مخلوق نہ ہو مگر دوسوہ ایسے ہی باطل حقیقت کا نام ہے، اس لئے اسکی تردید کے لئے اتنا سمجھنا کافی ہے، کہ یقیناً یہ کائنات موجود ہے، اب تم اس سے کہو کہ جب خدا کے لئے خالق مانتے ہو، تو پھر خالق کے لئے بھی کوئی خالق ماننا پڑے گا، یہ سلسلہ لا الہی نہایہ جاری رہے گا، اسی کو تسلسل کہتے ہیں، اور جب تسلسل محال ہے، تو لب بٹو کہ یہ ساری کائنات کہاں سے آئی، کیونکہ غیر متناہی کا وجود ہوتا ہی نہیں، تو کہنا پڑے گا کہ کہیں نہ کہیں جا کر ضرور ختم ہوگا، اور جہاں پر ختم ہوگا، ہم اسی کو خالق کہتے ہیں محسوسات میں اس کی واضح مثال یہ ہے، کہ جیسے عبودیت کا سلسلہ حضرت آدم پر ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح خالقیت کا سلسلہ خدا پر ختم ہو جاتا ہے،

ہارون رشید کے زمانہ میں ہندوستان کے ایک بادشاہ نے سوال کیا کہ مسلمانوں کا خدا قادر ہے یا نہیں؟ تو مسلمانوں نے کہا بالکل اتنا اس نے کہا اپنے جیسا پیدا کر سکتا ہے یا نہیں؟ تو ایک لڑکے نے اس سوال کو حل کیا کہ یہ سوال ایسا ہی مہمل ہے جیسے کوئی کہے خدا کو اس پر قدرت ہے یا نہیں کہ خود کو جال و عاجز بنائے یہ سوال مہمل ہے، کیونکہ خدا تو اس ہستی کو کہتے ہیں، جس میں جہل، عجز، کاشائہ تک نہ ہو، اگر وہ جال و عاجز بن جائے، تو پھر وہ خدا ہی کیونکر رہ جائے گا، بالکل اسی طرح کہا جائے گا، کہ اگر خدا اپنے جیسوں کو پیدا کر دے، تو پھر وہ خدا ہی کیونکر رہا، خدا تو وہ ہے جس کا کوئی ہمسر نہ ہو یہ سوال ایسا ہی مہمل ہے جیسے کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملک سے نکالنے پر قادر ہے یا نہیں؟ ظاہر یہ کہ ساری کائنات خدا کی ملک ہے تو پھر جہاں بھی کسی کو نکال کر ڈالے گا، وہ اسی کا ملک ہوگا، وہ اول والآخر والظاہر والباطن، ولم یکن لہ کفو أحد، للہ مافی السموات والارض، اس قسم کی آیات میں ایسے ہی مہمل سوالات کے جواب کی طرف اشارہ ہے، غرض کائنات کا ہر ذرہ اس کے وجود کی ایک بدیہی دلیل ہے، اس طرح خدا کی ذات کا یقین میسر آ جاتا ہے، جہاں دوسوہ خود بخود فنا ہو جاتے ہیں، لام نوئی فرماتے ہیں، وجود خدا کی بہترین دلیل یہ ہے کہ کسی کا رخا نہ، بلکہ عہدہ نظام، یا خراب نظام بھی بغیر منتظم کے نہیں چلتا، پھر اتنی بڑی دنیا کا انتظام، جس میں ہزاروں عالم ہیں، پھر ان سب کا ابتدائے آفرینش سے ایک ہی نظام کے ساتھ چلنا، اور اس کے خلاف کبھی بھی نہ ہونا، اس کے وجود پر اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔





## باب وعید من اقتطع حق مسلم بيمين فاجرة بالنار

جو شخص جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مار لیوے اس کی سزا جہنم ہے

حدثنا يحيى بن ايوب ..... عن ابي أُمَامَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ فَقَدْ أَوْجَبَ اللَّهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيرًا يَأْتِيهِ قَالَ ﷺ قَالَ وَإِنْ قَضَيْتَ مِنْ أَرَاكَ (۲) وفيه رواية أخرى عن عبد الله عن رسول الله ﷺ قَالَ مَنْ خَلَفَ عَلَى يَمِينٍ صَبْرٌ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ لَقِيَ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانٌ قَالَ فَذَخَلَ الْأَشْعَثُ ابْنُ قَيْسٍ فَقَالَ مَا يُخَذُّكُمْ أَبُو عَبْدِ الرَّحْمَنِ قَالُوا كَذَا وَكَذَا ، قَالَ صدق أبو عبد الرحمن فَيَنْزِلَتْ كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَ رَجُلٍ أَرْضٌ بِالْيَمَنِ فَخَاصَمْتُهُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ هَلْ لَكَ بَيْنَهُ فَقُلْتُ لَا قَالَ فِيمَنْهُ قُلْتَ أَذِنَ يَحْلِفُ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عِنْدَ ذَلِكَ مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ لَقِيَ اللَّهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانٌ فَنَزَلَتْ أَنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أَلَى الْآيَةِ.

(۳) وفي رواية أخرى عن عبد الله قال مَنْ خَلَفَ عَلَى يَمِينٍ يَسْتَجِئُ بِهَا مَالًا هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ لَقِيَ اللَّهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانٌ ثُمَّ ذَكَرْنَاهُ حَدِيثَ الْأَعْمَشِ غَيْرَ أَنَّهُ قَالَ كَانَتْ بَيْنِي وَبَيْنَ رَجُلٍ خُصُومَةٌ فِي بَيْتٍ فَاخْتَصَمْنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ شَاهِدَاكَ أَوْ يَمِينُكَ . (۵)

حضرت ابوامامہ روایت کرتے ہیں، کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، جو شخص مسلمان کے حق کو دبا لے، قسم کے

ترجمہ | ذریعہ، اس نے اپنے کو جہنم کا حق بنالیا، اور جنت اس پر حرام ہو جائے گی، ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا، اگرچہ معمولی چیز ہو اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا، اگرچہ پیلو کے درخت کی شاخ ہی کیوں نہ ہو..... عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے، کہ جو شخص ایسی قسم پر جم جائے، جس سے کسی مسلمان کا مال بڑپ کرنا چاہتا ہے، اور وہ اس میں ناحق ہے، تو اللہ تعالیٰ سے غصہ کی حالت میں ملے گا، راوی کہتے ہیں، کہ پھر اشعث بن قیس آئے، اور انہوں نے کہا کہ ابو عبد الرحمن (کنیت عبد اللہ بن مسعود کی) تم لوگوں سے کیا بیان کر رہے تھے، تو لوگوں نے کہا فلاں فلاں بات، تو اشعث نے کہا عبد اللہ بن مسعود نے سچ فرمایا میرے ہی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی میری اور ایک شخص کی مشترک زمین یمن میں تھی، میں نے اپنا معاملہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، تو آپ نے فرمایا کیا تمہارے پاس بیٹہ ہے؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ پھر اس کی قسم پر فیصلہ ہوگا، میں نے کہا کہ وہ تو قسم کھائے گا، اس پر آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا جو ایسی جھوٹی قسم پر جم جائے، جس سے اس کا مقصد مسلمان کا مال بڑپ کرنا ہو تو اللہ سے ایسی حالت میں ملے گا، وہ اس پر غضبناک ہوگا، پھر آیت اتری، کہ جو لوگ اللہ کے عہد و ایمان کے ذریعہ توڑا مال خریدتے ہیں، الا یہ علقمہ بن وائل اپنے والد سے

(۱) حدیث (۱) مسلم ص ۸۰، نسائی ۳۶۶، ۸، مسند احمد ۲۶۰، ۵، حدیث (۳) بخاری ۲، ۹۸۷، ۶۶۷، مسلم ص ۸۰

ابوداؤد ص ۵۶۲، ۳۲۳، نسائی ۲۹۹،

روایت کرتے ہیں، ان کا بیان ہے، کہ حضر موت اور کندہ کا ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آئے حضری نے کہا یا رسول اللہ اس نے میری زمین دہلی ہے، جو میرے والد کی تھی، پھر کندی نے کہا کہ وہ میری زمین ہے، میرے قبضہ میں ہے، اس میں کھیتی کرتا ہوں اس میں کسی کا بھی کوئی حق نہیں ہے، آنحضور ﷺ نے حضری سے فرمایا کہ تمہارے پاس بیٹہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا تمہارے لئے یہی صورت ہے کہ اس سے قسم لے لو حضری نے کہا یا رسول اللہ یہ فاجر انسان کسی ناجائز چیز سے بالکل پرہیز نہیں کرتا، اور جھوٹی قسم کی پرولہ نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے اسکے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے، کندی قسم کھانے کے لئے چلا، جب انہوں نے رخ پھیرا تو آنحضور ﷺ نے فرمایا سن لو اگر اس نے ناحق مال ہضم کرنے کے لئے قسم کھائی، تو اللہ تعالیٰ سے اسکی حالت میں ملے گا، کہ حق تعالیٰ اس سے اپنا رخ پھیر لے گا۔

## تشریح

اس باب کا تعلق حقوق العباد سے ہے، جس طرح مسلمان کے لئے حقوق اللہ کی رعایت ضروری ہے، اور اس میں کوتاہی کرنے سے ایمان میں نقصان پیدا ہوتا ہے، اور پھر اس کی حلانی کے لئے توبہ کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی طرح اسلام میں حقوق العباد بھی ایک انجز ہے، اس کی حفاظت لازمی ہے، اگر کسی بندہ کا حق دہالے تو اس کے ایمان میں نقص پیدا ہو جائے گا، اور اس سے توبہ کرنا ضروری ہوگا، اور یہاں توبہ کی نوعیت یہ ہے، کہ جس کا مال لیا گیا ہے، اس کو مال لوٹانا ہوگا، اگر مالک نہ ہو تو اس کے ورثہ کو دینا ہوگا، اور اگر اس کا پتہ نہ ملے تو پھر غرباء و مساکین پر تقسیم کرنا ہوگا، یہاں حق عام ہے، خواہ مال ہو یا غیر مال، مال جیسے کسی کی زمین جھوٹی قسم کھا کر دہالے یا غیر مال، جیسے کسی کے مردار چیزے کو دہالے یا کسی پر جہت لگا دے یا حق شفعہ یا حق شرب یا بیوی کے حقوق دہالے۔

قوله 'مسلم'۔ مسلم کی قید میں ذی بھی داخل ہے، کیونکہ ان سے ہمارا عقد ذمہ ہو چکا ہے، اور اس کی وجہ سے ان کا مال مسلمانوں کے مال کی طرح محفوظ ہو چکا ہے، لقوله عليه السلام دما ثمهم كدما ثنا و اموالهم كما موالنا۔ تواب مقصد یہ ہوا کہ مسلمان اور جو مسلمانوں کے ذمہ میں ہیں، معاملات میں مسلمانوں کے حکم میں ہیں، اہل بیت جو کافر، حربی ہے وہ اس حکم سے خارج ہے، مسلم کی قید مزید قباح و شاعت کو ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے، جیسے لا تاكلوا الربوا اضعافا مضاعفة میں سود در سود کی قید اسی مقصد کے لئے ہے، کہ سود کھانا بری چیز ہے اور سود در سود تو اور بھی بری چیز ہے، یا جیسا کہ يقتلون النبیین بغیر حق میں بغیر حق کا مقصد یہ ہے، کہ انبیاء کو قتل کرنا بڑے گناہ کا کام ہے، اور ناحق قتل کرنا تو انتہائی گناہ کا کام ہے، اسی طرح یہاں مسلم کی قید ہے، کہ جب کافر ذی کمال دہالینا بری بات ہے، تو پھر مسلمان کا مال دہالینا، کتنی بری بات ہوگی۔

حرم الله عليه الجنة اس سے پہلے توفیق اوجب الله له النار کہہ دیا گیا، کہ اس کے لئے جہنم واجب ہو چکی تو پھر حرم الله عليه الجنة کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ علامہ طحطاوی فرماتے ہیں کہ پہلے جملے سے جہنم میں دائمی طور پر رہنا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ مطلقاً جہنم میں جانا معلوم ہوتا ہے، اب اس جملہ نے یہ بتادیا کہ جب جنت اس پر حرام ہو گئی، تو گویا دائمی طور پر اس میں رہے گا، اس لئے حرم الله کہا گیا۔

اگر حرم الله عليه الجنة کا مطلب یہ ہے، کہ جنت میں جانے کا مستحق نہیں، تو تضاد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے، کہ پھر جنت میں داخل ہو جائے گا، گویا ایک قسم کا تعارض ہے، اسکے چند جواب ہیں،

(۱) یہ جملہ اپنی حقیقت پر معمول ہے، کہ واقعہ جنت اس پر حرام ہو جائے گی، لیکن اس کے لئے جو اس حرام کو حلال سمجھ کر کرے، کیونکہ حرام کو حلال سمجھنے والا کافر ہو جاتا ہے، (۲) اس عمل کی وجہ سے جہنم کا مستحق تو ہو چکا ہے، غفور گذر کا احتمال ہے، تاہم ابتدائے جنت حرام ہے، تو گویا صالحین کے ساتھ ابتداً جنت میں نہیں جائے گا۔

وان قضیب من اراک: علامہ نوویؒ یہ فرماتے ہیں، کہ مسواک کی لکڑی کہہ کر یہ بتلاتا ہے، کہ حرمت میں قلیل و کثیر برابر ہے، ایسا نہیں کہ مال قلیل ہو، تو اس کا غضب حرام نہیں، یہاں حرمت کی شدت میں فرق ضرور ہے۔

علی یمین صبر: اضافت کیساتھ ہے یمین یعنی جم جانا قسم کھانے پر یا قسم کھائے حاکم کے حکم سے وهو علیہ غضبان، اللہ تعالیٰ اس سے رخ پھیرے گا، اور لطف و کرم کی نگاہ نہیں ڈالے گا، غضبان مبالغہ کا صیغہ ہے، مراد اس سے انتقام اور بدلہ لینے کے ہیں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ پر غضبان کا اطلاق کیا جائے، تو تعاقب غضب یعنی انتقام کے معنی پر معمول ہو گا۔

فدخل الاشعث بن قیس: کنیت ان کی ابو محمد تھی، کندہ کے وفد میں شامل ہو کر، آنحضور ﷺ کے پاس آئے تھے زمانہ جاہلیت میں سردار مانے جاتے تھے اور مسلمانوں میں بھی باوقار تھے، بعد میں مرتد ہو گئے تھے، اور پھر خلافت ابو بکرؓ میں دوبارہ مسلمان ہوئے، کوفہ میں ان کا انتقال ہوا اور حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ۴۰ میں وفات ہوئی، امام شافعیؒ کے مسلک کی رو سے صحابی تھے اور ارتداد کی وجہ سے صحابیت ختم ہو جانے کی وجہ سے احناف کے یہاں تابعی کہلائے جاتے ہیں۔

ارض باليمن: دوسری روایت میں ہے کہ جھگڑا، ایک کنویں کے بارے میں تھا، تطبیق کی صورت یہ ہوگی، کہ خصومت کنویں کی زمین کے متعلق تھی، اور اسی میں کنواں بھی شامل تھا، پوری زمین کے بارے میں خصومت نہیں تھی۔

فنزلت ان الذین یشترون:- حافظ ابن حجرؒ نے لکھا، یکہ آل عمران کی تفسیر میں یہ بات بتائی گئی ہے، کہ اس آیت کا نزول عصر کے بعد، جموئی قسم کھانے کے وعید میں نازل ہوئی ہے، تطبیق کی صورت یہ ہے، کہ ممکن ہے دونوں کے متعلق ساتھ ساتھ نازل ہوئی۔ علامہ کرمائی کی تحقیق یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ابن ابی لویٰ کو یہ آیت زمین کے جھگڑے کے موقع پر معلوم ہوئی ہو، اس لئے انہوں نے سمجھا کہ اسی موقع پر اتری۔

اور ایسا بھی ممکن ہے کہ دونوں واقعہ ایک ساتھ پیش آئے ہوں اور دونوں کے بارے میں یہ آیت اتری، آیت کے عمومی الفاظ میں یہ دونوں اور اس طرح کی تمام باتیں شامل ہیں۔

بعہد اللہ: اللہ تعالیٰ کا وہ عہد جو نبی آدم سے امانت کی الوداعی اور ترک خیانت پر لیا گیا، شاهدک او یمینہ: اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مدعی سے صرف شاہد اور مدعی علیہ سے صرف یمین کا مطالبہ ہو گا، مدعی سے شہادت اور قسم دونوں نہیں لی جائے گی۔

لقى اللہ وهو علیہ غضبان: یہ اس صورت میں ہے، جب کہ توبہ کئے بغیر مر جائے، اور اہل سنت کے یہاں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جس کو اللہ تعالیٰ عذاب دینا چاہیں۔

عن علقمة بن وائل: حدیث کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں مذکورہ قصہ کے علاوہ دوسرے واقعہ ہے، اور مغازت پر عبدالملک بن عمیر والی روایت واضح دلیل ہے۔

حضرت موت ضاد ساکن کے ساتھ یمن کے ایک مقام کا نام ہے، کندہ، ابو قبیلہ من الیمن لیس لك منه الاذالك۔ اس سے معلوم ہوا کہ فاجرو فاسق کے قسم سے بھی مدعی کا دعویٰ ختم ہو جائے گا، نور فتنہ و فجور کی وجہ سے اس کو معاملات سے روکا نہیں جائے گا، اور نہ اس سے اس کا اقرار باطل ہوگا، ورنہ تو پھر قسم لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔

## باب الدلیل علی ان من قصد اخذ مال غیرہ بغیر حق کان القاصد مہدر الدم فی حقہ وان قتل کان فی النار وان من قتل دون ماله فهو شهید

جو شخص دوسرے کا مال ناحق چھیننا چاہے، تو اس کا خون اس کے حق میں لغو ہو جائے گا، اور مارا جائے تو جہنم میں جائیگا، اور مالا مال لالچانے میں مارا جائے تو شہید ہوگا۔

حدثني ابو كريب محمد بن العلاء عن ابي هريرة قال جاء رجل الى النبي ﷺ فقال يا رسول الله ارأيت ان جاء رجل يريد اخذ مالي قال فلا تعطه مالك قال ارأيت ان قاتلتني قال قاتله قال ارأيت ان قاتلتني قال فانت شهيد قال ارأيت ان قتلته قال هو في النار (۲) اخبرني سليمان الاحول ان ثابتاً مولی عمر بن عبد الرحمن أخبره أنه لملكان بين عبد الله ابن عمر، وثيق غنبة بن ابي سفيان، ملكان تيسروا للقتال فركب خالد بن العاص الى عبد الله بن عمرو فوقعه خالد فقال عبد الله بن عمرو انا غلصت ان رسول الله ﷺ قال من قتل دون ماله فهو شهيد. (۵)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ ایک شخص آنحضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا یا رسول اللہ یہ بتادیں کہ اگر کوئی شخص میرا مال لینے کے ارادہ سے آئے (تو میں کیا کروں) آپ ﷺ نے فرمایا اس کو اپنا مال مت دینا، انہوں نے کہا، آپ یہ بھی بتادیں کہ اگر وہ شخص مجھ سے لڑائی کرنے لگے تو؟ آپ نے فرمایا اس سے لڑائی کرو، انہوں نے کہا آپ بتائیں کہ وہ اگر مجھے مار ڈالے تو؟ آپ نے فرمایا تو شہید ہوگا، انہوں نے کہا یہ بتائیں کہ اگر میں اس کو مار ڈالوں تو؟ آپ نے فرمایا وہ جہنمی ہوگا۔

جب عبد اللہ بن عمرو اور غنصہ بن ابی سفیان کے درمیان لڑائی کی تیاری شروع ہوئی، تو خالد بن عاص عبد اللہ بن عمرو کے پاس بذریعہ سواری تشریف لے گئے، اور ان کو سمجھایا حضرت خالد نے، تو عبد اللہ بن عمرو نے فرمایا کہ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جو مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

حدیث باب کا حاصل یہ ہے کہ کسی کا ناحق مال ڈبا لینے سے ایمان میں نقصان آ جاتا ہے، اور اس میں دوسرا پہلو، اپنے مال کی حفاظت یہ کمال ایمان میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا مال ہڑپ کرنا چاہے، تو مالک کو چاہیے کہ اس سے مزاحمت کرے، اگر اس مزاحمت میں اس کی جان چلی جائے تو وہ شہید کہلائے گا، یہ شہید اخروی ہے۔

## شہید کے اقسام

شہید کی تین قسمیں ہیں، پہلا وہ شخص جو اعلا کلمۃ اللہ کے لئے میدان جنگ میں کافروں سے لڑے، اور لڑتے ہوئے وہ مارا جائے، تو یہ شخص ثواب اخروی اور احکام دنیوی کے لحاظ سے شہید ہے، بغیر غسل دیئے دفن کر دیا جائے گا، دوسرا وہ شخص جو ثواب کے اعتبار سے شہید ہے، دنیوی احکام کے لحاظ سے وہ شہید نہیں ہے، جیسے نفساء حاملہ نفاس میں مر جائے، کوئی طاعون کی بیماری میں مر جائے، کوئی دیوار میں دب کر مر جائے، اسی طرح جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے، تیسرا وہ شخص جو غنیمت میں خیانت کرے، اور کافروں کے ہاتھ سے میدان جنگ میں مارا جائے، دنیا میں یہ شہید ہے، لیکن آخرت میں پورے پورے ثواب کا مستحق نہیں ہوگا۔

دونوں اصل میں ظرف مکان ہے، تخت کے معنی میں ہے، اور مجازاً نسبت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جو شخص مال کی حفاظت کے لئے لڑائی کرتا ہے، اس کو عموماً اپنے نیچے ڈال دیتا ہے۔

## کیا چور کو قتل کرنا جائز ہے؟

جمہور کا قول یہ ہے، کہ ناحق طریقہ پر مال لینے والے سے قتال جائز ہے، خواہ مال کثیر ہو یا لکھل ہو، بہت سے علماء چوروں سے قتال اور اپنے مال و جان سے نقصان دور کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنے گھر میں ایک چور کو پکڑا اور اس پر تلوار سے حملہ کیا حضرت سالم کہتے ہیں، کہ اگر میں نہ ہوتا، تو میرے والد چور کو مار ہی ڈالتے، ابراہیم خفی فرماتے ہیں کہ اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ چور تم پر حملہ کرنے میں پیش قدمی کرے گا، تو تم پیش قدمی کر دو۔

امام مالکؒ سے مسافروں کے بارے میں دریافت کیا گیا، کہ اگر دور الہا سفر ان کو چوروں سے سابقہ ہو جائے تو کیا کرے تو فرمایا کہ اس سے لڑائی کرے، اگرچہ تھوڑا مال ہی کیوں نہ ہو۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چور گھر سے چوری کر کے نکلے اور اس کا پیچھا کر کے مار ڈالے تو مارنے والے پر کچھ نہیں ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں، کہ چور مال لینے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے ایک راستہ یہ ہے، کہ چور سے فریاد کرے۔ اگر اس کی وجہ سے رک گیا، تو اب اس کو قتل و قتال کی اجازت نہیں ہوگی، اور اگر فریاد کرنے پر باز نہ آئے، اور لڑا اور چور کو مار ڈالا، تو قصاص دیتے، کفارہ میں سے کچھ بھی اس پر نہیں ہوگا، البتہ علماء اس کی تصریح کرتے ہیں، کہ اس سے سلطان مستثنیٰ ہے، کیونکہ بہت سی حدیثوں میں اس کے مظالم پر صبر کرنے کی تاکید آئی ہوئی ہے، قولہ کان بین عبد اللہ عمرو بن

حضرت معاویہ کے ایک عامل نے پانی کا چشمہ کھودنا چاہا، تاکہ زمین سیراب کر سکیں تو کھودتے ہوئے عمرو بن عاص کے رشتہ دار کی دیوار سے قریب پہنچا تو عامل دیوار سے نالی بنانا چاہا یہ دیکھ کر عبداللہ بن عمر اور ان کے غلام ہتھیار لیکر آئے، اور کہا کہ جب تک ہم لوگ زندہ ہیں، اپنی دیوار سے نالی نکالنے نہیں دیں گے، عامل کا نام عنبسہ بن ابی سفیان تھا، مکہ، طائف اور مذکورہ زمین کے عامل تھے اپنے بھائی حضرت معاویہ کی طرف سے، عبداللہ بن عمرو نے دیوار کے نقصان کی وجہ سے رد کا تھا اور اس کا ان کو حق حاصل تھا۔

## باب استحقاق انوالی الغاش لرعيته النار

حدثنا شَيْبَانُ ..... عن الحسن قال عَادَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ زِيَادٍ مَعْقِلُ بْنُ يَسَارٍ الْكُزَنِيُّ فِي مَرَضِهِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ ، فَقَالَ مَعْقِلُ إِنِّي مُخَلِّتُكَ حَدِيثًا سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ لَوْ عَلِمْتُ أَنَّ لِي حَيَاةً مَخَلِّتُكَ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَّةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ .

وفي رواية قالَ أَلَا كُنْتُ حَدَّثْتَنِي بِهَذَا قَبْلَ الْيَوْمِ قَالَ مَا حَدَّثْتُكَ أَوْلَمَ أَكُنْ لِأَخِيكَ وَفِي روايةٍ أُخْرَى سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَا مِنْ أَمِيرٍ يَكِلِي أَمْرَ الْمُسْلِمِينَ ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ وَيَنْصَحُ إِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ (بخاری ص ۱۰۵۸ ، ۷۱۵۰ مسلم ص ۸۱ سند امام احمد ۲۵۰۵)

ترجمہ: حضرت حسن سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا، عبید اللہ بن زیاد نے، معقل بن یسار مزی کی عیادت کی، اس کے مرض الموت میں، تو معقل نے فرمایا، میں آپ کے سامنے آنحضور ﷺ سے سنی ہوئی ایسی حدیث بیان کروں گا، کہ اگر مجھے زندگی کی توقع ہوتی تو میں آپ سے وہ حدیث بیان نہیں کرتا، میں نے آنحضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے، کہ جس بندہ کو اللہ تعالیٰ رعایا کا نگران بنادے اور وہ اس کی خیر خواہی نہ کرے، تو جس دن مرے گا اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دے گا، دوسری روایت میں اس کے بعد یہ ہے، عبید اللہ بن زیاد نے کہا آپ نے آج سے پہلے یہ حدیث کیوں نہیں بیان کی؟ تو معقل نے فرمایا میں نے (مصلحت کی وجہ سے) بیان نہیں کیا یا فرمایا میں آپ سے بیان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا جو شخص مسلمانوں کے امور کا ذمہ دار بن جائے پھر اس کے لئے جدوجہد اور خیر خواہی نہ کرے تو وہ شخص مسلمانوں کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

مقصد:- مقصد اس حدیث کا یہ ہے کہ ظلم و جور و ایمان میں نقص پیدا کر دیتا ہے، خواہ بادشاہی کیوں نہ ہو، جیسے عدل و انصاف سے کمال آتا ہے۔

شرح حدیث: عبید اللہ بن زیاد حضرت امیر معاویہؓ اور یزید کی جانب سے بصرہ کے امیر تھے، معقل بن یسار مشہور صحابی تھے، بصرہ میں سکونت اختیار کر لیا تھا اور وہاں ایک نہر تعمیر کیا، انہیں کی طرف نہر معقل کی نسبت ہے۔ جو بصرہ میں نہر ہے، بیعت الرضوان میں موجود تھے، بصرہ میں ساٹھ ستر سال کی عمر میں حضرت امیر معاویہ کی خلافت میں وفات ہوئی۔

قوله لو علمت ان لی حیاة الخ: حسن بصری نے خود اس کی وجہ بیان کی ہے، کہ عبید اللہ سفاک یعنی حجاج کی طرح خون ریز تھے، حسن بصری کا بیان ہے، کہ بصرہ کے لئے عبید اللہ بن زیاد کو امیر معاویہ نے امیر بنا کر بھیجا، جو بیوقوف اور سفاک تھے، اور ہمارے درمیان عبد اللہ بن معقل موجود تھے، ایک دن عبید اللہ حضرت معقل کی خدمت میں آئے تو حضرت معقل نے فرمایا عبید اللہ اپنی ناشائستہ حرکت سے باز آ جاؤ، تو عبید اللہ نے کہا آپ کو اس سے کیا مطلب یہ کہہ کر حضرت معقل مسجد میں تشریف لائے، تو ہم لوگوں نے کہا آپ نے عبید اللہ کو برسرِ عام اس قسم کی بات جو کہی اس کا کیا مقصد؟ تو

حضرت معقل نے فرمایا کہ میرے پاس ایک حدیث ہے، میں نے چاہا کہ موت سے قبل اعلانیہ اس کو کہہ دوں۔

زمانہ صحت میں بیان نہ کرنے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے، کہ کہیں ایمان نہ ہو کہ اس حدیث سے ایک فساد پھیلے، لوگ عبید اللہ کو برا جان کر اسی کی اطاعت سے پھر جائیں، یا کہیں ایمان نہ ہو کہ مجھے ایذا پہنچا دے، کیونکہ جس نے اہل بیت کی حرمت نہیں کی، تو دوسری کسی کو اس سے کیا توقع؟

قاضی عیاض کا خیال ہے، کہ معقل بن یسار کو اس سے پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ عبید اللہ کے لئے وعظ نفع بخش نہ ہوگا، اس کے باوجود کتمان علم کے خوف سے اس کے رو برو حدیث بیان کر دیا، تاکہ فریضہ تبلیغ سے سبکدوشی ہو جائے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ معقل کو عبید اللہ کی گرفت کا اندیشہ ہوا موت کے وقت اس لئے کہہ دیا کہ ممکن ہے اس کی وجہ مسلمانوں کی ایذا رسانی میں کچھ کمی آجائے۔

يَسْتَرِعِيَةُ اللّٰهُ رَعِيَةُ الْخ : یعنی خدا نے اس کو قوم کا ذمہ دار بنایا تھا فہو غاش ۔ یعنی خدا نے یہ ذمہ داری دی تاکہ قوم کے ساتھ نصیح و خیر خواہی کرے، تو اس نے اس کو پلٹ دیا، لہذا اس کی عاقبت بھی پلٹ جائے گی، جیسا کہ الاحرام اللہ علیہ الجنۃ کی وعید سے معلوم ہوتا ہے، اس وعید کی بھی وہی توجیہ ہے، جو بار بار گذر چکی ہے۔

## باب رفع الامانة والايمان من بعض القلوب و عرض الفتن على القلوب

بعض دلوں سے لمانت اٹھ جانے کا بیان اور فتنوں کا دلوں میں آنا

حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة ..... عن حذيفة قال ثنا رسول الله ﷺ حَدِيثَيْنِ قَدَرَايْتُ أَحَدَهُمَا وَأَنَا أَنْتَظِرُ الْآخَرَ، حَدَّثَنَا أَنَّ الْأَمَانَةَ نَزَلَتْ فِي جَزْرِ قُلُوبِ الرِّجَالِ ثُمَّ نَزَلَ الْقُرْآنُ فَعَلِمُوا مِنَ الْقُرْآنِ وَعَلِمُوا مِنَ السَّنَةِ ثُمَّ حَدَّثَنَا عَنْ رَفْعِ الْأَمَانَةِ قَالَ يَنَامُ الرَّجُلُ النَّوْمَةَ فَتَقْبِضُ الْأَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهِ فَيَبْطِلُ أَثَرُهَا وَمِثْلُ الْوَكَيْتِ، ثُمَّ يَنَامُ النَّوْمَةَ فَتَقْبِضُ الْأَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهِ فَيَبْطِلُ أَثَرُهَا مِثْلَ الْمَجَلِ كَجَمْرِ تَخْرُجَتْهُ عَلَى رَجُلِكَ فَتَقْطَعُ فَتَرَاهُ مُنْتَبِراً وَلَيْسَ فِيهِ شَيْءٌ ثُمَّ أَخَذَ حَصَى فَدَخَرَجَهُ عَلَى رَجُلِهِ فَيَصْبِغُ النَّاسُ يَتَّبِعُونَ لَا يَكَاذُ أَحَدٌ يُؤَدِّي الْأَمَانَةَ حَتَّى يُقَالَ إِنَّ فِي بَنِي فُلَانٍ رَجُلًا أَمِينًا حَتَّى يَقَالَ لِلرَّجُلِ مَا أَجْلَدَهُ مَا أَظْرَفَهُ مَا أَغْلَقَهُ وَمَا فِي قَلْبِهِ مِنْ ثِقَالٍ حَبَّةٍ مِنْ خَزْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ وَلَقَدْ أَتَى عَلَى زَمَانٍ وَمَا أَهْلِي أَيْكُمْ بَاتِيْعٌ لِّئِنْ كَانَ مُسْلِمًا لَيَرْدُنَّهُ عَلَى دِينِهِ وَإِنْ كَانَ نَصْرَانِيًّا أَوْ يَهُودِيًّا لَيَرْدُنَّهُ عَلَى سَاعِيَةِ وَأَمَّا الْيَوْمَ فَمَا كُنْتُ لِأَتْبِعُ مِنْكُمْ إِلَّا فُلَانًا وَفُلَانًا.

حضرت حذیفہ سے روایت ہے، کہ آنحضور ﷺ نے ہم لوگوں کو دو باتیں سنائی، ان میں ایک تو اپنی

ترجمہ آکھوں سے دیکھ چکا ہوں، اور دوسرے کا انتظار ہے، ہم لوگوں سے بیان فرمایا کہ لمانت اللہ والوں کے دلوں میں

اماری مٹی، پھر قرآن کا نزول ہوا اور قرآنی مضامین کا یقین کر لیا، اور احادیث کو بھی جانتا پھر آپ نے ہم سے لمانت اٹھ جانے کے بارے میں بیان فرمایا، فرمایا کہ انسان سوئے گا، اور ان کے دلوں سے لمانت قبض کر لی جائے گی، اور صرف اس کا ہلکا سا نشان رہ جائے گا، پھر سوئے گا تو لمانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی، اور اس کا نشان چھالہ کی طرح رہ جائے گا، جیسے چنگاری کو اپنے پاؤں پر پھرد تو آبلہ ہو کر ابھر اہو اد کھائی دیتا ہے، اور اس میں کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی، پھر آپ نے ایک ننگری لیکر اپنے پاؤں پر لڑھکایا، لوگ آپس میں ملامت کریں گے، اور کوئی لمانت ہوا کرنے کا خیال بھی نہیں کریگا، یہاں تک ایک دنیا ہو جس کو مال کمانے میں، مہارت ہوگی، اس کے بارے میں عام طور پر مشہور ہوگا، کہ فلاں قبیلہ میں ایک لمانت دار شخص ہے، اور اس کے بارے میں کہا جائے گا، کہ وہ کتنا ہوشیار کتنا سمجھدار ہے؟ حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا، (حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ) مجھ پر ایک ایسا دور آیا کہ بے کھٹک لوگوں سے بیچ و شرہ کرنا تھا، اگر مسلمان ہوتا، تو اس کا دین لمانت ہوا کرتے پر اس کو مجبور کرتا، اور اگر نصرانی اور یہودی ہوتا، تو اس کا دلی اس کو لوہا کرنے پر آمادہ کرتا، اور آج کل کا حال یہ ہے کہ میں تم لوگوں میں سے سوئے فلاں اور فلاں کے کسی سے معاملہ نہیں کرتا۔

### مقصد حدیث

زمانہ رسالت سے جس کو جتنا قرب ہوگا، اتنا ہی اس کا ایمان پختہ ہوگا، اور عہد رسالت سے جتنی دوری ہوگی، ایمان میں کمزوری بڑھتی جائے گی، یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا، کہ لوگوں کے دلوں سے ایمان اٹھالیا جائے گا، اور بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک آئے گی، کہ روئے زمین پر اللہ اللہ کہنے والا بھی کوئی باقی نہ رہے گا، اور قیامت آجائے گی۔

حدیث جبرئیل میں کمال ایمان کا تذکرہ تھا، جس کو احسان سے تعبیر کیا گیا تھا، اور قاعدہ ہے ”ہر کمالے رازوال“ جب آیت الیوم اکملت لکم دینکم الخ کا نزول ہوا، تو عام صحابہ اس بشارت سے خوش تھے، مگر حضرت عمر فاروقؓ مفہوم تھے، لوگوں نے دریافت کیا، تو فرمایا کہ کمال کے بعد زوال آنا فطری بات ہے، جب کھیتی حید ہو جاتی ہے، تو کاٹی جاتی ہے، شباب اور جوانی کمال پر پہنچ جاتا ہے، تو بڑھ چلا آ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ احسان کے سوال کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے قیامت کا سوال کیا تھا، اس قسم کی حدیث کا مقصد یہ ہے، کہ جب تک زمانہ میں خیر ہے، اس سے خوب فائدہ اٹھانا چاہئے، مستقبل کے لئے ہرگز چھوڑنا نہیں چاہئے، نہیں معلوم کب؟ شر کا دور دورہ ہو، اور پھر نیک کام کرنا مشکل ہو جائے، امام مسلم یہاں سے دور انحطاط اور اس کے اسباب پر تفصیلی کلام کر رہے ہیں۔

### امانت سے مراد کیا ہے؟

(۱) امانت اس کی تفصیل بعض لوگ تکلیف سے کرتے ہیں، جس کا مکلف انسانوں کو بنایا گیا ہے، یعنی فطرۃ سلیمہ (۲) بعض لوگوں نے عین ایمان مراد لیا ہے، جس کا تذکرہ انا عرضنا الامانة الخ میں کیا گیا ہے، جب انسانی قلوب میں لمانت مضبوطی سے جم جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی، پابندی کے ساتھ ہوا کرنے لگتا ہے، اور خدائی احکامات کو نفیست سمجھ کر پوری جدوجہد کے ساتھ تعمیل میں لگ جاتا ہے، (۳) اور لمانت سے فطری صلاحیت بھی مراد لے سکتے ہیں، اس کو ایمان شرعی کے لئے بمنزلہ حم (ہج) سمجھنا چاہئے، جو دل کی زمین میں ڈالا جاتا ہے، اور قرآن و حدیث بمنزلہ ہارش کے ہے،



جب عمدہ زمین پر بارش ہوتی ہے، تو اس سے درخت پیدا ہوتا ہے، اور خراب زمین میں تخم بھی ضائع ہو جاتی ہے، یہی حال مسلمان اور کافر کا ہے، (۴) امانت سے مراد اس کا مشہور معنی بھی ہو سکتا ہے، یعنی کسی کے حق میں یا کسی کی ملکیت میں خیانت کرنا۔ (۵) علامہ عثمانی کہتے ہیں، کہ امانت سے، ایمان و ہدایت کی نجات مراد ہے، جو کہ قلوب مومنین پر من جانب اللہ بکھیرا گیا ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے، کہ یہ تمام اقوال ایک دوسرے کے معارض و متضاد نہیں، بلکہ غرض کے اعتبار سے متفق ہیں، کیونکہ تمام اقوال سے مقصد مکلف ہونا اور تمام ادا و ادائیگی کو اپنے شرائط کے ساتھ قبول کرنا ہے، حضرت مولانا اور یس صاحب کا مذہبی فرماتے ہیں کہ امانت جو مخلوق کے متعلق ہے۔ وہ تو ظاہر ہے، باقی امانت مع اللہ تو اس سے مراد وہ احکامات ہیں، جن کا مکلف بنایا گیا ہے، اس کو بھی امانت سے تعبیر فرمایا، اس میں مقصد یہ ہے، کہ وہ احکامات جن کا مکلف بنایا گیا ہے، وہ لازم الوجود ہیں، اور امانت لازم الاداء۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے تنظیم الاشارات ج ۱ ص ۷۰

قوله فی جذر قلوب الرجال الخ: جیم کا فتح اور کسر دونوں طرح ہے، اصل کے معنی میں ہے، یعنی امانت سب سے پہلے اللہ والوں کے دل پر اترتی ہے، اور یہی کتاب و سنت پر مضبوطی کے ساتھ عمل پر آمادہ کرتی ہے۔  
قوله ثم نزل القرآن الخ: یعنی کتاب و سنت کی تعلیم فطرت سلسلہ کے مطابق ہوتی ہے، اس لئے اس کو فطری طور پر قبول کر لیتا ہے۔

قوله ينال الرجل النومة الخ: نوم سے یا تو نیند مراد ہے، یا غفلت جس کی وجہ سے گناہوں کا صدور ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں ایمان و امانت میں نقصان آ جاتا ہے۔ وکتب لکنا نشان، جیسے نقطہ اس درجہ کو کہتے ہیں، جو کسی شے کی مخالف رنگ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ جیسے سیاہ نقطہ، مجمل میم مفتوح اور جیم ساکن اور جیم کو فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، چھالہ جو چکی پیسنے یا کدال چلانے کی وجہ سے ہاتھ میں ہو جاتا ہے، اور اس میں کچھ پانی بھی آ جاتا ہے، منبر، انبر سے ماخوذ ہے، پھولنے کے معنی ہیں، اصل معنی بلندی کے ہیں، اسی سے منبر آتا ہے بلند جگہ کو کہا جاتا ہے، مقصد یہ ہے کہ آخر کی زمانہ میں لوگوں کے بارے میں خیال کیا جائے گا، کہ وہ امانت دار ہے، حالانکہ اس میں کوئی اچھائی نہیں ہوگی، جیسے آبلہ ابھرا ہوا ہوتا ہے، اور اس کے نیچے سوائے غلیظ پانی کے کچھ نہیں ہوتا، امانت دھیرے دھیرے اٹھائی جائے گی، جب کوئی حصہ زائل ہوگا تو اس کا نور ختم ہو کر اس کی جگہ ظلمت آ جائے گی، جیسے سیاہ نقطہ اور جب کچھ حصہ زائل ہوگا تو وہ آبلہ کی طرح ہوگا، جس طرح آبلہ مدت دراز تک رہ جاتا ہے، اسی طرح ظلمت کے آثار مضبوط ہو جائیں گے، نور کے ازالہ کو پھر تشبیہ دی گئی، اس چنگاری سے جو پاؤں پر لڑھک جائے، اور اسکے بعد آبلہ پڑ جائے۔

قوله ثم اخذ حصی فدحرجه: مسئلہ کی وضاحت کے لئے مقول کو محسوس کے ذریعہ سمجھایا گیا۔  
قوله ما اجلده الخ: اس زمانہ میں کثرت عقل و طرافت پر داد دی جائے گی، اور علم نافع اور عمل صالح کی کوئی تعریف نہیں کرے گا۔

قوله ما ابالی ایکم بایعت الخ: امانت و دیانت پر وثوق و اعتماد کی وجہ سے، کیف ما خلق ہر شخص سے معاملہ کیا جاتا تھا  
قوله لعن کائن مسلم الخ: یہ ایک سوال کا جواب ہے، کہ آپ نے جس زمانہ کا تذکرہ کیا ہے، اس وقت کافر بھی تو

تھے اور وہ لوگ اہل خیانت ہوتے ہیں، اس کا جواب دیا گیا کہ بات تو اسی طرح کی ہے، لیکن مومن کا حال تو یہ ہے، کہ اس کی ذات قابل اعتماد تھی، اور کافر تو جس امیر کے ماتحت زندگی گزارتے تھے، اس کے عدل و انصاف پر اعتماد کرتے ہوئے، کافروں سے معاملہ کرنے میں تردد نہیں تھا اگر وہ خیانت پر آمادہ ہوتے تو حکام کے ذریعہ حق مل جاتا تھا، ساعی جو شخص قوم کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ ساعی کہلاتا ہے۔

❦ حدیث ❦ حدثنا محمد بن عبد الله بن نمير..... عن حذيفة قال كنا عند عمر فقال  
أيكم سمع رسول الله ﷺ يذکر الغن قال قوم نحن سمعناه فقال لعلكم تعنون فتنة الرجل  
في أهله وجاره قالوا أجل قالوا تلك تكفرها الصلوة والصيام والصدقة ولكن أيكم سمع رسول  
الله ﷺ يذكر التي تنوح بنوح البحر قال حذيفة فأشكيت القوم فقلت أنا قال انت لله أبوك قال  
حذيفة سمعت رسول الله ﷺ يقول تغرض الغن على القلوب كالخصير غوداً غوداً فأى  
قلب أشربها نكت فيه نكتة سوداء وأى قلب أنكرها نكت فيه نكتة بيضاء حتى تصير على  
قلبين على أنيص مثل الصفا فلا تضره فتنة مادامت السموات والارض والأخراسود يربداً  
كالكوز مجحياً لا يعرف مغروفاً ولا ينكر منكراً إلا ما أشرب ماله قال حذيفة وحدثتني إن  
بينك وبينها باباً مغلقاً يوشك أن يكسر قال عمر أ كسراً لا أبالك فلو أنه فتح لعله كان يعلك قلت  
لا بل يكسر وحدثتني ان ذلك الباب رجل يقتل او يموت حديثاً ليس بالأغاليط قال ابو خالد  
فقلت لسعد يا ابنا مالك ما أسود يربداً قال شدة البياض في سوداء قال قلت فما الكوز مجحياً  
قال منكوساً. (مسلم ص ۸۲، مسند امام احمد ج ۵ ص ۴۰۵)

ترجمہ  
حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا، کہ ہم لوگ حضرت عمرؓ کے پاس موجود تھے، تو حضرت عمرؓ  
نے فرمایا، آپ لوگوں میں سے کسی نے آنحضور ﷺ سے فتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے، تو ایک جماعت  
نے کہا کہ ہم نے سنا ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا، ممکن ہے تمہاری مراد وہ فتہ ہو، جو اہل اور پڑوسی کے بارے میں پیش آئے  
لوگوں نے کہا جی ہاں، اور ان لوگوں نے کہا کہ ان فتوں کا کفارہ نماز، روزہ اور صدقہ ہے، ہاں آپ لوگوں میں سے، آنحضور  
ﷺ سے اس فتہ کا تذکرہ، کس نے سنا ہے؟ جو سمندر کی طرح موج مارے گا، حضرت حذیفہؓ نے فرمایا، کہ لوگ خاموش ہو گئے  
، تو میں نے عرض کیا، کہ میں نے سنا ہے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، تم کو یہ بات معلوم ہو گی، حضرت حذیفہؓ نے فرمایا میں نے  
آنحضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ فتے دلوں پر پیش کئے جائیں گے (کچھ بعد دیگرے) چٹائیوں کے تنکے کی طرح جس  
قلب میں دو گھل مل جائیں گے، اس میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جائے گا، اور جو قلب اس سے بیزار ہو گا، اس میں روشن نشان ہو گا،  
یہاں تک کہ وہ طرح کے قلوب ہو گئے، چکنے پچر کی طرح صاف شفاف ایسے دل کو فتہ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، جب  
تک آسمان و زمین قائم ہیں، اور دوسرے قسم کا قلب راکھ کی طرح سیاہ ہو گا، لے ہوئے برتن کی طرح نہ تو اچھے کام کو پہنچانے  
گا، اور نہ برے کام سے انکار کرے گا، صرف انہیں کاموں کو جانے گا، جو اس کے خواہش نفسانی کے مطابق ہو گا۔

حضرت حذیفہ کہتے ہیں، کہ میں نے حضرت عمر سے بیان کیا کہ آپ اور اس کے قتل کے درمیان، ایک بندہ دروازہ حائل ہے، اور بہت قریب ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے، حضرت عمرؓ نے دریافت کیا، کہ کیا وہ دروازہ توڑا جائے گا؟ اگر وہ کھولا جائے تو پھر دوبارہ بند کیا جاسکتا ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں، بلکہ توڑا جائے گا، اور میں نے ان سے بیان کیا، کہ یہ دروازہ ایک انسان ہیں، جو قتل کئے جائیں گے، یا سر جائیں گے، ایسی بات ہے، جس میں کسی قسم کا اشتباہ اور ابہام نہیں ہے، ابو خالد راوی کہتے ہیں، کہ میں نے سعد سے عرض کیا، اے ابوامالک (کنیت سعد کی) "اسود مر باد" کی کیا مراد ہے، تو انہوں نے کہا سیاحی میں حد درجہ کی سفیدی، ابو خالد نے کہا "یکوز مجحیا" کے کیا معنی ہیں تو سعد نے کہا التاہوا (لو کہ وہاں ہوا پھیلے)

### قتلہ کی تعریف اور اس کے اقسام

قتل جمع قتلہ کی ہے، ابتلاء، امتحان انسان کا اچھی حالت سے بری حالت میں آنا، کسی کی طرف میلان اور خود پسندی، یہ سب معنی آتے ہیں، یہ لفظ خیر اور شر دونوں کے لئے مستعمل ہے، جیسا کہ آیت قرآنی و نبلوکم بالبشر والخیر فتنہ، فتنہ سے مراد اصطلاح شرع میں یہ ہے کہ ہر ایسی چیز جو انسان کو خدا سے غافل کر دے، عام طور پر انہیں چیزوں کو قتلہ سے تعبیر کیا گیا ہے، مثال کے طور پر مال اور لولہ کو ایک جگہ قتلہ کہا گیا، انما اموالکم واولادکم فتنہ کیونکہ مال و لولہ انسان کو یاد الہی سے غافل کر دیتے ہیں، غرض ہر ایسی چیز جو انسان پر یاد الہی سے غفلت طاری کر دے، وہ قتلہ کہلاتا ہے، حضرت مولانا اور یس کا ندھلویؒ نے شرح مشکوٰۃ میں قتلہ کی تعریف کرتے ہوئے، اسکی یہ اقسام ذکر کی ہیں۔

(۱) ذاتی قتلہ وہ قلب کا اس طرح سخت ہونا، کہ طاعت و مناجات میں حلاوت و لذت محسوس نہ ہو۔

(۲) قتلہ مال۔ لولہ کی تا فرمانی زد و چین میں گرفت، اور گھریلو نظام کا بگڑ جانا۔

(۳) قتلہ انسانیت انسانیت ختم ہو جائے، خود غرضی ایذا رسانی کے درپے سبھی ہونے لگیں۔

(۴) ذاتی قتلہ: قطع طوفان، حذف اور علامات قیامت۔

(۵) قتلہ کذب: کذب و دھوکہ دہی عام ہو جائے۔ (۶) دلوں سے امانت نکل جائے۔ (۷) قتلہ تاویلات: یعنی آیات

تشابہات میں گھڑی کے ساتھ غلط تاویلات کرنا، (۸) قتلہ سب و شتم: سلف صالحین کو گالی دینا، (۹) قتلہ استخفاف: مثلاً حدیث کا جواز، نام بدل کر شراب کو حلال سمجھنا وغیرہ، (۱۰) من عامہ کا ختم ہو جانا، (۱۱) بد اخلاق اور برے لوگوں کا حاکم بن جانا، (۱۲) قتلہ قتل و خون ریزی۔

زمانہ قتلہ کے احکام | نیا اکرم ﷺ نے جس طرح قتلہ سے مطلع فرمایا، اسی طرح قتلہ کے احکام، اور اس سے چھٹکارا کی راہ بھی بیان فرمائی ہے۔

(۱) اگر مسلمانوں کے درمیان قتلہ و فساد پھوٹ پڑے، تو گوشہ نشینی اختیار کر لو،

(۲) جب تک امیر کی طرف سے صریح کفریہ اعمال و احکام نہ ہوں اسکی مخالفت نہ کرو۔

(۳) ایسے موقع پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے،

(۴) ایسے موقع پر بالخصوص حکام کی ملاقات، اور ملتے جلنے سے گریز کرنا چاہئے، ایسے قتلہ کے زمانہ میں عبادت و طاعت

## شرح حدیث

پر قائم رہنا انگارے کو ہاتھ میں لینے کے مترادف ہے، ایک عبادت کا ثواب پچاس عبادت کے برابر ہوگا۔“ م (۱)

حضرت عمرؓ جب کسی اہم بات کی طرف، ذہن متوجہ کرنا چاہتے، تو پہلے سوال پیش فرماتے، چنانچہ فتنہ کے بابت سوال کیا، چونکہ فتنہ کا وہی عام مفہوم صحابہ کے ذہن میں تھا، اس لئے صحابہ کے جواب سے پہلے ہی حضرت نے کہہ دیا کہ غالباً فتنہ سے متعلق میرے سوال کا منشاء وہ فتنہ آپ لوگ سمجھ رہے ہیں، جو لعل و عیال، مال و نور پر دوسی کی طرف سے پیش آتا ہے، یہ فتنے تو ہیں مگر عبادات، نماز و روزہ سے معاف ہو جاتے ہیں، میرے سوال کا مقصد وہ فتنے ہیں، جو فسادات کی شکل میں امت میں ظاہر ہوں گے، ان میں مسلمانوں کے درمیان، کشت و خون ہوگا، یا مگر انہی پھیلنے کی اور وہ موج یعنی دریائی طغیانی کی طرح ہوں گے، ان فتنوں کو طغیانی سے تشبیہ اس لئے دیا، کہ جھگڑوں کی کثرت اس کے نتیجے میں قتل و قتال، سب شتم عام ہو جائیں گے۔ حضرت علیؓ کی ایک روایت ہے کہ جب دریا کی لہروں کی طرح فتنہ اٹھے گا تو اس زمانہ میں لوگ حیوانات کی طرح ہو جائیں گے۔

حضرت ابو موسیٰ کی روایت میں ہے، کہ اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی عقل ختم ہو جائے گی، مصنف ابن شیبہ میں ایک روایت ہے، جب تک دین کی معرفت باقی رہے گی، فتنہ نقصان نہیں پہنچائے گا، ہاں جب حق و باطل میں اشتباہ ہوگا، تب فتنوں سے نقصان ہوگا، غرض حضرت عمرؓ کے سوال کا منشاء فتنہ عظیم تھا، جس سے احوال قلب زیر و زبر ہو جائیں گے، اس فتنہ کے سننے کے بعد، لوگ خاموش ہو گئے، تو حضرت حذیفہؓ نے کہا، کہ میں اس فتنہ کو جانتا ہوں ان کے کہنے پر حضرت عمرؓ نے فرمایا، اللہ ابوک: عرب کا عرف ہے، کہ جب کسی بچہ سے کوئی کام قابل تعریف کام یا بات کا مصدر ہوتا ہے، تو مدح کے طور پر اللہ ابوک کہتے ہیں، کیونکہ باپ کی اچھی تربیت کا یہ نتیجہ ہے، اس لئے اس کے باپ کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے، خدا کی طرف نسبت کی جاتی ہے، اور اس کا عربی معنی یہ سمجھا جاتا ہے، کہ حیراناب بہت اچھا تھا، اس کے بعد حضرت حذیفہؓ نے پوری روایت سنائی، جس کی شرح الفاظ حدیث کے تحت ملاحظہ کریں۔

تعرض الفتن :- فتنوں کا جال بچھا دیا جائے گا، اور فتنے اس طرح گھیر لیں گے، جیسے چٹائی کے بچانے سے وہ زمین کو ڈھانپ لیتی ہے، عوداً عوداً اس کو تین طرح پڑھا جاتا ہے، (۱) مشہور بضم العین اور دال مہملہ یعنی عوداً اس صورت میں مطلب یہ ہوگا، کہ دلوں پر فتنے ظاہر ہوں گے، اور یکے بعد دیگرے اسی طرح آتے رہیں گے، جیسے چٹائی بننے والا مسلسل ایک تنکا بن کر دوسرے اور پھر تیسرا، اس طرح یکے بعد دیگرے لیتا رہتا ہے، اسی طرح مسلسل دل پر یکے بعد دیگرے فتنے آتے رہیں گے۔

(۲) عوداً عوداً فتح العین، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا، فتنے دلوں کے ایک جانب میں اسی طرح چپک جائیں گے، جس طرح چٹائی سونے والے کے پہلو سے چپک جاتی ہے، اور جیسے مسلسل نشانات ہوں گے، اسی طرح مسلسل بار بار فتنے آکر چپکیں گے۔

(۳) عوداً عوداً فتح العین و ذال معجم، بمعنی ان فتنوں سے ندا کی پناہ، خدا کی پناہ، غرض ان تینوں میں بول صورت بہتر اور شارحین کا پسندیدہ ہے، مطلب اس جملہ کا یہ ہے، کہ فتنے بہت زیادہ ہونے لگیں گے۔

قوله فاي قلب اشربها: اشرب بمعنى خلط، یعنی اس کی محبت دل میں اس طرح پیوست ہو جائے گی، جیسے پانی میں شکر گھل مل جاتی ہے، مقصد یہ ہے کہ فتنے دل سے اس طرح چمٹ جائیں گے، کہ پھر اس سے زائل نہیں ہوں گے، اور جس طرح پانی بدن کے مسامات میں پیوست ہو جاتے ہیں، یہی حال فتنے کا ہوگا، اسی طرح جملہ واشربوا فی قلوبہم العجل بکفرہم ہے۔

نکتہ فیہ :- ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ نکتہ کہتے ہیں اس اثر کو جو زمین پر لکڑی وغیرہ مارنے سے پیدا ہوتا ہے۔

(مرقات ص ۱۱۰ ر ۱۰)

مثل الصفا :- صاف ستھرے پتھر کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جس دل میں وہ فتنہ رچ بس جائے گا، تو اس میں ایک کا لاداغ پیدا ہوگا، اور دل اس کو نہیں مانے گا، بلکہ قرآن وحدیث پر قائم رہے گا، اس میں ایک سفید نورانی دھبہ ہوگا، یہاں تک کہ اس طرح وہ قسم کے دل ہو جائیں گے، ایک خالص سفید دل بچنے پھر دل کی طرح یہاں دل کو تشبیہ اس اعتبار سے دی گئی، کہ جس طرح صاف پتھر داغوں سے پاک ہوتا ہے، ویسے ہی یہ دل بھی ان فتنوں کی آلائش سے پاک وصاف ہوں گے، والآخر اسود مریدانکسر العید، اور باد سے شستن ہے، یعنی راحہ کا سفیدی مائل، (بحور) یعنی فتنوں کے اثرات قبول کرنے کی بنا پر دل ان کی آلائش سے کالامال ہو جائے گا۔

کالکوز مجحیا: اسم مفعول باب تفعل جحی سے فعل لازم ہے، اور مجرد میں جحی (تفقد رانجم والکلام) جو کادینا متعدی ہے، قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ مرید کی تشبیہ نہیں ہے، بلکہ قلب کی صفت ہے، کہ اس کا ایک وصف یہ بھی ہوگا، اس کا دل اوندھا ہو چکا ہوگا، یعنی جس طرح برتن الٹا دینے سے پانی سے برتن خالی ہو جاتا ہے، اسی طرح دل علوم و معارف سے، بالکل خالی ہو جائے گا، یا جس طرح الٹے برتن میں پانی ٹھہرنا نہیں، اسی طرح بعض دلوں میں ایمان کو استقرار نہیں ہوگا، اور کوئی بہتری اور بھلائی، اور حکمت کی بات نہ ہوگی، چنانچہ اسی کو بیان کیا، کہ نہ تو وہ بھلی بات کو بھلی سمجھے گا، اور نہ وہ بری بات کو بری۔

قوله ان بینک و بینہ باباً مغلقاً الخ حضرت حذیفہ کی روایت میں تصریح ہے، کہ باب حضرت عمرؓ کی ذات ہے، مقصد یہ کہ فتنہ کی آمد میں آپؐ کی ہستی حائل ہے حضرت کا اذکر لم یفلق فرمانے کا مقصد یہ ہے، کہ فتنہ کے زمانہ میں سخت لڑائیاں ہوں گی، اور جب اس کا دروازہ کھل جائے گا، تو پھر بند نہیں ہوگا، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے، اذا وضع السیف فی امتی لم یرفع عنها الی یوم القيامة خطیب نے ذکر کیا ہے، کہ حضرت عمرؓ مکتوم بنت سنی کے پاس تشریف لائے، تو دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں، رونے کا سبب پوچھا، تو بتایا کہ حضرت کعب احبارؓ آپؐ کی بابت کہتے ہیں کہ آپؐ جہنم کے ایک دروازہ ہیں، حضرت عمرؓ نے ماشاء اللہ فرمایا، پھر وہاں سے لٹکے اور حضرت کعب کو بلانے کے لئے ایک شخص کو بھیجا حضرت کعبؓ امیر المؤمنین کے پاس آئے اور کہا یا امیر المؤمنین خدا کی قسم، ذی الحجہ کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی آپؐ جنت میں داخل ہو جائیں گے، حضرت عمرؓ نے فرمایا، یہ کیسی بات کہ کبھی مجھے جنتی بناتے ہو، اور کبھی جہنمی تو حضرت کعبؓ نے فرمایا کہ میں نے کتب سابقہ میں آپؐ کے متعلق یہ دیکھا ہے، کہ آپؐ جہنم کا ایک دروازہ ہیں، جو لوگوں کو جہنم میں جانے سے روکتے رہیں گے اور جب آپؐ کی موت ہو جائے گی، تو لوگ کثرت سے جہنم میں داخل ہوں گے۔



## باب بیان ان الاسلام بدأ غریبا وسیعود غریبا وانه لیارز بین المسجدين

اسلام شروع ہوا غربت کے ساتھ اور پھر غریب ہو جائے گا اور دونوں مسجدوں کے درمیان سٹ آئے گا۔

(۱) حدثنا محمد بن عباد..... عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ. (۲) عن ابن عمر عن النبی صلی

اللہ علیہ وسلم قال إنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ غَرِيبًا كَمَا بَدَأَ وَهُوَ يَأْرُؤُ بَيْنَ الْمَسْجِدَيْنِ

كما تَارُؤُ الْحَيَّةُ فِي جَحْرِهَا. (۳) وفي رواية إنَّ الْإِيمَانُ لِيَارِزُ إِلَى الْمَدِينَةِ.

ترجمہ | حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، کہ اسلام جب دنیا میں آیا تھا تو وہ ایک پردہ میں شخص کی طرح اکیلا تھا، اور آخر میں پھر اسی طرح پردہ میں بن جائے گا، تو مبارک ہو ان کو جو اپنے دیس میں بھی پردہ میں کی طرح بن جائیں۔ عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، ان الاسلام بدأ الخ اور وہ سکر مسجد حرام اور مسجد نبوی کے درمیان اس طرح آجائے گا، جیسا کہ سانپ دور دور جا کر پھر اپنے ہی سوراخ کی طرف لوٹ آتا ہے، ایک اور روایت میں ہے ایمان سکر مدینہ کی طرف آجائے گا۔

### اسلام کی ابتدائی اور آخری حالت

شرح حدیث | ابتدا میں، اسلام غریب تھا، اسلام کے معنی یا تو معنی مصدری ہے یا اسلام کے معنی مسلم کے ہیں ای بدأ المسلم غریباً۔ غریب، اجنبی اور پردہ میں کو کہتے ہیں، جس کو کوئی پہچانتا نہ ہو، جس کو کوئی قبول کرنے والا نہ ہو۔ سہارا دینے والا نہ ہو، اگر اسلام کو اپنے معنی پر رکھا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ شروع میں اسلام ایک اجنبی اور پردہ میں کی طرح تھا کوئی بھی اس کو قبول کرنے والا نہیں تھا، جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو تبلیغ کا حکم دیا، تو تمام قریش کو ایک جگہ جمع فرمایا اور صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر، لوگوں کو دین کی دعوت دی، تو ابولہب نے کہا "تَبَالَكَ الْهَذَا جَمْعَتْنَا" اور پورا مجمع منتشر ہو گیا، اسلام کے خلاف لوگوں میں جوش، جذبہ پیدا ہوا، اور داعی اسلام کے ہر شخص درپے آزار ہو گئے، بڑی جدوجہد کے بعد بھی مکہ والوں نے ایمان قبول نہیں کیا، تو آپ طائف تشریف لے گئے، اور وہاں کے رئیسوں کے سامنے دعوت پیش کی، وہاں کے لوگ اور زیادہ تر شردی سے پیش آئے اور سرداران طائف نے تبلیغ جواب دیکر، آپ کے پیچھے، غلاموں، شریروں، کتوں کو لگادیا، جس نے آپ کے ساتھ انتہائی بے دردی، سیرحمی کا سلوک کیا، اور طائف سے آپ کو نکال دیا، وہ دور اسلام کے غربت کا تھا، اور اگر اسلام کو مسلمان کے معنی میں لیا جائے تو اس کے دو معنی ہوں گے، کہ شروع میں مسلمانوں کا کوئی بھی پرسان حال نہ تھا، اور جو لوگ مسلمان ہوتے تھے، ان کے ساتھ اجنبی جیسا سلوک کیا جاتا تھا، اور دوسرا مطلب غریب کا قلت سے کیا جائے، یعنی شروع میں مسلمان بہت تھوڑے تھے اتنے تھوڑے کہ جب آنحضور ﷺ

کو مشرکین تکلیف پہنچاتے تھے، تو مسلمان اپنی قلت کی وجہ سے آپ کی حمایت بھی نہیں کر سکتے تھے، اس کے بعد دھیرے دھیرے مسلمان، اور اسلام کو ترقی ہوئی۔ چنانچہ اسلام مدینہ سے نکل کر، اطراف میں پھیلا، پھر مکہ فتح ہوا، اور پھر خلفاء کے زمانہ میں اسلام حدود عرب سے نکل کر عجم میں پہنچا، اس کے بعد پھر قرب قیامت میں اسلام کی وہی پہلی والی حالت ہوگی، جب لوگ اسلام سے بیزار ہو جائیں گے اور اس کا پرسان حال کوئی نہیں ہوگا، تو اسلام پھر مکہ و مدینہ میں لوٹ آئے گا، جو مسلمان ہوں گے وہ کافروں کے ڈر سے مدینہ بھاگ آئیں گے۔

قاضی عیاض کہتے ہیں، کہ اسلام شروع ہوا چند محدود لوگوں سے، پھر آخر زمانہ میں بھی اسی طرح سٹ کر تھوڑے لوگوں میں رہ جائے گا۔ یہ زمانہ دجال کا ہو گا ہر جگہ تباہی پھیلائے گا، مگر مکہ اور مدینہ میں وہ داخل نہیں ہو سکے گا، یہاں اسلام اور مسلمانوں کو دجال کے فتنہ سے ہر طرح حفاظت ہوگی۔ ترمذی (ج ۲ ص ۹۱) میں اتنا اور اضافہ ہے "الذین یصلحون ما افسد الناس من بعدی من سفنی یعنی غریبا" یہ وہ لوگ ہیں جو اصلاح کریں گے میری سنت کی، ان باتوں سے جو بدھنوں نے میرے بعد آکر خراب کر دی ہوں گی،

قوله فطوبی للغریبا:۔ طوبی فعلی کے وزن پر ہے، طیب سے ماخوذ ہے طلاء کے مضموم ہونے کی وجہ سے اس کے بعد دو لایا گیا، نکل عرب "طوباک وطوبالک" دونوں طرح استعمال کرتے ہیں، قرآن میں ہے "طوبی لہم وحسن مآب" عبد اللہ ابن عباس نے، اس کی تفسیر فرح و قرۃ عین سے کی ہے، مگر مد نے نعم ما لہم سے کی ہے، صحاح نے غبط سے کی ہے اور قتادہ نے حسنی لہم اور اصابوا خیر اے کی ہے، ابن عثمان دوام خیر سے کرتے ہیں، بعض لوگ جنت اور بعض جنت کے درخت سے تفسیر کرتے ہیں، حدیث میں ان تمام معانی کا احتمال ہے،

قوله یارز:۔ یا مفتوح ہمزہ ساکن اور راء مکسور اور کبھی راء کو ضمہ کیساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور بعض لوگ راء کو مفتوح بھی پڑھتے ہیں، لیکن اصح کسرہ ہے۔ اور بعض لوگ راء کو مضموم بھی پڑھتے ہیں اور بعض فتح کے بھی قائل ہیں۔ معنی سمنٹا۔

### قرب قیامت میں اسلام حجاز میں

قوله بین المسجدین: مراد مسجد حرام، اور مسجد نبوی ہے، مقصود مکہ اور مدینہ ہے۔ ایک روایت میں حجاز کا لفظ ہے، یعنی یہ دین حجاز میں سٹ کر آجائے گا، اور حجاز کا علاقہ مکہ مدینہ سے زیادہ پھیلا ہوا ہے، اس لئے اس روایت کی بنا پر شارحین فرماتے ہیں کہ جس روایت میں مدینہ یا مکہ مدینہ ہے، اس سے مراد اطراف مکہ اور اطراف مدینہ ہے، لہذا اب حجاز کو بھی شامل ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ اس سے آخری زمانہ مراد ہے، کہ فتنہ و فساد سے بچنے ہوئے لوگ، مکہ و مدینہ ہی آجائیں گے یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ ایسے سنگین وقت میں مدینہ کی طرف رحلت و روانگی کو سانپ کے بل میں جانے سے کیوں تشبیہ دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سانپ جب کسی معصیت کو محسوس کرتا ہے، تو علی الفور اپنے بل کی طرف بھاگتا ہے۔ اور پورے طور پر اس میں اس طرح سما جاتا ہے، کہ دشمن کو نظر نہ آ سکے۔ اسی طرح مؤمنین صلاقیین اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے پورے طور پر ان مقام مقدس میں جا گریں ہو جائیں گے۔ (مرقاۃ ج ۱ ص ۲۲۲)

قوله کما تلرز الحیة فی جحرھا الخ: یعنی جس طرح سانپ اپنے بل سے نکل کر دور دراز چلا جاتا ہے، مگر



اسے بل کوئی مسکن اور مامون جگہ سمجھ کر اس کی کشش کو محسوس کرتا ہے، اسی طرح مومن اگرچہ مدینہ سے دور دراز ہوں لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس کا مسکن مدینہ پاک ہو اسی کو وہا مامون سمجھتا اور اس کی کشش محسوس کرتا ہے۔ اگر یہ توجہ کی جائے تو پھر اس کا تعلق ہر زمانہ سے ہو گا تو اس صورت میں مطلب ہو گا آنحضور ﷺ کے زمانہ میں علم حاصل کرنے کے لئے لوگ آیا کرتے تھے اسی طرح عہد صحابہ تابعین تبع تابعین میں ہدایت حاصل کرنے آیا کرتے تھے اور اس کے بعد روئے انور کی زیارت مسجد نبویؐ میں نماز کی ادائیگی، اور آثار رسولؐ اور صحابہ سے تبرک حاصل کرنے کی غرض سے آتے رہیں گے۔

علامہ قرطبی کہتے ہیں اس میں اہل مدینہ کے صحیح المذہب اور بدعت سے اجتناب پر تنبیہ ہے کہ ان کا عمل قابل حجت ہے جیسا کہ امام مالکؒ کا اسی پر عمل رہا ہے، بہتر یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق عہد رسالت اور خلفاء راشدین کے مبارک عہد کے ساتھ کر دیا جائے اور جب مدینہ میں فتنہ کا ظہور ہوا تو بہت سے صحابہ مختلف جگہوں میں پھیل گئے تو وہ مقامات بھی علمی مرکز اور ان کا عمل قابل حجت بن گیا جیسے کوفہ وغیرہ۔ (فتح الباری ج ۴ ص ۹۲)

## باب ذهاب الايمان آخر الزمان

آخری زمانہ میں ایمان کے ختم ہو جانے کا بیان

حدثني زهير بن حرب..... عن انس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا تقوم الساعة

حتى لا يقال في الارض الله. وفي رواية لا تقوم الساعة على احد يقول الله. (۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی یہاں تک کہ روئے زمین پر ترجمہ اللہ اللہ نہیں کہا جائے گا۔

مقصود:- حدیث جبریل میں قیامت کی کچھ علامتیں بتلائی گئی تھیں یہاں ایک اہم علامت قیامت کا تذکرہ ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے جو چیز بنائی جاتی ہے، جب وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو اس کو ختم کر دیا جاتا ہے، اس زمین اور اس کے بسنے والے کو پیدا کرنے کا مقصد، خدا کی عبادت ہے، جب یہ مقصد لوگ چھوڑ دیں گے، تو پھر دنیا ہی ختم کر دی جائے گی، گویا اس زمین کی روح خدا کا ذکر ہے، جب تک صلحاء اس مقصد کو پورا کرتے رہیں گے، تو اس کے خیر و برکات سے فیاد و نسیان بھی فائدہ اٹھاتے رہیں گے، کہ صلحاء کا اثر متعدی ہوتا ہے اور جب قرب قیامت میں ہوا کے چلنے پر، تمام مومنین کی رو جس قبض کر لی جائیں گی، جس کا تذکرہ باب الريح التي تقبض ارواح المومنين میں ہو چکا، تو زمین پر صرف بدترین مخلوق رہ جائے گی، انہیں لوگوں پر قیامت قائم ہو گی۔

اس روایت پر یہ اشکال نہ ہونا چاہئے کہ ایک روایت میں ہے کہ ایک جماعت تا قیامت حق پر قائم رہے گی اور غالب رہے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم قیامت تک مسلمان رہیں گے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ تا قیامت سے مراد قرب قیامت ہے، یعنی قرب قیامت تک مسلمان کا وجود رہے گا، پھر ایک نرم ہوا چلے گی جس سے مسلمان سب فوت ہو جائیں گے اور شرار خلق ہی باقی رہ جائیں گے۔

قوله الله الله:- عام روایات میں اللہ اللہ مکرر ہے، اشارہ اس بات کی طرف ہے، کہ صرف اللہ مفرد ذکر اللہ میں شامل ہے۔ اس سے علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کی تردید ہو جاتی ہے، جو صرف اللہ کو ذکر میں شامل نہیں کرتے معلوم ہوتا ہے، اس حدیث کی طرف ان کی نظر نہیں ہوئی، بلکہ ہول ہو گیا حتیٰ لایقال کے معنی حتیٰ لا یذکر اللہ کے ہیں۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ لفظ اللہ جو مکرر ہے اس کو نحوی ضابطہ کے مطابق تجذیر کی طرح نصب پڑھنا چاہئے۔ رفع کیا نہ پڑھنا بہتر نہیں۔ (المفہم ج ۱ ص ۳۶۳) خیال رہے کہ تصوف و طریقت میں ذکر میں لفظ اللہ جو مکرر کہا جاتا ہے وہ مجزوم کہا جاتا ہے۔ (تسہیل قصد السبیل ص ۱۷)

## باب جواز الاستسرار بالایمان للخائف

خوف زدہ کے لئے ایمان چھپانے کے جواز کا بیان

حدثنا ابو بکر بن ابي شَيْبَةَ..... عن حذيفة قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَحْضُوا لِي كِم يَلْفُظُ الْإِسْلَامَ قَالَ فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اتَّخَذَ عَلَيْنَا وَنَحْنُ مَا بَيْنَ السَّيِّئَةِ مَائَةِ إِلَى السَّيِّئَةِ مَائَةِ قَالَ أَنْكَ لَا تَذَرُونَ لَعَلَّكُمْ أَنْ تُبْتَلُوا قَالَ فَاثْبَتْنَا حَتَّى جَعَلَ الرَّجُلُ مِنَّا يُصَلِّي إِلَّا سِرًّا. (بخاری ۱۳۰-۳۰۶۰ مسلم ص ۸۴)

ترجمہ: حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے آپ نے پوچھا شمار کر کے بتلاؤ، اس وقت کلمہ گو لوگوں کی تعداد کتنی ہے؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہملوگ چھ سات سو کے درمیان ہیں، کیا اب بھی ہمارے متعلق آپ کو کسی قسم کا اندیشہ ہے، آپ نے فرمایا تم کو خبر نہیں، شاید تم کسی آزمائش میں مبتلا کئے جاؤ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، آخر ہم قتل میں مبتلا ہوئے، حتیٰ کہ ہم میں سے کسی کسی کو تو چھپ کر نماز پڑھنی پڑی۔

### ایمان چھپانا کب جائز ہے؟

مقصد حدیث: مقصد یہ ہے کہ جس طرح مصلحت کی وجہ سے ایمان کو چھپایا جاسکتا ہے اسی طرح امور ایمانی، کسی فتنہ سے بچنے کے لئے عقلی طور پر کئے جاسکتے ہیں، مثلاً علی الاعلان نماز پڑھنے میں خطرہ ہے تو گھر میں خفیہ طور پر نماز پڑھ سکتا ہے، اسی طرح مجمع عام میں نماز پڑھنے سے جان کا خطرہ ہو تو چھپ کر تنہائی میں بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے، مقصد یہ ہے کہ خوف و ہراس کی زندگی میں، اس امر کی اجازت ہے، کہ اسلام اور احکام اسلام چھپ کر لدا کئے جائیں، مگر یہ مرحلہ زیر بحث رہے گا کہ اس اخفاء کی اجازت کن حالات میں دی جاسکتی ہے؟ ایک بزدل کو اپنی زندگی ہر وقت اور ہر جگہ خوف و ہراس نظر آتی ہے، اسلامی احکام میں، ایسے بزدلوں کی رعایت نہیں کی جائے گی، جیسا کہ ان بہادروں کو بھی معیار نہیں بنایا جاسکتا، جن کے سامنے عاقبت اندیشی سے پہلے، جان بازی کی منزل آ جاتی ہے، وہ خوف و ہراس کے میدانوں کو سکون و اطمینان کی آرام گاہیں تصور کر لیتے ہیں، ایک عالمگیر مذہب کو جوش اور ہوش دونوں کی تعلیم دینی چاہئے۔ اس لئے مصلحت کے وقت اسلام کے اخفاء کی بھی اجازت دیدی، بشرطیکہ دل اندر سے مطمئن ہو۔ اگرچہ افضل اب بھی یہی ہے کہ اپنی جان

قربان کر دے اور کلمہ کفر زبان سے ادا کرے۔

دی کس خوشی سے جان پہنچ دلیغ نے

لب پہ ہے تبسم اور نظریار کی طرف

### شرح حدیث

احصالی کم یلفظ الاسلام۔ حضور ﷺ نے حکم فرمایا کہ مسلمانوں کی تعداد شمار کر دیہاں پر یہ بات تشدد ہے کہ شمار کرنے کا حکم کس موقعہ؟ اور کس سن میں دیا گیا؟ تاہم قرآن سے محدثین نے موقع اور سن کی تعیین کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے اس کا موقع جنگ اُحد یا اس کے علاوہ اور کسی جنگ کے خروج کے وقت ہو۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ واقعہ خندق کھودنے کے وقت کا ہے، اور بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ تذکرہ حدیبیہ کے وقت کا ہے۔ کیونکہ اہل حدیبیہ کی تعداد میں اختلاف ہے، کہ وہ ڈیڑھ ہزار تھے یا چودہ سو۔

قول ونحن ما بین الستة مائة الى السبع مائة الخ :- لام نووی لکھتے ہیں کہ لفظ الست مائة نحوی قاعدہ کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے، ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مائة دونوں مقام پر تیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہو جیسا کہ بعض اہل عرب کی رائے ہے۔ اور بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مائة مجرور ہو اور الف لام زائد ہو لہذا الف لام کے داخل ہونے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور سب سے بہتر بات یہ ہے کہ مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں میں لفظ ست مائة بغیر الف لام کے ہے

### تعداد صحابہ کا اختلاف کیوں؟

سفیان ثوری کی روایت کے مطابق، بخاری میں پندرہ سو کا ذکر ہے۔ جبکہ حضرت ابو جرہ کی روایت میں پانچ سو کا تذکرہ ہے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سفیان ثوری کی روایت بخاری کے نزدیک رائج ہے، کیوں کہ وہ حفظ میں بڑھے ہوئے ہیں، اور ثقہ کی زیادتی قابل قبول ہوتی ہے۔ اسی لئے بخاری نے، ثوری کی روایت پر اعتماد کیا، گویا ان کے بقول پندرہ سو والی روایت رائج ہے، اور حدیث باب اس کے خلاف نہیں کیونکہ عدد اکثر عدد اقل کے خلاف نہیں ہوا کرتی۔ لیکن امام مسلم نے ابو معاویہ کی روایت پر اعتماد کیا، غالباً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اعمش کے شاگردوں میں، ابو معاویہ زیادہ حافظ مانے جاتے ہیں، مگر کسی عدد پر انہوں نے یقین کیسا تھا ذکر نہیں کیا۔

بعض لوگوں نے تطبیق کی صورت بھی نکالی ہے۔ پہلی صورت ممکن ہے کہ روایت میں یہ تعداد کا اختلاف، موقعوں کی اختلاف کی وجہ سے ہو کسی موقعہ پر ڈیڑھ ہزار کی تعداد رہی ہو، اور کسی موقعہ پر پانچ سو، ڈیڑھ ہزار سے مراد، مسلمانوں کی مجموعی تعداد ہو جس میں مرد، عورت، غلام، بچے سبھی شامل ہوں۔ اور چھ سو سے سات سو کی تعداد، خاص مردوں کی رہی ہو۔ اور پانچ سو کی تعداد مجاہدین کی ہو۔ پانچ سو سے صرف مجاہدین اہل مدینہ مراد ہوں، اور چھ سے سات سو تک مدینہ کے مجاہدین اور غیر مجاہدین مراد ہوں، اور ڈیڑھ ہزار سے تو اہل مدینہ اور مدینہ کے آس پاس کے لوگوں کی تعداد مراد ہو۔ ان توجہات میں کوئی بھی توجیہ تشفی بخش نہیں ہے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کی اس جیسے موقعہ پر رائے یہ تھی کہ جو اختلافات قصے میں پیدا ہو جائیں، اگر اس سے کوئی حکم شرعی مستنبط نہیں ہوتا تو ان کے فیصلے کے درپے ہونا مفت کی درد سرائی ہے، ہاں اگر صرف تاریخی لحاظ سے اس کی طرف توجہ کرنا چاہے، تو کر سکتا ہے۔

## پیشین گوئی کا مصداق

حتی جعل الرجل منا لا یصلی الا سرا۔۔۔۔۔ غالباً اس پیشین گوئی کا مصداق، حضرت عثمان کی خلافت کا آخری زمانہ تھا، جبکہ امیر کوفہ اتنی تاخیر کیا کرتا تھا، کہ بعض صحابہ کو مجبوراً اپنی نمازیں خفیہ طور پر علحدہ پڑھنی پڑتی تھیں، جن لوگوں نے اس کا مصداق، حضرت عثمان کی شہادت کا زمانہ قرار دیا ہے، وہ صحیح نہیں۔ کیونکہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہ تھے، پھر حضرت حذیفہ کے بعد، حجاج کے زمانہ میں صحابہ کو ان سے بھی کہیں زیادہ مصائب پیش آئے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنی کثرت پر تاز کرنا، کبھی مبارک نہیں ہوتا، جنگ حنین اس کی واضح مثال ہے۔

## باب تألف قلب من یخاف علی ایمانہ لضعفہ، والنهی عن القطع بالایمان من غیر دلیل قاطع

جو شخص ضعیف الایمان ہو اسکے قلب کو مانوس کرنا، اور بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی کو کفر مومن نہ کہنا۔

حدثنا ابن ابی عمر..... عن عامر بن سعد عن ابيه قال قَسَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسَمًا فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَعْطِ فُلَانًا فَإِنَّهُ مُؤْمِنٌ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ مُسْلِمٌ أَقُولُهَا ثَلَاثًا وَيُرَدِّدُهَا عَلَى ثَلَاثًا أَوْ مُسْلِمٌ ثُمَّ قَالَ إِنِّي لَأَعْطِي الرَّجُلَ وَغَيْرَهُ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْهُ مَخَافَةَ أَنْ يَكُفَّهُ اللَّهُ فِي النَّارِ.

حدثني زهير بن حرب..... عن ابيه سعد بن رسول الله صلى الله عليه وسلم اعطى رهطاً وسعد جالس فيهم قال سعد فترك رسول الله صلى الله عليه وسلم منهم من لم يعطه وهو اعجبهم الى فقلت يا رسول الله مالك عن فلان فوالله اني لاراه مومنًا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم او مسلماً قل فسكت قليلاً ثم غلبني ما اعلم منه فقلت يا رسول الله مالك عن فلان فوالله اني لاراه مومنًا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم او مسلماً قل فسكت قليلاً ثم غلبني ما علمت منه فقلت يا رسول الله مالك عن فلان فوالله اني لاراه مومنًا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم او مسلماً اني لاعطى الرجل وغيره احب الي من خشية ان يكذب في النار على وجه وفي رواية اخرى فضرب رسول الله بيده بين عنقي وكنتفي ثم قال أقتل أباي سعد اني لاعطى الرجل.

(بخاری ص ۱۹۹-۱۲۷۸ مسلم ص ۸۰ ابوداؤد ص ۴۶۸۳)

ترجمہ حضرت سعد سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں، کہ کسی موقع پر آنحضور ﷺ نے مال غنیمت تقسیم کی، تو میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ فلاں کو دیجئے، کیونکہ یقیناً وہ مومن ہے، تو آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، کیا مسلم ہے؟ میں تین بار اس کو کہتے رہا، اور تینوں بار آنحضور ﷺ "او مسلم" سے جواب دیتے رہے پھر آپ نے فرمایا،

کہ بے شک میں ایک آدمی کو دیتا ہوں، حالانکہ دوسرا شخص، میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے، محض اس آدمی سے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کو اوندھے منہ دوزخ میں نہ ڈال دے۔

### ترجمہ حدیث نمبر (۲)

حضرت سعد سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے چند لوگوں کو کچھ مال دیا، اور سعد ان لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے، سعد نے فرمایا، کہ آنحضور ﷺ نے میرے نزدیک، جو شخص ان میں زیادہ مستحق تھا اس کو کچھ نہ دیا، تو میں نے پوچھا، آپ نے فلاں آدمی کو بھلا کیوں نہ دیا، میں تو ان کو بخدا پکا مؤمن سمجھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا مؤمن کہتے ہو یا صرف مسلمان؟ سعد کہتے ہیں پھر تھوڑی دیر میں خاموش رہا پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا، اور میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ آپ فلاں کو کیوں نہیں دیتے؟ بخدا میں تو ان کو پکا مؤمن سمجھتا ہوں تو آنحضور ﷺ نے فرمایا مؤمن کہتے ہیں یا صرف مسلمان سعد کہتے ہیں کہ پھر میں خاموش رہا تھوڑی دیر۔ پھر جو حال میں ان کا جانتا تھا اس نے زور کیا، اور میں کہہ ڈالا یا رسول اللہ فلاں کو کیوں نہیں عنایت فرماتے؟ بخدا میں ان کو پکا مؤمن سمجھتا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا، مؤمن کہتے ہو یا صرف مسلمان؟ میں تو ایک شخص کو مال دیتا ہوں حالانکہ اس سے زیادہ پیارا مجھے دوسرا شخص ہوتا ہے، کہ کہیں وہ اوندھے منہ دوزخ میں نہ ڈال دیا جائے۔

### ترجمہ حدیث نمبر (۳)

آنحضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے، میری گردن اور مونڈھے کے درمیان، ہاتھ مارا پھر فرمایا کیا تم مجھ سے جھگڑنا چاہتے ہو، اے سعد میں ایک شخص کو دیتا ہوں۔

### شرح حدیث

ابتداءً اسلام میں ضعیف الایمان، نو مسلم افراد کو مال دیکر، دل جوئی اور قریب کیا جاتا تھا، لیکن وہ لوگ جو ایمان کی لذت سے آشنا ہو چکے تھے، وہ اس قسم کی دلجوئی سے بہت بالاتر تھے، ان کی استقامت و محبت کی آزمائش کے لئے، چتے ہوئے پتھر، دھکتی ہوئی آگ یا آبدار شمشیر ان کے ایمان میں ذرہ برابر لرزہ پیدا نہیں کر سکتی تھی، اور یہ تو مشاہدہ ہے کہ ہر انسان کا حراج، یکساں نہیں ہوتا بلکہ طبیعتیں حقیقت کی مستلاشی ہوتی ہیں، اور پست فطرتیں، حسن سلوک، اور ظاہری ہمدردی کا بہت جلد اور زیادہ اثر قبول کرتی ہیں۔ اسی لئے اشاعت دین کے لئے اسلام نے جبر واکراہ کی پالیسی کبھی اختیار نہیں کی، بلکہ اس کے برعکس تالیف قلب، اور دل جوئی سے کام لیا، یہاں تک کہ اگر کسی نو مسلم نے آپ سے مال کی کوئی طمع ظاہر کی ہے، تو آپ نے اس کی خواہش بھی پوری فرمادی۔

حدیث باب میں، حضرت سعد کا جو واقعہ مذکور ہے، کہ آپ نے بہت سے افراد کو عنایت فرمایا، اور ایک شخص جو ہم میں اچھا آدمی سمجھا جاتا تھا اس کو آپ نے نہیں نوازا، جبکہ خیال یہ گزر رہا تھا، کہ عنایت و نوازش اسی کی قسمت میں آئے گی، جسے قرب نبوی ہو، اور رسول اکرم کی نظر میں محبوب ہو، اسی نظریہ کی بنا پر، صحابی رسول، بار بار عرض کرنے لگے، درحقیقت حضرت سعد کا ذہن، تالیف قلب کی مصلحت اور تقسیم مال کی حکمت کی طرف نہ جاسکا۔ اس لئے آپ نے وضاحت فرمائی، کہ مال کی تقسیم کو، میری محبت کا معیار تصور کرنا غلط ہے، بلکہ یہ تقسیم مصلحت و دعوت کے پیش نظر ہوا کرتی ہے۔ اس موقع پر ان کی ایک اصلاح فرمائی کہ انسان کو اپنے مبلغ علم کے مطابق بات کہنی چاہئے، ایمان قلب کی ایک صفت ہے، اور اسلام ظاہری انقیاد کا نام ہے، دل کا حال کسی کو کیا معلوم؟ لہذا ان کے لئے مؤمن کے بجائے مسلم کا لفظ استعمال کرنا مناسب ہے، یہ ایک نوع

کی بے ادبی ہے، صاحب دوحی کے سامنے کسی کے متعلق ایسے احکام لگا دئے جائیں جن کا علم خدا کی اطلاع کے بغیر، خود اس کو بھی نہیں ہوتا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغیر مشورہ مانگے، مفضل افضل کو رائے دے سکتا ہے اور اسی سے معلوم ہوا کہ افضل مفضل کی رائے کو ٹھکرا دے، اگر مصلحت کے خلاف ہو، اور افضل کو چاہیے کہ تردید کی وجہ بتلا دے۔

**الفاظ حدیث کی تحقیق** | **نیک بڑائی عجیب لفظ ہے**، کہ ثلاثی مجرد میں تو متعدی ہوتا ہے، اور مزید فیہ میں جا کر لازم ہو جاتا ہے۔ **قوله لأزاهمزه** کے ضمہ کے ساتھ، لام نووی لکھتے ہیں، کہ ہمزہ کو مفتوح ہی پڑھنا چاہئے، جو یقین کے معنی دیتا ہے۔ یعنی اعلیٰ، لہذا ضمہ کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ وہ اظنہ کے معنی میں ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کے بعد غلبنی ما اعلم یقین کے معنی کو بتلاتا ہے۔ لیکن لام نووی کے قول کا جواب یہ ہے کہ ضمہ پڑھنے کی صورت میں اس کو ظن غالب پر بھی محمول کر سکتے ہیں، اور علم کا اطلاق ظن غالب پر بکثرت ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے ”فان علمتموهن مومنات الخ“ میں ظن کے معنی ہی ہیں۔

**قوله او مسلم**۔ دوا ساکن، تقدیر عبارت ”قل او مسلم“ بطور تردید یا تقدیر ”قل مسلم“ بطریق جزم پڑھا جاتا ہے۔ اور از بمعنی بل کے بھی ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مؤمن کہنے کے بجائے مسلم کہو، کیونکہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے جو ایک مخفی شئی ہے، اور اسلام ظاہری انقیاد کا نام ہے، تو تمہیں مسلم کہنا چاہئے۔ یہ معاملہ چونکہ دربار رسالت کا ہے کہ آپ کے سامنے ایک ہر باطن کی خبر دی جائے، جو ایک نوع کی بے ادبی تھی، تاہم اگر کوئی شخص کسی کو مسلم کہے یا مؤمن تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔

**قوله أقتالا ای سعد**۔ تقدیری عبارت ”انقائل قتالا یا سعد؟“ یہ انداز حضور ﷺ کی ناگوری کا پتہ دیتا ہے یہاں قتال سے مراد امانت ہے، جیسے مرور کی حدیث میں فان ای فلیقائل یدافعة کے معنی میں ہے۔ بخاری شریف (۱) کتاب الزکاة میں لفظ ”اقبل ای سعد“ ہے اقبال سے ماخوذ ہے۔ حافظ نے لکھا ہے کہ مسلم میں ”اقبالا ای سعد“ بھی ہے، یعنی ”انقابلنی اقبالاً“ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ مسلم کا جو نسخہ ہمارے یہاں رائج ہے اس میں قتالاً کے ساتھ ہے اور ہمزہ استعہام کا ہے۔ (فتح المکرم ج ۱ ص ۲۹۳) لفظ ربط، تین سے دس تک جماعت کو کہتے ہیں۔

### موالفة القلوب کی تفصیل اور نیت المال کی نوعیت

”چوتھا مصرف، مصارف زکوٰۃ میں سے، موالفة القلوب ہے، یہ وہ لوگ ہیں، جن کی دل جوئی کے لئے، ان کو صدقات دیئے جاتے تھے، عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ ان میں تین چار قسم کے لوگ شامل تھے، کچھ مسلمان کچھ غیر مسلم، پھر مسلمانوں میں بعض تو وہ لوگ تھے، جو غریب حاجت مند بھی تھے، اور تو مسلم بھی، ان کی دل جوئی اس لئے کی جاتی تھی، کہ اسلام پر پختہ ہو جائیں، اور بعض وہ تھے، جو مالدار بھی تھے، اور مسلمان ہو گئے تھے، مگر ابھی تک ایمان کا رنگ ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا، اور بعض وہ لوگ تھے جو خود تو بکے مسلمان تھے، مگر ان کی قوم کو ان کے ذریعہ ہدایت پر لانا، اور پختہ کرنا مقصود تھا، اور غیر مسلموں میں بھی کچھ وہ لوگ تھے، جن کے شر سے بچنے کے لئے ان کی دل جوئی کی جاتی تھی، اور بعض وہ تھے جن کے بارے میں یہ تجربہ تھا، کہ نہ تبلیغ و تعلیم سے اثر قبول کرتے ہیں، نہ جنگ و تشدد سے، بلکہ احسان و سلوک سے متاثر ہوتے

ہیں، رحمۃ اللہ علیہ توبہ چاہتے تھے، کہ خلق خدا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر نور ایمان میں لے آئیں، اس کے لئے ہر وہ جائز تدبیر کرتے تھے، جس سے یہ لوگ متاثر ہو سکیں، یہ سب قسمیں عام طور پر موکفۃ القلوب میں داخل سمجھی جاتی ہیں، جن کو صدقات کا چوتھا مصرف قرآن کریم کی سورہ توبہ میں قرار دیا گیا ہے۔

عام خیال کے مطابق، ان میں مسلم و غیر مسلم، دونوں طرح کے لوگ تھے، غیر مسلموں کی دل جوئی اسلام کی ترغیب کے لئے، اور نو مسلموں کی دل جوئی، اسلام پر پختہ کرنے کے لئے کی جاتی تھی، عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ان کو رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں، ایک خاص علت اور مصلحت کے لئے جس کا ذکر ابھی آچکا ہے، صدقات دیئے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ کے وفات کے بعد جبکہ اسلام کو لازمی قوت بھی حاصل ہو گئی، اور کفار کے شر سے بچنے یا نو مسلموں کو اسلام پر پختہ کرنے کے لئے، اس طرح کی تدبیروں کی ضرورت نہ رہی، تو وہ علت اور مصلحت ختم ہو گئی۔ اس لئے ان کا حصہ بھی ختم ہو گیا، جس کو بعض فقہاء نے منسوخ ہو جانے سے تعبیر کیا ہے، فاروق اعظم، حسن بصری، شعی، ابو حنیفہ، مالک بن انس کی طرف یہی قول منسوب ہے۔

اور بہت سے حضرات نے فرمایا کہ موکفۃ القلوب کا حصہ منسوخ نہیں، بلکہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم کے زمانہ میں، اس کو ساقط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے، ان کا حصہ ساقط کر دیا گیا آئندہ کسی زمانہ میں پھر ایسی ضرورت پیش آجائے، تو پھر دیا جاسکتا ہے، امام زہری، قاضی عبدالوہاب بن عربی، امام شافعی، اور امام احمد کا یہی مذہب ہے، لیکن صحیح اور تحقیق بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کو صدقات وغیرہ سے کسی وقت کسی زمانہ میں حصہ نہیں دیا گیا، اور نہ وہ موکفۃ القلوب میں داخل ہیں، جن کا ذکر مصارف صدقات میں آیا ہے۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں، ان سب لوگوں کے نام تفصیل کے ساتھ ذکر کئے ہیں، جن کی دل جوئی کے لئے رسول اکرم ﷺ نے یہ صدقات سے حصہ دیا ہے اور یہ سب شمار کرنے کے بعد فرمایا ”وبالجملة فكلهم مومن ولم يكن فيهم كافر“ یعنی خلاصہ یہ ہے کہ موکفۃ القلوب سب کے سب مسلمان ہی تھے، ان میں کوئی کافر شامل نہیں تھا، تفسیر مظہری میں اس مغالطہ کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے جو بعض روایات کے سبب لوگوں کو پیش آیا ہے، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ رسول ﷺ نے بعض غیر مسلموں کو کچھ عطیات دیئے ہیں، چنانچہ صحیح مسلم اور ترمذی کی روایت میں جو یہ مذکور ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے صفوان بن ُیئہ کو کافر ہونے کے زمانہ میں، کچھ عطیات دیئے تو اس کے متعلق امام نووی کے حوالہ سے تحریر فرمایا کہ یہ عطیات زکوٰۃ کے مال سے نہ تھے، بلکہ غزوہ حنین کے مال غنیمت کا جو خس بیت المال میں داخل ہوا۔ اس میں سے دیئے گئے، اور یہ ظاہر ہے کہ بیت المال کی اس مد سے مسلم و غیر مسلم دونوں پر خرچ کرنا باقیات فقہاء جائز ہے پھر فرمایا کہ امام بیہقی ابن سید الناس، ابن کثیر وغیرہ سب نے یہی قول اختیار کیا ہے کہ یہ عطا مال زکوٰۃ سے نہیں بلکہ خس غنیمت سے تھی۔“ (مصارف القرآن)

### باب زیادة طمانينة القلب بتظاهر الادلة

حدثني حرملة بن يحيى..... عن ابي هريرة أن رسول الله ﷺ قال نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرْنِي كَيْفَ تُخَيِّرُ الْمَوْتَى، قَالَ اَوَّلُهُمْ تَوَمُنٌ، قَالَ بَلَى، وَلَكِنْ لَيَطْمَئِنُّ قَلْبِي، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ لَوْطًا لَّقَدْ كَانَ يَأْوِي إِلَى رَكْنٍ شَدِيدٍ وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السَّجْنِ مَلُوكًا لَّبِثْتُ يَوْسُفَ لَا جَبْثُ الدَّاعِي.

وحدثني به ان شلة الله عبد الله ابن محمد ابن اسلمه ضبعي الحديث. (مسلم ص ۸۵)

**ترجمہ** | حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے مستحق ہیں (مگر وہ سوال ازادہ شک کرتے) جس وقت انہوں نے کہا، اے میرے پروردگار مجھے دکھلا دے، کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے، ارشاد ہوا اچھا کیا تمہیں اس پر یقین نہیں، عرض کیا کیوں نہیں؟ لیکن مقصد یہ ہے کہ (کیفیت احیاء کا مشاہدہ کر کے) میرا دل اور مطمئن ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط پر رحم کرے، بیشک وہ ایک مضبوط سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔ اور اگر یوسفؑ کی طرح آنے والوں میں جیل میں رہ جاتا تو میں داعی کے پکار کو قبول کر لیتا۔

**مقصد حدیث** | حدیث جبرئیل میں ایمان کے مراتب بیان کئے گئے تھے، ایک مؤمن جب ایمان کا لطف حاصل کر لیتا ہے، تو اس کی برابر یہی خواہش ہوتی ہے کہ ایمانی مراتب کو درجہ بدرجہ طے کرتے رہیں، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کو احیاء موتی پر ایمان تو تھا ہی، محض کیفیت احیاء کے متعلق سوال کر کے ایمانی مراتب کے آخری درجہ تک پہنچنا تھا اور آخری منزل سے مراد علم الیقین سے عین الیقین تک رسائی ہے۔

### کیا حضرت ابراہیمؑ کو شک تھا؟

نحن احق بالشك۔ یعنی ہم حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ شک کرنے کے لائق ہیں، اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب حدیث باب کی آیت نازل ہوئی تو صحابہ میں سے کچھ حضرات نے کہا کہ شک حضرت ابراہیمؑ کو ہوا، میرے نبی کو نہیں ہوا، اس پر آپؐ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ اب اس جملہ کے ظاہری اسلوب سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے نہ صرف حضرت ابراہیمؑ کے لئے بلکہ اپنی ذات کے لئے بھی مذکورہ شک کا اثبات فرمایا حالانکہ دونوں کا اس طرح شک میں مبتلا ہونا امر محال ہے، اس لئے شارحین سے متعدد توجیہیں منقول ہیں۔

(۱) بعض صحابہ نے کہا کہ حضرت ابراہیمؑ کو تو شک ہوا، لیکن میرے نبی کو شک نہیں ہوا، جب اس کی خبر آپؐ کو ہوئی تو حضرت ابراہیمؑ سے شک کا دفعیہ کرنے کے لئے ”نحن احق بالشك“ فرمایا اور یہ وہی انداز ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے کوئی چیز دفع کرنا چاہتا ہے کہ اگر تم فلاں کو ناشائستہ بات کہنے کا ارادہ ہی کر چکے ہو، تو بجائے اس کو، مجھے کہہ لو، اور ظاہر ہے کہ تم بھٹکے نہیں کہہ سکتے، تو ان کو بھی نہ کہو۔

(۲) جب ہم کو شبہ نہیں، تو ان کو بھی شبہ نہیں، آپؐ نے تو واضح اور نسبت انبیت میں یہ فرمایا، یعنی ہم ان کی ذریت، اور قبیح قرآن میں ہے ”واتبع ملة ابراهيم حنيفا“ اگر بالفرض ان سے سوال کسی شک کی بناء پر سرزد ہوتا تو ہم اس شک کے زیادہ حقدار ہوتے، لیکن جب ہمیں کوئی شک نہیں، تو بھلا اس موحد اعظم کو کیا ہو سکتا ہے؟

(۳) ہم احیاء موتی کی کیفیت مشاہدہ کرنے کے ابراہیمؑ علیہ السلام سے زیادہ مشتاق ہیں، کیونکہ مشرکین مجھ سے زیادہ سوالات کرتے ہیں، اور بعث بعد الموت کی تکذیب، اور اس پر تعجب زیادہ کرتے ہیں تو ان کو سمجھانے کے لئے کیفیت احیاء دیکھنے کے ہم زیادہ مشتاق ہیں، اس کے باوجود ہم سوال نہیں کرتے، یہ جواب ابن جوزی کا ہے۔

(۴) علامہ سندھی فرماتے ہیں کہ نحن سے مراد آپؐ کی ذات شریفہ نہیں ہے، بلکہ ابراہیمؑ علیہ السلام کے علاوہ



دیگر انبیاء علیہم السلام ہیں، مقصد یہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیم کو شک ہوتا، تو دوسرے انبیاء کو بدرجہ اولیٰ ہوتا کیونکہ ان کو دوسرے انبیاء پر فوقیت حاصل تھی، جب دیگر انبیاء کو شک نہیں ہوا، تو افضل کو کیسے شک ہو سکتا ہے۔

(۵) نحن سے مراد امت ہے، جن کو شک ہو سکتا ہے، آپ کی ذات داخل نہیں، کیونکہ آپ معصوم ہیں، مطلب یہ ہوا کہ جب عام مومنین کو شک نہیں تو پھر ابراہیم علیہ السلام کو شک کیسے ہوتا ہے؟

### احیاء موتی کا سوال کیوں کیا گیا؟

اذ قال رب ارنی کیف تموتی قال اَو لَمْ تومن :- حضرت ابراہیم کا یہ سوال کسی شک کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ احیاء موتی کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کے متعلق سوال تھا، تاکہ عینی مشاہدہ ہو کر ایمان، عین یقین تک پہنچ جائے، سوال میں خود کیف کا لفظ اشارہ کرتا ہے کہ حالت و کیفیت کے متعلق شوق کا سوال تھا، نہ کہ شک کا، یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے کہ شوق کے سوال اور شک کے سوال میں زمین و آسمان کا فرق ہے ذوق و شوق عین تقاضہ یقین ہے، اگر خدا تعالیٰ کے احیاء پر، یقین نہ ہو تو کیفیت احیاء کے مشاہدہ کا شوق ہی کیسے پیدا ہو، یہاں ممکن تھا کہ کسی کج فہم کو یہ شبہ گزرتا، کہ احیاء موتی کے متعلق شک کی بنیاد پر حضرت ابراہیم نے سوال کیا تو اس گوشہ کو بھی قرآن نے از خود اَو لَمْ تومن کا سوال اٹھا کر حضرت ابراہیم کی زبان سے صاف کر دی۔

اس کو ایک مثال کے ذریعہ یوں حل کر لیجئے، کہ ریڈیو کی جو آواز ہم سنتے ہیں، یہ وہی آواز ہوتی ہے، جو اسٹیشن پر نکل رہی ہے لیکن اس نکل یقین کے باوجود، اگر ہم یہ سوال کریں کہ یہ آواز اتنی جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے پہنچ جاتی ہے، تو یہ سوال ہرگز اس کی دلیل نہیں بن سکتا، کہ ہمیں ریڈیو کے اصل وجود میں ہی کوئی شبہ لاحق ہے، بلکہ ہمارا یہ سوال اس کی دلیل ہو گا، کہ ہمیں اس کے وجود کا یقین ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا ہر گوشہ ہمارے سامنے ایسا ہی یقینی ہو جائے جیسا خود ریڈیو کا وجود۔ غرض یہ سوال تو صرف ایک احیاء موتی کے متعلق تھا، لیکن حضرت موسیٰ کا سوال تو اس سے کہیں بڑھ کر خود بارگاہ سبحانی کے جمال کے دیدار کا تھا، ”رب ارنی انظر الیک“ کون کہہ سکتا ہے اس سوال میں شک و تردد کی بو آتی ہے؟ بلکہ ہر لمحہ یقین کا کل ہی اس سوال کا محرک بنا۔

فائدہ :- اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں تک ایمانیات کی حدیں ہیں، اس پر تو صرف خدا اور رسول کے بیان پر ایمان لانا ہے، ہاں جو گوشے ایمانیات سے متعلق نہیں، ان میں اطمینان کے لئے مشاہدہ کے سوال کی محتاج نئش ہے، لیکن اگر ایمانیات کا یقین بھی مشاہدہ کے بغیر، کسی کو حاصل نہیں ہوتا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو بیان رسول پر اعتماد نہیں، ظاہر ہے کہ اس طرح کے یقین کو ایمان نہیں کہا جائے گا۔

نیز مذکورہ واقعہ سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ نوحان و یقین کی ساری منزلیں طے کرنے کے بعد، بھی ہر گوشہ میں اطمینان و سکون میسر آ جانا، ضروری نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ پورا یقین ہو جانے کے بعد بھی غائبات کے کچھ گوشے ایسے تشہ رہ جائیں جن کے بھانے کی نفس انسانی میں طلب باقی رہ جائے، چونکہ یہ گوشہ ایمان کا جزو شمار نہیں ہوتا، اس لئے اس کے مشاہدہ کی جستار واد میں شامل نہیں۔

بعض شارحین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ سوال کیا کہ کیا ایک جواب تو گزرا کہ یہ سوا شوق تھا، جیسے کہ ہر مؤمن کو رسول پاک ﷺ جنت و دوزخ پر کامل یقین ہے، تاہم دیکھنے کا جذبہ ہر ایک کو ہے تو اظہار جذبہ کو شک پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ (۲) اور حقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مقام قرب کو دیکھنا چاہتے تھے، کہ خدا ان کی اس درخواست کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ اس صورت میں تو ہم تو من کا معنی یہ ہو گا کیا تجھ کو اس بات کا یقین نہیں کہ تو میلادوست ہے۔ اور تیر اور جہ میرے نزدیک بڑا ہے۔ (۳) حضرت ابراہیمؑ نے ایک موقع پر توحید کے اثبات میں مشرکین کے سامنے دلیل قائم کی میرا پروردگار جلاتا ہے اور مارتا ہے، تو انہوں نے چاہا کہ اب اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں تاکہ ان کی دلیل صاف ہو جائے۔

وقوله یرحم الله لوطا لقد کما یاوی الی رکن شدید۔ اللہ تعالیٰ حضرت لوط پر رحم فرمائے، جو رکن شدید کا سہارا پکڑنا چاہتے تھے۔ رکن اصل میں کسی بھی چیز کے مضبوط کنارے، یا مضبوط ستون کو کہتے ہیں، اور یہاں رکن شدید سے مراد مضبوط اور طاقت ور جماعت ہے۔

اس جملہ کا پس منظر یہ ہے کہ، حضرت لوط کی قوم، بد فعلی، خبیث اخلاقی گراؤ میں مبتلا تھی، حضرت لوط کی پند و نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا، تو ان کی ہلاکت کے لئے دو فرشتے حسین و خوبصورت جوان کی شکل میں آئے، جب قوم کو دو حسین مہمان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آگئے، اور کہنے لگے، کہ ان کو حوالہ کریں، ہم اپنی ہوس پوری کریں گے، حضرت لوط نے بہت سمجھایا، ان کو بہت غیرت آئی، مگر کوئی ایک نہ سنتا تھا، جب پریشان خاطر ہو کر، فرمایا کہ کاش تمہارے مقابلہ میں مجھے (وآتی) طاقت یا کوئی مضبوط سہارا (ساتھیوں کی حمایت) حاصل ہوتی تو اس کا سہارا لیتا، اور مہمانوں کو بچا لیتا، حضور ﷺ نے ان کی اسی حسرت و تمنا کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کہ انسانی قوت کا سہارا چاہنے لگے، حالانکہ اصل سہارا تو خدا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کو بھول کر کسی اور کی پناہ کے طالب بن گئے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وقت قوم کے ارادہ بد کو دیکھ کر استقدر پریشان، اور اس درجہ قابل رحم حالت میں تھے، کہ طبعی طور پر ان کی یہ تمنا ہوئی کہ کاش خدا مدد فرماتا اور اتنی قوت عطا فرمادیتا، گویا آپ ﷺ کا منشا یہ ظاہر کرنا تھا، کہ حضرت لوط ایک انسان تھے، ایسے نازک وقت میں ان کی بشری جبلت کا اندرونی تقاضا یہ ہوا کہ ان بد کردار کو مزہ چکھانے کے لئے مضبوط لوگوں کے متشی ہوئے، رہا یہ رحم اللہ کہنا، تو محض دعاء و تعظیم، اور شانِ تقدس کو باقی رکھنے کے لئے فرمایا۔

حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ نے اپنے خاص انداز میں اس کی یوں تفصیل کی ہے :

واقعہ اس کا یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم جب سرکشی میں حد سے تجاوز کر گئی اور معاصی و فواحش میں خلاف فطرت ایک ایسے عمل کا دروازہ کھول دیا جس سے دنیا آشنا نہ تھی تو آخر ان کی ہلاکت کی گھڑی آگئی۔ اور اللہ تعالیٰ کے فرشتہ خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آہونچے صورت یہ ہوئی کہ پہلے وہ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان بن گئے۔ ان کو ابھی کچھ علم نہ تھا کہ اصل ماجرا ہے کیا؟ انہوں نے حسب دستور انبیاء علیہم السلام اپنے مہمانوں کو احترام سے لیا اور ان کی قوم کو اس کی خبر لگ گئی تو معصیت کے نشہ میں چور ہو کر ان کے مکان پر آچڑھے اور ان کے معزز مہمانوں پر ہاتھ ڈالنا چاہا اندازہ کرو کہ قوم کے سارے ناہنجار افراد ایک طرف اور حضرت لوط علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی آبرو ایک طرف نہ خود مدافعت کی

طاقت اور نہ قبیلہ ہی اتنا زور دار کہ ان کی مدد کر سکے۔ اس حیرت اور مجبوری کے عالم میں ان جاہلوں کو بڑی فہمائش کی، اور جو ایک بلند حوصلہ اور ہامروت انسان اپنے مہمان کی خاطر بڑے بڑے ایثار کر سکتا ہے وہ بھی کر گذرے یعنی ابھی تک کفار اور مسلمانوں کے درمیان نکاح درست تھا خود حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی کافرہ تھی اور ہماری شریعت کے ابتداء میں بھی یہ نکاح درست سمجھا جاتا تھا لہذا انہوں نے خدائی حدود کے تحفظ اور اپنے مہمانوں کی خاطر وہ بات بھی برداشت کر لی جس کو جواز کے باوجود بھی بے اختیار برداشت نہ فرماتے اور یہ بات کہی کہ تم میری لڑکیوں سے نکاح کر سکتے ہو یہ ایک شرعی راستہ لیکن ایک حرام کار نکاح اور وہ بھی میرے گھر پر پھر وہ بھی اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس پر ان کی جاہل قوم نے جو فواحش کے خوگر انسانوں کا جواب ہوا کرتا ہے وہی جواب دیدیا اب حضرت لوط کی اس بیچارگی اور قوم کی سرکشی اور فاسد ارادہ کا نقشہ سامنے رکھو اور اندازہ لگاؤ کہ یہ سماں ایک نبی کے دل پر کیا گذر رہی ہو گی آپ کے دل کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو مگر آنحضور ﷺ کی غیبیہ اخوت کے سامنے جب یہ نقشہ آیا تو آپ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور بڑے درد کے انداز میں فرمایا الہی میرے بھائی لوط پر بڑی رحمتیں نازل فرما کہ قوم کی نالائقیوں اور اذیتوں سے تنگ آکر انھیں ان کلمات کے کہنے کی نوبت آگئی جو فطرت بشری سے بدرجہ مجبوری نکلا کرتے ہیں۔ یعنی کاش اس مصیبت و نصیبت کا نقشہ بدلنے کی طاقت خود میرے دست و بازو میں ہوتی یا میرا کوئی زور دار قبیلہ ہو تا تو ان ناخجاردوں کو سزا دی جاتی انبیاء علیہم السلام کے مخلصانہ اور عاجزانہ کلمات کبھی خالی نہیں جاتے لہذا ان کی یہ آواز بھی آسمانوں پر سنی گئی اور اسی دن کے بعد سے سنت الہیہ یہ ٹھہر گئی کہ جب کوئی نبی آتا تو ہمیشہ قبیلہ کا آتا، انسان کا خاصہ ہے کہ جب وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے تو تسلی کے لئے اس قسم کے گزشتہ واقعات کا تصور بڑا طمینان بخش ہوتا ہے۔ اسلئے جب آپ بھی مصائب و آلام کے اسی دور سے گذر رہے تھے تو ایک مرتبہ آپ کو اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یاد بے ساختہ آگئی پھر کیا تھا ان کی عظمت شان بیان کرنے کا گویا ایک موقع ہاتھ آگیا۔ اسلئے فرمایا ”رحم اللہ موسیٰ لقد اودى اکثر من ذالک فصبر“ یہاں اکثر کے لفظ کا صرف مقصد یہ ہے کہ ان کی مصیبتوں کا نقشہ اپنی مصیبتوں سے بڑھا کر تصور کیا جائے تاکہ تسلی کا سامان ہاتھ آئے، آپ نے دیکھا آنحضرت ﷺ کے سامنے جب اپنے بھائیوں کے مصائب کا نقشہ آیا تو ہمیشہ ان کے حق میں بزرگی اور دعاء کے کلمات ہی نکلے اور ہر موقع پر اپنی فروتنی اور تواضع کا ہی اظہار ہوتا رہا اور کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ سالوں ایک گھنٹی میں بے آب و دانہ قید رہنے کی حالت میں یا طائف کے میدانوں میں خون سے رنگین ہو جانے یا سر کے زخمی اور دندان مبارک کے شہید ہو جانے کے بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام کے بالمقابل کبھی یہ کلمہ زبان پر آیا ہو کہ ان مصائب پر جس طرح میں صبر کیا مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں کیا۔

### کیا حضرت لوط نے دوسروں کی لڑکی پیش کی تھی؟

فائدہ :- (۱) اگر یہاں لفظ بنات سے مراد قوم کی بنات لی جائے تو بے شبہ اس مجازی معنی کا استعمال خلاف محاورہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر پہلے یہ غور کر لینا چاہئے کہ نبی کی معنوی ابوت کے لحاظ سے عرف قرآن میں کہیں امت کی لڑکیوں پر نبی کی زبان سے، بناتی، کا اطلاق ہوا ہے۔ ہمارے ذہن میں تو کوئی ایسی آیت نہیں ہے۔

(۲) دوم جب اخوت اسلامی کے لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ کو ”ہذہ اختی“ کہا ایک کذب کے برابر

سمجھا ہو تو پھر اجنبی عورتوں کو کسی معنوی رشتہ سے بنات کہہ کر پکارنا انبیاء علیہم السلام کے عرف میں کہاں تک قرین قیاس ہو سکتا ہے، نیز بناتی میں خاص اپنی طرف نسبت کرنے سے جس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے اس کا نکتہ بیان کرنا بھی ضروری ہو گا بالخصوص جبکہ وہ عورتیں کافرہ تھیں۔ چہارم یہ کہ قرآن کریم نے کفر کے ساتھ اپنے نبی عزیر کو "ان ابنی من اہلی" کہنے کی ممانعت کی بلکہ صاف "انہ لیس من اہلک" فرمایا تو پھر جن کافرہ عورتوں کیساتھ نبی کوئی رشتہ بھی نہیں تو ان کو بناتی کا پیارا کہہ کہاں کہاں تک مناسب ہو سکتا ہے۔ کیا ان کافروں کی اولاد پر جو نبی کی فضیلت کے لئے چڑھ آئے تھے اپنے اس معنوی رشتہ کے اظہار کا یہی عمل رہ گیا تھا، بیچم اگر ان مجبور کن حالات میں بھی اپنی حقیقی بنات کی جائز پیش کش قابل اعتراض ہو سکتی تھی تو کیا دوسروں کے لڑکیوں کی پیش کش پھر وہ بھی اسی قابل اعتراض عنوان سے کچھ کم قابل اعتراض ہے، کیا نبی کے شان کے یہ مناسب ہو گا اپنی بلاتلے کے لئے اپنی امت کی لڑکیوں کی پیش کش کرے اور صرف بناتی کے ایک محبت آمیز کلمہ کی آڑ لے کر وہی بلاتا ان کے سر ڈالنے کا ارادہ کرے یہ تو پہلے سے بھی ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ مفسرین بناتی کے جو مجازی معنی مراد لیتے ہیں اگر اس اعتراض سے بچنے کے لئے ہے تو مجازی معنی مراد لینے میں بھی یہ عقلی اعتراضات ہیں۔ فہل الی خروج من سبیل۔

فائدہ نمبر (۲) :- جن لوگوں نے رکن شدید سے یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لی ہے انہوں نے قرآنی آیات "او ای الی رکن شدید الخ" میں "او" حرف تردید پر غور نہیں کیا اور صحیح بخاری کے ایک لفظ کی مراد بھی خود اسی معنی کی مویہ سمجھ لی۔ حالانکہ اس روایت کا مطلب بھی دوسرا ہے ابن حزم نے ملل و التحلل میں لکھا ہے کہ اس سے ملائکہ اللہ مراد ہیں۔

قول ولو لبثت فی السجن الخ : اس جملہ کا اشارہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی طرف ہے یہ تو معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان بڑی اونچی ہوتی ہے مگر ان کی باز پرس بھی بڑی ہوتی ہے۔ ان سے مواخذہ بھی سخت ہوتا ہے حضرت سوئی سے ایک بار یہ کلمہ نکل گیا "انا اعلم" بات بالکل ٹھیک ہے انبیاء اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے اعلم ہوتے ہیں، مگر ان کا یہ کلمہ بھی آفت میں آگیا، حتیٰ کہ اس کی سرگذشت سورہ کہف میں مستقلاً بیان کی گئی ہے جو تاقیامت تلاوت کرنے والوں کی زبانوں پر تازہ ہوتی رہے گی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے اپنی بیوی سے متعلق ایک نازک سے نازک وقت میں "ہذہ اختی" کا کلمہ نکل گیا۔ مگر وہ ہمیشہ اس پر نام رہے کہ روز محشر تک اس کی سختی زبان سے نہ مٹی آخر جب اہل محشر ان سے شفاعت کے لئے عرض کریں گے تو اپنے اسی قسم کے کلمات یاد کر کے فرط عداوت سے سر جھکائیں گے اور فرمائیں گے میں اس بلند مقام کا اہل نہیں ہوں اس طرح کی لفظی گرفت اور اپنی ذرا سی بات پر اس طرح عداوت اسی مقدس گروہ کا خاصہ ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی جب زنان مصر کی دعوت کا منظر آیا۔ اور جیل خانہ کی سخت دھمکی بھی ان کے کانوں نے سنی اور ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ اب تمہارے لئے صرف دو ہی راستے ہیں، یا زینحاک و دعوت قبول کرو یا جیل خانہ کے لئے تیار ہو جاؤ اب انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا اندازہ یہاں سے کر لو۔ کہ نوجوانی کے عالم میں سامنے سے حسن اپنی پوری شوکت و طاقت کے ساتھ خود دعوت دے رہا ہے مگر نبیانہ عصمت ہے کہ پہاڑ کی طرح جزر و اثرزل نہیں ہوتی اور جواب صرف یہ ہے کہ اگر میرے لئے راہیں صرف یہی دو ہیں تو مجھ کو اپنی عصمت کے مقابلہ میں جیل خانہ اختیار کر لینا بخوشی پسند ہے۔

مفسرین کا خیال ہے کہ یہ جواب زنان مصر کے سامنے ایک نبی کا نہیں بلکہ فرشتہ کا جواب تھا لیکن چونکہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی نظر اپنے رب کی طرف اٹھی ہوئی تھی جس نے ان کی تربیت نبیانہ تربیت فرمائی تھی اس لئے یہ بلند جواب بھی گرفت میں آگیا۔ ”رب السجن احب الی مما یدعوننی الیه“ ان مفسرین کا خیال یہ ہے کہ جب معاملہ پروردگار کے سامنے آگیا تھا تو اب یہاں اس کے لئے ایک تیسرا راستہ اور تھا اور وہ پوری عافیت تھی۔ یعنی نہ ان کی دعوت کو بلیک کہنا پڑے اور نہ جیل خانہ کی مصیبت سہنی پڑے رب کے سامنے نہ یہ مشکل نہ وہ مشکل اس قسم کی توفیق صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ اور ان کا مقصد ان کے منصب کی بلندی اور نزاکت کا اظہار اور عام انسانوں کو یہ سبق دینا ہوتا ہے کہ ضعیف انسان کو کسی موقع پر بھی ایسا کلمہ منہ سے نکالنا نہیں چاہئے۔ بلکہ اپنے پروردگار سے ہر حالت میں عافیت ہی عافیت طلب کرنی چاہئے، انسان کی استقامت کتنی ہی مضبوط ہو مگر اس کو آزمائش میں ڈالنے کی کیا ضرورت یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کی شان ہوتی ہے کہ جتنی آزمائشوں میں وہ پھنستے ہیں اتنی ہی اور کھرے ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کلمہ کو بھی جس صداقت کیساتھ حضرت یوسف نے اپنے منہ سے نکالا تھا پھر آخر دم تک اسی مضبوطی کے ساتھ اس کو نبھایا بھی حتیٰ کہ جب ان کو رہائی کی خبر ملی تو جلدی سے فوراً اس طرح باہر نہیں آئے کہ پہلے جوابات منہ سے نکل گئی تھیں گویا وہ بے سوچے سمجھے نکل گئی تھیں یا صرف وقتی جذبات تھے جس پر بعد میں ان کو ندامت ہو سکتی تھی بلکہ بڑی استقامت کے ساتھ فرمایا کہ تم رہائی کا حکم لے کر آئے ہو مگر جس نے اپنی خوشی سے جیل خانہ پسند کیا تھا وہ اس وقت اپنی رہائی پسند نہیں کر سکتا جب تک اس کے سر تہمت رکھنے والی عورتیں خود بھی اس کے بے گناہی کا اعتراف نہ کر لیں تم نے دیکھا کہ نبی کی زبان سے جو کلمہ نکل گیا تھا وہ اس کے قلب کی کس گہرائی سے نکلا اور آخر تک کس شان سے اس کو نبھایا گیا یہ شان انبیاء علیہم السلام ہے مگر سہ اللہ یہاں بھی پوری ہو کر رہی آخر ان کے الفاظ کے جو آثار ہونے تھے وہ نمایاں ہو کر رہے یہ شان الہی تھی یہ دونوں شانیں اپنی اپنی جگہ داؤچی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے سامنے جب اپنے بھائی یوسف کی اس مصیبت کا نقشہ آیا تو آپ ان کی داد دینے کے لئے یہاں بھی خود بے تاب ہو گئے اور صرف اسی پر کفایت نہیں کہ بلکہ ان کی عزت و احترام میں تواضع کے جو کلمات اپنے حق میں استعمال فرما سکتے تھے وہ استعمال فرمائے یہ ہے اخوت نبوت کہ سر پر سرداری کا تاج رکھا ہو اسے مگر یوں نظر آتا ہے کہ آپ اپنے بھائیوں پر فوقیت کے جذبات سے اتنے خالی ہیں گویا دھر التفات ہی نہیں حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کامل کا کمال جتنا بڑھتا جاتا ہے اس کی شان تواضع اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی ہے، اس انکسار و تواضع کے کلمات اس کے نقص کا موجب نہیں ہوتے بلکہ اور اس کے کمال کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے مصائب کا نقشہ بار بار آپ کے سامنے آنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ قرآن کریم میں خاص طور پر آپ سے خطاب ہے ”فاصبر کما صبر اولو العزم من الرسل“ چونکہ قرآن کریم ہی نے آپ کے صبر کے لئے انبیاء علیہم السلام کے صبر کا تصور رکھا تھا اس لئے ہر صبر آزمایہ موقع پر آپ صبر فرماتے۔

آپ کی شان تواضع اور انکساری میں بڑا دخل اس کو بھی ہے کہ آپ کی فطرت میں عبدیت اس طرح گونہ محسوس گئی کہ آپ کی رفتار و گفتار، نشست و برخاست، خصلت و صفت ہر ادا میں وہ بے اختیار چلتی نظر آتی تھی۔ اب آپ اس خاص صفت عبدیت کے پیش نظر سوچئے کہ ایک عبد کا نقشہ یہاں کیا ہونا چاہئے کیا یہی نہیں کہ جب اس کا آقا جیل خانہ میں بھیجے تو بڑی

خندہ پیشانی سے چلا جائے اور جب اس کو باہر کرنا چاہے تو خوشی خوشی باہر نکل آئے گویا قید و رہائی کے دونوں معاملے اپنے آقا کے حکم برداری کے سامنے اس کے لئے برابر ہوں۔ اگر آپ کا جواب تم اسی روشنی میں پڑھو تو معلوم ہوگا کہ جو انگساری کے جملے یہاں آپ کی زبان مبارک سے نکل رہے ہیں وہی آپ کی برتری کی سب سے کھلی دلیل ہے۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

## باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام حاکما بشریعة نبینا صلی اللہ علیہ وسلم شریعت محمدی کے مطابق حاکم بن کر حضرت عیسیٰ کا نزول

حدثنا قتیبہ بن سعید..... عن ابن النُسَیب أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَيُؤْشِكُنَّ أَنْ يَنْزَلَ فِيكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا مُقْسِطًا فَيَكْسِرُ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلَ الْخَنَازِيرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيَقْنِضَ الْعَمَالَ حَتَّى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ.

(۲) وفی حدیث الثَّوْبِ مِنْ الزَّيَادَةِ وَحَتَّى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ أَقْرَبُ وَأَنْ شِئْتُمْ وَأَنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ الْخ.

(۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهِ لَيَنْزِلَنَّ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَادِلًا فَلَيَكْسِرَنَّ الصَّلِيبَ وَلَيَقْتُلَنَّ الْخَنَازِيرَ وَلَيَضَعَنَّ الْجِزْيَةَ وَلَيَنْتَزِكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يَسْعَى عَلَيْهَا وَلَيَتَذَهَبَنَّ الشُّكْنُ وَالْتَّبَاعُضُ وَالتَّخَاسُّفُ وَلَيَدْعُوَنَّ إِلَى الْعَمَالِ فَلَا يَقْبَلُهُ أَحَدٌ.

(۴) قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيكُمْ وَأَمَامَكُمْ مِنْكُمْ - قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ فَيَنْزِلُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُولُ أَمِيرَهُمْ تَعَالَى صَلِّ لَنَا فَيَقُولُ لَا إِيَّاهُ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ أَمْرًا تَكْرِمَةَ اللَّهِ هَذِهِ الْأُمَّةُ. (۱)

ترجمہ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کہ یقیناً وہ زمانہ قریب ہے، جبکہ ابن مریم تمہارے درمیان اتریں گے وہ ایک منصف فیصلہ کرنے والے کی حیثیت سے آئیں گے صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور سور کو مار ڈالیں گے، اور جزیہ ختم کر دیں گے، اور ان کے دور میں مال کی اس طرح فراوانی ہوگی، کہ کوئی شخص اس کو قبول کرنے والا نہ ہوگا۔

دوسری روایت میں یہ بھی ہے، کہ لوگوں کی نظر میں، ایک سجدہ کی قدر و قیمت دنیا و ما فیہا سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی، یہ

(۱) بخاری ص ۴۹۰-۴۸۸ مسلم ص ۸۷ ابوداؤد ص ۵۹۴-۵۹۳ ترمذی ص ۴۷ حدیث (۴) بخاری

ص ۴۹۰-۴۸۹ مسلم ص ۸۷ حدیث (۳) بخاری ص ۴۹۰-۴۸۸.

مضمون فرما کر ابوہریرہ کہتے تھے، کہ اگر تم اس مضمون کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہو، تو سورہ نسا کی یہ آیت پڑھ لو "وَمِنْ اٰهْلِ الْكِتَابِ الْيَهُودُ"

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ بخدا الہ بن مریم ضرور اتریں گے، ایک منصف حاکم بن کر، اور صلیب کو ضرور توڑیں گے، اور سور کو ضرور ماریں گے، اور ٹیکس کو ختم کر دیں گے، اور یقیناً اونٹوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور اس پر کسی طرح کی کوبشش نہیں کی جائے گی، اور دلوں سے عداوت و بغض و حسد دور کر دیا جائے گا۔ اور مال کے لئے بلایا جائے گا، تو اس کا کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا بھلا اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی، جبکہ عیسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان آسمان سے اتریں گے، اور تمہارا امام خود تم میں کا ہوگا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضور ﷺ سے سنا ہے کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق کے مقابلہ میں جنگ کرتی رہے گی، اور تاقیامت اپنے دشمنوں پر غالب آتی رہے گی، اس کے بعد آپ نے فرمایا، آخر عیسیٰ بن مریم اتریں گے، مسلمانوں کا امیر ان سے عرض کرے گا، تشریف لائیے اور نماز پڑھائیے، وہ فرمائیں گے یہ نہیں ہو سکتا، اس امت کا اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اکرام و اعزاز ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے کے امام و امیر بنو۔

حدیث جبریل میں، ایمان کے بہت سے مومن بہ بتلائے گئے تھے، اللہ، رسول، ملائکہ، کتاب اللہ، قیامت وغیرہ، امام مسلم انہیں مومن بہ کی تفصیلات پر روشنی ڈال رہے ہیں، اور حدیث جبریل کے اجماعی مومن بہ کی تفصیلات پیش کر رہے ہیں، ان میں ایک نزول عیسیٰ کا عقیدہ ہے، نیز حدیث جبریل میں قیامت کی علامتوں کا سوال کیا گیا تھا، نزول عیسیٰ بھی علامت قیامت میں ہے۔

### مقصد حدیث

”حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت ہوگی، وہ کوئی معمولی محکوم، انسان نہیں ہو گے، بلکہ حاکم ایسے کے اس وقت کی بڑی طاقت، نصرانیت کو روحانی، اور مادی دونوں طرح ختم کریں گے، شعائر نصرانیت کو توڑ ڈالیں گے۔

### شرح حدیث

لیوشکن: باب افعال سے قرب کے معنی میں، یعنی وہ زمانہ بہت قریب ہے۔  
حکما: یعنی شریعت محمدی کے مطابق فیضہ کریں گے، ایسا نہیں کہ مستقل نبی بن کر آئیں، جس طرح بنی اسرائیل میں مستقل آئے تھے، غلامہ سندھی حکما، بمعنی حاکم کرتے ہیں۔ اور اس لفظ کو استعمال کرنے میں اشارہ ہے کہ ان کی آمد بحیثیت نبوت نہیں ہوگی۔

صلیب: وہ مثلث لکڑی جس کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اسی طرح کی رسی پر ان کو سولی دی گئی، مراد دین نصرانیت کا پورے طور پر خاتمہ ہے۔

یقتل الخنزیر: طبرانی کی روایت میں "والقردة" کا بھی اضافہ ہے، خنزیر مارنے میں عیسائیوں کے شعائر کو ختم کرتا، اور بندر کو مارنے میں ہندوؤں کے شعائر اور ان کے اوبام باطلہ کو ختم کرنا مقصود ہے، اس سے معلوم ہوا کہ منکرات کو روکنے میں حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے۔ "م"

ویضع الجزیۃ: ان کی آمد کے بعد پوری دنیا میں صرف دین اسلام باقی رہ جائے گا، کوئی ذمی نہیں رہے گا، کہ جزیہ لینے کا سوال پیدا ہو، اس لئے کہا گیا، جزیہ ختم کر دیں گے، بعض حضرات نے یہ توجیہ بھی کی ہے، کہ مال کی اتنی فراوانی ہو جائے گی، کہ جزیہ کی رقم صرف کرنے کا کوئی مصرف ہی باقی نہ رہے گا اس لئے جزیہ کو ختم کر دیا جائیگا۔ لیکن یہ توضیح صحیح نہیں، کہ کفار کو اپنے مذہب پر چھوڑ دیا جائیگا۔ اور جزیہ نہیں لیا جائے گا کیونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں اسلام کے علاوہ کچھ قبول ہی نہیں کیا جائے گا۔ اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے، کہ حضرت عیسیٰ دین محمدی کے تابع ہوں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دین محمدی میں جزیہ موقت ہے نزول عیسیٰ تک، اور اس کا پتہ اسی روایت سے چلتا ہے، تو حضرت عیسیٰ سین بنی اسرائیل ہیں نہ کائنات۔

یفیض المال: عدل و انصاف، اور عدم تشدد کے سبب خیر و برکت کا ظہور بکثرت ہوگا، اسلئے مال کی ریل پیل ہوگی۔  
حتی تكون السجدة الواحدة الخ: یعنی لوگوں کو نماز اور دیگر عبادتوں میں ایسی رغبت پیدا ہو جائے گی، کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی معلوم ہوگا، یا تو اس وجہ سے کہ دنیا کی رغبت ہی کم ہو جائے گی، یا چونکہ دنیا کے ختم ہونے کا وقت قریب ہوگا، اس لئے دنیا سے بیزاری اور آخرت کی رغبت بڑھ جائے گی۔

اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا "اقروا ان شئتم وان من اهل الكتاب الخ" اس آیت میں قبل موت کی ضمیر کے سلسلہ میں مفسرین کی مختلف رائے ہے، کہ اس کا مرجع حضرت عیسیٰ ہیں یا اہل کتاب؟ لیکن جس سیاق میں حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ جملہ پیش فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا خیال یہ ہے کہ موت کی ضمیر کا مرجع، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، آیت کا مطلب یہ ہوگا، کہ لگے نزول کے بعد تمام اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے، یعنی ان کو خدا کا خاص بندہ اور ابن مریم ہونے کا یقین کریں گے، یہی خیال مفسرین کی ایک جماعت کا ہے، اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ مرجع کتابی ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ہر کتابی کو اپنی موت کے وقت حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلط خیال کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور ان کا ایمان حضرت عیسیٰ پر درست ہو جاتا ہے، اگرچہ یہ ایمان معتبر نہیں، کیونکہ یہ غرغہ کے وقت کا ایمان ہے۔

یہ توجیہ پہلی توجیہ سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ پہلی توجیہ سے صرف کتابی خاص ہو جاتے ہیں، اور قرآنی الفاظ سے عموم سمجھ میں آتا ہے، خواہ نزول عیسیٰ کے وقت کتابی ہوں، یا اس سے قبل، دوسری توجیہ کی تائید دوسری قرأت قبل موہم سے ہوتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ "یہ" کا مرجع آنحضور ﷺ ہیں اور "موتہ" کے مرجع کتابی، یعنی ہر کتابی موت کے وقت حضور ﷺ پر ایمان لے آتے ہیں گو کہ یہ ایمان معتبر نہیں۔

بعض لوگ "یہ" کا مرجع اللہ، اور "موتہ" کا مرجع اہل کتاب کو ٹھہراتے ہیں، یعنی ہر کتابی موت کے قبل خدا پر صحیح ایمان لے آتا ہے ان توجیہات میں پہلی دونوں توجیہیں معروف و مشہور ہیں۔

قوله لیترکن القلاص: قلاص قلوص کی جمع، بمعنی اونٹ، یعنی اونٹوں کی بھی رغبت نہیں ہوگی، یہ بھی کثرت مال کا نتیجہ ہوگا۔

قوله شحفاء: عداوت، بغاض، سبب عداوت، یہ سب حب دنیا کا نتیجہ ہے، جب دنیا، اور جاہ کی محبت ہی نہیں



ہوگی، تو یہ ساری بیماریاں ہی ختم ہو جائیں گی۔

کیف انتم الخ: خوشی کا اظہار، و امامکم منکم، ابن ماجہ کی ایک لمبی حدیث جس میں و جال کا ذکر ہے، اسی میں یہ قصہ بھی ہے کہ مسلمان بیت المقدس میں ہوں گے اور ان کے امام ایک صالح انسان ہوں گے، اور نماز پڑھائیں گے، وہ مصلیٰ پر جا چکے ہوں گے، کہ حضرت عیسیٰ کا نزول ہو گا اور وہ امام پیچھے ہٹ جائیں گے، تاکہ عیسیٰ علیہ السلام نماز پڑھائیں۔

### نزول عیسیٰ کے وقت امام کون ہو گا؟

امامکم منکم فامامکم: اس وقت اس امت کے امام کون ہوں گے؟ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے حضرت امام مہدی ہوں گے، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے، ان دونوں روایتوں کے تضاد کو دور کرنے کے لئے مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) امام سے مراد، حضرت عیسیٰ ہوں، تو مطلب یہ ہو گا، کہ حضرت عیسیٰ اس زمانہ میں امت محمدیہ ہی کے ایک فرد ہوں گے، کیونکہ ان کا فیصلہ قرآن کے مطابق ہو گا نہ کہ انجیل کے مطابق۔

(۲) اگر امام سے مراد، حضرت مہدی کو لیا جائے، تو مطلب ہو گا کہ جس وقت آسمان سے نزول ہو گا وہ وقت فجر کا ہو گا، اور جماعت کی تیاری میں لوگ ہو گے حضرت مہدی امامت کے لئے جا چکے ہوں گے مگر نماز شروع ہونے سے پہلے حضرت عیسیٰ کا نزول ہو گا۔ حضرت مہدی ان سے امامت کی درخواست کریں گے، مگر اس نماز میں حضرت مہدی ہی امامت کریں گے اس کے بعد حضرت عیسیٰ امامت کریں گے تو "امامکم منکم" سے وہ فجر کی نماز، اور "امکم" سے اسکے بعد والی نماز مراد لی جائے۔

(۳) امامکم میں امام سے مراد، امام مہدی ہیں، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ایسے وقت میں، جبکہ ہمارا امام خود ہم میں ہی کا ایک شخص ہو گا اس صورت میں امام سے مراد امامت کبریٰ یعنی امیر و خلیفہ ہے، اور امامت کے لئے بلاتا، اس سے امامت صغریٰ مراد ہے۔

اب ظاہر ہے کہ دونوں مضمون بالکل متحدہ متحدہ ہیں۔ اور اسی طرح منقول ہیں، غرض حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں لفظ "وامامکم منکم" سے پہلا مضمون، یعنی امامت کبریٰ مراد ہے، اس سلسلہ کی کئی روایات ترجمان السنۃ میں مذکور ہیں۔

### حضرت عیسیٰ کا نزول کیوں؟

خدائی نظام یہ ہے کہ دنیا کے خاتمہ پر جملہ ادیان پھر ملت واحد بن جائے، ظاہر ہے اس کے لئے اہل کتاب اور اہل قرآن کا اختلاف ختم ہونا لازم ہے، اس لئے خدا کی مصلحت کا تقاضا ہو کہ ایسے آدمی کو بھیجا جائے جو فریقین کے نزدیک ان کی شخصیت مسلم ہو، تاکہ خدا کی حجت دونوں فریق پر پوری ہو جائے۔

### نزول عیسیٰ کا عقلی جائزہ

حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے، اور پھر زمین پر اترنے کی سرگزشت ایک تعجب خیز بات ہے، لیکن سب سے پہلے یہ سوال سامنے رکھنا چاہئے کہ کس دور اور کس شخصیت سے متعلق ہے کیونکہ دنیا کے روزمرہ معمولی واقعات بھی زمانہ اور

شخصیتوں کے مختلف ہونے سے مختلف ہو جاتے ہیں، اسی زمین پر ایک حصہ ہے جہاں مہینوں کی رات اور مہینوں کا دن ہوتا ہے، اسی طرح انسانوں کا اختلاف بھی ہے ظاہر ہے کہ بہادری اور طاقت کے وہ بعید سے بعید کارنامے جو رستم، ہٹلر وغیرہ کے حق میں بے تامل تصدیق کرائے جاتے ہیں، وہ عام انسانوں کے حق میں بڑے تامل کے بعد بھی مشکل سے ہی تصدیق کئے جاتے ہیں، لہذا صرف عام انسانوں کے حالات کے لحاظ سے یا صرف اپنے دور اور اپنے زمانہ کے حالات پر قیاس کر کے کسی صحیح واقعہ کا انکار کر دینا، کوئی معقول طریقہ نہیں، اس لئے نزول عیسیٰ پر غور کرنے سے پہلے اس پر غور کر لینا ضروری ہے، کہ یہ واقعہ کس دور، اور کس زمانہ سے اور پھر کس شخصیت سے متعلق ہے۔

جب ان دونوں سوالوں پر بصیرت کی نگاہ ڈالیں گے، تو پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہو گا، کہ یہ واقعہ قیامت کے واقعات کی ایک کڑی ہے، اور تخریب عالم کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو عالم کے تعمیری دور کے واقعات سے ملتا جلتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم کی تحقیق اور اس کی تخریب کے دونوں واقعات اتنے عجائبات پر مشتمل ہیں، کہ جو انسان ان دونوں جانبوں سے غائب ہے وہ بچا رہے اپنے موجودہ حالات کی دنیا دیکھ کر ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ عالم کی تخلیقی واقعات پر نظر ڈالیں، زمین کس طرح بنائی گئی، پھر کس طرح بچائی گئی، آسمان کس طرح بنائے گئے، حضرت آدم کس طرح بنائے گئے، ان کا جوڑا کس طرح پیدا ہوا، کس طرح زمین کی خلافت ان کے حوالہ ہوئی۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں، جو ایک سے ایک عجیب ترین ہیں، یہ ساری چیزیں اتنی تعجب خیز ہیں کہ ایک جماعت نے سرے سے تخلیقی عالم کا انکار کر کے عالم کے قدیم ہونے کا راستہ لے لیا، مگر آپ کے نزدیک کیا اس کا یہ طریق صحیح ہے؟ اسی طرح جب آپ تخریب عالم کے واقعات پر نظر ڈالیں گے، تو وہ بھی عجیب در عجیب نظر آئیں گے، یعنی کبھی نہ پھٹنے والا آسمان، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے آفتاب، چاند، اور یہ تمام روشن ستارے بے نور ہو کر گر بڑیں گے، اور کبھی نہ ٹپنے والے یہ بڑے بڑے پہاڑ روٹی کے ٹکڑوں کی طرح اڑتے نظر آئیں گے۔ اور یہ سارا کاسار عالم ہستی نیستی کے تحت آجائے گا۔ اب اگر آپ ان کی تصدیق کا فیصلہ موجودہ عالم کے واقعات کے پیش نظر کرنے بیٹھ جائیں، تو کیا کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں گے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ بھی عالم کے درمیانی واقعات کا مسئلہ نہیں، بلکہ تخریب عالم کے واقعات کی اہم کڑی ہے اس لئے اپنی جگہ وہ بھی معقول ہے ظاہر ہے کہ تمام مردوں کے زندہ ہو کر ایک میدان میں جمع ہونے کا زمانہ قریب آ رہا ہو تو اس سے ذرا قبل صرف ایک زندہ انسان کا آسمانوں سے زمین پر آنا کون سی بڑی بات ہے اسی لئے حضرت عیسیٰ کی شان میں ارشاد ہے ”وانا لعلم الساعة“ حضرت عیسیٰ قیامت کی ایک علامت ہیں، حضرت ابن عباس، حسن، اور قتادہ سے معقول ہے کہ اس آیت کا مصدق قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری ہے۔

اس کے بعد جب آپ اس پر غور کریں گے کہ یہ پیشین گوئی کس شخصیت کے متعلق ہے، وہ شخصیت عام شخصیتوں سے الگ ہے یا اسی طرح ہے؟ تو آپ کو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ صرف عام انسان سے ہی نہیں، بلکہ تمام انبیاء میں بھی سب سے الگ، اور سب سے ممتاز خلقت بشر ہیں، کیونکہ بغیر باپ کے پیدا ہونا، گوارہ میں بات کرنا، تعجب خیز امر ہے پھر ان کے معجزات دیکھئے، ان کی ہجرت دیکھئے کہ بجائے زمین کے عالم ارواح کی طرف ہوتی ہے، قرآن نے روح اللہ، کلمۃ اللہ کہا، اور پھر عالم

کے خاتمہ میں جسمانی نزول فرما کر علامات قیامت میں بھی شمار ہیں۔

اگر یہ دو باتیں ملحوظ رکھیں کہ یہ مسئلہ تخریب عالم کا ایک مقدمہ ہے اور اس شخصیت کے متعلق ہے جس کے دیگر حالات زندگی عالم کے عام دستور کے موافق نہیں، تو پھر نظر انصاف اس میں کوئی تردد نہ ہونا چاہئے، اور اس کا تعلق ہی عالم غیب سے ہے اور وہ سب خلاف عقل ہوتے ہیں، اگر انسانی عقل کے مطابق ہو تو پھر اس کو عالم غیب کہنا ہی غلط ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اگر یہ مسئلہ قابل تسلیم نہیں، تو پھر یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ عالم کے تخریب و تخلیق کے دوسرے واقعات بھی قابل تسلیم نہیں، یہی وجہ ہے کہ عقائد کی سبھی کتابوں میں عقیدہ میں شمار کیا جاتا ہے عجیب بات یہ ہے کہ ذات، صفات، قضاء قدر، حشر و نشر، رویت باری ان کے بارے میں اختلافات بھی ہیں، پھر بھی عقائد سے اس کو خارج نہیں کیا گیا اس کے برخلاف نزول عیسیٰ میں کسی کا اختلاف نہیں، معتزلہ کا بھی اختلاف نہیں۔ بلکہ ابن عطیہ لکھتے ہیں کہ تمام امت کا اس پر اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں، اور قرب قیامت میں اسی جسم کے ساتھ تشریف لائیں گے۔ اس سلسلہ میں تین صحابہ سے قریباً سوا حدیث منقول ہیں، گویا متواتر حدیث لکھی جاسکتی ہے۔

یہاں دو بات پر اور غور کرنا ہے۔ پہلی بات یہ کہ ایک انسان کی موت کا واقعہ کوئی پیچیدہ نہیں، جب وفات کے لئے عربی میں موت سے زیادہ واضح لفظ کوئی نہیں، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ”ان عیسیٰ قد مات“ کے بجائے لفظ ”توفی“ استعمال کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان کی وفات ہو چکی ہے اب دوبارہ تشریف نہیں لائیں گے، تو احادیث میں نزول کی پیشگوئی خاص اسی نام و نسبت کے شخص کے متعلق کیوں کی گئی، پھر دیکھئے کہ قرآن نے جہاں ان کی موت کی صاف نفی کر دی ہے، وہیں یہ بھی بتلایا ہے کہ آئندہ زمانہ میں اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا ہے، اسی طرح دوسری طرف یہ بھی تصریح کی ہے کہ حضرت عیسیٰ پر ان کو شہادت دینا باقی ہے ان دونوں باتوں کے لئے ان کی تشریف آوری لازم ہے۔ غرض ان مذکورہ پہلوؤں پر غور کریں تو نزول عیسیٰ کا ماننا آسان ہو جاتا ہے۔

### ایک اہم بحث

حضرت عیسیٰ سے متعلق سورہ آل عمران میں تین لفظ ”توفی“، ”رفع الی اللہ“ اور ”تطہیر“ استعمال ہوا ہے سورہ نساء میں صرف ”رفع الی اللہ“ ہے ان تینوں میں تطہیر کا لفظ تونی، اور رفع کے تابع ہے، کیوں کہ کفار سے ان کی تطہیر کا مقصد ان کی علحدگی تھی، اب وہ کسی صورت سے ہو، اس لئے قابل بحث دو ہی لفظ ”تونی، رفع الی اللہ“ پھر ان دونوں میں سے ایک بصیغہ ماضی ہے یعنی رفع، اس کا مطلب یہ نکلا کہ دو عددوں میں سے ایک وعدہ رفع کا دور نبوی سے پہلے پورا ہو چکا، جبکہ کسی اور آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تونی بمعنی موت کا وعدہ بھی اس وقت پورا ہو چکا تھا، اس لئے اس کو بصیغہ ماضی ذکر نہیں کیا گیا، ہاں سورہ مائدہ میں حضرت عیسیٰ کی اپنی زبان سے تونی کا لفظ گرچہ بصیغہ ماضی استعمال کیا گیا، مگر قرآن کی تصریح کے مطابق وہ ان کے مقدمہ کے ذیل میں نہیں ہے بلکہ اس سوال کے جواب میں ہے جو محشر میں ان سے ہو گا اور ظاہر ہے قیامت سے پہلے ان کی موت کا واقعہ ہونا سب کو مسلم ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس معاملہ میں اصل فیصلہ کن لفظ ”رفع“ کا ہے اسی لئے مقدمہ کے فیصلہ میں خاص طور پر اسی پر زور دیا گیا

ہے اور یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر ان کی موت واقع ہو چکی ہے تو آخر ہر مقام پر اس حقیقت کا کیوں انکشاف کیا گیا، اور کیوں نہ صاف "مات" کہہ دیا جاتا۔ آیات ذیل پر غور کریں،

(۱) ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات (۲) یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات. (۳) ولو شئنا لرفعناہا بها ولكنہ اخلد الی الارض. (۴) ورفعناہ مکاناً علیہا، ان تمام آیات میں رفع کا لفظ انسانوں میں ہی استعمال ہوا ہے کسی ایک جگہ بھی موت کے لئے مستعمل نہیں۔

## باب وجوب الايمان برسالة محمد صلى الله عليه وسلم الی جميع الناس ونسخ الملل بملته

نبی اکرم ﷺ کی رسالت سارے لوگوں کے لئے ہے، اور آپ کی شریعت سے تمام شریعت منسوخ ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے

(۱) حدثنا قتیبہ بن سعید..... عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال مَا مِنَ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ نَبِیٍّ اِلَّا قَدْ اُعْطِيَ مِنَ الْاٰیَاتِ مَا مِثْلُهُ اَمَّنْ عَلَیْهِ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِیْ اُوْتِیْتَ وَحِیاً اَوْحٰی اللّٰہُ اِلَیْ فَاَرْجُوْا اَنْ اَکُوْثَ اَکْثَرُھُمْ تَابِعاً یَوْمَ الْقِیَامَةِ.

(۲) حدثنی یونس بن عبد الأعلى عن ابی ہریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انه قال والذی نفس محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار.

(۳) حدثنی یحییٰ بن یحییٰ..... عن الشَّعْبِیِّ قَالَ رَأِیْتُ رَجُلًا مِنْ اَہْلِ خُرَاسَانَ سَأَلَ الشَّعْبِیَّ فَقَالَ یَا اِبَاعَمْرُو اِنْ مِنْ قَبْلِیْنَا مِنْ اَہْلِ خُرَاسَانَ یَقُولُوْنَ فِی الرَّجُلِ اِذَا اَعْتَقَ اَمْتَهُ ثُمَّ تَزَوَّجَهَا فَہُوَ کَالرَّاکِبِ بِذَنْتَہُ فَقَالَ الشَّعْبِیُّ حَدَّثَنِیْ اَبُو بَرْدَہُ بْنُ اَبِی مُوسٰی عَنْ اَبِیہُ اَنْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثَہُ یُؤْتُوْنَ اَجْرَھُمْ مَرَّتَیْنِ رَجُلٌ اَمَّنْ مِنْ اَہْلِ الْکِتَابِ اَمَّنْ بِنَبِیِّہِ وَاَنْذَرَ النَّبِیَّ صَلٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَمَّنْ بِہِ وَاتَّبَعَہُ وَصَدَّقَہُ فَلَہُ اَجْرَانِ وَعَبْدٌ مَمْلُوْکٌ اَدٰی حَقَّ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَحَقَّ سَیِّدَہُ فَلَہُ اَجْرَانِ وَرَجُلٌ کَانَ لَہُ اِمَۃٌ فَغَدَاَہَا فَاَلْحَسَنَ غَدَاَہَا ثُمَّ اَدْبٰہَا فَاَلْحَسَنَ اَدْبٰہَا ثُمَّ اَعْتَقَہَا وَتَزَوَّجَہَا فَلَہُ اَجْرَانِ ثُمَّ قَالَ الشَّعْبِیُّ لِلْخُرَاسَانِیِّ خُذْہَا بِغَیْرِ شَیْءٍ فَقَدْ کَانَ الرَّجُلُ یُرْحَلُ فِیْمَا دُوْنَ ھٰذَا اِلَی الْمَدِیْنَةِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، کہ انبیاء علیہم السلام میں کوئی نبی

ایسا نہیں گزرا جس کو اسی جیسا معجزہ دیا گیا جس پر لوگ ایمان لائے، مگر جو خاص معجزہ مجھ کو عطا ہوا ہے وہ وحی

ترجمہ

ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل فرمایا ہے اسلئے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام میں اجتماع کرنے والوں کی سب سے بڑی تعداد میری امت کی ہوگی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں، محمد (ﷺ) کی جان ہے، اس امت کا کوئی فرد خواہ یہودی ہو، یا نصرانی ہو، وہ میری دعوت کو سنے، اور پھر اس کی موت ایسی حالت میں ہو، کہ میرے لائے ہوئے احکام پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنمی ہوگا۔ شععی سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے دیکھا ایک خراسانی کو، انہوں نے شععی سے دریافت کرتے ہوئے کہا، اے ابو عمر ہمارے یہاں خراسان کے کچھ لوگ کہا کرتے ہیں، اس شخص کے بارے میں، جو اپنی باندی کو آزاد کر کے، پھر اس سے نکاح کر لے تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے اپنے بندہ پر سوار ہونا، اور شععی نے کہا مجھ سے بیان کیا ابو بردہ بن موسیٰ نے اپنے والد ابو موسیٰ سے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، کہ تین شخصوں کو دواجر ملیں گے، ایک وہ اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لایا، اور انہوں نے محمد ﷺ کو پایا، اور ان پر ایمان لایا، اور ان کی پیروی کی اور ان کو سچا مانا تو ان کو دواجر ملیں گے، دوسرا وہ غلام جو اللہ کا حق ادا کرے، اور اپنے آقا کا حق، تو اس کو دواجر ملیں گے، تیسرا وہ شخص جن کے پاس باندی ہو، اور اس کو کھانا دے اور ادب سکھائے۔

شرح الفاظ قوله من الآيات الخ: اس سے مراد معجزات ہیں،

قوله ما مثله آمن عليه البشر الخ: ماموصولہ اور اعطی کا مفعول ثانی ہے، مثلاً مبتداء آمن اس کی خبر ہے، مثل کا اطلاق عین شئی، اور مساوی شئی دونوں پر ہوتا ہے معنی یہ ہیں، کہ ہر نبی کو اسی جیسے معجزے دیئے گئے، جس کی شان یہ تھی کہ اس کو دیکھنے والا اس پر ایمان لائے، علیہ میں علی بمعنی لام ہے، یا بمعنی باء، علی کے ساتھ تفسیر کرنے میں غلبہ کے معنی کی رعایت ملحوظ ہے یعنی ایسا ظاہر معجزہ دیا کہ اس کے سامنے انسان مغلوب ہو جائے، اور اس کے انکار کی اس میں طاقت نہ ہو عتاد کی وجہ سے انکار کر دے یہ الگ بات ہے۔

قوله انما كان الذي اوتيت وحياً الخ: شرح حدیث سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے، کہ یہاں وحی سے مراد، یہی کتاب اللہ ہے، جس کا ذکر قرآن پاک میں جا بجا ہے، اسی لئے اس حدیث میں "اوحي الله الي" سے مفید کیا گیا ہے، ورنہ نفس وحی، تو عموماً انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے، اس میں آپ کی کوئی خصوصیت نہیں ہاں قرآن، تو آپ کی خصوصیت، اور مخصوص معجزہ ہے، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن میں جتنی آیات ہیں، وہ سب کے سب آپ کے معجزات ہیں، لہذا قرآن کو مجموعی طور پر، ایک ہی معجزہ سمجھنا خلاف واقعہ ہے۔ حدیث کے مذکورہ جملہ کی محدثین نے مختلف مطلب بیان کئے ہیں۔

(۱) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو، معجزات حسب حال دیئے گئے، آنحضور ﷺ جس قوم میں بھیجے گئے اس ماحول میں فصاحت، بلاغت انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی، ان کے مناسب فصاحت و بلاغت سے بھرا ہوا ایک قرآن عطا ہوا کہ اس جیسے کلام کو پیش کرنے کی کسی میں طاقت نہ تھی،

(۲) بعض حضرات اس حدیث کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں، کہ ہر نبی کا معجزہ ان سے پہلے کے نبیوں کے معجزہ سے صورتاً یا کیفیتاً مشابہ ہو اگر تھا، قرآن ایسا معجزہ ہے کہ اس طرح کا معجزہ پہلے کسی کو بھی نہیں دیا گیا،

(۳) بعض حضرات کے بقول مراد حدیث یہ ہے کہ قرآن ایسا معجزہ مکالمہ ہے، کہ اس میں تخیلات اور شک و شبہ پیدا کرنے کی گنجائش نہیں، برخلاف دوسرے انبیاء کے معجزات کے، کہ ان میں ساحرین کو یہ موقع مل جاتا تھا کہ لوگوں کو اشتباہ میں ڈال دیں، اسی لئے معجزہ اور سحر میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے نظر و فکر کی ضرورت پڑتی تھی، اور نظر و فکر میں غلطی ہو سکتی ہے۔

(۴) بعض حضرات یہ مطلب بیان فرماتے ہیں، کہ تمام انبیاء کے معجزات واقعی تھے، ان کا مشاہدہ انہی لوگوں نے کیا، جو اس زمانہ میں موجود تھے، لیکن قرآن کا معجزہ قیامت تک باقی رہنے والا ہے، اس میں آنے والے واقعات کی جا بجا پیشگوئیاں ہیں، جو ہر زمانہ میں لوگ اس کے مطابق واقعات رونما ہوتے ہوئے دیکھتے رہیں گے۔

(۵) بعض لوگ حدیث کی مراد یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انبیاء سابقین کے معجزات حسی تھے، جن کا آنکھوں سے مشاہدہ ہوتا تھا، جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاشی، اور ید بیضا۔ لیکن قرآن کا معجزہ ذہن و عقل سے مشاہدہ کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے اس کے متبعین تعداد میں زیادہ ہو سکے، کیونکہ جس کا مشاہدہ عقل کی آنکھ سے ہو گا۔ اس کو ہر زمانہ کے لوگ دیکھیں گے، قرآنی احکام کے اسباب پر علماء نے سیر حاصل بحث کی ہے، دیکھئے فتح الملہم ص ۹۶-۹۵ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ چند روایات فضائل سے متعلق بطور نمونہ درج ہیں۔

### فضائل قرآن

(۱) ایک روایت میں ہے، کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے قرآن شریف پڑھ لیا، اس نے گویا نبوت کو اپنی دونوں پسلیوں کے درمیان لے لیا، سوائے اس کے، کہ اس پر کوئی دجی نہیں اترتی، اس لئے قرآن والے کے لئے مناسب نہیں، کہ جو شخص غصہ کرے، وہ بھی غصہ کا جواب غصہ سے دے، اور جاہلوں کے ساتھ جہالت کرنے پر اتر آئے، اور اس کا خیال نہ کرے، کہ اس کے سینے میں کلام اللہ موجود ہے۔ (رواہ الحاكم و صححہ)

(۲) حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، کہ کلام اللہ کی فضیلت، دوسرے کلام پر ایسی ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ شہادت کی تمام مخلوق پر، (رواہ الترمذی والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

(۳) ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کا مضمون نقل کیا ہے، کہ میں نے آپ کا صبر و استقامت، اور شکر آزمائے کے لئے آپ کو بھیجا اور اس لئے کہ لوگوں کی آزمائش آپ کے ذریعہ کروں، اور آپ کے ساتھ ایک ایسی کتاب نازل فرمائی، جس کو پانی نہیں دھو سکتا، (یعنی ہر کتاب کے نقوش کسی نہ کسی ذریعہ مٹ سکتے ہیں اور کم از کم جب تک، پریس نہیں تھے، ہر کتاب کی سیاہی پانی کے ذریعہ مٹائی جاسکتی تھی، لیکن قرآن پاک کسی صورت میں سینوں سے مٹائے مٹ نہیں سکتا ہے) آپ اس کو سوتے جاگتے پڑھا کریں گے، (چنانچہ کبھی حافظ سوتے میں بھی پڑھ لیتے ہیں، اور کبھی خواب کی حالت میں بھی، بعض حافظ پڑھا کرتے ہیں) (مسلم، مشکوٰۃ)

(۴) آپ نے فرمایا قرآن جس میں گزشتہ قوموں کے حالات، اور آئندہ کے واقعات، اور تمہارے معاملات کا فیصلہ، یہ سب موجود ہیں، یہ کتاب کیا ہے؟ بس آخری فیصلہ ہے، کچھ ہنسی مذاق نہیں، جس کسی جابر بادشاہ نے اس کو چھوڑا، اللہ تعالیٰ نے اس کو ذلیل کیا، اور جس نے راہ ہدایت اس کے سوا، کہیں اور تلاش کیا، اللہ نے اس کو گمراہ کیا، یہی خدا تعالیٰ کی

مضبوط رتی ہے، یہی وہ ذکر ہے، جو حکمت سے لبریز ہے، اور یہی سیدھی راہ ہے، لوگوں کی خواہشات اس کے معانی بول نہیں سکتے، مختلف زبانیں اس میں غلط ملط نہیں کر سکتیں، علم کے دل بھی اس سے نہیں بھرتے، کتنا ہی پڑھے لیکن تازہ لطف دیتا ہے، اس کے عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں، جنات جیسی مخلوق نے جب اس کو سنا تو وہ بھی بیباخت بول پڑے "إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ" جس نے قرآن پاک پڑھا، اس نے سچ ہی سچ بولا، جس نے اس پر عمل کیا بے شبہ ثواب کما۔ جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اس نے یقیناً انصاف کا فیصلہ کیا اور جس نے اللہ کی طرف دعوت دی اس نے بلاشبہ راہ راست کی دعوت دی۔ (ترمذی، دارمی)

وارجو ان اکون: مطلب یہ ہے کہ جب قرآن کریم اتنی فضیلتوں کا حامل ہے، اور اس کا فائدہ اتنا عام و تمام ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ماننے والے بہت ہونگے، اور جب ماننے والے کثیر ہونگے، تو میرے قبیحین بھی زیادہ ہوں گے۔ جس کتاب کی یہ خصوصیت ہے بلاشبہ اس کے ماننے والے بھی کثیر تعداد میں ہونگے چونکہ نفع بھی اس کا سب سے زیادہ ہے۔

قوله من هذه الامة: مراد مسجد دعوت ہے، جس میں یہود نصرانی، مجوسی وغیرہ سب داخل ہیں۔  
قوله يهودي ولا نصراني: یہود و نصاریٰ کی تخصیص ان کے ماسوا کو داخل کرنے کے لئے ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کے پاس، جب آسمانی کتاب کے ہوتے ہوئے آنحضور ﷺ پر ایمان ضروری ہے، تو جس کے پاس آسمانی کتاب نہیں ان کے لئے تو اور ضروری ہے۔

قوله ثم يموت: اشارہ ہے اگر ایمان میں تاخیر ہو، اور غرغره سے قبل ایمان لائے تو وہ بھی معتبر ہے۔  
قوله وان كان من اصحاب النار: یعنی خلود فی النار کا مستحق ہوگا، ہاں جن کو حضور ﷺ کی اطلاع نہیں ہوئی اور آپ پر ایمان نہیں لائے، تو وہ اس وعید سے خارج ہے۔

قوله كالراكب ببندقته الخ: یعنی اس کو کوئی اجر نہیں ملے گا،  
قوله ثلاثة طبرانی میں اربعة یوتون اجرهم مرتین، چوتھا ازواج مطہرات کو شمار کر لیا ہے، اور اس چار کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں، جن کو دواہر اجر ملے گا، اس کے ملبوم کا اعتبار نہیں، کہ دواہر جس انہیں تین افراد کو دیا جائے گا۔ موقع کے لحاظ سے ان تینوں کو شمار کیا گیا ہے۔

قوله یوتون اجرهم مرتین الخ: اہل کتاب اگر اپنے مذہب کو چھوڑ کر مذہب اسلام قبول کر لے، تو اس کو دواہر اجر ملتا ہے، اس کو وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کی فطرت ہے کہ اس کو دین سے والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت ہوتی ہے، اپنا دین چھوڑ کر، دوسرا دین اختیار کرنا، فطرۃ شاق گذرتا ہے، اسلام یہ کہتا ہے ادیان سادہ ہیں کوئی رقابت، کوئی پارٹی نہیں، یہ ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہیں، لہذا ایک دین کے مصدق کو، دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے، اگر اہل کتاب اسلام قبول کر لے تو اس کو یہ دوسرے نہیں گذرنا چاہئے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائج کیا ہو گیا، بلکہ وہ آنحضرت ﷺ پر بھی ایمان لے آیا، تو دواہرے اجر کا مستحق ہوگا، ہاں یہ بھی یقینی ہے، اگر آپ پر ایمان نہیں لایا، تو پہلے ایمان کا اجر بھی حبط ہو جائے گا، کیونکہ رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کی جاسکتی، جو ایک کا مسکر ہو وہ سب ہی کا خدا کی نظر میں مسکر شمار ہوگا۔

اس بشارت میں، دراصل اہل کتاب کو یہ دعوت ہے، کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو اس کی صورت یہی ہے کہ، آپ کی ذات پر بھی ایمان لے آئیں، اور کیوں ایمان نہ لائیں، جبکہ ان سب نبیوں پر ایمان لانا آپ کی دعوت کا جزو ہے، پس آپ ﷺ پر ایمان لانا، ان سب پر ایمان لانا، اور آپ کا انکار کرنا درحقیقت ان سب کا انکار کرنا ہے، خلاصہ یہ کہ ایمان لانا سب انبیاء علیہم السلام پر ضروری، لیکن منہاج اطاعت صرف اسلام میں منحصر ہے۔

### اہل کتاب سے مراد کیا، اور ان کو دوہرا اجر کیوں؟

اشکال یہ ہے کہ اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟ یہود و نصاریٰ، تو ریت و انجیل دونوں؟ یا ان دونوں میں سے کوئی ایک؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اہل کتاب سے صرف نصاریٰ مراد ہیں، اور کتاب سے صرف انجیل مراد ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا، ان کو دجال کہا، اور مسیح دجال کو، مسیح بمشربہا یہی وجہ ہے کہ دجال کے ساتھ دینے والے، زیادہ تر یہودی ہوں گے۔ تو جب یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر دیا، تو ان کا ایمان جھٹ ہو گیا، اب اگر یہود آنحضور ﷺ پر ایمان لے آئیں، تو صرف ایک نبی پر ایمان ہو گا، دو پر نہیں، لہذا دوہرا اجر پانچکے لئے، دو نبی پر ایمان ہونا جو شرط تھا، وہ مفقود ہو گیا، اس لئے دو اجر کے مستحق کیونکر ہوں گے، لہذا یہی کہا جائیگا کہ اس حدیث کے مصداق عیسائی ہیں۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ اس حدیث کا ماخذ، قرآن پاک کی آیت، ”اولئک یتون اجرہم مرتین“ ہے۔ اور اس آیت کے بارے میں بڑے بڑے مفسرین جیسے جریر طبری، طبرانی، حافظ ابن کثیر یہ حضرات فرماتے ہیں، کہ اس کے مصداق عبد اللہ بن سلام اور ان کے رفقاء ہیں، جو یہودی تھے، تو اگر حدیث میں صرف نصاریٰ مراد لیا جائے تو قرآن میں کیا تاویل کی جائے گی؟ نیز اگر صرف نصاریٰ مراد لیں، تو اس پر بھی اشکال ہو گا، کہ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں جو نصاریٰ موجود تھے ان میں چند ہی تھے۔ جو صحیح نصرانیت پر قائم تھے۔ اکثر نصاریٰ تو ابلیس کا عقیدہ رکھتے تھے، اور یہ کفر صریح ہے، تو کیا ابلیس باسحیح کے معتقد، کو مومن باسحیح کہہ سکتے ہیں؟ اگر نہیں کہہ سکتے ہیں، تو نصاریٰ کا بھی دو نبی پر ایمان کہاں ہو سکا، اس طرح نصاریٰ بھی یہودی طرح ہو گئے، اور ان کا ایمان بھی دو نبی پر نہیں ہوا، لہذا آپ کے بقول ان کو بھی دو اجر نہیں ملنا چاہیے، خلاصہ یہ ہوا کہ عبد اللہ بن سلام کا ایمان موسیٰ علیہ السلام پر معتبر ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں صرف عبد اللہ بن سلام آگئے، عام یہودی تو نہیں آئے، اسی طرح نصاریٰ اصل دین پر قائم نہیں تھے، پھر ایسے کتابوں کو دوہرا اجر کس بات پر ملے گا؟

علامہ طہی نے اس کا یہ جواب دیا ہے، کہ ان کا ایمان، اگرچہ معتبر نہیں، لیکن حضور ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے، اللہ نے ان کو یہ اجر دیا، جیسے نو مسلم، کہ جو اچھے کام حالت کفر میں کئے تھے، وہ محسوب ہو جاتے ہیں اسی طرح ان کا ایمان گوناغ نہ تھا، لیکن حضور ﷺ کی برکت سے معتبر ہو گیا، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو حضور ﷺ پر ایمان لاتا ہے، وہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر بھی صحیح ایمان لے آتا ہے۔ اس لئے اب اس کے ایمان سابق کی بھی تصحیح ہو گئی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی فتح المسلم (ص ۲۹۷) میں فرماتے ہیں، ان جوابات میں بڑے تکلفات ہیں، سب سے عمدہ جواب یہ ہے کہ یہ فطری بات ہے، کہ اگر کسی آدمی کو مامور بہ کے ادا کرنے میں، کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہو، اور مامور بہ کی ادائیگی پر



ثابت قدم رہے، تو یقیناً قابل ستائش ہے، مگر اس سے زیادہ وہ انسان قابل ستائش ہے، جو ہزار مولع اور رکاوٹوں کے باوجود مامور بہ پر ثابت قدم ہو۔ ایسا آدمی زیادہ ستائش کا مستحق ہوگا۔ مثلاً ایک فارغ آدمی نماز پڑھتا ہے، تو وہ حق واجب، اس طرح ادا کرتا ہے، کہ اسے ادائیگی کے مواقع حاصل نہیں، یہ بڑا کمال نہیں ہے، لیکن اس کے مقابل ایک وہ جس کو دنیا کی ہزار فکریں لاحق ہوں، خون پسینہ ایک کر کے، روزی کماتا ہو، اور جب نماز کا وقت آتا ہے تو ان تمام مواقع کے ہوتے ہوئے نماز کی پوری پابندی کرتا ہے، تو یہ بلاشبہ اس پہلے کے مقابلہ میں زیادہ تعریف کا مستحق ہے، اب اگر دونوں کے اجر میں، مالک حقیقی فرق کرے، اور دوسرے کو پہلے سے زیادہ اجر دے تو کسی طرح خلاف عقل نہیں۔

یاشا ایک امیر و خوشحال کا روزہ ہے، اور ایک غریب محنتی کسان کا، کہ امیر کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے خوشحال ہے، مشقت نہیں کرتی پڑتی، بخلاف اس محنتی کسان کے، کہ اس کے لئے بہت مولع ہیں۔ پس اگر وہ ان مولع پر غالب آتا ہے، اور پوری محنت کے ساتھ مظاہرہ عبادت کر کے روزہ رکھتا ہے، تو بے شک یہ زیادہ اجر کا مستحق ہے، بالکل یہی حال اہل کتاب کے مسلمان ہونے کا ہے، کہ یہود و نصاریٰ موسیٰ و عیسیٰ کو برحق سمجھتے ہیں، مگر یہودیوں و عیسائیوں کے ایمان کے معتبر ہونے نہ ہونے سے قطع نظر کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، اور تورات و انجیل کی تصدیق کرتے ہیں، پھر اس کے بعد یہ کہا جائے، کہ یہ سب برحق ہیں ضرور، مگر آخرت کی کامیابی، اور نجات اسی وقت ملے گی، جب آخری نبی پر ایمان لے آو، ورنہ تمہارا سابق ایمان بھی بیکار ہے، ظاہر ہے، ان کے سامنے ان کے مذہب و شریعت کی صداقت کی خبر سننے کے بعد پھر اس کو چھوڑ کر نئی شریعت میں داخل ہونا اور اس کو منسوخ ماننا کس قدر شاق ہوگا۔ اور یہ بات ان کے لئے کس قدر مشکل ہوگی جس نے امت سے کام لے کر طبیعت اور نفس کے تقاضے کے خلاف، حضور ﷺ کو مان لیا اور کسی کے ملامت کی پروا نہ کی، تو یقیناً وہ مشکل و گراں کام کے کرنے پر دوہرا اجر پانے کا مستحق ہونا چاہئے دو کاموں پر نہیں، بلکہ ایک ہی کام پر۔ ہماری اس بات کی تائید خود قرآن کے الفاظ سے ہوتی ہے، ”یؤتون اجرہم مرتین بما صبروا“ یعنی جسے رہے، نفس کو روکے رکھا، لعنت و ملامت کی پروا نہ کی، اور دوسرا وہ شیطانہ کو دور کرتا رہا اس لئے دواجر ہیں، تو اب حاصل یہ ہوا کہ دواجر ایمان بالنبی ہی پر ملا۔ لہذا اس میں کسی کی تخصیص نہیں نہ یہود کی نہ نصاریٰ کی، نہ تورات کی نہ انجیل کی، لہذا کوئی اشکال نہیں۔

پس یہی حال سمجھو، ”العبد المملوک اذا دی حق اللہ وحق موالیه“ ایک غلام کو ایک طرف یہ فکر لاحق ہے، کہ اپنے آقا کا حکم بجالائے۔ اور دوسری طرف یہ بھی فکر ہے، کہ اپنے اصلی مولیٰ کا حکم بجالائے، اور وہ ان دونوں کو پورا کرتا ہے، اور اسکے لئے مشقت برداشت کرتا ہے، اس کی محنت و مشقت، اس آزاد شخص سے کہیں زیادہ ہے، جو ہر طرح آزاد ہے، اس کو صرف ایک ہی حق ادا کرنا ہے، بخلاف غلام کے ان کے لئے مانع ہے اس کے باوجود دونوں حق پر ثابت قدم رہتا ہے۔

اسی طرح ”رجل کانت عنده امته الخ“ باعدی ہر طرح ماتحت ہے، مجبور ہے، مگر مولیٰ نے اس کے ساتھ احسان کیا، تعلیم و تربیت سے سنوارا، اور پھر اس کو غلامی کے قید سے رہا کر دیا۔ لیکن آزاد کرنے کے بعد، یہ چیز عار سمجھی جاتی ہے، خود ہی نکاح کرے، کیونکہ بظاہر پھر قید میں لانا ہے، اور اس میں حظ نفس بھی چنانچہ بری نظر سے دیکھا جائے گا، مگر اس نے کچھ پروا نہیں کی، برابری اور قوم کی طعنہ زنی سے بے نیاز ہو کر، اس پر مزید احسان یہ کیا، کہ اس سے نکاح کر لیا، پہلا احسان

پڑھانا، لکھانا، دوسرا احسان شرف زوجیت بخشا تو احسان بالاسے احسان کیا، یہ بات نہیں کہ اس کو مقید کر دیا بلکہ اس کو اپنے برابر کر لیا، ”ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف“ یعنی بیویوں کا بھی حق ہے، شوہروں پر جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے، تو اب دو گنا اجر ان کو یوں ملے گا، کہ ایسا کرنے میں لوگ اس کو برا کہیں گے مگر اس کی پرولہ کے بغیر وہ کر لیتا ہے تو کیا وہ مزید ثواب کا مستحق نہیں ہوگا؟

### شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تحقیق

شیخ اکبر کہتے ہیں کسی بھی زمانہ میں، جس شخص نے جس کسی نبی پر ایمان قبول کیا، اس کو آنحضور ﷺ پر بھی اجمالی ایمان لانا تھا، کیونکہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ بلکہ تمام انبیاء نے آپ کی بشارت دی ہے، تو اس بشارت کے تحت آپ پر اجمالاً ایمان سبھی کے لئے ضروری ہوا، گویا جس نے حضرت عیسیٰ پر ایمان قبول کیا، وہ ان کے قول ”میشوا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد“ پر ایمان قبول کیا، تو اسی طرح جو شخص کسی ایک نبی پر ایمان رکھتا تھا، اس کے دو ایمان ہوئے، ایک تفصیلی، جو اس کا اپنے نبی پر، اور ایک اجمالی جو حضور پر تھا، قرآن میں ہے ”واذ اخذ اللہ میثاق النبیین بما آتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جائکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ قال اقررتم واخذتم علی ذالکم اصری قالوا بقرنا (الآیۃ)“ اس کے آگے و عید ہے ”فمن تولی بعد ذالک فاولئک ہم الفاسقون“ ایک اور جگہ ہے ”وتجدونہ مکتوباً عندهم فی التورۃ والانجیل“ لہذا نبی کی وحی پر ایمان لانا اجمالاً ضروری تھا، اس کے بعد جب حضور ﷺ تشریف لائے، تو آپ نے ہمارے نبیوں کی تصدیق کی، ”آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل آمن باللہ وملائکتہ وکتابہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ“ تو حضور ﷺ پر جو ایمان لایا وہ تفصیلی ایمان ہے اور اس کے ضمن میں اجمالاً تمام انبیاء پر بھی ایمان لانا ہوا۔

شیخ اکبر اس کے بعد لکھتے ہیں، یہ کتابی جو حضور ﷺ پر ایمان لائے اس میں ہر ایک ایمان دو ایمان پر مشتمل ہے، پہلے اپنے نبی پر تفصیل، اور آپ پر اجمالاً اور جب حضور پر ایمان لائے۔ تو اب تفصیل حضور پر اور اجمالاً تمام انبیاء پر ایمان قبول کرنا ہوا، اسی طرح ان کا ایمان دو ایمان پر مشتمل ہے اس لئے فرمایا ”اولئک یوتون اجرہم مرتین“ چونکہ ان کا ایمان دو مرتبہ تھا اس لئے مرتین کہا گیا، اجرین نہیں کہا گیا۔ فقط واللہ اعلم

### باب بیان الزمن الذی لا یقبل فیہ الایمان

اس زمانہ کا بیان جب ایمان مقبول نہ ہو

❦ حدیث ❦ حدثنی یحییٰ بن ایوب ..... عن ابی ہریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقوم الساعة حتی تطلع الشمس من مغربہا اذا طلعت من مغربہا آمن الناس کلہم اجمعون فیومئذ لا ینفع نفساً ایمانہا لم تکن آمنّت من قبل او کسبت فی ایمانہا خیراً. عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث اذا خرجن لا ینفع نفساً ایمانہا لم تکن

آمنت من قبل او كسبت في ايمانها خيرا طلوع الشمس من مغربها والدجال ودابة الارض. (۱)

ترجمہ | حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ آفتاب پچھتم سے نہ نکلے، اور جب پچھتم سے نکلے گا تو سب لوگ ایمان لے آئیں گے، اور اس وقت ان لوگوں میں کسی کو بھی ایمان نفع بخش نہ ہوگا، جو اس سے پہلے مسلمان نہیں ہوئے ہوئے، یا ایمان لا کر کوئی نیک کام نہیں کیا ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تین چیزوں کا ظہور ہوگا، تو یحمرن ایمان کا رآہ ہوگا اور نہ کوئی نیک عمل، آفتاب کا مغرب سے نکلنا، دجال اور دلیہ الارض کا ظہور۔

مقصد حدیث | جس طرح غرہ کے وقت انسان کا کوئی عمل قابل قبول نہیں ہوگا، اسی طرح جب عالم کا غرہ یعنی آخری وقت ہوگا، اس وقت بھی ایمان و عمل قابل قبول نہیں ہوگا، کیونکہ تمام پیشین گوئیاں جب ظاہر ہو چکی ہوں گی تو پھر ایمان بالمشاہدہ ہوگا اور ایمان کے معتبر ہونے کے لئے ایمان بالغیب ضروری ہے۔

حضرت جبریلؑ کی حدیث میں ایمان کا ذکر تھا، اب ایمان کی قبولیت کا وقت اور اس کا آخری زمانہ بتلایا جا رہا ہے، مقصد یہ ہے کہ اس زمانہ سے قبل ایمان لانا چاہئے، کیونکہ اس کے بعد پھر ایمان کا اعتبار نہ ہوگا۔

### سب سے پہلی علامت قیامت کون؟

علامہ قرطبی لکھتے ہیں، علامت قیامت میں سب سے پہلے کونسی علامت ظاہر ہوگی؟ اس سلسلے میں روایات میں ایک کوئی اختلاف ہے ایک روایت کے مطابق سب سے پہلے طلوع شمس من المغرب، ایک قول کے مطابق خروج دابہ سب سے پہلے، اور مسلم کی ایک روایت کے مطابق علامت قیامت میں سب سے پہلے یمن سے آگ کا ظہور ہوگا (۱)۔ تاہم اس سلسلے میں یاد رہنا چاہئے کہ قرآن و احادیث نے واضح طور پر متعین کرنے کے بجائے بغیر کسی ترتیب و قومی کے علامات قیامت کو ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کی تصنیف علامات قیامت قابل دید ہے۔

قوله ثلاث اذا خرجن : حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ خروج دجال زمین پر تغیر کی پہلی سب سے بڑی علامت ہوگی، اور اس کا خاتمہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر ہوگا، اور طلوع شمس من المغرب پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

قوله دابة الارض الخ : ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین کا دابہ نکلے گا، اس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا عصا، سلیمان علیہ السلام کی انگشتری، انگشتری کے ذریعہ مسلمانوں کے چہرے روشن ہو جائیں گے، اور عصا کے ذریعہ کافر کی ناک میں تھیل پڑ جائے گی۔

ایک دستر خوان پر کافرو مشرک جمع ہوں گے، تو بالکل ایک دوسرے سے ممتاز ہوں گے۔ علامہ آلوسیؒ نے دلیہ الارض کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے بارے میں بہت سی روایتیں ہیں، اس کی ماہیت شکل، محل خروج، اور تعدد و مقدار کے بارے میں بہت سی متعارض روایتیں ہیں، اس لئے ان کا نقل کرنا عبث ہے۔

اس کے بارے میں اعتقاد کے لائق ترمذی اور حاکم کی روایت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ دلیہ حشرات الارض کی طرح خود بخود پیدا ہوگا، علماء نے لکھا ہے کہ اسکی لمبائی ساٹھ گز کی ہوگی۔ بعض کا خیال ہے کہ چہرہ انسانوں کی طرح، پاؤں اونٹ کی طرح، گردن گھوڑے کی طرح، دم چیل کی طرح، سرین ہرن کی طرح، سینک بارہ سگھے کی طرح، اور ہاتھ بندر کی طرح ہوگا، نیز اس کے نمودار ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ کوہ صفا زلزلہ سے پھٹ جائے گا، اور اس سے یہ جانور نکلے گا، بعض حضرات کا خیال ہے کہ دلیہ الارض تین دفعہ نکلے گا۔

حدثنا يحيى بن ايوب واسحق بن ابراهيم — عن ابي ذر ان النبي صلى الله عليه وسلم قال يوما ائتذرون اين تذهب هذه الشمس قلوا الله ورسوله اعلم، قال ان هذه تجري حتى تنتهي الى مستقرها تحت القرش، فخر ساجدة فلا تزال كذلك حتى يقال لها ارتفعي ارجعي من حيث جئت فتزجي طلعة من مطلعها ثم تجري حتى تنتهي الى مستقرها تحت القرش فخر ساجدة فلا تزال كذلك حتى يقال لها ارتفعي ارجعي من حيث جئت فتزجي طلعة من مطلعها ثم تجري لا يستنكر الناس منها شيئاً حتى تنتهي الى مستقرها ذلك تحت القرش فيقال لها ارتفعي اصبحي طلعة من مغربك فتصبح طلعة من مغربها فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ائتذرون متى ذاكم ذاك حين لا ينفع نفساً ايمانها لم تكن آمنت من قبل او كسبت بى ايمانها خيراً.

ترجمہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز فرمایا کیا تمہیں اس کا علم ہے کہ یہ آفتاب کہاں جاتا ہے؟ تو صحابہ نے عرض کیا اللہ و رسول اعلم، تو آپ نے فرمایا کہ یہ آفتاب چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے اپنے مستقر پر پہنچ جاتا ہے، تو سجدہ میں گر پڑتا ہے، اس وقت تک برابر سجدہ کرتا رہے گا یہاں تک کہ اسکو حکم ملے گا کہ جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ اور وہ لوٹ جائے گا اور اپنے مطلع سے طلوع ہوگا، پھر چلتا رہے گا، یہاں تک کہ جب عرش کے نیچے اپنے مستقر پر پہنچ جائے گا تو سجدہ میں گر پڑے گا، اور اسی طرح سجدہ میں رہے گا، یہاں تک کہ کہا جائے گا جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ، پھر وہ طلوع ہوگا اپنے مطلع سے، پھر چلتا رہے گا، لوگ اس کا انکار کریں نہیں سکتے، یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے اپنے مستقر پر پہنچ جائے گا تو اس کو کہا جائے گا جاؤ اور مغرب سے طلوع ہو جاؤ، تو وہ مغرب سے طلوع ہوگا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ یہ کب ہوگا؟ یہ اس وقت ہوگا جب کسی کا ایمان اور عمل صالح نفع بخش نہیں ہوگا، جو اس سے پہلے مومن نہ ہوا ہو یا جس نے ایمان کے بعد اس سے پہلے عمل صالح نہ کیا ہوگا۔

کیا سورج کا سجدہ کرنا عقلاً محال ہے؟

صاحب روح المعانی نے اس حدیث پر ایک مشہور اشکال نقل کیا ہے کہ اس روایت سے آفتاب کا تحت العرش سجدہ کرنا ثابت ہوتا ہے، اور سجدہ کے دوران اس کا استقرار اور توقف (تھمنا) ثابت ہوتا ہے، خولہ اپنے ہمارے چڑھ کر عرش کے نیچے جا کر ہو مایا اپنے مدار پر رہ کر ہو، یہ بات تو مسلم ہے کہ آفتاب بھی غروب نہیں ہوتا، اگر ایک جگہ غروب ہوتا دکھائی

دیتا ہے تو دوسری جگہ طلوع ہوتے ہوئے دکھائی دیتا ہے، رات کسی جگہ لمبی ہوتی ہے تو کہیں چھوٹی ہوتی ہے، بلکہ بلخاز کے علاقہ میں تو غروب کے بعد شفق کے ختم ہونے سے قبل آفتاب نکل آتا ہے اور ارض تعین میں جب تک آفتاب شمالی برج میں رہتا ہے اس وقت تک نکلا ہی رہتا ہے، اور جب جنوبی برج میں چلا جاتا ہے تو اتنے زمانہ تک غروب ہی رہتا ہے، اسکے بعد چھ ماہ کی رات، اور چھ ماہ کا دن ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ ہر وقت طلوع و غروب کا سلسلہ ہوتا ہی رہتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ کسی وقت وہ ٹھہرنا نہیں ہے، اب اگر غروب کے وقت سجدہ کے لئے ساکن مانا جائے تو طلوع کے لئے بھی سکون ماننا ہو گا حالانکہ سورج کو استقرار و سکون نہیں۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ شمس ہمیشہ اپنے مدار میں رہتا ہے پھر یہ چڑھ کر عرش کے نیچے کس طرح جاتا ہے؟ اسی طرح عرش تو سب کو محیط ہے تو اس طرح آفتاب تو ہمیشہ تخت العرش ہی رہتا ہے پھر ہر وقت اس کو سجدہ پر ہی رہنا چاہئے؟ یہ تین سوال سامنے آتے ہیں اگر سورج کے سجدہ کرنے کو تسلیم کر لیا جائے۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانے کے علماء سے اس اشکال کا حل دریافت کیا تو کوئی تفسی بخش جواب نہیں مل سکا اس کے بعد علامہ نے خود اپنا جواب نقل کیا ہے، اسکا حاصل یہ ہے کہ آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اور اسی طرح دوسرے ستارے کو عقل و شعور ہے جیسا کہ ”كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ“ سے معلوم ہوتا ہے، یسبحون ذوی العقول کی جمع ہے، اسی طرح ”إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ“ سے بھی یہی سمجھ میں آ رہا ہے۔ تو حضرت ابو ذرؓ کی اس روایت میں سورج کے سجدہ اور استیذان کے حقیقی معنی ہی مراد لئے جائیں کہ وہ زبانِ قلم سے اجازت مانگتا ہے اور عقل و شعور اس میں برابر رہتا ہے جب ایسی بات ہے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کی طرح اس میں بھی نفسِ ناطقہ ہو، بلکہ بعض صوفیاء تو سورج میں کامل درجہ کا نفسِ ناطقہ مانتے ہیں۔ اور حکماء فلک کے لئے بھی نفس مانتے ہیں، اور بعض حکماء ستاروں کے لئے بھی نفس مانتے ہیں۔ جب شمس میں نفسِ ناطقہ کا ہونا ممکن ہے تو جس طرح انسان کے نفسِ ناطقہ میں لطافت و پاکیزگی آ جاتی ہے، تو کبھی وہ اپنے بدن سے جدا ہو جاتا ہے اور کسی دوسری صورت کے مشابہ صورت سے تعلق پیدا کر لیتا ہے، جیسے حضرت جبریلؑ کی کلبی کی صورت میں یا کسی اعرابی کی شکل میں متشکل ہو جاتے تھے، حالانکہ اس وقت بھی ان کے نفس کا اصلی بدن سے تعلق رہتا تھا، اسی طرح بہت سے بزرگانِ دین ایک ہی وقت میں بہت سے مقامات پر نظر آتے، اور یہ بات محض ان کے نفس کے پاکیزہ ہونے کی وجہ سے تھا، تو روح ان کے بدن اصلی میں رہتی تھی، اور ظہور اور تمثیل دوسری جگہ میں ہوتا تھا۔ علامہ تفتازانیؒ نے بعض فقہاء اہلسنت جیسے ابنِ مقاتل سے نقل کیا ہے کہ اس قسم کے اعتقاد رکھنے والوں پر کفر کا فتویٰ صادر کیا جائے گا جیسے ابراہیم بن ادہمؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ یوم الترویہ میں لوگوں نے ان کو بصرہ میں دیکھا اور اسی دن بہت سے لوگوں نے مکہ میں دیکھا۔ ایسے لوگوں پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس قسم کی باتوں کا تعلق معجزات سے ہے اور یہ اولیاء کے لئے کرامت نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ان کی بات کا جواب یہ ہے کہ اولیاء کے لئے کرامت ہے البتہ جن چیزوں کا کرامت ہونا نصی سے محال ہو جیسے قرآن جیسی آیت پیش کرنا، ایسی چیزوں کو کرامت بنا کر ثابت کرنا کفر ہے، رہا ایک وقت میں مختلف مقامات پر نظر آنا تو خود آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو کعبہ احمر کے پاس قبر میں نماز پڑھتے دیکھا، اور ان کو چھٹے آسمان پر بھی دیکھا، اور گفتگو فرمائی یہ

بات یقین و جزم کے ساتھ کوئی نہیں کہتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے قبر والے جسم کے ساتھ آسمان پر چڑھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے انبیاء کو آپ نے لیلۃ المعراج میں آسمان پر دیکھا۔ غرض مختلف جگہوں پر نظر آنا بطور کرامت ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ آفتاب میں بھی پاکیزہ نفس ہو، جیسے اولیاء میں ہے اور وہ اپنے شمس محسوس و مشاہد جسم سے نکل جاتا ہو، اور تھوڑا تعلق جسم سے باقی رہتا ہو اور وہ نفس آسمانوں پر چڑھتے ہوئے عرش کے نیچے سجدہ ریز ہوتا ہو، اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر حق تعالیٰ نے اجازت مانگتا ہو، اور چونکہ مشاہد جسم میں نفس کا تعلق بھی ہے تو اس کی مدد سے وہ حرکت بھی کرتا رہتا ہو، تو اس طرح سے سکون بھی لازم نہیں آتا۔ خلاصہ یہ کہ سجدہ نفس شمس کرتا ہے اور حرکت جرم شمس کرتا ہے۔

اب رہا یہ اشکال کہ طلوع و غروب تو ہر وقت ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے مدینہ کے افق سے غروب ہو کر سجدہ کرتا ہو، تو اس طرح سے مدینہ میں غروب ہو اور دوسری جگہ میں طلوع ہو گا یہ تحقیق صاحب روح المعانی کی ہے۔

## باب بدء الوحي الى رسول الله صلى الله عليه وسلم

حدثني ابو الطاهر احمد بن عمرو بن عبد الله بن عمرو بن السرح قال انا ابن وهب قال اخبرني يونس عن ابن شهاب قال حدثني عروة ابن الزبير ان عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم اخبرته انها قالت كان اول ما بدى به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحي الرؤيا الصادقة في النوم فكان لا يرى رؤيا الا جاءت مثل فلق الصبح ثم حُبب اليه الخلاء فكان يخلو بغار حراء فيتحنث فيه وهو التعبد الليالي اولات العدد قبل ان يرجع الى اهله ويتزود لذلك ثم يرجع الى خديجة فيتزود لمثلها حتى فجئه الحق وهو في غار حراء فجاءه الملك فقال اقرأ قال ما انا بقارى قال فاخذنى فغطنى حتى بلغ منى الجهد ثم ارسلنى فقال اقرأ قل ما انا بقارى قال فاخذنى فغطنى الثانية حتى بلغ منى الجهد ثم ارسلنى فقال اقرأ قل ما انا بقارى فاخذنى فغطنى الثالثة حتى بلغ منى الجهد ثم ارسلنى فقال اقرأ باسم ربك الذى خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربك الاكرم الذى علم بالقلم علم الانسان ما لم يعلم فرجع بها رسول الله صلى الله عليه وسلم ترجف بوادره حتى دخل على خديجة فقال زملونى زملونى فزملوه، حتى ذهب عنه الروع ثم قال لخديجة اى خديجة مالى واخبرها الخبر قال لقد خشيت على نفسى قالت له خديجة رضى الله عنها كلاً ابشر فوالله لا يخزيك الله ابداً والله انك لتصل الرحم وتصديق الحديث وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقري الضيف وتعين على نوائب الحق فانطلقت به خديجة حتى اتت به ورقة بن نوفل بن اسد بن عبد العزى وهو ابن عم خديجة اخى ابيها وكان امرأ تنصر فى الجاهلية وكان يكتب الكتاب العربى ويكتب من الانجيل بالعربية ماشاء الله ان يكتب وكان شيخاً كبيراً قد عمى

فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ اَيِّ عَمِ اسْمِعْ مِنْ ابْنِ اخِيكَ قَالَ وَرَقَةُ بْنُ نَوْفَلٍ يَا ابْنَ اَخِي مَاذَا تَرَىٰ فَاخْبِرْهُ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبِرْ مَا رَأَىٰ فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي اَنْزَلَ عَلَىٰ مُوسَىٰ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا لَيْتَنِي فِيهَا جُذْعًا يَا لَيْتَنِي اَكُونُ حَيًّا حِينَ يَخْرُجُكَ قَوْمُكَ قَالَ النَّبِيُّ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ مَخْرَجِيْ هُمْ قَالَ وَرَقَةُ نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمَا جِئْتَ بِهِ اِلَّا عَوْدِيْ وَانْ  
يَدْرِكْنِي يَوْمَكَ اَنْصُرَكَ نَصْرًا مُّؤَزَّرًا. (مسلم ص ۸۸)

ترجمہ عروہ بن زبیر حضرت عائشہؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ پہلی چیز جس سے  
آنحضور ﷺ پر وحی کی ابتدا ہوئی روایہ صالحہ تھے، جنہیں آپ خواب میں دیکھتے تھے، چنانچہ جو خواب بھی  
دیکھتے، وہ سپید صبح کی طرح سامنے آتا، پھر غلوت گزینی آپ کے نزدیک محبوب کر دی گئی، اور غار حراء میں غلوت گزینی  
فرماتے، اور اپنے اہل کی طرف، اشتیاق سے پہلے، کئی رات تک اس میں عبادت فرماتے تھے، اور اس کے لئے سامان  
خور و نوش ساتھ لیجاتے تھے، پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس، واپس تشریف لاتے، اور اتنے ہی راتوں کے پھر  
سامان، مہیا فرماتے، یہاں تک کہ آپ کے پاس اچانک حق آگیا، جبکہ آپ غار حراء میں تھے، چنانچہ وہ فرشتہ، آپ کے پاس آیا،  
اور اس نے کہا، پڑھئے، آپ نے فرمایا، میں نے فرشتہ سے کہا، کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، فرشتہ نے مجھے پکڑا اور دہرایا،  
یہاں تک کہ اس کا دہانا، میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور کہا اقرأ، تو میں نے کہا، میں پڑھا ہوا نہیں  
ہوں، پھر اس نے پکڑا، اور دوسری مرتبہ دبوچے، یہاں تک کہ اس کا دبوچنا، میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گئی، پھر اس نے مجھے  
چھوڑ دیا اور کہا اقرأ، میں نے اس سے کہا، کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، پھر اس نے مجھے پکڑا، اور تیسری مرتبہ دبوچے، پھر مجھے  
چھوڑ دیا، اور کہا اپنے پروردگار کے نام سے پڑھئے، جس نے انسان کو، جسے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھئے آپ کا پروردگار بڑا  
کریم ہے، یہ آیات لے کر آنحضور ﷺ واپس ہوئے، اور آپ کا دل کانپ رہا تھا، چنانچہ خدیجہ بنت خویلدؓ کے پاس تشریف  
لائے، اور فرمایا کہ مجھے کبیل اوڑھا دو لوگوں نے آپ کو کبیل اوڑھا دیا، یہاں تک کہ آپ کا خوف ختم ہو گیا، پھر آپ نے یہ  
کیفیت حضرت خدیجہؓ سے بیان کیا، اور پورے واقعہ کی اطلاع دی، اور فرمایا کہ، مجھے اپنی جان کا خطرہ ہو گیا تھا، حضرت خدیجہؓ  
نے فرمایا ہر گز ایسا نہیں ہو سکتا، خدا کی قسم اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا، بلاشبہ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں، اور سچ  
بات بولتے ہیں، اور ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، آپ ناداروں کے لئے کماتے ہیں، اور آپ مہمان نوازی کرتے ہیں، اور آپ  
لوگوں کی ان حوادث پر مدد کرتے ہیں، جو حق ہوتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو ساتھ لے کر چلی ورقہ بن نوفل کے  
پاس پہنچی، جو اسد بن عبد العزیٰ کے بیٹے اور خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے، اور ورقہ ایسے آدمی تھے، جو جاہلیت کے زمانہ میں  
دین نصرانیت، اختیار کر چکے تھے، اور وہ عربی خط کے کاتب تھے اور انجیل میں سے عربی زبان میں لکھتے تھے جو خدا کو منظور تھا وہ  
بہت عمر رسیدہ آدمی تھے، جس کی بصارت بھی جاتی رہی تھی، ان سے حضرت خدیجہؓ نے فرمایا، اے میرے چچا، اپنے بھتیجے کی  
بات سنو، چنانچہ ورقہ نے آپ سے کہا، میرے بھتیجے کیا تم دیکھتے ہو۔ پھر آنحضور ﷺ نے ان کو وہ تمام واقعات سنا دیے،  
جس کا مشاہدہ فرمایا تھا، ورقہ نے کہا، یہ تو وہی رازدار جو خداوند قدوس کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتے تھے، کاش

میں تمہاری پیغمبری کے زمانہ میں نوجوان اور طاقتور ہوتا، کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا، جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔ تو آنحضور ﷺ نے فرمایا، کیا مجھ کو وہ لوگ نکالیں گے، حضرت درقہ نے کہا ہاں، کوئی شخص کبھی نہیں آیا اس چیز کو لیکر جس کو آپ لائیں گے مگر ان سے دشمنی کی گئی، اگر مجھے آپ کا وہ دن ملا تو میں بھرپور مدد کروں گا۔

### وحی کے معنی

”بدء“ کے معنی ہیں: آغاز، ابتداء، شروع۔ بعض روایتوں میں ”بدء“ ہے جس کے معنی ظہور کے ہیں، تاہم آل کے اعتبار سے دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے، مگر زیادہ بہتر پہلی روایت ہے جس میں یہ بدء کا لفظ ہے۔

لفظ وحی کے اصل معنی ہیں: اشارہ کرنا، الاعلام الخفی، علامہ ابن تیم نے ایک قید بڑھائی ہے ”الاعلام الخفی السریع“ دوسرا معنی: رحر و اشارہ میں بات کرنا، القاء کرنا، الہام کرنا، پیغام بھیجنا، انبیاء کرام پر نزول وحی کی مختلف صورتیں تھیں بعض کو براہ راست شرف تکلم حاصل ہوا، جیسے حضرت موسیٰ، خود سرور کو نبین کو شب معراج میں براہ راست شرف تکلم حاصل ہوا، دوسری صورت: فرشتہ کے واسطے سے پیغام الہی کا آنا، زیادہ تر یہی صورت پیش آئی، تیسری صورت: القاء ہے، یعنی من جانب اللہ دل میں کسی بات کا القاء ہو جانا، جیسے آنحضور ﷺ نے فرمایا: القی فی روعی،

لیکن قرآن میں لفظ وحی کی نسبت بعض مقامات پر غیر نبی کی طرف بھی کی گئی ہے اس سے وحی معروف مراد نہیں، بلکہ دوسرے معنی ہیں، کہیں الہام کے معنی جیسے ”واوحینا الی أم موسیٰ“ والدہ موسیٰ کے دل میں ڈال دیا، کہیں حکم کے معنی میں ہوگا، جیسے ”واوحیت الی الحواریین“ اور ہم نے حواریوں کو حکم دیا، اور کہیں طبعی خاصہ پیدا کرنے کا معنی ہوگا، جیسے ”واوحی ربک فی النحل“ میرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یوں رکھا،

### مبادیات وحی کا مقصد

قوله اول ما بدئنی به رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا منشا مبادیات وحی کو بتلانا ہے، کہ مقدمات وحی میں سچے خواب ہیں، بعض روایتوں میں کچھ اور مبادیات مذکور ہیں، مثلاً روایت ہے کہ سرور کو نبین ﷺ مکہ مکرمہ میں پندرہ سال قیام پذیر رہے جن میں سات سال تک آپ روشنی دیکھا کرتے تھے، دوسری روایت میں ہے کہ: چالیس سال تک کی عمر میں آپ کو نبوت ملی، ابتداء نبوت میں ۳ سال تک اسرافیل علیہ السلام آپ کے ہر لہرے اور کبھی ایک کلمہ، کبھی کوئی بات آپ پر القاء فرماتے رہتے، مگر قرآن ہنوز نہیں اتر تھا، جب تین سال کی مدت گزر گئی، تو اس کے بعد جبریل علیہ السلام آپ کے ہر لہرے ہننے لگے ایک اور روایت ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں، کہ مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو میں خوب پہنچاتا ہوں جو میری بعثت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔ (ترمذی ج ۲ ص ۲۰۳)

ان مبادیات سے مقصود یہ تھا کہ عالم غیب سے روحانی تعلق میں مزید اضافہ ہو، اور عالم غیب سے تعارف ہو اس کے لئے بطور مبادیات جن چیزوں کا تذکرہ ہے اس میں بظاہر یہ مناسبت معلوم ہوتی ہے مثلاً: نور دیکھا کرتے تھے، تو ایک نورانی عالم کا تعارف نور سے ہونا ہی مناسب تھا، اسی طرح پتھر جیسی غیر شعور چیز سے سلام کی آواز بھی عالم غیب سے تعارف کا ایک ذریعہ ہے جو عالم اسباب سے بالاتر ہے، اسی طرح حضرت اسرافیل کو اور وحی کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے اسی وجہ سے نفع صورت کی



خدمت ان کے سپرد ہے۔ اسی طرح رویہ صالحہ کا تعلق بھی عالم غیب سے ہے، غرض اس مدت میں قدرت کو منظور تھا کہ آپ کی روحانیت اور بلند سے بلند مراتب طے کر لے، اور آئندہ آپ میں قرآن کریم کے نزول کی تحمل کی صلاحیت مزید مکمل ہو جائے، جس کے تحمل کی طاقت پہاڑوں میں نہیں، اس سے اندازہ لگانا چاہئے کہ کلام الہی بھی کتنا پر عظمت کلام ہے جس کے نزول کے لئے کتنی تمہیدیں ہو رہی ہیں، کبھی جمادات سلام کرتے ہیں کبھی صرف غیبی آواز آتی ہے ایک مدت تک سچے خواب دکھائے جا رہے ہیں، اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتہ بھی ایک ایک کلمہ القا کر کے اس صلاحیت میں اضافہ کر رہا ہے۔

### رویہ صالحہ بمبشرات ہیں

ارشاد نبوی ہے کہ میرے بعد نبوت کا کوئی جزء باقی نہ رہا، صرف مبشرات باقی ہیں، صحابہ نے عرض کیا، کہ یا رسول اللہ ﷺ مبشرات کیا چیز ہیں؟ آپ نے فرمایا اچھے خواب جو مسلمان خود دیکھے، یا اس کے لئے کوئی دیکھے (ترمذی ج ۲ ص ۵۳) جامع ترمذی کی روایت ہے میں ”لهم البشرى فى الحياة الدنيا“ کہ بشری سے مراد رویہ صالحہ ہے (ترمذی ج ۲ ص ۵۳) بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے مرفوع روایت ہے ”الرويا الحسنة من الرجل الصالح جزء من ستة واربعين جزء“ (بخاری ج ۲ ص ۹۳۸) نیک آدمی کا اچھا خواب نبوت کا چھالیسواں جزء ہوتا ہے، چھالیسویں جز کہنے کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ سرور کونین ﷺ نبوت سے پہلے چھ ماہ تک مسلسل خواب دیکھتے رہے، اس کے بعد وحی کا دور شروع ہوا، جس کی مدت تیس (۲۳) سال ہے، اس حساب سے چھ ماہ سال کا چھالیسواں جزء ہوا، مگر یہ توجیہ اس وقت کمزور ہو جاتی ہے جبکہ دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چھالیسواں حصہ، اور بعض میں چھبتر واں حصہ کہا گیا ہے، جبکہ اس کی کوئی قابل قبول توجیہ نظر آتی نہیں، اس لئے یہی کہا جائے کہ اس تعداد کی حکمت و وجہ شارع کو ہی معلوم ہے، جیسا کہ نماز، و تسبیحات کو تعداد کا مسئلہ ہے۔

خواب جزء نبوت کیونکر ہو سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کسی چیز کا حصہ اس سے جدا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ ہوتا ہے تو جب نبوت باقی نہیں رہی تو نبوت کا حصہ رویہ صالحہ کیونکر باقی رہے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خواب علم نبوت کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور ظاہر ہے کہ علم نبوت باقی ہے مگر چہ نبوت باقی نہیں۔

الرويا الصالحة: یعنی جو کچھ آپ نے دیکھا بیداری میں واضح طور پر سامنے آ جاتی، اور اس کی تعبیر میں ذرہ برابر دشواری نہیں ہوتی، حضرت عائشہؓ نے آپ کے سچے خواب کو صبح کی سفیدی، اور ترکے سے تشبیہ دی ہے، یہ تشبیہ وضاحت میں ہے، ابن ابی جرہ نے اس تشبیہ میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ رویہ مبادی وحی میں سے ہے، اور سرور کونین ﷺ انبیاء کرام میں مثل آفتاب کے ہیں، اور آفتاب کے مبادی میں سے صبح صادق کا ترکہ ہے، شمس نبوت کے طلوع ہونے کے مناسب یہ تھا کہ اس کا مبدأ یعنی فلک الصبح ہوتا، کہ جس طرح طلوع شمس سے کچھ روشنی ہوتی ہے اسی طرح شمس نبوت سے پہلے کچھ روشنیاں ہونی چاہئے، چونکہ آپ انبیاء کرام کی جماعت میں شمس کی حیثیت رکھتے تھے، اور دیگر انبیاء قرار و ستاروں کی طرح تھے، اور جس طرح طلوع آفتاب کے بعد پھر کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں رہتی، اسی طرح آپ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں رہ گئی، صبح صادق رات کی تاریکی کو ختم کرنے کی علامت ہوتی ہے، اسی طرح آپ کی بعثت اس بات کی علامت

ہے کہ اب دنیا سے کفر و ضلالت اور جہالت کی تاریکیاں کانور ہونے والی ہیں۔

### غار حرا کا انتخاب کیوں؟

ثم حُبِبَ اليه الخلاه: خلاہ کے دو معنی آتے ہیں، (۱) مکان خلوت (۲) خلوت اختیار کرنا، یعنی مصدر یہاں معنی مصدری فعل خلاہ مراد ہے۔ یعنی آپ کے قلب مبارک میں تنہائی میں رہنے کی محبت ڈال دی گئی، اس کام کے لئے آپ نے غار حرا کو تجویز فرمایا، حرا کو اب جبل ثور کہتے ہیں، اور اہل مکہ اس کو اسی نام سے جانتے ہیں، مکہ تین میل کے قریب مٹی جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر پڑتا ہے۔ جن لوگوں نے غار حرا جاکر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ خلوت کے لئے نہایت موزوں اور مناسب جگہ ہے، ایک تو غار میں داخل ہونے کے لئے راستہ بہت تنگ کہ ہر دو آدمی ایک ساتھ نہیں چل سکتے، اور ایک آدمی کو بھی میز حرا چھو کر چلنا پڑتا ہے، اور قدرتی طور پر ایسی تاریکی جگہ ہے کہ آفتاب کی روشنی نہیں پڑتی، اور اندورین غار کوئی چیز نظر نہیں آتی، عبادت میں یکسوئی حاصل کرنے کے لئے تاریکی جگہ مناسب ہوتی ہے تہجد کی نماز چونکہ رات کی تاریکی میں پڑھی جاتی ہے، مذاکرین اور شافعیین جانتے ہیں کہ تہجد میں کتنا خشوع و خضوع ہوتا ہے، اسی لئے آپ نے انتخاب فرمایا، دوسری وجہ سیر کی کتابوں سے معلوم ہوتی ہے کہ آپ کے دادا خواجہ عبدالمطلب اس غار میں کبھی کبھی استکاف کرتے تھے، اس لئے آپ نے بھی اسی کو پسند فرمایا، جبل حرا کی چوٹی پر بیٹھنے سے خانہ کعبہ، اور وطن نظر آتا ہے، جبکہ حدیث میں ہے کہ خانہ کعبہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے، گویا دیدار کعبہ کی سہولت بھی پیش نظر تھی۔

فتحتن فيه وهو التعبد: یہ تفسیر مدرج ہے، حضرت عائشہ کا قول نہیں، تحت باب تفضل سے ہے اور تفضل کا خاصہ ترکہ ماخذ ہے۔ حنن بمعنی تازیانہ ناشائستہ حرکت کرنا، تو تحت کے معنی ترکہ گناہ کنایہ عبادت مراد لی گئی ہے۔ "اللیالی" حدیث کا لفظ "اولات العدد" اس کی تاکید ہے کہ تھے دن وہاں ٹھہرتے تھے اس کا حل اللیالی جمع کثرت سے سمجھ میں آتا ہے کہ کئی کئی رات گزارتے تھے، رات کے تابع دن ہے لہذا اس میں دن میں شامل ہے، بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے رمضان کا پورا مہینہ گزارتے تھے، ایک زمانہ تک حرائم آمدورفت کا سلسلہ رہا۔

### نبوت سے پہلے طریقہ عبادت

یہاں لوگوں نے سوال کیا ہے کہ سرور کونین ابھی نبی نہیں بنائے گئے تھے، جہالت کا دور دورہ تھا، اور جاہلیت کے ماحول میں پرورش ہوئی تھی، تو پھر آپ عبادت کیا کرتے تھے، کسی حدیث میں طریق عبادت کی تصریح نہیں ملتی، البتہ اہل سیر، اور علماء کے مختلف اقوال ملتے ہیں، کسی نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مذہب کے مطابق عمل تھا، کسی نے حضرت عیسیٰ کے مطابق کہا، اور کسی نے کہا کہ من جانب اللہ الہام کے مطابق عبادت تھی، کیونکہ قبل از نبوت بھی آپ دلی تھے بلکہ مسلم ہے کہ ہر نبی قبل از نبوت دلی ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ غور و فکر تھا، کسی نے کہا کہ جاہلیت کے ماحول سے الگ ہو جانا ہی عبادت تھا۔ لیکن راجح قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین ابراہیمی کے مطابق عمل تھا، یعنی دین ابراہیمی کے جو بقیہ حصے اہل عرب میں رائج تھے اس کے مطابق عمل کرتے تھے، حافظ ابن حجر نے دعویٰ کیا ہے کہ در حقیقت یہاں فلا کو چلو سے بدل دیا گیا ہے، اور کلام عرب میں اس طرح بدلنے کا دستور ہے، لہذا اصلاً یہ تھا، تحنف، معنی ہو گا سلسلہ حنیف یعنی دین ابراہیمی کی اتباع کرتے تھے۔

تاہم اگر یہ تبدیلی نہ بھی ہو تو بھی قرینہ سے یہی معلوم ہوتا کہ وہیں حریف ابراہیمی پر عمل تھا۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۲۳) قولہ یرجع إلی اہلہ: یعنی غار حرا میں اس وقت تک قیام فرماتے تھے جب تک بال بچوں سے ملنے کا اشتیاق نہیں ہوتا تھا۔ اشتیاق کے بعد تشریف لاتے، گویا حقوق اللہ، اور حقوق العباد کا اہتمام اب سے ملحوظ خاطر تھا۔

فیفتزون: یعنی توشہ تیار کر کے تشریف لے جاتے، اس سے معلوم ہوا کہ زاد کار کھنا توکل کے خلاف نہیں ہے، توکل کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آدمی اسباب سے بے نیاز ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ طوفان نوح سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو دہی بھیجی تھی، کہ کشتی تیار کر لو، پانی سے بچنے کے لئے کشتی کا ہونا یہ ظاہری اسباب میں داخل ہے اگر یہ توکل کے منافی ہوتا تو کشتی بنانے کا حکم نہ دیا جاتا، خداوند قدوس بغیر کشتی کے بھی بچا سکتے تھے، مگر اسباب سے بے نیاز ہونا شریعت کی تعلیم نہیں، سید المرسلین امام التوکلین غار حرا میں جاتے ہوئے بقدر مدت اقامت خورد و نوش کا سامان ساتھ رکھ لیتے تھے، اگر یہ توکل کے خلاف ہوتا تو سید الکونین خالی ہاتھ جاتے، حضرات صوفیہ چلہ کشی میں خورد و نوش کا سامان ہمراہ لے لیتے ہیں، ان حضرات نے یہ طریقہ سرور کو نین سے اخذ کیا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ حضرت خدیجہ کو آپ کے زاد ختم ہونے کا احساس ہوتا تو خود خورد و نوش کا سامان لے کر پہونچا آتمی، غرض غار حرا میں آپ کی آمد برابر ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ مقصد سامنے آ گیا جس کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔

### حضرت جبرئیل سے پہلی ملاقات

حتیٰ فجثہ الحق: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ سرور کونین ﷺ نے حضرت جبرئیل کو سب سے پہلے مقام اجیاد (فتح الباری ج ۳ ص ۲۳) میں دیکھا، ہوا یہ کہ اس مقام پر آپ جارہے تھے، کہ حضرت جبرئیل نے بلند آواز سے پکار لیا محمد، آپ نے دائیں بائیں جانب دیکھا تو کچھ نظر نہیں آیا، پھر اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھایا تو فضا میں ایک شکل نظر آئی انہوں نے کہا یا محمد میں جبرئیل ہوں، میں جبرئیل ہوں، دوبار کہا، یہ عجیب منظر دیکھ کر آپ وہاں سے تیزی سے نکلے، اور لوگوں میں آگئے، جب لوگوں کے زمرہ سے باہر آئے، تو پھر آپ کو پکارا، آپ دوبارہ وہاں سے الگ ہو گئے، پھر غار حرا میں آپ کے سامنے آئے، اس وقت آپ نے حضرت جبرئیل کو ایسی حالت میں دیکھا کہ ان کے بدن پر یاقوت کے ایسے دو بازو لگے ہوئے تھے، جس کی چمک سے عام انسانی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔

مسلم شریف میں حضرت عائشہ ہی کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے حضرت جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں صرف دوبار دیکھا۔ امام احمد نے عبد اللہ بن عباس کی روایت نقل کی ہے۔ پہلی بار آپ نے جبرئیل کو اصلی صورت میں اس وقت دیکھا جب آپ نے فرمائش کی تھی کہ آپ مجھے اپنی اصلی صورت دکھلا دیں، اور دوسری بار معراج میں، ترمذی شریف کی روایت بطریق مسروق حضرت عائشہ کی ہے کہ اپنی اصلی صورت میں دوبار دیکھا، ایک سدرۃ المنتہی کے پاس، اور ایک مقام اجیاد میں، بظاہر پہلی روایت اور دوسری روایت میں تضاد معلوم ہوتا ہے، بعض حضرات نے کہا کہ پہلی روایت کے راوی ابن ابی السود ہیں جو ضعیف راوی ہیں لیکن ترمذی کی روایت سے اس کی تائید ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ توجیہ کر دی جائے، کہ حضرت جبرئیل کو ان کی مکمل صورت میں دوبار دیکھا، معاملہ مقام اجیاد کا، تو ان کی مکمل صورت

نظر نہیں آئی ہو، اس لئے کہیں عدم تذکرہ اور کہیں تذکرہ

سلیماں بھی اپنی میرت میں اپنے والد کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیلؑ حرم میں تشریف لائے اور فرمایا اقرء پھر چلے گئے، تھوڑی دیر کے بعد آپ کے سامنے اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے، تفصیل کیلئے دیکھیں فتح الملہم ص ۲۳۰۔

### قوله: اقرأ ما انا بقاری

ما انا بقاری کا مفہوم: لفظ اقرأ میں اخبار اور اشلہ و دونوں کا احتمال ہو سکتا ہے یعنی آپؐ وہی پڑھتے جو میں پڑھ رہا ہوں، یا اپنی طرف سے کچھ پڑھتے، آپؐ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، یہاں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ زر قانی شرح مواہب میں روایت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ ایک حریری صحیفہ لے کر آئے جو جو اہرات سے مرصع تھا، اور وہ آپؐ کے وسیع مبارک میں دیا اور کہا اقرأ (زر قانی ص ۲۱۸) شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب آپؐ ای تھے، تو پھر اقرء کا حکم دینا تکلیف مالا یطاق کے قبیل سے ہوا، اشاعرہ کے مسلک پر تو سوال پیدا ہونی نہیں سکتا، کیونکہ ان کے یہاں تکلیف مالا یطاق جائز ہے۔ احناف اور معتزلہ تکلیف مالا یطاق کے قائل نہیں، احناف کے مسلک پر جواب یہ دیا جائے گا کہ گرچہ آپؐ ای تھے، لیکن انسان کے حالات کا بدل جانا کوئی بعید نہیں، جس وقت جبرئیلؑ آپؐ کے پاس آئے، اس وقت آپؐ عالم بشریت سے عالم ملکوت کی طرف متوجہ تھے ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے سے حالات کا بدل جانا مستبعد نہیں ہے جیسے قیامت کے دن عالم، جاہل سب کے ہاتھ نامہ اعمال دے کر کہا جائیگا، اقرأ کتابک کفی بنفسک الیوم حسینا قبر میں مگر تکبیر کا جب سوال ہوگا تو ہر آدمی اس کے سوال کا جواب عربی میں دے گا، تو عالم بدلنے سے کیفیت بدلی، اسی طرح آپؐ عالم ملکوتی میں تھے، اس لئے پڑھنا ممکن، لہذا تکلیف مالا یطاق کا سوال بطل ہوا اور اگر اقرأ میں تلقین کرنا مقصد ہو کہ جیسے بچوں کو استاذ پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ پڑھو، تو اس کا مطلب یہی یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ میں پڑھا ہوں، اس کو پڑھئے، تو پھر تکلیف مالا یطاق کا سوال ہی نہ ہوتا۔

”اور اگر کوئی صحیفہ لے کر نہیں آئے، بلکہ محض زبان سے پڑھنا چاہتے تھے تو پھر زبان سے پڑھنا ہیبت کے منافی نہیں، اکی انسان بھی دوسرے کی تلقین سے تلفظ کر سکتا ہے، خصوصاً فصاحت و بلاغت جبکہ اس کی غلام ہو، تو پھر ما انا بقاری کا کیا مطلب ہوگا؟ تو اس صورت میں حضرت کے جواب کا حاصل یہ ہوگا، کہ ہیبت و دہشت کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتا، روضۃ ملک اور مشاہدہ انوار کی وجہ سے قلب پر اس درجہ ہیبت و دہشت طاری ہے کہ زبان اٹھتی نہیں، کس طرح پڑھوں، جیسا کہ بعض روایت میں کیف اقرأ ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ”ما انا بقاری“ کی ایک اور توجیہ فرمائی ہے، سرکارِ دو عالم ﷺ میں رسالت کی پوری اہلیت تھی، مگر جب کبھی انسان پر عاجزی، واکساری تواضع و خاکساری کا غلبہ ہوتا ہے، تو اپنے کمالات نگاہوں سے اوچھل ہو جاتے ہیں، اور صرف بے بسی، عجز، بے چارگی پیش نظر ہوتی ہے، نیز ایک باکمال انسان جب نااہلوں کے ماحول میں رہتا ہے تو ایسے بھی اس کے کمالات پوشیدہ ہو جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ آپؐ کی پرورش جاہلیت کے ماحول میں ہوئی، مگرچہ آپؐ کے اندر ذرہ برابر اس کی خو، بو نہیں لیکن عجز و خاکساری کے غلبہ کی بنا پر یہ تصور ضرور ہوا کہ ایسے گندہ ماحول میں رہ کر ایک انسان اتنے بڑے منصب پر کیسے فائز ہو سکتا ہے؟ اس لئے تاکید کے ساتھ آپؐ نے انکار فرمادیا، کہ اس عظیم کلام

کو ادا کرنے کی ہماری زبان تاب نہیں رکھتی، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بقول مولانا رومی شیر کا بچہ بکری میں پرورش پایا اور اپنے کو بکری سمجھتے ہوئے گھاس وغیرہ کھاتا رہا، لیکن جب پانی میں اپنا عکس نظر آیا، تو اس کی حقیقت کھلی کہ وہ ہے کیا؟ اب بکریوں سے ممتاز ہوا، اور اس کو اپنی بلندی کا سرسراہٹ ملا، بالکل اسی طرح جب تک آپ کو اپنی سیادت کو نمین کی اطلاع نہیں تھی، آپ کے لئے ایسا تصور دشوار تھا، لیکن جب بار بار فرشتہ کے دبانے سے حقیقت سامنے آئی تو اس بار لانت کو اٹھانے کی آمادگی ظاہر فرمادی، جس سے کو نمین نے انکار کر دیا تھا۔ ”م

حتیٰ بلع منی الجہد: یعنی مجھے پکڑ کر دیا، یہاں تک کہ میں پریشان ہو گیا، یا یہ کہا جائے کہ اس کے تحمل میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا تھا۔ بعض روایت میں نجد کا لفظ جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اس کے دال پر رفع نصب دونوں ہو سکتا ہے۔ نصب کی صورت میں معنی ہوں گے، جبرئیل کو میری جانب سے تکلیف محسوس ہوئی، اور رفع کی صورت میں معنی ہوگا، میری طاقت جواب دینے لگی، دال کے رفع، اور نصب دونوں کو ابن جریر نے ذکر کیا ہے۔ (فتح الباری ص ۱/۲۵)

یہ اعتراض لغو ہے کہ جبرئیل غیر معمولی طاقت کے مالک تھے، اور سرور کو نمین بشر ہونے کی وجہ سے نسبت کمزور تھے، تو پھر کمزور کو دبانے میں طاقتور کو مشقت کیسے محسوس ہوگی، جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نبوت سے قبل بھی زہد و ریاضت کی وجہ سے غیر معمولی طاقت کے مالک تھے، دیکھئے حضرت موسیٰ کے طمانچہ رسید کرنے پر ملک الموت کی ایک آنکھ پھوٹ گئی، غرض یہ فطری بات ہے کہ جب فرشتہ انسان کی شکل میں آئے تو اس میں انسانی خصوصیات آ جاتی ہیں، اس کی واضح مثال، جنات جب سانپ کی شکل میں آئے تو ایک ڈنڈا ہی لگا دیتا کافی ہوتا ہے۔ تو حضرت جبرئیل انسانی شکل میں آئے، اور آپ میں غیر معمولی طاقت تھی، اس لئے حضرت جبرئیل کو تکلیف محسوس ہونا مستبعد نہیں۔

دراصل سرکارِ دو عالم ﷺ کی ذات گرامی میں ملکوتی نور، اور قلب مبارک میں وحی کے عرفان دبوچنے کی حکمت کو منتقل کرنے کی ایک صورت تھی، جس کے لئے حضرت جبرئیل سینہ سے ملا کر وہ قوت منتقل کر رہے تھے، جو وحی الہی کے تحمل میں معین ثابت ہو، تھوڑا تھوڑا کر کے تین بار تدریجی طور پر وہ طاقت منتقل کی گئی چنانچہ اس کے بعد آپ کیلئے پڑھنا آسان ہو گیا، اور وہ نقل دبوچہ جو شروع میں محسوس ہوا ختم ہو کر سہولت ہو گئی۔

علامہ شبلی نعمانی نے انکار کیا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت جبرئیل آپ کو دباؤ میں، اور اس دباؤ سے سہولت پیدا ہو جائے، نقل دور ہو جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلہ کی شروع سے لے کر آخر تک سمجھ میں آنے کی ہے کون سی بات؟ سبھی باتیں تو منتقل سے بالاتر ہیں، تو سب کا انکار کر دیا جائے، علامہ شبیر احمد عثمانی نے اپنا ایک واقعہ فضل الباری میں نقل کیا ہے جو حیدر آباد میں ان کو پیش آیا، مولانا وہاں کے شفاخانہ میں تشریف لے گئے، ڈاکٹروں نے بجلی سے علاج کے بہت سے کرشمہ دکھائے، اور یہ کہا کہ اگر آپ کہیں تو آپ کے بدن میں بجلی داخل کر کے دکھلا دوں، اطمینان دلانے پر مولانا کرسی پر بیٹھ گئے، ایک پینل کا ڈنڈا مولانا کو پکڑا دیا، اور مشین چلا دی، کچھ دیر بعد کہا کہ ہم اس قدر بجلی آپ کے بدن میں پہنچا چکے ہیں حالانکہ مولانا کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا، ڈاکٹر نے مولانا کے خادم خاص مولانا مکی سے کہا کہ آپ ذرا مولانا کو ہاتھ لگائیں انہوں نے ابھی ایک انگلی بڑھائی ہی کہ مولانا شبیر احمد صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کی انگلی سے ایک شعلہ نکلا وہ سمجھے کہ میری انگلی

کٹ گئی، اور مولانا کو بھی تکلیف ہوئی، اور یوں محسوس کرنے لگے کہ کوئی اجنبی چیز بدن پر ہے، پھر ڈاکٹر نے مولانا کو بھی سے کہا کہ آپ دفعہ مولانا کو پکڑ لو، لگے زور سے پکڑنے پر مولانا کی تکلیف اور بوجھ جاتا رہا، اسی حالت میں ڈاکٹر نے ایک تیسرے آدمی سے کہا کہ تم پکڑو، اس کا ہاتھ قریب آیا ہی تھا کہ وہی کیفیت پیدا ہوئی، جو مولوی جی کے پکڑنے سے پہلی بار ہوئی تھی، پھر اس سے کہا کہ زور سے پکڑ لو، جب پکڑا، تو اس کی بھی کیفیت جاتی رہی، حضرت مولانا یہ دیکھ کر فرمانے لگے کہ آج بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا، اور وہ یہ کہ کبھی زور سے پکڑنے میں آسانی ہو جاتی ہے، بس اسی طرح بلاشبہ جبرئیل کے ملنے پر جب نور کا نور سے اتصال ہوا تو اولاً شروع میں تکلیف محسوس ہوئی، مگر جب زور سے دہایا تو ثقل جاتا رہا۔ (فضل لہادی ص ۱۸۶/۱)

قوله إقرأ وربك الأكرم الذي علم بالقلم علم الإنسان ما لم يعلم: یہ چند آیات سرکارِ دو جہاں ﷺ کے حسب حال ہے، بلاغت اسی کا نام ہے کہ شکم کے حال کے مناسب بات کی جائے، اور اسی کو مقتضیہ حال کہا جاتا ہے، اور یہ قرآن میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ حضور ﷺ وحی کے بار اٹھانے اور پڑھنے میں ثقل محسوس کر رہے تھے، اور اپنے آپ کو عاجز محسوس کر رہے تھے، قرآن نے اس شبہ اور تردد کا اس طرح ازالہ فرمایا کہ آپ کی نگاہ تمام تر اپنے لو پر ہے اپنی کمزوری پر ہے، حالانکہ آپ کی نگاہ اس قادر مطلق پر ہونا چاہیے جو ہر قسم کی طاقت کا مالک ہے، آپ کو اپنی نگاہ اس ذات پر رکھنا چاہیے جو آپ کو نبوت سے سرفراز کر رہی ہے "باسم" میں بایا تو استعانت کے لئے ہے یہ مصاحبت کے لئے، دونوں کا حاصل یہ ہے کہ آپ میں قدرت نہیں، مگر اللہ کی مدد سے پڑھو، یہاں بجائے اللہ کے اسم ربکہ کہا بظاہر یاد دلایا گیا کہ جس نے چالیس سال تک عجیب غریب انداز میں آپ کی تربیت کی وہی آپ کو پڑھا رہا ہے، لام راغب نے تربیت کا معنی لکھا ہے کہ کسی کو اس کے حد کمال تک بتدریج پہنچا دینا مطلب یہ ہوا کہ جس نے بتدریج تربیت کی وہ پڑھا رہا ہے، پھر رب کی اضافت آپ کی طرف کر کے غیر معمولی شان ظاہر فرمائی کہ یہ اضافت ہی شرافت و کرامت کی ہے جیسے "نافقہ اللہ، بیت اللہ" اس سے یہ ظاہر کیا گیا کہ آپ کوئی معمولی ہستی نہیں جو اپنے آپ کو حقیر سمجھ رہے ہیں، آپ کی تو یہ شان ہے کہ رب نے اپنی طرف آپ کی نسبت کی ہے۔

الذي خلق: یہاں خلق کا مفعول مذکور نہیں، بلاغت کا قاعدہ ہے کہ مفعول زیادہ ہو تو اس کو حذف کر دیا جاتا ہے، یہاں خلق کا مفعول حذف کر کے اشارہ کر دیا گیا کہ پوری کائنات کا وہی خالق ہے، وہی اعراض و جواہر دونوں کا خالق ہے، غور کریں کہ جس ذات کو پوری کائنات، آسمان، زمین، جنت و دوزخ، جہنم، لوح و قلم، عرش و کرسی، وغیرہ پیدا کرنے پر قدرت ہے کیا اس میں اتنی طاقت نہیں کہ آپ کو نبی بنا دیں۔

خلق الإنسان من علق: یہ تخصیص بعد اعمام ہے، اس میں سرکارِ دو عالم کی توجہ حضرت انسان کی طرف کرانا چاہتے ہیں جس میں خود آپ کی ذات گرامی داخل ہے۔ سوچئے کہ انسان کیا تھا، آپ کیا تھے، انسان پر ایک وہ بھی زمانہ آیا کہ وہ قابل ذکر بھی نہیں تھا، "هل اتى على الإنسان حين من الدهر لم يكن شيئاً مذكوراً، انا خلقنا الإنسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلناه سميعاً بصيراً" اشارہ ہے انسان کی اصل ایسی تھی کہ اس میں کسی چیز کا بالکل اور اک نہیں تھا، اللہ نے اس پر روح فائز کر کے دائم بینا عاقل و فہیم بنایا، تو کیا وہ عاقل کو عارف، اور آدمی کو قاری نہیں بنا سکتا، غرض اس میں قدرت کاملہ کا اظہار اور محبوبِ دو عالم کی تسلی ہے، کہ قوسِ قرأت ہم عطا کرنے والے ہیں، یہاں تک امکان کا بیان

تھا، آگے فعلیت کا ذکر ہے۔

إقرا وربك الاكرم: اس میں وقوع کی دلیل فرمایا کہ رب کے لفظ کو یاد کر لو، اور سوچو کہ جس کی تربیت خدا کے زیرِ نگرانی ہو اس میں یقیناً استعداد کامل ہوگی، اس لئے فیض بھی کامل ہوگا، کیونکہ فیض کا متعدد ہونا دو طرح سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ فیض حاصل کرنے والے میں اخذ کی صلاحیت نہ ہو، دوسرا یہ کہ فیض پہنچانے والا اس لائق نہیں، اور اگر ہے تو بخل کرتا ہے، اب گویا خدا کہتا ہے کہ چالیس سالہ تربیت عجیب انداز پر کرنا یہ کمال استعداد کا ثبوت فراہم کرتا ہے، اور ہم فیض پہنچانے میں کامل ہیں، بخل کا احتمال نہیں کیونکہ اکرم ہیں، تو اب مانع عن الفضل کیا چیز رہی، تو یہ وقوع کی دلیل ہے کہ آپ کی استعداد کو یوں ہی ضائع نہیں کرے گا۔

علم بالقلم: قلم کی مدد سے سکھایا، ظاہر ہے کہ تمام علوم میں قلم واسطہ ہے، مقصد یہ ہے کہ خدا ایک کلمی اور سیما کی ذریعہ انسان کو سکھلانے پر قادر ہے، جو دونوں جامد ہیں، وہ اللہ کیا محمد ﷺ کو جبرئیل کے ذریعہ عطا نہیں کر سکتا؟

### حضرت جبرئیل واسطہ ہیں معلم نہیں

یہاں ایک مشہور شبہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ گویا ایک طرح کے استاد اور معلم ہو گئے، اور سرور کو نین ﷺ تلمیذ، تو بظاہر جبرئیل کی افضلیت معلوم ہوتی ہے، اس کا جواب لفظ قلم سے ہوا، بخاری کا علم ہم تک قلم کے ذریعہ پہنچا، لیکن قلم ہم سے افضل نہیں، ہاں بخاری ہم سے افضل ہیں، کیونکہ قلم کو کچھ معلوم نہیں، حرکت تو کاتب دے رہا ہے، فرشتے بارگاہ الہی میں ایسے ہی ہیں، جیسے قلم کاتب کے ہاتھ میں، جس طرح قلم کو مجال نہیں سرتابی کی، اسی طرح فرشتوں کو مجال نہیں کہ سرتابی کر سکیں پس جبرئیل کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے کاتب و مکتوب کے درمیان قلم ہے، ملائکہ ایسے ہیں جیسے ہمارے اعضاء بلکہ جیسے قلم جس طرح یہ چیزیں خود کچھ نہیں کر سکتی، اسی طرح اللہ کے حکم کے بغیر ملائکہ کچھ نہیں کر سکتے، جہاں کہیں علم کی نسبت فرشتوں کی طرف کی گئی ہے وہ مجازاً ہے، علمہ شدید القوی، یہاں مجاز ہے کہ جبرئیل واسطہ ہے اور واسطہ کا افضل ہونا ضروری نہیں، معلم ضرور افضل ہوتا ہے جو یہاں اللہ تعالیٰ ہے۔

علم الانسان ما لم يعلم: یعنی بچہ شہداد سے کچھ لے کر نہیں آتا، خدا نے اسے علوم عطا کئے، تو جو ذات ایک بچہ کو علم و عقل دے سکتی ہے، کیا وہ بڑے کو نہیں دے سکتی۔

### خوف کس بات کا؟

فرجع بہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ترجف: فرشتہ کو دیکھا تو رعب چھا گیا، مگر یہ آپ کا ہی حوصلہ تھا کہ آپ نے تحمل کر لیا، دوسرا کوئی ہوتا تو برداشت بھی نہ کر پاتا "لقد خشیت علی نفسي" "لقد میں لام جواب قسم ہے، قسم محذوف ہے، تقدیر عبارت یوں ہے "واللہ لقد خشیت علی نفسي" حضرت خدیجہ کو آپ نے اپنی آپ بیتی سنائی، دوران پر اپنا اثر ظاہر فرمایا، کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے، کس بات کا خطرہ؟ تو اس کی تعین میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں، جس کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

(۱) جنون کا خطرہ، یعنی جو کچھ میں نے دیکھا، کہیں اس کا تعلق نجوم و کہانت سے تو نہیں؟ بعض لوگوں نے اس کی تردید

کی ہے کہ نبی کو ایسا گمان کیسے ہو سکتا ہے، لیکن اسامیہؓ نے اس رد کا جواب دیا ہے کہ یہ خطرہ اس وقت آپ کو لاحق ہوا تھا جب تک یہ یقینی طور پر علم نہ تھا کہ آنے والا فرشتہ ہے، اور وہ خدا کے پاس سے آیا ہے۔

(۲) ہا جس، اس قول کی بھی تردید کی گئی ہے، کہ ہا جس اس خیال کو کہا جاتا ہے، جس کا دل میں استقرار نہ ہو، اور یہ خیال بہت دیر تک آپ کے دل میں باقی رہ گیا، اسی لئے حضرت خدیجہ سے اس کا اظہار فرمایا،

(۳) انتہائی دہشت سے موت کا اندیشہ، (۴) اندیشہ مرض (۵) دوام مرض، (۶) باریت کے اٹھانے سے عاجزی،

(۷) رعب کی وجہ سے فرشتہ کی طرف نظر کرنے سے عاجزی، (۸) مدد ڈالنے کا اندیشہ (۹) وطن چھوڑنے کا اندیشہ، (۱۰) اپنی

قوم کی نوبت پر صبر نہ کرنے کا اندیشہ (۱۱) قوم کی تکذیب کا اندیشہ، ان تمام اقوال میں حافظ نے تیسرے قول کو ترجیح دی ہے،

اور اس کے بعد کی دو اور توجیہ یعنی چوتھی اور پانچویں، اس کے علاوہ باقی تمام توجیہات کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اعتراض

سے خالی نہیں۔ (فتح الباری ص ۱۲۴)

### ”ذرا نشان نبوت کے خلاف نہیں“

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کو اپنے بارے میں اس قسم کا شبہ گزرنے لگے، یہ تو منصب نبوت کے خلاف معلوم ہوتا ہے

جب کوئی شخص نبی بتلایا جاتا ہے تو پہلے نبوت کا ان کو یقین دلایا جاتا ہے، اور جب یقین ہو گیا تو پھر ذکر کس بات کا، اس ڈر سے بظاہر

پتہ چلتا ہے کہ نبوت کا یقین ہی نہیں تھا، اسی لئے بعض صحیح فہم لوگوں نے نقد خشیت علی نفسی کا انکار ہی کر دیا، کیونکہ یہ کھرا

اصول کے معارض ہے انہیں میں علامہ شبلی کا نام آتا ہے۔ (دیکھئے سیرت النبیؐ) اس قسم کے مقامات پر علامہ شبلی سے جا بجا غلطیاں

ہوئی ہیں، اصل بات یہ ہے کہ علامہ شبلی انگریزوں سے مرعوب تھے، غزوہ بدر کے سلسلہ میں انہوں نے لکھ دیا ہے کہ سرکارِ دو عالم

ﷺ کے بدر جانے کا مقصد عیر یعنی قریش کے سامان کو لوٹنا نہیں تھا، وہ اس قسم کو شان نبوت کے خلاف سمجھتے ہیں، حالانکہ غور

کرنا چاہئے کہ اگر مقصد عیر ہی تھا، تو اس سے شان رسالت پر کیا فرق پڑتا ہے؟ قریش کا مقصد شام سے سلمان لانے کا صرف یہ

تھا کہ اس سلمان کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جائے، اسلام کے اشاعتی پروگرام کو فیل کیا جائے، اگر سرکارِ دو عالم اس مقصد

سے حاصل کر لیں کہ اسکی وجہ سے مشرکین کی ٹاپاک اسکیم فیل ہو جائے تو یہ کونسا منصب نبوت کے خلاف کام ہوا۔

اگر آنحضور ﷺ کو اپنی جان کا خطرہ تھا، جیسا کہ بخاری میں ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو اپنی نبوت کا یقین نہ

تھا، جان کا خطرہ الگ چیز ہے اور نبوت میں تردد الگ چیز ہے، جان کا خطرہ تقاضائے بشریت کی وجہ سے تھا، اور یہ بات مسلم ہے کہ

انسان کتنے ہی اونچے مقام کو طے کر لے، بشری تقاضے ختم نہیں ہوتے، کیونکہ یہ تو فطری اور قدرتی چیز ہے حضرت ابراہیم علیہ

السلام کے پاس جب فرشتے انسانی شکل میں آئے، پھر ان کو انسان سمجھ کر حضرت نے پھچھاؤں کیا اور پیش کرنے پر نہ کھلایا تو

حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈر گئے، کہ کہیں دشمن تو نہیں ہیں، قرآن نے نقل کیا ہے ”واوجس منهم خيفة“ حضرت ابراہیم

علیہ السلام کو آسمان و زمین کے ملکوت کی سرکرائی اور اس کے باوجود فرشتوں سے ڈر گئے، تو یہ تقاضائے بشریت کی وجہ سے تھا۔

حضرت موسیٰ سے خدا نے فرمایا کہ تم چلو اور اس فرعون کو خدا کے عذاب سے ڈرو جس کے ڈر سے تم بھاگے تھے،

حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ یہ بڑا اہم کام ہے تنہا ممکن ہے نہ سمجھل پائے، اس لئے میرے بھائی کو میرا معین و مددگار بنا دیجئے،



سو نچو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی بنایا تو کیا خدا کا سہارا ان کو کافی نہ تھا، جو بھائی کے سہارے کا مطالبہ کیا، اسی طرح حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ یا اللہ میں ان کی (فرعون وغیرہ) کی نگاہ میں مجرم ہوں ان کے سامنے جاتے ہوئے جان کا اندیشہ لگتا ہے، "فلو جس فی نفسه خيفة"

کیا علامہ شبلی بتا سکتے ہیں کہ خدا کے سامنے ہوتے ہوئے بھی غیر اللہ سے ڈر جانا منصب نبوت کے خلاف ہے؟ یہ سب لالچنی باتیں ہیں، یہ ڈر بشری تقاضے کے نتیجہ میں ہے، جو کسی طرح بھی منصب نبوت کے خلاف نہیں، بس یہی حال یہاں حضور ﷺ کے ڈر کا ہے فرشتہ کو پہلی بار دیکھا، فطری طور پر دہشت طاری ہو گئی۔

اس کے علاوہ بخاری شریف میں خشیت ماضی کا صیغہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کے واقعہ کو بیان فرما رہے ہیں، کہ میرے پاس فرشتہ آیا، دہلیا، اس وقت مجھے اپنی جان کا خطرہ ہو چلا تھا، اس میں ماضی کا حال بتایا گیا، نہ کہ مستقبل کا۔

### حکمت خوف

اس خوف کو ظاہر کرنے میں بڑی مصلحت ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس خشیت کے نتیجہ میں درود جیسے نصرانی مذہب اور توریت و انجیل کے عالم سے آپ کی رسالت کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں، اگر یہ خوف ظاہر نہ کیا جاتا تو درود کے پاس جانے کی ضرورت ہی کیا تھی، اور حضرت خدیجہ کیوں بجاتیں۔

ایک توجہ میں نے اپنے شیخ سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سے سنا ہے، جس کو شیخ الحدیث مولانا زکریا نے الابواب والترجم ص ۱۸/۲ میں نقل کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ پر کوئی خوف و دہشت نہیں تھی، لیکن آپ نے حضرت خدیجہ کے سامنے دہشت زدہ کی صورت بنائی، اور اس میں حکمت یہ تھی کہ حضرت خدیجہ اور گھر والوں سے آپ سے ہمدردی ہو جائے، اگر ایسی صورت نہ اختیار کی جاتی، اور کہیں گھر والے کچھ کہہ دیتے، کوئی جنون کا اثر بتاتے، کوئی کچھ اور کہتے، تو معاملہ قابو سے باہر چلا جاتا، پھر تو باہر کے لوگ یہ کہہ کر بہانہ بازی کرتے کہ گھر والے تو پاگل کہتے ہیں اور ہمیں آتے ہیں سمجھانے، پہلے گھر والوں کو سمجھاؤ، پھر ہم سے باتیں کرنا، خلاصہ یہ کہ لقد خشیت علی نفسی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، یہی وجہ ہے کہ امام بخاری کو اس روایت کی تائید و تقویت کے لئے متابعات پیش کرنے کی ضرورت پڑی، تاکہ روایت میں مضبوطی آجائے۔

فقال خديجة كلا والله ما يخزيك الله أبدا الخ: لفظ كلا اس کے معنی نفی، اور ابعاد کے ہیں، یہ حرف ردع ہے، يخزيك بعض روایت میں يخزئك، حزن سے ماخوذ ہے غم کے معنی ہیں، حضرت خدیجہ کی ذہانت کا کمال جواب سے معلوم ہوتا ہے، انہوں نے سوچا کہ اتنی بڑی دہشت آسانی سے دور نہیں ہو سکتی، اس لئے کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے تاکید در تاکید الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ کلا: کسی نظریہ کے رد کے لئے استعمال ہوتا ہے، مقصد یہ ہے کہ آپ کے دل میں جو کچھ ہے اس کو یقین نکال دیجئے، پھر واللہ قسم کھا کر دوسری تاکید کا استعمال کیا، پھر ما يخزيك الله ابدًا میں ابدًا میں خود تاکید ہے، خذني، اس ذمہ داری کو کہا جاتا ہے جو کسی انسان کے سر ڈالا جائے، اور اس ذمہ داری کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو نباہ نہ سکے، جس کے نتیجہ میں رسول کا سامنا کرنا پڑے، تو مشاہدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری آپ کے سپرد

کرنا چاہتے ہیں وہ آپ کی طاقت سے باہر نہیں، ممکن تھا کہ اتنی بات پر آپ کو تسلی نہ ہوتی۔ اور حضرت خدیجہ کی بات کو حسن ظن پر محمول کر لیتے، اس لئے اپنے دعویٰ کی دلیل خود آپ کے ذات میں پیش فرما رہی ہیں،

إِنَّكَ لَتَتَصَلَّيَ الرَّحْمَنُ: آپ اپنے آئینہ میں اپنے اعمال کا جائزہ لیجئے، آپ میں کیسے کیسے اچھے اوصاف اور عمدہ اخلاق ہیں، قرابت داروں سے صلہ رحمی، ناداروں کے لئے کماتے ہیں، ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ان کلمات میں حسن اخلاق کے سارے اصول بیان کر دیئے گئے ہیں، کیونکہ احسان اپنوں پر ہو گا یا بیگانوں پر، بدن سے ہو یا مال سے، ناداروں پر ہو یا اہلیت رکھنے والوں پر، اپنوں پر احسان، صلہ رحمی میں آگیا، اور بیگانوں پر تقویٰ الضیف میں آگیا، اور ناداروں کے لئے تحصیل الكل میں۔ اب بتائیے جن کا اللہ کی مخلوق کے ساتھ اتنا اچھا سلوک ہو گا، اس کو اللہ تعالیٰ رسوا کرے گا؟

کل: بوجھ، قرآن میں ہے "وَهُوَ كُلٌّ عَلَى مَوْلَاهُ" تاکارہ کو کہا جاتا ہے "تَكْسِبُ الْمَعْدُومُ" تاکا فتنہ مشہور ہے، اور ضررہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، پہلی صورت میں معنی ہوئے آپ معدوم کو کماتے ہیں، یعنی جو چیز آپ کے پاس نہیں ہے اس کے حاصل کرنا کمال اللہ نے آپ کو دیا تھا، مشہور تھا کہ آپ تجارت میں بڑی مہارت رکھتے تھے چونکہ صرف کمالینا کمال نہیں ہے، بلکہ کم کر دوسروں پر خرچ کرنا کمال ہے، اسی کو حضرت خدیجہ نے "تَقْوَى الضَّيْفِ" میں بیان فرمایا، اور اگر تکسب بضم اللہ پڑھا جائے تو ترجمہ ہو گا آپ کمواتے ہیں معدوم کو، دوسرا مفعول محذوف ہے، یعنی فقیر، مطلب یہ ہے کہ فقر کو کمال کمواتے ہیں، معدوم، اور معدوم دونوں طرح پڑھا گیا ہے معدم بلا و او فقیر کے معنی میں، کسب کے معنی فائدہ اٹھانے کے ہیں۔

تَعَيَّنَ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ الْخ: نوائب جمع نائبة کی ہے حادثہ کو کہتے ہیں، حق کا اضافہ کر کے بتاتا ہے، کہ آپ حق کا ساتھ دیتے ہیں، اگر کوئی حق کی حمایت میں ناگہانی حادثہ سے دوچار ہو گیا، تو آپ اس کی مدد فرماتے ہیں، جیسے کسی مقررہ کی ادائیگی کا کفیل بن جائے، اور اس کے پہلے مصیبت میں پھنس جائے، اور آپ میں تو یکمال و تمام یہ اوصاف موجود ہیں اور ایسے اچھے اوصاف و دلوں کو اللہ تعالیٰ باعزت زندگی دیتا ہے، رسوائی کا کیا سوال؟ "فَانْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ" مزید تسلی کے لئے ایک عالم کے پاس لے جا کر آپ کی حقانیت کی شہادت مہیا کرنا چاہتی ہیں، حضرت درود حضرت خدیجہ کے معجزے بھائی ہیں، ان کو حق کی تلاش تھی یہ او زید بن عمرو بن فضیل تلاش حق میں نکل کر شام پہنچے، درود کو کوئی راہب مل گیا، جو صحیح نصرانیت پر تھا، یہ نصرانی بن گئے، اس کے بعد انہوں نے انجیل کی کتابت سیکھی، اور انجیل لکھا کرتے تھے، کیونکہ قرآن کریم کی طرح کتب سابقہ کے حفظ کا رد وین نہ تھا، بعض روایت میں ہے کہ عربی میں لکھا کرتے تھے، ممکن ہے دونوں زبان میں لکھا کرتے ہوں، کیونکہ عبرانی، اور عربی قریب قریب ہے، عبرانی زبان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان ہے جو اللہ نے انہیں عراق سے شام جاتے ہوئے سکھایا تھا، تو ریت وغیرہ عبرانی میں تھی، لیکن انجیل کی زبان میں اختلاف ہے۔

قوله شيخاً كبيراً: وہ عمر درود تھے، اور آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، یہ شبہ کہ پھر کتابت کیسے کرتے تھے، جواب یہ ہے کہ بالکل نابینا نہیں ہوئے تھے، یا نابینا ہونے سے قبل لکھتے تھے،

يا ابن عم: جس روایت میں عم آیا ہے، اس میں ان کو احقرانا چچا کہا گیا ہے۔ حضرت خدیجہ نے حضرت درود سے کہا کہ تجھے کی بات سن لیجئے، درود نے پوچھا، ماذا تقری، آپ کو کیا نظر آتا ہے، آپ نے ان کو وہ ساری باتیں بتائیں، درود نے

من کر کہا "هذا الناس الذي نزل على موسى" خیر کے رازدار کو ناموس کہتے ہیں، اور شر کے رازدار کو جاسوس حضرت ملائکہ اللہ کے رازدار ہوتے ہیں، مراد جبرئیل علیہ السلام ہیں۔

### حضرت موسیٰ کی طرف نسبت کرنے کی وجہ

سوال تو یہ ہوتا ہے کہ ورقہ تو نصرانی تھے، عیسیٰ علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا؟ حافظ ابن حجر نے ایک روایت میں حضرت عیسیٰ کا لفظ بھی ذکر کیا ہے، مگر حافظ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے کیونکہ اس میں ایک راوی عبد اللہ بن معاذ ضعیف ہیں، البتہ ابو نعیم کی دلائل نبوت میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ حضرت خدیجہ پہلے ورقہ کے پاس تھیں آپس اور حضور ﷺ کا سارا ماجرا کہہ سنایا، تو ورقہ نے فرمایا کہ اگر آپ سچ کہہ رہی ہیں، تو یقیناً وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آنے والا فرشتہ ہے اس سے سمجھ میں آتا ہے، کبھی ناموس عیسیٰ کہا، اور کبھی ناموس موسیٰ۔ حضرت خدیجہ کو بتلاتے ہوئے عیسیٰ کا نام لے کر اپنا نصرانی ہونا ظاہر کیا، اور جب آنحضور ﷺ کو خبر دینے لگے تو موسیٰ کا نام لیا، (۱) اس لئے کہ آنحضور ﷺ کی وحی کو حضرت موسیٰ کی وحی سے زیادہ مشابہت تھی، کیونکہ توریت احکام کا مجموعہ ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں اتنے احکام نہیں ہیں، اس لئے بعض نے کہا کہ شریعت عیسوی شریعت موسوی ہی تھی، قرآن میں ہے "ومصدقا لما بین یدی من التوراة ولا حل لکم بعض الذی حرم علیکم" تو چونکہ تورات جامع تھی، اسلئے اس سے تشبیہ دی، کیونکہ قرآن بھی جامع ہے جیسا کہ قرآن کریم میں "ومہیمناً علیہ" ہے، کہ قرآن سارے ادیان کے اوپر نگہبان ہے، غرض ورقہ نے اس تشبیہ میں اشارہ فرمایا، کہ آپ کی شریعت جامع ہے جس طرح موسیٰ کی شریعت جامع تھی، یہ بات انجیل میں نہ تھی، اس میں زیادہ ترقصے اور نصیحتیں ہیں، (۲) دوسری وجہ کہ حضرت موسیٰ فرعون کی سرکوبی کے لئے بھیجے گئے تھے، اسی طرح آنحضور ﷺ کے ہاتھ سے اس وقت کے فرعون ابو جہل وغیرہ کی سرکوبی کی جائے گی، (۳) اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ کی رسالت کو تحقیقی طور پر ثابت کرنے کے لئے حضرت موسیٰ کا ذکر کیا، کیونکہ جبرئیل علیہ السلام کا حضرت موسیٰ کے پاس آنا یہود و نصاریٰ دونوں کے یہاں مسلم تھا، بخلاف حضرت عیسیٰ کے کیونکہ اکثر یہودی ان کی نبوت کا انکار کرتے تھے،

یا لیتنی فیہا جذعا: جذعا کاں مقدر کی خبر ہے۔ اور یہی تاویل کوفیوں نے "انتھوا خیر لکم" میں کی ہے، اور بعض حضرات نے اس کی تقدیر "یا لیتنی جعلت فیہا جذعا" نکالی ہے، اور بعض لوگ حال ہونے کی وجہ سے منصوب مانتے ہیں، جذع، نوجوان، حضرت ورقہ بہت خوش ہوئے انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی آپ نبی ہیں، اس لئے تمنا ظاہر کی۔

### حضرت ورقہ مومن تھے یا نہیں؟

مشہور یہ ہے کہ سب سے پہلے مسلمان مردوں میں ابو بکر صدیق اور عورتوں میں حضرت خدیجہ اور بچوں میں حضرت علی، اور غلاموں میں زید و جلال ہیں۔ حضرت ورقہ کو اول مومن کسی نے نہیں کہا، اگر وہ مومن ہوتے تو مومنین کی فہرست میں ان کا بھی نام آتا، اور اگر نہیں ہیں تو پھر اس وقت کی نصرت اور مدد کا وعدہ اور تصدیق کیوں؟ اور کیسا تھا، اس سے تو ایمان معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جواب مجملایہ ہے کہ صرف تصدیق اور معرفت ایمان کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے دوسرے دین سے بری ہونا، اور دین محمدی کا التزام کر لینا ضروری ہے اور یہ ورقہ سے ثابت نہیں البتہ تصدیق، اور تمنا ضرور ہے، مگر

کوئی ایسا لفظ نہیں ہے، ہاں ورقہ نے انکار ثابت نہیں ہے، تو التزام کا اقرار بھی ثابت نہیں ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان تو ہو سکتے ہیں۔ صحابی نہیں کہلا سکتے ہیں، صحابیت کے لئے دعوت کے بعد مسلمان ہونا اور صحبت اختیار کرنا شرط ہے، چونکہ دعوت سے قبل حضرت ورقہ کی موت ہو گئی، اس لئے بعض نے کہا وہ مسلمان تو ہیں، لیکن اس امت کے مسلمان نہیں، حضور ﷺ نے ان کو سفید پٹا اپنے ہوئے خواب میں دیکھا اور تعبیر مغفرت سے کی، اس سے زیادہ سے زیادہ ان کا ایمان ثابت ہوتا ہے۔

الاعودی الخ: کتاب التفسیر الا اودی "ہے، حضرت ورقہ نے عدوت کی علت اس طرح بیان کی، چونکہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم مشرکین کی عادت و عقیدہ کے خلاف ہوتی ہے، اس لئے لوگ ان کے دشمن بن جاتے ہیں، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ورقہ کو کتب سابقہ سے عدوت مشرکین کا علم ہوا ہوگا، انہوں نے اس کا اظہار اس لئے کیا تاکہ آپ کا غم کم ہو جائے، کیونکہ جب یہ تصور ہوگا، کہ اس مصیبت سے تمام انبیاء کو دو چار ہونا پڑا ہے، تو یہ ایک تسلی کا سامان بن جائے گا، "مرگ انہو شے دارد" مؤزر اقویا کے معنی ہیں۔ ازر سے ماخوذ ہے، قوت کے معنی ہیں، بعض نے ازار سے مٹا ہے، تو اس سے اشارہ ہے کہ کمر کسنا، یعنی بھرپور مدد کرنا۔

حدثني ابو الطاهر..... ان جابر بن عبد الله الانصاري وكان من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يحدث قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو يحدث عن فترة الوحي قال في حديثه فبينما انا امشي سمعت صوتا من السماء فرفعت رأسي فاذا الملك الذي جله نى بحراء جالسا على كرسى بين السماء والارض قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، فجئنت منه فرقا فرجعت فقلت زملوني زملوني فذروني فانزل الله تعالى يا ايها المدثر قم فانذر وربك فكبر وثيابك فطهر والرجز فاهجر وهي الاوثان قال ثم تتابع الوحي. وفي رواية قال ثم حمى الوحي بعد و تتابع وفي رواية اخرى وقال فانزل الله عز وجل يا ايها المدثر الي والرجز فاهجر قبل ان تقرض الصلوة وهي الاوثان.

حدثنا زهير بن حرب..... يقول (يحيى) سألت ابا سلمة اي القرآن انزل قبل قال يا ايها المدثر فقلت او اقرأ فقال سألت جابر بن عبد الله اي القرآن انزل قبل، قال يا ايها المدثر فقلت او اقرأ قال جابر احدثكم ما حدثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم قال جاورك بحراء شهرا فلما قضيت جوارى نزلت فاستبطنت بطن الوادي فتوديت فتظرت امامي وخلفي وعن يميني وعن شمالي فلم ارا احدا ثم نوديت فنظرت فلم ارا احدا ثم نوديت فرفعت رأسي فاذا هو على العرش في الهواء يعني جبرئيل عليه السلام فاخذني من رجة شديدة فانيت خديجة فقلت دثروني فذروني فصبوا على ما فانزل الله تعالى يا ايها المدثر قم فانذر وربك فكبر وثيابك فطهر. (مسلم ص ۹۰)

ترجمہ

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ، وحی کے موقوف ہو جانے کے پیام کی حدیث بیان فرما رہے تھے، آپ نے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں جا رہا تھا کہ آسمان سے ایک آواز سنی، میں نے اپنی نگاہ اٹھا کر دیکھا، تو اچانک، وہی فرشتہ، جو میرے پاس حرام میں آیا تھا، آسمان وزمین کے درمیان کرسی بچھائے بیٹھا ہے، اس حالت کو دیکھ کر مجھ پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ میں زمین پر گر پڑا اور اپنے گھر واپس آیا، اور میں نے کہا، مجھے کبیل اوڑھادو بار، لوگوں نے مجھے کبیل اوڑھادیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ”یا ایہا المدثر“ سے ”فہاجر“ تک آیت نازل فرمائی، رجز، بت کو کہتے ہیں، اس کے بعد پھر وحی گرما گرمی کے ساتھ بے درپے نازل ہونے لگی۔

ترجمہ

دوسری روایت، صحیح، کہتے ہیں میں نے ابو سلمہ سے دریافت کیا، سب سے پہلے قرآن کی کونسی آیت نازل ہوئی، ابو سلمہ نے کہا ”یا ایہا المدثر“ تو میں نے عرض کیا، مدثر یا اقرا، تو ابو سلمہ نے کہا میں نے جابر بن عبد اللہ سے دریافت کیا، کہ قرآن کی سب سے پہلے کون سی آیت نازل ہوئی، انہوں نے کہا ”یا ایہا المدثر“ میں نے عرض کیا، مدثر یا اقرا، تو جابر نے فرمایا کہ میں تم سے وہی بات بیان فرما رہا ہوں، جو مجھ سے آنحضور ﷺ نے فرمایا، آپ نے فرمایا کہ میں ایک مہینہ کے لئے حرام میں محکف ہو گیا، جب میں نے اپنا استکفاف پورا کر لیا، تو میں اتر آیا، اور بطن وادی کے اندر، چلا آیا تو مجھے آواز دی گئی، میں نے اپنے آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، دیکھا، تو کچھ نظر نہیں آیا، پھر مجھے پکارا گیا، تو میں نے دیکھا پھر کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ پھر پکارا گیا، تو میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا، تو وہ فرشتہ فضا میں تخت پر معلق بیٹھا ہوا نظر آیا۔ یعنی جبرئیل علیہ السلام، اس کی وجہ سے میرے بدن میں بہت زیادہ کچکی آگئی، تو میں خدیجہ کے پاس آیا، میں نے کہا کبیل اوڑھادو، گمراہوں نے کبیل اوڑھادیا۔ اور میرے اوپر پانی بہا دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یا ایہا المدثر فطہر تک نازل فرمایا۔

### فترت وحی کی حکمت اور مدت

تشریح

عن فترات الوحی الخ: ماخوذ ہے فتور سے، وحی کے سلسلے کا موقوف ہو جانا کچھ مدت تک کے لئے، چونکہ پہلی بار کی وحی سے، آپ کو غیر معمولی گھبراہٹ لاحق ہو گئی تھی، اس کو دور کرنے کے لئے ایک مدت تک، وحی کے سلسلہ کو موقوف کر دیا گیا، تاکہ وحی کا آپ کو اشتیاق ہو جائے، (بخاری ص ۲۲/۱) فترت وحی کی مدت احمد بن حنبل کی تاریخ میں ۳/ سال بتلائی گئی ہے، ابن اسحاق نے اسی قول پر اعتماد کیا، اور یہی نے نقل کیا ہے کہ روایکی مدت چھ ماہ ہے (فتح الباری ص ۲۷/۱) تو اس صورت میں نبوت کی ابتدا اور دیہ کے ساتھ چالیس سال کی عمر مکمل کرنے کے بعد ربیع الاول میں ہوئی، اور بیداری کی وحی کی ابتدا اور رمضان کے مہینہ میں ہوئی، آنحضور ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ کی مدت اقامت میں اختلاف ہے، بعض روایت میں ۱۳/ سال، اور بعض روایت سے دس سال کا پتہ چلتا ہے۔ ان دونوں میں بعض لوگوں نے اس طرح تطبیق دی ہے، کہ بعض روایت میں فترت کی مدت، ڈھائی سال اور خواب کی مدت چھ ماہ، تو جس نے مکہ کی مدت اقامت دس سال کو لیا، تو اس نے روایکی فترت کی مدت کو شمار نہیں کیا، اور جنہوں نے تیرہ سال والی روایت کو لیا، اس نے دونوں مدت کو شامل کر دیا۔ سہیلی نے تطبیق کی یہی صورت نکالی ہے (فتح الباری ص ۲۷/۱) بخاری کی بعض روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ فترۃ کے زمانہ میں آپ کو وحی نہ آنے کا اتنا ملال ہوا کہ کبھی کبھی صدمہ میں آپ پہاڑ کی چوٹی پر، چڑھ

کر کو د جانا چاہتے تھے، جب کبھی ایسا ارلوه کیا، تو حضرت جبرئیل نمودار ہو کر آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے تھے، اے محمد بے شبہ آپ برحق رسول ہیں، اس کی وجہ سے آپ کو تسلی ہو جاتی تھی۔

قوله فجئت الخ: جیم مضموم، اور ہمزہ مکسور، بعض روایت میں جُئْتُ، دونوں کے معنی گھبرانے اور مرعوب ہونے کے ہیں۔

قوله يا ايها المدثر الخ: انداز پیش آنے والے خطرات پر تنبیہ کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی انھیں اللہ کے عذاب سے جو مستقبل میں آنے والا ہے ڈرو، دشار اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو بدن سے ملا ہوا نہ ہو۔ جس کا ترجمہ بالا پوش، اور شعار وہ کپڑا جو بدن سے ملا ہوا ہو، مدثر سے خطاب کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ آپ کا کام لینے رہنے کا نہیں، بلکہ آپ کے لئے تو بڑا میدان ہے، بڑا کام ہے، جسے انجام دینا ہے۔ یہ پیار و محبت کا خطاب ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ تنبیہ بھی ہے کہ آپ کا کام آرام کرنا نہیں، وربك فكبر اي فعظم یعنی قول، فعل، دعوت، ہر طرح سے اپنے رب کی بڑائی بیان کریں، کبر میں دو چیزیں ہیں، خود بڑائی بیان کیجئے، اور دوسروں کو اس کا سبق بھی دیجئے، چونکہ یہاں ربك مفعول مذکور ہے، اسلئے لغوی معنی ہی مناسب ہے، اللہ اکبر مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ لازم ہے، بعض نے تکبیر تحریمہ مراد لی ہے، ہو سکتا ہے کہ تکبیر تحریمہ بھی اس کا ایک فرد ہو، آیت میں صرف انداز کا حکم ہے، حالانکہ نبی کا ایک کام بشارت کا بھی ہے۔ یہاں اس کی وجہ یہ ہے کہ بشارت کے مستحق مؤمنین ہوتے ہیں، اور اب تک کوئی مؤمن ہوئے نہیں، سب کے سب کافر ہی تھے، اس لئے صرف انداز پر اکتفا کیا گیا۔

قوله وثيابك فطهر الخ: اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے، پاک کر دو کا ترجمہ مناسب نہیں، کیونکہ آنحضور ﷺ تپاک کپڑے استعمال نہیں فرماتے تھے، کہ پاک کرنے کا حکم دیا جا رہا ہو، کپڑے تو پاک ہی تھے، مگر آئندہ کے لئے مزید اہتمام کی ہدایت دی جا رہی ہے، بعض نے ثياب سے نفس مراد لیا ہے، یعنی نفس کو رذائل سے پاک رکھئے۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ظاہر پہلا ہی معنی ہے گویا پہلے انداز کا پھر تعظیم کا پھر ظاہری و باطنی طہارت کا حکم دیا گیا۔ ثياب سے بطور دلالت النفس کے معنی مراد لئے جاسکتے ہیں، اور وہ اس طرح کہ جب کپڑے کی صفائی کا حکم ہے جو انسان کے بدن سے جدا بھی ہوتا رہتا ہے تو نفس کے پاک رکھئے کا بدرجہ کوئی اہتمام ہو نا چاہئے، کیونکہ وہ کبھی انسان سے جدا نہیں ہوتا ہے۔

قوله والرجز فاهجر الخ: رجز سے مراد بت ہے، یعنی بتوں کو چھوڑے رکھئے، یہاں بھی چھوڑ دیجئے سے ترجمہ صحیح نہیں ہے کیونکہ بت پرستی آنحضور ﷺ سے کبھی صادر نہیں ہوئی، رجز کی دوسری تفسیر رجز بمعنی عذاب، یعنی کوئی ایسا کام نہ کیجئے جو باعث عذاب ہو۔ یا رجس کے معنی میں ہو، اوٹان سے ابو سلمہ راوی کی تفسیر ہے، قولہ حتی هويت، ہوی اور اھوی سکتے کے معنی میں۔

ثم حمى الوحى وتتابع الخ: یہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ ہر ایک دوسرے کی تاکید ہے، کثرت و ازداد کے معنی میں ہے۔

سب سے پہلے کونسی آیت اتری

قوله ای القرآن انزل قبل قال يا ايها المدثر الخ: امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف بلکہ باطل

ہے، اور صحیح حضرت عائشہؓ کی روایت ہے جس میں سب سے پہلے، اقرأ باسم کے سب سے پہلے نازل ہونے کی تصریح ہے، مگر بعض لوگوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق بھی دی ہے، اور وہ اس طرح ہے، کہ حضرت عائشہؓ کی روایت کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے اقرأ نازل ہوئی، اور حضرت جابرؓ کی روایت کا مطلب یہ ہے کہ نزل کے بعد سب سے پہلے سورہ مدثر نازل ہوئی، گویا اقرأ کی ابتدا ابتدا حقیقی ہے، اور مدثر کی ابتدا ابتدا اضافی ہے، بعض لوگوں نے یہ بھی تطبیق دی ہے کہ مدثر کی سب سے پہلے نازل ہونے کا مطلب مکمل سورت کا نزول ہے، تو اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ پوری سورت جو سب سے پہلے نازل ہوئی، وہ مدثر ہے، اور اقرأ کی صرف چند آیتیں شروع میں نازل ہوئیں، اور پھر بعد میں باقی آیتیں نازل ہوئیں، فتح الباری (ص ۱۹/۸) میں ایک مرسل حدیث ہے کہ سب سے پہلے سورہ فاتحہ کا نزول ہوا۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ جس مجلس میں اقرأ نازل ہوئی، اسی مجلس میں سورہ فاتحہ بھی نازل ہوئی، کیونکہ اس مرسل روایت میں ”ماذا اقرأ“ بھی ہے، معلوم ہوا کہ پہلے اقرأ باسم کہا گیا، پھر آپؐ نے پوچھا ”ماذا اقرأ“ تو فرشتہ نے کہا ”قل بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد لله رب العالمین“ تو اول نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اول مجلس جس میں اقرأ اتری تھی، اسی میں فاتحہ بھی اتری، درایت بھی اسی کو ترجیح دیتی ہے، کیونکہ فاتحہ کو ام الكتاب کہا گیا، یہ اصل ہے جیسے ختم، اور سارا قرآن اس کی فرع ہے، جیسے درخت فاتحہ میں اجمال ہے، اور سارا قرآن اس کی تفسیر ہے اور ترتیب طبعی بھی اسی کا ساتھ دیتی ہے کہ پہلے نچ ہو اور بعد میں شجر، اس لئے اگر مرسل کو تسلیم کر لیں تو کچھ بعید نہیں۔

قوله جاورت بحراء شهراً الخ: شہر سے مراد رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔

قوله فصبوا على ماء الخ: بخاری کی کتاب التفسیر میں ہے فانیت خديجة فقلت دثروني وصبوا على ماء واحدا۔ (بخاری ص ۳۳/۲)

حافظ ابن حجر کبیل اوڑخانے کے بعد پانی ڈالنے کی حکمت سکون قلب حاصل کرنا بتاتے ہیں، کیونکہ اندر پریشانی تھی، اور دستور یہ ہے کہ جب اندر کچکی ہو اس کے بعد بخار آتا ہے، اور طب نبوی سے یہ بات معلوم ہے کہ بخار کا علاج ٹھنڈے پانی سے کرتے تھے۔ (فتح الباری ص ۷۲/۸)

## باب الاسراء برسول الله صلى الله عليه وسلم الى السموات وفرض الصلوات

حدثنا شيبان بن فروخ... عن انس بن مالك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال  
أتيت بالبراق وهو دابة ابيض طويل فوق الحمار ودون البغل يضع حافره عند منتهى طرفه  
قال فركبته حتى أتيت بيت المقدس قال فربطته بالحلقة التي يربط به الانبياء قال ثم دخلت  
المسجد فصليت فيه ركعتين ثم خرجت فجاءني جبرئيل باناء من خمر واناء من لبن فاخترت

اللبن فقال جبرئيل عليه السلام اخترت الفطرة ثم خرج بنا الى السماء فاستفتح جبرئيل فقيل من انت قال جبرئيل قيل ومن معك قال محمد قيل وقد بعث اليه قال قد بعث اليه ففتح لنا فاذا انا بادم صلى الله عليه وسلم فرحب بي ودعاني بخير ثم عرج بنا الى السماء الثانية فاستفتح جبرئيل عليه السلام فقيل من انت قال جبرئيل قيل ومن معك قال محمد قيل وقد بعث اليه قال قد بعث اليه قال ففتح لنا فاذا انا بابن الخالة عيسى بن مريم ويحيى بن زكريا صلى الله عليهما وسلم فرحباي ودعالي بخير ثم عرج بنا الى السماء الثالثة فاستفتح جبرئيل عليه السلام فقيل من انت؟ قال جبرئيل قيل ومن معك قال محمد قيل وقد بعث اليه قال قد بعث اليه ففتح لنا فاذا انا بيوسف صلى الله عليه وسلم واذا هو قد اعطى شطر الحسن قال فرحب بي ودعاني بخير ثم عرج بنا الى السماء الرابعة فاستفتح جبرئيل عليه السلام فقيل من هذا قال جبرئيل قيل ومن معك قال محمد قيل وقد بعث اليه قال قد بعث اليه ففتح لنا فاذا انا بادر يس صلى الله عليه وسلم فرحب بي ودعالي بخير قال الله عز وجل ورفعناه مكانا عليا ثم عرج بنا الى السماء الخامسة فاستفتح جبرئيل فقيل من هذا قال جبرئيل قيل ومن معك قال محمد قيل وقد بعث اليه قال قد بعث اليه ففتح لنا فاذا انا بهارون صلى الله عليه وسلم فرحب بي ودعاني بخير ثم عرج بنا الى السماء السادسة فاستفتح جبرئيل قيل من هذا قال جبرئيل قيل ومن معك قال محمد قيل وقد بعث اليه قال قد بعث اليه ففتح لنا فاذا انا بموسى صلى الله عليه وسلم فرحب ودعاني بخير ثم عرج بنا الى السماء السابعة فاستفتح جبرئيل فقيل من هذا قال جبرئيل قيل ومن معك قال محمد قيل وقد بعث اليه قال قد بعث اليه ففتح لنا فاذا انا بابراهيم صلى الله عليه وسلم مسنداً ظهره الى البيت المعمور واذا هو يدخله كل يوم سبعون الف ملك لا يعودون اليه ثم ذهب بي الى السدرة المنتهى فاذا ورقها كآذان الفيلة واذا ثمرها كالقلال قال فلما غشيها من امر الله ما غشي تغيرت فما احد من خلق الله يستطيع ان ينعتها من حسنها فاوحى الي ما اوحى ففرض على خمسين صلوة في كل يوم وليلة فنزلت الى موسى عليه السلام فقال ما فرض ربك على امتك قلت خمسين صلوة قال ارجع الى ربك فاسأله التخفيف فان امتك لا يطيقون ذلك فاني قد بلوت بني اسرائيل وخبرتهم قال فرجعت الى ربي فقلت يا رب خفف على امتي فحط عني خمسا فرجعت الى موسى فقلت كُط عني خمسا قال ان امتك لا يطيقون ذلك فارجع الى ربك فاستله التخفيف قال فلم ازل ارجع بين ربي وبين موسى عليه السلام حتى قال يا محمد انهن خمس صلوات كل يوم وليلة لكل صلوة عشر فذلك خمسون صلوة ومن هم بحسنة فلم يعملها كتبت له حسنة فان عملها كتبت له عشرا ومن هم بسئية فلم يعملها لم



تکتب شیئاً فان عملها کتبت سئیة واحدة قال فنزلت حتی انتهیت الی موسیٰ علیہ السلام  
فاخبرته فقال ارجع الی ربک فسلہ التخفیف فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت قد  
رجعت الی ربی حتی استحییٰ منہ۔ (مسلم ص ۹۱)

ترجمہ حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں، آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے براق پیش کیا گیا، اور وہ ایک لمبا سفید رنگ کا جانور ہے، گدھے سے ذرا بڑا، اور فخر سے ذرا چھوٹا، وہ اپنا قدم وہاں ڈالتا تھا، جہاں اس کی نظر پہنچتی تھی، آپ نے فرمایا، میں اس پر سوار ہو گیا، یہاں تک کہ میں بیت المقدس پہنچ گیا، آپ نے فرمایا، میں نے سواری کو اس حلقہ میں باندھ دیا، جس میں انبیاء علیہم السلام باندھے تھے، آپ نے فرمایا، پھر میں مسجد میں گیا، اور وہاں دو رکعت نماز پڑھی، پھر وہاں سے نکلا، تو میرے پاس جبرئیل ایک برتن، شراب کا، اور ایک برتن دودھ کا لے کر آئے، تو میں نے دودھ کو لے لیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے فطرت (فطری چیز کا) کے مطابق انتخاب کیا، پھر مجھ کو آسمان کی طرف لے کر چڑھے، تو وہاں پہنچ کر دروازہ کھلویا، ان سے دریافت کیا گیا کون؟ انہوں نے جواب دیا میں جبرئیل، ان سے پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا محمدؐ، فرشتوں نے پوچھا کیا آپ کی طرف بھیجے گئے ہیں؟ جبرئیل نے فرمایا، ہاں، بھیجے گئے ہیں، اس کے بعد ہمارے لئے دروازہ کھولا گیا، تو کیا دیکھتا ہوں، کہ میں آدم علیہ السلام کے پاس ہوں، انہوں نے مجھ کو خوش آمدید کہا، اور میرے لئے دعاء خیر کی، پھر ہم کو دوسرے آسمان کی طرف لے کر چلے، تو جبرئیل نے دروازہ کھلویا، ان سے دریافت کیا گیا کون؟ انہوں نے جواب دیا میں ہوں جبرئیل، پوچھا آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا، محمدؐ، فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو بلانے کے لئے بھیجا گیا ہے؟ جبرئیل نے فرمایا ہاں، بلانے کے لئے بھیجے گئے ہیں، اس کے بعد ہمارے لئے دروازہ کھولا گیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں خال زاد و لڑکے عیسیٰ بن مریم اور عیسیٰ بن زکریا علیہما السلام کے پاس ہوں، ان دونوں نے مجھے خوش آمدید کہا، اور میرے لئے دعاء خیر کی، پھر ہم کو تیسرے آسمان کی طرف لے چلے، تو جبرئیل علیہ السلام نے دروازہ کھلویا ان سے دریافت کیا گیا کون؟ انہوں نے جواب دیا، میں جبرئیل ہوں، پوچھا آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا، محمدؐ، فرشتوں نے پوچھا کیا آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا، محمدؐ، فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو بلانے کے لئے بھیجے گئے ہیں؟ انہوں نے کہا، محمدؐ، فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو بلانے کیلئے بھیجے گئے ہیں؟ جبرئیل نے فرمایا ہاں بلانے کیلئے بھیجے گئے ہیں اس کے بعد ہمارے لئے دروازہ کھولا گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ میں اور یس علیہ السلام کے پاس ہوں، انہوں نے خوش آمدید کہا، اور دعاء خیر کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں کے بارے میں فرمایا ہے، ”ورفعناہ مکاناً علیا الخ“ پھر ہم کو لے کر پانچویں آسمان کی طرف چلے، تو جبرئیل نے دروازہ کھلویا، ان سے دریافت کیا گیا، کون؟ انہوں نے جواب دیا میں جبرئیل ہوں، پوچھا کیا آپ کے ہمراہ کون ہیں، انہوں نے کہا، محمدؐ، فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو بلانے کیلئے بھیجے گئے ہیں؟ جبرئیل نے فرمایا ہاں، بلانے کے لئے بھیجے گئے ہیں، پھر دروازہ کھولا گیا،

تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہارون علیہ السلام کے پاس ہوں، انہوں نے مر حبا کہا، اور دعاء خیر کی، پھر ہنکو چھٹے آسمان کی طرف لے کر چلے، تو جبرئیل نے دروازہ کھلویا ان سے دریافت کیا کون؟ انہوں نے کہا، میں ہوں جبرئیل، پوچھا گیا، آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا محمدؐ، فرشتوں نے پوچھا، کیا ان کو بلانے کے لئے بھیجے گئے ہیں، جبرئیل نے فرمایا، ہاں، بلائے کیلئے بھیجے گئے ہیں، اس کے بعد ہمارے لئے آسمان کا دروازہ کھولا گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہوں، انہوں نے مر حبا کہا، اور دعاء خیر کی، پھر ہم کو ساتویں آسمان کی طرف لے کر چلے، تو جبرئیل علیہ السلام نے دروازہ کھلویا، ان سے دریافت کیا گیا کون، انہوں نے کہا میں ہوں جبرئیل، پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا محمدؐ، فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو بلانے کے لئے بھیجے گئے ہیں، جبرئیل نے فرمایا ہاں، بلائے کیلئے بھیجے گئے ہیں، پھر ہمارے لئے دروازہ کھولا گیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں ابراہیم علیہ السلام کے پاس ہوں اور وہ بیت المعمور کی جانب، پیٹھ کا سہارا لگا کر بیٹھے ہیں، اور بیت المعمور میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، پھر ان کو دوبارہ آنے کا موقع نہیں ملتا، پھر مجھ کو سدرۃ المنتہی کی طرف لے چلے، تو اس کے پتے، ہاتھی کے کان کی طرح تھے، اور اس کا پھل منکھ کی مقدار میں تھا، جب اس کو اللہ کے تجلیات نے گھیرا تو اس کی حالت بدل گئی، اس کی خوبی کو بیان کرنے کی کسی میں طاقت نہیں،

پھر میری طرف، بہت عظیم وحی بھیجی، جس میں مجھ پر ہر رات و دن میں پچاس نمازیں فرض ہوئیں، اس کے بعد میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، تو انہوں نے دریافت کیا، کہ آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا؟ میں نے کہا پچاس نمازیں، تو موسیٰ نے فرمایا، واپس جائیے، اور تخفیف کی درخواست کیجئے، اس لئے کہ آپ کی امت میں اس کی طاقت نہیں، میں تو بنی اسرائیل کو آزما چکا ہوں، آپ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے پاس پھر گیا، اور عرض کیا یا رب، میری امت سے کچھ کم کر دیجئے، تو پانچ نمازیں کم کی گئیں، پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، اور کہا کہ پانچ کی تخفیف ہو گئی، تو انہوں نے کہا کہ آپ کی امت میں اس کی طاقت نہیں، اس لئے پھر جائیے اور کمی کرائیے، تو میں برابر اپنے رب اور موسیٰ کے پاس آتا جاتا رہا، یہاں تک کہ (آخر میں) حق تعالیٰ نے فرمایا، کہ شب دروز میں پانچ نمازیں ہوئیں، ان میں ہر نماز دس کے برابر ہے، اس طرح پچاس نمازیں ہو گئیں، آپ کی امت میں جو شخص نیک کام کا ارادہ کرے گا، اور اس کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا، تو میں ایک ثواب لکھ دوں گا، اور اگر اس کو کرے گا تو دس ثواب لکھ دوں گا، اور جو شخص برائی کا ارادہ کرے گا، اور اس کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا تو اس پر کچھ نہیں لکھا جائیگا، اور اگر گزرے گا تو ایک گناہ لکھوں گا،

آپؐ نے فرمایا، پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا، اور پوری بات ان سے کہہ دی، تو انہوں نے کہا جائیے اپنے رب کے پاس، اور کم کرائیے، تو آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے کہا، کہ میں اتنی بار اپنے رب کے پاس گیا کہ اب جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

معراج کی حدیث کی شرح سے قبل درج ذیل امور پر تفصیلی نظر ڈالنا نہایت ضروری ہے

(۱) اسراء اور معراج کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (۲) معراج کے رواق کی تعداد (۳) اسراء اور معراج دونوں ایک ہی شب

میں پیش آئے یا الگ الگ راتوں میں؟ (۴) اسراء اور معراج، جسمانی ہوئے یا صرف روحانی؟ (۵) قرآن کریم میں معراج کا

صراحتاً ذکر کیوں نہیں؟ (۶) معراج کا واقعہ کب پیش آیا؟ (۷) معراج کا عقلی ثبوت ان سات امور کی تفصیل بالترتیب ملاحظہ کیجئے۔

پہلی بات کا جواب ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر نص قطعی سے ثابت ہے، اور اس حصہ کا منکر کافر ہے، البتہ معراج کا ثبوت خبر مشہور سے ثابت ہے، اس کا منکر کافر نہیں، بلکہ فاسق کہلائے گا، اور آسمان سے عرش، یا فوق عرش تک کا ثبوت خبر آحاد سے ہے، یہ پہلے دونوں حصہ سے کتر ہے، علامہ تفتازانی نے شرح عقائد میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ (شرح عقائد ص ۱۳۳)

دوسری بات کا جواب خصائص کبریٰ میں اسراء اور معراج کی مختصر اور مفصل روایت کرنے والے، اکتیس (۳۱) صحابہ کا نام گنایا ہے، جن میں حضرت انسؓ، جابر بن عبد اللہ، ابن عباس، ابن عمر، ابن مسعود، علی بن ابی طالب، عمر بن خطاب، ابو یوب النضاری، ابو ہریرہؓ، اسلمہ بنت ابی بکر، ام ہانی، ام سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا نام قابل ذکر ہے۔

تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ عام لوگوں کا رجحان یہی ہے کہ اسراء اور معراج دونوں واقعہ ایک ہی شب میں پیش آئے، اگرچہ ایک قول یہ بھی ہے کہ دونوں دورات میں پیش آئے، لیکن یہ قول مرجوح ہے، عام روایات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جس رات آپ کو بیت المقدس کا سفر کرایا گیا وہیں سے پھر آسمان پر تشریف لے گئے۔ (فتح الباری ص ۱/۴۶۰)

### معراج روحانی یا معراج جسمانی؟

جو تھی بات یہ کہ معراج روحانی تھی، یا جسمانی؟ یہاں بھی محققین، روح مع الجسد کے قائل ہیں، کچھ لوگ جیسے حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "ما فقدت جسد النبی صلی اللہ علیہ وسلم قط" یعنی حضور کا جسم مبارک کبھی غائب نہیں پایا، اسی طرح حضرت امیر معاویہؓ سے منقول ہے کہ ان سے معراج کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ ایک سچا خواب تھا، یا تو ان دونوں کے قول کی توجیہ کر کے جمہور کے مسلک کے مطابق بنایا جائے گا ورنہ تو صرف دو آدمی کی رائے جمہور صحابہ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، ممکن ہے کہ ان دونوں کا اجتہاد ہو، کیونکہ یہ تصریح کہیں نہیں ملتی ہے کہ ان دونوں نے حضورؐ سے سن کر بیان کیا ہو ممکن ہے قرآن کے لفظ "رویا" سے استنباط کیا ہو، حالانکہ روایا سے روایا عین، یعنی بیداری مراد ہے، علاوہ ازیں حضرت عائشہؓ یا تو اس وقت پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں یا بہت چھوٹی تھیں، اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی زوجیت میں واقعہ معراج کے وقت نہیں آئیں، اسی طرح حضرت معاویہؓ اس وقت مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، پھر ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اس وقت مسلمان ہو چکے تھے، کیسے ان کی بات کو ترجیح دی جائے گی ہاں تطبیق کی صورت نکالی جاسکتی ہے۔

علامہ محی السنۃ نے بیان کیا ہے کہ معراج دو مرتبہ ہوئی، ایک مرتبہ بحالت خواب، صرف روحانی، اور اس میں آپ کو عالم ملکوت کی سیر کرائی گئی، اور وہاں کی چیزوں کا روحانی طور پر مشاہدہ فرمایا، اور غالباً وہ روایت اسی طرف اشارہ کر رہی ہے جس میں یہ لفظ ہے "پس آپ کی آنکھ کھلی، تو آپ مسجد حرام میں تھے" اور دوسری مرتبہ اس خواب کو محقق کرنے کے لئے بحالت بیداری بدن، اور روح دونوں کے ساتھ ہجرت سے ایک سال قبل، ۷۷ھ/۲ رجب کی شب کو بقول مشہور معراج ہوئی، جیسے پہلے عمرہ کا خواب دیکھا اور پھر ۷۷ھ میں بحالت بیداری میں عمرہ کیا، جہاں حضرت عائشہؓ اور امیر معاویہؓ نے جسمانی معراج کا انکار کیا ہے اس سے وہی معراج مراد ہوگی جو صرف روحانی ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ معراج روحانی میں آپ کا جسم اطہر غائب

نہیں ہوں اور اگر "ما فقدت جسد النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کا تعلق معراج جسمانی ہی سے کر دیا جائے تو پھر اس کی توجیہ حضرت تھانویؒ نے اس طرح کی ہے کہ فقد کے معنی جستجو اور تلاش سے کیا جائے، اور اس کی مثال قرآن کریم کی آیت جو سورہ یوسف میں ہے "ماذا تفقدون" یہاں بادشاہ کے صانع اور پیانہ کو لوگ تلاش کر رہے تھے، تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے دریافت کیا تھا "ماذا تفقدون" تم لوگ کیا تلاش کر رہے ہو، بالکل اسی طرح حضرت عائشہؓ کی روایت "ما فقدت جسد النبی علیہ السلام" کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ معراج سے اتنا جلد واپس آ گئے، کہ ہمیں آپ کو تلاش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی، (بیان القرآن ص ۷۳/۶) یہ تاویلات اس لئے ضروری ہیں تاکہ اس قسم کی روایتیں جمہور کے خلاف نہ رہنے پائیں، صحیح بات یہ ہے کہ جس اسرار کا ذکر قرآن میں ہے، اور معراج کا ذکر جو عام حدیثوں میں ہے اس کے سیاق و سباق سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفر جسمانی بیداری کی حالت میں ہوا ہے۔

پہلا قرینہ تو لفظ سبحان ہے، اس واقعہ کو اس لفظ سے شروع کرنے کا مقصد ہی، یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس حیرت ناک سفر کو سن کر، بہت سے لوگوں کو سخت حیرت ہو گی، اور دشمنوں کو تو خوب آوازیں سننے کا موقع ملے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس کی پیش بندی لفظ سبخن سے کی گئی کہ جن واقعہ کو تم حیرت ناک سمجھتے ہو، وہ تمہارے لئے حیرت کی بات ہے، لیکن ہماری قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں، ہم اپنے بندے کو آن کے آن میں اتنا لبا سفر کرانے پر قادر ہیں، کیونکہ ہم تو ہر قسم کی خوبیوں کے مالک ہیں، اور ہر قسم کے عیوب بلکہ اس کے شائبہ سے بھی پاک ہیں۔

دوسرا قرینہ لفظ "عبد" ہے اس لفظ کا اطلاق قرآن کریم میں بدن اور روح دونوں کے مجموعہ پر ہوا ہے، پورے قرآن میں صرف روح پر کہیں بھی، لفظ عبد بولا نہیں گیا، قرآن میں ہے "ارایت الذی ینہی عبداً اذا صلی" ظاہر ہے نماز روح و بدن دونوں کے مجموعہ سے ہوتی ہے، اسی طرح لفظ عبد، جسمانی معراج کو بتاتا ہے۔

تیسرا قرینہ واقعہ اسرار اور معراج پر شریکین میں ہنگامے کا برپا ہونا اور حضور ﷺ کا امتحان لینا، اور بیت المقدس کا نقشہ بتانا، اور اس واقعہ سے بعض کمزور ایمان والوں کا ڈگمگا جانا، یہ باتیں کھلی دلیل ہیں کہ معراج خواب کا واقعہ نہیں، بلکہ حالت بیداری میں آپ کو جسمانی معراج نصیب ہوئی، ورنہ تو محض ایک خواب کا تذکرہ کتب سابقہ میں کیا جاتا، جیسا کہ آگے علامہ ابن تیمیہؒ کے بیان میں آ رہا ہے، کون ایسا شخص ہے، جو اس قسم کا خواب نہیں دیکھتا ہے، اور اس قسم کے خواب بیان کرنے والے کے کندھیب کی کون درپے ہوتا ہے، اور کیا محض ایک خواب ہی کی بات سن کر، بعض مومن کا بھی پاؤں پھسل سکتا ہے، خود قرآن پاک میں ارشاد ہے "وما جعلنا الرؤیا الّتی اریناک الا فتنة للناس" کیا صرف ایک خواب فتنہ کا سبب بن سکتا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ اسرار اور معراج بیداری میں پیش آئے، یہاں معراج جسمانی کو روایا سے تعبیر کیا گیا ہے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں "رؤیا عین اریہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی رؤیا عجیب و غریب نظارہ کے معنی میں ہے نہ کہ خواب، خواب اور نظارہ میں قدر مشترک بات یہ ہے کہ خارجی عادت چیز کو بھی خاص رائی کے سوا اور کوئی نہیں دیکھتا جس طرح کہ رؤیا کو بھی صرف صاحب خواب دیکھتا ہے، اس لئے عجیب و غریب یعنی نظارہ کو، اگرچہ وہ بحالت بیداری ہو رؤیا سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

## معراج کا ذکر صراحۃً قرآن میں کیوں نہیں؟

ہاں ایک سوال رہ جاتا ہے کہ قرآن کریم نے معراج کا صراحۃً تذکرہ کیوں نہیں کیا؟ اس کی دو معقول وجہ ہو سکتی ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ مکہ والوں کو بیت المقدس کا تجربہ تھا، اسی حصہ سفر میں ان لوگوں کو اشکال ہو سکتا تھا، کیونکہ عالم آخرت کو تو ان لوگوں نے دیکھا ہی نہیں تھا، اور نہ اس کا تجربہ تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب مشرکین کے بھرے مجمع میں آپ نے امر لبور معراج دونوں سفر کا تذکرہ کیا، تو ان لوگوں نے امتحان کے لئے بیت المقدس کے طائفے، روشندان، ستون کے بارے میں سوالات شروع کر دیئے، اور آپ نے ان کے ہر ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دیدیا، جس کی ان لوگوں کو بھی تصدیق کرنی پڑی، جب اس حصہ کی تصدیق ہو گئی، تو آگے تصدیق کرنے میں کیا تردد رہ جاتا ہے جب ان کے عقیدہ کے مطابق ایک محال کی تصدیق ہو گئی تو پھر دوسرے کی خود بخود تصدیق ہو جاتی ہے، اس لئے قرآن نے صرف اتنا حصہ ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا، جس حصہ سے اہل مکہ اپنی معلومات کی بنیاد پر دلچسپی لے سکتے تھے، جب یہ حصہ ثابت ہو گیا، تو اس کے بعد والا تو خود بخود ثابت ہی ہے،

دوسری وجہ یہ ہے کہ سفر کے صرف اس حصہ کو بیان کیا ہے، جو رات میں ہوا ظاہر ہے، رات اور دن کا ظلوغ و غروب آفتاب کا نام ہے اور عام طور پر یہ کہا جاتا ہے چاند سورج سب آسمان سے نیچے ہے، معلوم ہوا کہ رات و دن کا حساب سورج کے نیچے والے حصہ سے ہے سورج کے اوپر والے عالم میں، جب نہ ظلوغ ہے اور نہ غروب، تو وہاں نہ دن ہے نہ رات، اس لئے آسمانی سفر کو بیان ہی نہیں کیا گیا، بلکہ صرف وہ حصہ ذکر کیا گیا جو رات کے قہوڑے حصہ میں پیش آیا، اور وہ بیت المقدس والا سفر ہے، یہ دونوں وجہیں اپنی جگہ معقول ہیں۔

## معراج کا عقلی ثبوت

اس موضوع پر اس سے قبل بہت کچھ باتیں کہی اور لکھی جا چکی ہیں۔ اور آج کی سائنسی ترقی نے ان تمام اعتراضات کا قلع قمع کر دیا ہے، جو معراج کے محال ہونے پر، زور دار طریقہ پر بیان کئے جاتے تھے، مثلاً یہ کہا جاتا تھا کہ آسمان وزمین کے درمیان کرۂ فناء، اور کرۂ زمهریر پر اتنی ٹھنڈک اور گرمی ہے، کہ کوئی انسان اس کو برداشت کر ہی نہیں سکتا، پھر آنحضور ﷺ ان کرات سے صحیح و سالم کیسے آئے اور گئے؟ اس زمانہ میں امریکہ نے چاند پر جانے کا دعویٰ کیا ہے، اس سے بحث نہیں، کہ وہ یہو نیچے پانچ سو نیچے، مگر اس نے توبہ ثابت کر دیا، کہ کرۂ فناء و زمهریر سے آنا جانا ممکن ہے، تو اگر تمہارے فرستادہ، ان کرات کو عبور کر سکتے ہیں، اور صحیح سلامت آسکتے ہیں، تو پھر آنحضور ﷺ کے آنے جانے میں، کیا استحالہ ہے؟ پھر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ نفس انسانی کا جب تک بدن سے تعلق نہیں ہوتا، اور وہ اپنے روکنے والی قیدوں میں، مقید نہیں ہوتا، تو وہ تیز رفتاری، اور قوت میں لڑنے والے جنات، اور فرشتوں کے مشابہ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں لطافت ہوتی ہے، اور ثقل و کثافت سے پاک ہوتا ہے، بلکہ اس کی سرعت سیر جنات سے بھی زیادہ ہو، تو کوئی بید نہیں، کیونکہ جنات کی پیدائش آگ سے ہے، اور نفس کی نور سے، اور آگ اگرچہ صاف ہوتی ہے، مگر پھر بھی کدورت سے خالی نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں جلتے ہوئے اجزاء شامل ہوتے ہیں، بخلاف نور کے کہ وہ ہر طرح صاف ہوتا ہے، مگر جب نفس کا تعلق بدن سے ہو جاتا ہے، اور مادہ جسدی جب اس کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہے تو اس کی ظلماتیں اس کو اس طرح مقید کر لیتی ہیں، جس طرح زنجیروں

میں جکڑا ہوا قیدی، اس لئے اس میں وہ تیز رفتاری نہیں رہتی، جو اس تعلق سے قبل اس میں تھی، ہاں انسان جب خواہشات کی مخالفت کرتا ہے، اور اس کو مضبوطی کا تابع کر لیتا ہے، اور ساری قوتوں سے کٹ کر خدا کی طرف یکسوئی حاصل کر لیتا ہے، تو اس وقت اس کا نفس تعلقات سے پاک صاف ہو جاتا ہے، اور اس کی قوت اس نسبت سے، اور بڑھ جاتی ہے، اور اس سے ایسی حرکتیں صادر ہونے لگتی ہیں، جن سے شریعتیں بھی عاجز ہو جاتے ہیں، دیکھئے حضرت سلیمانؑ نے جب چاہا کہ بتیس کا تخت یمن سے شام میں پلک جھپکنے سے پہلے ان کے سامنے آجائے، تو عفریت جینی جس کا نام صحر تھا، اس پر قادر نہ ہو سکا، بلکہ وہ عظمت میں، پہاڑ کی طرح تھا کہ جہاں تک نظر پہنچتی تھی وہاں تک، اس کا قدم پڑتا تھا، مگر حضرت آصف بن برخیاؑ نے پلک جھپکنے سے پہلے اس کو حضرت سلیمانؑ کے پاس لا کر حاضر کر دیا، اور یہ صرف اس وجہ سے کہ حضرت آصفؑ کے پاس کتابی علم تھا چونکہ وہ دنیا کے تعلقات سے الگ ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے لہذا اللہ نے اس کو زبردست قوت بخشی، جس کے ذریعہ اتنا زبردست کام کیا، کہ جنات و انسان سب حیران ہو گئے، اور آپ کو معلوم ہے کہ محمد ﷺ صورت و سیرۃ بہترین خلق ہیں، لہذا بشریت کے تعلقات سے آپ کا تجرد اور مادی کدورتوں سے آپ کی صفائی حد درجہ کو پہنچی تھی، کہ آپ گویا نور بن گئے تھے، نیز آپ کو جنت کے چالیس مردوں کی قوت عطا ہوئی، اور جنت کے ایک مرد کو، دنیا کے سو مردوں کے برابر قوت دی جائے گی، اس حساب سے آپ کو ۴۰ ہزار مردوں کے برابر قوت تھی، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، کہ غزوہ احزاب کے دن، خندق کھودنے کا حکم دیا، اور کھدائی ہونے لگی، ایک پتھر نکلا جس پر صحابہ کرام نے کتنی ہی چوٹ ماری، مگر وہ نہ ٹوٹ سکا، جب کدالوں کے لوہے ٹوٹ گئے، تو آپ کو خبر دی گئی، تو آپ نے حضرت سلمانؓ کی کدال لے کر، پتھر پر ایک چوٹ ماری، تو پتھر پھٹ گیا، اور اس میں سے غیر معمولی روشنی نمودار ہوئی۔ حالانکہ اس وقت آپ پر کئی وقت کا فائدہ تھا اور پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے تھے، اگر اتنی قوت کے مالک ہوتے ہوئے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور یہاں سے آسمانوں تک، گشت کر آئیں تو کیا محال بات ہے؟ آپ نے حدیث میں پڑھا ہو گا کہ جو شخص اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کا ہو جاتا ہے لہذا آنحضور ﷺ جو کچھ کہتے تھے، وہ خود نہ کرتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کرتا تھا، (و ما رمیت اذ رمیت الا یہ) اور آپ فعل الہی کے صدور کے لئے محل تھے، وہ روایت یاد کریں جو بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، آنحضورؐ نے فرمایا حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ نفلوں کے ذریعہ میرا مقرب ہو تا رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں، اور جب اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگا ہے تو اس کو عطا کرتا ہوں، اور اگر نہ مانگا ہے تو نہ دیتا ہوں۔ (بخاری ج ۲ ص ۶۳ کتاب الرقاق)

اب سوچو کہ اللہ تعالیٰ جس کی آنکھ بن جائے، جس کا کان بن جائے، پاؤں بن جائے، اس کی آنکھ، کان، پاؤں میں کتنی طاقت ہو گی، اگر وہ اسی طاقت سے بیت المقدس، اور وہاں سے آسمانوں پر پہنچ جائے، تو کیا بعید ہے یہ ایسی دلیل ہے کہ فلاسفہ بھی انکار نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ نفس کے تجرد کے وہ بھی قائل ہیں، نیز فلاسفہ اس کی تصریح کرتے ہیں، کہ سرعت میر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، دیکھو بونلے والا ہر یکہ میں بولتا ہے اور اسی آن آواز ہندوستان میں پہنچ جاتی ہے، اور اس کو ریڈیو سے سنا جاتا ہے۔

رہا فلاسفہ کا یہ کہنا کہ آسمان میں خرق و التیام نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو فلاسفہ اسی میں اختلاف کر رہے ہیں کہ آسمانوں کا وجود ہے یا نہیں؟ تو بتاؤ ان کے اس قول کا کیا اعتبار؟ بطلموس کے سمیترے ماننے والے حکماء تو آسمانوں میں جتنے ستارے جڑے ہوئے ہیں، ان سمیوں میں جوڑ توڑ کو محال سمجھتے ہیں، اور فیثاغورس کے قبضین حکماء کی قطعی رائے یہ ہے کہ آسمان کوئی چیز ہی نہیں، ہاں ستاروں کا وجود ثابت کرتے ہیں، اور ان میں توڑ جوڑ کو جائز بتاتے ہیں، ظاہر ہے جن اقوال میں اختلاف ہو، اس کا کیا اعتبار؟ اس لئے ان لغویات کو چھوڑ کر اللہ و رسول کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اور اس بارے میں اس کے ارشادات کو دیکھا جاتا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضور ﷺ تک جتنی کتابیں اس نے نازل کیں، سب کا اس پر اتفاق ہے کہ آسمانوں کا وجود ہے، اور ان میں توڑ جوڑ ممکن ہے۔

ملا علی قاریؒ نے مرقاة شرح مشکوٰۃ (ج ۱۱، ص ۱۳۹) میں لکھا ہے کہ ارواح چونکہ کمال و جلال کے انوار سے ماخوذ ہیں، اور ان کو بدنوں سے وہ نسبت ہے، جو معراج کی ٹکلیا کو عالم دینا سے نسبت ہے، لہذا جس بدن تک، سورج کی روشنی پہنچتی ہے، تو جیسے اس کی تاریکیاں روشنی سے بدلتی ہیں، اسی طرح جس عضو میں روح کی روشنی پہنچتی ہے، تو اس کی حالت موت سے زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور ارواح کی چار قسمیں ہیں۔

### روح کی چار قسمیں

(۱) ایک وہ جو صفات بشریہ سے مکدر ہیں جیسے عوام کی رو میں، کہ جن پر حیوانی قوتیں غالب ہیں، اس لئے ان میں اوپر چڑھنے کی قابلیت نہیں رہتی۔

(۲) دوم جن کو علوم حاصل ہونے کی وجہ سے قوت فکریہ کا کمال حاصل ہوا جیسے علماء کی رو میں۔

(۳) سوم جن کو اخلاق حمیدہ کے اکتساب کی وجہ سے وہ کمال قوت حاصل ہوئی، جو بدن کی مدد پرہے جیسے اہل ریاضت کی رو میں، جن کے بدن مجاہد و ریاضت کی وجہ سے قوی ہو گئے۔

(۴) چہارم جن کو دونوں قوتوں کا کمال حاصل ہو، جو کہ بشری کی روحوں کا معجزہ ہے، اور ایسی رو میں، انبیاء و صدیقین کی ہیں، اس طرح جوں جوں ان کی روحوں کی قوت بڑھتی ہے، اتنی ہی زمین سے ان کے بدنوں کی بلندی بڑھتی ہے، ہر انبیاء علیہم السلام میں، چونکہ وہ روح قوی ہوتی ہیں، لہذا ان کو آسمان کی جانب عروج ہوتا ہے، اور ان میں کامل تر روح سید الانبیاء سرور کونین ﷺ کی روح ہے، اسی لئے آپ کو قاب قوسین تک عروج ہوا، بلکہ اس سے بھی زیادہ، بس ان روحوں کی مثال ایسی سمجھئے جیسے نوابجاو غبارہ میں دھواں محبوس ہوتا ہے کہ جب تک وہ دھواں خفیف ہوتا ہے کسی کو بھی وہ اٹھا نہیں سکتا، مگر جب وہ قوی ہو جاتا ہے اور اس کی قوت برابر بڑھتی رہتی ہے، تو وہ غبارہ کو بھی اٹھا لیتا ہے۔ اور جو انسان اس کو پکڑ کر لٹک جاتا ہے، اس کو بھی مح ضروری سامان و اسباب کے اٹھا لیتا ہے، یہی حال اس دھواں کا ہے، کہ جب تک کمزور ہوتی ہے تو کسی شئی کو بھی اوپر کی جانب نہیں اٹھا سکتی اور جب ان کی قوت پوری اور صفائی زیادہ ہو جاتی ہے، تو قوت کے مطابق بدن کو اوپر کی جانب اٹھاتی ہے، اور ثابت ہو چکا ہے کہ سب سے زیادہ قوی روح ہمارے نبی سید الانبیاء ﷺ کی ہے لہذا اگر آپ کا لطیف اور صاف بدن اتنا اوپر چڑھ جائے کہ فلک ہفتم سے بھی آگے بڑھ جائے تو اس میں کچھ استبعاد نہیں، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اور سب سے حکیمانہ جواب تو وہ ہے جو واقعہ معراج کے متعلق، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مشرکین کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا، اور وہ یہ ہے کہ معراج خود خرق عادت ہے اور عادت سے بہت ہی بعید ہے، لیکن جب اس سے بھی بعید بات ہم آنحضور ﷺ کی تسلیم کرتے ہیں تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا تردد ہے؟ دیکھئے جس کے پاس بادشاہ خود آتا ہو، اگر اس کو بادشاہ کبھی اپنے گھر بلائے تو کیا تعجب ہے؟ بادشاہ کے پاس کسی کا جانا تو تعجب نہیں؟ ہاں بادشاہ کا کسی کے پاس خود آنا تعجب خیز ہے، یہی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا، میں تو اس سے زیادہ عجیب بات کی پہلے تصدیق کر چکا ہوں، کہ آسمان والے ان کے پاس آتے ہیں، اور خدا کا کلام ان پر نازل ہوتا ہے، اور جن کے پاس آسمان والے آتے ہوں، وہ اگر آسمان پر بلایا جائے تو اس میں کیا تعجب ہے، جب میں ان بعد کا قائل ہوں، تو بعید کا قائل ہونا کیا مشکل بات ہے، اسی طرح ہم کہتے ہیں، کہ جب ہم حضور ﷺ کے لئے خرق عادت کے طور پر معراج کے جو کہ بعد ہے قائل ہیں تو اسی خرق عادت کے طور پر آپ کے لئے سرعت سیر کے بھی قائل ہیں، جو اس کے مقابلہ میں بعید ہے، تو کیا احتمالہ ہے؟

### شرح الفاظ حدیث..... براق پر سفر کی حکمت اور انداز رفتار

قوله او تبت بالبراق الخ: براق بضم الباء اور راء مخفف بریق سے مشتق ہے یا براق سے، بخوف ہے، پہلی صورت میں چونکہ اس کا رنگ سفید تھا، اس لئے براق کہا گیا، اور دوسری صورت میں سرعت سیر کو براق سے تشبیہ دی گئی، اللہ تعالیٰ بغیر براق بھیجے ہوئے بھی بیت المقدس اور آسمان کی سیر کرا سکتے تھے، براق بھیجنے میں دو مصلحت ہے۔

(۱) ایک تو بشری طبیعت کی رعایت انسانوں کو سواری سے ایک انیسیت ہوتی ہے۔

(۲) دوسری وجہ اعزاز و اکرام، بادشاہوں کا دستور ہے کہ جب کسی خاص آدمی کو اپنے پاس بلاتے ہیں، تو ان کے پاس شاہی سواری بھیجی جاتی ہے، اور اس پر سوار ہو کر، معزز ہستی بادشاہ کے یہاں جاتی ہے، اس میں اعزاز و اکرام زیادہ ہوتا ہے، نیز اگر آنحضور ﷺ کو بغیر براق کے بلایا جاتا تو صورت ماشی کی ہو جاتی اور راکب ماشی کے مقابلے میں زیادہ معزز سمجھا جاتا ہے۔

قوله فوق الحمار دون البغل الخ: یعنی معتدل اور متوسط تھا، وین محمدی کی یہی خصوصیت ہے کہ افرط و تفریط سے ہٹ کر، اس میں اعتدال ہے سواری منزل مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتی ہے، بالکل یہی حال دین کا ہے، کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

قوله يضع حافره عند منتهی طرفه الخ: طرف بالفتح و سکون الراء یعنی جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی تھی وہاں اپنا قدم یعنی انتہائی تیز رفتار تھا۔

مسند ابویعلیٰ اور برزخ میں عبد اللہ بن مسعود سے یہ بھی آیا ہے کہ جب پہاڑ پر آتا تھا تو اپنے دونوں پاؤں کو اٹھا لیتا تھا، تاکہ نیچے کی طرف جھکاؤ نہ ہو اور جب پہاڑ سے اترتا ہوتا تھا تو اپنے ہاتھوں کو اٹھا لیتا تھا، یعنی ہمیشہ اس کی پیٹھ برابر رہتی، نشیب و فراز نہیں ہوتا تھا۔

قوله فر کبته: ابوسعید خدری کی روایت میں اتنا اور اضافہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام راکب کو پکڑے ہوئے تھے، اور حضرت میکائیل لگام کو تھامے ہوئے تھے، سمری روایت میں قنارہ، بواسطہ اس آنحضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے



ہیں کہ میرے پاس زمین و لگام کیساتھ براق لایا گیا، اور اس نے اٹھ کھڑی ہو کر براق کو اپنے پیسنے سے لٹکا دیا، تو جبرئیل علیہ السلام نے براق سے کہا کہ یہ کیا حرکت ہے، بخدا آنحضور ﷺ سے زیادہ معزز ہستی نے تم پر سواری نہیں کی، یہ سن کر براق پسینہ پسینہ ہو گیا، لام ترندی نے اس جھڑ کو نقل کر کے اس پر حسن و غریب ہونے کا حکم لگایا ہے، ابن حبان نے بھی اس کی تصحیح کی ہے، کہ ابن مسیر کہتے ہیں کہ براق کی یہ حرکت فخر و مباہات، اور غیر معمولی خوشی کی وجہ سے تھی، حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سے کچھ بلواتا چاہتے تھے مگر وہ شرم کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو گیا، براق کا خوشی میں جھومنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بار پہاڑ میں حرکت ہوئی تو آپ نے فرمایا تھا اثبت فانما علیک نبی و صدیق و شہید الخ فتح الباری۔

قوله حتی اتیت بیت المقدس الخ: مقدس میم مفتوح قاف ساکن اور دال مکسور، اور میم مضموم قاف مفتوح اور دال مشدود مفتوح بھی پڑھا گیا ہے، مشدود والی صورت میں مقدس بمعنی مطہر اور مخفف والی صورت میں یا تو مصدر ہو گا یا ظرف مکان، اگر مصدر ہو، تو الیہ مرجع کم کی طرح ہو گا، یعنی طہارت کے معنی میں اور اگر ظرف مکان ہو، تو اس کا مطلب وہ مکان جس میں پاکیزگی ہو، اور اس کی پاکیزگی اس میں بتوں کا نہ ہونا یا اس لئے کہ اس میں گناہوں سے پاکی ہوتی ہے، اس کو ایلیا بھی کہتے ہیں، ایل بمعنی اللہ یا بمعنی بیت یعنی بیت اللہ۔

### اسباب کا اختیار کرنا خلاف توکل نہیں

قوله فربطته بالحلقة الخ: حلقہ میں لام ساکن اور مفتوح دونوں طرح پڑھا گیا ہے، مراد اس سے بیت المقدس کے دروازہ کا حلقہ، براق کو باندھنے میں حکمت، احتیاط اور اسباب کو اختیار کرنے کی تعلیم ہے، اس سے توکل میں کوئی فرق نہیں آتا جبکہ اعتماد علی اللہ باقی رہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے براق کے باندھنے کا انکار کیا ہے، مسند احمد اور ترمذی میں الکا مقولہ اس طرح نقل کیا ہے، کہ تم لوگ کہتے ہو کہ آپؐ نے براق کو باندھا کیا آپ کو اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آپؐ کے تابع کر دیا تھا، بلکہ عالم غیب و عالم شہادت سب کو مسخر کر دیا تھا، لام یہی فرماتے ہیں کہ ثبت کو تانی پر ترجیح ہوگی، اور باندھنے میں وہی حکمتیں پیش نظر ہیں۔

التي يربط به الانبياء: یہ کامر جمع حلقہ ہے، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام نے بھی براق پر سفر کیا تھا، اس کی تصریح نسائی کی بعض روایت اور ابن مردويه میں ہے، لیکن ملا علی قاریؒ کو یہ تسلیم نہیں کہ اسی براق پر دیگر انبیاء نے سواری کی تھی کیونکہ کوئی نقل صحیح نہیں ملتی۔ (مرقات ج ۱۱ ص ۱۳۰)

### معراج پر پادری کی شہادت

تواریخ میں مذکور ہے کہ ابوسفیان نے جب ہر قل کے سامنے پیش ہوتے وقت کہا کہ اے بادشاہ محمد کی دی ہوئی ایسی خبر نہ سنائیں؟ جس سے آپ کو بھی اندازہ ہو گا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں، ہر قل نے کہا کہ وہ کیا؟ ابوسفیان نے کہا کہ ان کا گمان یہ ہے کہ وہ ایک ہی رات کے اندر ہمارے شہر یعنی مکہ سے چل کر تمہاری اس مسجد میں آئے، اور پھر اسی رات ہمارے یہاں واپس بھی پہنچ گئے، اس پر ایک پادری نے کہا کہ میں اس رات سے واقف ہوں، قیصر نے اس سے پوچھا، تو اس رات سے کیسے واقف ہوا؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں مسجد کے دروازے جب تک بند نہیں کر لیتا، اس وقت تک نہیں سوتا تھا، چنانچہ اس

رات کو بھی میں نے دروازہ بند کر لیا تھا، سوائے ایک دروازہ کے، کہ میں نے اپنے ملازموں سے مدد بھی لی، مگر اس کے بند کرنے کی ہم میں طاقت نہیں ہوئی، ملازم کہنے لگے، اس میں کچھ خرابی آگئی ہے، اس کو رہنے دو، کل کسی بڑھئی سے درست کرالیں گے، چنانچہ میں نے اس کو کھلا چھوڑ دیا، اور جب صبح ہوئی تو میں نے وہاں آکر دیکھا، کہ دروازہ کے گوشے کے پتھر میں سوراخ کیا ہوا ہے، اور اس میں چوپایہ کے باندھنے کی جگہ بھی نظر آئی، اور دروازہ میں کوئی نقص نہیں پایا، جو اس کے بند ہونے سے روکتا ہو، اس سے میں سمجھ گیا کہ اسی وجہ سے دروازہ بند نہ ہو سکا، اور مجھے علم قدیم سے پتہ چلا تھا کہ ایک نبی بیت المقدس سے آسمان کی طرف چڑھیں گے، اس وقت میں نے اپنے رفقاء سے کہا تھا کہ اسی وجہ سے آج کی رات یہ دروازہ بند نہیں ہو رہا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کی معراج کا تذکرہ پہلے صحیفوں میں بھی آچکا ہے، اور آنحضور ﷺ کی دیگر علامات میں اس کو بھی ایک علامت کے طور پر شمار کیا گیا ہے، چنانچہ حافظ موصوف کہتے ہیں۔

قال دانيال النبي! ايضا سألت الله وتضرعت اليه ان يبين لي ما يكون من بين اسرائيل فذكر شأنهم الي ان قال حتى ابعث نبياً من بني اسماعيل الذي بشرت به هاجرة فذكر صفاته الي ان قال اسرى به واتى وارقبه من السماء الي السماء حتى يعلو فادينه واسلم عليه وادعى اليه ثم ارده الي عبادي بالسروور ديناو اننقبطه وانغبطه دانيال ثم سرد قصة رسول الله صلى عليه وسلم وهذه البشارة الي الآن عند اليهود والنصارى يقرؤنها ويقولون لم يظهر صاحبها بعد.

حضرت دانیال نبی نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ بنی اسرائیل کا حال مجھ سے بیان فرمائیے، تو اس نے ان کے حالات بیان فرمادیے، یہاں تک کہ فرمایا کہ میں بنی اسماعیل میں ایک نبی اٹھاؤں گا، جس کی بشارت میں نے باہرہ کو دی ہے، پھر اس نبی کی صفات ذکر کیں، یہاں تک کہ فرمایا، کہ میں شب میں اس کو بلاؤں گا، اور آسمان در آسمان سیر کراتے ہوئے اس کو اوپر بلاؤں گا، اور اس کو اپنے قریب کر کے، ان پر صلوٰۃ و سلام بھیجوں گا، اور وحی کے ذریعہ امر ارد و حکم سے آگاہ کروں گا، اس کے بعد شاداں و فرحاں، اپنے بندوں کے پاس پھر اس کو واپس کروں گا۔ اس کے بعد دانیال علیہ السلام نے آپ کا پورا قصہ ذکر فرمایا، یہ بشارت آج تک یہود، کے یہاں چلی آرہی ہے نصاریٰ بھی اس کو پڑھتے ہیں، مگر یہ کہتے ہیں کہ اس کا مصداق ابھی نہیں آیا۔

قوله فصليت ركعتين الخ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں حضور ﷺ کی نماز کا انکار کرتے ہیں، اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر آنحضور ﷺ وہاں نماز پڑھتے، تو امت پر وہاں کی نماز فرض ہو جاتی، جیسا کہ خانہ کعبہ میں نماز فرض ہے، حضرت حذیفہ کا یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ حضور ﷺ کے نماز پڑھنے سے فرض ہوتا یہ کوئی ضروری نہیں، ہاں آپ کی نماز کی وجہ سے وہاں نماز مشروع ہے اور ہم اس کا التزام کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہاں کی نماز پر بہت کچھ اجر و ثواب کا وعدہ ہے، اور شدہ حال کی اجازت مسجد حرام اور مسجد نبویؐ کیساتھ بیت المقدس کی بھی دی گئی ہے، نسائی میں اتنا اور اضافہ ہے کہ میں براق پر سوار ہوا اور میرے ساتھ جبریلؑ تھے، میں چلا تو ایک جگہ پر جبریلؑ نے فرمایا کہ یہاں اتر کر نماز

ادافرما لیس میں نے نماز پڑھ لی، تو جبرئیل علیہ السلام نے دریافت کیا، کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے کہاں نماز ادا فرمائی؟ آپ نے ارض طیبہ میں نماز ادا کی، اور یہ آپ کا دار بھرت ہے، براز اور طیرانی میں ہے کہ معراج کے لئے جاتے ہوئے میرا گدڑ کھجور کے درخت والی سرزمین سے ہوا تو جبرئیل نے فرمایا یہاں اتر کر نماز پڑھ لیں، تو جبرئیل نے میری نماز کے بعد فرمایا آپ نے یثرب میں نماز ادا کی، پھر دوبارہ ارض طور سیناء میں نماز کا مشورہ دیا جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے مناجات فرمائی تھی، پھر نماز کے لئے کہا جب میں نماز ادا کر چکا، تو فرمایا کہ آپ نے بیت لحم میں، نماز ادا کی، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی، ایک اور روایت میں ہے کہ ارض مدین میں بھی نماز کے لئے کہا۔

### دودھ، شہد، شراب کی پیشکش اور اختلاف روایت

قوله فجاءني جبرئيل بانه من خمر الخ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ برتن بیت المقدس میں، معراج سے قبل پیش کیا گیا، اور قنادہ کی روایت جو حضرت انس سے مروی ہے، کہ یہ پیالہ سدرۃ المنتہی پہنچ کر پیش کیا گیا، نیز پیالہ کے عد میں بھی اختلاف ہے کہیں دو برتن، اور کہیں تین، جسمیں تیسرا پیالہ شہد کا تھا، تطہیق کی صورت یہ ہے کہ ممکن ہے کہ پیالے دو بار پیش کئے گئے ہوں، ایک بار نماز سے فراغت کے بعد، بیت المقدس میں، ممکن ہے اس وقت آپ کو پیاس کا احساس ہوا ہو، اور دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہی پہنچ کر، جہاں آپ نے چار نہروں کا مشاہدہ فرمایا۔ رہا پیالوں کے عدد کا اختلاف تو یہ راویوں کے بیان کا قصور ہو، بعض راوی نے بعض پیالے کا تذکرہ نہیں کیا، ورنہ پیالوں کی مجموعی تعداد چار ہو جاتی ہے، اور یہ چار پیالے چار نہروں کے تھے۔ دودھ، شراب، شہد، اور صاف شفاف پانی کے، حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں انہی چار نہروں کا ذکر ہے، جو سدرۃ المنتہی کے جز سے نکلتی ہے۔

قوله فاخترت اللبن الخ: یہاں روایت مختصر ہے۔ تفصیلی روایت میں اس طرح ہے کہ، دونوں پیالے پیش کر کے کہا گیا کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کیجئے، تو آنحضور ﷺ کو دودھ کے برتن کو منتخب کرنے کا الہام کیا گیا، یہ اعتراض کہ شراب جب حرام ہے، تو آپ کے سامنے کیوں پیش ہوئی، جواب یہ ہے کہ یا تو اس وقت شراب حرام نہیں ہوئی تھی، کیونکہ شراب مدینہ میں حرام ہوئی اور معراج کا واقعہ مکہ میں پیش آیا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حنت کی شراب پیش کی گئی، جو حلال ہے دونوں برتنوں کے پیش کرنے کا منشا آپ کی سہولت اور آسانی کی خاطر، کہ آپ اپنے صوابدید پر جس کو چاہیں پسند فرمائیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ دونوں برتنوں کو پیش کر کے حضرات ملائکہ پر آپ کے حسن انتخاب کی برتری ظاہر کرنا تھی، ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ نے اپنی فراست سے معلوم کر لیا ہو کہ شراب حرام ہونے والی ہے اور دودھ ہمیشہ حلال رہے گا، ظاہر ہے کہ ایسی چیز یقیناً عمدہ ہوگی، اس چیز سے، جواب حلال ہے مگر بعد میں حرام ہونے والی ہے۔

### فطرۃ کا معنی اور انتخاب دودھ کی حکمت

عشر من الفطرۃ کی وضاحت | قوله اخترت الخ: فطرۃ سے مراد، معنی تم ہے کیونکہ یہ فطرۃ انسانی کے مطابق ہے "لقوله عليه السلام كل مولود يولد على الفطرۃ" علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ دودھ کو فطرۃ کہنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دودھ ایسی غذا ہے کہ ہر بچہ پیدا ہو کر اسی کا استعمال

کرتا ہے، آپ نے دودھ اس لئے پسند فرمایا کہ عام طبیعت کا میلان دودھ کی طرف ہوتا ہے (۲) یا اس لئے کہ اس سے ضرر اور نقصان نہیں ہوتا اور شراب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے عقل میں فساد آجاتا ہے اور مگر اہیاں پیدا ہوتی ہیں، ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں دودھ، خالص اور سفید ہوتا ہے، اور ہر مولود کی سب سے پہلی تربیت اسی سے ہوتی ہے، اس وجہ سے عالم قدس میں ہدایت اور علم کو دودھ کی شکل میں دکھلایا گیا، کہ اگر یہاں دودھ جسم کی تربیت اور نشوونما کا ذریعہ ہے، تو علم و ہدایت روح کی تقویت اور نشوونما کا ذریعہ ہے اور شراب چونکہ ایک خراب چیز ہے اس لئے عالم قدس میں ضلالت و گمراہی کو شراب کی صورت میں دکھلایا گیا کہ اس سے روحانی قوت میں فتور، اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اسی لئے حضرت جبریلؑ نے فرمایا "لو اخترت الخمر لغوت امتك"

قوله ثم عرج بنا الى السماء الخ: عرج بطح العین والراء او پر چڑھنے کے معنی میں ہے۔ عرج کا فاعل جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ یا اللہ عزوجل ہیں۔ "عرج بنا" سے یہی سمجھ میں آتا ہے اور بنا جمع متکلم کی ضمیر تعظیمنا ذکر کیا ہو۔ مراد آپ کی ذات مبارکہ ہے حافظ ابن حجر کا رجحان پہلے قول کی طرف ہے، کیونکہ جبرئیل کی حیثیت اس وقت مقصد تک پہنچانے کے لئے زہمائی کی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ معراج دوسرا اسی ایک رات میں ہوئی اور اس سے زیادہ تصریح حضرت ابو سعید کی روایت میں ہے، ابن الخثعم کی روایت میں ابو سعید خدریؓ کے الفاظ یہ ہیں "فلما فرغت مما كان في بيت المقدس اتى بالمعراج"

### آسمان کا سفر کس پر ہوا؟

قوله الى السماء: بظاہر سمجھ یہ آتا ہے کہ براق ہی کے ذریعہ آسمان تک پہنچے، اس روایت سے وہ حضرات استدلال کرتے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں، معراج، اسراء کے علاوہ دوسری شب میں ہوئی، لیکن دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے کہ آسمان پر براق کے ذریعہ سفر نہیں ہوا، بلکہ بیت المقدس سے، معراج یعنی سیر حمی کے ذریعہ سفر فرمایا۔ اور اس کی تصریح ابن اسحاق نے ابو سعید کی روایت میں اور بیہقی نے دلائل النبوة میں کی ہے، ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اختصار راوی نے کی ہے ورنہ تفصیلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس تک براق کے ذریعہ پہنچے، اور بیت المقدس سے آسمان تک کا سفر سیر حمی کے ذریعہ ہوا۔

قوله فاستفتح جبرئیل الخ: بیہقی نے ابو سعید خدریؓ کی روایت میں اس کی تصریح کی ہے کہ آپ آسمان کے دروازہ پر پہنچے جس کو باب المحفظة کہا جاتا ہے، اور اس کے محافظ اسماعیل فرشتہ ہیں، اور ان کے ماتحت بارہ ہزار فرشتہ ہیں۔

قوله قيل ومن معك الخ: اس سے پتہ چلتا ہے کہ محافظ فرشتہ کو لو پر ہی سے اس کا احساس ہو چکا تھا، کہ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ کوئی اور بھی ہیں، اسی لئے انہوں نے دریافت کیا "ا.ك احذ" اور اس کا علم یا تو دیکھ کر ہوا ہوگا، اس لئے کہ آسمان آمینہ کی طرح صاف شفاف ہے، یا اپنی روحانیت یا فراست باطنی سے کیا ہوگا۔

قوله قال محمد الخ: اس سے معلوم ہوا کہ تعریف کے موقع پر کنیت کے بجائے علم کا استعمال ہونا چاہئے محافظ

کے اس سوال ”وقد بعث الیہ“ میں حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو بتانا مقصود تھا کہ ملا علیؑ میں، آپ کی شخصیت معروفت و مشہور ہے اور ان فرشتوں کو اس کا علم ہے کہ آپ کا آسمان پر تشریف لانا یقینی ہے، ورنہ تو سوال کرنا چاہئے کہ محمد کون ہیں؟ قوله وقد بعث الیہ الخ: یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ استفسار تعجب کی بناء پر تھا کہ ماشاء اللہ اتنی بڑی نعمت سے آپ نوازے گئے ہیں، یا آپ کو خوشخبری دینے کے لئے استفسار ہوا ہو، فرشتوں کو اس کا یقین تھا کہ کوئی انسان بغیر اذن خداوندی اتنے اونچے مقام پر نہیں آسکتے ہیں، اور جبرئیلؑ اپنی طبیعت سے کسی کو یہاں تک نہیں لاسکتے ہیں۔ (مرقات ج ۱ ص ۱۳۲)

### فرشتوں کے سوال کی حکمت

حضرت جبرئیلؑ اور پھر ہمارے سوال و جواب کا مقصد یہ ہو کہ آنحضور ﷺ کو آسمانی نظام کے استحکام کا علم ہو، کہ یہاں پہرہ راتا مضبوط ہے کہ جبرئیلؑ علیہ السلام جیسا فرشتہ بھی بغیر پہرہ دار کی اجازت کے آمد و رفت نہیں کر سکتے ہیں۔ اور آنحضور ﷺ جیسی برگزیدہ شخصیت کے لئے بھی اجازت کی ضرورت پڑتی ہے، یہی آیات دکھانے کے لئے تو معراج کا سفر کرایا گیا، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے ”لَنُرِيهٖ مِنْ آيَاتِنَا“ سورہ نجم میں ہے ”لَقَدْ رَأٰی مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی“ اس سے وہ اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے کہ کیا اتنا بڑا واقعہ معراج کا، اور پھر اس کا علم پہرہ داروں کو بھی نہ ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو معلوم تھا مگر آپ کو حکم نظام دکھانے کی غرض سے سوال و جواب کی ضرورت پیش آئی، اس کی ایک توجیہ یہ بھی کی جاتی ہے کہ فرشتوں کو، اس کی اطلاع تو تھی کہ آنحضور ﷺ کو معراج ہونے والی ہے، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ آج تو، کی رات ہوگی، اس لئے تعجب سے سوال کیا کہ کیا آج ہی کی رات بلائے گئے ہیں؟ ممکن ہے حضرت جبرئیلؑ دنیا میں آتے ہوئے کسی اور دروازے سے آئے ہوں، اسی لئے اسماعیلؑ کو اس کا علم نہ ہو سکا، جب آسمان پر جاتے ہوئے دروازہ پر پہنچے تو ممکن ہے ان کو حیرت ہوئی ہو کہ آخر کس طرف سے چلے گئے کہ ہم کو جانے کا علم بھی نہ ہو سکا، اس قسم کی تاویل سے بہتر پہلی ہی تاویل ہے۔

قوله ففتح لنا الخ: دروازہ پہلے سے بند تھا اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر پہلے سے دروازہ کھلا رہتا تو اس میں اتنا اعزاز آپ کا نہ ہوتا، سوال و جواب کے بعد کھولا جانا، اس مقصد کے لئے تھا کہ آپ کی خاطر دروازہ کھولا گیا ہے لیکن اس سے تو آسمان میں خرق و انتظام ثابت ہوا۔ اس کا جواب حدیث کی شرح سے پہلے گذر چکا ہے ملاحظہ کر لیا جائے۔

### انبیاء کرام کے آمد کی نوعیت

قوله فاذا انا بآدم الخ: یہ معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں مدفون ہیں، تو پھر آسمان پر کیسے پہنچ گئے؟ نیز یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو ان کی قبروں میں نماز پڑھتے بھی دیکھیں، اور پھر بیت المقدس میں سارے انبیاء کو نماز بھی پڑھائیں، اور پھر آسمانوں پر ان کو اپنے اپنے مقامات پر دیکھیں، اور ان کو سلام کریں اور اس کے جواب میں مرحبا سنیں، اسی طرح وفات کے بعد نماز پڑھنے کا کیا مطلب؟

اس کا اجمالی جواب یہ ہے کہ ان کے اجسام، اپنی قبروں میں ہوں، اور ان کی ارواح ان کے اجسام کی صورتوں میں،

مشکل ہو گئے ہوں، جیسے شہداء کی روحوں کا ستر پرندوں کی شکل میں مشکل ہونا حدیث سے ثابت ہے، (۲) یہ بھی ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام، اس رات آسمانوں پر حاضر کئے گئے ہوں تاکہ سب سے آپ کی ملاقات ہو جائے، اس میں آپ کا اعزاز و اکرام مقصود تھا، اس کی تائید عبد الرحمن ہاشمی کی روایت سے ہوتی ہے، جو انس بن مالک کے حوالہ سے منقول ہے الفاظ یہ ہیں "وَبَعَثَ لَهُ آدَمُ فَمِنْ دُونِهِ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ كَذَا فَبُتِحَ الْبَارِي"

تفصیلی جواب یہ ہے کہ بیت المقدس میں نبیوں کو نماز پڑھانا، اس طرح ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے سب کو جمع فرمادیا ہو، تاکہ نماز میں آپ ان کے امام بنیں، اور ان سب کو آپ کی فضیلت اور سب پر آپ کی برتری معلوم ہو جائے، پھر اللہ نے آپ کو آسمانوں میں ان کے مقامات پر ان کو جمع کر کے دکھایا ہو، تاکہ آپ بھی ان کے مرتبوں سے واقف ہو جائیں۔

رہا انبیاء علیہم السلام کا نماز پڑھنا، تو بات یہ ہے کہ وہ شہداء سے بھی افضل ہیں، اور شہداء کے بار میں "وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ" دوسری جگہ "بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ" مذکور ہے، انبیاء علیہم السلام تو بعد الوصال بدرجہ اولیٰ زندہ ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے "نَبِيُّ اللَّهِ حَيٌّ يُرْزَقُ" اس وضاحت کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ نماز سے مراد ذکر و دعا ہو، جو کہ آخرت کے اعمال میں سے ہیں، جیسے اہل جنت کے بارے میں مذکور ہے "سَبِّحْكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ"

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو آخرت میں بھی، بعض خصوصیات کیساتھ مخصوص فرمایا ہو، جیسا کہ دنیا میں ایسی بہت سی خصوصیات موجود تھیں، اور انھیں خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ جس کی خبر آنحضور ﷺ نے دی کہ آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو تبلیہ پڑھتے اور حج کرتے دیکھے، اسی طرح نماز بھی خصوصیات میں سے ہو، تو کیا بعید ہے، اس کا بیان طلوع شمس من المغرب کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

قوله فرحب بی ودعالی بخیر الخ: یعنی ٹھکرو مہربا کہا اس سے یہ معلوم ہوا کہ اہل فضل کی جب باہر ملاقات ہو تو سلام، و مہربا دعا، وغیرہ سے استقبال کرنا چاہئے، مگر چہ دعا دینے والے سے جن کو دعا دی جارہی ہے، وہ افضل ہی کیوں نہ ہو۔ قوله فاذا انا بابنی الخالة عیسیٰ بن مریم ویحییٰ بن زکریا الخ: امام نوویؒ نے ابن سکیت کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ لفظ ابنا خالہ بولا جاتا ہے البتہ ابنا عمہ مستعمل نہیں، اسی طرح ابنا عم کا استعمال بھی ہوتا ہے، ابنا خال کا استعمال نہیں ہوتا، تفریق کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے۔

علامہ بدر الدین عینیؒ اپنی خالہ کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ ایثار بنت فاؤز، حضرت مریم کی والدہ حنہ کی بہت تھیں، اس لحاظ سے حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت عمران والد مریم دونوں ہم زلف تھے، حضرت ایثار سے حضرت عیسیٰ بھی پیدا ہوئے، اور حضرت حنہ سے حضرت مریم پیدا ہوئیں، تو رشتہ میں حضرت مریم کی خالہ، ایثار والدہ عیسیٰ اور عیسیٰ کی خالہ حنہ والدہ مریم ہوئیں، اسی لحاظ سے حضرت عیسیٰ اور عیسیٰ کو اپنی خالہ کہہ دیا گیا، گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حنہ کی اولاد مجاز کہہ دیا گیا۔ (عمد القاری)

### حضرت یوسفؑ اور حضورؐ کے حسن میں فرق

قوله فاذا هو قد اعطی شطر الحسن الخ: عینیؒ میں ابو سعید خدریؓ کے حوالہ سے یہ روایت ہے کہ میں

ایسے آدمی کے پاس تھا، جو مخلوق میں سب حسین تھے، اور ان کو حسن میں ایسی ہی فوقیت تھی، جیسے چودھویں کے چاند کو ستاروں پر فوقیت ہوتی ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام حسن میں سب پر فوقیت رکھتے تھے، مگر تہذیبی میں روایت ہے کہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے حسن صورت اور اچھی آواز سے نوازا ہے، اور تمہارے نبی کو سمجھوں میں حسین تر اور سب کے مقابلہ میں اچھی آواز سے نوازا ہے، تو بظاہر حدیث باب سے تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اعطی شطر الحسن میں حضور ﷺ کی ذات مشتکی ہے کیونکہ گشتو کا دستور یہ ہے کہ متکلم عام خطاب میں داخل نہیں ہوتا اور ابن المیز نے شطر الحسن کے الف لام کو مہدی مان کر یہ جواب دیا ہے کہ آنحضور ﷺ کو جو حسن دیا گیا ہے اس کا ایک بڑا حصہ یوسف علیہ السلام کو دیا گیا ہے۔

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ فرماتے تھے کہ حسن و جمال میں فرق ہے، حسن کا تعلق دیکھنے والوں کے اعتبار سے ہوتا ہے، حسین وہ کہلاتا ہے جس کو دیکھنے والا حسین سمجھے، مثلاً رنگ اچھا ہو، اور ان میں رونق ہو، اور جمیل وہ شخص ہے جن کے اعضاء سب مناسب ہوں ہر عضو دوسرے لحاظ سے مناسب، قد و قامت کے لحاظ سے ناک، کان، آنکھ سارے اعضاء مناسب ہوں، قد و قامت معتدل ہو اس کے ساتھ رنگ میں صفائی ہو، غالباً یہی مقصد اس شعر کا ہے۔

یزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ حسنا

ابوالعباس اشہلی نے کیا خوب کہا ہے۔

من انت محبوبہ من ذالغیرہ ومن صفوت له من ذالکدرہ

ہیہات عنک ملاح الناس تشغلنی والکل اعراض حسن انت جوہرہ

حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف احسن الناس تھے، اور آنحضور ﷺ اجمل الناس تھے، ملا علی قاریؒ نے اپنے زمانہ کے بعض معتبر عالم کے حوالہ سے نقل کیا ہے، کہ آنحضور ﷺ حضرت یوسف علیہ السلام سے احسن تھے، اس لئے کہ آنحضور ﷺ کے حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ چہرہ انور سے شعاع پھوٹ کر دیوار پر پڑتی تھی، جیسے آئینہ کو سورج کے سامنے رکھنے سے اس کی شعاع زمین وغیرہ پر پڑتی ہے۔ بعض روایت میں تو یہ بھی آتا ہے کہ رات کی تاریکی میں، حضرت عائشہؓ آنحضور ﷺ کے چہرہ انور کی روشنی میں سوئی کے اندر دھاگہ ڈال لیتی تھیں، کیا خوب کہا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ یذ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو خبا داری

کیا حضرت ادریس آسمان پر اٹھائے گئے؟

قوله فی حق ادریس الخ: بعض روایت میں "مرحبا بالاخ الصالح" کی بھی تصریح ہے، یہ مشہور ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام آنحضور ﷺ کے اجداد میں ہیں، اس لئے ان کو نوح کا جہد اعلیٰ بتایا جاتا ہے، جواب دینے والے کہتے ہیں، کہ ادریس حضرت الیاس علیہ السلام کا نام ہے، وہ حضرت نوح کے اجداد میں نہیں تھے۔ اور اگر حضرت ادریس کو حضرت نوح کے اجداد میں بھی مان لیا جائے، تو حضور ﷺ کو ان اجداد کا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام باہم بھائی سمجھے جاتے ہیں،

قوله قال الله تعالى "ورفعناه مكاناً علياً" الخ: مکان علی سے ممکن ہے چوتھا آسمان مراد ہو، بعض لوگ مکان علی سے جنت مراد لیتے ہیں،

اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے حق میں، مکانِ علی کی تخصیص کیوں کی گئی؟ جبکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام ان سے بھی اونچے مقام پر تھے۔

مشہور جواب یہ ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے، مگر اس جواب پر اعتراض یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بھی زندہ اٹھائے گئے ہیں، جبکہ حضرت ادریسؑ کے زندہ اٹھائے جانے کی کوئی مرفوع صحیح قوی روایت بھی نہیں، طبرانی میں یہ روایت ہے کہ حضرت کعب احبار نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بتایا کہ ”ورفعناہ مکانا علیا“ کی تفسیر یہ ہے کہ حضرت ادریسؑ نے اپنے دوست فرشتہ سے آسمان پر لیجانے کی درخواست کی، تو فرشتہ اپنے دونوں بازوؤں کی نیچ میں لے کر آسمان پر گئے، جب چوتھے آسمان پر پہنچے تو ملک الموت سے ملاقات ہوئی اس فرشتہ نے ملک الموت سے دریافت کیا کہ یہ بتائیے کہ ادریسؑ کی کتنی عمر باقی رہ گئی ہے؟ ملک الموت نے پوچھا، کہ ادریسؑ کہاں ہیں تو انہوں نے کہا وہ تو میرے ساتھ ہیں، تو ملک الموت نے کہا عجیب بات ہے کہ مجھے ادریسؑ کی روح چوتھے آسمان پر قبض کرنے کے لئے کہا گیا ہے میں نے تعجب سے کہا کہ ادریسؑ چوتھے آسمان پر کہاں سے ملیں گے؟ وہ تو زمین پر ہیں، چنانچہ ملک الموت نے وہیں ان کی روح قبض کرنی، حضرت کعب احبار نے کہا ”ورفعناہ مکانا علیا“ کا یہی مطلب ہے، مگر یہ اسرائیلی قصہ ہے جو قابل اعتبار نہیں۔ اس قصہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ادریسؑ نے ساڑھے تین سو سال کی عمر میں آسمان پر اٹھائے گئے، حضرت ابو ذرؓ کی ایک لمبی حدیث، جس کی ابن حبان نے تصحیح بھی کی ہے، اس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت ادریسؑ رسول اور نبی تھے، قلم سے لکھنے کا آغاز انہوں نے کیا، اور سب سے پہلے سلائی کا کام انہوں نے کیا۔

بیت المعمور کس آسمان پر؟

قوله الى بيت المعمور الخ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المعمور ساتویں آسمان پر ہے، اکثر روایتوں میں اس کا ذکر ہے جس روایت میں چھٹے آسمان کا ذکر ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں، کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آسمان پر بیت المعمور ہے، کیونکہ خانہ کعبہ کے محاذات میں ہر آسمان پر ایک ایسا مکان ہے، جو فرشتوں سے آباد رہتا ہے، اسی لئے بعض روایت میں اس کی تصریح ہے کہ پہلے آسمان میں بیت المعمور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے محاذات میں پہلا بیت پہلے آسمان پر ہے اور پہلے آسمان کے بیت المعمور کو ”ضرح“ (ضم الصاد وفتح الراء) کہا جاتا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ”ضرح“ پہلا اول کا نام ہے۔ طبریؒ نے سعید بن ابی عروبہ سے بحوالہ قتادہ نقل کیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا کہ بیت المعمور آسمانی مسجد ہے، جو خانہ کعبہ کے محاذات میں ہے، اگر آسمان سے وہ گر پڑے، تو فحیک خانہ کعبہ پر جا گرے، ہر دن ستر ہزار فرشتے اس میں داخل ہوتے ہیں، اور جب یہ ستر ہزار نکلتے ہیں تو پھر دوبارہ ان کو نوٹے کا موقع نہیں ملتا، (کثرت ملائکہ کی طرف اشارہ ہے)



## سدرۃ المنتہی کی وجہ تسمیہ، اور سدرہ کے انتخاب کی وجہ

ثم ذهب بي الى سدرۃ المنتهى الخ: سدرۃ المنتهى کی وجہ تسمیہ، مسلم شریف (ج ۱ ص ۹۷) میں عبد اللہ بن مسعود کی حدیث مرفوعہ میں ہے، کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، سدرۃ المنتهى چھٹے آسمان میں ہے، اور زمین کی چیزیں وہیں تک پہنچتی ہیں، اور پھر وہاں سے اوپر کو لے جائی جاتی ہیں، اور اس سے اوپر کی چیزیں وہیں اتار دی جاتی ہیں، اور وہاں سے متعلقہ فرشتہ اس کو لیتے ہیں۔

امام نوویؒ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ وغیرہ کے حوالہ سے وجہ تسمیہ اس طرح بیان کرتے ہیں، حضرات ملائکہ کے علم کی انتہاء سدرۃ المنتهى تک ہے اس سے آگے ان کی پرواز نہیں ہے۔ اور سوائے آنحضور ﷺ کے اس سے آگے کوئی نہیں جاسکا۔ عبد اللہ بن مسعود کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سدرۃ المنتهى چھٹے آسمان پر ہے، اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے۔ تعارض کو اس طرح دور کیا جائے گا، کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان پر اور اس کی شاخ، پتیاں ساتویں آسمان پر ہے۔ لیس فی السادسة الاصل ساقها الخ

قوله اذا ورقها كآذان الفيلة الخ: قاسمور اور یا مفتوح لیل کی جمع ہے اور بعض روایت میں مثل آذان الفیلوں کا لفظ ہے۔ میری کے درخت کو منتخب کرنے کی وجہ، بعض علماء سے اس طرح منقول ہے کہ اس درخت کی تین خاصیتیں ہیں۔ (۱) سایہ لمبا (۲) پھل لذیذ (۳) پاکیزہ، ایمان بھی قول، عمل، نیت کا مجموعہ ہے، سایہ بمنزلہ عمل، ذائقہ بمنزلہ نیت اور بو بمنزلہ قول تصور کرنا چاہئے۔

قوله واذا ثمرها كالقلال: بعض روایت میں "فاذا نبقها مثل قلال هجر" کے الفاظ ہیں۔ ہجر بفتح الہاء، والجحم، تانیث وعلیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے، اور منصرف بھی پڑھا جاسکتا ہے، قلال قلدہ کی جمع ہے، منکدہ کو کہتے ہیں۔ اس کے پھل کو مقدار میں قلدہ سے تشبیہ دی گئی ہے، اور قلال ہجر کی مقدار مخاطب کو معلوم تھی، اسی لئے اس سے تشبیہ دی گئی "نبق" بفتح النون وکسر الہاء ولسکون ہیری کے پھل کو کہا جاتا ہے، ہجر یمن کا ایک شہر اور مدینہ کے قریب ایک گاؤں ہے، جس کی طرف قلدہ منسوب ہیں، اور ہجر یمن کی طرف بھی قلدہ کی نسبت ہوتی ہے۔

قوله فلما غشيها من امر الله ما غشيها الخ: قرآن کی آیت "اذ يغشى السدرۃ ما يغشى" کی طرف اشارہ ہے، یعنی انوار ربانی تجلیات الہی جس کی حقیقت زبان بیان کرنے سے قاصر ہے، حضرت ابوذرؓ کی حدیث میں ہے "فغشيها الوان لا ادرى ما هي" اور مسلم شریف کی روایت میں سونے کا فراش (پرواند) کا ذکر ہے۔ کہ اس نے اس کو ڈھانپ لیا۔ اور بعض روایت میں سونے کے ٹڈی کا ذکر ہے، یہ بطور تمثیل و تشبیہ ہے، کیونکہ درخت پر ٹڈیاں وغیرہ گرتی ہی ہیں۔ رنگ کی صفائی اور چمک میں سونے سے تشبیہ دی گئی ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واقعہ سونے کی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس میں اڑنے کی طاقت ڈال دی ہو۔

حضرت ابو سعید خدریؓ اور ابن عباسؓ کی روایت میں "يغشاها الملائكة" ہے یعنی فرشتوں نے اس کو ڈھانپ رکھا ہے۔ اور ترمذی میں ابو سعید کی روایت میں "على كل ورقة منها ملك" کے الفاظ ہیں، اس کی ہر پتیوں پر فرشتہ ہیں۔ بظاہر

ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ فرشتہ ٹڈی، اور پروانوں کی شکل میں ہوں، اور وہ تجلیات ربانی پر ٹوٹ رہے ہوں، چونکہ ملائکہ کو تجلیات سے عشق ہوتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب انوار کی تعبیر، تجلیات الہی اور تدبیرات رحمانی سے کرتے ہیں۔  
 قوله تغیرت الخ: یعنی تجلیات ربانی کی وجہ سے اپنی پہلی حالت سے اعلیٰ حالت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔  
 قوله فما احد من خلق الله الخ: آسمان وزمین کی ساری مخلوق، اس میں شامل ہیں۔  
 قوله من حسنہا الخ: من تعلیلہ ہے، یعنی کمال جمال اور عظمت جلال کی وجہ سے۔  
 قوله فلوحي الی ما اوحی الخ: ماموصوفہ یا موصولہ مضامین وحی کو سمجھ رکھنے میں یا تو موصوفہ کی عظمت کو بتانا ہے جیسے "ففشیهن من الیم ما غشیہن" میں ہے، یا اس طرف اشارہ ہے کہ اس کے مضامین ناقابل بیان ہیں، اس کا مقصد بھی عظمت کا اظہار ہے۔

### معراج میں فرضیت نماز کی حکمت

قوله ففرض علی الخ: حضرت ابوذرؓ کی حدیث میں "ففرض اللہ علی امتی خمسين صلاة" کے الفاظ ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے لیلۃ المعراج میں نماز کی فرضیت کی وجہ، اور حکمت یہ بتلائی ہے کہ جب حق تعالیٰ نے زمر سے آپؐ کے قلب بطہر کو دھو کر پاک و صاف کر دیا، اور ایمان و حکمت سے آپؐ کے دل کو معمور فرمادیا، تو نماز کا ضابطہ ہی یہ ہے کہ اس سے پہلے طہارت ہو، لہذا اس کے بعد نماز کی فرضیت قرین قیاس ہے، اور اس سے آپؐ کی بزرگی اور عظمت حضرات ملائکہ پر بھی ظاہر کرتا ہے، گویا اب تر حیب اس طرح ہوئی کہ پہلے ظاہر و باطن کو مزکی کیا گیا، اور پھر معراج میں بلا کر راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، نماز بھی اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کا ذریعہ ہے، یہ موقعہ تمام مسلمانوں کو دیا گیا، کہ ہر دن با وضو نماز میں اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کر کے، خاص مقام اور تقرب حاصل کر لیں۔

حافظ ابن حجرؒ ایک دوسرے مقام پر اس کی حکمت یہ بھی تحریر کرتے ہیں، کہ جب آنحضور ﷺ نے شب معراج میں فرشتوں کی عبادت کا مشاہدہ فرمایا کہ کوئی قیام میں ہیں، تو اسی حالت میں پڑے ہوئے ہیں، اور کوئی رکوع میں ہیں، تو اسی حال پر پڑے ہیں، تو حق تعالیٰ نے آپؐ کی امت کے لئے ایسی جامع عبادت تجویز فرمائی، جو قیام، قعود، رکوع و سجود سب پر مشتمل ہے۔ اور نماز کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ براہ راست آپؐ کو اپنے پاس بلا کر فرض کیا، فرشتہ کا واسطہ نہیں رکھا گیا اور بار بار کی مراجعت کے بعد، پچاس کو پانچ کیا گیا۔

قوله ففزلت الی موسی الخ: سب سے پہلے آپؐ کا گذر حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے ہوا، ترمذی شریف میں اس کی تصریح موجود ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میری ملاقات شب معراج میں ابراہیمؑ سے ہوئی اور انہوں نے فرمایا اے محمدؐ اپنی امت سے میرا سلام کہ دیں، اور ان کو بتادیں کہ جنت کی مٹی بڑے پاکیزہ اور اس کا پانی بڑا شیریں ہے مگر وہ چٹیل میدان ہے۔ اور اس کے پودے سبحان اللہ، الحمد للہ، ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہے۔

## حضرت ابراہیمؑ نے تخفیف کا مشورہ کیوں نہیں دیا؟

عارف باللہ حضرت ابو جرحہ کا بیان ہے کہ اس سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ مقام غلت تسلیم و رضاء کا مقام ہے، اسی بناء پر حضرت ابراہیمؑ نے نماز کی تخفیف کا مشورہ نہیں دیا، اور مقام تکلم نماز، اور ربیری کا مقام ہے، کہ انہوں نے تخفیف کی ہدایت دی، حالانکہ حضرت ابراہیمؑ سے آپؐ کو زیادہ قرب تھا کیونکہ ان کی اولاد میں ہیں اور آپؐ کا دین، دینِ ضعیف ہے، اسی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کو اسؐ کا تقدیر ہدیہ سے غیر معمولی خوشی ہوئی، اور تخفیف کا مشورہ نہیں دیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی امت کا تجربہ ہو چکا تھا، کہ انہوں نے نماز کے بارے میں بڑی کوتاہیاں کی، اسی لئے انہوں نے ”قد جوبت الناس قبلک“ سے اپنا تجربہ بیان کیا۔

(۲) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم تھا کہ اب دین محمدی ہی قابل عمل ہے، سارے ادیان منسوخ ہو چکے، تو ہماری امت بھی محمدی ہو گی، تو تخفیف کی درخواست، اپنی امت کی بھی خیر خواہی ہوئی۔

(۳) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ معراج میں جاتے ہوئے، جب آنحضور ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذر کر، ساتویں آسمان پر جانے لگے، تو موسیٰ علیہ السلام رہ پڑے، ممکن تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رونے کو کوئی یہ سمجھتا، کہ شاید حضرت موسیٰ کو آپؐ کی ترقی دیکھ کر حسد ہوا ہو، اور اسی وجہ سے ان پر گریہ طاری ہو گیا، حالانکہ حضرات انبیاء علیہم السلام حسد و بغض کی ناپاک باتوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ تو واپسی میں امت محمدیہ کی خیر خواہی کے لئے حضرت موسیٰ ہی کا انتخاب ہوا، تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں، کہ ردائے حسد کی وجہ سے نہیں تھا، کیونکہ اگر حسد ہوتا تو امت محمدیہ کے لئے خیر خواہی ہرگز نہ کرتے، یہ بالکل ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ”رب ارنی کیف تحی الموتی“ فرمایا تو ممکن تھا، کوئی نادان یہ سمجھتا، حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ احیاء و موتی میں کوئی شک و شبہ تھا، اس ادنیٰ سے وہم کو بھی دور کرنے کے لئے، قرآن نے صاف کر دیا ”قال اولم تؤمن قال بلی ولكن لیطمئن قلبی“ اس سے انبیاء علیہم السلام کی شان و عظمت کا پتہ چلتا ہے، کہ ان کی ہستیاں کتنی معزز ہوتی ہیں، کہ ذرا بھی شک و شبہ کو ان کے بارے میں برداشت نہیں کیا جاتا، اور اگر کوئی ایسی بات ان سے صادر ہو جاتی ہے جس سے شبہ کرنے والوں کو ذرا سا بھی شبہ کا موقع مل سکتا ہے، تو فوراً اس کے ازالہ کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے۔

(۴) نیز ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے امت محمدیہ کے ایک فرد ہونے کی تمنا کی تھی، تو تخفیف کا مشورہ دیکر، اس امت سے تعلق اور لگاؤ کا ثبوت پیش کیا۔

قوله ارجع الی ربك الخ: (۵) بعض مشائخؒ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس امر کے لئے انتخاب کرنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے دیدار کی درخواست کی تو دیدار نہیں ہو سکی، ان کو معلوم ہوا کہ، شب معراج میں اس دولت سے محمد ﷺ نوازے گئے ہیں تو بار بار حضور ﷺ کو لوٹنے کی درخواست کر رہے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم کو نہیں ہو سکی، تو کم از کم خدا کے دیدار کرنے والے کی بار بار رویت کر لوں، اور عشاق کے لئے یہ بڑی بات ہوتی ہے، کہ معشوق کا دیدار نہ ہو تو کم از کم معشوق کے دیدار کرنے والے کا دیدار ہو جائے۔

ایک شاعر نے اسی کو اس طرح ادا کیا ہے "لعلی اراهم او اری من راہ ہم" مگر اس توجیہ میں اشکال یہ ہے کہ ہر مرتبہ میں دیدار کے ثبوت کی ضرورت ہے جو صراحتاً روایت میں نہیں ہے۔

### اختلاف روایت کی توجیہ

قوله خمساً الخ: بعض حدیث میں "فوضع شطرها" اور بعض میں "فوضع عنی عشراً" اور شریک کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور ثابت کی روایت میں "فحط عنی خمساً" ہے۔ ابن منیر نے تطبیق دیتے ہوئے کہا ہے کہ لفظ شطر عام ہے ایک دفعہ اور دو دفعہ سے، اور اسی طرح عشر عام ہے تو مقصد یہ ہو گا کہ دو مرتبہ میں دس نمازیں معاف ہوئیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شطر سے مراد بعض ہو، چونکہ ثابت کی روایت میں تصریح ہے کہ تخفیف ہر مرتبہ میں پانچ پانچ نمازوں کی ہوئی اور یہ قابل اعتماد زیادتی ہے اس لئے اس کو اصل مان کر باقی روایتوں میں تاویل کر کے، اس کے مطابق کیا جائے، کرمانی نے شطر سے مراد نصف لے کر یہ توجیہ کی ہے کہ پہلی بار پچیس نمازوں میں تخفیف ہوئی، اور دوسری مرتبہ میں پچیس کا نصف تیرہ، بخلاف کسر، اور پھر تیسری مرتبہ میں تیرہ کا نصف سات، اس توجیہ کو حافظ نے مرجوح قرار دیا ہے، اور پہلی ہی توجیہ پر اعتماد کیا ہے۔

### آخری دفعہ نہ جانے میں حیاء کی وجہ

آخر مرتبہ میں جب صرف پانچ نمازیں باقی رہ گئیں، اور پھر موسیٰ علیہ السلام نے تخفیف کے لئے عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا اب جاتے ہوئے حیا معلوم ہوتی ہے، حیاء کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب ہر مرتبہ میں پانچ پانچ نمازیں کم ہوتی رہیں، تو اگر اس بار تخفیف کی درخواست قبول ہوئی تو دین محمدی نماز سے بالکل خالی ہو جائے گی، اور جس عین میں نماز نہ ہو، وہ دین کیا ہوا؟ نیز اس بار کی تخفیف کی درخواست کا مقصد، ہدیہ کو واپس کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، جو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ نیز حیاء کی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہر مرتبہ میں پانچ پانچ نمازوں کی معافی ہوتی رہی اور جب پانچ ہی رہ گئی تھی تو چلتے وقت کچھ ایسے کلمات ارشاد ہو گئے تھے، جن سے آپؐ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب اس سے زیادہ تخفیف کی گنجائش نہیں رہی، اس نکتہ کے سمجھ جانے کے بعد، گو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے، آپؐ سے واپس جانے کا اصرار بھی کیا، اور یوں بھی امت کے حق میں تخفیف کے لئے نہ معلوم، موسیٰ علیہ السلام کے قلب میں کتنے ارمان ہوں گے، لیکن شانِ عبدیت، حکم کے سامنے جھک گئی، اور جو اتنی بار آمد و رفت سے نہیں تھکے تھے، وہ اس بار جانے میں شرم محسوس فرمانے لگے۔ سبحان اللہ! شانِ عبودیت بھی کیسی بلند ہے، اور اس کے بالمقابل شانِ عبدیت بھی کتنی کامل ہے، اور ہر جب آخری فیصلہ فرما دیتے ہیں، تو پھر کوئی نہیں جو اس میں ذرا سی ترمیم بھی کرا سکے، اور ادھر شانِ عبدیت کا کیا کمال ہے کہ جب آخری حکم ہونے کا احساس بھی ہو جاتا ہے تو پھر ترمیم کی درخواست پیش کرنے کے لئے قدم ہی نہیں اٹھتے ہیں۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام بڑے مزاج شناس ہوتے ہیں، دیکھتے حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کا امتحان لینا چاہا، اور حق تعالیٰ ان کے صبر کو عالم پر ظاہر کرنا چاہتے تھے، تو طرح طرح کی آزمائش میں مبتلا ہوئے۔ لوگوں نے دعا کے لئے کہا، لیکن کسی کی درخواست کو قبول نہیں فرمایا، اور امتحان و آزمائش میں ثابت قدم رہے اور جب حق تعالیٰ کامیاب معلوم کر لیا کہ اب وہ چاہتے ہیں کہ میں ان سے نجات مانگوں

توفیر اداء کے لئے ہاتھ اٹھ گئے، ”رب انی مسنی الضر الخ.....“ اور آپ نے پیچھے ملاحظہ کیا کہ حضرت یوسفؑ کے صبر کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جب ان کو جیل خانہ سے نکلنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے یہ فرمادیا تھا کہ پہلے جا کر ان عورتوں سے حال کی تحقیق کر لو، جنہوں نے مجھے معتم کیا تھا، لیکن اگر یہی واقعہ مجھ کو پیش آتا تو میں توفیر اس بلانے والے کیساتھ ہو لیتا، علماء نے لکھا ہے کہ اس میں بھی آپؐ کی کمالی عبدیت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک مشیت الہیہ جیل میں رکھتی جیل میں رہتا، اور جب باہر نکالتی تو باہر نکل آتا، نہ عذر اس میں ہو تا نہ تاخیر اس میں ہوتی۔

### کیا نزول احکام سے قبل نسخ ممکن ہے

قوله انهن خمس الخ: یعنی حتی اور یقینی۔ اس روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ فعل سے قبل نسخ ہو سکتا ہے یعنی ابھی پچاس نماز پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی، اور نسخ ہو گیا، اسکے ساتھ ساتھ تو یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ خدائی احکام، بندوں تک پہنچنے سے قبل بھی نسخ ہوتا ہے، جس کو اشاعرہ اور معتزلہ سبھی ممنوع قرار دیتے ہیں، ان لوگوں پر یہ روایت حجت ہے حافظ نے اسکو عجیب اور نادر نکتہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ قبل البلاغ سے کیا مراد ہے، اگر ہر فرد امت کے پاس پہنچنا مراد ہے، اگر یہ مقصد ہے تو پھر یہ نظریہ ہی غلط ہے، اور اگر یہ مقصد ہے کہ کسی ایک فرد کے پاس بھی پہنچ جائے تب ہی نسخ ہو سکتا ہے، تو پھر اعتراض ہی نہیں ہوگا، کیونکہ آپ ﷺ کو تو پچاس کا علم ہو چکا پھر بعد میں منسوخ ہوا، تو اس کی تعبیر اس طرح ہوگی، کہ امت کے لئے تو نسخ ہے ہی نہیں۔ البتہ وہ حضورؐ کے اعتبار سے نسخ ہے، کیونکہ پہلی بار میں یقیناً آپ پچاس نمازوں کے مکلف ہو گئے، اور اس حکم کے پہنچنے کے بعد فعل سے قبل نسخ ہوا۔ (نسخ المسلم ج ۱ ص ۴۶)

قوله لكل صلوة عشرة: یعنی گنتی میں پانچ، اور ثواب میں پچاس، تو اس طرح سے ہر نماز شمار میں ایک، اور ثواب میں دس، یہ ترمیم ایسی ہے، جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال کی ہو گئی تھی، اور حضرت آدم علیہ السلام کی درخواست پر ان کی عمر کے چالیس سال حضرت داؤد کو دے کر، پورے سو کر دیئے گئے۔ وہاں ساٹھ کو، سو بنایا گیا اور یہاں پچاس کو پانچ بنایا گیا، اگرچہ پچاس نماز کو پانچ بنایا گیا۔ مگر اس کے باوجود ایک لحاظ سے وہ پچاس ہی رہی۔ غور کیجئے تو پہلی جگہ بھی علم الہی میں کوئی ترمیم نہیں تھی، اس کو معلوم تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال ہوگی، مگر ہوگی اس طرح کہ اس میں چالیس سال کے اضافہ کی، حضرت آدم علیہ السلام درخواست فرمائیں گے۔ اور وہ ہم منظور کریں گے، اور یہاں یہ صورت ہوئی کہ پچاس کو پانچ تو کیا، مگر ایک دوسرے ضابطہ کے ماتحت پھر ان پانچ کو پچاس کر دیا گیا، اور وہ یہ کہ اس امت کی نیکی کا ثواب دس گنا لکھا جائے اس لحاظ سے جو دنیا میں پانچ ہوں گی، وہ آخرت کے دفتر میں بھی پچاس رہیں گی، پہلی امت کی طرح ایک نیکی پر ایک کا ثواب رکھا جاتا، تو یا تو تخفیف ہی نہ کی جاتی یا پھر پچاس کو پانچ ہی کر دیا جاتا، مگر چونکہ اُدھر طے شدہ تقدیر کی ترمیم منظور نہیں اور اُدھر خالی ہاتھ آپ کو واپس کر دینا گوارا نہیں۔ اس لئے یہ طے پایا کہ ایک دوسرے ضابطہ کے ماتحت یہ دونوں باتیں قائم رکھی جائیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ اظہار بھی کر دیا جائے، کہ تقدیر کے فیصلے تلا نہیں کرتے ”لا یبدل القول لدی“ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آپ کی خاطر داری اور اکرام میں ہوا ہے، اور اسی لئے صرف پہلی بار، مراجعت پر آخری فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا، کہ آپ کی بار بار آمد ہو، اور درخواست ہو، اور ہر بار اس کو منظور کر کے، آپ کے اکرام

میں، اور اضافہ کیا جائے مگر آخر میں ہر فیصلے پر قضاء و قدر کی حاکمیت کا اعلان بھی کر دیا جائے، یہاں اس حدیث کو پیش نظر رکھنا چاہئے، جس میں حضرت ثوبانؓ آنحضور ﷺ کی ایک دعا کا تذکرہ فرماتے ہیں، کہ آپؐ نے پروردگار عالم سے اپنی امت کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی، پروردگار میری امت پر ایسا قحط نازل نہ فرماتا جو ان سب کی ہلاکت کا باعث بن جائے، اور ایک یہ کہ غیروں پر ان کو مسلط نہ کیجئے۔ ورنہ وہ ان کی جز نکال کر پھینک دیں گے، حق تعالیٰ کی جانب سے ارشاد ہوا کہ ہم نے آپ کی دونوں دعائیں تو منظور کر لیں ”انی اذا قضیت قضاء، فانه لا یرد“

**حدیث** ﴿حدثنی عبد اللہ بن ہاشم العبدی..... عن انس بن مالک قتل قتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أتیت فانطلقوا بی الی زمزم فشرح عن صدری ثم غسل بملء زمزم ثم انزلت، وفی نسخه حدثنا ابو احمد ابو العباس العباسی نا شیبان بن فروخ نا حامد بن مسلمة یعنی هذا الحدیث بطوله۔

ترجمہ حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس فرشتہ آئے اور مجھ کو زمزم کے پاس لے گئے اور میرا شق صدر (سینہ چاک کیا) اور اس کو زمزم کے پانی سے دھویا، اور پھر مجھے اٹھا کر اسی جگہ لایا گیا جہاں سے مجھے لائے تھے۔

### شق صدر کی حکمت

**تشریح** اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معراج سے قبل بھی شق صدر ہوا تھا، جیسا کہ لڑکپن میں حضرت علیہ السلام کے یہاں ایک بار اور بعثت کے وقت ایک دفعہ ہوا تھا۔ ہر مرتبہ کی حکمت الگ الگ ہے، لڑکپن میں تو اس لئے کہ عام بچوں میں کھیل کود کا جو مادہ ہوتا ہے، اس کو نکال دیا جائے۔ اس وقت ایک جما ہوا خون یہ کہہ کر نکالا گیا ”هذا حظ الشیطان“ گویا لڑکپن ہی میں شیطانی اثرات سے حفاظت کے لئے شق صدر ہوا تھا اور بعثت کے وقت وحی الہی کا بوجھ اٹھانے کے لئے شق صدر ہوا تھا۔ اور معراج کے وقت اس لئے کہ عالم ملکوت کی سیر، اور حق تعالیٰ سے ہمکاری کی قوت، قلب میں پیدا ہو جائے۔ اس لئے جن لوگوں نے معراج کے وقت، شق صدر کا انکار کیا ہے، وہ غلط ہے، کیونکہ شق صدر کے ربوی ثبوت ہیں۔ اس لئے انکار کی گنجائش نہیں، شق صدر کو اپنی حقیقت ہی پر رکھا جائے، اس کو طاقت و قوت کے معنی مجازی پر محمول کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ یہ شق صدر بطور خرق عادت ہوا، اور معجزات انبیاء کرام علیہم السلام کے خصوصیات میں سے ہے، اور اس زمانے میں سرجری کے حیرت انگیز چیز، پھاڑ، آپریشن کو دیکھ کر، شق صدر کا مسئلہ بے غبار ہو جاتا ہے کہ جب بندوں میں اتنی طاقت ہے کہ آلات کے ذریعہ انسانی اعضاء کو نکال کر، باہر کر دیں اور پھر اپنی جگہ رکھ کر اس کی سلامتی کر دیں اور مریض کو شفا مل جائے تو پھر خرق عادت انبیاء کے ساتھ، اس قسم کے واقعات کا پیش آ جانا، کونسی بڑی بات ہے؟ اسی قبیل سے معراج کا وہ واقعہ بھی ہے، کہ جبرئیل علیہ السلام گھر کی چھت کو پھاڑتے ہوئے آئے، اور پھر خود بخود درست بھی ہو گئی، جو خدا کی قدرت کو ماننا ہے اور رات دن کے مشاہدات اس کی زبردست قدرت پر بین دلیل ہے، ان کے لئے شق صدر کو ماننے میں کیا تردد؟

قوله ثم غسل بعماء زمزم الخ: شغلہ میں قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ جب آنحضور ﷺ کے قلب اطہر کو دھویا گیا، تو جبریل علیہ السلام نے فرمایا، ”قلب سدید فیہ عینان تبصران واذنان تسمعان“ بہت ہی مضبوط یا عمدہ قلب ہے اس میں دیکھنے والی دو آنکھیں ہیں۔ اور سننے والے دو کان ہیں۔ (نیم المیاض ج ۲ ص ۲۲۲)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ماہوز زمزم کو تمام پانی پر فضیلت حاصل ہے۔ ابن جریر نے کہا کہ جنت کے پانی سے، قلب اطہر کو اس لئے نہیں دھویا گیا، کہ زمزم میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق جنت سے بھی ہے، اور زمین سے بھی، اس کا مقصد یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی برکت زمین میں باقی رہے، اور مزید یہ کہ زمزم کو حضرت جبریلؑ کے پر اور اسماعیلؑ کے قدم مبارک سے نسبت ہے، اسی لئے بہت سے لوگوں نے زمزم کو حوض کوثر سے افضل مانا ہے، ہاں جو پانی آنحضور ﷺ کی انگشت مبارک سے بطور معجزہ نکلا تھا اس کو زمزم پر فضیلت دی جاتی ہے۔

قوله ثم انزلت الخ: امام نوویؒ کہتے ہیں کہ لام ساکن اور تاء مضموماً ہے، عام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ قاضی عیاض نے تمام روایات سے اسی طرح نقل کیا ہے، اس کی مراد میں اختلاف ہے، بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ صحیح نہیں بلکہ صحیح ”ترکت“ ہے ”انزلت“ وہم راوی ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس لفظ کے بارے میں ابن سراج سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ انزلت کے معنی لغت میں ترکت کے بھی آتے ہیں، لہذا یہ معنی مان کر اس کو صحیح سمجھا جائے، وہم راوی پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں۔ قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ میری سمجھ میں یہ آیا کہ انزلت کو معروف پڑھا جائے اور اس کو نعت کی ضد مان کر مطلب یہ لیا جائے کہ فرشتہ مجھے اٹھا کر زمزم کے پاس لئے گئے اور پھر مجھے اسی جگہ پہنچا دیا۔ اور بر قاتی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ”انزلت“ فتح اللام اور تاء ساکن ہے اور جمع بین الصحیحین للحمیدی میں بھی اسی طرح ہے۔

### راوی حدیث کی ایک وضاحت

قوله قال الشيخ ابو احمد الخ: ابو احمد جلودی، مسلم شریف کے راوی ہیں، جو بواسطہ ابن سفیان، اور وہ امام مسلم سے نقل کرتے ہیں، جلودی کو یہ حدیث، ابن ابی سفیان سے حاصل ہوئی۔ اور پھر یہی حدیث ان کو کسی اور شخص سے حاصل ہوئی۔ اور وہ ماسر جسی جو شیبان کے شاگرد ہیں ماسر جس کا نام احمد بن محمد بن حسین ہے، نیشاپور کے رہنے والے ہیں یہ عبارت یعنی ”قال الشيخ ابو احمد“ سے آخر تک بعض نسخہ مسلم میں حاشیہ پر ہے، اور اکثر نسخہ میں اصل کتاب کے ساتھ ہے۔ اور دونوں کی معقول وجہ ہے، جنہوں نے حاشیہ پر لکھا ہے تو اس کی وجہ تو ظاہر ہے کہ وہ امام مسلم کا کلام نہیں ہے، اور نہ ان کی کتاب کا یہ حصہ ہے یہ تو فائدہ کے طور پر لکھ دیا گیا اس لئے اس کو حاشیہ ہی میں لکھنا چاہئے۔ اور جنہوں نے اس کو نفس کتاب میں شامل کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے، کتاب مسلم منقول ہے عبد الغافر فارسی سے، اور وہ اس کو اپنے شیخ جلودی سے نقل کرتے ہیں اور یہ عبارت شیخ جلودی کی ہے اور اس کے نقل عبد الغافر ہیں، تو چونکہ عبد الغافر نے مسلم ہی کی روایت، شیخ جلودی سے کی ہے اور اس حصہ کو بھی شیخ جلودی سے لیا ہے اس لئے کتاب میں، اس کو شامل کر دیا، اور اس عبارت سے بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، کہ یہ امام مسلم کی عبارت نہیں ہے بلکہ شیخ جلودی کی ہے، اس لئے اس کو کتاب

کیا تھ ذکر کرنے میں کسی قسم کا اشتہاد اور التباس نہیں ہوتا۔

**حدیث** ﴿حدثنا شيبان بن فروخ..... عن انس بن مالك ان النبي صلى الله عليه وسلم اتاه جبرئيل وهو يلعب مع الغلمان فاخذه فصرعه فشق عن قلبه فاستخرج القلب فاستخرج منه علقه فقال هذا حظ الشيطان منك ثم غسله في طست من ذهب بماء زمزم ثم لأمه ثم أعاده في مكانه وجاء الغلمان يسعون الى أمه يعني ظئره فقالوا ان محمداً قد قتل فاستقبلوه وهو منتقع اللون قال انس وقد كنت ارى اثر ذلك المخيض في صدره. (۱)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ کے پاس، حضرت جبرئیل آئے اور آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، آپ کو پکڑ کر زمین پر گر لیا، اور آپ کے قلب کو چاق کیا، اور دل کو نکالا اور اس سے بندھا ہوا خون نکالا، اور کہا یہ شیطانی حصہ ہے، پھر سونے کے ایک طست میں، آپ کے قلب کو زمزم کے پانی سے دھویا، پھر اس کو درست کر کے اپنی جگہ لوٹا دیا، (یہ ماجرا دیکھ کر) بچے دوڑتے ہوئے، آپ کی رضاعی ماں کے پاس آئے، اور سبھوں نے کہا کہ محمد مارے گئے۔ (یہ سن کر) لوگ آپ کے پاس آئے۔ جب کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا حضرت انسؓ فرماتے ہیں میں سلام کا نشان آپ کے سینہ مبارک پر دیکھتا تھا۔

### شرح الفاظ حدیث

قوله فصرعه: پیٹھ کے بل لٹا دینا۔

قوله علقه: جما ہوا خون (گازھا) معاصی کی جڑیں ہیں یعنی یہی وہ حصہ ہے جہاں شیطان دساوس پیدا کیا کرتا ہے۔

قوله هذا حظ الشيطان الخ: یعنی آپ میں، اگر یہ خون رہ جاتا، تو معصیت کی طرف میلان ہوتا۔

قوله ثم غسله في طست الخ: طست چونکہ پانی کا برتن ہے جس کو وضو وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے، اور چونکہ جنت کے برتنوں میں انٹی قسم کا برتن سونے کا ہے، اس لئے سونے کا برتن لایا گیا، جن لوگوں نے اس روایت سے، مصحف کو سونے سے مزین کرنے پر استدلال کیا ہے، وہ صحیح نہیں اس لئے کہ اس برتن کے لائیا والے اور حضور ﷺ کے قلب مبارک کو دھونے والے حضرات ملائکہ تھے، اور وہ ہماری طرح مکلف نہیں ہیں۔ نیز واقعہ معراج مکی ہے اور سونے کی حرمت مدینہ میں ہوئی، انس سے معلوم ہوا کہ اس کا استعمال حرمت سے قبل ہوا تھا۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سونے کا استعمال دنیا کے کاموں میں استعمال نہیں کیا جاسکتا، اور اس رات میں جو واقعات پیش آئے وہ سب عالم آخرت سے متعلق ہیں۔ لہذا اس کا تعلق بھی احکام آخرت ہی سے ہو گا اور وہاں اس کا استعمال جائز ہے۔

قوله ثم لأمه الخ: چیرے (کٹے) ہوئے حصہ کو ٹھیک کر دیا۔

ثم أعاده الخ: نکالے ہوئے قلب کو اپنی جگہ لوٹا دیا۔ یہاں ثم تراخی کے لئے نہیں ہے، کیونکہ پہلے قلب کو اپنی جگہ لوٹایا گیا، اور پھر اس کو درست اور برابر کر دیا گیا، یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ سکر انسان کو دہشت لاحق ہو جاتی ہے، دیکھنے والے کا



تو کیا حال ہوگا، پیٹ چاق کر کے دل کو نکالنے کے بعد، انسان عموماً مر جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کو کسی طرح کا نقصان نہیں ہوا اور نہ کوئی تکلیف ہی ہوئی، اس لئے وہ لوگ گھبرائے ہوئے آئے۔

اعتراف:- یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر اس کے بھی، آپ کے قلب مبارک کو ایمان و حکمت سے بھر سکتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کرنے سے، آپ کی قوت یقین کو بڑھانا تھا، دستور یہ ہے کہ جو شخص اس قسم کے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے، یا جس کو اس قسم کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے، اس میں شجاعت و بہادری کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔ جب کہ آپ "اشجع الناس" کہلاتے تھے، جہاں لوگوں کی ہمت جواب دیدیتی تھی، وہاں بے خوف و خطر چلے جاتے تھے، جنگ کے میدان میں جہاں شیروں کے پاؤں اکھڑ جاتے تھے، وہاں آپ کے قدموں میں جنبش نہیں آتی تھی۔

### کیا شق صدر کسی اور نبی کا ہوا؟

فائدہ:- شق صدر اور قلب مبارک کا دھویا جانا آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے؟ یا دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ پیش آیا۔

طبرانی میں قصہ کتابوت کا ذکر آتا ہے کہ اس میں ایک طشت تھا، جس سے انبیاء علیہم السلام کے قلوب دھوئے جاتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی اس میں آپ کے شریک تھے۔

غلمان سے وہ بچے مراد ہیں جو جنگل میں آپ کے ہمراہ کھیل رہے تھے، ظنور، رضاعی ماں، مراد حلیمہ سعدیہ ہیں۔

قوله ان محمداً قد قتل الخ: شق بطن کے بعد عاؤۃ زندہ رہنا محال تھا، اس لئے قتل کی خبر دی۔

قوله فاستقبلوه الخ: حلیمہ سعدیہ کے خاندان کے لوگ آپ کو دیکھنے آئے۔

قوله انتقع الخ: بمعنی تغیر محزن اور گھبراہٹ سے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

قوله اثر ذلك المخطط الخ: بخیط بکسر الحکم سوئی کو کہتے ہیں۔

قوله فی صدره الخ: مقصد یہ ہے کہ شق صدر حسی تھا معنوی نہ تھا۔

❦ حدیث ❦ حدثنا هارون بن سعيد الايلي ..... قال سمعت انس بن مالك يحدثنا

عن ليلة أسرى برسول الله صلى الله عليه وسلم من مسجد الكعبة انه جلاه ثلاثة نفر قبل ان

يوحى اليه وهو نائم في المسجد الحرام وساق الحديث لقصته نحو حديث ثابت البناني

وقدم فيه شيئاً واخبروا زاد ونقص. (مسلم ص ۹۶)

شریک بن عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں، کہ میں نے انس بن مالک سے سنا، ہم سے وہ اس رات کا قصہ بیان کر رہے

تھے، جس میں آپ کو مسجد کعبہ سے رات میں سڑ کر لایا گیا، آپ کے پاس تین شخص وحی کے نزول سے قبل

مسجد حرام میں آپ کے سونے کی حالت میں آئے۔

تشریح:- قوله حدثني شريك بن عبد الله الخ: یہ تابعی مدنی ہیں، ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے اور یہ

شریک بن عبد اللہ مخفی قاضی شریع سے بڑے تھے۔ (خ)

قوله جاءه ثلاثة نفر الخ: حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ میں ان تینوں کے نام سے واقف نہیں ہو سکا، ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ سب فرشتے تھے، بعض لوگوں نے جبرئیل و میکائیل کی تصریح کی ہے، اور اسکی تصریح طبرانی میں ہے، اس کے راوی انس بن مالک ہیں اور اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”فأتاه جبرئیل ومیکائیل فقالا أیتهم وکانت قریش تنام حول الکعبة فقالا امرنا بسیدهم ثم ذهبنا ثم جاءوا هم ثلاثة فالتقوه فقلبوه لظهوره“ یعنی آپ کے پاس جبرئیل و میکائیل آئے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ ان لوگوں میں سے کون ہیں؟ قریش کا دستور تھا کہ وہ کعبہ کے ارد گرد سوتے تھے، وہ دونوں بولے کہ ہم کو ان میں سے جو بڑے ہیں (سر دار) ان کے بارے میں حکم دے کر بھیجا گیا ہے۔ پھر دونوں چلے گئے، اور اس کے بعد وہ دونوں اور ان کے ساتھ ایک اور تھے تین شخص آئے، اور ان لوگوں نے مجھے پیچھے کے بل لٹا دیا۔ (تیسیم ارباض)

قوله قبل ان یوحی الخ: خطابی، ابن حزم، عبد الحق، قاضی عیاض، نووی، رحمہم اللہ نے اس زیادتی کا انکار کیا ہے۔ امام نوویؒ نے تصریح کی ہے کہ شریک کے اس جملے کا علم نے انکار کیا ہے، ”قبل ان یوحی“ یہ غلط ہے، کیونکہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز کی فرضیت لیلۃ المعراج میں ہوئی، تو پھر یہ واقعہ بعثت سے پہلے کا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور ان علماء نے تصریح کی ہے کہ شریک اس لفظ میں متفرد ہیں، اس کا کوئی متابع نہیں، مگر دعویٰ تفرد پر حافظ کو کلام ہے، کیونکہ شریک کی موافقت کثیر بن خض نے کی ہے، اور اس کو سعید بن سہمی بن سعید اسوی نے کتاب المغازی میں ذکر کیا ہے۔ (فتح الباری)

قوله وهو نائم فی المسجد الخ: اخیر حدیث میں اسی جملے کی تاکید ہے۔

قوله فاستیقظ وهو فی المسجد الحرام: بعض روایت میں ”بین النائم والیقظان“ کی تصریح ہے، حافظ فرماتے ہیں کہ اس کو ابتدائے حال پر محمول کیا جائے گا اس کے بعد جب مسجد کے دروازہ پر براق پر سوار ہوئے تو برابر بیدار رہے اور واپسی تک برابر آپ بیدار ہی رہے۔ اور ”فاستیقظ وهو فی المسجد الحرام“ کی توجیہ علامہ قرطبی نے یہ کی ہے کہ اس نوم سے مراد اسراء سے واپسی کے بعد کی ہے، چونکہ اسراء اور معراج رات کے تھوڑے حصہ میں ہوئی، تو واپس ہو کر باقی حصے میں آپ سو رہے تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معراج کے دوران آپ پوری طرح عالم بشریت سے عالم ملکوت کی طرف متوجہ تھے اپنی سابقہ حالت کی طرف مسجد حرام واپس ہو کر لیٹے۔ (المعجم ج ۱ ص ۳۸۵)

ان تاویلات کی اس وقت ضرورت پیش آئے گی، جبکہ شریک کی اس روایت کو بیداری کی معراج سے متعلق مانا جائے۔ اور اگر روحانی معراج سے متعلق ہو، تو پھر ان تاویلات کی کوئی ضرورت نہیں۔

قوله وقدم فیه شیئا واخروا ذان ونقص: اس عبارت میں امام مسلم نے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ شریک کی روایت میں، ثقہ راویوں کی مخالفت ہے، جمع بین الصحیحین میں مؤلف نے لکھا ہے کہ شریک نے کچھ غیر معروف الفاظ بڑھا دیا، اسراء کی روایت حفاظ کی ایک جماعت نے بیان کیا اور ان میں سے کسی نے ان الفاظ کو ذکر نہیں کیا جس کو شریک نے ذکر کیا ہے۔ شریک حافظ نہیں ہیں۔

حافظ ابوالفضل بن طاہر نے اپنی کتاب ”الانتصار لامام الانصار“ میں حمیدی سے، اور انہوں نے ابن حزم کا مقولہ

ذکر کیا ہے کہ ہم نے بخاری و مسلم ان دونوں کتابوں میں، کوئی قابل اعتراض حدیث نہیں دیکھی، سوائے دو حدیث کے، باوجودیکہ بخاری و مسلم جہاں اور حدیث میں پورا عبور رکھتے ہیں، پھر بھی ان دونوں حدیثوں کو ذکر کیا ہے، اور اس میں اس حدیث کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ ساری خرابیاں شریک کی جانب سے ہیں۔ ابو الفضل بن طاہر کو شریک کے تقرو، اور ابن حزم کے اس دعویٰ پر، کہ یہ سب آفت شریک کی ہے، اس میں ان کو کلام ہے کیونکہ شریک کو ائمہ جرح و تعدیل نے قبول کیا ہے، اس کی توثیق کی، ان سے روایت کرتے ہیں اور اس کی حدیث اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں اور اس کو دلیل بناتے ہیں چنانچہ محمّد بن معین کے بارے میں کہتے ہیں لا باس بہ، ابن عدی نے کہا کہ شریک مشہور مدنی ہیں۔ ان سے امام مالکؒ اور دوسرے ائمہ نے حدیث نقل کی ہے اور جب شریک سے کوئی ثقہ راوی روایت بیان کرے تو وہ قابل قبول سمجھی جاتی ہے ہاں اگر ان سے اگر کوئی ضعیف راوی روایت کرے تو وہ نا قابل اعتبار۔ ابن طاہر کہتے ہیں کہ شریک کی معراج دہلی یہ روایت ان سے سلیمان بن بلال نقل کرتے ہیں، اور یہ ثقہ ہیں۔ حافظ بن حجر کا بیان یہ ہے کہ ابن حزم سے پہلے شریک پر ابو سلیمان خطابی کلام کر چکے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے شریک کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایسے منکر الفاظ کثرت سے بیان کرتے ہیں۔ جس کی دوسرے راوی موافقت نہیں کرتے۔ خطابی نے کہا کہ حضرت انس کی یہ حدیث شریک کے علاوہ اور دوسرے طریقوں سے آئی ہے اور اس میں یہ الفاظ نہیں آئے، اس سے یہ بات ذہن میں پیدا ہوتی ہے کہ یہ خرابی شریک ہی کی جانب سے پیدا ہوئی ہے، امام نسائی اور ابو محمد بن حارود شریک کے بارے میں لکھتے ہیں ”لیس بالقوی“ مکی بن سعید القطن ان سے حدیث بیان نہیں کرتے ہیں۔ البتہ ابو ذر ان کی توثیق کرتے ہیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ شریک مختلف فیہ ہیں۔ لہٰذا ان کے تقروات کو مثلاً اور ان لوگوں کی رائے کے مطابق منکر کہا جائیگا جو شاذ اور منکر کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، اس کا فیصلہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں شریک متفرد ہوں اس کی ایسی تاویل کی جائے جو دوسرے ثقہ راویوں کے موافق ہو جائے اس روایت میں وہ توجیہ ہو سکتی ہے جو اوپر بتائی گئی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

❦ حدیث ❦ حدثني حرمة بن يحيى التجيبي قال انا ابن وهب قال اخبرني يونس

عن ابن شهاب عن انس بن مالك قال كان ابوذر يحدث ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فرج سقف بيتي وانا بمكة فنزل جبرئيل عليه السلام ففرج صدرى ثم غسله من ماء زمزم ثم جاء بطست من ذهب ممتلئ حكمة وايمانا فافرغها في صدرى ثم اطبقه ثم اخذ بيدي فعرج بي الى السماء فلما جئنا السماء الدنيا قال جبرئيل لخازن السماء الدنيا افتح قال من هذا قال هذا جبرئيل عليه السلام قال هل معك احد قال نعم معي محمد قال فارسل اليه قال نعم فافتح قال فلما علونا السماء الدنيا فاذا رجل عن يمينه اسودة وعن يساره اسودة قال فاذا نظر قبل يمينه ضحك واذا نظر قبل شماله بكى قال فقال مرحبا بالنبي الصالح والابن الصالح قال قلت يا جبرئيل عليه السلام من هذا قال هذا آدم صلى الله عليه وسلم وهذه الاسودة عن يمينه وعن شماله نسمة بنية فاهل اليمن اهل الجنة والاسودة التي عند شماله اهل النار فاذا نظر قبل يمينه

ضحك واذا نظر قبل شماله بكى قال ثم عرج بي جبرئيل عليه السلام حتى اتى السماء الثانية فقال لخازنها افتح قال فقال له خازنها مثل ما قال خازن السماء الدنيا ففتح فقال انس بن مالك فذكرانه وجد في السموات آدم وادريس وعيسى وموسى وابراهيم عليهم السلام، ولم يثبت كيف منازلهم غير انه ذكر انه قد وجد آدم عليه السلام في السماء الدنيا وابراهيم في السماء السادسة قال فلما مر جبرئيل ورسول الله صلى الله عليه وسلم بادريس قال مرحبا بالنبى الصالح والاخ الصالح قال ثم مر فقلت من هذا قال هذا ادريس قال ثم مررت بموسى عليه السلام فقال مرحبا بالنبى الصالح والاخ الصالح قال قلت من هذا قال هذا موسى قال ثم مررت بعيسى عليه السلام فقال مرحبا بالنبى الصالح والاخ الصالح قلت من هذا قال هذا عيسى بن مريم قال ثم مررت بابراهيم عليه السلام فقال مرحبا بالنبى الصالح والابن الصالح قال قلت من هذا قال هذا ابراهيم قال ابن شهاب واخبرني ابن حزم ان ابن عباس واباحبة الانصارى يقولان قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم عرج بي حتى ظهرت لمستوى اسمع فيه صريف الاقلام قال ابن حزم وانس بن مالك قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ففرض الله على امتي خمسين صلاة قال فرجعت بذلك حتى امر بموسى عليه السلام فقال موسى عليه السلام ماذا فرض ربك على امتك قال قلت فرض عليهم خمسين صلوة قال لى موسى عليه السلام فراجع ربك فان امتك لا تطيق ذلك قال فراجعت ربي فوضع شطرها قال فرجعت الى موسى عليه السلام فاناخبرته قال راجع ربك فان امتك لا تطيق ذلك قال فراجعت ربي فقال هي خمس وهي خمسون لا يبدل القول لدى قال فرجعت الى موسى عليه السلام فقال راجع ربك فقلت قد استحييت من ربي قال ثم انطلق بي جبرئيل حتى نأتى سدرة المنتهى فغشيها الوان لا ادري ما هي قال ثم ادخلت الجنة فاذا فيها جنابذ اللؤلؤ واذا ترابها المسك.

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ حضرت ابوذرؓ بیان کرتے تھے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، میرے مکان کے چھت کو پھاڑا گیا، میں مکہ میں تھا، حضرت جبریل علیہ السلام آسمان سے اترے، اور میرے سینہ کو چاق کیا پھر اس کو زحزم کے پانی سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت، ایمان و حکمت سے بھرا ہوا لائے، اور اس کو میرے سینہ میں اتریل دیا، اور سینہ کو درست کر دیا، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے چلے، جب دنیا کے آسمان (پہلا آسمان) پر پہنچے تو جبریل نے آسمان کے دربان سے کہا، کھولو تو انہوں نے کہا، کہ آپ کون ہیں؟ تو کہا میں جبریل ہوں، انہوں نے کہا کیا اور بھی کوئی آپ کے ساتھ ہیں؟ تو جبریل نے کہا ہاں، میرے ساتھ محمد ﷺ ہیں۔ تو انہوں نے دریافت کیا کہ ان کو بلانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ تو انہوں نے کہا ہاں، تب انہوں نے دروازہ کھولا، آپ نے فرمایا، جب میں

دروازہ سے نکل گیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص کے داہنے جانب کچھ لوگ (روح) ہیں، اور ان کے بائیں جانب بھی پر چھائیاں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب وہ داہنے جانب دیکھتے ہیں، تو خوش ہوتے ہیں، اور جب اپنے بائیں دیکھتے ہیں، تو روپڑتے ہیں، آپ نے فرمایا انہوں نے کہا خوش آمدید ہو نیک نئی اور نیک اولاد کو، آپ نے فرمایا میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہیں تو جبرئیل نے فرمایا، یہ آدم علیہ السلام ہیں۔ اور یہ ان کے دائیں بائیں پر چھائیاں ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔ داہنے جانب والے جنتی ہیں، اور بائیں جانب والے جہنمی ہیں، جب داہنے جانب دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور جب بائیں دیکھتے ہیں تو روپڑتے ہیں، پھر مجھ کو لے چلے، دوسرے آسمان کی طرف، جب وہاں پہنچے، تو یہاں کے دربان سے اسی طرح سوال وجواب ہوا، جیسا پہلے آسمان کے دربان سے ہوا تھا، پھر دروازہ کھولا گیا، حضرت انس نے فرمایا کہ ابوذر نے ذکر کیا، کہ آسمانوں میں آپ نے آدمؑ اور ادریسؑ، اور عیسیٰؑ، اور موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کو پایا۔ ان کے مقامات محفوظ نہیں رہے، ہاں اتنا یاد رہا کہ ابوذر نے کہا آنحضور ﷺ نے پہلے آسمان پر آدم کو پایا، اور چھپنے پر ابراہیم کو۔ راوی کہتے ہیں کہ جب حضرت جبرئیلؑ اور آنحضور ﷺ کا گذر ادریس کے پاس ہوا، تو انہوں نے کہا نبی صالحؑ، اور ابن صالحؑ کو خوش آمدید، جب وہاں سے گذرے تو میں نے پوچھا یہ کون تھے؟ تو بولے یہ ادریس تھے، پھر میرا گذر موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہوا، تو انہوں نے کہا، آئیے برادر صالحؑ اور نبی صالحؑ آپ نے فرمایا، میں نے دریافت کیا، یہ کون ہیں، تو جبرئیلؑ نے کہا، یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، پھر میں عیسیٰ کے پاس پہنچا، تو انہوں نے کہا، آئیے برادر صالحؑ اور نبی صالحؑ، میں نے دریافت کیا، یہ کون ہیں؟ تو بتایا کہ یہ عیسیٰ بن مریم ہیں۔ آپ نے فرمایا، پھر میں ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچا، تو انہوں نے کہا، آئیے نبی صالحؑ اور فرزند صالحؑ، آئیے خوش آمدید آپ نے فرمایا، میں نے دریافت کیا، یہ کون ہیں؟ تو جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ ابراہیم ہیں۔

ابن شہاب کہتے ہیں، اور مجھے ابن حزم نے بتایا، کہ ابن عباس اور ابو حبیہ انصاری، دونوں فرماتے تھے، کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر مجھے اوپر ایسی ہموار جگہ لے گئے جہاں میں قم کے چلنے کی آواز سننے لگا۔

ابن حزم، اور انس بن مالکؓ نے فرمایا، کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کی، آپ نے فرمایا، کہ میں اس کو لے کر واپس آیا، یہاں تک کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا تو انہوں نے کہا کہ آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا آپ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا کہ ان پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں موسیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ آپ اپنے رب کے پاس پھر جائیے، کیونکہ آپ کی امت میں اس کی طاقت نہیں، آپ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے پاس واپس گیا، تو اس کا ایک حصہ معاف کر دیا، آپ نے فرمایا کہ پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے لوٹا، اور میں نے ان کو اس سے مطلع کر دیا، تو انہوں نے کہا کہ اپنے رب کے پاس پھر جائیے کیونکہ آپ کی امت میں اس کی طاقت نہیں ہے آپ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے پاس پھر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ پانچ نمازیں ہیں اور وہ درحقیقت پچاس ہیں۔

میری بات میں رد و بدل نہیں ہوگا آپ نے فرمایا کہ میں موسیٰ کے پاس پھر واپس آیا انہوں نے پھر کہا کہ آپ اپنے رب کے پاس جائیں۔ تو میں نے کہا کہ مجھے اپنے رب کے پاس جانے سے شرم آتی ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر مجھ کو جبرئیلؑ لے چلے یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے، اس کو قسم قسم کے رنگ نے اس طرح گھیر لیا تھا کہ میں نہیں جاسکتا کہ اس کی

حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ پھر مجھے جنت میں داخل کیا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں موتیوں کے گنبد ہیں، اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں کی مٹیاں مشک ہیں۔

### چھت میں سوراخ کرنے کی حکمت

**تشریح** | قولہ فرج سقف بیتنی : قلم مضموم، اور راء مخفف، اور مشدود دونوں پڑھ سکتے ہیں۔ فرج اور تفرج سے ماخوذ ہے پھاڑنے اور کھولنے کے معنی میں۔ حافظ ابن حجر نے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ فرشتہ براہ راست آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ اور ادھر ادھر مڑنا نہیں چاہتے تاکہ یہ آپ پر واضح ہو جائے کہ اس وقت، ان کی آمد کا مقصد صرف آپ کی ذات ہے، اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں، (فتح الباری ج ۱ ص ۴۶۰) اور ہو سکتا ہے کہ چھت کا پھاڑنا شق صدر کی تمہید ہو، گویا اس پر آپ کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں، کہ جس طرح چھت پھٹی، اور فوراً درست ہو گئی اسی طرح سے آپ کا سینہ چاق کیا جائے گا، اور فوراً پھر اس کو درست کر دیا جائے گا، آپ کے دل کو ثابت کرنے کے لئے ایسا کیا گیا۔

### طشت میں کیا تھا؟

ممتلئ حکمة وایمانا الخ : امام نوویؒ لکھتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ طشت میں کوئی ایسی چیز ہوگی، جس کے ذریعہ ایمان و حکمت میں کمال پیدا ہوتا ہو، اس بھرے ہوئے پیالے میں، یہ بھی احتمال ہے کہ حقیقتہً وہ کسی چیز سے لبریز ہو۔ اور معنوی چیزوں کا محسوس ہونا، کوئی بعید نہیں ہے، اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، جیسا کہ روایت میں ہے کہ بروز قیامت سورہ بقرہ سایہ نلگن ہوگی، اور موت کو ڈبنے کی شکل میں لایا جائیگا۔ اسی طرح اعمال کا وزن وغیرہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے بعد، حکمت سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں، اسی لئے ایمان کے ساتھ اس کو ذکر کیا گیا۔ اس کی تائید قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ ”ومن یوتی الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً الخ“ حکمت کی سب سے اچھی تفسیر یہ ہے، کہ ہر چیز کو اپنے محل میں رکھنا، یا اس سے مراد کتاب اللہ کی فہم ہے، امام نوویؒ نے حکمت کی تفسیر میں کئی اقوال نقل کئے ہیں (نووی علی شرح مسلم ج ۱ ص ۵۳)۔ اس میں عمدہ اور صاف بات یہ ہے کہ حکمت اس علم کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کی معرفت تہذیب نفس، عمل کے لئے تحقیق حق، اور باطل سے گریز پر مشتمل ہو، حکیم وہی شخص کہلاتا ہے جو ان تمام چیزوں کو اپنے اندر جمع کر لے، اور کبھی حکمت کا اطلاق قرآن پر، نبوت پر، اور صرف علم پر، اور صرف معرفت پر بھی ہوتا ہے۔

قولہ ان یمینہ اسودۃ الخ : سواد کی جمع ہے، جیسے ازمنہ زمان کی جمع ہے، شخص کے معنی میں ہے، کیونکہ دور سے وہ کالا دکھائی دیتا ہے۔

قولہ قلت لجبرئیل من هذا الخ : بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے آدم علیہ السلام کے بارے میں، آدم علیہ السلام کے مر جا کہنے کے بعد، دریافت کیا، اور دوسری روایت سے اس کے برعکس سمجھ میں آتا ہے، معتمد علیہ یہی روایت ہے۔

قولہ نسف بنیہ الخ : نسف، ان اور سین، دونوں مفتوح نسف کی جمع ہے، روح کو کہتے ہیں یہ جنتی اور جہنمی انسان تھے،

جو آسمان میں موجود تھے۔

## تمام ارواح کا آسمان پر جمع ہونا بظاہر ناممکن

اس پر اشکال یہ ہے کہ کفار کی روح کے بارے میں قرآن میں آتا ہے کہ ان کی روحیں جہنم میں، اور مومنین کی روحیں جنت میں، تو یہ آسمان دنیا میں کیسے اکٹھی ہوئیں۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ممکن ہے یہ تمام ارواح کسی کسی وقت، حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پیش کی جاتی ہوں۔ اور جس وقت آپ آدم علیہ السلام کے پاس پہنچے وہی وقت ارواح کی پیشی کا رہا ہو، اور خود یہ قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان ارواح کو جہنم پر کسی کسی وقت پیش کیا جاتا ہے ”النار یعرضون علیہا غدوا و عشیا“

## کیا کفار کی روح آسمان پر جاتی ہے؟

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کافروں کی ارواح کے لئے آسمان کے دروازے کھولے نہیں جاتے، جیسا کہ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے، کہ جنت آدم کے واسطے جنت میں ہو اور جہنم بائیں جہنم میں اور دونوں کے حالات حضرت آدم علیہ السلام دیکھتے رہتے ہوں۔ اس سے عمدہ جواب یہ ہے کہ ارواح تین طرح کی ہیں۔ (۱) جو اب تک انسانی بدن سے متعلق نہیں ہوئی۔ (۲) جو انسانی بدن سے متعلق ہو کر جدا ہو گئی۔ (۳) جو ابھی دنیا میں انسانی بدن سے متعلق ہے۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں، بائیں جو روحیں تھیں، یہ وہ ارواح تھیں جو اب تک بدن سے متعلق نہیں ہوئیں، ان ارواح کو اللہ تعالیٰ نے جسم کی پیدائش سے پہلے، پیدا فرمادیا۔ اور ان ارواح کا ٹھکانا آدم علیہ السلام کے دائیں اور بائیں، اور آدم علیہ السلام کو ان ارواح کے انجام کا علم دے دیا گیا ہو، کہ واسطے جنتی، اور بائیں جہنمی ہوں گے اسی وجہ سے واسطے والوں کو دیکھ کر مسرور ہوتے، اور بائیں والوں کو دیکھ کر غمگین ہوتے، ان ارواح سے وہ روحیں مراد نہیں ہیں، جو بدن میں داخل ہو چکیں یا جو بدن سے جدا ہو چکیں، اس تحقیق کے بعد وہ اعتراض دور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن میں انہی ارواح کے بارے میں آسمان کے دروازے نہ کھولے جانے کی تصریح ہے، جو جسم میں داخل ہو کر پھر اس سے جدا ہو گئیں اسی طرح جو ابھی بدن میں داخل ہے، وہ تو ابھی زمین پر ہے، اس لئے بھی آسمان پر جانے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

نسم بنیہ الخ: عام ہے مگر مراد میں خاص ہے۔

قوله قال انس بن مالك فذكر الخ: ذکر کے فاعل ابوذر ہیں۔

## حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کس آسمان پر؟

قوله و ابراهيم في السماء السنادسة الخ: دفع تعارض :- یہ حدیث بخاری کی اس حدیث کے مطابق ہے، جو شریک سے مراد ہے، لیکن ان دونوں روایتوں کے علاوہ تمام روایات میں یہ ہے کہ ابراہیم ساتویں آسمان پر تھے، یا تو یہ تادیل کی جائے، کہ متعدد بار آپ کو معراج ہوئی، کبھی چھٹے آسمان پر دیکھا اور کبھی ساتویں پر۔

(۲) نور تطہیر کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابراہیم کا اصل مقام، تو ساتواں آسمان ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ کے استقبال

کی غرض ہے، چھپے پر آگئے ہوں۔ اور پھر ساتویں پر چلے گئے ہوں۔ اس طرح دونوں آسمان پر ملاقات ہوئی۔

(۳) یا پھر تو ساتویں آسمان کی روایت ہی کو ترجیح ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک جماعت کی روایت ہے، اور اس میں یہ تصریح ہے، کہ آپ نے ان کو بیت المعمور کی طرف پیٹھ کر کے سہارا لگائے ہوئے دیکھا۔ اور بیت المعمور ساتویں آسمان پر ہے، نیز حضرت انس کی اس روایت میں یہ ہے کہ انبیاء کے مقامات حضرت انس کو یاد نہ رہے ہوں، جیسا کہ ”لم یثبت کیف منازلہم“ سے ظاہر ہے، تو جن لوگوں نے مقامات کو محفوظ رکھا، ان کی روایت کو ترجیح ہوگی۔

قوله قال فلما مر جبرئیل ورسول اللہ الخ: قال کے قائل انس ہیں۔ جیسا کہ بخاری میں ہے۔

قوله ثم مرت بعیسیٰ: تم یہاں ترتیب کے لئے نہیں ہے، کیونکہ عام روایتوں میں تصریح ہے، کہ حضرت عیسیٰ سے ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوئی ہے، اور اگر تم کو ترتیب ہی کے لئے مانا جائے، تو پھر اس کو تعدد معراج پر محمول کیا جائے گا۔

قوله قال ابن شہاب واخبرنی ابن حزم الخ: یعنی ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم۔ ابو بکر کے والد محمد، ان کا سامع زہری سے ثابت نہیں ہے، کیونکہ محمد کی وفات پہلے ہو چکی تھی، ہاں ابو بکر کی روایت ابو حبیہ سے منقطع ہے۔ اس لئے کہ ابو حبیہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے اور معمر کہ احد ابو بکر کی پیدائش سے بہت پہلے ہو چکا تھا، بلکہ ان کے والد محمد کی پیدائش سے بھی پہلے معمر کہ بدر ہو چکا تھا۔

قوله وابعابہ الخ: یا مفتوح یا مشد مشہور یہی ہے، بعض لوگوں نے حیلا کے ساتھ پڑھا ہے، یہ غلط ہے، اور واقدی نے نون کو ذکر کیا ہے، یعنی ح۔

قوله حتی ظہرت الخ: اس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، مستوی اونچی زمین اور بعض لوگوں نے مکان مستوی کے معنی میں لیا ہے۔ ملا علی قاری نے مستقر کے معنی لئے ہیں۔ مرقاۃ ج ۱۱ ص ۱۵۳

قوله سمع صریف الاقلام الخ: لکھتے ہوئے قلم کی آواز سنی، فرشتوں کا قضاء الہی اور مضامین وحی وغیرہ کو لوح محفوظ سے لکھتے ہوئے قلم کی آواز آپ کے کانوں میں آئی۔

یہ دلیل ہے اہل سنت والجماعت کی، اس بات پر کہ وحی اور تقادیر الہی کی لوح محفوظ سے کتابت ہوتی ہے، کس طرح لکھا جاتا ہے یہ تفصیلات معلوم نہیں، اس کی کیفیت خدا کو معلوم ہے، اور ان انبیاء و ملائکہ کو اس کی تفصیلات کا علم ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو مجاز پر محمول کیا ہے، درحقیقت اس کو ظاہری معنی سے پھیر کر تاویلات کرنا انہیں لوگوں کا کام ہے جن کے ایمان میں پختگی نہیں ہوتی ورنہ عقلاً کوئی استحالہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کتابت وغیرہ کے محتاج نہیں، اس کے باوجود کتابت، خدائی حکمت پر مبنی ہے۔

آنحضور ﷺ کو اتنے اونچے مقامات پر لے جانا، جہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ہالہ جبرئیل ﷺ مرتبہ میں سب سے اونچے تھے، مسند بزاز میں ایک روایت معراج کے بارے میں، حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ براق پر چلے، اور حجاب تک پہنچے، تو حجاب کے پیچھے سے ایک فرشتہ



نمودار ہوئے، ان کے بارے میں حضرت جبریل علیہ السلام نے قسم کھا کر فرمایا کہ یہ وہ فرشتہ ہیں جن کو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا، حالانکہ مخلوق میں میرا تہ بہ تہ بلند ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میں اتنے بلند مقام پر پہنچا، جہاں کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، ممکن ہے لوح محفوظ سے نوٹ کر کے فرشتوں کے حوالہ کیا جاتا ہو۔

قوله خمس وهي خمسون الخ: ممکن ہے اس کا تعلق شفاعت سے ہو، شیخ سے نہ ہو۔ یعنی عمل و فعل کے اعتبار سے پانچ ہیں۔ لیکن ثواب کے اعتبار سے پچاس کے برابر ہے۔

### لا يبدل القول لدى اعتراض؟

”اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خدائی فیصلہ کے بعد، کوئی تبدیلی اور کوئی نسخ نہیں ہوتا، حالانکہ خود اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائی فیصلہ اور حکم میں تبدیلی ہو گئی، کہ پچاس کے بجائے پانچ نمازیں ہو گئیں؟ اس اشکال کے چند جوابات ہیں۔ (۱) اس آیت کا تعلق خبر سے ہے، احکامات سے نہیں، یعنی ثواب و عقاب سے متعلق جو خبریں دی جاتی ہیں، اس میں تبدیلی نہیں ہوتی، احکامات کے اعتبار سے ہوتی ہیں۔

(۲) میرے فیصلے میں تبدیلی نہیں ہوتی، اگر یہ مراد لیا جائے، تو مطلب یہ ہے کہ تقدیر مبرم میں تبدیلی نہیں ہوگی، رہا تقدیر معلق کا معاملہ تو حسب مصلحت اس میں تبدیلی ہوتی ہے کہ کسا ہینا۔ (۳) مطلب یہ ہے کہ اب پانچ نماز کے بعد، قول میں تبدیلی نہیں ہوگی۔

(۴) علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق نماز کے ثواب سے ہے، کہ ایک نماز کا ثواب دس کے برابر ہے، اس میں کوئی نسخ و تبدیلی نہ ہوگی، ان کا خیال ہے کہ یہ مراد لینا کہ اب پانچ نماز کے بعد تبدیلی نہ ہوگی صحیح نہیں، کیونکہ اگر یہ مراد ہوتا تو جب پانچ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، کہ پھر جائیے، تو آپؐ نے فرمایا فقد استحييت مجھے حیا آ رہی ہے۔ لہذا اگر اس جملہ کا تعلق نماز سے ہوتا تو یہ جواب نہ ہوتا، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن ج ۷ ص ۱۱۵ سورہ ق۔“م قوله الوان الخ: یہ فرشتوں کے انوار و اوصاف ہیں جس کو زبان سے بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔

قوله لا ادرى الخ: یا تو اس کا تعلق دنیا میں آنے کے بعد ہو، کہ یہاں آکر میں اس کے اوصاف بیان نہیں کر سکتا، یا یہ مطلب ہو کہ ہماری پوری توجہ خالق کائنات پر تھی، مکان پر نہیں تھی۔

قوله فاذا قيها جنابذ الخ: اذا مفاجاتيه ہے، جنابذ، جمع جنبذ بضم الجيم وسكون نون وضم باء بلند اور ابھری ہوئی چیز، عام لوگ باہر کو مفتوح پڑھتے ہیں یہ گنبد کا معرب ہے۔ (قبہ)

قوله واذا ترابها المسك الخ: مشک کا شمار عمدہ قسم کی خوشبوؤں میں ہوتا ہے، اور حدیث میں آیا ہے کہ جنت کی خوشبو پانچ سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔ (مرقات ج ۱ ص ۱۵۵)۔

❦ حدیث ❦ حدثنا محمد بن المثنیٰ ..... عن انس بن مالك قال قال عن مالك بن صعصعة

رجل من قومه قال قال نبي الله صلى الله عليه وسلم بينانا عند البيت بين النائم واليقضان

اذ سمعت قائلا يقول احد الثلاثة بين الرجلين فاتيت فانطلق بي فاتيت بطست من ذهب فيها من ماء زمزم فشرح صدرى الى كذا وكذا. قال قتادة فقلت للذى معى ما يعنى قال الى اسفل بطنه فاستخرج قلبى فغسل بماء زمزم ثم أعيد مكانه ثم حشى ايماننا وحكمة ثم اتيت بدابة ابيض يقال له البراق فوق الحمار ودون البقل يقع خطوه عند اقصى طرفه فحملت عليه ثم انطلقنا حتى اتينا السماء الدنيا فاستفتح جبرئيل عليه السلام فقبل من هذا قال جبرئيل قيل ومن معك قال محمد صلى الله عليه وسلم قيل وقد بعث اليه قال نعم قال ففتح لنا وقال مرحبا ولنعم المجنى جاء قال فاتينا على آدم عليه السلام وساق الحديث بقصته.

وذكر انه لقي فى السماء الثانية عيسى و يحيى عليهما السلام وفى الثالثة يوسف عليه السلام وفى الرابعة ادريس عليه السلام وفى الخامسة هارون عليه السلام قال ثم انطلقنا حتى انتهينا الى السماء السادسة فاتيت على موسى عليه السلام فسلمت عليه فقال مرحبا بالاخ الصالح والنبي الصالح. فلما جاوزته بكى فنودى ما يبكيك قال رب هذا غلام بعثته بعدى يدخل من امته الجنة اكثر مما يدخل من امتى قال ثم انطلقنا حتى انتهينا الى السماء السابعة فاتيت على ابراهيم عليه السلام وقال فى الحديث وحدث نبى الله انه رأى اربعة انهار يخرج من اصلها نهران ظاهران ونهران باطنان فقلت يا جبرئيل ما هذه الانهار قال اما النهران الباطنان فنهران فى الجنة واما الظاهران فالنيل والفرات ثم رفع لى البيت المعمور فقلت يا جبرئيل ما هذا قال هذا البيت المعمور يدخل كل يوم سبعون الف ملك اذا خرجوا منه لم يعودوا فيه آخر ما عليهم ثم اتيت يانائين احدهما خمر والاخر لبن فعرضتا على فاخترت اللبن فقبل اصبت اصاب الله بك امتك على الفطرة ثم فرضت على كل يوم خمسون صلوة ثم ذكر قصتها الى آخر الحديث.

(بخارى ص ۴۵۵ - ۳۲۰۷ مسلم ص ۹۴ ترمذى ص)

ترجمہ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے، قتادہ کہتے ہیں کہ شاید انس بن مالک نے مالک بن صمعدہ جو ان کے خاندان کے ایک فرد ہیں۔ ان سے روایت کیا کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میں بیت اللہ کے پاس بنید اور بیداری کی حالت میں تھا کہ میں کیا سنتا ہوں، کہ ایک کہنے والا کہہ رہا ہے کہ دو کے درمیان تیسرے شخص ہیں، فرشتہ آئے اور مجھے لے چلے، اور ایک سونے کا پشت جس میں زمزم کا پانی تھا، میرے سینہ کو یہاں سے یہاں تک چاق کیا، قتادہ نے کہا، کہ میں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا کہ (کذا وکذا) کا کیا مقصد ہے، تو انہوں نے کہا کہ پیٹ کے نچلے حصہ تک پھر میرا قلب نکالا، اور زمزم کے پانی سے دھویا گیا، پھر اس کو اپنی جگہ لوٹا کر ایمان و حکمت سے بھر دیا گیا، پھر میرے سامنے ایک سفید رنگ کی سواری لائی گئی، جس کو براق کہا جاتا ہے، گدہا سے اونچا اور نیچے سے نیچا، وہ اپنا قدم اس جگہ ڈالتا تھا جہاں اس کی نظر پہنچتی تھی، مجھے اس پر سوار کیا گیا، پھر ہم کو لے چلے یہاں تک کہ ہم دنیا کے آسمان پر آئے، تو انہوں نے دروازہ کھلوایا، ان

سے دریافت کیا گیا، کہ کون؟ انہوں نے جواب دیا میں ہوں جبرئیل، پوچھا آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ کہاں محمد ﷺ پوچھا گیا کیا ان کو لینے کے لئے بھیجے گئے ہیں؟ بولے ہاں تب ہمارے لئے دروازہ کھولا گیا، اس پر کہا گیا خوش آمدید، کیا مبارک تشریف آوری ہے، آپ نے فرمایا ہم آدم علیہ السلام کے پاس آئے، اور پر کی حدیث کی طرح مضمون بیان کیا۔

انہوں نے ذکر کیا کہ دوسرے آسمان پر عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات ہوئی، اور تیسرے آسمان پر یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے پر ادریس علیہ السلام سے، اور پانچویں پر ہارون علیہ السلام سے پھر فرمایا، کہ ہم کو لے چلے یہاں تک کہ چھٹے آسمان پر پہنچے، تو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، میں نے ان کو سلام کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ آئیے براہِ صالح اور نبی صالح خوش آمدید! جب میں آگے بڑھنے لگا تو موسیٰ علیہ السلام پر گریہ طاری ہوا، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں روتے فرمایا، اس لئے کہ ایک نوجوان جو میرے بعد مبعوث ہوئے ہیں ان کی امت کے لوگ میری امت سے بھی زیادہ جنت میں جائیں گے۔ آپ نے فرمایا، پھر مجھے لے چلے، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچا، اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا، اور اسی حدیث میں انہوں نے کہا، کہ آنحضور ﷺ نے بیان فرمایا کہ آپ نے چار نہریں ایسی دیکھیں، جو اس کے جز سے نکل رہی ہیں۔ دو باہر کی جانب، اور دو اندر کی جانب، میں نے پوچھا اے جبرئیل یہ نہریں کیا ہیں، تو بوسلے کہ جو دو نہریں اندر کی جانب ہیں، یہ دونوں جنت کی نہریں ہیں، اور جو باہر کی جانب ہیں وہ نخل و فرات ہیں، پھر میرے سامنے بیت المعمور لایا گیا، جس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے آتے ہیں، جب وہ سب اس سے نکل جاتے ہیں، تو پھر اخیر تک ان کی باری نہیں لوٹتی، پھر میرے پاس دو برتن لائے گئے، ایک شراب کا اور دوسرا دودھ کا، اس کو میرے سامنے پیش کیا گیا، تو میں نے دودھ کے پیالے کا انتخاب کیا، تو مجھ سے کہا گیا آپ نے ٹھیک انتخاب کیا، اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو راہِ راست پر قائم رکھے، پھر ہر دن میں میری امت پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں، اس کے بعد آخر تک بیان کیا۔

قوله عن مالك بن صعصعة الخ: یہ قبیلہ ابوالنجا کے تھے بخاری اور دیگر کتب حدیث میں ان سے ہی ایک روایت مروی ہے۔ اور ان سے روایت کرنے والے صرف انس بن مالک (قالہ الحافظ) ابوالحسن دار قطنی کہتے ہیں کہ عن انس بن مالک عن مالك بن صعصعة کی سند سے صرف قنادہ روایت کرتے ہیں۔

### اسراء کی ابتداء کس مکان سے ہوئی؟

قوله فبيننا انا عند البيت الخ: بعض "روایت میں بینما انا فی الحطیم" ہے اور حضرت ابوذرؓ کی روایت میں "فوج سقف بيتي" ہے اور واقدی کی روایت میں "انه اسرى به من شعب ابي طالب" ہے اور ام ہانی کی روایت طبرانی میں "انه بات فی بيتها" ہے، ان تمام روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ آنحضور ﷺ ام ہانی کے گھر آرام فرما رہے تھے، اور ان کا گھر شعب ابی طالب کے قریب تھا، اور وہ حطیم کے قریب تھا، اور ام ہانی کے مکان کو حجاز اپنی طرف نسبت کر کے بتی فرمایا، یا تو اس لئے کہ چچری بہن ہوتی ہیں، یا اس لئے کہ اس وقت آپ وہیں ٹھہرے تھے اس کی صورت یہ ہوئی کہ فرشتہ ام ہانی کے مکان سے آپ کو مسجد حرام لے آئے، اور یہاں آکر آپ پر نیند کا اثر باقی ہی تھا، پھر باب مسجد پر لے آئے اور یہیں سے براق پر سوار ہوئے۔

ابن اسحاق کے یہاں مرسل حسن میں یہ الفاظ مذکور ہیں "ان جبرئیل اتاہ فاخرجه الى المسجد فارکبه البراق الخ" اس سے مذکورہ بالا تطبیق کی تائید ہوتی ہے، قولہ قائلًا یقول سے۔ قائل فرشتہ ہیں۔

قوله احد الثلاثة بین الرجلین الخ: رجلین سے مراد، آپ کے دو چچا حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ ہیں، آپ اس شب میں، دونوں کے بیچ میں سوئے ہوئے تھے، اس سے یہ مسئلہ معیض ہوا کہ چند لوگ ایک جگہ سو سکتے ہیں، بشرطیکہ سب اپنی اپنی چادروں میں ہوں، کئی آدمی کا ایک چادر اوڑھ کر سونا مناسب نہیں۔

قوله ولنعم المجبی جاء الخ: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، اور مخصوص بالمدح محذوف ہے، تقدیر عبارت "جاء فنعم المجبی مجیئہ" اور بعض لوگوں کے نزدیک، تقدیر "نعم المجبی الذی جاء" موصول حذف کر کے صلہ پر اکتفاء کر لیا گیا۔ نعم المجبی مجبی جاء اس صورت میں موصوف محذوف اور صرف صفت پر اکتفاء کیا گیا۔ (مرقات ج ۱۱ ص ۱۳۲)

### حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رونے کی مصلحت

قوله فلما جاوزته الخ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ردنا حسد کی وجہ سے نہیں تھا، کیونکہ عالم آخرت میں جب عام مومنین کو بھی حسد و کینہ سے صاف کر دیا جائے گا، تو پھر انبیاء علیہم السلام و صلحاء میں یہ مذموم صفت کیسے آسکتی ہے، بلکہ یہ رونا اس وجہ سے تھا، کہ امت محمدیہ کے صلحاء و تقویٰ کی وجہ سے، جو رتبہ بلند آپ کو ملا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت بنی اسرائیل کی تافرمائی، اور سرکشی کی وجہ سے ان کے مرتبہ میں کمی آگئی، کیونکہ ہر نبی کا رتبہ ان کے قبیعین کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت تعداد میں امت محمدیہ سے کم ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو غلام سے تعبیر کیا، اس میں آپ کی تنقیص مقصود نہیں، بلکہ اس میں عظمت شان کو ظاہر کیا گیا ہے کہ اتنی کم عمری میں اتنا بلند رتبہ حاصل کر لیا، جو بڑی بڑی عمروالے بھی اتنا اونچا رتبہ نہیں پاسکے۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آپ کی امت کے بارے میں خیر خواہی اس کا ثبوت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس امت سے حد درجہ تعلق تھا، اسی لئے بعض روایت میں آپ کے یہ الفاظ منقول ہیں "کان موسیٰ اشدھم غلیٰ حین مرت و خیرھم لی حین رجعت" (طبری، بزار) ابن ابی جرہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے قلوب میں امت کا بے پناہ درود و شفقت، اور محبت ڈالا ہے، اسی لئے حضرت موسیٰ اپنی امت کے حالات پر رو پڑے۔

### آپ کو غلام کہنے کی وجہ

غلام عربی میں جوان کو کہا جاتا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے لفظ غلام پر، ایک اور نکتہ لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس لفظ میں اشارہ کیا ہے کہ آپ کی قوت و طاقت، کمولت بلکہ بڑھاپے میں بھی نوجوانوں کی طرح رہے گی، نہ آپ پر بڑھاپے کی کمزوری آئے گی، اور نہ دیکھنے والے آپ کو بوڑھا تصور کریں گے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے، تو اہل مدینہ نے آپ کو جوان کہا، اور آپ کے رفیق یار غار، ابو بکر کو بوڑھا کہا، حالانکہ ابو بکرؓ آپ سے عمر میں چھوٹے تھے، اور اسی سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آپ سے بے پناہ تعلق تھا، جب تک آپ ان سے جدا نہیں ہوئے، اپنے تمام مشاغل سے یکسو ہو کر، صرف آپ کی طرف متوجہ رہے، اور جب آپ جدا ہوئے تو رو پڑے۔ (فتح الباری)

قوله اربعة انهار الخ: یعنی سدرة المنتهى کی جڑ سے چار نہریں نکل رہی تھیں، جب کہ بخاری میں اس کے بارے میں مفصل روایت ہے۔ (مرقات ج ۱۰ ص ۳۳۰)

قوله آخر ما عليهم الخ: آخر میں رلو کو ضمہ پڑھا گیا ہے، اور نصب بھی نصب ظرفیت کی بنا پر، اور رفع کی صورت میں ذالک محذوف کی خبر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے ”ذالك آخر ما عليهم من دخوله“ اور بہتر رفع ہے۔  
قوله اصاب الله بك الخ: اصاب بمعنی اراد ہے، قرآن میں ہے ”فسخرنا له الريح تجري بأمره رخاء حيث اصاب“ یعنی جہاں اراد تقدیر عبارت ”اراد بك الفطرة والخير والفضل“

❦ حدیث ❦ حدثني محمد بن العثني وابن بشار..... عن قتادة قال سمعت ابا العالية يقول حدثني ابن عم نبيكم صلى الله عليه وسلم يعني ابن عباس قال ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم حين اسرى به فقال موسى آدم طوال كانه من رجال شنوءة وقال عيسى جعد مربوع وذكر مالكا خازن جهنم وذكر الدجال.

ترجمہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج کا تذکرہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام گندم گوں رنگ، اور دراز قامت تھے، جیسا قبیلہ شنوءہ کے لوگ ہوتے ہیں، اور عیسیٰ علیہ السلام گھونگر والے بال، اور میانہ قد کے تھے، اور اس شب کے عجائبات میں آپؐ نے دارود جہنم، اور دجال کے دیکھنے کا بھی ذکر فرمایا۔

شرح الفاظ قوله آدم الخ: بالمد گندم گوں۔ طوال، بضم الطاء طویل کے معنی میں۔ ”كانه من رجال شنوءة الخ“ شہین مفتوح نون مضموم واو ساکن مؤنث یمن کا ایک قبیلہ، جو شنوءہ کی طرف منسوب ہے، اور وہ عبد اللہ بن کعب بن عبد اللہ بن مالک بن نضر بن ازد ہیں اور اس کی طرف نسبت کر کے شنوئی کہلاتے ہیں اس قبیلہ کے لوگ دراز قامت ہوتے تھے۔

قوله جعد: عام روایات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بال کی صفت میں، سبط الرأس یعنی سیدھے بال والے آیا ہے۔ اور جعد اس کی ضد ہے، اسی لئے عام علما کا رجحان یہ ہے کہ یہاں جعد سے مراد ہے بدن کا گٹھا ہوا ہونا، اور موسیٰ علیہ السلام کے اوصاف میں جہاں جعد آیا ہے، اس سے مراد یا تو گھٹکر والے بال ہیں، یا بدن کا گٹھا ہوا ہونا۔ دوسری صورت کو ترجیح دی گئی ہے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے ”انه رجل الشعر“ مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی صفت میں پہلا معنی بھی لیا جاسکتا ہے، اس صورت میں دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہوگی، کہ نہ بالکل سیدھے بال تھے نہ بالکل گھونگر والے بلکہ تھوڑا سا بچ و خم تھا۔

قوله مربوع: نہ دراز قامت، اور نہ کوتاہ قد، بلکہ میانہ قد تھا۔ دوسری روایت میں عیسیٰ علیہ السلام کی صفت میں ”مربوع الخ الى الحمرة والبياض سبط الرأس“ ہے  
قوله الى الحمرة والبياض الخ: حال واقع ہے، مقصد یہ ہے کہ ان کا رنگ سرخ اور سپیدی کی طرف مائل تھا نہ بالکل سرخ تھے، اور نہ بالکل سپید بلکہ سپیدی سرخی ملی ہوئی تھی۔

حدیث عن عبد بن حمید..... قوله اری مالکاً خازن جهنم فی آیات اراهن

الله اياه فلا تکن فی مریة من لقاءه.

ترجمہ یعنی حضور ﷺ کو شب معراج میں، جہاں اور بڑے بڑے نشانات دکھائے گئے، انہیں میں ایک دجال کو بھی دکھلایا گیا، ”فی آیات اراهن الله اياه الخ“ یہ راوی کا کلام ہے، جس کو راوی نے اس مقصد سے درج کیا ہے کہ کسی کو غلجان اور شبہ نہ ہو، مگر یہ قول آنحضور ﷺ کا ہوتا، تو پھر ”اراهن الله اياهی“ فرمایا جاتا۔ لقاء میں ضمیر کا مرجع دجال ہے۔ آیات سے خوارق عادت امور مراد ہیں، جن کو بطور استدراج دجال کے ہاتھوں ظاہر ہوگا، اور اس میں انسانوں کے لئے بڑی آزمائش ہوگی، علاوہ طبعی فرماتے ہیں کہ آیات سے مراد ”لقد رآی من آیات ربہ الکبری الخ“ والی آیتیں مراد ہیں، یعنی ان آیات میں دجال بھی ایک آیت ہے جو مجھے اس رات میں دکھلایا اس صورت میں یہ باب التفات سے ہوگا کہ ایاہ، ایاہی کی جگہ پر ہے، یا راوی نے روایت بالمعنی کی ہو۔

فلا تکن فی مریة من لقاءه الخ: اس کا تعلق بظاہر اول کلام سے ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے، اس میں اشارہ ہے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی طرف ”ولقد آتینا موسیٰ الکتاب فلا تکن فی مریة من لقاءه“ صاحب کشاف اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لیلۃ المعراج میں حضرت موسیٰ کی ملاقات کا آپ کو شک و شبہ نہیں گذرنا چاہئے، رہا حضرت عیسیٰ اور دوسری آیات، تو وہ اسی کے ضمن میں تابع ہو کر داخل ہوں گی، مطلب یہ ہے کہ آپ کو جو آیات دکھائے گئے ہیں، اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہئے، اس صورت میں ”فلا تکن“ میں خطاب آنحضور ﷺ کو ہے، اور کلام باہم مربوط ہے، راوی نے صرف لفظ ایاہ کو بدلا ہے۔ اور اس کی تائید لام نووی کے کلام سے ہوتی ہے، جو انہوں نے اسی حدیث کی شرح میں ذکر کیا ہے۔

انکابیان ہے کہ قراءہ اس کی وضاحت کر رہے ہیں، کہ آنحضور ﷺ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، مجاہد، کلبی، سعدی نے اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن عام شارحین لکھتے ہیں کہ ”فی آیات اراهن الله“ راوی کا کلام ہے۔ حدیث میں اس جملے کو درج کر کے سامعین کے استبعاد کا ازالہ کیا ہے، کہ شاید اسکو بعید از عقل سمجھ کر شک و شبہ میں پڑ جائیں تو اب خطاب فلا تکن میں عام لوگوں کو ہے، جو بھی اس حدیث کو سنیں گے سب اس کے مخاطب ہیں۔ اور لقاء کی ضمیر کا مرجع، دجال ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب اس کو خروج کی پیشین گوئی دی جا چکی ہے، تو اس میں کسی کو تردد نہیں ہونا چاہئے، اور کچھ لوگوں نے لقاء کا مرجع ما ذکر کو ٹھہرایا ہے، یعنی قیامت تک آنیوالی جتنی نشانیں کو دکھایا گیا اس میں کسی قسم کا تردد نہیں ہونا چاہئے۔

### حیات انبیاء پر اشکال

ابوداؤد و نسائی کی روایت، جس کی تصحیح ابن خزیمہ نے کی ہے ”ان الله حرم علی الارض اجساد الانبیاء“ ابوداؤد کی ایک روایت جس کے الفاظ یہ ہیں ”ما من احد یسلم علی الارض الا رد الله علی روحی حتی ارد علیہ السلام“ (ابوداؤد ص ۷۹)۔ بظاہر روح کو لوٹانے سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ روح کا بدن سے انفصال ہو جاتا ہے، اور اسی کو موت کہتے ہیں۔ اس کے مختلف جوابات ہیں۔ (۱) رد اللہ علی روحی کا مطلب یہ ہے کہ دفن کے بعد میری روح اللہ نے واپس

کر دیا، یہ مطلب نہیں کہ لوٹا کر نکال لی جاتی ہے۔ (۲) نزاع کے معنی نکالنے ہی کے لئے جائیں مگر یہ موت والا نزاع نہیں ہے بلکہ نکالی جاتی ہے اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ (۳) روح سے وہ فرشتہ مراد ہے، جو درود کے پہونچانے پر مقرر ہے۔ (۴) روح سے مراد مولا اعلیٰ سے توجہ ہٹا کر سلام کرنے والوں پر متوجہ ہونا ہے۔

### حیات انبیاء علیہم السلام پر عقلی دلائل

یوں تو انبیاء علیہم السلام کو عام مخلوقات پر اور ان کی آنکھ، کان، وغیرہ سارے اعضاء کو امتیاز ہے، اسی طرح عام انسانوں کے جسم میں تو صرف ایک جزء ایسا ہوتا ہے جو تمام جسم کے فنا ہو جانے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتا، لیکن انبیاء علیہم السلام کے پورے اجسام کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ زمین کے تخریبی اثرات سے بالکل محفوظ رہتے ہیں، یوں تو ادویات کے ذریعہ سے اجسام کا محفوظ رکھنا مصر کی عام صفت تھی، اور اسی صفت کی بدولت، آج عجائب گھروں میں ہزاروں سال کی لاشیں موجود نظر آتی ہیں، اور آج کی ایجادات میں بھی ایسے آلات موجود ہیں، جنکے ذریعہ پانی اور آگ کے اثرات سے کافی حفاظت ہو جاتی ہے، واٹر پروف کا استعمال عام طور پر ہمارے زمانے میں سب جانتے ہیں، تھرمس میں برف جیسی جلد پگھل جانے والی چیز بے تامل چوبیس چوبیس گھنٹے تک محفوظ رہ سکتی ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کے اجسام کا محفوظ رہنا، بھی کوئی بعید از قیاس بات نہ تھی جبکہ تاریخی واقعات سے بعض صحابہ کے اجسام کا محفوظ رہنا بھی صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہے لیکن ہم صرف آپ کی تسکین خاطر کے لئے کچھ مزید وضاحت بھی کئے دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جس طرح عناصر کی لطافت و کثافت سے کون و فساد ہو سکتا ہے، اسی طرح مرکبات عناصر میں لطیف و کثیف بنانے سے، مادیت و روحانیت کا تغیر ہو سکتا ہے، دیکھئے اگر پانی کو آگ پر رکھا جائے تو وہ ایک دوسرے لطیف تر عنصر کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یعنی ہوا بن جاتا ہے، پھر اس کے خواص بھی بدل جاتے ہیں، اسی طرح اگر بھاپ کو ٹھنڈا کر دیا جائے تو پھر وہ پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جو اس سے کثیف عنصر ہے یہاں بھی اس کو خواص میں تبدیلی ہو جاتی ہے، اسی طرح انسانی جسم، جو عناصر اربعہ سے مرکب ہے، اس میں بھی ریاضت و معصیت کے اثرات سے لطافت و کثافت کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے، مسلمانوں میں طبقہ صوفیاء، نصاریٰ میں راسخین، اور ہندوؤں میں جوگیوں کی تاریخ پڑھنے سے یہ حد یقین تک پہونچ جاتا ہے کہ ان کے ظاہری اجسام ریاضات کے اثرات سے اتنے لطیف ہو جاتے ہیں، کہ عام جسمانی انقلابات، ان پر کم اثر انداز ہوتے ہیں، اس کے برعکس جو جماعت تن پروری کی ریاضت میں منہمک ہے، ان کے اجسام بھی اسی قدر کثیف ہو جاتے ہیں، آج کل کی اصطلاح میں اس مسئلہ کا نام تجسد الارواح یا تروح الاجساد ہے، یعنی روحوں میں یہ طاقت ہو جاتی ہے کہ وہ کسی جسم کی صورت اختیار کر لیں اور جسم لطیف ہو کر روح کے خواص پیدا کر لے۔

انبیاء علیہم السلام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش چونکہ عام دستور کے خلاف، صرف تھو جبریل سے ہوئی تھی، اسی لئے ان کے جسم عنصری میں بھی روح کے خواص اتنے نمایاں تھے، کہ موجودہ انجیل کے بیان کے مطابق بعض مرتبہ بات کرتے کرتے ان کی شکل مبارک تبدیل ہو جایا کرتی تھی، اور ہماری شریعت میں بھی ان کا لقب روح اللہ رکھا گیا ہے، ان کا آسمانوں پر جانا، اور پھر اترنا بھی اسی کے اثرات میں سے ہے، اسی طرح ان کے معجزات میں احیاء موتی کا ایک معجزہ

ہونا، بھی ان کے روح اللہ، ہونے کے مناسبات میں سے تھا۔

احادیث سے پتہ چلتا ہے، کہ معصیت کا اثر مادیت میں ترقی ہے، اور طاعات کا اثر، روحانیت میں اضافہ اس لئے اہل جہنم پر مادیت غالب کر دی جائے گی، اور ان کی جسامت دنیوی، جسامت سے سینکڑوں گنا بڑھادی جائے گی، تاکہ ایک طرف ان کے عذاب میں شدت ہو، اور دوسری طرف جہنم کے بھرنے کا، جو وعدہ گذر چکا ہے، وہ تکثیر افراد کے بجائے ایک ایک فرد کی جسامت میں اضافہ کر کے پورا کر دیا جائے، اس کے برخلاف اہل جنت پر روحانیت غالب ہو جائے گی، اور اس وجہ سے جنت کی نعمتوں سے لطف اندوزی، اور پروردگار عالم کی رویت، جو عالم مجردات سے بھی دور اور اعلیٰ ہے، ان کے لئے آسان کر دی جائے گی۔ بے شک اجسام اپنی ساری عمر، ریاضت و عبادت میں صرف کر کے یہاں بھی روح کے کچھ خواص حاصل کر چکے تھے، جنت میں پہنچ کر ان کی اس صفت میں اور ترقی ہو جانی چاہئے، حیرت ہے کہ جب اس دنیا میں بھی موسم، زمین کے شور ہونے نہ ہونے اور خود جسم کے باطنی غیر باطنی ہونے کے اختلاف سے لاش کے بگڑنے، اور نہ بگڑنے میں، فرق آسکتا ہے، تو معصیت و طاعت کے اثرات سے بھی، اگر یہ اختلاف رونما ہو جائیں، تو اس کا انکار کیوں کیا جاتا ہے؟

اب تک جو ہم نے بیان کیا، یہ تو کسب و اکتساب کے اثرات و نتائج تھے، انبیاء علیہم السلام کی جماعت، چونکہ صفتِ مطہرہ کے ماتحت ہوئی ہے اس لئے ان کے اجسام کی ابتدائی نہاد ہی ان کمالات سے بالاتر ہوتی ہے، جو کسب و اکتساب کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ قالبِ انسانی ان کو بھی ملتا ہے، مگر وہ قالب جو منور ہو۔ روح بشری ان میں بھی ہوتی ہے، مگر وہ روح نشہِ عبودیت میں سرشار ہو۔ اور اس طرح وہ ظاہر و باطن منور ہستیاں جب عالم میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تو کفر کا حیرہ و تاریک عالم ان کے وجود سے منور ہو جاتا ہے۔ پسند ان کو بھی آتا ہے، مگر وہ پسند نہیں، جو دماغ کو متعفن کر دے، بلکہ وہ دل و دماغ کو مضطر کر دے۔ سوتے وہ بھی ہیں مگر وہ نیند نہیں، جو دل و دماغ کو غافل کر دے، کھاتے وہ بھی ہیں، مگر وہ کھانا نہیں جس کی احتیاج عام انسانوں کی طرح ہو۔ بلکہ عین نیند کی حالت میں، ان کے دل دوسرے تمام بیداروں سے زیادہ بیدار ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ان کا خواب وحی ہوتا ہے۔ اور ان کی نیند ناقض و ضو نہیں ہوتی۔ اور وہ روزہ رکھتے ہیں تو کئی کئی دن کھانے کے قریب نہیں جاتے، پھر اس وجہ سے ان کو کوئی ضعف بھی لاحق نہیں ہوتا، اس پر جب آپ کے فداکار، آپ کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں، تو آپ بڑی شفقت کے انداز میں ان سے یہ فرمادیتے ہیں، کہ تم میری طرح نہیں ہو میں اگر جسمانی غذا ترک کرتا ہوں، تو میرا پروردگار مجھے روحانی غذا سے سرفراز فرماتا ہے، تم لمبیں پیاز سب کھا سکتے ہو، مگر میں نہیں کھا سکتا کہ، میرے اصحاب محفل، تمہارے علاوہ نوعِ ملائکہ بھی ہیں، نکاح وہ بھی کرتے ہیں، مگر وہ نکاح نہیں جس سے مقصود کسی درجہ میں بھی تلافی ہو، بلکہ وہ نکاح جس کا مقصد صرف عبادت اور تقرب ہو، قوتِ باصرہ، سامعہ، ذائقہ وہ بھی رکھتے ہیں، مگر وہ قوت نہیں جو صرف عالمِ مادیت تک محدود ہو، بلکہ وہ جو ماوراءِ مادیات کو بھی نفوذ کر جائے۔ زبانیں اگر صرف خوش مزہ، اور بدمزہ کا ادراک کرتی ہیں، تو ان کی زبان حلال و حرام غذا کا بھی ادراک کر لیتی ہے حتیٰ کہ بول و براز میں وہ بھی عام انسانوں کے شریک نظر آئیں، مگر یہاں اس کے متعلق جذب کر لینا بھی منقول ہو، اور سب سے آخری میں موت کا فرشتہ، ان کے پاس بھی آئے، مگر اجازت کے بغیر جبر واکراہ سے نہیں بلکہ اذن و اجازت سے، اور دفن گرچہ وہ بھی ہوں، مگر یہاں بھی اپنے جانے وفات میں، مدفون ہونے کا



امتیاز باقی رہے۔ اب سوچو کہ اگر ان کے جسم غصری ہی میں کوئی امتیاز و خصوصیت نہیں ہوتی، تو جس غذا کے اثر سے دوسرے جسموں کو متعفن پسینہ آتا ہے، وہ ان کو کیوں نہیں آتا۔ وہ عام انسانوں کی طرح غذا کے محتاج کیوں نہیں ہوتے۔ ان حواس کے اور اک کا دائرہ عام انسانوں سے بالاتر کیوں ہوتا ہے؟ اور کیوں ان کی نیند عام انسانوں کی سی نیند نہیں ہوتی، دنیا میں غفلت کی نیند صحت کی علامت ہے۔ اور ان کے یہاں بیداری کی نیند، موجب کمال ہو کیا اس سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا، کہ ان کے اجسام غصریہ کی بنیاد ہی کچھ عام اجسام سے نرالی ہوتی ہے۔

بعض ضعیف حدیث میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں۔ ایک بار آنحضور ﷺ سے اہل جنت کی غذا کے متعلق دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ وہ معطر پسینہ بن کر ختم ہو جائے گی، اس سے فضلہ نہیں بنے گا، اگر کہیں غذا کی مادیت حائل نہ ہوتی تو شاید انبیاء علیہم السلام کا فضلہ اس عالم میں بھی پسینہ بن کر رہ جاتا، گویا فرق اگر کچھ رہے گا تو وہ صرف غذا کی نوعیت کے فرق سے رہا، حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں رہ کے جب غذا کھائی، تو وہی جسم جو فضلہ کا محتاج نہ تھا اب فضلہ دفع کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ پس جسم ایک ہی تھا، فرق جو ہو غذا کی نوعیت سے ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام جنتی جسم لے کر، اس جہاں کی آبادی کے لئے تشریف لائے اور آنحضرت ﷺ اپنا بھی غصری جسم لے کر، خدا تعالیٰ کے دیدار کے لئے تشریف لے گئے، اور اسی جسم الطہر کے ساتھ، جنت کو شرف قدم سے نوازا، پس کیا شبہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں۔ اگر ان کا قالب غصری بھی اہل جنت کی طرح، کون و فساد کے اثرات سے آزاد ہو تو بعید کیا ہے؟

پھر اس پر غور کرنا چاہئے کہ انسانی زندگی میں عام انسانوں کے اجسام کے بگڑنے سے کون سی چیز مانع ہے۔ تو ظاہر ہو گا کہ وہ علاقہ روح یعنی حیات ہے، ادھر روح نے جسم سے پرواز کی ادھر جسم کے اندر تغیر شروع ہوا۔ اگر انبیاء علیہم السلام کی ارواح کا ان کے جسموں کیساتھ، علاقہ شہداء سے کچھ زیادہ تسلیم کر لیا جائے، تو کیا پھر بھی ان کے جسموں کے محفوظ رہنے میں کوئی وجہ اشکال ہو سکتی ہے؟

آخر میں امام رازی کی تفسیر کبیر کے ایک مضمون پر بحث کو ختم کر دیا جاتا ہے، امام موصوف ص ۵۶ جلد دوم پر تحریر فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے۔ ”یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کے نفوس قدسیہ، عام انسانوں سے اپنی ماہیت ہی میں مختلف ہوتے ہیں، ان نفوس میں فہم و فراست اور جسمانیات و شہوات سے ایک عجب قسم کی برتری ہوتی ہے، جب ایک طرف روح کی پاکیزگی و شرف کا یہ عالم ہو، دوسری طرف جسم بھی عایت درجہ پاک و صاف ہو تو لازمی طور پر ان کے قوی محرکہ اور مدد رکھ بھی انتہائی درجہ کامل ہوں گے، کیونکہ جب قاعل اور قابل دونوں کامل ہوں تو پھر اس کے آثار قوت و شرف و پاکیزگی میں کیوں کامل نہ ہوں۔“ (ترجمان الہ)

❦ حدیث ❦ حدثنا محمد بن المنثی ..... عن مجاہد قال کنا عند ابن عباس

فذكروا الدجال فقال انه مكتوب بين عينيه كافر قال فقال ابن عباس لم اسمعه قال ذاك ولكنه قال اما ابراهيم فانظروا الي صاحبكم واما موسى فرجل آدم جعد على جمل احمر

(مسلم ص ۹۵)

مخطوم بخلبة كانى انظر اليه اذا انحدر فى الوادى يلبى.

**ترجمہ** مجاہد سے روایت ہے، انہوں نے کہا ہم لوگ عبد اللہ بن عباس کے پاس تھے، تو لوگوں نے دجال کا تذکرہ کیا، تو بعض حاضرین نے فرمایا، کہ ان کی دونوں آنکھ کے درمیان، کافر لکھا ہوا ہو گا، اس پر عبد اللہ بن عباس نے فرمایا، کہ میں نے یہ بات آنحضور ﷺ سے فرماتے ہوئے نہیں سنی، ہاں! آپ نے فرمایا کہ ابراہیم کو دیکھنا چاہو، تو مجھے دیکھو، اور موسیٰ علیہ السلام تو وہ گندم گوں گھسے ہوئے بدن والے تھے۔ سرخ لونٹنی پر سوار تھے، اس کی ٹکیل ٹھجور کے چھال کی تھی، گویا میں دیکھ رہا ہوں ان کو، جبکہ وہ وادی میں تلبیہ پڑھتے ہوئے نیچے کی جانب اتر رہے تھے۔

**تشریح** اس سے قبل کی روایت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے "كانى انظر الى موسى فذكر من لونه وشعره شيئاً لم يحفظه داؤد واضعاً اصبعيه فى اذنيه الخ" یعنی ان کے رنگ و بال کے بارے میں کچھ اوصاف بیان کئے اور وہ گندم گوں رنگ، ٹھنکریالے بال، یہ راوی داؤد کو یاد نہیں رہا۔

قوله واضعاً اصبعيه الخ: اس سے معلوم ہوا کہ اذان کہتے ہوئے آواز کو بلند کرنے کی غرض سے، کانوں میں انگلی ڈالنا مستحب ہے، کیونکہ شرائع من قبلنا حجت ہے، اگر اس پر شارع نے انکار نہ کیا ہو۔ یہ استنباط امام نووی کا ہے، ملا علی قاری اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ استنباط اس وقت صحیح ہے، جبکہ کانوں میں انگلی ڈالنا اذان کے لئے ثابت ہو، حالانکہ روایت میں تلبیہ پڑھتے ہوئے کانوں میں انگلی ڈالنے کا ثبوت ہے اذان کے وقت انگلی ڈالنے کے لئے الگ سے مستقل دلیل کی ضرورت ہے۔ (مرقات ج ۱ ص ۲۶)

قوله لفت الخ: لام مکسور، فاساکن بعدہ تا، بعض لوگ کہتے ہیں ہر شئی ثنیہ جو جحفہ کے قریب ہے اس کو لفت بھی کہا جاتا ہے، او، شک ربوی کے لئے ہے اور او کو تنوِیج کے لئے بھی مانا جاتا ہے۔ کہ بعض نے ہر شئی کہا اور بعض نے لفت حقیقہ دونوں ایک ہی ہیں۔

قوله فذكر والدجال الخ: یعنی حاضرین میں سے بعض نے کہا کہ دجال کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہو گا۔ قوله لم اسمعه الخ: یعنی ابن عباس نے فرمایا دجال کے بارے میں، کہ یہ بات میں نے آپ ﷺ سے نہیں سنی، ممکن ہے کہ عجائبات کا تذکرہ چل رہا ہو، تو انہیں عجائبات میں دجال کا حال بیان کیا ہو۔ تو ابن عباس نے فرمایا، کہ یہ عجیب بات میں نے آنحضور ﷺ سے نہیں سنی، ہاں! میں نے ایک دوسری عجیب بات اور اس پر موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کا حال بیان کیا۔ قوله فانظروا الى صاحبكم الخ: مراد آپ کی ذات گرامی ہے۔

اذا انحدر فى الوادى الخ: معلوم ہوا کہ اوپر سے نیچے آتے ہوئے، تلبیہ کی تاکید ہے جیسا کہ نیچے سے اوپر جڑھتے ہوئے پڑھنے کی تاکید ہے۔

❦ حدیث ❦ حدثنا قتيبة بن سعيد..... عن جابر رضى الله عنه ان رسول الله

صلی الله عليه وسلم قال عرض على الانبياء فاذا موسى ضرب من الرجال كانه من رجال شنوءة ورأيت عيسى ابن مريم فاذا اقرب من رأيت به شبهة عروة بن مسعود ورأيت ابراهيم

فاذا اقرب من رأيت شبهاً صاحبكم يعني نفسه ورأيت جبرئيل عليه السلام فاذا اقرب من رأيت شبهاً دحية وفي رواية ابن رُمح دحية بن خليفة۔ (مسلم ص ۹۵ ترمذی ص ۳۶۵)

ترجمہ حضرت جابر سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا، کہ مجھ پر انبیاء پیش کئے گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت موسیٰ درمیانہ قسم کے ہیں۔ گویا وہ شنوۃ کے ایک فرد معلوم ہوتے ہیں۔ اور میں نے عیسیٰ بن مریم کو دیکھا تو وہ میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں عروہ بن مسعود کے بہت مشابہ ہیں۔ اور ابراہیم کو دیکھا تو میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں میرے مشابہ ہیں۔ اور میں نے جبرئیل کو دیکھا تو وہ دحیہ کے زیادہ مشابہ ہیں۔

تشریح ضرب من الرجال الخ۔ گوشت کی کمی زیادتی میں، دو آدمی کے درمیان والے شخص کو ضرب کہا جاتا ہے۔ قاضی عیاض نے کم گوشت اور ملا علی قاریؒ نے نوع من الرجال سے ترجمہ کیا ہے۔ قوله شبهاً الخ۔ بفتح الحین معنی، نظیر۔ عروہ بن مسعود بعض کا خیال ہے کہ یہ عبد اللہ بن مسعود کے بھائی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ عروہ ثقفی ہیں۔ اور عبد اللہ بن مسعود ہذلی ہیں۔

قوله قال مضطرب الخ۔ حبیثہ کے قائل عبد الرزاق ہیں، مضطرب جو بہت لائبہ نہ ہوں، بعض خفیف اللحم کا ترجمہ کرتے ہیں۔ ابن شہین نے دوسرے ترجمہ پر اعتراض کیا ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ صفت بخاری کی ذکر کردہ صفت ”انہ جسیم“ کے مغائر ہے۔ اس کا جواب بعض نے دیا ہے، کہ جسیم دجال کی صفت بتائی گئی ہے، قاضی عیاض کا خیال ہے کہ جنہوں نے ضرب کی صفت ذکر کی ہے، وہ مضطرب کے لفظ سے اصح ہے، کیونکہ اس میں شک ہے، جہاں موسیٰ علیہ السلام کی صفت میں جسیم کا لفظ آیا ہے، تو وہ ضرب کی بھی ضد ہوگا، تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے، کہ جسیم سے مراد زیادہ لمبائی کے ہیں، حافظ ابن حجرؒ کا خیال یہ ہے کہ قاضی عیاض نے جسیم کا ترجمہ، طول کی زیادتی سے کیا ہے، یہی رائے تسلیم کر لینا چاہئے، کیونکہ بعض روایت میں ”كانه من رجال الزط“ ہیں۔ اور زط کے لوگ بہت لائبہ نہیں ہوتے تھے اور بخاری میں بدء الوحي کے تحت (بخاری شریف ج ۱ ص ۵۹) اسروہ کی حدیث میں ”رأيت موسى جعد او طولا“ کے الفاظ ہیں۔ اگرچہ داؤد نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے، کہ یہ روایت غیر محفوظ معلوم ہوتی ہے، کیونکہ طویل کی صفت میں جعد نہیں لایا جاتا ہے، مگر داؤد نے اس نظریہ پر اعتراض کیا ہے، کہ ان دونوں میں منافات نہیں ہے۔ جعودہ کے معنی گٹھے بدن کے ہیں گھنگر بال کے نہیں۔

قوله رجل الرأس الخ۔ جیم مسور اور ساکن اور مفتوح تینوں طرح پڑھا جاتا ہے، اس سے مراد نہ بالکل گھنگریالے بال تھے، اور نہ بالکل سیدھے، بلکہ درمیانیاں تھیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جعودہ کو منبوطہ پر غالب مانا جائے، تاکہ جعد اولیٰ روایت کے مغائر نہ ہو (ملا علی قاریؒ) یا تو جعودہ کا تعلق بدن سے کیا جائے، نہ کہ بال سے۔

قوله فاذا ربعة احمر الخ۔ ربعة، راء مفتوح باء ساکن اور باء کا مفتوح بھی جائز ہے، متوسط القامة درمیانہ قد، ربعة کو نفس کی صفت بتایا جائے، عیسیٰ علیہ السلام کا رنگ یہاں سرخ اور دوسری روایت میں آدم بتایا گیا ہے، امام بخاری نے عبد اللہ بن عمرؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے، انہوں نے احمر کی روایت کا انکار کیا ہے، اور حرم کھا کر فرمایا احمر کا آنحضور ﷺ نے نہیں فرمایا، بلکہ راوی کو شبہ ہوا، اب یا تو احمر کو آدم کی تاویل میں رکھیں، اور مقصد یہ ہو کہ نہ بالکل اسمر تھے اور نہ بالکل احمر، بلکہ حرۃ کے قریب تھے۔

قوله: كانما خرج من ديماس الخ: دال مسور اور قاموس کے تصریح کی مطابق فتح بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ سرنگ، غسل خانہ، جوہری نے لکھا ہے کہ دیماس بفتح الدال کی جمع، زمانیں جیسے شیطان کی جمع، شیاطین اور کسرہ کی صورت میں دیماس جمع آئے گی، جیسے قیراط کی جمع قرار پاتی ہے۔

قوله: حَمَامًا الخ: یہ عبد الرزاق کی تفسیر ہے (قالہ الحافظ) جسم کی چمک، اور رنگ کی صفائی اور چہرے کی پانی کی کثرت کو تشبیہ دیا ہے دیماس سے یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرنگ سے نکلے ہوں، اور اسی کی وجہ سے چہرے پر پسینہ ہو، اور ابن عمر کی روایت میں ہے ”ینطف راسہ ماء“ اس کے حقیقی معنی بھی ہو سکتے ہیں، کہ ان کو اتنا پسینہ آ رہا تھا، جیسے لگ رہا تھا کہ غسل خانہ سے غسل کر کے نکلے ہوں اور اس کو چہرے کی رونق اور تازگی سے کنایہ مانا جاسکتا ہے، اور اس کی تائید، مسند احمد، ابو داؤد کی روایت کے الفاظ ”یقطر راسہ ماء وان لم یصبہ بلل“ سے ہوتی ہے۔

لو اخذت الخ: اسی شربت مقصد یہ ہے کہ اگر آپ کا میلان خاطر ذرا بھی شراب کی طرف ہوتا۔ غوت امتك الخ: یعنی اس قسم کی گمراہی جو شراب پینے سے ہوتی ہے مقصد یہ ہے کہ اگر آپ پے لیتے، تو آپ کی امت کے لئے حلال تو ہو جاتی، مگر اس کے نقصانات سے وہ دوچار ہوتی، اگرچہ آپ کی معصومیت کی وجہ سے آپ پر کوئی برا اثر نہ پڑتا۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام و پیشوا کی اچھائی برائی کا اثر قہرین پر پڑتا ہے، کیونکہ مقتدی کی حیثیت قلب کی ہوتی ہے، اور مقتدی کی حیثیت اعضاء کی ہوتی ہے۔ چونکہ آپ کو یاس کا احساس تھا اس لئے دو وہ شہد سے بھی زیادہ موزوں ہے، اسی لئے آپ نے شہد کو بھی نہیں لیا۔

قوله ارانى ليلة الخ: مضارع کا صیغہ حکایت حال ماضی۔

قوله لمة: وہ بال جو کان کے نو سے نیچے آگیا ہو اور جب موڑے پر لٹک آئے تو جھٹکے اور جب دونوں کے درمیان ہو تو وفرد۔

رَجَلها: بالوں میں کنگھا کرنا۔

قَطَط: بفتح القاف والطاء اور طاء کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے، سخت گھنگروالے۔ انسان کی صفت جعدہ مت کی غرض سے لایا جاتا ہے، کہا جاتا ہے ”جعد الیدین وجعد الاصابع“ یعنی پخیل شخص اور جب بال کی صفت میں لایا جائے تو مدح و ذم کے دونوں پہلو ہو سکتے ہیں۔

كانها عينيه طافية: طافیہ بغیر ہمزہ روایت میں طافیہ کو یحییٰ کے ساتھ مقید کیا ہے اور عبد اللہ بن مغفل سرہ اور ابو بکرہ کی روایت میں تصریح ہے کہ ”ان عينه اليسرى مسحوة“ طافیہ ابھری ہوئی۔ طافیہ میں ہمزہ اور بغیر ہمزہ، دونوں جائز سمجھنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ دونوں کے معنی میں تضاد ہے قاضی عیاض کہتے ہیں، کہ اکثر لوگوں سے روایت بغیر ہمزہ کے ہے، اور اسی کو جمہور نے ترجیح دی ہے، طافیہ یطفو بلا ہمزہ علو اور بلندی کے معنی میں ہے۔

دجال کو مسیح کہنے کی وجہ

قوله فقیل هذا المسيح الدجال الخ: علامہ تور پشٹی کہتے ہیں کہ مسیح کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ خیر اس سے دور

کر لیا گیا ہے اس لئے وہ اسی طرح مسج ضلالت ہے جیسے عیسیٰ علیہ السلام سے شر کو دور کر لیا گیا تو مسیح ہدایت ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہنے کی یہ وجہ بھی بتلائی جاتی ہے کہ جس پیار پر اپنا ہاتھ پھیر دیتے تھے، وہ اچھا چکا ہو جاتا تھا یا اس لئے کہ ان کے قدم کے نچلے حصہ میں گہرائی نہیں تھی، یا اس لئے کہ بطن مادر سے، صاف ستھرے پیدا ہوئے تھے، بدن پر کسی طرح کی آلائش نہیں تھی، یا اس لئے کہ زمین کو طے کرتے تھے، اور بعضوں نے مسیح صدیق بھی کہا ہے۔ اور دجال کو مسیح کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اس کی ایک آنکھ برابر ہے، اس سے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا، اعمور کو مسیح کہا جاتا ہے، یا اس لئے کہ چند دنوں میں پوری زمین کو طے کر لے گا، سوائے حرمین شریفین کے، اس صورت میں فعلی بمعنی قائل ہو گا، اس کی صفت میں دجال اس لئے ناساتے ہیں، کہ عیسیٰ علیہ السلام سے امتیاز ہے، حضرت ثعلب کا خیال ہے کہ دجال سے اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ زمین کو وہ طے کرے گا، دجل سے وہ ماخوذ ہے۔ یا طمع سازی کی وجہ سے دجل بمعنی موبہ بھی آتا ہے۔

قوله واضعاً یدیه علی منکبئہ رجلین الخ: رجلین سے مراد ان کے وہ معاون جو ان کی ہر باطل بات کے حامی ہوں گے، جس طرح عیسیٰ کے رجلین سے مراد ان کے معاون جو ان کی ہر بات کی حمایت کریں گے۔

### دجال کا طواف کعبہ

قوله یطوف بالبعیت الخ: ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اس سے یہ بتانا ہے کہ بیت اللہ شریف سے کسی کو استغناء نہیں ہے اور بغیر اس دربار کے کوئی غرض پوری نہیں ہو سکتی، اسی لئے کفار بھی جاہلیت اور بعثت کے چند سالوں تک پابندی سے طواف بیت اللہ کرتے تھے، اور اب بھی یہود و نصاریٰ بیت اللہ کے طواف، اور اس کے دیدار کو ترستے ہیں۔ (مرقات ۱۰)

اشکال یہ ہے کہ دجال کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا، اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، حالانکہ روایت میں تصریح ہے کہ دجال عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی نمک کی طرح پگھلے گا۔ جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے یہ واقعہ خواب میں دیکھا، اگرچہ انبیاء کا خواب وحی کی حیثیت رکھتا ہے مگر بہر حال خواب محتاج تعبیر ہے۔

علامہ تورپشتیؒ نے فرمایا ہے، کہ دجال کا طواف کرنا، جبکہ وہ کافر ہے اس کی تاویل یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کا یہ خواب مکاشفات میں سے ہے، آپؐ کو یہ منکشف کرایا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام دین کے آس پاس گھوم رہے ہیں، اقامت دین کے لئے، اور فساد کی اصلاح کے لئے، اور دجال کے بارے میں یہ منکشف کیا گیا کہ دین کو مسخ کرنے کی کوشش میں چکر لگا رہا ہے۔ ربایہ سوال کہ دجال مکہ میں کیسے داخل ہوا جواب یہ ہے کہ اس کا داخلہ اس وقت ممنوع ہو گا، جب وہ خروج کرے گا۔

حدثنا قتیبہ بن سعید..... عن جابر بن عبد اللہ ان رسول اللہ ﷺ قال لما کذبتنی

فریش قمت فی الحجر فجلی اللہ لی بیت المقدس فطفت لخبیرہم عن آیاتہ وانا انظرہ۔

حضرت جابر سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جب مجھ کو قریش نے جھٹلایا، تو میں عظیم میں کھڑا ہو گیا، تو حق تعالیٰ نے میرے لئے بیت المقدس کو ظاہر کر دیا، میں اس کو دیکھ کر اس کی ساری علامتیں بتا رہا۔

ترجمہ

کیا حقیقتہً بیت المقدس سامنے لایا گیا تھا؟

حجر عظیم کو کہتے ہیں۔ قوله فجلی اللہ بیت المقدس الخ: جلی بتشدید اللام تجلیہ سے بمعنی اظہر کشف کے ہیں،

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور بیت المقدس کے درمیان، حجابات کو ہٹا دیئے، اور میں وہیں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ عبد اللہ بن فضل کی روایت بحوالہ ام سلمہ مسلم شریف میں ہے، کہ قریش نے بیت المقدس کے متعلق کچھ باتیں مجھ سے دریافت کیں، مجھے وہ چیزیں محفوظ نہیں تھیں، تو اتنی پریشانی لاحق ہوئی کہ اتنی کبھی لاحق نہیں ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے بیت المقدس کو اٹھا کر میری نظروں کے سامنے کر دیا، اور پھر میں ان کی ہر باتوں کا جواب دیتا رہا۔ اس کی ایک توجیہ یہ بھی کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حقیقتہً بیت المقدس کو اٹھا کر ایسی جگہ رکھ دیا جس کو میں دیکھ دیکھ کر ان کے سوالات کا جوابات دیتا تھا، اور پھر اس کو اٹھا کر اپنی جگہ رکھ دیا گیا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت کے الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے، الفاظ یہ ہیں ”فجئنی بالمسجد وانا انظر الیہ حتی وضع عند دار عقیل فنعته وانا انظر الیہ الخ“ اگر ایسی صورت ہوئی ہو تو یہ اعلیٰ درجہ کا معجزہ ہو اور ایسا ہونا کوئی محال بھی نہیں ہے، جب ایک انسان ٹپک جھپکتے، پلٹتے کے تحت کو لا سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کیا کمی ہے، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی شبیہ اور تصویر آپ کی نگاہوں کے سامنے لائی گئی ہو، اور اس کی مثال آج کل ٹیلی ویژن ہے، جس میں آواز کیساتھ تصویر بھی نظر آ جاتی ہے۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے الفاظ سے اسی کی تائید ہوتی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں ”فخیل لى بیت المقدس فطففت اخبرهم عن آیاتہ الخ“ اگر فحلی سے خیال کو نہ بدلا ہو، بلکہ حضور ﷺ ہی کے الفاظ ہوں، تو اس کی نظیر ”أريت الجنة والنار“ ہے کہ جدار قبلہ میں جنت و جہنم کی شبیہ دکھائی گئی، اس صورت میں جئى بالمسجد کے معنی جئى بمثالہ کے ہوں گے۔

ایک بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ مشرکین کا آپ سے بیت المقدس کے متعلق تفصیلات دریافت کرنا، اتنا مہمل اور لغو ہے کہ اس کے جواب کی بھی ضرورت نہ تھی، کیونکہ آپ نے دعویٰ کیا تھا، کہ میری اندھیری رات میں معراج ہوئی، نیز ایسی تیز رفتار سواری سے گیا جس کا قدم منجائے نظر پر پڑتا تھا۔ اسی طرح آپ نے یہ بھی فرمایا تھا، کہ میں بیت المقدس میں صرف اتنی دیر ٹھہرا کہ صرف دو رکعت نماز پڑھ کر آسمان پر چلا گیا، خود ہی بتاؤ کہ اندھیری رات کے مسافر کو راستے کی چیزوں کا کیا علم؟ خصوصاً جبکہ ایسی تیز رفتار سواری، اور پھر اتنا مختصر قیام، یہ سوالات انتہائی مہمل تھے، مگر اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو دشمنوں کے سامنے سرفراز ہی رکھتے ہیں، ایسا موقع ہی نہیں دیا جاتا جس سے شکست کی صورت ہی نظر آ سکے۔

### کفار کے سامنے واقعہ معراج کا تذکرہ اور ان کا برتاؤ

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب آپ معراج سے واپس آئے اور چاہا کہ قدرت الہی کا اظہار ہو تو ارادہ ہوا کہ اپنی قوم کو اطلاع دوں، تو حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے آپ کی چادر پکڑ لی، اور کہا کہ بھائی تم کو قسم ہے خدا کی، قریش سے اس کا تذکرہ نہ کرنا، ورنہ جو تم کو سچا سمجھتے ہیں وہ بھی تم کو جھوٹا کہنے لگیں گے، آپ نے چادر کو ہاتھ مار کر ام ہانی سے چھڑا لیا، ام ہانی کہتی ہیں کہ اس وقت آپ کے قلب کے پاس ایک نور چمکا، جس سے میری آنکھ خیرہ ہو گئی، اور میں سجدہ میں گر گئی۔ جب سر اٹھایا تو آپ باہر جا چکے تھے، تب میں نے اپنی حبشیہ کنیز سے کہا، کہ آپ کے پیچھے جا اور دیکھ کہ کیا فرماتے ہیں، اس نے واپس آ کر مجھے خبر دی، کہ جب آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو سمجھا کہ لوگ جھٹلائیں گے، اس لئے غمگین ہو کر بیٹھ گئے۔ دشمن خدا ابو جہل کا آپ پر گذر

ہوا، اور اس نے مذاق کے طور پر پوچھا، کہ کبوچکھ اور بھی حاصل ہوا؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! آج رات مجھے سیر کرائی گئی انہوں نے کہا کہاں تک گئے؟ آپؐ نے فرمایا یہ، المقدس تک۔ ابو جہل بولا اور پھر صبح ہوئی تو ہم ہی میں موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں ابو جہل نے سوچا، کہ کہیں آپؐ انکار نہ کر جائیں اعتراض نہیں کیا اور کہا کہ اپنی قوم سے بھی قصہ اسی طرح نقل کر دو گے، جس طرح مجھ سے نقل کیا ہے، آپؐ نے فرمایا ضرور تب ابو جہل نے آواز دی کہ اے گروہ بنی کعب بن لوی، انہوں اس پر لوگ اپنی مجلسوں سے اٹھ کر اصر آئے اور آپؐ کے پاس بیٹھ گئے، ابو جہل نے کہا کہ محمدؐ اپنی قوم سے بیان کرو جو مجھ سے بیان کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں مجھے آج رات سیر کرائی گئی، انہوں نے پوچھا کہاں تک کی؟ آپؐ نے فرمایا بیت المقدس تک کی، کہ گروہ انبیاء میرے لئے جن میں ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ بھی تھے، اور میں نے ان کو نماز پڑھا لی۔ اور ان سے باتیں کیں، ابو جہل نے مذاق سے کہا، کہ ان نبیوں کا حلیہ تو مجھ سے بیان کرو۔ آپؐ نے فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام مینہ قدس کچھ زیادہ اور لمبے قد سے کچھ کم تھے، کہ سرخی ان پر دھکتی تھی، گویا ان کی داڑھی سے موتی جھڑتے ہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام گٹھے ہوئے بدن کے گندم گوں لمبے قد ہیں، جیسے قبیلہ شذوۃ کے شخص۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام واللہ صورت اور سیرت میں میرے ساتھ زیادہ مشابہ تھے۔ اس پر لوگوں نے یہ سن کر شور مچایا، اور معراج کو ناممکن سمجھا، کوئی تالیاں بجانے لگا، اور کوئی تعجب سے اپنے سب پر ہاتھ رکھنے لگا، مطعم بن عدی نے کہا، کہ آج سے پہلے تمہارا معاملہ تو آسان بھی تھا، مگر آج کی بات تو خود گواہی دے رہی ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ (عیاذ باللہ) ہم تو اونٹوں کے جگر پھاڑ کر بیت المقدس تک پہنچیں کہ ایک مہینہ میں آنا اور ایک مہینہ میں یہ پہنچنا اور تم کہتے ہو کہ ایک رات میں وہاں سے ہو آیا قسم ہے لات وعزیٰ کی، کہ میں تمہیں سچا نہیں سمجھ سکتا، اور ایسا ہرگز نہیں ہوا، جیسا تم کہتے ہو، نیز بعض وہ لوگ بھی جو مسلمان ہو گئے تھے، مرتد ہو گئے، اور چند کفار نے ابو بکر کے پاس آکر کہا کہ میاں اپنے رفیق کی بھنی سنی، کہ آج رات ان کو بیت المقدس تک سیر کرائی گئی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا وہ ایسا فرماتے ہیں۔ لوگوں نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا اگر انہوں نے یہ کہا، تو ضرور سچ کہا ہے۔ لوگوں نے کہا، کیا اس میں بھی تم اس کو سچا سمجھتے ہو؟ کہ بیت المقدس تک گئے، اور صبح ہونے سے پہلے چلے بھی آئے، آپؐ نے فرمایا کہ ہاں میں تو ان کو اس بات میں بھی سچا سمجھتا ہوں جو اس سے زیادہ مستبعد ہو۔ (یعنی ایک اولیٰ وقت صبح اور اولیٰ وقت شام میں آسمان کی خبر کا وہ اظہار کرتے ہیں، اور ان کو سچا کہتے ہوں) اسی بناء پر ابو بکر کا نام صدیق رکھا گیا، لوگوں میں ایسے بھی تھے جو مسجد اقصیٰ ہو آئے تھے، انہوں نے کہا کہ ہم سے مسجد کی کیفیت نقل کر سکتے ہو، آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! اس کے بعد آپؐ نے مسجد کی کیفیت بیان کرنی شروع کر دی، اور پھر اشتباہ ہوا تو مسجد اقصیٰ کر آپؐ کے سامنے لائی گئی، یہاں تک کہ عقیل کے مکان کے پاس رکھ دی گئی۔ آپؐ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اس کی طرف دیکھتا اور اس کا نقشہ بیان کرتا جاتا تھا۔ تب اہل مکہ نے کہا، کہ واللہ مسجد اقصیٰ کی کیفیت ٹھیک بیان کی۔ اور پھر کہا، کہ اے محمد ہمارے قافلہ کی ہمیں اطلاع دو، کہ زیادہ فکر ہمیں اسی کی ہے، ایامان میں بھی کسی سے تم ملے تھے، آپؐ نے فرمایا ہاں، فلاں قافلہ پر ہو کر گذرنا تھا، اور وہ مقام روحہ میں تھا۔ ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا اور وہ اس کی تلاش میں تھے۔ نیز ان کے کجاہوں میں پانی کا ایک پیالہ تھا، کہ مجھے پیاس لگی اور میں نے پی کر اس کو رکھ دیا، جیسا کہ رکھا تھا۔ جب وہ واپس آویں تو ان سے پوچھنا کہ پیالہ میں ان کو پانی ملا تھا یا نہیں؟ وہ بوسے کہ بہتر ہے یہ ایک علامت ہوئی۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اور فلاں فلاں وہ شخصوں پر بھی میرا گذر ہوا، جو

مقام زیر میں اپنے لوٹ پر سوار تھے، اور ان کا اونٹ مجھ سے بدکا، اور فلاں شخص کو گرا دیا، کہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا، ان سے بھی پوچھا، کہ یہ واقعہ سچا ہے، یا غلط۔ اہل مکہ نے کہا بہتر ہے یہ دوسری علامت ہوئی، پھر کہنے لگے کہ ہم کو تو ہمارے مالی قافلہ کی خبر سنا، آپ نے فرمایا کہ اس کی طرف میں نے توجہ نہیں کی۔ آخر وہ قافلہ مع ساز و سامان، اور آدمیوں کے متشکل ہو کر، آپ کے سامنے لا کھڑا کیا گیا، جو کہ اس وقت ضرورہ میں تھا، اس کو دیکھ کر آپ نے بیان فرمایا کہ ان کی ہیئت یہ ہے، اور اس میں فلاں فلاں شخص ہیں قافلے کے آگے آگے ہیں خاکی رنگ کا اونٹ ہے، جس پر سارے ہوئے دو پورے ہیں، طلوع آفتاب کے وقت وہ تم کو نظر آجائیں گے۔ انہوں نے کہا، بہتر ہے۔ یہ تیسری علامت ہوئی، اور اس کے بعد دوڑے ہوئے ہنسی کی طرف چلے، اور کہتے جاتے تھے، کہ واللہ محمد نے تو بات مفصل بیان کی، آخر کدہ تک آئے، اور اس پر بیٹھ کر دیکھنے لگے کہ کب آفتاب طلوع ہو، اور کب آنحضرت ﷺ کو جھٹلائیں، دفعہ ایک آواز آئی کہ یہ سورج نمودار ہوا، مگر اس کے ساتھ ہی دوسری آواز آئی، اور یہ قافلہ نمودار ہوا کہ آگے خاکی اونٹ ہے، اور فلاں فلاں اس میں موجود ہیں۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا (فتح الباری ج ۸ ص ۳۹۳) اس کے باوجود قریش ایمان نہ لائے، اور کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ”وما جعلنا الرزق الا فتنة للناس الا فتنة للنفاس الآیة الخ“ اس تفصیلی واقعہ سے معراج منائی کی تردید اور بیدار کی پوری تائید ہوتی ہے۔

قوله فطفقت الخ: فاء مسکور بمعنی شریعت۔

قوله اخبرهم عن آیاته الخ: مکہ سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے آسمان پر پہنچانے کی حکمت بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر مکہ سے سیدھا آسمان لے جایا جاتا، تو مشرکین کو خاموش کرنے، اور اس کو زیر کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، کیونکہ آخرت کے حالات سے مشرکین واقف نہ تھے، اور بیت المقدس کے حالات سے واقف تھے، جب آپ نے بیت المقدس کے نشانات صحیح بتا دیئے، تو ان کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کو تو آپ نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا اور جب واقعہ کا یہ حصہ صحیح مان لیا، تو پھر معراج کی تصدیق تو خود بخود ہو جاتی ہے، کیونکہ ایک ہی سفر کے دونوں واقعات ہیں۔

قوله فحانت الصلوة الخ: نماز کا وقت آگیا ممکن ہے کہ یہ نماز تحیہ الصلوٰۃ ہو، یا صلوٰۃ المعراج جو مخصوص ہے آپ کیساتھ (مرقات) پہلی میں ابوسعید خدری کے روایت کے الفاظ ہیں ”حتی اتیت بیت المقدس فصلی کل واحد منا رکعتین“ ایک اور روایت میں عبد اللہ بن مسعود سے آتی اور زیادتی ہے ”ثم دخلت المسجد فعرفت النبیین من بین قائم ورائع وساجد ثم اقيمت الصلوة فامستهم“

حدثنا احمد بن حنبل وسريج بن يونس..... عن ابن عباس ان النبي صلى الله عليه وسلم مرَّ بوادى الازرق فقال أيُّ وادٍ هذا فقالوا هذا وادى الازرق قال كلاني انظر الى موسى هابطاً من الثنية وله جوار الى الله بالتلبية ثم اتى على ثنية هرشى فقال اي ثنية هذه قالوا ثنية هرشى قال كلاني انظر الى يونس بن متى على ناقه حمراء جعدة عليه جبة من صوف خطام ناقته خلبة وهو يلبي قال ابن حنبل في حديثه قال هيشم يعني ليفا.



## ترجمہ

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ کا گذر، وادیِ ازرق سے ہوا، تو آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ کونسی وادی ہے؟ تو بتایا کہ یہ وادی ازرق ہے، آپؐ نے فرمایا کہ میں ایسا محسوس کر رہا تھا، کہ گویا موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ کے بلند راستے سے اترتا ہوا دیکھ رہا ہوں، اور تلبیہ زور سے پڑھ رہے تھے، پھر ”ثنیہ ہر شا“ پر آئے تو آپؐ نے دریافت کیا، یہ کونسا ثنیہ ہے، تو بتایا کہ ثنیہ ہر شا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، کہ گویا یونس بن متی کو دیکھ رہا ہوں، جو سرخ اونٹنی پر سوار ہیں، بدن ان کا گٹھا ہوا، بدن پر اون کا جبہ ہے اور ان کے اونٹنی کی تکمیل، کھجور کے چھال کی جی ہوئی رسی کی ہے اور وہ تلبیہ پڑھ رہے تھے۔

## شرح حدیث

قوله مر یواد الازرق الخ: حرمین کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، اور بعض کا خیال ہے کہ یہ وادی کسی شخص کی طرف منسوب ہے، حافظ ابن حجر کی تحقیق یہ ہے کہ وادی ازرق مقام الحج کے پیچھے ہے، الحج اور مکہ مکرمہ کے درمیان، صرف ایک میل کا فاصلہ ہے، امیج (میم اور جیم دونوں مفتوح) ایک قریہ کا نام ہے جہاں کاشت کی زمین ہے۔

قوله جؤ ارالی اللہ الخ: جو ار بضم الیم بعد ہمزہ، اور کبھی ہمزہ کو دو سے بدل دیا جاتا ہے، تفسیر و زاری کے معنی میں ہے، تفسیر و زاری کیسا تھوڑا وار بلند کرنے میں کوئی منافات نہیں ہے۔

قوله علی ثنیہ ہر شا الخ: ثنیہ مفتوح اور تون مکسور مشدود گھائی کو کہتے ہیں ایک اونچا راستہ، پہاڑ میں یاد و پہاڑوں کے درمیان کے اونچے راستے کو کہتے ہیں۔ ہر شا، ہوا، را، شین، اور اس کے بعد الف مقصورہ شام اور مدینہ کے راستے پر، جتہ کے قریب ایک مقام کا نام ہے۔

قوله علی ناقة حمراء الخ: جعدہ گٹھا ہوا جسم،

قوله حبة من صوف: تواضع اور زہد کا لباس، صوفیہ کے سادہ لباس کا ماخذ، اسی قسم کی روایت ہے، سلا ہوا کپڑا احرام کی حالت میں استعمال کرنے کی وجہ، یا تو یہ ہوتی ہے، کہ چادر کی طرح سے اوڑھ لیا ہو، یا یونس علیہ السلام کی شریعت میں سلعے ہوئے کپڑے کا استعمال حرم کے لئے جائز ہو گا۔

قوله خطام ناقتہ الخ: خطام تکمیل، یعنی وہ رسی جس کو پکڑ کر اونٹ کو کھینچا جائے، خطم ناک اور منہ کے ابتدائی حصہ کو کہا جاتا ہے۔

قوله خلبة الخ: کھجور کی چھال، خلم مضموم، لام ساکن اور مضموم دونوں طرح سے پڑھا جاتا ہے،

قوله وهو یلبی الخ: وفات کے بعد تلبیہ اور حج کے اشکال کا جواب پیچھے گزر چکا ہے، ایک جواب اس کا یہ بھی ہے کہ آنحضور ﷺ کو ان کی زندگی کی حالت کا مشاہدہ کر لیا گیا ہو، تاکہ آپؐ کو علم ہو جائے کہ وہ حج کس طرح کرتے تھے، اور تلبیہ کس طرح پڑھتے تھے، اسی لئے روایت میں ”کأنی انظر الی موسیٰ، وكأنی انظر الی یونس“ کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک جواب یہ بھی ہے کہ ممکن ہے کہ آپؐ کو بذریعہ وحی ان کے اعمال کی خبر دی گئی ہو، اسی لئے روایت میں ”کأنی حرف تشبیہ داخل کیا گیا۔“

### حیاتِ انبیاء پر شواہد

امام بخاریؒ نے حیاتِ انبیاء پر بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے، اور اس میں حضرت انسؓ کی روایت، "الانبياء احياء في قبورهم يصلون" کو ذکر کیا ہے، روایت کی توثیق، امام احمدؒ اور ابن حبانؒ نے کی ہے، اس کے اور بھی شواہد ہیں۔ جس سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے، مثلاً ابو داؤد میں روایت ہے "صلو علی فان صلواتکم تبلیغنی حیث ما کنتم" ایک اور روایت ہے "من صلی عند قبری سمعته ومن صلی نائياً بلغته" ایک اور روایت میں ہے "فلم ابعث الا یسیراً حتی اجتمع الناس کثیر ثم اذن مؤذن فاقیمت الصلوة فقمنا صفوفاً ننظر من یؤمنا فاخذ بیدی جبرئیل فقدمنی فصلیت بهم وعن انس۔ ابن ابی حاتم"

مسند احمد میں عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں "فلما اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم المسجد الاقصی قام یصلی فاذا النبیون اجمعون یصلون معہ" اسی طرح مسند احمد بن عمر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں "انه مما دخل بیت المقدس قال اصلی حیث صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتقدم الی القبلة فصلی" راجع قول یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز، معراج میں جانے سے پہلے ہوئی، پہلے ان لوگوں کے ساتھ نماز ادا کی گئی، اس کے بعد آسمان پر لے جائے گئے۔ اگرچہ بعض لوگ واپسی پر نماز کے قائل ہیں مگر یہ قول مرجوح ہے۔ (تحقیق النبی)

قوله قال قائل یا محمد هذا مالک النار فسلم علیہ فالتفت الیہ فبدأ فی السلام الخ: سلام میں سبقت آپ کے اعزاز و اکرام میں تھا، یا ہشت دور کرنے کے لئے۔

قوله الیہا ینتہی ما یرج الخ: سدرۃ المنتہی کی درجہ تسمیہ خود اس روایت میں ہے، کہ اعمال و ارواح وہیں تک لے جائے جاتے ہیں۔ اور پھر اوپر سے اٹھائے جاتے ہیں، سدرۃ المنتہی سے آگے کسی کی رسائی نہیں۔

### کیا سورہ بقرہ کی آخری آیت معراج میں دی گئی؟

قوله فاعطی الیہا ینتہی ما یرج الخ: اس سے اعطاء مضاف میں مراد ہے ورنہ تو سورہ بقرہ مدینہ میں اتری، اور معراج مکہ میں ہوئی۔ ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے، کہ سورہ بقرہ کا یہ آخری حصہ لیلۃ المعراج میں بر لہر است، عنایت ہوا، اور پھر بواسطہ جبرئیل مدینہ میں اترا، تو اس کو مصاحف میں لکھا گیا۔ (لمعات)

یہ توجیہ بہر حال کرتی ہی ہوگی ورنہ تو حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کا کوئی معنی نہیں ہوگا، جو باب تجلوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس والخواطر بالقلب اذا لم تستقر کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے، اس باب کو بھی اس جگہ ملاحظہ کر لینا چاہئے۔

علامہ سندھیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ خواتیم سورہ بقرہ کے دیئے جانے کا حتمی وعدہ لیلۃ المعراج میں ہوا، کہ یہ حصہ عنقریب آپؐ پر نازل ہوگا، اس لئے مطلقاً دئے جانے کی نسبت معراج کی طرف کر دی گئی۔

قوله المقحّمات الخ: بکسر الحاء، مراد اس سے گناہ کبائر ہیں۔ جس کا عذاب دو بال، مرتکب کو ہلاک کرنے والا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی نہ ہو۔

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا، کہ مغفرت سے مراد یہ ہے کہ غلویٰ انار سے نجات مل جائیگی، یہ مطلب نہیں ہے کہ اس امت کو بالکل عذاب نہ ہوگا، کیونکہ مرتکب کبیرہ کے عذاب پر اجماع ہے۔ سوال یہ ہوگا کہ پھر اس میں، امت محمدیہ کی خصوصیت ہی کیا رہی؟ یہ تو ہر امت کیساتھ ہوگا۔

تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اس امت کے اکثر و بیشتر کیساتھ مغفرت کا معاملہ ہوگا، کیونکہ یہ امت امت مرحومہ ہے۔

حدثنا زهير بن حرب..... عن مسروق عن عائشة قال كنت متكئة عند عائشة رضي الله عنها فقالت يا ابا عائشة ثلاث من تكلم بواحدة منهن فقد اعظم على الله الفرية قلت ما هن قالت من زعم ان محمداً راي ربه فقد اعظم على الله الفرية قال وكنت متكئة فجلست فقلت يا ام المؤمنين انظروني ولا تعجليني ايم يقل الله تعالى ولقد راه بالافق المبين ولقد راه نزلة اخرى فقالت انا اول هذه الامة سأل عن ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال انما هو جبرئيل عليه السلام لم اره على صورته التي خلق عليها غير هاتين المرتين رأيته منهبطاً من السماء ساداً عظم خلقه ما بين السماء الى الارض فقالت اولم تسمع ان الله عزوجل يقول لا تدركه الابصار وهو يدرك الابصار وهو اللطيف الخبير، او لم تسمع ان الله يقول وما كان لبشر ان يكلمه الله الا وحياً او من وراء حجاب او يرسل رسولا الى قوله على حكيم قالت ومن زعم ان رسول الله ﷺ، كتم شيئاً من كتاب الله فقد اعظم على الله الفرية والله يقول يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته قالت ومن زعم انه يخبر بما يكون في غد فقد اعظم على الله الفرية والله يقول قل لا يعلم من في السموات والارض الغيب الا الله.

وفى رواية آخر وزاد قالت ولو كان محمداً كتما شيئاً مما انزل عليه لكتتم هذه الآية واذ تقول للذي انعم الله عليه وانعمت عليه امسك عليك زوجك واتق الله وتخفى في نفسك ما الله مبديه وتخشى الناس والله احق ان تخشاه. (۱)

ترجمہ | مسروق حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا، اس نے میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا، اے ابو عائشہ (کنیت مسروق) تین باتوں میں کوئی بات بھی کسی کی زبان سے نکل جائے، تو اس نے اللہ پر بہتان تراشی کی، میں نے عرض کیا وہ تین باتیں کیا ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا، کہ جن کا یہ خیال ہو، کہ محمدؐ نے اپنے رب کو دیکھا، تو اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا، مسروق کہتے ہیں کہ میں ٹیک لگائے ہوا تھا تو (یہ سن کر) بیٹھ گیا، میں نے کہا اے ام المؤمنینؓ ذرا توقف کیجئے، اور جلدی نہ کیجئے، کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے ”ولقد راه بالافق المبين ولقد راه نزلة اخرى“ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، کہ میں اس امت کا پہلا انسان ہوں جس نے آنحضور ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا، تو آپؐ نے فرمایا، کہ وہ جبرئیل ہیں، میں نے ان کی اصلی صورت کو دودھ

کے علاوہ نہیں دیکھا، میں نے ان کو پورے اترتے ہوئے دیکھا، کہ ان کا عظیم چشم آسمان وزمین کے درمیان کو گھیرے ہوئے ہے، انہوں نے فرمایا کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا قول نہیں سنا، جس میں فرماتے ہیں کہ اس کو کوئی آنکھ پورے طور پر نہیں دیکھ سکتی، اور وہ سب آنکھوں کو پورے طور پر دیکھتے ہیں۔ اور وہ لطیف و خبیر ہیں، اور کیا تم نے نہیں سنا، کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وحی کے سوا کسی انسان میں اس سے بات کرنے کی طاقت نہیں، یا پس پردہ بات کر سکتے ہیں، یا رسول کو بھیج کر بات کر لیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جن کا یہ خیال ہو کہ قرآنی آیات میں سے کسی آیت کو آپ نے چھاپا، تو اس نے اللہ پر بڑا بہتان تراشا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے رسول آپ ان تمام آیات کو، جو نچادیں جو آپ پر اتاری گئیں، اور اگر آپ نے یہ کام انجام نہیں دیا، تو آپ نے اپنی رسالت کا فریضہ انجام نہیں دیا، حضرت عائشہ نے فرمایا، اور جن کا یہ خیال ہو کہ آپ کھل آئندہ بات کی خبر دیا کرتے تھے (غیب) تو اللہ پر زبردست بہتان تراشا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دیتے کہ آسمان وزمین کے رہنے والے میں سوائے اللہ کے کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا، دوسری روایت میں ہے کہ اگر محمد کو کچھ چھپانا ہی ہوتا تو اس آیت کو چھپاتے "واذ تقول للذي اٰلٰى ان تخشاه الخ"

سردق کے والد کا نام اجدع تھا، سردق اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے بچنے میں ان کو کسی نے چڑایا تھا اور پھر بعد میں ملے تھے۔

تشریح

الفريفة: وہ جھوٹ جس میں کوئی شبہ نہ ہو۔ علامہ سندھی فرماتے ہیں کہ "فقد اعظم على الله" میں اللہ سے پہلے مضاف محذوف ہے، یعنی اعظم على رسول الله،

قوله انما رسول هو جبرئيل الخ: امام نووی فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے کسی حدیث مرفوعہ کے ذریعہ روایت کی نفی نہیں کی، اگر ان کے پاس اس سلسلہ میں کوئی حدیث مرفوعہ ہوتی تو ضرور اس کا تذکرہ فرماتیں، صرف انہوں نے آیت کے ظاہر سے استنباط کیا ہے۔

حافظ بن حجر لکھتے ہیں (فتح البدر ج ۸ ص ۶۰۸) امام نوویؒ نے ابن خزیمہ کی پیروی کی ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی صحیح ابن خزیمہ کی کتاب التوحید میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی نفی سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ان کو عدم روایت کا علم تھا، اگر ایسا ہوتا تو ضرور حدیث مرفوعہ حوالہ میں پیش فرماتیں، کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کو نہیں دیکھا، وہ تو صرف آیت میں بتویل کرتی ہیں، حافظ فرماتے ہیں کہ یہ بڑی تعجب خیز بات ہے، حالانکہ حدیث مرفوعہ صحیح مسلم میں موجود ہے۔ غالباً اس سے حافظ کی مراد "قالت انا اول هذه الامة سأل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم" ہے۔

علامہ زر قانی نے امام نوویؒ کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ، مسلم میں یہ کہاں تصریح ہے کہ حضورؐ نے اپنے بارے میں روایت باری کا انکار کیا ہے مسلم میں اتنی بات ہے کہ مخالف کی اس دلیل کو، کمزور کیا ہے کہ راہ میں ضمیر کا مرجع اللہ ہے، اور آنحضور ﷺ کے حوالہ سے ذکر مرجع جبرئیل کو بتایا، اس لئے حضور ﷺ کی اس تصریح کے بعد، اب اس کے خلاف کا اعتبار نہیں ہوگا، لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ حضور ﷺ کو خدا کا دیدار نہیں ہوا، خلاصہ کلام یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس آیت سے روایت باری کا ثبوت نہیں ملتا، لیکن دوسری صحیح روایت سے تو روایت کا ثبوت ملتا ہے، انہیں

دوسرے نصوص سے رویت کو ثابت کیا جائے گا، لہذا حافظ کلام نووی پر تعجب بیجا ہے۔

قوله غير هاتين المرتين الخ: ایک بار اجیاد نہیں دیکھا، ایک بار آسمان پر، سدرۃ المنتهی کے پاس۔

قوله ساد اعظم الخ: عظیم کو دو طرح پڑھا جاسکتا ہے، بضم العین و سکون الظاء، اور دوسرا بکسر العین اور بفتح الظاء دونوں طرح صحیح ہے۔

قوله اولم تسمع ان الله يقول لا تدركه الابصار الخ: جیسا کہ با قبل میں گذرا، کہ عبد اللہ بن عباس نے حضرت عائشہؓ کے اس استدلال پر اختلاف کیا ہے، ابن عباسؓ کی رائے یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ اپنا دو نور ظاہر فرمائیں جس کے دیکھنے کی بندوں میں تاب نہیں، تو اس وقت رویت ناممکن ہے، یہی مطلب ہے ”لا تدركه الابصار“ کا اور جب ایسی تجلی فرمائیں، جس کو آنکھ دیکھنے کی تاب لاسکے، تو پھر رویت ہوگی۔ جیسے اہل جنت کو دیدار ہوگا، صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ ”نور انی اراہ“ اور ”نورانی اراہ“ کو اسی دو حال پر محمول کیا جاسکتا ہے، پہلی صورت کو تاب لانیوالی تجلی پر، اور دوسری صورت کو تاب نہ لانے والی تجلی پر۔

نورانی کی تنوین تعظیم اور نوعیت کا مان لیں، پہلی صورت میں تنوین تعظیم کے لئے، اور دوسری صورت میں تنوین کے لئے، یعنی ایک خاص قسم کا نور دیکھا، اور وہ تاب لانے والا۔

قوله لا تدركه الابصار الخ: الف لام عہدی ہے، مراد اس سے کفار، دلیل اس کی آیت ”کلا انهم عن ربهم يومئذ لمحجوبون الخ“ ہے مؤمنین کو رویت ہوگی، دلیل اس کی ”وجوه يومئذ ناضرة الى ربها ناظرة“ اور جب مؤمنین کو آخرت میں رویت ہوگی، تو دنیا میں بھی رویت ممکن ہے۔ کیونکہ مرئی (اللہ تعالیٰ) کے لئے دونوں وقت برابر ہے۔ باقی بیان رویت باری میں آئے گا انشاء اللہ۔

قوله اولم تسمع ان الله يقول ما كان لبشر الخ: یہ دوسری دلیل ہے، جس سے حضرت عائشہؓ نے نفی رویت پر استدلال کیا ہے۔

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں حق تعالیٰ کے کلام کرنے کو تین صورتوں میں منحصر کر دیا گیا ہے۔ (۱) دل میں کوئی بات ڈال دی جائے۔ (۲) یا پس پردہ بات چیت ہو۔ (۳) یا کسی فرشتہ کے واسطے سے وحی بھیج دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تکلم کی حالت میں رویت ہو ہی نہیں سکتی، اس کا جواب یہ ہے کہ مطلقاً رویت کی اس سے نفی نہیں ہوتی، ایسا ہو سکتا ہے کہ رویت کے وقت کلام نہ ہو۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۶۰۹)

قوله ومن زعم انه يخبر الخ: ترمذی شریف میں ہے کہ ”من اخبرك ان محمداً راى ربه او كتم شيئاً مما امر به او يعلم الخمس التي قال الله ان عنده علم الساعة“

قوله لكتم هذه الآية الخ: چونکہ اس میں آنحضور ﷺ نے ایک ایسی بات کو مخفی رکھا، جو اللہ نے آپ کو بتادی تھی، کہ ایسا ہو کر رہیگا۔

علی بن حسین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو آگاہ فرمادیا تھا، کہ زید اپنی بیوی زینب کو طلاق دیں گے۔ اور ان سے

آپ کا نکاح ہو گا، جب حضرت زید نے زینب کی تند مزاجی کی شکایت کی تو آپؐ نے نصیحت کے انداز میں فرمایا ان کو اپنی زوجیت میں رکھو، اور خدا سے ڈرتے رہو، آپ کو اس بات کا اندیشہ ہوا کہ متنی کی مطلقہ سے نکاح کرنے پر منافقین آوازیں کیسے گئے۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ زید طلاق دے کر زینب کو اپنی زوجیت سے علاحدہ کر دیں، تاکہ میں زینب سے نکاح کر لوں، اور زبان سے یہ فرمایا کہ ”امسک عليك زوجك“ یہ سراسر جہالت و نادانی ہے، اور اس کو شان نبوت کے بالکل خلاف سمجھ کر رد کیا جائے گا۔

سوچنے کے بابت ہے کہ جن کا دل ایمان و حکمت سے لبریز ہو چکا ہو، اور ملا اعلیٰ سے حد درجہ اتصال ہو۔ اور جنہوں نے عجائبات آسمان و زمین کا مشاہدہ کیا ہو، جنت کی سیر کر چکے ہوں، وہ ایک عورت پر فریفتہ ہو جائے، کتنی گری ہوئی بات ہے، آپؐ نے اگر شادیاں کیں اور دنیا کے مسلمانوں سے فائدہ اٹھایا تو اس میں محض رضائے رب ہی کا جذبہ تھا۔

قوله لقد قف شعري الخ: خوف، دہشت، گھبراہٹ، سے بدن کے رگوں کا کھڑا ہو جانا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسی حالت میں بدن کا جلد سٹکڑ جاتا ہے، اور بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔

قوله كان ياتي في صورت الرجال الخ: اور عموماً جبہ کلبی کی صورت میں آتے تھے۔

قوله في صورته التي هي صورته الخ: یعنی ان کی دو اصلی صورت جس پر ان کی تخلیق ہوئی۔

قوله نوراني الخ: حضرت علامہ کشمیریؒ نے اس کا ترجمہ نور من این اراہ سے کیا ہے، علامہ نے فرمایا کہ یہی ابن خزیمہ کا مختار قول ہے۔ اور جنہوں نے نورانی بفتح راء و کسر نون و تشدید یاء پڑھا ہے، وہ تصحیف اور غلط ہے، اور اگر اس کو صحیح مانا جائے، تو پھر اس کا وہی مطلب ہو گا جس کو اوپر بیان کیا گیا۔

### علم غیب کے متعلق بحث

آنحضور ﷺ نے قیامت تک کی بہت سی خبریں دیں، مگر غیب دانی کے دعویٰ کے بناء پر نہیں۔ بلکہ علم الہی کے سامنے اپنی بے مانگی کے اعتراف کے ساتھ، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اپنے غیر متناہی خزانہ غیب سے، کچھ عطا فرماتا ہے، اس سے وہ غیب داں نہیں کہلاتے، بلکہ غیب داں کے تفسیر کہلانے لگتے ہیں۔ دنیا اپنی نا سمجھ سے خود انہیں غیب داں کہنے لگتی ہے، قرآن کی اصطلاح میں علم وہ ہے جو خود واقعہ سے حاصل ہو، اور کسی واقعہ کے متعلق جو اپنی جانب سے تخمینہ کیا جائے، وہ ظن کہلاتا ہے، موجودہ زمانہ میں علامات کے ذریعہ بعض ان باتوں کا علم بھی ہو جاتا ہے، جو حدیث میں مذکور ہیں، لیکن ان کا براہ راست علم اب تک بھی کسی کو نہیں ہوتا، جو کچھ ہوتا ہے وہ صرف استدلال اور علامات کی بناء پر ہوتا ہے، آنحضور ﷺ نے علامات قیامت خود بتائیں، مگر اس کے باوجود قیامت کے معاملہ میں ہمیشہ اپنی لاعلمی ہی کا اظہار کیا، اہلباء نے صل کے مذکور و مؤنث ہونے کی شناختیں لکھیں ہیں۔ اسی طرح ہمارے دور میں فضائی اثرات سے موسم کا اندازہ بھی کر لیا جاتا ہے، مگر یہ سب ظن کے مرتبہ سے متجاوز نہیں، یہ علم استدلالی تو ہے، لیکن براہ راست واقعہ کا علم نہیں، اسی لئے بہت مرتبہ خلاف بھی ہو جاتا ہے، واقعات کا براہ راست علم اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے، ہم حوادث سے غائب رہ کر بذریعہ استدلال ان کو معلوم کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ حاضر و ناظر ہو کر ان کا علم رکھتی ہے۔ واللہ علی کل شئی شہید، کا یہی مطلب ہے۔ مسند احمد میں ایک لمبی حدیث

ہے، جس کا ایک حصہ ابو داؤد نے بھی نقل کیا ہے، ربیع بن خراش بنی عامر کے ایک صحابی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں، اس کے آخر میں ہے کہ سائل نے پوچھا اچھا کوئی علم ایسا باقی ہے جو آپ نہ جانتے ہوں؟ آپ نے فرمایا ابھی تو بہت سی عمدہ عمدہ باتیں باقی ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے مجھے بتائی ہیں، ہاں علم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا، اس کے بعد آنحضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ”ان الله عنده علم الساعة الآیة“ روایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔

صفت علم جو حق تعالیٰ کی ایک نمایاں ترین صفت ہے، اس کے مظاہرے کے لئے ازل میں ملائکہ اللہ کا وہ معرکہ الآراء واقعہ پیش آیا تھا، جس میں انھیں ”انی اعلم ما لا تعلمون“ کا عتاب آمیز فقرہ سننا پڑا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف ایک کلمہ ”انا اعلم“ کی بدولت کتنا حیران و پریشان ہونا پڑا۔ اور سب سے آخر میں وہ رسول بھی آگیا، جس کو علم الاولین والآخرین کا مجموعہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مگر خالق السموات والارضین کے علم کے سامنے وہ بھی ہمیشہ اپنے عجز و نیاز کا سر جھکائے رہا، اور ”رب زدنی علما“ کی ہی دعائیں مانگا کیا اور کسی نے کبھی شاعرانہ رنگ میں ”وفینا نبی یعلم ما فی غد“ کہہ دیا تو اس نے وہیں ان کو روک دیا۔

یہاں بالذات اور بالواسطہ کا فرق پیدا کرنا ایک مضحکہ خیز خیال ہے، بندے میں خدا تعالیٰ کی کوئی صفت نہ بالذات نہ بالذات ہو سکتی ہے، نہ بالعرض، اللہ تعالیٰ ایسا یگانہ، ویکتا ہے کہ نہ اس کی ذات میں، اور نہ اس کی صفات میں سے کسی صفت میں کوئی شریک ہو سکتا ہے، نہ اس کا احتمال ہے۔ شعر ۔

بس جس جگہ تک میری رسائی ہے      اس کے بس اس طرف تیری خدائی ہے

اسی طرح کائنات ہستی کے ”جميع ملکان وما یکون“ کا علم بھی کسی کے حق میں تسلیم کرنا، اسلامی عقیدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے ماوراء اگرچہ بیشتر علوم اور بھی ہیں، مگر وہ انسانی دماغ کے تصور سے باہر ہیں۔ انسانی دماغ صرف انہیں علوم کا تصور کرتا ہے، جو کائنات میں اس کو نظر آتے ہیں۔ پس اگر ان علوم میں خالق اور مخلوق مساوی ہوں تو پھر صفت علم کے بارے میں وہ خالق کی برتری کا کوئی تصور کر ہی نہیں سکتا۔

حالانکہ اسلام میں خالق کی برتری کا تصور، اتنا اعلیٰ سکھایا گیا ہے، کہ اس کے نام کے برابر بھی، کسی مخلوق کا نام لینا اس کے برتری کے خلاف سمجھا گیا ہے، پھر ذرا یہ بھی سوچنا چاہئے کہ کائنات ہستی میں ایسی بھی بے شمار اشیاء موجود ہیں، جن کا علم خالق کائنات کیلئے تو ضرور موجب کمال ہے، مگر انسان کے لئے کوئی کمال نہیں۔ مثلاً کسی میدان کے ریت کے ذرات یا کسی درخت کے شاخوں کے پتے، یا اسی قسم کے اور علوم، جو انسان کی تکمیل کیلئے غیر ضروری، بلکہ نور غل ہیں، یہ سب جب عام انسانوں کے حق میں کوئی کمال نہیں سمجھے جاتے تو ان میں جو سب سے برتر ہستیاں ہیں، ان کے لئے کیا موجب کمال ہو سکتے ہیں۔

(۱) روایت میں آیا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ آنحضور ﷺ کے ہمراہ، حضرت میمونہؓ کے گھر گئے، آنحضور ﷺ کے سامنے ایک بھنی ہوئی گدہ پیش ہوئی، آپ نے اس کی طرف اپنا دست مبارک بڑھایا، اس پر آپ کی زوجہ سلمہؓ میں سے کسی نے کہا جس چیز کے تناؤی فرمانے کا آپ ارادہ فرما رہے ہیں، آپ کو اس کی اطلاع دے دوں۔ (بخاری شریف ج ۲ ص ۸۱۲)

یہ روزمرہ کا ایک واقعہ ہے، دیکھئے یہاں حاضرین مجلس حتیٰ کہ امہات المؤمنین جیسی خاص خاص ہستیوں میں سے کسی

ایک کے ذہن میں بھی یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کو عالم غیب کا اس طرح احاطہ تھا کہ عالم کا کوئی ذرہ آپ کے علم سے باہر نہ تھا، وہ کس صفائی کے ساتھ ایک معمولی سی کھانے کے چیز کے متعلق آپ کو ٹوک دیتی ہیں۔ اور آپ بھی فوراً متنبہ ہو کر اس کے تناول فرمانے سے دست کش ہو جاتے ہیں، اور یہ نہیں فرماتے ہیں کہ یہ تو میں خود بھی جانتا تھا، واضح رہے کہ یہ واقعہ حضرت میمونہؓ سے عقد کے بعد کا واقعہ ہے، جو آپ کی بہت آخر عمر کا واقعہ ہے۔

(۲) اسی طرح ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا، میں ایک انسان ہی ہوں، اور تم لوگ اپنے جھگڑے لے لے کر میرے پاس آتے ہو، ہو سکتا ہے کہ تم میں ایک آدمی اپنے دلائل بنا سنوار کر بیان کرنے میں، دوسرے شخص سے زیادہ باہر ہو، اور میں اس کے بیان سے متاثر ہو کر جیسا اس کا بیان سنوں، اسی کے مطابق فیصلہ کر دوں، تو اگر میں کسی کے بھائی کے حق کا اس کے حق میں فیصلہ کر کے اس طرح دے دوں، تو اسے چاہئے کہ وہ میرے اس طرح کے فیصلہ پر اعتماد کر کے اس کا مال دبا نہ لے اور یہ سمجھے کہ جو مال اس کو فیصلہ سے ملا ہے، وہ حقیقت میں آگ کا ایک انگارہ ہے۔ (۱)

(۳) اسی طرح حضرت موسیٰ اور خضر علیہ السلام کے واقعہ کے بعد اخیر میں فرمایا اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کو مراتب علیا عطا فرمائے، ہمیں تنہا تھی کہ موسیٰ علیہ السلام اگر کچھ صبر فرمالیتے، تو ان دونوں کے کچھ اور واقعات بھی ہمارے سامنے بیان میں آجاتے (بخاری شریف)۔ غور کرو علم الہی کے متعلق حضرت موسیٰ و خضر کا عقیدہ تو یہ تھا کہ غیر متناہی علوم کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہ تھی جو قطرہ کو دریا سے ہوتی ہے، آخر میں سب سے بزرگ و برتر ہستی، سرور کائنات ﷺ کا ارشاد سن لیجئے۔ آپ فرماتے ہیں، کاش موسیٰ علیہ السلام کچھ اور صبر کر لیتے، تو ہمیں کائنات کے عجائبات کا علم کچھ اور حاصل ہو جاتا۔ معلوم ہوا کہ کائنات ہستی کے تمام واقعات کا علم تو دور کنر آپ کو ان چند واقعات کے علم پر بھی پورا احاطہ حاصل نہ تھا جو ان دو بزرگوں کے مابین بہت ہی محدود زمانہ میں پیش آیا۔

سچ کہا ہے علامہ تفسطائی نے کہ قدرت نے انسان کو پیدا ہی ایسی وضع پر کیا ہے کہ غیب کے علوم کا احاطہ تو درکنار اس کو حاصل شدہ علوم کا استحضار رہنا بھی مشکل ہے، ایک وقت انسان کی ملکی قوت عروج کرتی ہے تو وہ عرش کی خبریں دینے لگتی ہے، اور ایک وقت اس پر بشریت کا دباؤ پڑتا ہے تو وہ خود اپنی معلومات بھی فراموش کر بیٹھتا ہے، اسی زجر و مد میں انسانی ترقی کا راز مضمر ہے، خطا و نسیان انسان کے لئے عیب نہیں۔

(۴) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت پڑھئے، جس میں یہ آتا ہے کہ، آنحضور ﷺ نماز کے لئے باہر نکلے، قریب تھا کہ تکبیر کہتے، کہ فوراً آپ واپس تشریف لے گئے، اور لوگوں کو اشارہ کیا کہ جس طرح تم اب ہو، اسی طرح رہنا، غسل کر کے پھر باہر تشریف لائے، اور آپ کے سر مبارک سے پانی ٹپک رہا تھا۔ آپ نے نماز پڑھائی، اور فارغ ہو کر فرمایا، میں جنابت کی حالت میں تھا، اور غسل کرنا بھول گیا تھا۔ (۵)

(۵) نیز عقبہ بن حارث کی اس روایت کو یاد کیجئے، جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ میں نے مدینہ طیبہ میں آنحضور ﷺ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی، آپ سلام پھیر کر، لوگوں کی گردنیں پار کرتے ہوئے جلدی جلدی کسی زوجہ



مطہرہ کے گھر تشریف لے گئے، لوگ آپ کی یہ عجلت دیکھ کر گھبرا گئے، جب آپ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ آپ کی اس عجلت پر حیران ہیں، آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنے گھر میں سونے کی ایک ڈلی رکھی ہوئی یاد آگئی تھی، مجھے یہ بات ناپسند ہوئی کہ مبادا وہ میرے تعلق خاطر کا باعث بنے اس لئے میں اسے تقسیم کرنے کے لئے کہہ آیا ہوں (بخاری ج ۱ ص ۱۹۲)۔

(۶) نیز عبد اللہ بن مسعود کی وہ روایت جس میں یہ آیا ہے کہ ایک بار آپ نے چار رکعت والی نماز کو پانچ پڑھادیا اور بعد میں سجدہ سہو کر لیا۔ (بخاری شریف ج ۱ ص ۱۹۳)

(۷) اسی طرح ذوالیدین کی روایت میں چار رکعت والی نماز کو دو ہی پڑھا کر سلام پھیر دیا، اور مصلیٰ سے اٹھ کر چلے گئے لوگ حیران ہیں، کسی کو ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوئی، ذوالیدین نے ہمت کر کے پوچھا "اقتصرت الصلوة ام نسيث يا رسول الله الخ" اس کے بعد بھی آپ کو یاد نہیں آیا، پھر فرمایا "كل ذلك لم يكن" اس پر ذوالیدین نے کہا، "فدكان بعض ذلك" تب لوگوں سے دریافت کیا، اصدق ذوالیدین، سہووں نے کہا، صدق، تب اپنی جگہ تشریف لائے، اور دو رکعت اور پورا کر کے سجدہ سہو کیا۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۹۳)

حدیثوں میں مثالیں بکثرت ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کو جن باتوں کا علم نہ ہوتا ان کے جواب کے لئے کبھی تو جبرئیل از خود تشریف لے آئے، اور کبھی آپ ان کی آمد کا انتظار فرماتے، اور آپ کے جواب میں اگر کوئی اجمال رہ جاتا، تو جبرئیل علیہ السلام فوراً اس کی ضروری تفصیل کر دیتے، درحقیقت یہ نبی کا بہت بڑا کمال ہے اور اس کی صداقت کی سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ وہ دین کے بارے میں ایک حرف بھی اپنی جانب سے نہیں کہتا۔ جس طرح نبی کو فتح و شکست اس کے صداقت کی دلیل ملتی ہیں۔ اسی طرح ان کا نطق و سکوت بھی اس کی صداقت کا ایک محکم ثبوت ہوتا ہے، یہاں بے علم اس کو نقصان کا موجب گردان لیتا ہے۔

(۸) یہاں ابو سعید خدریؓ کی اس روایت کو یاد کیجئے، کہ جس میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا جن باتوں کا مجھے تمہارے بارے میں اندیشہ ہے، ان میں سے دنیا کی وہ رونق اور ان کی وہ فتوحات ہیں، جو میرے بعد تم کو نصیب ہوں گی، اس پر ایک شخص نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ (یہ تو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہو گی) بھلا نعمت بھی خطرہ کا سبب بن سکتی ہے، اس پر آپ اس طرح خاموش ہو گئے، جس سے ہم یہ سمجھے کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ (بخاری شریف ج ۲ ص ۹۵)

(۹) اسی کے ساتھ آپ وہ روایت بھی پڑھئے جو ابو داؤد میں ہے، راوی ابو سعید خدریؓ ہیں، فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ اپنے صحابہ کو نماز پڑھا رہے تھے کہ دفعۃً آپ نے نعلین مبارک اتار کر اپنی بائیں جانب رکھ لئے، یہ دیکھنا تھا کہ صحابہ کرام نے بھی، اپنے اپنے چپل اتار ڈالے، جب آپ اپنی نماز پوری فرما چکے تو ان سے پوچھا تم لوگوں نے اپنے چپل کیوں اتار دیئے، انہوں نے کہا، آپ کی اتباع میں آپ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے تھے انہوں نے مجھ سے کہا آپ کے نعلین میں کچھ گندگی لگی ہوئی ہے۔ بتاؤ کہ چپل کی گندگی حضرت جبرئیل کے بتانے کے بعد معلوم ہوئی۔ (ابوداؤد شریف ج ۱ ص ۹۵)

(۱۰) اسی کے ساتھ بخاری وغیرہ کی اس روایت کو بھی یاد کرو کہ حماد بن ابی حمزہ کے موقع پر آپ نے ایک دینی مصلحت کی وجہ سے لوگوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ سب اپنے اپنے احرام کھول ڈالیں، اور حج کے بجائے عمرہ کر ڈالیں، پھر جب حج کا وقت آئے

توجہ کا احرام باندھ کر حج کر لیں، یہ بات لوگوں کو شاق گذری، تو آپ ان لوگوں پر برہم ہوئے فرمایا تھا "لو لا انی استقبلت من امری ما استنبطت ما سقت الہدی معی الخ" یعنی کاش اگر میں اس کو پہلے سے جانتا تو میں بھی اپنے ہمراہ ہدی کا جانور نہ لاتا، اور یہاں سے ہی خریدتا، اور اپنا احرام بھی اسی طرح کھول ڈالتا، جس طرح اور لوگوں نے کھولا (بخاری شریف) ان الفاظ میں روایت نہیں البتہ دوسرے الفاظ میں ہے۔ (۱)

(۱۱) اسی کے ساتھ اس روایت کو بھی یاد کرو، جس میں یہ مقصود ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ میدان حشر کی اتنی بڑی بھیڑ میں، آپ اپنی امت کو کس طرح پہچانیں گے، آپ نے فرمایا، وضو کے پانی کے نشاںوں سے ان کے چہرہ روشن ہوں گے، اور ہاتھ پاؤں چمکدار، ان کے سوال اور کوئی امت ایسی نہ ہوگی۔ (۱۲)

اس قسم کی حدیثوں کو بڑے غور سے پڑھنا چاہئے، جن میں ضمنی طور پر یہ امر نہایت نمایاں ہوتا ہے، کہ یہاں تکلم و مخاطب کے ذہنوں میں علم محیط کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، وہ بڑی سادگی سے سوال و جواب کرتے ہیں۔ اور نہ تو سائلین آپ کے متعلق کسی علم کی نسبت، قطع کرنے میں جھبکے، اور نہ آپ اس غلطی پر ان کو متنبہ کرتے نظر آتے ہیں، بلکہ جو جواب دیتے ہیں، اس سے اور ان کے عقیدہ کی تائید ہوتی ہے،

(۱۲) اس سے بڑھکر اس روایت کو یاد کیجئے، جو ابوہریرہؓ کی روایت ہے، اور ہمیشہ نے اس پر حجت کا فیصلہ صادر کیا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ باہر تشریف لائے، اور اس وقت آپ پر غصہ کے آثار تھے، آپ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دے کر فرمایا، آج تم مجھ سے جو جو سوالات کرو گے میں تم کو جوابات دوں گا، راوی کہتے ہیں کہ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے ساتھ ساتھ ہیں۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: عن انس رضی اللہ عنہ قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو غضبان فخطب الناس فقال لا تسألونی عن شیء الیوم الا اخبرتکم بہ ونحن نری ان جبرئیل معہ۔ (۱۳)

یہ روایت بخاری شریف میں بھی ہے، مگر یہاں مسند ابوہریرہؓ کی روایت میں، صحابہ کے ان الفاظ کی زیادتی ہے "و نحن نری" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کے نزدیک آپ کے فرمان، تم مجھ سے جو سوال کرو گے اس کا جواب دوں گا، کی بنیاد یہ نہ تھی، کہ نبی کو ہر وقت ہر بات کا علم ہوتا ہے، بلکہ اس قسم کے اوقات میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور بذریعہ وحی اسی وقت آپ کو سائلین کے سوالات کے جوابات کی اطلاع دیدی جاتی ہے۔

ابوداؤد میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک بار عصر کے بعد خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، اور جو جو حواہیات قیامت تک ظہور میں آنے والے تھے، وہ سب آپ نے ذکر کر دیئے جس نے یاد رکھا، اس نے یاد رکھا، اور جس نے بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔ (۱۴)

ایک حدیث میں "ما ترون شیئاً" کے لفظ ہیں، اگرچہ اس میں بہت عموم ہے لیکن یہ عموم ایسا ہی ہے جیسا کہ "او تبت من کل شیء" میں، دیکھو قرآن کریم نے بلقیس کے شاہی ساز و سامان کی فراوانی میں یہ لفظ کہا۔ کیا اس لفظ کے عموم سے کوئی

یہ عقیدہ رکھنے کا مجاز ہو سکتا ہے؟ کہ اس کو ھقیقۃً تمام اشیاء عطا کر دی گئی تھیں، حتیٰ کہ تمام غیوب کا علم بھی یا یہ صرف اس کے شانِ ملوکیت کی عظمت کا ایک انداز بیان تھا۔

علماء نے تصریح کی ہے کہ جو لفظ مقام مذمت یا مقام مدح میں آتا ہے اس سے کسی مسئلہ کا استنباط کرنا صحیح نہیں، وہ صرف مشکلم کے جذبات احترام یا اس کے جذبات توہین کے ترجمان ہوتے ہیں۔

”انما المشركون نجس“ کو اسی قبیل سے سمجھنا چاہئے، ان کا مقصد مخاطب کے ذہن میں کسی کی محبت یا کسی سے نفرت قائم کرنا ہوتا ہے کسی عقیدہ کی تعلیم دینا نہیں۔ اس قسم کی احادیث جن سے اہل بدعت استدلال کرتے ہیں ان کی توجیہ و تشریح کے لئے ازلۃ الاریب کا مطالعہ کریں۔

اسی طرح ”ما ترک شیئاً“ میں ہے، کسی کلام کے معنی سمجھنے کے لئے، مشکلم و مخاطب کے مفروضات اور ماحول کے اقتضاء سے قطع نظر نہ کرنا چاہئے، سوچو کہ اگر یہاں، آپ نے تمام واقعات پورے استیعاب کیساتھ بیان کر ڈالے تھے، حتیٰ کہ ریت کے ذرات، اور بارش کے قطرات بھی، تو اول صحابہ کے سامنے اس قسم کے علوم بیان کرنے سے نبوت کے کس باب کی تکمیل ہوتی تھی۔

پھر کیا اس کے بعد تمام صحابہ کو بھی عالم الغیب کہنا صحیح تھا؟ اور اگر نسیان کے بعد وہ عالم الغیب نہ رہے تھے، تو کچھ مدت کیلئے انکو عالم الغیب بنانے سے کیا فائدہ؟ پھر اس کا کوئی قطعی ثبوت دیا جاسکتا ہے؟ کہ آنحضور ﷺ پر بھی نسیان طاری ہوا تھا۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اس مجلس میں آپ نے فتن اور قائدین فتن کے متعلق کوئی تفصیلی بیان فرمایا تھا۔ اور اس سلسلہ میں اس درجہ تفصیل فرمائی تھی کہ سننے والوں کا تخمینہ یہ تھا کہ اب آپ نے کوئی اہم فتنہ ایسا نہ ہوگا جس کو اس وقت ذکر نہ کیا ہو۔ اسی ابہام کو حذیفہ کی دوسری حدیث میں کھول دیا گیا ہے۔

بہر حال اس کا تعلق قیامت کے فتنوں سے تھا دنیا کے غیر متعلق حوادث سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت حذیفہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

عن حذيفة رضى الله عنه قال والله ما ادرى انسى اصحابى ام تناسوا والله ما ترك رسول الله صلى الله عليه وسلم من قائد فتنة الى ان تنقضى الدنيا من معه ثلثمائة فصاعداً الا قد سماه لنا باسمه واسم ابائه واسم قبيلته. (۵)

اگر اس کے متعلق آیات و روایات کا جستجو کیا جائے تو سینکڑوں ملیں گے، جن سے اس مسئلہ کا پورا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

نقطہ

والله اعلم بالصواب وعلمه اتم واحكم۔

## باب معنی قول اللہ عزوجل ولقد رآه نزلة اخرى وهل رأى النبي صلى الله عليه وسلم ليلة الاسراء

وحدثني ابو الربيع الزهراني قال نا عباد وهو ابن العوام قال اخبرنا الشيباني قال سئلت زربن جيش عن قول الله تعالى فكان قاب قوسين او ادنى قال اخبرني مسعود ان النبي صلى الله عليه وسلم رأى جبرئيل عليه السلام له ستمائة جناح.

شيبانی کہتے ہیں کہ میں زربن جيش سے قول باری "فكان قاب قوسين او ادنى" کی تفسیر دریافت کیا، تو انہوں نے بتایا کہ مجھ کو عبد اللہ بن مسعود نے خبر دی کہ آنحضور ﷺ نے حضرت جبرئیل کو دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو ہیں۔

### شب معراج میں رویت باری ہوئی یا نہیں؟

اس باب کے تحت ایک اہم مسئلہ زیر بحث ہے، کہ شب معراج میں حضور اکرم ﷺ نے خداوند قدوس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا نہیں؟ اس سلسلے میں علمائے کرام کے درمیان سخت اختلاف ہے، اختلاف کی بنیاد در حقیقت قرآنی آیات "ملائکذ الفوار مارأی، ولقد رآه نزلة اخرى" ہے۔ اس میں راہ کی تفسیر کے مرجع کی تعیین میں اختلاف ہے، کہ اس کا مرجع کیا ہے؟ جن حضرات نے آنکھوں سے رویت باری کا انکار کیا ہے، انہوں نے اس کا مرجع حضرت جبرئیل کو قرار دیا ہے، کہ ان کو آپ نے دوسری مرتبہ دیکھا، جبکہ دوسرے حضرات نے اس کا مرجع اللہ کو قرار دیا ہے، یعنی آپ نے خدا کو دیکھا۔ جن حضرات نے رویت کا شدت سے انکار کیا ہے، ان میں قابل ذکر حضرت عائشہ، اور حضرت عبد اللہ بن مسعود ہیں، جبکہ دوسری طرف جنہوں نے رویت باری کا اقرار کیا ہے، ان میں قابل ذکر حضرت ابوذر، حضرت ابن عباس، عروہ بن زبیر، کعب احبار، امام زہری، حضرت معمر، امام اشعری، وغیرہ ہیں۔ حضرت حسن بصری قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ حضور نے اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھا ہے، پھر اس جماعت میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ آپ نے خدا کو انہی ظاہری آنکھوں سے دیکھا یا دل کی آنکھوں سے، حضرت عبد اللہ بن عباس سے دو طرح کی روایت منقول ہے، ایک روایت ان کی مسلم میں ہے، "رأی ربہ بفواہدہ مرتین" ایک میں بقلہ ہے، بلکہ اس سے واضح روایت ابن مردویہ کی ہے "قال لم یرہ بعینہ، انما ارہ بقلہ" ہے۔ اسی طرح کی روایت کو سامنے رکھ کر، بعض حضرات نے حضرت عائشہ، اور حضرت ابن عباس کے اختلاف، اور نظریاتی اختلاف کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، کہ حضرت عائشہ کی فہمی رویت کا تعلق رویت بصر سے ہے، اور حضرت ابن عباس کی رویت کے اثبات کا تعلق قلب سے ہے۔

لیکن یہ تطبیق اس وقت کمزور ہو جاتی ہے، جبکہ ابن عباس کی ایک اور روایت بھی سامنے آتی ہے، علامہ جلال الدین سیوطی نے نقل کیا ہے "عن ابن عباس قال ان محمداً رأى ربہ مرتین مرة ببصرہ ومرة بفواہدہ" حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کی روایت دو طرح کی ہے، ایک مطلق دیکھنے سے متعلق جیسا کہ نسائی میں "عن ابن عباس

قال اتعجبون ان تكون الخلة لابراهيم والكلام لموسى والرؤية لمحمد" میں مطلق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مطلق روایت کو مقید پر محمول کرلو، تو اشکال دور ہو جائے گا۔

شرح عقائد میں علامہ تفتازانی نے لکھا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے رب کو دل کی آنکھ سے دیکھا، نہ کہ سر کی آنکھ سے، ملا علی قاری وغیرہ کا مختار قول یہی ہے، امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ آنحضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو یا تو دل کی آنکھ سے دیکھا ہے، اور وہ اس طرح کہ آپ کے دل میں چنانچہ ذال دی گئی، یا اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا، تو اس صورت میں یا تو کہا جائے گا، کہ دل کی قوت آپ کے سر کی آنکھوں میں دیدی گئی تھی۔

ولا کل

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تو شدت کے ساتھ روایت کا انکار فرماتی ہیں، ان کی مشہور روایت جس کو بخاری نے مسروق سے روایت کی ہے، کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا، کہ امان کیا محمدؐ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟ تو آپؓ نے فرمایا، تیری بات سے تو میرے بدن کا رد نکلا کھڑا ہو گیا، یا درکھ کہ تین باتوں میں سے جو کوئی تجھ سے نقل کریں، تو وہ جھوٹا ہے، جو کہے کہ محمدؐ نے اپنے رب کو دیکھا، اس نے جھوٹ کہا، اور اس کی تائید میں قرآن کی آیت "لا تدركه الابصار وهو يدرك الابصار، وهو اللطيف الخبير" کو پڑھا، اور دوسری آیت "ما كان لبشر ان يكلمه الله الا وحيا او من وراء حجاب" کو پیش کیا۔ اور جو تجھ سے کہے کہ محمدؐ کو آسمان کی خبر تھی تو وہ بھی جھوٹ بولا، اور اس کی تائید میں وما تدرى نفس ماذا تكسب غداً و غداً و غداً جو تجھ سے کہے کہ آپؐ نے وحی کا کچھ حصہ چھپایا تھا، اس نے بھی جھوٹ کہا، اور پھر اسی کی تائید میں "يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك فان لم تفعل، فما بلغت رسالته" پڑھا۔

حضرت ابن عباس کا جواب :۔۔۔۔۔ حضرت عائشہؓ کی پیش کردہ آیت کا جواب، ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا، کہ آنحضور ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا، اس پر ان کے شاعر عکرمہ نے کہا، کہ اللہ نے کیا یہ نہیں فرمایا "لا تدركه الابصار" تو ابن عباسؓ نے فرمایا، کہ ہائے افسوس، یہ تو اس وقت کا حال ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اسلی نور میں تجلی فرمایا، اور واقعہ آپؐ نے اپنے رب کو دوسرے دیکھا، جب آنحضور ﷺ شب معراج میں وہاں تک پہنچ گئے، جہاں نہ کوئی نبی و رسول پہنچا اور نہ مقرب فرشتہ، تو حق تعالیٰ نے چاہا، کہ ایسی خاص نعمت سے آپؐ کی عزت افزائی فرمائیں کہ دنیا و آخرت کی نعمتوں سے کوئی نعمت بھی اس کے مشابہ نہ ہو، لہذا اپنے چہرے سے، پردہ نور کو اٹھا کر تجلی فرمائی، کہ آنحضور ﷺ نے چشم بصیرت زیارت کی، اور آپؐ کی جانب بلا حجاب و دوحی فرمائی، کہ اس جیسی آپؐ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ہوئی، پھر جب وہاں سے خوش و خرم واپس ہوئے، اور سدرة المنتہی تک پہنچے تو دوبارہ زیارت سے سرفراز ہوئے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "ولقد راہ نزلة اخرى عند سدرة المنتهى" یہ ہے وہ تفسیر جس کو ترمذی نے حضرت کعب سے نقل کیا ہے، کہ اللہ نے تقسیم فرمایا، اپنی رویت اور اپنے کلام کو محمد ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان، حضرت موسیٰؑ نے دوسرے کلام فرمایا، اور محمد ﷺ کو اپنے رب کی رویت دوسرے حصہ حاصل ہوئی۔

حضرت ابو ذرؓ کی روایت مسلم میں ہے کہ میں نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا، کہ آپؐ نے اپنے پروردگار کو شب معراج میں دیکھا تھا؟ آپؐ نے فرمایا، کہ نورانی دیکھا تھا، اس روایت کے تلفظ اور ضبط میں اختلاف ہے، اسے دو طرح پڑھا گیا

ہے "نور انی ارہ" اور دوسرے "نورانی ارہ" پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ تو نور ہے اس کو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اور اگر "نورانی ارہ" پڑھا جائے، نور ارہ کو ایسر کے معنی میں لیا جائے، تو اس کا ایک مطلب یہ ہوگا، کہ دنیا میں تو نہیں دیکھا، البتہ آخرت میں دیکھیں گے، اس صورت میں "ارہ" مضارع مستقبل کے معنی میں ہوگا یا یہ مراد ہو کہ میں نے اس کو دیکھا ہے تو ماضی کو استقبال کے ساتھ تعبیر کرنا حکایت حال ماضی کے قبل سے ہوگا، گویا ایک گزری ہوئی چیز کو مختصر کر کے لذت حاصل کی جا رہی ہے۔ اس صورت میں ارہ مضارع حال کے معنی میں ہوگا، گویا مسلم کی اس روایت میں دونوں قرأت کی بنیاد پر دونوں فریق کی دلیل ہو سکتی ہے، انی ارہ، منکرین کے لئے، اور نورانی ارہ، متبعین کے لئے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ "انی ارہ" والی صورت میں استفہام نفی کیلئے نہیں ہے، بلکہ تقریر کیلئے ہے، تو ترجمہ ہوگا، "نور حدیث ارہ" ملا علی قاری نے شرح شفا میں نفی اور اثبات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ جنہوں نے رویت کی نفی کی، اس کا تعلق ذات سے ہے، اور اثبات کا تعلق صفات سے ہے، یعنی اللہ کی ذات کو تو نہیں دیکھ سکا، البتہ اس کے صفات کا دیدار ہوا۔

**شرح الفاظ حدیث** قوله عن قول الله تعالى فكان قاب قوسين او ادنى الخ: قاب ما بين القبضة والسبغة من القوس، علامہ والدی نے جہور کا قول نقل کیا ہے، کہ قوس ہے مراد کمان ہے جس سے تیر پھینکا جاتا ہے، اور بعض کی تحقیق یہ ہے کہ قوسین سے مراد ہاتھ (گز) ہے اس لئے کہ اسی سے چیزوں کی پیمائش کی جاتی ہے علامہ شبیر احمد عثمانی کا رجحان اسی طرف ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ابن مردویہ نے باننا صحیح عبد اللہ بن عباس سے نقل کیا ہے، کہ قاب بمعنی قدر اور قوسین بمعنی ذرا عین، اور اس معنی کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر قوس سے مراد کمان ہوتا، تو کہا جاتا "قاب رمح" مثلاً اور بعض لوگ اس کو باب قلب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اصل عبارت تھی "قانی قوس" کیونکہ ہر قوس کے دو قاب ہوتے ہیں، "او ادنی" بمعنی اقرب اور او بمعنی بل بھی ہو سکتا ہے، "ثم دنا فتدلى" کے بارے میں اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ دنا اور تدلى، منقسم ہے، حضور ﷺ اور جبریل کے درمیان، یا اللہ اور رسول کے درمیان، کہ دونو حضور ﷺ کی جانب سے ہوا اور تدلى حق تعالیٰ کی جانب سے، چونکہ حق تعالیٰ کسی جہت کے ساتھ مقید نہیں ہے، اس لئے اس میں تاویل یہ ہوگی کہ آنحضور ﷺ کا دو کنا یہ ہے، عظمت شان سے، کہ آپ اس جگہ پہنچ گئے، جہاں کوئی نہیں پہنچ سکا، اور اللہ تعالیٰ کی تدلى کنا یہ ہے اس بلند رتبہ کو ظاہر کرنے سے، اور قاب قوسین کنا یہ ہے، انتہائی قرب سے، جیسا کہ حدیث قدسی "من تقرب الی شبرا اتقربت منه ذراعاً ومن اتانی یمشی اتیتہ هرولة" میں تاویل کی جاتی ہے۔

قوله ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رای جبرئیل الخ: عبد اللہ بن مسعود کا مذہب یہ تھا کہ حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا، تو ان کے مذہب کے مطابق تقدیر عبارت اس طرح ہوگی "فاوحی ای جبرئیل الی عبدہ ای الی عبد اللہ محمد" چونکہ ابن مسعود کا خیال تھا کہ دنی اور تدلى کے فاعل جبرئیل علیہ السلام ہیں، اور وحی جبرئیل نے کی اور اکثر مفسرین وحی اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں، اور بعض سلف نے وحی جبرئیل علیہ السلام کو بتایا ہے۔

قوله لقد رآہ من آیات ربہ الکبری: بعض لوگ آیات سے وہ تمام آیات مراد لیتے ہیں، جو اس شب میں آپ نے دیکھا، اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے جبرئیل کی صفت یعنی ست مائۃ جناح مراد ہے۔

قوله قال رأى جبرئيل عليه السلام الخ: یہ ابن مسعود اور عائشہ کے رائے کے موافق ہے۔  
قوله رآه بقلبه الخ: یعنی آنحضور ﷺ نے اپنے رب کو قلب سے دیکھا، جیسا کہ ابن عباس کی روایت میں اس کی تصریح ہے۔

قوله رآه بفؤاده مرتين الخ: تحقیق اس کی گزر چکی ہے۔

## باب فی قوله عليه السلام ان الله لا ينام وفي قوله حجابہ النور لو كشفه لاحرق سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه

حدثنا ابو بكر بن ابي شيبة وابو كريب ..... عن ابي موسى قال قام فينا رسول الله صلى الله عليه وسلم بخمس كلمات فقال ان الله لا ينام ولا ينبغي له ان ينام يخفض القسط ويرفعه يرفع اليه عمل الليل قبل عمل النهار وعمل النهار قبل عمل الليل حجابہ النور وفي رواية ابي بكر النار لو كشفه لاحرق سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه وفي رواية ابي بكر عن الاعمش ولم يقل حدثنا.

ترجمہ حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر پانچ باتیں بیان فرمائیں، اللہ تعالیٰ سوتا نہیں، اور نہ یہ اس کے شایان شان ہے، میزانِ عدل کو جھکا تا ہے، اور اٹھاتا ہے رات کے کام دن سے پہلے اور دن کے کام رات سے پہلے اس کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، خود اس کا نور اس کا حجاب ہے، اور ابو بکر کی روایت میں بجائے نور کے نار ہے، اگر وہ یہ حجاب اٹھا دے تو اس کی ذات کے انوار جہاں تک نظر جائے ساری مخلوق کو پھونک ڈالیں۔

مقصد حدیث اس سے قبل یہ بات آئی کہ خدا حجاب سے پیچھے ہے، تو حجاب سے کیا مراد؟ اور انسانوں کا اس دنیا میں دیکھنا کیوں مشکل؟ انہی باتوں کو اس حدیث باب میں واضح کرنا ہے۔ حجاب سے مراد اصطلاحی پردہ نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ پردہ کے پیچھے ہے، کیونکہ پردہ اجسام کے لئے ہوا کرتا ہے، جبکہ اجسام محدود ہیں، اور ذاتِ باری غیر محدود، لہذا ذاتِ خدا کے لئے اصطلاحی پردہ مراد نہیں ہو سکتا، بلکہ حجاب بمعنی رکاوٹ اور مانعِ رویت ہے،

حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کا حجاب مخلوق کی طرح باہر سے نہیں، یہاں خود اس کے عظمت و جلال کے انوار ہی اس کا حجاب ہیں، جس طرح کہ خود آفتاب کی کرنیں، اور حسین کا حسن کبھی کبھی اس کے دیدار کے لئے حجاب بن جاتا ہے، اسی طرح یہاں خود اس کی عظمت و جلال کے انوار ہی اس کا حجاب بن رہے ہیں، دنیا میں کچھ لوگوں نے دیدار کا اشتیاق ظاہر کیا، اور چاہا کہ بے حجاب نظر آکر، مگر ہمیشہ ناکام ہی واپس آنا پڑا۔ اس عالم میں بے حجاب دیدار کی بس صرف ایک صورت ہے کہ وہ خود اس حجاب کو اٹھا دے، اس پر اس کو تو قدرت ہے، مگر ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کی تاب لا سکیں، یہاں عقلمندوں کا حصہ صرف اعتقادِ عظمت ہے، اور اگر باب کشف کا ذوق و وجدان ہے آنکہ پشدد و اند۔

ان الله لا ينام الخ: اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اونگھ، رنید سے بالاتر ہے، جب انسانوں کا یہ عقیدہ راسخ ہو چکا، کہ پوری کائنات کو چلانے والا، وہی ذات ہے، اور زمین و آسمان کا نظام اس کے قلم سے چل رہا ہے، تو ایک انسان کو

بتقاضائے فطرت یہ خیال آسکتا تھا، کہ جو ذات اتنا بڑا کام کر رہی ہے، اس کو کسی وقت تھکان ہونا چاہئے اور تھکاوٹ اور بدن کے ڈھیلے ہونے سے نیند بھی آنی چاہئے، تو اس جملے میں آپ نے تنبیہ فرمادی کہ خدائے پاک کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرو، وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ مشکل نہیں، اس کی ذات تمام تاثرات اور انفعال سے بالاتر ہے، کہ اس کو نیند آئے۔

يخفف القسط ويرفعه: قسط: اسواء اعضاء میں سے ہے، عدل و نظم دونوں معنی میں قرآن وحدیث میں مستعمل ہے، چونکہ ترانہ کے ذریعہ عدل ہوتا ہے، اس لئے اس کا معنی ترانہ ہے، جمہور کا مسلک یہ ہے کہ دربار خدا میں میزان عدل قائم ہوگا جس کا مقصد دنیا میں مخلوق کی روزی، اور آخرت میں انکے اعمال کی مقدار، کیلئے مقرر کی گئی ہے، اعمال رزق کی قلت و کثرت، دونوں جہاں میں اسی کے قبضہ قدرت میں ہے کسی کے اچھے عمل زیادہ ہونگے، اور کسی کے کم کسی کو روزی زیادہ ملتی ہے اور کسی کو کم، مگر اس حقیقت کے باوجود جدوجہد کا حکم دونوں جگہ موجود ہے، گویا تم سعی کے مکلف ہو اور قدرت دینے کی مختار۔

رفع اعمال الخ: یہ اس خدائی نظم کا ایک شعبہ ہے، جس پر بساط عالم کی بنیاد رکھی گئی ہے، خدا کے معصوم فرشتے مقرر ہیں، عصر و صبح کی نمازوں میں ان کی ڈیوٹی بدلی جاتی ہے، اور اس درمیان میں جو اچھے برے اعمال مخلوق کرتی ہے، وہ ان کے ساتھ جاتے ہیں، عالم تکوین کے گوشہ گوشہ میں نظم موجود ہے، دنیا اس کے عین امر اور دریافت کرنے کے درپے ہے، اس کے انکار یا بطلان کے درپے نہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر عالم غیب کا کوئی نظم آپ کے سامنے نہ ہو، تو آپ اس کے انکار یا اس سے آگے بڑھ کر استہزاء کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

حجابه النور الخ: ایک روایت میں لفظ نار ہے، اور دوسری روایت میں نور ہے، چونکہ حقیقت کے لحاظ سے نور و نار میں چنداں فرق نہیں ہے، اس لئے دونوں کا ترجمہ نور ہی سے کر دیا گیا ہے، ابو عبیدہ نے نار ہی کی مناسب سے قرآن کی آیت "فلما جاءها نودی ان بورک من فی النار ومن حولها" تلاوت فرمائی ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام کو صورت ہر میں تجلی ہوئی، تو معلوم ہوا کہ ذات پاک کا حجاب نار تھا، جس کے پس پردہ اس کی تجلی ہو رہی تھی، اس بابرکت نار اور بابرکت ماحول سے کسی تا سمجھ کو یہ دھوکہ نہ گئے کہ معاذ اللہ خدا کی ذات پاک کہیں ہفتہ آگ میں حل ہو کر آئی تھی۔ اس لئے فرمایا کہ وہ خود اس آگ اور سارے جہاں کا پالنے والا ہے، وہ جسم و جہت، حدوث و حلول کے آثار سے پاک و برتر ہے۔

حجاب لغت میں منع اور ستر کے معنی میں آتا ہے، حجاب سے مراد اصطلاحی پردہ نہیں، کہ اللہ تعالیٰ پرودہ کے پیچھے ہے، کیونکہ پردہ اجسام کے لئے ہوا کرتا ہے، جبکہ اجسام محدود ہیں، اور ذات باری غیر محدود، لہذا ذات خدا کے لئے اصطلاحی پردہ مراد نہیں ہو سکتا ہے، بلکہ حجاب بمعنی رکاوٹ اور مانع رویت ہے۔ یہاں مراد مانع رویت ہے، اسی مانع کو نور یا نار سے تعبیر کیا، اس لئے کہ ان دونوں کی شعاعیں رویت سے مانع ہوتی ہیں،

قوله سبحات: سین و باہ مضموم جمع شجرت، محدثین و لغویین نے سبحات وجہ سے خدائی نور و جلال مراد لیا ہے۔

قوله ما انتھی الیہ بصرہ الخ: مراد اس سے جمع مخلوقات کیونکہ حق تعالیٰ کی نگاہ ہر چیز کو محیط ہے، لفظ من جنسیت کے بیان کے لئے ہے مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ رویت کے مانع کو بیچ سے ہٹا دیں، اور تجلی فرمائیں تو اس عالم فانی کی



تمام مخلوق جل کر خاکستر ہو جائے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ بندوں کی طرف سے حجاب خود ان کا نفس اور اس کے صفات مخلوقات کے نفوس خود بہت بڑا حجاب ہے، جو رویت باری سے مانع ہے، کیونکہ وہ ظلمت مٹھل ہے، اگر نفس کا یہ حجاب اٹھادیا جائے، تو پھر رب کا وصال ہی ہو جائے، اور جو حجاب اللہ کی طرف سے ہے، وہ اس کا نور ہے، اس عالم میں حجاب نفس کے دور ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے، اسی حجاب کی وجہ سے کوئی انسان بلا حجاب کے حق تعالیٰ سے براہ راست بات بھی نہیں کر سکتا ہے، ہاں جب بندہ مقام احسان پر پہنچ جاتا ہے تو پھر دلوں پر تجلیات ربانی کا کچھ کچھ ظہور ہونے لگتا ہے، ”واعبد ربك كانك تراه“ (الحديث)

### نقل روایت میں امام مسلم کا احتیاط

لم يقل حدثنا الخ: امام مسلم کے غایت احتیاط کی دلیل ہے کہ ابو کریب اور ابو بکر سے جس طرح سنا اسی طرح نقل کیا، ابو کریب نے اپنی روایت میں حدثنا ابو معاویہ قال حدثنا الاعمش کہا تھا۔ اور ابو بکر نے ”حدثنا ابو معاویہ عن الاعمش یصفیہ عن کہا تھا۔ جب دونوں کی عبارت میں فرق تھا تو امام مسلم نے ظاہر فرمایا، اس سے دو فائدے حاصل ہوئے۔ (۱) حدیث اتفاق علماء اتصال کی دلیل اور عن کے بارے میں اختلاف ہے، اس میں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ عن بھی اتصال پر دلالت کرتا ہے، البتہ اگر راوی مدلس ہو تو اس کا عن اتصال پر محمول نہ ہوگا۔ تاوقتیکہ دوسرے ذرائع سے اتصال کا ثبوت نہ مل جائے،

(۲) اگر امام مسلم صرف ایک عبارت پر اکتفا کر لیتے تو ان کی عبارت میں نقص آجاتا، کیونکہ اگر صرف عن پر اکتفا کر لیا جاتا، تو حدیث کی قوت فوت ہو جاتی، اور روایت بالمعنی ہو جاتی، اور اگر اکتفا کر لیتے حدیث پر تو جن کی روایت میں کوئی زائد بات ہے، وہ روایت بالمعنی ہو جاتی، اور امام مسلم اس سے حتی الامکان پرہیز کرتا چاہتے ہیں۔

### باب اثبات روية المؤمنين في الآخرة لربهم سبحانه وتعالى

حدثنا نصر بن علي الجهضمي وابو غسان السمعی واسحاق بن ابراهيم عن ابی بکر بن

عبد الله بن قيس عن ابيه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال جنتان من فضة آنيتهما وما

فيهما وجنتان من ذهب آنيتهما وما فيهما وما بين القوم وبين ان ينظروا الى ربهم الا رداء

الكبرياء، على وجهه في جنة عدن۔ (بخاری ص ۷۲۳-۷۲۸ مسلم ۱۰۰-۹۹ ترمذی ص ۶۵۳)

ابو بکر بن عبد اللہ بن قیس اپنے والد سے اور وہ آنحضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں، کہ آپ نے ارشاد فرمایا،

کہ دو جنت ہیں، جن کے برتن اور کل سامان چاندی کے ہیں۔ اور دو جنت ہیں جن کے برتن اور کل سامان سونے کے ہوں گے۔ جنت میں جنتی، اور ان کے رب کی رویت کے سچ صرف اللہ کی بے پایاں عظمت حاکم ہوگی۔

### مسئلہ رویت باری

حدیث جبرئیل میں احسان کا طریقہ حاصل کرنے کے لئے ”واعبد ربك كانك تراه“ میں خدا کی رویت کا ذکر تھا،

مگر اس عالم کی رویت کو کائنات سے تعبیر کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ رویت حقیقی نہیں ہے۔ اس باب میں رویت حقیقی کا اثبات، اور اس کے وقت کی تعیین کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایمان کے مومن بہ کو شمار کرتے ہوئے، ایک روایت میں ”بلقاءہ“ کا لفظ بھی آیا ہے، لہذا کی بعض نے رویت سے تفسیر کی ہے، اور اگر یہ تفسیر صحیح نہ ہو تو پھر مقصد یہ ہوگا کہ دوسرے نصوص سے مسلمانوں کے لئے جنت میں دیدار خداوندی کی تصریح آئی ہے، امام مسلم اس باب میں بتانا چاہتے ہیں کہ ایمان کے مومن بہ میں ایک رویت باری بھی ہے، جس کی کیفیت اور تفصیل اس باب میں بتانا ہے، اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رویت ممکن ہے، عقلاً محال نہیں، اور اس پر بھی اجماع ہے کہ آخرت میں مسلمانوں کو رویت ہوگی، کفار محروم ہوں گے۔

معتزلہ، خوارج، اور بعض مرجیہ کا خیال ہے کہ رویت باری ناممکن اور عقلاً محال ہے، کسی کو رویت ہو ہی نہیں سکتی ہے، ان لوگوں کا نظریہ سراسر غلط اور جہالت پر مبنی ہے۔ کتاب و سنت اجماع صحابہ اور تابعین سے مؤمنین کے لئے، آخرت میں رویت ثابت ہے، تقریباً بیس صحابہ سے رویت کی روایت حدیث کی کتابوں میں درج ہے مکررین کے اعتراضات کا جواب متکلمین نے تسبیع عقائد میں عقلی نقلی دونوں طرح سے دیئے ہیں، ربا دنیا کا معاملہ تو اس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ ممکن ہے مگر اس کا وقوع نہیں ہے، امام ابو القاسم قشیری اپنے معروف و مشہور رسالہ میں امام ابو بکر بن خردک کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے امام ابو الحسن اشعری سے دو قول نقل کئے ہیں۔ ایک وقوع اور دوسرا عدم وقوع، ملا علی قاری شرح فقہ اکبر (شرح فقہ اکبر ص ۱۵۰) میں لکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ان ظاہری آنکھوں سے خدا کی رویت عقلاً ممکن ہے، اور آخرت میں عقلاً و نقلاً دونوں واقع اور ثابت ہے، دنیا میں شرعاً جائز ہونے کے بارے میں اکثر لوگ جائز سمجھتے ہیں، اور بعض اس کا انکار کرتے ہیں۔ جو لوگ شرعاً جائز سمجھتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو ایامہ المعراج میں رویت ہوئی، جس کی تفصیل پہلے گذر چکی۔

### رویت باری کے مدعی کا حکم

اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرے کہ میں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کو ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا ہے تو اگر اس کی مراد خواب میں دیکھنے کی ہے تو اس کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ اور اگر اس کی مراد بیداری میں دیکھنے کی ہے، تو پھر اس کا تجزیہ کیا جائے گا، اگر اس کا مقصد خدا کی رویت سے خدا کے انوار صفات، اور مصنوعات کے آثار مشاہدہ کرنے کا ہے، تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔ بعض صوفیہ سے منقول ہے ”ما رأیت شیئاً الا و رأیت اللہ قبلہ و بعدہ او فیہ او معہ“ اور اگر اس کی مراد بلا تأویل اللہ کی رویت ہے جیسے عام مبصرات کو بیداری میں دیکھا جاتا ہے تو یہ شخص فاسد گمان اور گمراہی میں پڑا ہوا ہے، بعض نے لکھا ہے کہ مشائخ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسا شخص گمراہ ہے، کیونکہ جب مومن علیہ السلام کو دنیا میں رویت نہیں ہوئی، تو اور کس کو ہوگی، بلکہ ایسے شخص کے بارے میں بعض عالم نے کفر تک کا فتویٰ دیا ہے، لیکن ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ اس کو گمراہ کہا جائے گا۔ کافر نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ اس میں تاویل کی گنجائش ہے کہ غلبہ حال کو رویت سے تعبیر کر دیا ہو، جیسے حدیث احسان میں ”واعبد ربک کأنک تراه“ میں استحضار کو ایک درجہ کارویت سے تعبیر کر دیا گیا

ہے، اگر رویت حقیقی پر اصرار ہو تو ایسے شخص پر تعزیری کارروائی ہو سکتی ہے، حاکم شرعی ایسے شخص کی مگرہی کا اعلان کرے اور جو مناسب سمجھے اس کو سزا دے۔

خواب میں اللہ تعالیٰ کو بہت سے اکابر امت نے دیکھا ہے، خود امام ابو حنیفہؒ نے سو بار دیکھا، امام احمدؒ سے منقول ہے کہ میں نے اللہ رب العزت کو خواب میں دیکھا، تو میں نے پوچھا کہ آپ کا قرب کس چیز سے حاصل ہو سکتا ہے تو فرمایا، اے احمد میرے کلام (قرآن) کے ذریعہ، میں نے دریافت کیا، سمجھ کر یا بے سمجھ تو فرمایا دونوں طرح سے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ سے اس قسم کے خواب منقول ہیں۔

### رویت باری پر حضرت نانوتویؒ کی تحقیق اہل حق

حضرت حمید الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی مشہور کتاب ”تقریر دل پزیر“ میں لکھا ہے کہ تجربات اور مشاہدات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حواس خمسہ یعنی قوت باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ دل میں ہے، اور آنکھ، کان، ناک، زبان وغیرہ مثل چشمہ کے ہے، جب بینائی کمزور ہو جاتی ہے تو چشمہ کی ضرورت پڑتی ہے، مگر چشمہ میں بینائی کی قوت نہیں ہوتی، بلکہ کمزور بینائی کے لئے معین و مددگار ہوتا ہے، حقیقت میں بینائی تو آنکھ میں ہوتی ہے اسی طرح ان حواس خمسہ کو سمجھنا چاہئے کہ اصل قوت تو دل میں ہوتی ہے، البتہ اس عالم میں عوارض کی وجہ سے اس کی قوت کمزور ہوتی ہے، تو یہ حواس اس کے لئے معین و مددگار بن جاتے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ حواس خمسہ کے ذریعہ جو چیزیں دل کو معلوم ہوتی ہیں وہ دل میں جا کر خلط ملط نہیں ہوتیں، بلکہ دل میں یہ پہچان، اور اختیار باقی رہتا ہے، کہ فلاں چیز آنکھ سے معلوم ہونے کے لائق ہے، اور فلاں چیز کان، اور ناک وغیرہ سے، آواز کے بارے میں اس کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہ کان سے حاصل ہو سکتا ہے، آنکھ سے نہیں، اگر دل میں آنکھ، کان نہیں، تو یہ تمیز کیونکہ ہوئی؟ بس دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ کان، آنکھ کے ذریعہ مسوع اور مبصر میں صفائی زیادہ ہوتی ہے۔ دل کے کان، آنکھ سے اتنا صاف سنا اور دیکھا نہیں جاسکتا ہے، جیسے عینک کے لگانے سے کمزور نگاہ والوں کو صاف نظر آنے لگتے ہیں، دیکھو خواب میں باوجودیکہ حواس معطل ہوتے ہیں، خاص کر آنکھیں تو بالکل بند ہی ہو جاتی ہیں، مگر چونکہ خیالات میں صفائی آ جاتی ہے تو ہر شخص اس وقت یونہی یہی خیال کرتا ہے، کہ آنکھ، کان سے دیکھ سن رہا ہوں، اور اس وقت کار دیکھنا سنا ایسا ہی واضح ہوتا ہے جیسے بیداری کا دیکھنا سنا، اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ بیداری میں جس چیز کا زیادہ دھیان رہتا ہے، اکثر انہیں چیزوں کو خواب میں دیکھتا ہے۔ تو اب غور کیجئے کہ جو لوگ شب و روز خدا کے خیال اور دھیان میں رہتے ہیں، اور دنیاوی خیالات فقط تقاضائے بشری کی وجہ سے ان کے دل میں آتے ہیں، دنیا کی محبت اور رغبت برائے نام ہوتی ہے، جب یہ لوگ اس دنیا سے گذر جائیں گے، تو یہ بشری تقاضے بھی چھوٹ جائیں گے، اور اس کے بعد تو دنیا کے تازہ خیالات بھی نہیں آئیں گے۔ اور ایک مدت کے بعد تو پرانے خیالات بھی محو ہو جائیں گے، کیونکہ انسان کو جس چیز سے محبت نہیں ہوتی، اس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا، تو مرنے کے بعد نہ دنیا کا تازہ خیال آیا، اور جو پرانے خیالات تھے وہ بھی محو ہو گئے۔ تو اب صرف ایک خیال خدا کا باقی رہا، اور ظاہر ہے کہ خدا کی طرف توجہ اور کثرت یاد کا سبب بجز محبت یا خوف کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور جن خیالات کا باعث، محبت یا خوف ہوتا ہے اس کی جگہ دل کے اندرونی حصہ میں ہوتی ہے۔

اور جو چیز تہہ دل میں ہو پھر ہمیشہ وہی اسی کار بہتا ہے، دوسری طرف خیالات نہیں جاتے، ظاہر ہے ایسی حالت میں دل کے خیالات کی صفائی اس سے زیادہ ہونی چاہئے، جتنی خواب میں ہوتی ہے۔ کیونکہ خواب میں تو صرف حواس معطل ہو جاتے ہیں، اور کوئی خیال بھی دل سے محو نہیں ہوتا، اس کے سوا دنیا میں جسمانی کدورت سے دل مکدر ہوتا ہے، پھر بدن کا میل کچیل، پاخانہ، پیشاب سے الگ نکدر ہوتا ہے۔ ہاں یہ کدورتیں اگر جاتی ہیں تو مرنے کے بعد ہی بالخصوص جو لوگ نزع کی تکلیف، اور محشر کی ہولناکی، اور قبر کے بھیانک منظر کے قائل ہیں، ان لوگوں کے یہاں تو یہ چیزیں دنیوی خیالات کی گندگی کو دور کرنے کے لئے ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسے میل کچیل، دور کرنے کے لئے غسل خانہ میں نہانا، میل کچیل دور کروانا، بہر حال جب مرنے کے بعد جسمانی نکدر جو صفائی اور وضاحت کے لئے مانع تھا، ختم ہو گیا تو نیک لوگوں کے دلوں میں جو خیال خداوندی ہے اس کی وضاحت خواب کے خیال کی وضاحت سے تو کیا؟ ان آنکھوں سے دیکھنے کی صفائی سے بھی زیادہ ہونی چاہئے، کیونکہ دنیا میں بیداری کی حالت میں تشویش اور انتشار زیادہ ہوتا ہے، اور یہ انتشار مرنے کے بعد دور ہو جاتا ہے۔ اب سوچو اگر ایسے لوگوں کو خدا کا دیدار ہو، تو کیا استحالہ ہے؟ دل کے دیدار کے لئے تو مرنے کے مکان و جہت کی بھی ضرورت نہیں ہے، ہاں جو لوگ محبت دنیا میں ڈوبے ہوئے تھے، ان کے خیالات دنیوی باقی رہے، اور اسی کا خیال دامن گیر رہے تو ہم اس کا انکار نہیں کرتے، پر یہ بھی نہیں کہتے کہ ان کو بھی دیدار خداوندی ہونا چاہئے۔ (تقریر دلی پڑھیں ص ۱۱۶)

نیز معتزلہ وغیرہ جو جہت و مکان کی وجہ سے رویت کا انکار کرتے ہیں وہ اس لئے بھی غلط ہے کہ رویت تو صرف اس قوت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں میں پیدا کرتا ہے، اس میں شعاعوں کا اتصال مرنے کا سامنے ہونا، رویت کی حقیقت سے خارج ہے البتہ دنیا میں رویت کے لئے ان چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے مگر نفس رویت میں ان چیزوں کی کوئی شرط نہیں، آخرت ایک دوسرا عالم ہے وہاں کے حالات یہاں سے بالکل جداگانہ ہیں، اگر وہاں جہت، مکان وغیرہ کی بھی عاودہ ضرورت نہ رہے تو کیا بعید ہے؟ آخر آج سے قبل دنیا میں سمجھتی تھی کہ بولنے کے لئے زبان کی ضرورت ہے، مگر سائنسی ایجاد نے ثابت کر دیا کہ بولنے کے لئے زبان کی بھی ضرورت نہیں، آخر ٹیپ ریکارڈ میں کوئی زبان ہے، جو بولنے والے کی آواز کو نقل کرتا رہتا ہے، عالم آخرت میں انسانوں کی انھیں گویا ہوں گی، اور بجائے زبان کے خود انگلیاں بولیں گی۔ جن کو خدا کی قدرت پر کامل یقین ہے، وہ ان کے لئے کسی بھی محال کو محال نہیں سمجھے گا، اگر ہماری طرح ان کے نزدیک بھی کوئی چیز محال باقی رہ جائے تو پھر مخلوق اور خالق میں فرق ہی کیا رہا؟ اھدنا الصراط المستقیم

### شرح حدیث

قوله جنتان من فضة آیتھما وما فیھما: بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو جنت خالص سونے کی ہوگی، اس میں چاندی کا نام و نشان نہ ہوگا، اسی طرح دو خالص چاندی کی، جس میں سونا بالکل نہیں ہوگا، حالانکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ ہم لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ ارشاد فرمائیں، کہ جنت کی عمارت کس چیز کی ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ ایک اینٹ سونے کی، اور ایک اینٹ چاندی۔ (ترمذی) اس کی تائید عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت سے ہوتی ہے جو طبرانی میں ہے۔

اور بزاز میں ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی تعمیر، ایک اینٹ سونا، اور ایک اینٹ چاندی سے کی

ہے۔ دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ابو ہریرہؓ کی روایت کا تعلق برتن اور دیگر سامانوں کیساتھ ہے، اور بعد کی روایت کا تعلق جنت کی دیواروں سے ہے۔ پہلی میں اس کی تصریح ہے کہ جنت کی دیوار میں ایک اینٹ سونا، اور ایک اینٹ چاندی کی ہے۔ اس صورت میں ”آئیتھما وما فیہما من ذہب“ سے بدل ہے۔

قوله الارداء الکبریاء الخ: اہل عرب بکثرت استعارات کا استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کو فصاحت کا اعلیٰ درجہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ”رداء الکبر علی وجہ“ اور ”اخفض لہما جناح الذل“ وغیرہ اسی قبیل سے ہے۔ جس کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا ان کو اس قسم کی حدیثوں میں سخت الجھن کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بعض لوگ تو اسی قسم کی حدیث کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے لئے جسم تک کے قائل ہو گئے ہیں۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر سے منزہ ہے، اور پھر اس کی مراد ان پر واضح نہیں ہوئی، تو انہوں نے دو میں سے ایک راستہ اختیار کیا، یا تو ان کو راوی کی تکفیر کرنی پڑی، یا اس کی تاویل کے ذریعے ہوئے کہ رداء کبریا استعارہ ہے اللہ کی عظمت، ہیبت، اور اس جلال سے جو مانع رویت ہے۔

تو مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی قوت بصر یہ کمزور ہونے کی وجہ سے اللہ کا دیدار نہیں کر سکتی ہے ہاں جب انکی نگاہ قلب کو قوی کر دیا جائے گا تو ہیبت و عظمت کا حجاب اٹھالیا جائے گا، اس صورت میں ”الارداء الکبریاء“ کے بعد ”فانہ ینظر علیہم برفعہ فیحصل لہم الفوز بالنظر الیہ“ کو مقدم کرنا پڑے گا، تاکہ مطلب یہ ہو جائے کہ جب مؤمنین جنت میں اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ کی رویت میں صرف اس کی عظمت و جلال حائل ہوگی، اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ جنتیوں کا اعزاز و اکرام کرنا چاہیں گے، تو اپنی خاص مہربانی سے ان کی نگاہوں میں رویت باری کی خفاقت پیدا کر دیں گے، اور لوگ اللہ کا دیدار کریں گے۔ اس کے بعد والی حضرت صہیب کی روایت میں ”غیکشف الحجاب“ سے ”وہی رداء الکبریاء“ مراد ہے، گویا امام مسلم نے حضرت صہیب کی روایت کو لا کر ابو موسیٰ کی روایت کے رداء الکبریاء کی تفسیر حجاب سے کر دی، ممکن ہے حدیث صہیب سے حدیث ابو موسیٰ کی شرح و تاویل ہی مقصود ہو۔

قوله علی وجہ الخ: علامہ طبری کہتے ہیں، کہ ”علی وجہ رداء الکبریاء“ سے حال ہے۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ (المنہج ج ۱ ص ۴۱۲) رداء استعارہ ہے، اور یہ کنایہ ہے عظمت و جلال سے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے ”الکبریاء رداء العظمت ازاری“ چونکہ رداء اور ازار اہل عرب کے لوازمات میں سے ہے، وہ کبھی ان سے جدا نہیں ہوتے، اور یہ ذریعہ عزت و عظمت ہے، تو کبریا کو ازار اور رداء سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں، حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عزت و عظمت اور اس کے استغناء کا تقاضہ یہ تھا، کہ کوئی اسکو نہ دیکھے لیکن مؤمنین پر رحمت و درأفت کا تقاضا ہے کہ ان کو اپنا دیدار کرائیں، تاکہ جنت کے نعمت کی تکمیل ہو۔ اس لئے مانع یعنی کبریا کو ہٹا کر اپنا دیدار کرائیں گے۔

فی جنة عدن الخ: اس کا تعلق اہل جنت سے ہے، یعنی رویت کے وقت وہ لوگ جنت میں ہوں گے۔ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں ہے، کیونکہ اس کو کوئی مکان احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔

قوله تریدون الخ: ہمزہ استفہام مقدر ہے، اتریدون شیئاً“ قوله ازیدکم، جنت کی نعمت میں اضافہ۔

قوله تنجینا من النار الخ: اہل جنت ہی کو نعمت کی انتہاء سمجھیں گے کہ جہنم سے رہائی مل گئی۔ اور جنت میں

طرح طرح کی نعمت مل گئی۔ اس سے آگے کا تصور بھی نہیں کر سکیں گے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنا دیدار کرائیں گے، تو اس کے سامنے ساری دولت چچ معلوم ہوگی۔

قوله ثم تلا للذين احسنوا الحسنی: حتیٰ سے اچھا بدلہ، یعنی جنت اور ”زیادہ“ سے دیدار باری مراد ہے۔ زیارت کی تحوین کو تعظیم کے لئے مانا جائے یعنی ”زیادۃ عظیمہ لا یعرف قدرها ولا یکنہ کنہها“

## باب معرفة طریق الرویة

حدثنی زهير بن حرب..... عن عطية بن يزيد الليثی ان ابا هريرة اخبره ان ناسا قالوا لرسول الله صلى الله عليه وسلم يا رسول الله هل نرى ربنا يوم القيامة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم هل تضارون في القمر ليلة البدر قالوا لا يا رسول الله قال هل تضارون في الشمس ليس دونها سحاب قالوا لا قال فانكم ترونه كذلك يجمع الله الناس يوم القيامة فيقول من كان يعبد شيئاً فليتبعه فيتبع من يعبد الشمس الشمس ويتبع من يعبد القمر القمر ويتبع من يعبد الطواغيت الطواغيت وتبقى هذه الامة فيها منا فقوها فيا تيهيم الله في صورة غير صورته التي يعرفون فيقول انا ربكم فيقولون نعوذ بالله منك هذا مكاننا حتى ياتيئنا ربنا فاذا جاء ربنا عرفناه فيا تيهيم الله في صورته التي يعرفون فيقول انا ربكم فيقولون انت ربنا فيتبعونه ويضرب الصراط بين ظهراني جهنم فلكون انا وامتى اول من يجيز ولا يتكلم يومئذ الا بالرسول ودعوى الرسل يومئذ اللهم سلم سلم وفي جهنم كالليب مثل شوك السعدان هل رأيتم السعدان قالوا نعم يا رسول الله قال فانها مثل شوك السعدان غير انه لا يعلم ما قدر عظمها الا الله تخلف الناس باعمالهم فمنهم المؤيق يعنى بعمله ومنهم المجازي حتى ينجي حتى اذا فرغ الله من القضاء بين العباد واراد ان يخرج برحمته من اراد من اهل النار امر الملائكة ان يخرجوا من النار من كان لا يشرك بالله شيئاً ممن اراد الله ان يرحمه ممن يقول لا اله الا الله فيعرفونهم في النار يعرفونهم باثر السجود تاكل النار من ابن آدم الا اثر السجود حرّم الله على النار ان تاكل اثر السجود فيخرجون من النار قد امتحشوا فيصّب عليهم ماء الحياة فينبتون منه كما تنبت الحبة في حميل السيل ثم يفرغ الله من القضاء بين العباد ويبقى رجل مقبل بوجهه على النار وهو آخر اهل الجنة دخولا الجنة فيقول اي رب اصرف وجهي عن النار فانه قد قشبنى ريحها واحرقني ذكاه فيدعوه الله ماشاء الله ان يدعوه ثم يقول الله تعالى هل عسييت ان فعلت ذلك بك ان تسأل غيره فيقول لا اسئلك غيره ويعلى ربه عزوجل من عهد وموآثيق ماشاء الله فيصرف الله وجهه عن النار فاذا اقبل على الجنة ورأها سكنت ماشاء الله ان يسكت ثم يقول اي رب قد منى الى باب الجنة فيقول الله له اليس قد اعطيت عهودك وموآثيقك لا تستلنى

غیر الذی اعطیتک ویلک یا ابن آدم ما اعذرک فیقول ای رب یدعو اللہ حتی یقول له فهل عسیبت ان اعطیتک ذالک ان تسأل غیرہ فیقول لا وعزتك فیعطی ربہ ما شاء اللہ من عہود ومواثیق فیقدمہ الی باب الجنة فاذا قام علی باب الجنة انْفَهَقَتْ له الجنة فرأى ما فیہا من الخیر والسرور فیسکت ما شاء اللہ ان یسکت ثم یقول ای رب ادخلنی الجنة فیقول اللہ تعالیٰ له اليس قد اعطیت عہودک ومواثیقک ان لا تسأل غیر ما أعطیت ویلک یا ابن آدم ما اعذرک فیقول ای رب لا لکونن اشقی خلقک فلا یزال یدعو اللہ حتی یضحک اللہ عزوجل منه فاذا ضحک اللہ منه قال ادخل الجنة فاذا دخلها قال اللہ له تمنّہ فیسأل ربہ ویتمنی حتی ان اللہ لیذکرہ من کذا وکذا حتی اذا انقطعت بہ الامانی قال اللہ ذالک لک ومثلہ معہ

قال عطاء بن یزید وابوسعید الخدری مع ابی ہریرۃ لا یرد علیہ من حدیثہ شیئاً حتی اذا حدث ابوہریرۃ ان اللہ عزوجل قال لذالک الرجل ذالک لک ومثلہ معہ قال ابوسعید وعشرۃ امثالہ معہ یا اباہریرۃ قال ابوہریرۃ ما حفظت الا قوله ذالک لک ومثلہ معہ قال ابوسعید اشہد انی حفظت من رسول اللہ ﷺ قوله ذالک لک وعشرۃ امثالہ قال ابوہریرۃ وذالک الرجل آخر اهل الجنة دخول الجنة. بخاری ص ۱۱۰۶-۷۴۲۷ مسلم ۱۰۰-۱۰۱ ترمذی ص ۲۵۵۷.

ترجمہ حضرت ابو ہریرہ نے خبر دیا عطاء بن یزید لیثی کو کہ آنحضور ﷺ سے کچھ لوگوں نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول، کیا ہم لوگ قیامت کے دن اپنے رب کا دیدار کریں گے، تو آپ نے ارشاد فرمایا کیا چودھویں رات کا چاند دیکھنے میں باہم مزاحمت کرتے ہو، لوگوں نے عرض کیا نہیں اے اللہ کے رسول، آپ ﷺ نے دریافت کیا کھلے آسمان میں آفتاب کو دیکھنے میں باہم کسی طرح کی مزاحمت ہوتی ہے، لوگوں نے عرض کیا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں کو اسی طرح خدا کا دیدار ہوگا، اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام لوگوں کو اکٹھا کرے گا، اور حق تعالیٰ فرمائے گا، جو شخص جس کو پوجتا تھا وہ اس کے ساتھ ہو جائے، چنانچہ پرستار سورج، سورج کے ساتھ لگ جائے گا، اور پرستار قمر، قمر کے ساتھ لگ جائے گا، اور ست پرست بتوں کے ساتھ، صرف اس امت کے لوگ باقی رہ جائیں گے، جن میں منافقین بھی ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے رو برو آئے گا۔ اس صفت کے خلاف جس صفت کیساتھ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کہے گا میں تمہارا رب ہوں وہ لوگ نعوذ باللہ منک کہیں گے، ہم لوگ اس وقت اسی جگہ جسے رحیں گے، جب تک ہمارا رب ہمارے درمیان نہ آجائے، جب ہمارے رب آجائیں گے تم ہم سے پہچان لیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اسی صفت پر تجلی فرمائیں گے جس صفت پر مسلمان اس کو پہچانتے ہیں، اور کہے گا میں تمہارا رب ہوں، تو یہ لوگ کہیں گے (واقعی) آپ ہمارے رب ہیں، پھر مسلمان ان (فرشتہ یا حکم خدا) کے قمع ہو جائیں گے، اور پھر لحد جہنم کے دونوں کنارے پل کی طرح بچھا یا جائے گا، سب سے پہلے میں اور میری امت اس کو پار کرے گی، اس روز رسولوں کے سوا کسی میں بات کرنے کی ہمت نہ ہوگی، اور رسولوں کی مدد سے اس دن، اللہم سلم سلم ہوگی۔ اور جہنم میں خاردار درخت کی طرح آگ لڑے ہوں گے، کیا تم لوگوں نے خاردار درخت دیکھا ہے؟ لوگوں

نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا کہ وہ سعدان کی طرح ہوگا، ہاں اس کی بڑائی کی مقدار اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، لوگوں کے اعمال کے لحاظ سے اپک لے گا، کچھ تو اپنی بد عملی کے سبب ہلاک ہونے والوں میں ہونگے اور کچھ لوگ گنہگار دیئے جائیں گے حتیٰ کہ ان کو نجات دیدی جائے گی، جب اللہ تعالیٰ بندوں کے فیصلوں سے فارغ ہو جائے گا اور ان کا روادہ کچھ جہنمیوں کو نکالنے کا ہوگا، تو فرشتوں کو حکم دے گا کہ جہنم سے ان لوگوں کو نکالو، جنہوں نے خدا کیساتھ کسی کو عبادت وغیرہ میں شریک نہ ٹھہرایا ہو، جو توحید کا فائل ہوگا انہیں لوگوں پر مہربانی کرے گا۔ فرشتے اہل توحید کو جہنم میں پہچانیں گے اور ان کو سجدہ کے نشان سے پہچانیں گے، بنی آدم کے سجدہ کے نشان کو چھوڑ کر جہنم کی آگ ہر چیز کو جلا ڈالے ہوگی، جہنم پر اللہ تعالیٰ نے سجدہ کے نشانات کو حرام کر دیا ہے وہ جہنم سے ایسی حالت میں نکالے جائیں گے کہ جلنے کے بعد ان کے جسم کی صرف ہڈیاں نظر آئیں گی پھر ان پر ملہ حیات بہایا جائیگا۔ وہ اس طرح (نئے سرے سے) آگ آئیں گے جیسے دلہ ندی کے کنارے آگ آتا ہے پھر اللہ تعالیٰ بندوں کے فیصلوں سے فارغ ہو جائے گا صرف ایک شخص بچ جائے گا، اور اس کا رخ جہنم کی طرف ہوگا اور یہ سب سے آخر میں جنت میں جائے گا، وہ کہے گا اے میرے رب میرا چہرہ جہنم سے پھیر دیجئے کہ اس کے دھواں سے مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے اور اس کی سخت لپٹ نے مجھے جلا ڈالا ہے دو جب تک اللہ چاہے گا پکارتا رہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا تم سے امید ہے کہ اگر اس کو کروں، تو اس کے علاوہ بھی تم مانگ کر نے لگو، تو وہ کہے گا میں اس کے علاوہ مانگ نہیں کروں گا، اور اللہ جو چاہے گا عہد و پیمان کرے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو جہنم سے پھیر دیا، جب جنت کی طرف رخ ہو جائے گا، اور اس کو دیکھ لے گا تو جب تک اللہ چاہے گا خاموش رہے گا، پھر کہے گا اے میرے رب مجھے جنت کے دروازہ کے قریب کر دیجئے، اللہ تعالیٰ کہے گا، کیا تم نے عہد و پیمان نہیں کیا تھا کہ اس کے علاوہ کی مانگ نہیں کروں گا، جو میں نے تم کو دیدیا تعجب ہے اے بنی آدم تو کتنا غدار ہے۔ تو وہ کہے گا اے میرے رب پکارے گا اللہ کو یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس سے کہے گا، کہ کیا تم سے امید ہے اگر اس کو پورا کروں تو اس کے سوا بھی تم مانگ کر نے لگو۔ تو وہ کہے گا قسم ہے میرے عزت کی اس کے سوا کوئی مانگ نہیں کروں گا، پھر وہ اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کرے گا جو اللہ چاہے گا، پھر اس کو جنت کے دروازہ کے قریب کر دیں گے، جب جنت کے دروازہ پر کھڑا ہوگا، تو اس کے لئے دروازہ کھل جائیگا، اور وہاں کے خیر اور مسرت کن چیزوں کو دیکھ کر جب تک اللہ تعالیٰ خاموشی چاہے گا، خاموش رہیگا، پھر کہے گا، اے میرے رب مجھے جنت میں داخل کر دیجئے، تب اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا، کیا تو نے عہد و پیمان نہیں کیا، کہ اسکے سوا کی مانگ نہیں کروں گا، تعجب ہے تجھ پر اے بنی آدم تو کس قدر غدار ہے تو وہ کہے گا اے میرے رب مجھے اپنے مخلوق میں سب سے شقی مت بنادے، اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کو برابر پکارتا رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہنس پڑے گا، اور جب اس سے خوش ہو جائے گا تو کہے گا جنت میں چلے جاؤ، جب جنت میں داخل ہو جائے گا تو حق تعالیٰ اس سے کہے گا تمنا کرو تو اللہ سے سوال کرے گا، اور تمنا کرے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو یاد دلانے گا، کہ فلاں فلاں چیز کی تمنا کرو، یہاں تک کہ جب اس کی تمنائیں ختم ہو جائیں گی، تو حق تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ ساری تمنائیں تم کو دیں اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور، عطاء بن یزید کہتے ہیں کہ ابو سعید خدری ابو ہریرہ کے ساتھ (بیٹھے ہوئے سن رہے) تھے اور حدیث کے کسی حصہ کی تردید نہیں کی، البتہ جب ابو ہریرہ نے اس حصہ کو بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص



فرمایا "ذالك لك ومثله معه" تو ابو سعید بول پڑے کہ اے ابو ہریرہ اور دوس گنا اس کے ساتھ اس پر حضرت ابو ہریرہ بولے کہ مجھے تو صرف ذالك لك ومثله معه یاد ہے ابو سعید نے فرمایا کہ خدا گواہ ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے آپ کا یہ ارشاد "ذالك لك وعشرة امثاله" محفوظ کیا ہے۔ ابو ہریرہ نے فرمایا یہ شخص سب سے اخیر میں جنت میں جائے گا۔

**تشریح** قوله هل نرى ربنا يوم القيامة الخ: یوم قیامت کی قید سے معلوم ہوا کہ سوال دنیا میں رویت باری کا نہیں ہے۔ مسلم شریف میں حضرت ابولہامہ کی حدیث میں تصریح ہے "واعلموا انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا" (مسلم)

قوله هل تضارون الخ: تضارون بضم التاء وتشدید الراء باب مفاعلة سے صُدر سے ماخوذ ہے اصل میں تضارون تضرعون تھا معنی میں "لا تضارون احداً" کے ہے یعنی چاند کو دیکھنے میں کوئی کسی کے لئے مانع نہیں بنتا، لہذا قدس اور پستہ قدس سب ہی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں، ممکن ہے صحابہ یہ سمجھتے ہوں کہ میدان حشر کے اتنے بڑے ہجوم میں سب لوگ آسانی دیدار نہیں کر سکیں گے، لہذا قدس والے آڑ بچاتے ہیں، کبھی کوئی مکان، پہاڑ، درخت حائل ہو جاتے ہیں، اس شبہ کو دور کرنے کے لئے ایک مثال دی گئی کہ دنیا میں چاند ہر شخص دیکھتا ہے اور کوئی کسی کے لئے حاسب اور مانع نہیں ہوتا اسی طرح رویت باری کو سمجھ لو۔

قوله هل تضارون فی الشمس الخ: سوال یہ ہے کہ مخاطب کو سمجھانے کے لئے چاند کی مثال کافی تھی اس کے بعد سورج کے مثال کی کیا ضرورت پیش آئی، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نور قمر کا احساس صرف بینا لوگوں کو ہوتا ہے نابینا کو اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا ان کو لوگوں کے بتانے پر قمر کا تقلیدی علم ہوتا ہے بخلاف شمس کے اس کا احساس بینا اور نابینا سب کو ہوتا ہے دوپہر کے وقت دھوپ کی تمازت اندھے بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے نابینا کو سمجھانے کے لئے قمر کے بعد شمس کی ضرورت پیش آئی، حافظ ابن حجر کا خیال یہ ہے کہ شمس کا عطف قمر پر اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ چاند کی روشنی آسانی سے دیکھی جاتی ہے اس میں آنکھوں پر کسی قسم کا بوجھ نہیں پڑتا، البتہ آفتاب کی روشنی میں آنکھوں پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے گرچہ مناسب تو یہی تھا کہ صرف پہلی مثال پر اکتفا کر لیا جاتا مگر ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی مجلس میں قمر کی مثال دی گئی ہو، اور کسی دوسری مجلس میں آفتاب کی مثال اور مقصد صرف یہ ہو کہ سب لوگ آسانی دیدار کر لیں گے کوئی کسی کے لئے مزاحم نہ ہو گا، ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایک ہی مجلس میں شمس و قمر دونوں کی مثال دی گئی تو پھر اعتراض ہو سکتا ہے کہ صرف قمر کی مثال سے بات واضح ہو جاتی ہے تو اس کے بعد شمس کی مثال کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس کا جواب علامہ شبیر احمد عثمانی نے یہ دیا ہے کہ مشابہ شمس و قمر دونوں کو بنانے میں ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی مختلف نوع سے ہوگی، اور اس تنوع کو شمس و قمر کی مثال سے سمجھایا گیا ہے کہ دیکھو آفتاب کی روشنی رات میں قمر کے ذریعہ زمین پر پھیلتی ہے تو اس کے آثار، رنگ و روپ کچھ اور ہوتے ہیں بلکہ عام لوگ تو یہ بھی نہیں سمجھتے ہیں کہ چاندنی دراصل آفتاب ہی کی روشنی ہے البتہ اس کو خواص جانتے ہیں۔ اور جب یہی آفتاب دن میں نکلتا ہے تو اس کے آثار، خصوصیات، رنگ و روپ کچھ اور ہی ہوتا ہے، اور ہر عام و خاص اس کو سمجھتا ہے کہ یہ آفتاب ہی کا نور ہے، اس کا کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا، اسی طرح حق تعالیٰ پہلی بار مومنین کے سامنے تجلی فرمائیں گے تو ایسی صورت میں تجلی ہوگی کہ لوگ پہچان نہیں

سکین گے حالانکہ بلاشبہ وہ تجلی حق تعالیٰ کی ہوگی، اور وہ یہ کہے گا انا ربکم مگر اس کے باوجود لوگ نہیں پہچان سکیں گے، پھر دوبارہ ایسی تجلی ہوگی کہ کسی کو انکار کی مجال نہ ہوگی، اور پہچان کر سجدہ میں گر پڑیں گے، آنحضور ﷺ نے شمس و قمر سے تشبیہ دے کر ظاہر فرمادیا کہ اللہ کی تجلی مختلف طرح سے ہوگی۔ (فتح المصنوع ص ۳۲۲)

قوله فانکم ترونہ الخ: یہاں تشبیہ رویت کی رویت سے ہے کہ جس طرح شمس و قمر کی رویت واضح، یقینی اور بے غبار ہوتی ہے یہی حال رویت باری کا ہوگا، مرنی کو مرنی سے تشبیہ دینا نہیں ہے، ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے شمس و قمر سے زیادہ واضح تو یہ تھا کہ آسمان کو مشابہ بنایا جاتا تو شمس و قمر سے عظیم بھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند و سورج میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ اس میں روشنی ہوتی ہے، اسی لئے کسی کے جمال و کمال کو شمس و قمر سے تشبیہ دی جاتی ہے یہ بات آسمان میں نہیں ہے، اس لئے شمس و قمر سے تشبیہ دی گئی چونکہ تشبیہ میں معروف و مشہور بھی یہی ہے۔

قوله من کان یعبدا شیئاً فلیتبعہ الخ: حافظؒ نے فرمایا کہ عبد اللہ بن مسعود کی روایت میں ہے "ثم ینادی منادی من السماء ایہا الناس ایس عدل من ربکم الذی خلقکم وصورکم ورزقکم ثم تولیتکم غیرہ ان یوتی بکل عبد ما کان تولی قال فیقولون بلی ثم یقول لتنتقل کل امة الی من کانت تعبدہ" یعنی کوئی پکارنے والا اوپر سے اعلان کرے گا کہ لوگو کیا تم لوگ اپنے رب سے نہیں پھرے جس نے تمکو پیدا کیا تمہاری صورت گری کی تم کو روزی دی پھر تم نے اس کو چھوڑ کر دوسروں کو مالک بنالیا، اس کے بعد کہے گا ہر جماعت اپنے معبود کی طرف چلی جائے۔

قوله ومن کان یعبدا الطواغیت الخ: جمع طاغوت کی، شیطان، بت، طبریؒ نے فرمایا ہے کہ طاغوت ہر وہ شخص جو اللہ سے سرکشی کرے غیر اللہ کی پرستش کرے خواہ اس سے ڈر کر یا اسکی محبت میں، انسان ہو، یا حیوان، یا جمادات ہو یا شیطان، ابو سعید خدریؒ کی روایت جو بخاری کی کتاب التوحید میں ہے اس کے الفاظ ہیں "فیذهب اصحاب الصلیب مع صلیبہم واصحاب الاوثان مع اوثانہم واصحاب کل آلهة مع الہتم" (بخاری ج ۲ ص ۱۱۰) اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو شخص شیطان کو پوجے یا جس کی پرستش سے شیطان کو خوشی ہوتی ہے اور جمادات ہو یا حیوانات سب اس میں داخل ہیں، رہے وہ لوگ جن کی پرستش سے خود پوجے جانے والوں کو خوشی نہیں ہوتی وہ ان میں داخل نہیں، جیسے فرشتہ، عیسیٰ علیہ السلام، عبد اللہ بن مسعود کی حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ معبودوں کی تصویر پوجنے والوں کو دکھائی دیں گے، اور اس کو دیکھ کر وہ لوگ اس کی طرف چل پڑیں گے، اور علامہ ابن عبد الرحمن کی روایت میں ہے کہ صلیب کے پجاری کو صلیب اور تصویروں کے پجاری کو تصویروں دکھائی دیں گی، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے یہود و نصاریٰ کے معبود عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کے سوا باقی مشرکین کے تمام معبود حاضر کئے جائیں گے، رہا تصویر و تمثیل کی تعبیر تو اس کے بارے میں ابن عربیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ تمثیل کی تعبیر یا تو پجاریوں کو اسمعہاء میں ڈالنے کے لئے ہو یا اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں، کہ ان کی تصویر دکھائی جائے گی خود ان لوگوں کو لایا نہیں جائے گا، کیونکہ وہ لوگ عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ ان کے سوا باقی معبودان باطل خود حاضر کئے جائیں گے جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے "انکم وما تعبدون من دون اللہ حسب جہنم" (فتح الباری)

قوله وتبقى هذه الامة فیہا منافقوها الخ: امت سے امت محمدیہ مراد لے لیا اس میں تمام اہل توحید کو

شامل کرلو تو جنات بھی آجائیں گے اسی تعیم کی خاطر بعض روایت میں یبقی من کان یعبد اللہ من یرو فاجر کالغظ آیا ہے۔ اور یہ بات اس حدیث کے ”فانکون اول من یحییٰ“ سے بھی سمجھ میں آتی ہے، اس لئے کہ اس میں اشارہ ہو رہا ہے کہ دیگر انبیاء اپنی امتوں کو اس کے بعد ہی پل صراط پار کرائیں گے۔ (فتح الباری)

قوله فیہا منافقوها الخ: اس سے بظاہر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ منافقوں کو بھی رویت باری ہوگی اس کی صورت یہ ہوگی کہ جس جماعت میں منافقین اور مؤمنین سب ہی ہوں گے اللہ تعالیٰ کے دیدار کے وقت امتحان ہوگا جو سجدہ کر لیں گے وہ مؤمن مخلص ہوں گے، اور جن کو سجدہ پر قدرت نہیں ہوگی، وہ منافق ہوں گے اس سے منافقوں کو رویت حاصل ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔

### کیا اللہ کی کوئی صورت ہے؟

قوله فیاتہم اللہ فی صورۃ غیر صورۃ الخ: اتیان کی نسبت خدا کی طرف یا تو مجاز ہے رویت سے، اس لئے کہ جب تک کوئی آنے والے ان کی رویت عادت نہیں ہوتی ہے، اس لئے یہاں رویت کو اتیان سے تعبیر کیا گیا۔  
رہی صورت کی بات تو ابن قتیبہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حق تعالیٰ کی بھی ایک صورت ہے مگر ان کے مناسب حال جیسے ہر مخلوق کی صورت الگ الگ ہے، اور اس کے مناسب حال ہے۔

فرقہ مجسمہ نے اللہ تعالیٰ کے لئے اُنر مخلوق کی طرح صورت مانا ہے تو یہ سراسر لفظ اور باطل ہے، جبکہ یہاں صورت کے معنی علامت کے بھی ہو سکتے ہیں، مقصد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لئے اپنی رویت کی کوئی علامت مقرر کر دیا ہو، جس سے مسلمانوں کو رویت کا یقین ہوگا، اسی وجہ سے دلیل اور علامت کو صورت کہہ دیتے ہیں۔ اور صورت کو صفت کے معنی میں بھی لیا جاسکتا ہے، بولتے ہیں صورت مسئلہ اور یہی مطلب ہے ”ان اللہ خلق آدم علی صورۃ“ (مشکوٰۃ) کا یعنی علی صفتہ امام بیہقی کا میلان خاطر اسی آخر معنی کی طرف ہے اور ابن شہین نے نقل کیا ہے کہ صورت کے معنی صورت اعتقادی کے ہیں۔

اور خطابی کا یہ خیال ہے کہ شمس و قمر، طوافیت کی مناسبت سے بطور مشاکلت اللہ تعالیٰ کے لئے صورت کا لفظ بولی دیا گیا ہو ابن بطلان نے مطلب سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کے پاس کسی فرشتہ کو بھیجے گا تاکہ ان مؤمنین کا امتحان ہو جائے کہ ”لیس کمثلہ شئی“ پر اس کا اعتقاد باقی ہے، اسی وجہ سے جب وہ فرشتہ ”انا ربکم“ کہے گا تو فوراً مؤمنین اس کی تردید کر دیں گے کیونکہ اس کی صورت مخلوق کی ہوگی، اور جب حق تعالیٰ مخلوقات کی صورت سے بالکل ممتاز صورت پر تجلی فرمائیں گے، تو سارے مؤمنین بالاتفاق ”انت ربنا“ کی صدا بلند کریں گے۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ امتحان کی جگہ تو دنیا ہے مگر ان حشر میں امتحان کے کیا معنی جواب یہ ہے کہ جنت اور جہنم جانے سے قبل امتحان لیا جاسکتا ہے قبر آخرت کی پہلی منزل ہے اور اس میں امتحان کے لئے سوالات ہوں گے،

اور پہلے یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مختلف صورتوں میں آنے کا مطلب مختلف قسم کی تجلیوں کے ساتھ ظاہر ہونا ہے، فتوحات مکیہ میں شیخ نے اس کی تصریح کی ہے اور احمد بن مبارک نے ابریز میں شیخ عبدالعزیز دباغ کے حوالہ سے علامت کے معنی ذکر کئے ہیں۔ اس کو بھی قشائہلت میں سمجھنا چاہئے اس کی صحیح مراد اللہ کے حوالہ کر دینا چاہئے

”معناه معلوم وکیفیتہ مجهول والايمان به واجب والسؤال عنه بدعة واللہ اعلم بالصواب“

قوله فبما تبهم الله في صورته التي يعرفون الخ: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی نگاہوں میں وہ صورت متخضر ہو جائے جس صورت پر عہد ”النست“ میں اللہ کو دیکھا تھا دنیا میں وہ صورت ذہن سے نکال دی گئی اور آخرت میں وہی صورت متخضر ہو جائے۔

قوله فيتبعونه الخ: اللہ کے پیچھے چلنے کا مطلب اس کے حکم یا ان کے ان فرشتوں کی اجازت جن کے حوالہ یہ کام سونپا گیا ہے۔

قوله ويضرب الصراط بين ظهرا نبي جهنم الخ: مفتخ غلاد سکون ہوا، پہل صراط بچھایا جائے گا جہنم کے دونوں کناروں کے درمیانی حصہ میں جیسا کہ مراقہ میں ہے ”وہو جسر علی جہنم“ (مراقہ) تمام لوگوں کو اس پر سے گذرنا ہو گا۔ تنبیہ:- حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے سیاق سے حضرت انس کی حدیث شفاعت کا وہ کلمہ حذف کر دیا گیا ہے جو بندوں کے معاملات کا فیصلہ والا حصہ ہے۔ جیسا کہ حضرت انس کی اس حدیث سے ان امور والا حصہ جو موقف میں مؤمنین کے ساتھ پیش آئے گا (جس کا تذکرہ اس روایت میں ہے) حذف کر دیا گیا، دونوں حدیث کے محذوف کلموں کو ملا کر پوری بات اس طرح ہوئی، جب میدان حشر میں سارے لوگ اکٹھا ہوں گے تو کفار کو آنکڑے جہنم میں کھینچ لیں گے اس کے علاوہ باقی لوگ محشر کی پریشانیوں میں پڑے رہ جائیں گے، پھر اہل محشر شفاعت کرائیں گے تو پھر صراط بچھانے کا حکم دیا جائیگا پھر سجدہ امتحان ہو گا تاکہ مؤمن اور منافق ممتاز ہو جائیں پھر سارے لوگ صراط کو پار کریں گے۔ (فتح الباری)

قوله اول من يجيزهم الخ: اجاز، یجیز، باب افعال کا مضارع ہے لام نوویٰ اس جملے کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے میں اور میری امت پہل صراط سے گذرے گی، اور اس کو پار کرے گی، جاز الوہوی اور اجاز الوہوی کے معنی طے کر لینا، اور اس کو پیچھے کر دینا، حاکم نے عبد اللہ بن سلام کے حوالہ سے یہ کلمہ ذکر کیا ہے ”ثم ينادي مناد ابن محمد وامته فيقوم فتتبعه امته برها وفاجرها فيأخذون الجسر فيطمس الله ابصار اعدائه فيتهافتون من يمين وشمال وينجو النبي والصالحون“

قوله ولا يتكلم يومئذ الا الرسل الخ: يومئذ سے مراد پہل صراط سے گذرنے کا وقت،

قوله ودعوى الرسل يومئذ الخ: ترمذی میں مغیرہ کی حدیث میں اتنا اور ہے کہ پھر صراط سے گذرتے ہوئے مسلمانوں کا شعار ”رب سلم سلم“ ہو گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان ان الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں گے بلکہ ہوا کر نیوالے تو انبیاء علیہم السلام ہوں گے مؤمنین کے حق میں ان کی سلامتی کی دعا کریں گے اسی لحاظ سے اس کو مؤمنین کا شعار کہا گیا ہے۔

قوله وفي جهنم كالليب الخ: كَلَاب بالضم یا کَلُوب بالفتح کی جمع ہے وہ لوہا جس کا سر اڑا ہوا ہو۔ جس پر گوشت لٹکایا جاتا ہے یا کسی چیز کو چیزی سے کھینچا جاتا ہے، یادہ لکڑی جس کا سر اڑا ہوا ہو۔ اس سے آگ کی چنگاری نکالی جاتی ہے۔ اس کو آنکڑا کہا جاتا ہے۔ قاضی ابو بکر بن عربی کی تحقیق یہ ہے کہ آنکڑے شہوات نفسانی کی صورت ہے جو حدیث میں ”خَفَّت النار بالشهوات“ ظاہر کیا گیا ہے، شہوات جہنم کے کناروں پر رکھے جائیں گے اور وہ شہوات نفسانی کی پیروی کرنے والوں کو

تیزی سے پہنچ لے گی،

قوله مثل شوك السعدان الخ: سین مفتوح عین ساکن سعد لہ کی جمع ہے خاردار گھاس، اونٹ اسکو بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

قوله غير انه لا يعلم ما قدر عظمها الخ: عین کسور ظلمہ مفتوح عظمت اور بڑائی کے معنی میں نہ میں ہا ضمیر شان اس گھاس سے تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ سعد ان بڑی تیزی سے آؤنگی کے دامن کو کھینچ لیتے ہیں۔ تمثیل کا مقصد غیر معلوم کو معلوم سے سمجھانے کی غرض سے ہوتی ہے چونکہ حضرات صحابہ کو اس گھاس سے برابر سابقہ ہوتا تھا اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی تاکہ بات ذہن نشیں ہو جائے۔ الموبق، الموبق بمعنی ہلک، الموبق بمعنی ہلک، المجازی ماخوذ من الجزاء گذر جانا۔

قوله حتى اذا فرغ الله من القضاء الخ: مقصد یہ ہے کہ جب وہ گھڑی آجائے گی جس میں اللہ تعالیٰ اپنے مؤمنین بندوں پر رحم کریں گے۔

قوله واراد ان يخرج برحمته الخ: یعنی تدریجی طور پر انبیاء، ملائکہ، مؤمنین کی سفارش سے جہنمیوں کو جہنم سے نکالنے کا وقت آجائے گا، نسائی شریف میں حضرت انسؓ کی روایت میں موحّدین کو جہنم سے نکالنے کی ایک دوسری وجہ یہ ذکر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے حساب سے فارغ ہو جائیں گے تو امت محمدیہ کے جو لوگ جہنم میں ہوں گے، ان اہل جہنم کو کفار کہیں گے کہ تم کو خدا کی عبادت اور شرک سے پرہیز کرنے کا کیا فائدہ ہوا تو حق تعالیٰ فرمائیں گے، میری عزت کی قسم میں ان موحّدین کو جہنم سے ضرور رہا کروں گا اس کے بعد سفارش کرنے والوں کو بھیجا جائے گا، باز میں ابو موسیٰ کی مرفوع روایت میں یہ مضمون آیا ہے کہ جب جہنمی جہنم میں اکٹھا ہوں گے، اور ان کے ہمراہ اہل قبلہ بھی ہوں گے تو کفار ان سے طنز آمیز جملہ میں کہیں گے کہ کیا تم لوگ مسلمان نہیں تھے، وہ لوگ کہیں گے ضرور، تب کفار کہیں گے تم کو اسلام سے کیا فائدہ ملا، تم تو ہمارے ساتھ جہنم میں ہو۔ موحّدین کہیں گے ہم لوگ اپنی معصیت کے پاداش میں جہنم آئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ شفاعت کرنے والوں کو اہل قبلہ کے نکالنے کا حکم دے گا۔ وہ لوگ جب نکالے جائیں گے تو کفار حسرت اور افسوس کے ساتھ کہیں گے، کاش ہم بھی مسلمان ہوتے اس قسم کی رایتوں میں اہل سنت کی تائید اور معتزلہ و خوارج کی بھرپور تردید ہے۔

قوله امر الملائكة الخ: حضرت انس کی شفاعت والی حدیث میں ہے ”فیحدلی حدا فناخرجهم“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکالنے والے انبیاء و رسل ہو گئے تطبیق کی صورت یہ ہے کہ فرشتوں کو شفاعت کی اجازت انبیاء کے واسطے سے ہوگی، نکالنے والے حقیقت میں فرشتے ہوں گے، اور چونکہ انبیاء کی زبانی ان کو یہ حکم ملے گا اس لئے ”فیحدلی“ میں نسبت مجازی ہے۔

قوله ممن يقول لا إله الا الله الخ: اقرار رسالت کا ذکر نہیں ہے یا تو دونوں لازم و مفروض ہیں، تلفظ دونوں کا ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور ایمان کے لئے اقرار رسالت شرط ہے یا اس وجہ سے رسول کو حذف کر دیا گیا ہے کہ اس حدیث کا تعلق امت محمدیہ اور دوسری تمام امتوں سے ہے اگر سارے رسولوں کو ذکر کیا جائے تو عبارت بہت لمبی ہو جاتی کیونکہ رسولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، مگر پہلا جواب زیادہ مناسب ہے کیونکہ دوسرے جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا جامع لفظ جیسے ”نومن“ برسلہ“ ذکر کر دیا جاتا تو طول عبارت کا اعتراض ختم ہو جاتا، بعض اہل بدعت اس روایت سے

استدلال کرتے ہیں کہ اہل کتاب اگر توحید کا اقرار کر لیں چاہے اپنے رسول کے سوا دوسرے آنے والے رسولوں پر ایمان نہ بھی لائیں تو نجات کے لئے کافی ہے جیسے عیسائی عیسٰی علیہ السلام پر اور یہودی موسیٰ علیہ السلام کے سوا آنحضور ﷺ پر ایمان نہ لائیں تو جہنم سے نکالے جائیں گے۔ یہ عقیدہ سراسر لغو اور باطل ہے کیونکہ جس نے رسالت کا انکار کیا اس نے خدا کا انکار کیا اور جو اللہ کا انکار کرے وہ موحّد کہاں رہا؟

قوله ويعرفونهم باثر السجود الخ: قرآن کریم میں ہے ”سیمامہم فی وجوہہم من اثر السجود“ (الآیۃ) مومنین کے چہروں سے سجدہ کے نشانات محو نہیں ہوں گے بلکہ بدستور باقی رہیں گے۔

### جہنم میں مومن کی پہچان کس طرح؟

قوله حرّم الله النار الخ: سوال کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ مسلم کی ایک روایت میں ہے ”فما تہما اللہ امانة حتی اذا کانوا فحماً اذن اللہ تعالیٰ بالشفاعة“ یعنی قاسم مومنوں پر جہنم میں ایک قسم کی نیند طاری کر دی جائے گی اور جب وہ کوئلہ ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دے گا، سوال یہ ہے کہ جب کوئلہ ہو جائیں گے۔ تو محل سجود دوسرے اعضاء سے کس طرح ممتاز ہوں گے، اور پھر پہچاننے کی کیا صورت باقی رہ جائے گی؟

جواب یہ ہو کہ اعضاء سے مراد اعضاء غیر سجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہنم پر اعضاء سجود کو حرام کر دیا ہے امام نوویؒ نے اعضاء سجود میں ساتوں عضو کو داخل کیا ہے، پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹن، دونوں قدم اور قاضی عیاضؒ نے صرف پیشانی کو خاص کیا ہے، راجح قول امام نوویؒ کا ہے۔ مگر قاضی عیاضؒ کے نظریہ کی تائید سیمامہم فی وجوہہم سے ہوتی ہے، اور مسلم کی اس روایت سے جس میں الا ذرات وجوہہم کا لفظ ہے۔ ابن ابی جرہ نے اس سے استنباط کیا ہے کہ جو مسلمان ہو کر نماز نہیں پڑھتا ہے اس میں کوئی علامت ہی نہیں ہوگی، اس لئے وہ جہنم سے نکالے نہیں جائیں گے۔

مگر جواب اس کا یہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھوں سے نکالے گا کیونکہ ان لوگوں کے بارے میں ”لم یعملوا خیر اقط“ کا لفظ ہے اور یہ ابو سعید کی روایت میں ہے جو آگے آرہی ہے۔ جو لوگ ایمان لا کر فوراً مر گئے اور ان کو ایک نماز پڑھنے کا بھی موقع نہیں ملا وہ لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔

قوله قد امتحشو الخ: محش بدن کا جزوہ محل کر صرف ہڈیاں دکھائی دے۔

فیصّب علیہم ماء الحیوة الخ: اس کو ماء حیات کے لئے کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر فنا نہیں ہے۔

قوله فی حمیل السیل: جبہ بکسر اللام جنگل کے جج جمع اس کی جبہ اور حۃ شخ اللہ وہ بیج جس کو انسان بوستے ہیں، جمع اس کی حیو۔ حمیل، شخ اللہ اور میم کسور جو دانے سیلاب میں بہہ جائے، بعض روایت میں الی جانب السیل ہے مراد اس سے وہ خس و خاشاک (کوڑے کوڑا) جو پانی کے روم میں بہے اور اس میں دل نہ بھی ہو یہ دانے، پتے ہوئے کہیں کنارے لگ جاتے ہیں تو نمی کی وجہ سے بہت جلد اس سے پودے نکل آتے ہیں۔ مقصد بہت جلد آگ جانا، آنحضور ﷺ کو اس قسم کے امور کا پورا تجربہ تھا اگرچہ ان چیزوں سے آپ کو سابقہ نہیں ہوا۔

قوله وهو آخر اهل الجنة دخولا الجنة الخ: کسی حدیث میں "آخر اهل الجنة دخولا فيها" و آخر اهل النار خروجاً منها" اس کی شرح آگے آرہی ہے۔

قوله ای رب اصرف وجهی الخ: اشکال یہ ہے کہ یہ شخص پلصر اط پر گزر رہا ہوگا اور اس کا رخ جنت کی طرف ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابولہامہ کی حدیث میں ہے کہ یہ شخص پلصر اط پر چلتے ہوئے پیٹ کے بل گر جائے گا۔ یہ مکالمہ اسی حال کا ہوگا، اس وقت اس کو اپنا رخ پھیرنے کی طاقت نہیں ہوگی، اس لئے اللہ تعالیٰ سے رخ پھیرنے کی درخواست کرے گا۔ (فتح الباری)

قوله فانه قسبني الخ: قاف اور شین دونوں مفتوح مخفف اور مشدود دونوں طرح جائز ہے، قسب کے اصل معنی زہر کا کھانے میں ملانا، یہاں مقصد ہے جہنم کا دھواں ناک کے ہانسوں میں بھر جانا، اور اسی طرح اس کی بدبو کا احساس، نوویؒ نے قسبنی کا ترجمہ سمعنی، آذانی، اهلکنی سے کیا ہے۔

قوله احرقني ذكاء ها الخ: ذال مفتوح، شعلہ، بھڑک، اس کو محدود اور مقصور دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے۔ ذکت النار، تذکوا ذكاً بالقصر وذكوا بضم الذال وتشديد الواو "سخت بھڑک اور سخت اشتعال کے معنی میں ہے۔ اور ذکوا بالمد کے معنی تیز ذہن، سرعت فہم کے ہے۔

قوله هل عسيت ان فعلت ذالك بك ان تسأل غيره الخ: ان تسأل، عسيت کی خبر ہے اور حج میں جملہ شرطیہ معترضہ ہے، مقصد یہ ہے کہ کیا تم سے اس کے علاوہ کے سوال کی توقع ہے، استقہام تقریری ہے انسان کی عادت میں یہ داخل ہے، عسيت ترحی کا تعلق مخاطب سے ہے حق تعالیٰ سے نہیں، اس قسم کے جملہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو غور و فکر کا موقع دیا جائے، بعض علما نے لکھا ہے کہ شروع میں وہ شخص حیا اور شرم کی وجہ سے سوال کرنے سے رکا رہا حالانکہ اللہ تعالیٰ کو بندے کا سوال بہت ہی پسند ہے۔ اس لئے پہلی بار "لعلک ان اعطیت هذا تسأل غیرہ" کا خطاب مسرت اور خوشی کے انداز میں ہے سوچو کہ یہ معاملہ توفیق کے ساتھ ہے فرمانبرداروں کیساتھ اس کا کیسا معاملہ ہوگا۔ قیاس کن زگلتاں من بہار مراد۔

قوله فاذا اقبل على الجنة الخ: اس روایت میں بعض راوی نے ان درختوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے جس کا تذکرہ عبد اللہ بن مسعود کی روایت میں آیا ہے جیسے عبد اللہ بن مسعود کی روایت میں "فيقدمه الى باب الجنة" کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔

قوله ويلك يا بن آدم الخ: ويل کے معنی ہلاکت کے ہیں۔

قوله ما اعذرک الخ: ما اعذر فعل تعجب ہے یعنی تمہارا فعل قابل تعجب ہے کہ بار بار عہد کو توڑے جا رہا ہے۔ کلابازی کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے عہد و میثاق کو جہالت و نادانی میں نہیں توڑا ہے بلکہ اس کو یہ معلوم ہے کہ اس قسم کے عہد کو توڑ دینا اس کو پورا کرنے سے بہتر ہے، کیونکہ اللہ سے سوال ترک سوال سے بہتر ہے۔ خود آنحضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "من حلف على يمين فرأى غيرها خيراً منها فليكفر عن يمينه وليأت الذي هو خير منه" اس بندہ نے اس فرمان پر عمل کیا، اور چونکہ دار آخرت ہے اس لئے قسم کے کفارہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قوله فيقول لا وعزتك الخ: بغیر قسم کا مطالبہ کئے ہوئے قسم کھانا اس وجہ سے ہے کہ اس کو اپنی ضرورت کو

پورا کرنے کی اتنی لگن پیدا ہوئی کہ بغیر مطالبہ قسم پر مجبور ہو گیا۔

قوله إِنْفَقَتْ لَهُ الْجَنَّةُ الْخ: فاء مفتوح اسی طرح پہ اور قاف بھی مفتوح ہے کھلنے کے معنی میں ہے۔

قوله اِی رَبِّ لَا اَكُونُ اَشْقٰی خَلَقْتَ الْخ: لفظاً خبر ہے اور معنی ایشہ یعنی طلب اور سوال ہے دوسری روایت میں لَا تَجْعَلْنِیْ اَشْقٰی خَلَقْتَ كَالْفَتْح: اَشْقٰی خَلَقْتَ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم بندوں پر و کھتا رہا اور کتنوں کو جہنم سے رہائی دی گئی اور اس کو نہیں ملی تو انتہائی حسرت کا اظہار کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے اپنی آنکھوں سے خدا کا لطف و کرم نہ دیکھا ہو، اس کے مقابلہ میں دیکھنے والوں کو زیادہ حسرت ہونی ہی چاہئے، خَلَقْتَ سے کفار جن کے لئے ابدی جہنم کا فیصلہ کر دیا گیا ہے وہ اس سے مستثنیٰ نہیں۔

قوله فِیَسْأَلُ رَبِّهِ وَیَتَمَنَّى الْخ: مسند احمد میں ابوسعید کی روایت میں ہے کہ وہ مانگ اور تمنا اتنی دیر تک کرتا رہے گا جتنی دیر دنیا کے تین دن میں ہوتی ہے۔

قوله حتیٰ ان الله لیذکر الخ: یعنی اسکے دل میں ایسی ایسی باتیں ڈالے گا جس کا اسکو وہم و گمان بھی نہیں ہوگا۔  
قوله ذٰلِكَ لَكَ وَعِشْرَةٌ اَمْثَالَهُ الْخ: بخاری کتاب التوحید میں ابوسعید خدری کی روایت دوسری سند سے ہے اس کے الفاظ یہ ہیں، ”فِیْقَالُ لَہُمْ لَکُمْ مَا رَأَیْتُمْ وَمِثْلُهُ مَعَهُ الْخ“ یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے موافق ہے۔ تطبیق کی ایک صورت یہ ہے کہ دس گنا، ابوسعید نے اس آخری جہنمی کے حق میں سنا ہو اور مثلاً معہ اس کے حق میں سنا ہو جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے جہنم سے نکلیں گے۔ قاضی عیاضؒ نے ابو ہریرہؓ اور ابوسعید کی روایت میں دوسری طرح تطبیق دی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ابو ہریرہؓ نے پہلی بار ”وَمِثْلُهُ مَعَهُ“ کی حدیث سنی تو اسی کے مطابق بیان کیا۔ پھر آنحضور ﷺ نے بعد میں ”عِشْرَةٌ اَمْثَالَهُ“ کی حدیث بیان فرمائی جس کو ابوسعید نے سنا ابو ہریرہؓ نے نہیں سنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثلاً معہ کی روایت بیان کرتے وقت ابو ہریرہؓ اور ابوسعید دونوں موجود ہوں گے، اسی لئے بخاری میں ابوسعید کی روایت مثلاً معہ کی بھی ہے، پھر عشرہ امثالہ کی روایت بعد میں صرف ابوسعید نے سنی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

حدثنا محمد بن رافع قال نا عبد الرزاق قال انا معمر بن ہمام بن منبہ قال هذا ما حدثنا ابو ہریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنذکر احادیث منها وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ادنیٰ مقعد احدکم من الجنة ان یقول له تمّ ویتمنی فیقول له هل تمّنت فیقول نعم فیقول له فان لك ما تمّنت ومثله معہ۔

محمد بن رافع ہم سے بیان کیا انہوں نے کہا ہم سے عبد الرزاق نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا کہ ہم کو معمر نے خبر دی ہمام بن منبہ کے واسطے سے ہمام بن منبہ نے کہا یہ وہ حدیثیں ہیں جو ہم سے بیان کیا ابو ہریرہؓ نے آنحضور ﷺ سے اس کے بعد ہمام بن منبہ نے ان میں سے کچھ حدیثیں بیان کیں۔ ان میں ایک حدیث جسکا مضمون یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ سب سے اونٹنی درجہ کے جہنمی سے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تمنا کرو، وہ تمنا کرے گا پھر اس سے کہے گا کہ کیا تم تمنا کر چکے تو وہ کہے گا ہاں پھر اس سے کہے گا کہ تم کو وہ تمام چیزیں جس کی تم نے تمنا کی مل گئیں اور اسی کے ساتھ اتنا ہی اور۔



## سند کی ایک اصولی بحث

تشریح

قوله فذكر احاديث منها وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ: امام نوویؒ نے اس مقام پر اصول حدیث کے ایک اہم مسئلہ کی نشاندہی فرمائی ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ حدیث کی جن کتابوں میں چند حدیثیں ایک ہی سند سے مروی ہوں اور استاد نے شاگردوں کے سامنے صرف پہلی حدیث کی سند بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے ہر حدیث پر اس سند کا اعادہ نہیں کیا، اگر سننے والا ان میں سے کسی ایک حدیث کو جو پہلی حدیث کے ماسوا ہو، بلا سند کے ذکر کرنا چاہے تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔

وکیح بن جرج، یحییٰ بن معین، اور ابو بکر اسامی شافعی جو فقہ، حدیث اور اصول کے امام تھے یہ تمام حضرات اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور یہی مذہب اکثر علماء کا ہے۔ دلیل ان لوگوں کی یہ ہے کہ اس کتاب اور رسالہ کی ساری حدیثیں پہلی حدیث پر معطوف ہیں اور پہلی حدیث معطوف علیہ اس لئے پہلی حدیث میں جو سند مذکور ہے وہ اس کی ہر حدیث میں سند لوائے جانے کے حکم میں ہے۔ مگر استاذ ابو الطحان سنی فقیہ شافعی، جو علم اصول اور فقہ کے امام ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ بغیر سند حدیث کو بیان کرنا جائز نہیں، ہر سامع پر ضروری ہے کہ اس رسالہ کی جو حدیث بیان کرے، اس کے ساتھ پہلی والی حدیث کی سند کو ضرور بیان کر دے، جیسا کہ اس جگہ امام مسلمؒ نے کیا ہے اور یہی طریقہ انسب اور محتاط طریقہ ہے۔

قوله فيتمنى يتمنى الخ: تمنا کو مکرر ذکر کرنے سے تمنا کی کثرت کو ظاہر کرتا ہے یعنی وہ بہت سی تمنا کرتے گا۔ علامہ طبریؒ فرماتے ہیں کہ مقصد یہ ہے کہ ادنیٰ درجہ کے جنتی کی کل تمنا پوری ہوگی اس کی کوئی تمنا باقی نہیں رہے گی۔

قوله فيقول له هل تمنيت الخ: یعنی کل تمنا۔

قوله فان لك ما تمنيت الخ: یعنی وعدہ کے بعد عدل کا تقاضا ہے کہ تمہاری ساری تمنائیں پوری ہوں۔

قوله ومثله معه الخ: یعنی انعام کے طور پر۔

حدثني سويد بن سعيد قال حدثني حفص بن ميسرة..... عن ابي سعيد الخدري ان ناساً في زمن رسول الله صلى الله عليه وسلم قالوا يا رسول الله هل نرى ربنا يوم القيامة قال رسول الله صلى الله عليه وسلم نعم قال هل تضارون في رؤية الشمس بالظهيرة صحواً ليس معها سحب وهل تضارون في رؤية القمر ليلة البدر صحواً ليس فيها سحب قالوا لا يا رسول الله قال ما تضارون في رؤية الله يوم القيامة الا كما تضارون في رؤية احدهما اذا كان يوم القيامة اذن موذن ليتبع كل امة ما كانت تعبد فلا يبقى احد كان يعبد غير الله من الاصنام والانصاب الا يتساقطون في النار حتى اذا لم يبق الا من كان يعبد الله من بروفاجر وغبر اهل الكتاب فيدعى اليهود فيقال لهم ما كنتم تعبدون قالوا كنا نعبد عزيراً بن الله فيقال كذبتم ما اتخذ الله من صاحبة ولا ولد فماذا تبغون قالوا عطشنا يا رب - فاسقنا فيشار اليهم الاتردون فيحشرون الى النار كانها سراب يحطم بعضها بعضها فيتساقطون في النار ثم

يدعى النصراني فيقال لهم ما كنتم تعبدون قالوا كنا نعبد المسيح ابن الله فيقال لهم كذبتم ما اتخذ الله من صاحبة ولا ولد فيقال لهم ماذا تبغون فيقولون عطشنا يا ربنا فاسقنا قال فيشار اليهم الاتردون فيحشرون الى جهنم كانها سراب يحطم بعضها بعضاً فيتساقطون في النار حتى اذا لم يبق الا من كان يعبد الله تعالى من يروفاجر اتاهم رب العالمين في ادنى صورة من التي راوه فيها قال فماذا تنظرون تتبع كل امة ما كانت تعبد قالوا يا ربنا فارقنا الناس في الدنيا افقر ما كنا اليهم ولم نصاحبهم فيقول انا ربكم فيقولون نعوذ بالله منك لا نشرك بالله شيئاً مرتين او ثلاثاً حتى ان بعضهم ليكاد ان ينقلب فيقول هل بينكم وبينه آية فتعرفونه بها فيقولون نعم فيكشف عن ساق فلا يبقى من كان يسجد لله من تلقاء نفسه الا اذن الله له بالسجود ولا يبقى من كان يسجد اتقاء ورياء الا جعل الله ظهره طبقة واحدة كلما اراد ان يسجد خرّ على قفاه ثم يرفعون رؤسهم وقد تحول في صورته التي راوه فيها اول مرة فقال انا ربكم فيقولون انت ربنا ثم يضرب الجسر على جهنم وتحل الشفاعة ويقولون اللهم سلم سلم قيل يا رسول الله وما الجسر قال دحش مزالة فيها خطاطيف وكلاليب وحسك تكون بنجد فيها شويكة يقال له السعدان فيمر المؤمنون كطرف العين وكالبرق وكالريح وكالطير وكأجاويد الخيل والركاب فناج مسلم ومخدوش مُرسل ومكدوس في نار جهنم حتى اذا خلاص المؤمنون من النار فوالذي نفسى بيده ما من احد منكم باشدّ مناشدة لله في استيفاء الحق من المؤمنين لله يوم القيامة لاخوانهم الذين في النار يقولون ربنا كانوا يصومون معنا ويصلون ويحجون فيقال لهم اخرجوا من عرفتم فتحرم صورهم على النار فيخرجون خلقاً كثيراً قد اخذت النار الى نصف ساقيه والى ركبتيه ثم يقولون ربنا ما بقي فيها احد من امرتنا به فيقول ارجعوا فمن وجدتم في قلبه مثقال دينار من خير فاخرجوه فيخرجون خلقاً كثيراً ثم يقولون ربنا لم نذر فيها احداً من امرتنا به ثم يقول ارجعوا فمن وجدتم في قلبه مثقال نصف دينار من خير فاخرجوه فيخرجون خلقاً كثيراً ثم يقولون ربنا لم نذر فيها احداً من امرتنا به ثم يقول ارجعوا فمن وجدتم في قلبه مثقال ذرة من خير فاخرجوه فيخرجون خلقاً كثيراً ثم يقولون ربنا لم نذر فيها خيراً وكان ابوسعيد الخدرى يقول ان لم تصدقوني بهذا الحديث فاقراؤا ان شئتم ان الله لا يظلم مثقال ذرة وان تك حسنة يضاعفها ويؤت من لدنه اجراً عظيماً فيقول الله تعالى شفعت الملائكة وشفع النبيون وشفع المومنون ولم يبق الا ارحم الراحمين فيقبض قبضة من النار فيخرج منها قوماً لم يعملوا خيراً قط قد عادوا حماً فيلقينهم في نهر في افواه الجنة يقال له نهر الحياة فيخرجون كما تخرج الحبة في

حمیل السیل الا ترونها تكون الى الحجر او الى الشجر ما يكون الى الشمس اصیفر واخضر وما يكون منها الى الظل يكون ابيض فقالوا يا رسول الله كانك كنت ترعى بالبادية قال فيخرجون كاللؤلؤ في رقابهم الخواتم يعرفهم اهل الجنة هؤلاء عتقا، الله الذين ادخلهم الله الجنة بغير عمل عملوه ولا خير قدموه ثم يقول ادخلوا الجنة فمارأيتموه فهو لكم فيقولون ربنا اعطيتنا ما لم تعط احداً من العالمين فيقول لكم عندي افضل من هذا فيقولون يا ربنا ای شئ افضل من هذا فيقول رضائي فلا اسخط عليكم بعده ابداً قرأت علی عیسیٰ بن حماد زغبة المصری هذا الحديث فی الشفاعة وقلت له احدث بهذا الحديث عنك انك سمعته من الليث بن سعد فقال نعم قلت لعیسیٰ بن حماد اخبركم الليث بن سعد عن خالد بن يزيد عن سعید بن ابی هلال عن زید بن اسلم عن عطاء بن یسار عن ابی سعید بن الخدری انه قال قلنا يا رسول الله انرى ربنا قال رسول الله ﷺ هل تضارون فی روية الشمس اذا كان يوم صحو قلنا لا وسقت الحديث حتى انقضى اخره وهو نحو حديث حفص بن ميسرة وزاد بعد قوله بغير عمل عملوه ولا قدم قدموه فيقال لهم لكم ما رأيتم ومثله معه قال ابو سعید الخدری بلغني ان الجسر اذق من الشعرة واحد من السيف وليس فی حديث الليث فيقولون ربنا اعطيتنا ما لم تعط احداً من العالمين وما بعده فاتقربه عیسیٰ بن حماد (مسلم من ۱۰۲، ۱۰۳)

**ترجمہ** ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے آپؐ سے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا ہم لوگوں کو روز قیامت خدا کا دیدار ہوگا؟ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہوگا ضرور ہوگا، آپؐ نے فرمایا کیا تم لوگوں کو کھلے آسمان (جب بار نہ ہو) میں دوپہر کے وقت آفتاب کے دیکھنے میں باہم کسی طرح کی مزاحمت ہوتی ہے، اور کیا تم کو کھلے آسمان میں چودھویں کے چاند دیکھنے میں کوئی کسی کے لئے آڑ اور رکاوٹ بنتا ہے لوگوں نے کہا نہیں، یا رسول اللہ، آپؐ نے ارشاد فرمایا جتنی مزاحمت چاند و سورج کو دیکھنے میں ہوتی ہے اتنی ہی رکاوٹ روز قیامت خدا کے دیدار میں ہوگی، (بالکل نہیں ہوگی) جب قیامت کا دن آئے گا تو اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ہر جماعت اپنے معبودوں کے ساتھ ہو جائے، تو کوئی بھی بت اور انصاف کا پرستار نہ ہوگا مگر سب جہنم میں گر پڑیں گے، جب صرف خدا کے پرستار نیک و بد اور نیچے کچھے اہل کتاب رہ جائیں گے تو یہود کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائیگا تم لوگ کس کی پرستش کرتے تھے، تو وہ لوگ کہیں گے ہم لوگ اللہ کے بیٹے عزیر کی پرستش کرتے تھے، ان سے کہا جائے گا تم لوگ جھوٹ بولے، اللہ تعالیٰ نے نہ تو کسی کو بیوی بنایا اور نہ بیٹا، تم لوگوں کی کیا خواہش ہے، وہ لوگ کہیں گے ہم لوگ پیاسے ہیں اے میرے رب ہم کو پانی پلائیے، تو ان لوگوں کو اشارہ کر کے بتلایا جائے گا کہ تم لوگ کیوں نہیں وہاں جاتے ہو۔ تو وہ لوگ اکٹھا ہو کر جہنم کی طرف جائیں گے، ان لوگوں کو چپکے ہوئے ریتے (اپنی چمک کی وجہ سے) موج مارتے ہوئے نظر آئیں گے، پھر وہ لوگ جہنم میں گر پڑیں گے۔ پھر نصاریٰ کی پکار ہوگی، ان سے پوچھا جائیگا تم لوگ کس کی پرستش کرتے تھے، تو وہ لوگ کہیں گے اللہ کے بیٹے مسیح کی تو ان کو کہا جائے گا تم

لوگ جھوٹ کہتے ہو، اللہ نے نہ تو کسی کو بیوی بنایا اور نہ بیٹا، ان سے پوچھا جائے گا تمہاری خواہش کیا ہے تو کہیں گے ہم لوگوں کو پیاس لگی ہوئی ہے اے ہمارے رب ہم کو پانی دیجئے، آپ نے فرمایا ان کو اشارہ سے بتایا جائے گا کہ کیوں نہیں اس جگہ آتے ہو، وہ لوگ اکٹھا ہو کر جہنم کی طرف آئیں گے، ان کو ایسا محسوس ہو گا کہ چپکتے ہوئے ریٹے موج مار رہے ہیں، پھر وہ لوگ اس میں گر پڑیں گے۔ حتیٰ کہ نیک و بد صرف اللہ کے پرستار رہ جائیں گے، تو ان کے پاس حق تعالیٰ آئیں گے اس کے علاوہ صورت میں جس صورت میں ان لوگوں نے دیکھا تھا، حق تعالیٰ پوچھیں گے تم لوگوں کو کس کا انتظار ہے۔ ہر جماعت اپنے معبود کیساتھ لگ گئی، وہ لوگ کہیں گے اسے ہمارے رب ہم نے دنیا میں ان لوگوں کا ساتھ چھوڑا، جبکہ دنیا میں ہم ان لوگوں کے محتاج تھے اس کے باوجود ہم ان کے ساتھ نہیں رہے۔ تب اللہ تعالیٰ کہے گا، میں تمہارا رب ہوں، تو سب لوگ بولی پڑیں گے نعوذ باللہ منک ہم لوگ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتے (یہ کلمہ) دو بار یا تین بار کہیں گے، حتیٰ کہ بعض لوگ اپنے نظریہ سے پلٹ جانے کے قریب ہو جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ دریافت کرے گا، کیا تمہارے اور خدا کے مابین کوئی ایسی علامت ہے جس سے تم اس کو پہچان لو گے، سب لوگ کہیں گے ہاں! اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک بہت بڑے نور سے تجلی فرمائے گا، تو ان میں کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہے گا، جو اخلاص کیساتھ خدا کی عبادت کرتا ہو گا، مگر سمجھو کہ اللہ تعالیٰ سجدہ کی اجازت دے گا، اور جو شخص صرف جان بچانے اور تادم و نمود کے لئے سجدہ کرتا تھا، ان سمجھوں کی پیٹھ کو سخت بنا دے گا۔ پھر سارے لوگ اپنا سر سجدہ سے اٹھائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اسی صورت میں تبدیل ہو گا، جس صورت پر ان لوگوں نے پہلی بار دیکھا تھا، اور کہے گا میں تم سمجھوں کا رب ہوں، سارے لوگ کہیں گے آپ ہمارے رب ہیں پھر بل صراط پر چھایا جائے گا، جہنم پر اور شفاعت کی اجازت مل جائے گی، سب لوگ ”اللہم سلم سلم“ کہتے ہوں گے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ جسر کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا قدم پھسلنے کی جگہ (جہاں قدم ثابت نہ رہ سکے) جہنم میں اچکنے والی چیزیں ہوں گی، اور آنکڑے، اور خاردار پھل گھاس کی طرح ہو گی، یہ گھاس نجد میں ہوتی ہے۔ اس میں کاٹنے ہوتے ہیں، اس کو سعدان کہا جاتا ہے، مسلمان آنکھ جھپکنے کی طرح گزر جائیں گے، اور بجلی، ہوا، پرندہ، عمدہ گھوڑا، اور لونٹ کی طرح، کچھ لوگ صحیح سالم نجات پا جائیں گے، کچھ لوگ بحروج ہو کر چھوڑ دیئے جائیں گے، (یعنی پلھراٹھ سے پار ہو جائیں گے) اور کچھ لوگ ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہوئے جہنم میں گر جائیں گے یہاں تک کہ مومنوں کو جب جہنم سے نجات مل جائے گی، تو آنحضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی اپنے حق کو پورا پورا لینے میں اپنے فریق اور ظالم سے قسم نہیں لیتا ہو گا۔ مگر قیامت کے روز اپنے مسلمان بھائیوں کی شفاعت کے معاملہ میں سب سے زیادہ قسمیں کھائیں گے، وہ لوگ کہیں گے، اے ہمارے رب وہ لوگ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، اور حج کرتے تھے، تب ان سے کہا جائے گا جن کو تم پہچانتے ہو ان کو نکال لاؤ، ان کی صورتیں جہنم کے لئے حرام کر دی گئی ہیں۔ تو وہ لوگ بہت سی مخلوق کو نکال لائیں گے، جہنم کی آگ انکے نصف پڑی، اور گھنٹوں تک پہونچی ہو گی، اس کے بعد کہیں گے کہ جن لوگوں کو آپ نے نکالنے کا حکم دیا ان میں سے اب اور کوئی باقی نہیں رہا۔ تب اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ جاؤ جس کے دل میں ایک دینار کے برابر کوئی عمل محسوس کرو تو اسے بھی نکال لاؤ، تو وہ لوگ بہت سی مخلوق کو نکال لائیں گے، پھر کہیں گے جن لوگوں کو آپ نے نکالنے کا حکم دیا، ان میں

کسی کو نہیں چھوڑا، پھر اللہ تعالیٰ کہے گا، کہ جس کے دل میں نصف دینار کے برابر عمل دیکھو اسے بھی نکال لاؤ، تو وہ لوگ بہت سی مخلوق کو نکال لائیں گے، پھر کہیں گے ہم نے کسی اہل خیر کو جہنم میں نہیں چھوڑا۔

ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ اگر تم میری اس حدیث کی تصدیق نہیں کرو اور تمہارا جی چاہے تو (قرآن کی اس آیت (کو) پڑھو، اللہ ذرہ برابر کسی پر ظلم نہیں کرے گا، اور اگر کوئی نیکی بھی ہوگی، تو اس کو بڑھا دے گا، اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر عنایت فرمائے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا، فرشتے شفاعت کر چکے انبیاء اور مؤمنین شفاعت کر چکے، صرف ارحم الراحمین باقی رہ گئے، پھر جہنم سے ایک مٹھی لے کر ایسے لوگوں کو نکالیں گے، جس نے کبھی بھی کوئی نیک کام نہیں کیا ہو گا۔ اور وہ جل کر کوئلہ ہو گئے ہوں گے، پھر ان کو جنت کے دہانے پر ایک نہر میں ڈالا جائے گا، جسکو نہر حیات کہا جاتا ہے، وہ لوگ اس طرح نکلیں گے جیسے سیلاب کی رو میں بہا ہوا دلت (کنارے) اُگ بہتا ہے کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ وہ پتھر یاد رخت کی جانب ہوتا ہے جو دھوپ کی جانب میں ہوتا ہے اس کا پتلا اور ہر رنگ ہوتا ہے، اور جو سایہ کی طرف ہوتا ہے وہ سفید ہوتا ہے، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ایسا لگتا ہے کہ آپ جنگل میں جانور چراتے تھے۔

آپؐ نے فرمایا وہ لوگ (نہر حیات) سے موتی کی طرح نکلیں گے، ان کی گردنوں میں نشانی ہوگی، جنتی ان کو پہچانیں گے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے جہنم سے رہائے ہوئے لوگ ہیں، جن کو اللہ نے بغیر کسی عمل کے جنت میں داخل کیا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے کہے گا، کہ جنت میں چلے جاؤ، جو کچھ بھی تم لوگ وہاں پاؤ گے وہ تمہارا ابو جانے گا تو وہ لوگ کہیں گے اے ہمارے رب آپ نے وہ چیزیں ہم کو عنایت فرمائی جو پورے جہاں میں کسی کو نہیں دیا، تو حق تعالیٰ فرمائیں گے تمہارے لئے میرے پاس ان تمام چیزوں سے عمدہ چیز ہے۔ وہ لوگ کہیں گے یا اللہ اس سے اچھی اور کونسی چیز ہے، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، میری خوشنودی اس کے بعد اب کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا، امام مسمم فرماتے ہیں کہ میں نے (اس حدیث (کو) پڑھا عیسیٰ بن حماد زغبہ مصری کے سامنے اور میں نے عرض کیا ان سے کیا میں بیان کر سکتا ہوں، اس حدیث کو آپ کے حوالہ سے آپ نے اس حدیث کو لیث بن سعد سے سنا ہے۔ تو انہوں نے کہا ہاں! میں نے عیسیٰ بن حماد سے عرض کیا آپ سے یہ حدیث لیث بن سعد نے اور انہوں نے خالد بن یزید سے اور انہوں نے سعید بن ہلال سے اور انہوں نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے عطاء بن یسار سے اور انہوں نے ابوسعید خدریؓ سے بیان کیا ہے اور پھر امام مسلم نے پوری حدیث سنائی، اور وہ حفص بن میسرہ کی ذکر کردہ حدیث کی طرح ہے۔ البتہ بغیر عمل عملوہ ولا قدم قدموہ کے بعد اتنی زیادتی ہے "فیقال لهم لكم ما ایتتم ومثله معه" ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ پل صراط بال سے زیادہ باریک اور تلواریں سے زیادہ تیز ہو گا۔ لیث کی حدیث میں "فیقولون ربنا اعطیننا ما لم تعط احدا من العالمین" اور اس کے بعد والا حصہ نہیں ہے، تو عیسیٰ بن حماد نے اس کا اقرار کیا۔

قوله ظہیرۃ، نصف النهار صحوا: بادل اور غبار نہ ہو، قوس میں ہے صحو کے معنی بادل کا چھٹ جانا، لیس معہا تاکید کے لئے ہے۔

لیس فیہا سحاب الخ: ہا کا مرجع آسمان ہے، اگرچہ تھقل میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ مگر قرینہ مقانی اس کے

مرجع کا باعث ہے۔

قوله الا كما تضارون في رواية احدهما الخ: تعلق بالحال کے قبیل سے ہے یعنی اگر شمس و قمر کے دیکھنے میں مزاحمت ہوئی تو روایت باری میں بھی ہوگی، معلوم ہوا کہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوگی، اؤن بمعنی نادئی (اعلان کرنا) لیتبع پیچھے ہونا۔

قوله الانصاب الخ: نصب کا جمع ہے۔ نون مفتوح اور مضموم دونوں طرح سے اسی طرح صادر ساکن اور مضموم دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے پھر کابت جس پر جانوروں کو ذبح کیا جاتا تھا مجبوروں سے تقرب حاصل کرنے کے لئے، اور پتھر اور درخت وغیرہ جس سے تعظیم کا عقیدہ قائم کیا جائے وہ سب نصب ہی میں شمار ہوگا۔

قوله غبر اهل الكتاب الخ: غبر نہیں مضموم بل مفتوح مشدود معنی بھٹایا کے جمع غابر کی بمعنی باقی یہاں پر وہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو توحید کا عقیدہ رکھتے تھے اور صلیب کی پرستش نہیں کرتے تھے، چونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ ہم لوگ خدا کی پرستش کرتے ہیں تو مسلمانوں کے ساتھ ہو جائیں گے، اور تحقیق کے بعد جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ لوگ عزیز و سبکی عبادت کرتے تھے، تو پھر بت پرستوں میں شامل کر دیئے جائیں گے۔

قرآن میں ہے "ان الذين كفروا من اهل الكتاب والمشركين في نار جهنم خالدين فيها" اور جو لوگ اپنے خالص دین پر عامل ہوں گے وہ "الذين كفروا" سے خارج ہوں گے،

قوله فيقال لهم الخ: ممکن ہے وہ فرشتہ ہو۔ جو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

قوله فيقال كذبتم الخ: اس میں لازم یعنی عزیز و مسیح کے ابن اللہ ہونے کی نفی ہے تاکہ اس کی نفی سے ابن اللہ کے عبادت کی نفی خود بخود ہو جائے۔

قوله كانها سراب الخ: چٹیل میدان، اور ہموار زمین، نصف النہار کے وقت سخت گرمی کے زمانہ میں چمکتے ہوئے ریتے پانی کی طرح نظر آتے ہیں، اسی کو سراب کہتے ہیں، کفار جب جہنم کے قریب آئیں گے، تو سخت پیاس کی حالت میں ان کو اندورنی جہنم چمکتی ہوئی چیز دکھائی دے گی، اس کو پانی سمجھ کر اس میں کود پڑیں گے، اعاذنا اللہ وسائر المسلمين منها ومن كل مكروه،

قوله يحطم بعضها بعضاً الخ: حطم کے معنی کسر، یعنی توڑنے اور ہلاک کرنے کے ہیں، لفظ جہنم کا نام ہے اور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جو اس میں ڈالا جائے گا ہلاک ہو جائے گا، آگ کی بھڑک اور لپٹ جو سمندروں کی طرح موج مارتے ہوئے نظر آئیں گے،

قوله يا ربنا الخ: مؤمنین محشر کی تکلیف دور کرنے کے لئے حق تعالیٰ سے آہو زاری کے انداز میں کہیں گے کہ ہم لوگ آپ کی طاعت میں لگے رہے اور جنہوں نے آپ کی اطاعت سے سر پھیر لانے سے الگ تھلگ رہے۔ حالانکہ معاش اور دنیوی مصالح کے لئے ان لوگوں کے ساتھ رہنا نہایت ضروری تھا۔ جس طرح فقراء صحابہ سے ان کے اعزاء و اقارب نے قطع تعلق کیا، یہ لوگ فقر و فاقہ کی وجہ سے ان رسول کی امداد کے محتاج تھے، اس کے باوجود غربت اور تنگی میں زندگی کاٹی، مگر دین پر ثابت قدم رہے، اہل محشر کا مقصد بھی یہی ہے۔

قوله حتى ان بعضهم ليكاد ان ينقلب الخ: یعنی سخت امتحان اور آزمائش کی وجہ سے تنگ آکر قریب تھا کہ قدم میں تزلزل آجاتا، علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ وہ جماعت ہوگی جن کو اپنے عقیدہ میں پورا رسوخ نہ ہوگا اور حق کے ساتھ رہے مگر اس پر بصیرت حاصل نہ ہو سکی، جیسے مقلدین کا علم ہوتا ہے وہی حال ان لوگوں کا ہوگا۔

قوله فيكشف عن ساق الخ: عبد اللہ بن عباسؓ سے یوم یكشف عن ساق ويدعون الى السجود کی تفسیر میں عن شدة من الامر منقول ہے۔ اہل عرب قامت الحرب علی ساق اس وقت بولتے ہیں جب جنگ میں خوب سختی آجائے۔ ابو موسیٰ اشعریؓ اس کی تفسیر نور عظیم سے کرتے ہیں۔ ابن فورک اس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے نئے نئے الطاف واکرامات سے کرتے ہیں، مطلب کہتے ہیں کہ کشف ساق مومنین کے لئے رحمت اور غیر مومنین کے لئے زحمت ہوگی۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اکثر مشائخ اس کے معنی میں غور و خوض سے ڈرتے تھے، عبد اللہ بن عباسؓ کی تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی وہ قدرت ظاہر فرمائے گا جس سے شدت اور سختی ظاہر ہوگی۔ کلاباذی فرماتے ہیں کہ کشف ساق کے معنی خوف و دہشت درور ہونے کے ہیں۔

قوله يسجد لله الخ: یعنی خدا کی عبادت نام و نمود اور دنیوی غرض کے لئے نہیں، بلکہ صحیح قلب سے کرتے تھے۔ قوله جعل الله ظهره طبقة واحدة الخ: طاء اور باء دونوں مفتوح بیٹھنے کی ہڈی کو کہتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ وہ تختہ کی طرح سیدھا ہو جائے گا اس میں جھکنے کی طاقت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ سجدہ کی قدرت سلب کر کے اس کے نفاق کو ظاہر فرمانا چاہتے ہیں، اور اہل محشر کے رو براس کو رسوا کیا ہے۔ اس لئے سجدہ کا حکم تکلیف مالا یطاق کے قبیل سے نہیں ہے، بلکہ تذلیل و تخفیر کے لئے ہے۔ جیسے جو میں گرہ لگانے کا حکم اسی مقصد کیلئے ہو گا یہ ایک طرح کا عذاب ہو گا۔ قوله خر علی قفاه الخ: پیچھے گر پڑیں گے۔

قوله فيقولون انت ربنا الخ: اس وقت اللہ تعالیٰ مانع کو دور فرما کر مسلمانوں کو اپنا دیدار کرائیں گے، جسرجیم مفتوح اور کمسور، پل، تحلیل، بکسر اللہ والضم اذن کے معنی میں ہے۔

قوله دحض مزلة الخ: ضاد پر توین دحض، اور مزلة دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ وہ جگہ جس میں قدم پھسل جائے ثابت قدم نہ رہ سکے، اسی سے دحضت الشمس بمعنی مالت الشمس (ڈھلنا) حجتہ داحضہ وہ دلیل جس میں ثبات نہ ہو، مزلة میم مفتوح زلہ کمسور، اور اس کو مفتوح بھی پڑھ سکتے ہیں، پھسلنے کی جگہ، مزلة زلہ کمسور کی صورت میں مکان زلزلت اور فتح والی صورت میں بات بھی بہک جاتا یہ بھی بعض کی تحقیق ہے۔

قوله خطاطيف الخ: خطاف بضم الخاء کی جمع ہے کلاب اس کے ہم معنی ہے۔

قوله حسك الخ: حاء اور سین دونوں مفتوح وہ گھاس جس میں سخت خار دار پھل ہو اور اس میں بھیڑ کے بال پھنتے ہوں اور کبھی لوہے کا بھی بنایا جاتا ہے، تو وہ آلات حرب میں شمار ہوتا ہے۔

قوله كطرف العين الخ: طرف، بطرف، طرفاء، اوپر والے پلک کو نیچے والے سے ملا کر آنکھ بند کر لینا، جھپکنا،

قوله كاجاويد الخیل الخ: جمع اجواد کی اور اجواد جمع جیاد کی، عمدہ تیز رفتار گھوڑا، اضافت صفت کی موصوف کی

طرف "الخيل الاجاويد"

قوله الركاب: راہ کمسور اس کا عطف خیل پر ہے مراد اس سے اونٹ ہے، اس لفظ سے اس کا واحد نہیں آتا ہے۔

قوله ناج مسلّم الخ: مسلّم، بتشدید اللام یعنی عذاب سے نجات پاجائیں گے،

قوله مخدوش مرسل الخ: زخم کی خراش آئے گی اور پھر نجات پاجائیں گے اور ناج مسلّم کسی طرح کی کوئی تکلیف دہ صورت پیش نہیں آئے گی، بال بال بکج جائیں گے۔

قوله مکدوس فی نار جہنم الخ: بعض کا بعض پر سوار ہونا، معلوم ہوا کہ پامصر اطہر گزرنے والے تین طرح کے لوگ ہوں گے، صحیح سالم پیر ہو جائیں گے، اور درمیانی طبقہ زخم و خراش کی تکلیف اٹھا کر پار کر جائیں گے۔

قوله مامنکم من احد باشد مناشدة الخ: اس کے مطلب کی وضاحت ہو چکی۔

قوله فمن وجدتم فی قلبه مثقال ذرة من خیر الخ: قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ یہاں خیر کے معنی یقین کے ہیں، اسکے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ خیر کے معنی یہاں ایمان سے زائد چیز کے ہیں۔ کیونکہ خالص ایمان جو تصدیق کو کہتے ہیں اس میں تقسیم و تجزیہ نہیں، قابل تجزی ایمان سے زائد شئی ہے یعنی عمل صالح یا اس سے عمل قلب مراد ہے جیسے مسکین پر شفقت یا اللہ کا خوف کی نیت وغیرہ ہے۔

قوله لم یبق الا ارحم الراحمین الخ: شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ پہلی شفاعت آنحضور ﷺ کی ہوگی، جس کا مقصد شفاعت کرنے والوں کے لئے شفاعت کی اجازت لینا، اس کے بعد ہی شفاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، اور اہل شفاعت شفاعت شروع کر دیں گے، اللہ جن کی شفاعت کو چاہیں گے، قبول فرمائیں گے، اور جس کو چاہیں گے رد فرمائیں گے، اس دن شفاعت کرنے والوں کے دلوں میں بے پناہ شفقت و مہربانی کا جذبہ ہوگا، جس کی شفاعت کو اللہ تعالیٰ رد فرمائیں گے اس کا صرف مقصد یہ ہوگا کہ اپنا بے پایاں رحم و کرم بعض بندوں پر ظاہر کریں گے، ان کے حصہ میں یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں وہ جہنم سے نکالے جائیں۔ حق تعالیٰ ارحم الراحمین ہیں، جیسے وہ منتقم و جبار ہیں۔ جنت کو رضاء و رحمت سے بھر دیا ہے جیسے جہنم کو غضب و عقاب سے بھر دیا ہے۔

قوله فیقبض قبضة من النار الخ: قبضہ، قبضہ میں جو سما جائے۔ قوله لم یعملوا خیرا قط الخ یعنی شہادتین کے اقرار کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہیں ہوگا۔ حق تعالیٰ نے شفاعت کرنے والوں کو انہیں لوگوں کو شفاعت کی اجازت دی، جن کے پاس ایمان کے علاوہ کچھ عمل کا بھی سرمایہ رکھتے ہیں، اور جن کے پاس صرف تصدیق کا سرمایہ ہے اس کی چھٹی ہوئی تصدیق سے سوائے ارحم الراحمین کے کوئی نہیں واقف ہوگا۔ اس لئے ان لوگوں کی شفاعت کو اپنے لئے مخصوص فرمایا۔ مثقال ذرہ سے معمولی خیر مراد ہے۔

قوله عادوا حمماً الخ: عادوا بمعنی صاروا۔ حتم، بضم الحاء والفتح حُتمہ کی جمع ہے، کوئلہ۔

قوله نہر الخ: نہر الخاء و السكون۔

قوله فی افواه الجنة الخ: فُوہہ کی جمع ہے، بضم الفاء اور واء مشدد، مفتوح یہ جمع غیر قیاسی ہے دہانہ، اول حصہ،



قوله ما يكون الى الشمس الخ: کیوں دونوں جگہ میں تادم ہے اس لئے اس کی خبر نہیں ہے قطع کے معنی میں ہے اصغر و اصغر دونوں مرفوع ہیں، علامہ قرطبی کہتے ہیں جو حصہ جنت کے قریب ہو گا اس میں بیاض ہو گا اور جو ہر کی طرف ہو گا وہ زرد اور ہر ہو گا۔

قوله الخواتم الخ: تادم مفتوح اور مکسور، مراد اس سے نشان اور علامت ان کی گردنوں میں علامت ہو گی، تاکہ ان مغفورین سے ممتاز ہوں، جو عمل صالح کے توسط سے نکالے گئے ہیں، امام تودوسی کی یہی رائے ہے اور صاحب التحریر فرماتے ہیں کہ خواتم سے مراد سونے وغیرہ کی کوئی چیز ہو گی جو ان کی گردن میں لٹکائی جائے گی۔

قوله بغير عمل عملوه الخ: مراد اعمال جو ارجح ہیں۔

قوله ولا خير قدموه: مراد اعمال قلب ہیں۔

قوله عيسى بن حماد زغبة المصري: زلف مضموم نہیں ساکن حماد والد عیسیٰ کا لقب ہے۔

قوله بلغني ان الجسر اذق من الشعرة الخ: فضیل بن عیاض کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ پلصر لٹ کی مسافت پندرہ ہزار سال کی ہو گی، پانچ ہزار اونچائی، پانچ ہزار نیچائی، اور پانچ ہزار برابری کی بال سے زیادہ باریک ٹکڑا سے زیادہ تیز اس پر وہی انسان گذر سکتا ہے جو اللہ کی خشیت سے دہلا ولا غر ہو گیا ہو اس کو ابن ابی نعیم نے ترجمہ الباب میں ذکر کیا ہے اور یہ معطل ہے صحیح سند سے ثابت نہیں (فتح الباری) معتزل کہ پل صراط پر چلنے کو محال سمجھتے ہیں، اہل سنت جواب دیتے ہیں کہ جو ذات چڑیا کو فضلوں میں اڑنے کی طاقت دے سکتی ہے وہ اس پر قادر ہے ایسے باریک راستہ پر مومنوں کو چلنے کی طاقت دیدے اس لئے اس میں تاویلات کی کوئی ضرورت نہیں۔

شیخ ابو طاہر قزوینی فرماتے ہیں کہ پلصر لٹ دو ہیں، دنیا میں اسلام وہ غم ہے اور یہی آخرت میں حسی پل میں تبدیل ہو جائے گا، اھدنا الصراط المستقیم، یہی مطلب ہے مذہب اسلام در حقیقت پل ہے جو کنکری پینڈ پر بچھایا گیا ہے۔ اور وہ ایک سیدھی کھیر ہے، جو بندہ اور اللہ کے درمیان کھینچی ہوئی اور پتھروں بچ بالکل سیدھی ہے، تشبیہ و تعطیل جبر و قدر، سخا و بخل شجاعت و جبن، کے درمیان ہے، جیسے تواضع کبر اور خساست کے بیچ میں ہے، عفت و شہوت اور تہمدی کے بیچ میں، ان امور کے دونوں کنارے مذموم اور بیخ والا محمود ہے، بیخ والے راستہ پر ثابت قدم رہنا یہی مطلب وقت اور تیزی کا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسی کی طرف اپنے فرمان ماسبق تم کما امرت میں ارشاد فرمایا ہے، دوسرے پلصر لٹ اخروی ہے جو حسی ہو گا اور وہ در حقیقت پہلے پلصر لٹ کی صورت ہو گی اور وہ مسلمانوں کے لئے جنت کا راستہ ہو گا لہذا جو شخص دنیا میں اسلام کے راستے پر چلنے کا عادی ہو گا روز قیامت پلصر لٹ پر آسانی سے چلے گا۔ اور جس کو دنیا میں اسلام پر چلنے کی عادت نہ ہو گی، ان کے لئے اخروی پل صراط پر چلنا دشوار ہو گا۔ اور دنیا میں جو رفتار اسلام کے راستے پر چلنے کی ہو گی وہی رفتار اخروی پل صراط پر چلنے کی ہو گی۔ اور کالیب دنیوی امور ہوں گے، جو دلوں سے متعلق ہوں گے، جس طرح دنیا میں انسان کو اپنی طرف کھینچتے تھے اسی طرح جہنم میں کھینچ لیں گے، اور پل صراط پر گھسٹ کر چلنا تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن سے برابر لغزشیں ہوتی رہتی تھیں، اور اس کے نتیجہ میں وہ صراط مستقیم سے کبھی ہٹ جایا کرتے تھے، نسأل اللہ اللطف بنا اجمعین۔

## باب اثبات الشفاعة و اخراج الموحدين من النار

حدثنا هارون بن سعيد الايلي..... عن ابي سعيد الخدري ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال يدخل الله اهل الجنة الجنة يدخل من يشاء برحمته ويدخل اهل النار النار ثم يقول انظروا من وجدتم في قلبه مثقال حبة من خردل من ايمان فاخرجوه فيخرجون منها حسدا قد امتحشوا فيلقون في نهر الحياة او الحيل فينبئون فيه كما تنبت الحبة الى جانب السيل ثم تروها كيف تخرج صفراء ملتوية. (مسلم ص ۱۰۴)

**ترجمہ** ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جس کو چاہیں گے، جنت میں داخل کریں گے، اور جہنم میں داخل کریں گے، اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے جا کر دیکھو، جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو تو اس کو نکال لاؤ، تو وہ لوگ اس سے کوئلہ کی طرح نکلیں گے، چڑا جل کر صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہوں گی، پھر ان کو نہر حیات یا حیا میں ڈالا جائیگا، تو اس کے بدن پر گوشت پوست پیدا ہوگا، جیسا کہ سیل کے رو میں بہا ہوا دانہ آگ جاتا ہے کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح پیلا ہوا نکلتا ہے۔

**تشریح** لغت میں شفاعت کے معنی معونت اور مدد کے ہیں، اور اصطلاح میں عذاب کو اٹھا دینا، اور گناہوں کو دور گذر کرنا، اہل سنت والجماعت، شفاعت کے قائل ہیں، اور یہ حق انبیاء و رسل و صالحین کو دیا جائے گا، اور یہ لوگ اہل کبار کو جہنم سے نکالیں گے، شفاعت خبر مشہور سے ثابت ہے، معتزلہ شفاعت کے منکر ہیں، چونکہ اہل سنت والجماعت، بلا شفاعت گناہ کبیرہ کی معافی کے قائل ہیں، حق تعالیٰ بہت سے گنہگاروں کے خطا کو معاف فرمائیں گے، تو مقرران بارگاہ کی سفارش سے بدرجہ اولیٰ معافی ہوگی، اور چونکہ معتزلہ گناہ کبیرہ کی معافی کے قائل نہیں، اس لئے وہ شفاعت کے بھی قائل نہیں، اہل سنت والجماعت کے دلائل میں، ایک دلیل ”واستغفر لذنوبك وللمؤمنين والمؤمنات“ ہے، ظاہر ہے کہ آپ کا استغفار مؤمنین و مؤمنات کے لئے فائدہ مند ہو گا تب ہی تو آپ کو استغفار کا حکم دیا گیا، اگر استغفار سے فائدہ نہ ہوتا تو پھر حکم ہی کیوں دیا جاتا؟ نیز ”فما تنفعهم شفاعۃ الشافعين“ کا انداز بیان شفاعت کو ثابت کرتا ہے، کیونکہ کافروں کے حق میں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کو غیر نفع بخش بتایا گیا ہے، تو مظلوم ہوا کہ مؤمنین کے حق میں نفع بخش ہوگا، یہ استدلال مفہوم مخالف سے نہیں بلکہ اسلوب کلام سے ہے، حدیث میں ہے ”شفاعتی لاهل الکبائر من امتی“ یہ حدیث مشہور ہے بلکہ معنی متواتر ہے۔

معتزلہ کے دلائل میں ایک دلیل ”وانفقویوما لا تجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منها شفاعۃ“ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے ”وما للظالمین من حمیم ولا شفیع یطاع“

اہل سنت والجماعت کی طرف سے جواب یہ ہے کہ تمہاری دلیل نفی شفاعت میں عام ہے مومن اور کافر سب کو اس میں شامل کرتے ہو، اور جمیع اوقات کے ساتھ عام مانتے ہو، (کسی وقت بھی شفاعت نہیں ہوگی) اور ہماری دلیل اشخاص اور اوقات دونوں لحاظ سے خاص ہے یعنی شفاعت صرف مسلمانوں کے حق میں قبول ہوگی، اور اس کا خاص وقت ہوگا، اور وہ اوزن کے بعد، اس لئے ہماری دلیل ہر لحاظ سے خاص اور تمہاری عام اور خاص کو عام پر ترجیح ہوتی ہے اس لئے ہماری دلیل

قابل ترجیح ہے۔ معافی اور شفاعت کا ثبوت کتاب و سنت اور اجماع سے ہے، اس کے بارے میں معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ عفو کا تعلق صغائر سے ہے اور کبائر کی معافی کے لئے توبہ ضروری ہے، اور شفاعت ترقی درجہات کے لئے ہوگی، جواب اس کا یہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے توبہ کرنے والا اور صغیرہ کا مرتکب جو کبائر سے پرہیز کرتا رہے معتزلہ کے نزدیک وہ مستحق عذاب نہیں۔ تو پھر عفو کا کیا مطلب کیونکہ ایسے اہل صغائر کے بارے میں معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ عذاب دے ہی نہیں سکتے۔ جب عذاب ہی نہیں ہو سکتا ہے تو کیا ترک عذاب کو عفو کہا جاسکتا ہے، اور مرتکب کبیرہ کے لئے خلود فی النار کے قائل ہیں۔ تو ان کے لئے بھی معافی کا کوئی سوال نہیں۔ پھر عفو و مغفرت کا کیا مطلب ہے؟ نیز شفاعت کے معنی گناہوں سے معافی کی طلب اور درخواست کے ہیں۔ پھر شفاعت کے معنی ترقی درجہات کے لینا کتنی بڑی حماقت ہے۔

### شفاعت کے اقسام

امام علی قاریؒ شفاعت کی پانچ قسمیں تحریر کرتے ہیں۔ (۱) پہلی شفاعت آنحضور ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں آپؐ کی شفاعت، اہل محشر کے حساب و کتاب کی بابت ہوگی، جس کی وجہ سے موقف کی ہولناکی اور پریشانیوں سے لوگوں کو نجات مل جائے گی، (۲) دوسری شفاعت کچھ لوگوں کو بلا حساب و کتاب جنت میں داخل کرانے کے لئے ہوگی، یہ بھی آپؐ کے ساتھ خاص ہے۔ (۳) تیسری شفاعت، ان لوگوں کے لئے جو جہنم کے مستحق ہو چکے ہوں گے ان کے بارے میں آنحضور ﷺ ملائکہ، اور صلحاء امت شفاعت کریں گے، (۴) چوتھی شفاعت ان گناہگار مومن کیلئے جو جہنم میں جا چکے ہوں گے، ان کے بارے میں حدیثوں میں آتا ہے کہ ہمارے نبیؐ، فرشتے، اور مومنین بھائیوں کی شفاعت سے نکالے جائیں گے، (۵) پانچویں شفاعت جنتیوں کی ترقی درجہات کی بابت، اس آخری شفاعت کے معتزلہ بھی قائل ہیں، گویا یہ آخری قسم متفق علیہ ہے، جس کا بیان اوپر بھی ہو چکا ہے۔

قوله من وجدتم الخ: امام غزالیؒ "فی قلبہ" کے لفظ سے استدلال کرتے ہیں کہ جن کے دل میں خدا کا یقین پیدا ہو جائے اور نطق سے قبل، اس کی موت ہو جائے، تو ایسے لوگوں کو نجات مل جائے گی، اسی طرح امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جن کو اقرار کا موقع ملے، اور انہوں نے تاخیر کر دی، اور اقرار سے قبل اس کی موت ہو گئی، تو ایسا شخص بھی مخلص فی النار نہیں ہوگا، اقرار لسانی سے ان کا رکتا یہ ایسا ہی ہوگا جیسے نماز سے رکنا، بغض لوگ اس دوسرے نمبر کے شخص کو مخلص فی النار مانتے ہیں، اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں، لہذا ان لوگوں کے یہاں فی قلبہ میں تاویل کی ضرورت پڑے گی، اور اس کے لئے ایک عبارت محذوف مانا جائے گا، "لقدیر عبارت" منضمنا الی النطق بہ مع القدرة علیہ یعنی وہ انسان جس کے دل میں توحید ہو، اسی وقت جہنم سے نکالا جائیگا کہ اس کے ساتھ اقرار بھی شامل ہو۔ جبکہ اس کا موقع اس کو ملا ہو۔

قوله ملتوی: بمعنی مڑا ہوا، جھکا ہوا،

قوله ولم یسکنا: تشبیہ کی ضمیر، وہیب اور خالد کی طرف لوثی ہے، یعنی امام مالک کو لفظ حیات یا حیات میں شک ہو، ان دونوں راویوں کو شک نہیں ہوا۔ بلکہ یہ لفظ حیات کو یقینی طور پر ذکر کرتے ہیں۔

قوله کما تنبت الغشاۃ الخ: نہیں مضموم اور ثناء مفتوح اور الف کے بعد ہمزہ، پھر ہاؤ برائے موصوفہ ہے، وہ چیز جو

سیلاب میں بہے یعنی لکڑی پتہ، سچ وغیرہ یہاں خاص کر سچ مراد ہے۔ قوله فی حمۃ السیل میم کے بعد ہمزہ، پھر ہاء، کچھڑ کو کہتے ہیں۔

## کیا جہنم میں موت آئے گی؟

قوله فاماتہم اللہ الخ: بعض نسخہ میں ”فاماتہم“ دو تہ کے ساتھ یعنی جہنم کی آگ ان کو مار ڈالے گی۔

(۱) امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ لامت حقیقی ہے، جتنی مدت ان کے عذاب کی مقرر ہوگی، اس کو بھگتتے کے بعد ان پر موت طاری ہو جائے گی، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہنم جاتے ہی مر جائیں گے، ان پر عذاب، ان کا جلنا، اور جلدی جنت جانے سے رکنا یہ ایسا ہی ہوگا جیسے قیدیوں کا حال ہوتا ہے، ہاں کفار نہ ان پر موت طاری ہوگی، تاکہ ان کو تکلیف کا احساس ہو تا رہے، اور نہ ان کو لطف اندوز زندگی میسر ہوگی جیسا کہ انکے حق میں ہے ”لایموت فیہا ولا یحی“

(۲) بعض اہل علم اس کی یہ بھی تاویل کرتے ہیں، کہ اس سے حقیقی موت مراد نہیں ہے۔ بلکہ لامت یہ کنایہ ہے تکلیف کے احساس نہ ہونے سے، اور ایک مہربانی ان لوگوں پر ہوگی، اور اس کو ایسا سمجھنا چاہئے، جیسے آج کل آپریشن سے قبل ”کلوروفارم“ سنگھا کر بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ یا انجکشن دے کر بدن کے اس حصہ کو ماؤف کر دیا جاتا ہے، تاکہ چیر پھاڑ کی لذت کا احساس نہ ہو۔ ممکن ہے کہ جہنمی مومنوں کے ساتھ بھی معاملہ ہو۔

(۳) یا لامت، نوم سے کنایہ ہو اللہ تعالیٰ نے نوم کو وفات کا نام دیا ہے، اور حدیث میں ”النوم اخو الموت“ آیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جب فاسق مومن جہنم میں داخل ہو جائیں گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ جب ان کے نکالنے کا ارادہ فرمائیں گے۔ تو اس وقت ان کو تکلیف کا احساس ہوگا۔ (فتح الباری)

قوله فجیء بہم ضیائر ضیائر الخ: دو مرتبہ اور یہ حالت کی بنا پر منصوب ہے۔ ضاد مفتوح ضبارہ مفتوح الضاد و بکسر الضاد کی جمع ہے ضبار مختلف جماعتوں کو کہتے ہیں۔ اور ضیادت ضیارت کی بھی روایت آئی ہے۔

وحدثنا ابوبکر بن ابی شیبۃ وابو کرب واللفظ لابی کرب قال نا ابو معاویۃ عن الاعمش عن ابراہیم عن عبیدۃ عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی لاعرف آخر اهل النار خروجاً من النار، رجل یخرج منها زحفاً فیقال له انطلق فادخل الجنة، قال فیذهب فیدخل الجنة فیجد الناس قد اخذوا المنازل فیقال له أتذكر الزمان الذی کنت فیہ فیقول نعم فیقال له تمّن فیتمنّ فیقال له لك الذی تمنیت وعشرة اضعاف الدنیا فیقول أتسخری وانت الملك قال لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضحك حتی بدت نواجذہ.

حدثنا ابوبکر بن ابی شیبۃ قال نا عفان بن مسلم قال حماد بن سلمۃ قال انا ثابت عن انس عن ابن مسعود ان رسول اللہ ﷺ قال آخر من یدخل الجنة رجل فهو یمشی مرۃ ویکب مرۃ وتسفعہ النار مرۃ فاذا ما جاوزھا التفت الیھا فقال تبارک الذی نجانی منك لقد اعطانی اللہ شیئاً ما اعطاه احدا من الاولین والآخرین فترفع له شجرة فیقول لی رب الدننی من هذه الشجرة

فلاستظل بظلها واشرب من ماء هـ فيقول الله عزوجل يا ابن آدم لعلی ان اعطيتكها سألتني غيرها فيقول لا يا رب وبعاهده ان لا يسأله غيرها وربه تعالى يعذره لانه يرى مالا صبر له عليه فيدنيه منها فيستظل بظلها ويشرب من ماء هـ ثم ترفع له شجرة هي احسن من الاولى فيقول اي رب ادنني من هذه الشجرة لا شرب من ماء هـ واستظل بظلها لا اسألك غيرها فيقول يا ابن آدم ألم تعاهدني ان لا تسألني غيرها فيقول لعلی ان ادنيتك منها تسألني غيرها فيعاهده ان لا يسأله غيرها وربه تعالى يعذره لانه يرى مالا صبر له عليه فيدنيه منها فيستظل بظلها ويشرب من ماء هـ ثم ترفع له شجرة عند باب الجنة هي احسن من الاوليين فيقول اي رب ادنني من هذه الشجرة لاستظل بظلها واشرب من ماء هـ لا اسألك غيرها فيقول يا ابن آدم ألم تعاهدني ان لا تسألني غيرها قال بلى يا رب هذه لا اسألك غيرها وربه تعالى يعذره لانه يرى مالا صبر له عليه فيدنيه منها فاذا ادناه منها فيسمع اصوات اهل الجنة فيقول يا رب ادخلنيها فيقول يا ابن آدم ما يصريني منك أيرضيك ان اعطيك الدنيا ومثلها معها فيقول يا رب انتستهزأ مني وانت رب العالمين فضحك ابن مسعود فقال ألا تستلوني بم أضحك قالوا بم تضحك فقال هكذا ضحك رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالوا بم تضحك يا رسول الله فقال من ضحك رب العالمين حين قال انتستهزأ مني وانت رب العالمين فيقول اني لا استهزئ منك ولكني على ما اشاء قادر۔ (مسلم ص ۱۰۵)

ترجمہ | حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، میں اس شخص کو خوب جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلیں گے، اور سب سے آخر میں جنت میں داخل ہوں گے، وہ شخص جہنم سے گھٹ کر نکلے گا، حق تعالیٰ اس سے کہے گا، جاؤ جنت میں چلے جاؤ، آپؐ نے فرمایا وہ جنت میں آئے گا۔ تو اس کو ایسا دکھائی دے گا، کہ جنت بھری ہوئی ہے، وہ پلٹ جائیگا، اور اللہ تعالیٰ سے کہے گا، اے رب میں نے جنت کو بھرا ہوا پایا، پھر اللہ تعالیٰ کہے گا جاؤ اور جنت میں داخل ہو جاؤ، آپؐ نے فرمایا پھر وہ آئے گا تو اس کو جنت بھری ہوئی معلوم ہوگی، وہ دلوٹ کر پھر جائے گا، اور اللہ تعالیٰ سے کہے گا، مجھے بھرا ہوا معلوم ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو معذور سمجھے گا، کیونکہ وہ ایسی چیز دیکھے گا، کہ صبر کی اس میں اس پر طاقت نہیں ہوگی، پھر اللہ تعالیٰ اس کے قریب کر دے گا، جب وہ اس کے قریب آجائے گا تو جنتیوں کی آواز سنے گا۔ تو وہ کہے گا اے میرے رب مجھے اس میں داخل کر دیجیے، تو حق تعالیٰ فرمائے گا، کون سی چیز تمہارے سوال کو ختم کرے گی، کیا تم اس بات پر راضی ہو جاؤ گے، کہ میں تم کو دنیا اور اتنا ہی اور دیدوں، تو وہ کہے گا اے میرے رب کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں۔ آپ تو رب العالمین ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود مسکرائے، عبد اللہ بن مسعود نے (اپنے شاگردوں سے) کہا کہ تم لوگ مجھ سے کیوں نہیں پوچھتے کہ میں کس وجہ سے ہنسنا (مسکرایا) لوگوں نے دریافت کیا، کس وجہ سے ہنسے (مسکرائے) تو ابن مسعود نے فرمایا اسی طرح آنحضور ﷺ مسکرائے تھے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ آپ کس وجہ سے مسکرائے یا رسول اللہ تو آپؐ نے فرمایا رب العالمین کے مسکرانے کی وجہ سے، جس وقت اس نے کہا، کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ رب

العالمین ہیں۔ تو حق تعالیٰ فرمائے گا میں تم سے مدق نہیں کر رہا ہوں۔ ہاں جو چیز میں چاہتا ہوں اس پر قدرت رکھتا ہوں۔  
**شرح الفاظ** | قوله حیو الخ: دوسری روایت میں زحاف ہے، حیو دونوں ہاتھ اور پاؤں پر چلنا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں ہاتھ اور کھٹنہ کے بل چلنا، اور ایک قول یہ بھی ہے ”دونوں ہاتھ اور مقعد پر چلنا“ زحف سرین کے بل چلنا، اس کے ساتھ سینہ پھیلا دے، اس طرح سے زحف اور حیو مماثل یا متقارب ہوں گے اور اگر دونوں میں اختلاف ملتا جائے تو پھر تادیل یہ ہے کہ کبھی حیو کی صورت ہوئی اور کبھی زحف کی۔

### خدا کی طرف مزاح کی نسبت

قوله أنتسخری او تضحك الخ: راوی کو شک ہے۔ اگر واقعہً انتضحك ہے، تو معنی انتسخرنی کے ہیں۔ کیونکہ حر یہ کرنے والا عموماً ہنستا ہے، تو یہاں ضحك کو سخریہ کی جگہ پر مجازاً ذکر کر دیا ہے۔ رہا سخریہ کی نسبت خدا کی طرف، تو اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں۔

(۱) علامہ مازنیؒ اس کو مقابلہ پر محمول کرتے ہیں۔ جیسے جزاء سیفۃ سیفۃ، اسی طرح یخادعون اللہ وہو خادعہم میں ہے۔ یہاں اس کی صورت یہ ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ سے بار بار یہ عہد کرتا رہا کہ اب اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے کوئی دوسرا سوال نہیں کرے گا، اور بار بار اس کو توڑتا رہا، تو اس کا یہ عذر ایک طرح کا سخریہ اور مذاق ہوا، تو اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ حق تعالیٰ اس کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں، جبکہ اس کو جنت بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ ہمارے حریہ (عذر) کا بدلہ تو نہیں دے رہے ہیں، اس لئے انہوں نے سخریہ کے بدلہ کو سخریہ سے تعبیر کر دیا، تو یہاں انتسخریہ کے معنی تعاقب بنی کے ہوئے۔

(۲) ابو بکرؓ صیر فی اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ انتسخریہ میں ہمزہ استفہام نفی کا ہے، مقصد اللہ تعالیٰ سے حر یہ کی نفی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا وہ شخص کہتا ہے مجھے اسکا یقین ہے کہ آپ حر یہ نہیں کرتے ہیں، کیونکہ آپ رب العالمین ہیں، آپ نے مجھے اتنا بڑا بدلہ دیا کہ دنیا سے کئی گنا جنت میں جگہ عنایت فرمایا، اس پر حیرت یہ ہے کہ آپ مجھے نااہل پر اتنی بڑی نوازش کا برتاؤ فرما رہے ہیں۔

(۳) قاضی عیاضؒ اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ یہ شخص انتہائی خوشی میں اپنے ذہن و دماغ پر بے قابو ہے، انتہائی مسرت میں بے سوچے سمجھے یہ لفظ اس کی زبان سے نکل گیا، اس کو ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسے ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص اپنے خورد و نوش کا سامان اپنی سواری پر رکھ کر چلا، اور ایسے چٹیل میدان میں پہنچ گیا، جہاں دور دور تک خورد و نوش کا سامان نہیں ہے، اس کی سواری کل سامان کے ساتھ غائب ہو گئی، اور وہ اسی یاس و ناامیدی میں بیٹھ گیا، اور اپنی موت کا منتظر رہا۔ اسے اسی حالت میں فیند آگئی، اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا سواری پورے سامان کے ساتھ اسکے سامنے موجود ہے، ایسے وقت میں اس کو اتنی غیر معمولی خوشی ہوئی، کہ اس کی زبان سے بے سوچے سمجھے ”انت عبیدی وانا ربک“ کا لفظ نکل گیا اس کو یہاں بھی اسی طرح سمجھنا چاہئے۔

تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے، جاو اور جنت میں داخل ہو جاو، اور تم کو دنیا کے مثل اور اس کے دس گنا تم کو جنت دی،

آپؐ نے ارشاد فرمایا، وہ کہے گا کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں، یا کہے گا مجھ سے ہنسی دل لگی کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ بادشاہ ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے آنحضور ﷺ کو ہنسنے (مسکراتے) ہوئے دیکھا، کہ آپ کے سامنے کے دندان مبارک نمودار ہو گئے، آپؐ نے فرمایا کہ یہ اونٹنی جنتی کا رتبہ ہو گا۔ عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے، کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص کو خوب پہنچاتا ہوں جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلے گا، وہ شخص جہنم سے سرین کے بل چل کر نکلے گا، تو اس سے کہا جائیگا کہ جہنم میں داخل ہو جاؤ، آپؐ نے فرمایا وہ جائے گا، اور جنت میں داخل ہو جائیگا تو اس کو محسوس ہو گا کہ سارے جنتی اپنی اپنی جگہ پر قبضہ کر چکے ہیں، اور اس کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم کو وہ زمانہ یاد ہے جہاں تم تھے وہ کہے گا ہاں، تب ان سے کہا جائیگا، تمنا کرو، تو وہ تمنا کرے گا، اس کے بعد ان سے کہا جائیگا، جس قدر تم نے تمنا کی، اس کے دس گنا دینا کے برابر تم کو دیا تو وہ کہے گا کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں حالانکہ آپ بادشاہ ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے آنحضور ﷺ کو اس طرح مسکراتے ہوئے دیکھا کہ آپ کے سامنے والے دندان مبارک نمودار ہو گئے۔

حضرت انسؓ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا آخری شخص جو جنت میں داخل ہو گا، تو وہ کبھی چلے گا، کبھی گر پڑے گا، اور گا ہے جہنم کی آگ اس کے چہرے کو سیاہ کر دے گی، جب وہ اس کو پار کر جائے گا، تو پلٹ کر اس کو دیکھے گا، اور کہے گا بابرکت ہے، وہ ذات جس نے تم سے مجھ کو نجات دلا دی، مجھے تو اللہ نے ایسی چیز عنایت فرمائی، جو اولین و آخرین میں سے کسی کو عنایت نہیں فرمائی۔ اس کے سامنے ایک درخت بلند کر کے دکھایا جائیگا، تو وہ کہے گا اے میرے رب مجھے اس درخت کے قریب کر دیجئے، کہ میں اس کا سایہ حاصل کروں، اور اس کا پانی پیوں، تو اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اے آدم کی اولاد میں اسے تم کو دیدوں، تو ہو سکتا ہے تم اس کے علاوہ کا سوال مجھ سے کرو، تو وہ کہے گا نہیں اے میرے رب اور اللہ سے وہ عہد کرے گا، کہ اس کے سوا کوئی مانگ نہیں کرے گا، اور اللہ تعالیٰ اس کو معذور سمجھے گا، اس لئے کہ وہ ایسی چیز کا مشاہدہ کرے گا جس کو مانگتے بغیر اس سے صبر نہیں ہو گا، پھر اس کو اس درخت کے قریب کر دے گا، اور وہ اس سے سایہ حاصل کرے گا، اور اس سے پانی پئے گا، پھر اس کے سامنے ایک دوسرا درخت اٹھایا جائے گا جو پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گا۔ تو (اس کو دیکھ کر) وہ کہے گا اے میرے رب مجھے اس درخت کے قریب کر دیجئے، تاکہ اس کا پانی پیوں، اور اس کا سایہ حاصل کروں، اس کے سوا اور کوئی مانگ نہیں کروں گا، تو اللہ تعالیٰ کہے گا اے بنی آدم کیا تم نے مجھ سے عہد نہیں کیا تھا کہ اور کوئی مانگ مجھ سے نہیں کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کہے گا ہو سکتا ہے کہ میں اس کے قریب تم کو کروں، تو مجھ سے اس کے سوا کوئی مانگ کرے گا۔ پھر اللہ سے عہد کرے گا، کہ اس کے سوا اللہ سے اور کوئی سوال نہیں کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تو اس کو معذور سمجھے گا، کیونکہ وہ ایسی چیز کا مشاہدہ کرے گا جس پر اس کو صبر نہیں ہو سکے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس درخت کے قریب کر دے گا، اس کا سایہ حاصل کریگا اور اس کا پانی پئے گا، پھر جنت کے دروازہ کے قریب ایک اور درخت نمودار ہو گا، جو پہلے دونوں درخت سے زیادہ حسین ہو گا۔ تو وہ کہے گا، اے میرے رب مجھے اس درخت کے قریب کر دیجئے، تاکہ میں اس کے سایہ میں آ جاؤں، اور اس کا پانی پی سکوں، اس کے سوا اور کوئی سوال نہیں کروں گا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابن آدم کیا تم نے مجھ سے عہد نہیں کیا تھا کہ اب کوئی سوال نہیں کروں گا۔ وہ کہے گا ہاں ایہ عنایت فرمادیں اور اس کے بعد اب کوئی سوال نہیں کروں گا۔

قوله حتى بدت نواجزه الخ: نواجزہ کی جمع ہے۔ سامنے کے دانت، کچلی۔

قوله فيجد الناس قد اخذوا المنازل الخ: بعض روایت میں فیخیل الیہ أنها ملأی کے الفاظ ہیں۔ یعنی اسکو ایسا معلوم ہوگا کہ جنت میں کوئی خالی جگہ نہیں ہے۔

قوله ويكبو مرة الخ: ٹھہرنا چہرے کے بل گر پڑنا۔

قوله وتسفحه النار الخ: جہنم کی آگ سے چہرے کا جھلس جانا۔ سیاہ کر دینا۔ ماحوز میں مازا کرنا ہے۔

قوله ما اعطاه احدا من العالمين الخ: ممکن ہے اس نے اپنے ساتھ کسی اور کو جہنم سے نکلے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ اور یہ پتہ نہ ہو کہ صالحین جنت میں مقیم ہیں۔

قوله فترفع له شجرة الخ: درخت کے ساتھ پانی کا چشمہ بھی ہوگا،

قوله ادننى من هذه الخ: ادنا، قریب کرنا۔

قوله فلاستظل بظلها الخ: فاسیہ اور لام زائد، یا اس کے برعکس یعنی لام سیہ فلو زائد۔

قوله يرى مالا صبر له عليه الخ: علیہ کے ضمیر کا مرجع باہے اور بعض نسخہ میں علیہا تو مابذل میں نعمت کے ہے، اور علی معنی میں عن کے ہے۔

قوله فيسمع اصوات اهل الجنة الخ: یعنی اہل جنت کی بیویوں اور دوستوں کی بات کو سنیں گے، اس سے مقصد یہ ہوگا کہ ان کی باتیں سن کر ایک گونہ انیسیت حاصل ہو۔

قوله ما يصبرني الخ: یہ مفتوح صادر ساکن صری سے ماخوذ ہے۔ قطع کے معنی میں ہے، مقصد یہ ہے کہ کس چیز سے تم راضی ہو گے، اور تمہارا سوال کس چیز سے ختم ہوگا۔

قوله فضحك ابن مسعود الخ: چونکہ بات ہی اس قسم کی ہے، جس سے ہنسی آتی ہے، اس لئے ابن مسعود کو ہنسی آگئی، محض تقلید اور حضور ﷺ کے فعل کی حکایت کے لئے نہیں ہنسی، انسان عجیب و غریب قول و فعل دیکھ کر سن کر بے اختیار ہنسی پڑتا ہے۔

قوله من ضحك رب العالمين الخ: ضحك، رضاء سے کنایہ ہے، اور حضور ﷺ کا ضحك حقیقی ہے۔ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ضحك اقتداء کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے۔

قوله ولكنى على ما اشاء قادر الخ: استدراک محذوف کا ہے، جب اس سے کہا جائے گا، کہ کیا تم اس سے خوش ہو جاؤ گے، کہ دنیا اور اتالی اور دیدوں تو وہ اس کو اپنے لئے مستعد سمجھے گا، اور اس کے نتیجہ میں "انتستہزأ بی" کہے گا۔ تو حق تعالیٰ اس کو جواب دیتے ہوئے فرمایا، اگرچہ تم اس مقام کے اہل نہیں ہو، مگر میں تم کو اس رتبہ کا اہل بنا رہا ہوں، اور جس کو تم بعید سمجھ رہے ہو، میں تم کو عنایت کر رہا ہوں، کیونکہ مجھے ہر چیز پر قدرت ہے ایسی ہی میں باہل کو بھی اہل بنانے کی قدرت رکھتا ہوں۔

حدثنا سعيد بن عمرو الاشعثي سأل موسى عليه السلام ربه تعالى ما ادنى اهل الجنة

منزلة قال هو رجل يجي بعد ما ادخل اهل الجنة الجنة فيقال له ادخل الجنة فيقول ابي رب



كيف وقد نزل الناس منازلهم واخذوا اخذاتهم فيقال له أترضى ان يكون لك مثل ملك من ملوك الدينا فيقول رب فيقول لك ذلك ومثله ومثله ومثله ومثله فقال في الخامسة رضيت رب فيقول هذا لك وعشرة امثاله ولك ما اشتئت نفسك ولذت عينك فيقول رضيت رب قال رب فاعلاهم منزلة قال اولئك الذين اردت غرست كرامتهم بيدي وختمت عليها فلم ترعين ولم تسمع اذن ولم يخطر على قلب بشر وقال مصداقه في كتاب الله عزوجل فلا تعلم نفس ما اخفى لهم من قرة اعين الآية۔ (مسلم ص ۱۰۶)

ترجمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے دریافت کیا کہ ادنیٰ جنتی کی پہچان و علامت کیا ہے؟ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک شخص جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد آئے گا، اسے کہا جائیگا کہ تم جنت میں چلے جاؤ، تو وہ کہے گا اے میرے رب! سارے لوگ تو اپنے اپنے مقامات پر قبضہ کر چکے ہیں، (اب میرے لئے جگہ کہاں رہی) تو ان سے کہا جائیگا کہ کیا تم اس پر راضی ہو، کہ تم کو دنیا کے بادشاہ جیسا ملک دیدیا جائے، تو وہ کہے گا میں راضی ہوں، اے میرے رب میں راضی ہوں۔ حق تعالیٰ فرمائے گا تم کو اتنا ہی دیا اور اس کے ساتھ اتنا، اتنا، اتنا، اتنا اور پانچویں مرتبہ میں بولے گا اے میرے رب میں راضی ہوں، تو حق تعالیٰ کہیں گے یہ سب دیا، اور اس کے دس گنا، اور تم کو جس چیز کی خواہش ہوگی، اور جس سے تمہاری آنکھوں کو غنڈک حاصل ہو، وہ سب ملے گا، تو وہ کہے گا اے میرے رب میں راضی ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ اعلیٰ مرتبہ کے جنتی کی پہچان (یا حالات) بتادیں، تو حق تعالیٰ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں، جن کو میں نے منتخب کر لیا ہے، (چھٹا لیا ہے) اور میں نے اس کی شرافت و کرامت پر مہر لگا دی ہے، (جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوگی) نہ اس کو کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا، نہ کسی کان نے سنا ہوگا، اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا خیال گذرا ہوگا، اور اس کی تصدیق قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے "فلا تعلم نفس ما اخفى لهم من قرة اعين الآية"

شرح حدیث قولہ روایۃ انشاء اللہ الخ: سند میں یہ لفظ یعنی انشاء اللہ باب زیادة طمانینت القلب بتظاہر الادلہ الخ کے ذیل میں گزر چکا ہے، وہاں اس کی تحقیق نہیں ہو سکی، یہاں ملاحظہ ہو۔ امام مسلم کے اس لفظ پر بعض نادان نے اعتراض کیا ہے کہ لفظ انشاء اللہ سے شک کا پتہ چلتا ہے، پھر امام مسلم مشکوک روایت کو اپنی کتاب میں ذکر کر کے، اس سے کس طرح استدلال کر رہے ہیں، جواب اس کا یہ ہے کہ امام مسلم نے اس حدیث کو باب کی بنیادی روایت نہیں بنایا ہے، بلکہ متابعت اور استشہاد کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔ متابعت میں کمزور اور ضعیف اور مشکوک روایتوں کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے، ہاں اس کی اصول میں گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی استشہاد کے طور پر ذکر فرمایا ہے، نیز محدثین کے یہاں لفظ روایت، "یرفعہ" "یبلغ بہ" یہ کل مرادف الفاظ ہیں۔ اور سب کا مقصد روایت کو حضور ﷺ تک مرفوع کرنے کے لئے ہوتا ہے، اس لئے یہاں روایۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم معنی ہے۔ اور اسی کو دوسری روایت میں بیان کر دیا ہے، اس لئے انشاء اللہ کے لفظ سے روایت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، کیونکہ اور روایات میں جزم کے الفاظ موجود ہیں۔

قوله قد اخذوا اخذاتهم الخ: قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل والاعمال پر قابض ہیں۔ یا قصدوا منازلہم کے معنی میں ہے۔

قوله هذا لك وعشرة امثاله الخ: مقصد یہ ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی حکومت پوری دنیا پر نہیں ہوتی ہے، بعض کی تھوڑے پر، اور بعض کی اس سے زائد پر اس جتنی کو دنیا کے بادشاہوں کے پانچ گنا ملے گا، اور یہ سب مل کر پوری دنیا کے برابر ہوگا، اور پھر اس کے دس گنا کر دیا جائے گا، یہ عبارت پہلی روایتوں کے موافق ہے۔

قوله مصداقه الخ: بمعنی ما یصدقہ اخس بمعنی لاویٰ یہ اضافی ہے ہو سہ جنت میں کسی کو کھلیا، اور لاویٰ چیز نہیں ملے گی، قوله غرست کرامتهم بیدی الخ: معنی انتخاب کرنے، اور چھانٹ لینے کے ہیں، لہذا ان کے مقامات اور نعمتوں میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی نہیں ہوگا، جس طرح زمین میں جڑ مضبوط ہو جاتی ہے، یہی حال ان کے مقامات کا ہوگا۔

قوله ولم یخطر علی قلب بشر الخ: یہاں عبارت مخدوف ہے، پوری عبارت اس طرح ہے "ولم یخطر علی قلب بشر ما کرمتہم بہ واعدتہ لہم" یعنی جو درجات اور انعام ان کے لئے مقرر کر دیا ہے وہ کسی کے خیالات تک کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی ہے۔

قوله اعرضوا: بمعنی اظہروا

قوله ارفعوا عنه کبارہا الخ: بڑے گناہوں کو معاف کیا جائے، یا اس کا افتخار ہوگا، کذا وکذا یعنی فلاں فلاں گناہ۔ مشفق بمعنی خائف۔

قوله یسأل عن الورد الخ: اشارہ ہے قول باری وان منکم الا واردہا کان علی ربک حتماً مقضیاً الخ کی طرف۔

حدثنی عبید اللہ بن سعید واسحق بن منصور..... أخبرنی ابو الذبیر انہ سمع جابر بن عبد اللہ یسأل عن الورد فقال نجی، نحن يوم القيامة عن كذا وكذا انظر أي ذالك فوق الناس قال فتدعی الامم بلوثانها وملكنت تعبد الاول فالاول ثم یاتینا ربنا بعد ذالك فیقول من تنظرون فیقولون ننظر ربنا فیقول انا ربکم فیقولون حتی ننظر الیک فی تجلی لہم یضحک قال فینطلق بہم ویتبعونہ ویعطی کل انسان منهم منافق اومومن نوراً ثم یتبعونہ وعلیٰ جسر جہنم کلالیب وحسک تاخذ من شاء اللہ تعالیٰ ثم یطفا نوراً لمنافقین ثم ینجوا المومنون فتنجوا اول زمرة وجوہہم کالقمر لیلة البدر سبعون الفا لا یحاسبون ثم الذین یلونہم کاضواء نجم فی السماء ثم کذا لک ثم تحل الشفاعة ویشفعون حتی یرفع من النار من قال لا الہ الا اللہ وکان فی قلبہ من الخیر ما یزن شعیرة فیجعلون بفنلہ الجنة ویجعل اهل الجنة یرشون علیہم الماء حتی ینبتوا نبات الشی فی السیل ویذهب حرارہ ثم یسأل حتی تجعل لہ الدنیا وعشرة امثالہا معہا۔ \* (مسلم ص ۱۰۶، ۱۰۷)

اس روایت کا مفہوم قریب قریب وہی ہے، جو پہلی روایتوں میں ذکر کیا گیا ہے، اس لئے اس کے ترجمہ کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، خاص خاص الفاظ کی تشریح درج کی جاتی ہے۔

### مسلم کی روایت پر اختلاط و تصحیف کا اعتراض

قوله عن كذا وكذا انظر اى ذلك فوق الناس الخ: صحیح مسلم کے تمام نسخوں میں اسی طرح ہے ان الفاظ کے بار میں مقتدین اور متاخرین کا اتفاق ہے کہ الفاظ میں تصحیف، تبدیلی، اور اختلاط ہوا ہے، قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ صحیح الفاظ اس طرح ہیں ”یخى يوم القيامة على كود هكذا“ اسی طرح بعض محدثین نے روایت کیا ہے، ابن ابی خثیمہ کی کتاب میں بطریق کعب بن مالک یہ الفاظ ہیں ”يحشر الناس يوم القيامة على تلّ وامتى على تلّ“ قاضی عیاض نے فرمایا کہ ان الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ مسلم کے الفاظ میں غلطی ہو گئی ہے، کہ یہ الفاظ یا تو راوی پر واضح نہیں ہو سکے، یا حروف مٹ گئے، اس لئے اس کو کڈاؤ کڈاؤ سے تعبیر کر دیا، اور پھر اس کی تفسیر، اپنے الفاظ ”ای فوق الناس“ سے کیا ہے اور اس پر تنبیہ کے لئے انظر لکھ دیا، اسی کو تمام ناقلین نے جمع کر دیا، اور اس انداز سے ملا کر لکھ دیا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ متین حدیث کے الفاظ ہیں۔ نیز اس حدیث کا کل ٹکڑا جابر کا کلام ہے، جو موقوف ہے اور یہ شرط مسلم کے بھی خلاف ہے، کیونکہ ان کے یہاں التزام ہے مرفوع حدیث کا خود امام مسلم نے اس کو ذکر کیا ہے اور دوسری سند سے مرفوعاً ذکر کیا ہے۔

ابن ابی خثیمہ ابن جریج سے یضحك کے بعد مرفوع ہونے کی تصریح کرتے ہیں۔ چنانچہ یضحك کے بعد یہ الفاظ ہیں۔ ”قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول فينطلق بهم الخ“ خود امام مسلم نے اس حدیث کے بعد ابن ابی شیبہ وغیرہ سے شفاعت کی حدیث میں تنبیہ کی ہے، اور اس کی سند اور سماع عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ذکر کیا ہے۔ اس لئے مذکور بالا الفاظ یقیناً راوی کے غلط اور تصحیف پر مبنی ہے۔

قوله فيتجلّى لهم الخ: یعنی رضاء و خوشی کے ساتھ تجلی فرمائے گا۔

قوله كاضوء نجم الخ: یعنی بہت درخشاں اور چمکدار۔

قوله يذهب حراقة الخ: بضم الحاء یعنی آگ کا اثر۔

قوله حدثني يزيد الفقير الخ: فقیر کی وجہ تسمیہ پیٹھ کی ہڈی میں کوئی بیماری ہو گئی تھی، اور اس کی تکلیف کی وجہ سے وہ جھک گئے تھے، یہ غنی کی ضد نہیں ہے۔

قوله الادارة وجوهم الخ: جمع دارۃ کی، چہرے کا دائرہ، یعنی اس کی جو حدی، مقصد یہ ہے کہ جہنم کی آگ محل سجدہ ہونے کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

قوله قد شغفني راي من الخوارج الخ: شغف، دل کے غلاف کو کہتے ہیں، شغاف دل کا غلاف، یعنی معتزلہ کا یہ نظریہ کہ مرتکب کبیرہ مخلص فی النار ہوں گے، میرے دل میں جم گیا، معتزلہ و خوارج گنہگار مومنوں کے لئے شفاعت کا انکار کرتے ہیں، ان کے دلائل میں ایک دلیل قرآنی آیت ”فما تنفعهم شفاعۃ الشافعين الخ“ بھی ہے، علامہ سندھی نے اس

کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں عموماً کافر اور مومن کا ذکر آیا ہے، فاسق مسلمانوں کے حالات کا ذکر بہت کم ہے اسی لئے عام طور پر اہل بار کے لئے غلو کا ذکر آتا ہے، فاسق مسلمانوں کا ذکر عام طور پر حدیثوں میں آتا ہے، لہذا قرآنی آیات میں تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے، شفاعت محمدی کے اثبات میں متواتر حدیثیں آئی ہیں، اور اسی شفاعت پر دال ہے، ”عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً الخ“ علامہ طبرانی نے فرمایا ہے کہ اکثر مفسرین مقام محمود سے شفاعت کبریٰ مراد لیتے ہیں۔

قوله فخر جنا فی اصابة ذوی عدد الخ: یعنی ہمارے ساتھ بہت بڑی جماعت حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ پہونچی، اور قصد یہ تھا کہ حج کے بعد لوگوں کے روپر و خوار حج کے مذہب کا پرچار کریں، اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیں۔ قوله فهل سمعت بمقام محمد الخ: مقصد یہ ہے کہ مقام محمد سے وہ شفاعت مراد ہے، جس کے نتیجے میں جہنمی جہنم سے نکلیں گے، لہذا قرآن سے بھی یہ ثابت ہوا کہ جہنم جانے کے بعد بھی وہ اس سے نکالے جائیں گے۔

قوله فانه مقام محمد صلى الله عليه وسلم المحمود الذي الخ: مقام محمود کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے، اور ان کے سارے اقوال کو حافظ نے، فتح الباری میں ذکر کیا ہے، اور پھر انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان تمام اقوال کا قدر مشترک مقصد شفاعت عامہ ہے، کیونکہ آپ کے ہاتھوں حمد کا جھنڈا عنایت ہونا، اپنے رب کی تعریف کرنا۔ ان کے سامنے گفتگو کرنا، اور اللہ کی کرسی پر بیٹھنا، اور جبرئیل سے بھی قریب تر ہو جانا، یہ ساری چیزیں اس مقام محمود کے صفات ہیں، جس میں لوگوں کے لئے آپ شفاعت کریں گے۔

امام نووی قاضی عیاض کی پیروی کرتے ہوئے شفاعت کی پانچ قسمیں لکھتے ہیں، جس کا ذکر شروع باب میں ہو چکا ہے۔ قاضی عیاض نے ایک چھٹی شفاعت کا بھی ذکر کیا ہے، جس کا تعلق ابوطالب کے تخفیف عذاب سے متعلق ہے، حافظ ابن حجر ایک اور شفاعت کا اضافہ کرتے ہیں، وہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کی نیکی اور بدی برابر ہوگی، وہ بھی شفاعت کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے، بدلیل اس کی طبرانی کی روایت ہے، جو عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا کہ جو سابقین میں ہوں گے، وہ بلا حساب جنت میں جائیں گے، اور درمیانی قسم کے لوگ اللہ کی رحمت سے جائیں گے، اور جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اور جو اعراف والے ہوں گے، وہ آنحضور ﷺ کی شفاعت سے داخل ہوں گے، اعراف والوں کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی۔

قوله كانهم عيدان السماسم الخ: دو سین کے ساتھ پہلا مفتوح اور دوسرا مکسور، سمس کی جمع ہے۔ یہ وہی معروف سمس ہے جس سے باریک اور کالے دانے نکلتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ سمس کی لکڑیاں جب کاٹی جاتی ہیں، اور اس کو دھوپ میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اس کے باریک اور کالے دانے حاصل کریں، تو بچے ہوئے دانے کی طرح ہو جاتے ہیں، گویا جہنمیوں کو اس دانے سے تشبیہ دی گئی، کہ ان کی صورتیں جل کر سیاہ ہو جائیں گی۔

قوله ويحكم اترون الشيخ يكذب على الله الخ: شیخ سے مراد جابر بن عبد اللہ ہیں، استفہام انکاری ہے۔ یعنی ان کے بارے میں کذب کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

قوله فرجعنا فلا والله ما خرج منا الخ: معنی اس کے یہ ہیں کہ ہم لوگ حج سے واپس آئے اور پھر ہم لوگ

خارج کی رائے سے تابع ہو گئے، ہماری جماعت کا صرف ایک شخص اسی نظریہ پر ہائی رہ گیا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

حدثنا ابو کامل عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يجمع الله الناس يوم القيامة فيهنئون لذلك فيقولون لو استشفعنا على ربنا حتى يريحنا من مكاننا هذا قال فيأتون آدم عليه الصلوة والسلام فيقولون أنت آدم أبو الخلق خلقك الله بيده ونفع فيك من روجه وأمر الملائكة فسجدوا لك إشفع لنا عند ربك حتى يريحنا من مكاننا هذا فيقول لست ههناكم فيذكر خطيئته التي أصاب فيستحيي ربه عز وجل منها ولكن اتنوا نوحاً أول رسول بعث الله قال فيأتون نوحاً عليه الصلوة والسلام فيقول لست ههناكم فيذكر خطيئته التي أصاب فيستحيي ربه ولكن اتنوا إبراهيم عليه السلام الذي اتخذه الله خليلاً فيأتون إبراهيم عليه السلام فيقول لست ههناكم فيذكر خطيئته التي أصاب فيستحيي ربه تعالى منها ولكن اتنوا موسى الذي كلمه الله واعطاه التوراة قال فيأتون موسى عليه السلام فيقول لست ههناكم فيذكر خطيئته التي أصاب فيستحيي ربه ولكن اتنوا عيسى عليه الصلوة والسلام روع الله وكلمته فيأتون عيسى عليه الصلوة والسلام فيقول لست ههناكم ولكن اتنوا محمداً صلى الله عليه وآله وسلم عبداً قد غفر له ما تقدم من ذنبه وما تأخر قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فيأتونني فاستأذنون علي ربي فيؤذن لي فإذا أنار أئنته وقفت ساجداً فيدعيني ما شاء الله فيقول يا محمد ارفع رأسك قل تسمع سل تطع لعلك أشفع تشفع فأرفع رأسي فأخمد ربي يتخيمد يعطيني ربي عز وجل ثم أشفع فيخلى خذاً فأخرجهم من النار وأدخلهم الجنة ثم أعوذ فلقم ساجداً فيدعيني ما شاء الله أن يدعيني ثم يقال لي ارفع يا محمد قل تسمع سل تطع لعلك أشفع تشفع فأرفع رأسي فأخمد ربي يتخيمد يعطيني ربي ثم أشفع فيخلى لي خذاً فأخرجهم من النار وأدخلهم الجنة قل فلا أدري في الثالثة أو في الرابعة قال فاقول يا رب ما يبقى في النار إلا من حبسه القرآن أي من وجب عليه الخلود قال ابن عبيد في روايته قال فتأذنه أي وجب عليه الخلود. (مسلم ص ۱۰۸، ۱۰۹)

ترجمہ | انس بن مالک سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو اکٹھا کرے گا، پھر وہ کوشش کریں گے، اس مصیبت کو دور کرنے کی، یا ان کے دل میں خدا اس کا فکر ڈالے گا، وہ کہیں گے، اگر ہم کسی کی سفارش کروائیں، اپنے مالک کے پاس یہاں سے آرام پانے کو، تو بہتر ہے اور آئیں گے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس، اور کہیں گے، تم سب آدمیوں کے باپ ہو، اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے ہاتھ سے بنایا، اور اپنی پیدا کی ہوئی روح، تم میں پھونکی، اور فرشتوں کو حکم کیا، تم تو آج ہم لوگوں کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ کے پاس، وہ آرام دے ہم کو اس جگہ کی تکلیف سے، وہ کہیں گے میں اس لائق نہیں، اور اپنے گناہ کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے شرمائیں گے، لیکن تم جہنم، نوح علیہ السلام کے

پاس، وہ پہلے پیغمبر ہیں، جن کو بھیجا اللہ تعالیٰ نے وہ آئیں گے لوح علیہ السلام کے پاس، تو نوح کہیں گے، میں اس لائق نہیں، اور اپنی خطا کو جو دنیا میں ان سے ہوئی تھی یاد کریں گے اور شرمائیں گے اپنے پروردگار سے اور کہیں گے تم جہو ابراہیم علیہ السلام کے پاس، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست بنایا تھا، وہ سب لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے، وہ کہیں گے میں اس لائق نہیں، اور اپنی خطا کو جو ان سے ہوئی تھی، یاد کر کے خدا سے شرمائیں گے، لیکن تم جہو موسیٰ علیہ السلام کے پاس جن سے اللہ تعالیٰ نے بات کی، اور ان کو تورات شریف عنایت کی، وہ سب موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے، وہ کہیں گے میں اس لائق نہیں، اور اپنی خطا کو جو ان سے ہوئی تھی یاد کر کے خدا سے شرمائیں گے، لیکن تم جہو عیسیٰ علیہ السلام کے پاس، جو اللہ کی روح ہیں اور اس کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، وہ آئیں گے عیسیٰ روح اللہ کے پاس، وہ کہیں گے میں اس لائق نہیں، لیکن تم جہو محمد ﷺ کے پاس، وہ ایسے بندے ہیں اللہ کے جن کے لگے اور جچھے سب گناہ معذہ بنے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، پھر وہ سب لوگ میرے پاس آئیں گے، میں اپنے پروردگار سے اجازت چاہوں گا (باریاب ہونے کی) مجھ کو اجازت ملے گی، جب میں اس کو دیکھوں گا، تو سجدہ میں گر پڑوں گا۔ پھر وہ مجھے رہنے دے گا سجدے میں جب تک خدا چاہے گا، اور اس کے بعد کہا جائے گا، اے محمد اٹھا اپنے سر کو اور کہہ جو کہتا ہے، سنا جائے گا، اور مانگ جو مانگتا ہے دیا جائیگا، اور شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی، پھر میں سر اٹھاؤں گا، اور اپنے پروردگار کی تعریف کروں گا، اس طرح جیسے وہ مجھ کو سکھائے گا، پھر سفارش کروں گا، تو ایک حد میرے لئے مقرر کی جائے گی، میں اس حد کے موافق لوگوں کو دوزخ سے نکالوں گا، اور جنت میں لے جاؤں گا، اور دوبارہ اپنے پروردگار کے پاس آکر سجدہ میں کروں گا، وہ مجھے رہنے دے گا، سجدے میں جب تک اس کو منظور ہوگا، پھر حکم ہوگا، اے محمد اپنے سر کو اٹھاؤ اور کہو سنا جائے گا، مانگو دیا جائے گا، سفارش کرو قبول کی جائے گی، میں اپنے سر کو اٹھاؤں گا اور اپنے مالک کی تعریف کروں گا، جس طرح وہ مجھ کو سکھائے گا، پھر سفارش کروں گا، تو ایک حد باندھ دی جاوے گی، میں اس حد کے موافق لوگوں کو دوزخ سے نکالوں گا، اور جنت میں داخل کروں گا۔ ریلوی نے کہا مجھے یاد نہیں آپ نے تیسری بار میاچو تھی بار میں فرمایا، میں کہوں گا مالک میرے، اب تو کوئی دوزخ میں نہیں رہا، مگر وہ جو قرآن کے بموجب ہمیشہ دوزخ میں رہنے کے لائق ہے۔ قتادہ نے کہا یعنی جس کا ہمیشہ رہنا وہاں ضرور ہے۔

قوله فيذكر خطيئته التي اصاب الخ: یعنی اپنے اس خطا کو ذکر کریں گے، جس کا اثر کتاب ان سے ہو گیا تھا اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نبی سے گناہ خطا کا صدور ہوتا ہے، تب تو اس کا ذکر کریں گے، اسی طرح سورہ فتح کی آیت لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر، میں ذنب کی نسبت آپ ﷺ کی طرف کی گئی ہے جو عصمت انبیاء کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

### اہم سابقہ اور عصمت

یہود و نصاریٰ کے یہاں تو عصمت انبیاء مسلم ہی نہیں، بلکہ جس طرح وہ اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ سمجھتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے بارے میں بھی ان کا یہی خیال ہے فرق اتنا ہے کہ پیغمبروں کو معاف کر دیا جاتا ہے، اور عام انسانوں کے معافی کی ضمانت نہیں۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک سبھی انبیاء بالاتفاق معصوم ہیں اور اجماعی ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ قطعی ہے اس کی

تفصیل یہ ہے کہ اشاعرہ اور ماترید یہ تو اس پر متفق ہیں کہ کبیرہ گناہ تو صادر ہو ہی نہیں سکتے، البتہ قبل از نبوت صغیرہ کے بارے میں کچھ اختلاف ہے۔ محققین علماء اسناد ابواسحاق اسفرائینی، قاضی عیاض، علامہ تقی الدین سبکی، اور حضرات ماترید یہ اور ہمارے مشائخ اس پر متفق ہیں کہ پیغمبر قبل از نبوت بھی ہر قسم کے گناہ سے محفوظ و معصوم ہوتے ہیں۔

### عصمت کا مفہوم

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ عصمت، خدا کی طرف سے وہ عنایت ہے جو انبیاء کرام کو اس کی ادنیٰ سی معصیت کے ارتکاب سے بھی دور رکھتی ہے، مگر اس طور پر نہیں کہ یہ طاقت و قوت ہی ان کے اندر سے سلب کر لی جائے، کیونکہ جس کو مکلف بنایا گیا ہے ضروری ہے کہ اس میں صفت اختیار باقی رکھی جائے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اس انداز میں اس کی وضاحت فرمائی ہے ”انبیاء کی عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اقوال ہوں، یا افعال، عبادات ہوں، یا عادات، معاملات ہوں، یا اخلاق و احوال ان سب کو حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے، نفس و شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ فرماتا ہے، خواہ وہ خطا و نسیان کی صورت ہی سے کیوں نہ ہوں، اور حفاظت و نگرانی کرنے والے، اپنے فرشتے ان کے ساتھ رکھتا ہے تاکہ غبار بشریت بھی ان کے دامن پاک پر ذرا سادھ نہ لگا سکے۔“

### عصمت انبیاء پر ”حضرت نانوتوی“ کی تحقیق

حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں، احقر کے نزدیک انبیاء علیہم السلام صفات اور کبار ہر دو قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، اپنی نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ ”قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ“ دوسری جگہ ارشاد ہے ”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ“ ان دونوں آیتوں میں جب ہر معاملہ میں اتباع، اور ہر بارے میں آپ کی ہستی کو نمونہ فرمایا گیا تو اب اگر آپ ﷺ کے افعال و اقوال میں معصیت کا احتمال ہو، تو لازم ہو گا کہ معصیت میں بھی آپ کی اتباع ضروری ہو، حالانکہ قرآن میں ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“ اور اسی طرح ”وما أمروا الا ليعبدوا اللہ مخلصین له الدین“ وارد ہے ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد صرف عبادت ہے نہ کہ معصیت، اور اس کو صرف اسی کا حکم دیا گیا ہے، تو اب یہ کیسے ممکن ہو گا؟ کہ معصیت میں بھی اس کو اتباع کا حکم دیا جائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے اس کی ذات کے کچھ لوازم ہوتے ہیں، جس جگہ وہ ذات موجود ہوتی ہے وہاں اس کے یہ لوازم بھی ضرور ہوتے ہیں، جیسے آگ، اس کے لئے جلا نا لازم ہے، جہاں آگ ہو گی ضرور جلائے گی، اس قاعدہ کے مطابق ہمارے سامنے دو قسم کی مخلوق ہے۔ ملائکہ اور شیاطین، ان کی ذات کے لئے بھی کچھ لوازم ہیں، قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذات کے لئے کفر لازم ہے ”کان الشیطان لوبہ کفورا“ اور ملائکہ کے لئے فرمانبرداری لازم ہے، وہ فرمانبرداری جس میں نافرمانی کی مطلق گنجائش نہ ہو ”لا یعصون اللہ ما امرهم ویفعلون ما یأمرون“ چونکہ یہ بات بھی مسلم ہے کہ جو ذات کے لوازم ہوتے ہیں وہ اس ذات کے علاوہ دوسری جگہ نہیں پائے جاسکتے، اس لئے

ملائکہ خدا کے علاوہ فرمانبرداری، اور شیطان کے علاوہ کفر و سرکشی دوسری جگہ پائی نہیں جاسکتی۔ لیکن دونوں مخلوق کے سوا یہاں ایک تیسری مخلوق حضرت انسان ہے جس میں یہ دونوں باتیں جمع ہیں۔ ارشاد ہے ”خلطوا عملاً صالحاً و آخر سئیئاً“ لہذا حسب بیان سابق ضروری ہے کہ انسان میں ہر دو قسم کا مادہ موجود ہوتا، مادہ شیطانی بھی اور مادہ ملکی بھی، ورنہ برائی، اور بھلائی جو دراصل ان دو قوتوں کے ذات کے لوازم تھے، عام بن جائیں گے، اور ان اجزاء سے انسان کی ترکیب پر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسا کہ عناصر اربعہ سے اس کی ترکیب پر۔ ظاہر ہے کہ انسان کے لئے عناصر اربعہ کے اجزاء ترکیبی ہونے کا ثبوت بھی ہمارے پاس بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے، کہ جو ان کے لوازم ہیں۔ مثلاً رطوبت، یوست، برودت، حرارت، یہ سب انسان میں موجود نظر آتے ہیں، رطوبت کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ پانی جس کے لئے رطوبت لازم ہے، انسان میں موجود ہے، اسی طرح بقیہ اثرات کو بھی دیکھ کر تسلیم کرنا ضروری ہوگا کہ اس میں آگ، دھوا اور مٹی کے عناصر موجود ہیں، ورنہ ایسا کون شخص ہے جس نے انسانی تخلیق کے وقت ان اجزاء کا مشاہدہ کیا ہو، پس جس طرح ہم یہاں صرف لوازم کے وجود سے عناصر کے وجود پر استدلال کرتے ہیں اسی طرح عام انسانوں میں اعمال صالحہ، اور اعمالیہ سید کے اثرات کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا بھی لازم ہوگا کہ اس میں وہ دونوں قوتیں بھی ضروری ہیں۔ جس کے یہ دو لوازم ہیں۔ یعنی مادہ ملکی، اور مادہ شیطانی۔

اس تمہید کے بعد اب ضروری ہوگا کہ آپ ﷺ (درگرا نیاء) مادہ شیطانی سے میرا ہوں، ورنہ اگر آپ ﷺ کی ذات اقدس میں یہ مادہ موجود ہو، تو یہ لازم آئے گا کہ جو اس کے لوازم ہیں یعنی معصیت وہ بھی آپ ﷺ کی ذات میں موجود ہو، العیاذ باللہ۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے تو جب قرآن کریم ہر معاملہ میں آپ کی اتباع کا حکم دیتا ہے تو یہ بھی لازم ہوگا کہ اس معصیت میں بھی آپ ﷺ کی اتباع ضروری ہو، حالانکہ یہ باطل ہے، اس لئے یہ ماننا پڑے گا، مادہ شیطانی جو منشاء گناہ ہے موجود نہیں اور چونکہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ دونوں کا منشاء شیطانی ہے، لہذا جب یہ مادہ نہیں تو آپ ﷺ ہر قسم کے گناہ سے معصوم و محفوظ ہیں۔ اس بیان سے صرف حضور اکرم ﷺ کا معصوم ہونا ثابت ہوا، لیکن غور کریں کہ خود نبی پاک کو کہا گیا ”فبہد اہم اقتدہ“ یہاں آپ ﷺ کو ان حضرات کی پیروی کا مطلق حکم دیا گیا، کسی خاص قول و فعل کی تخصیص نہیں کی گئی، اور یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ جب صلہ حذف کرتے ہیں، تو وہاں مراد عموم ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ اکبر، یہاں یہ مذکور نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس سے بڑا ہے، لیکن اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر چیز سے بڑا ہے، اسی طرح جب یہاں مطلق پیروی کرنے کا حکم ہے، تو مراد یہ ہے کہ ہر بات میں پیروی کریں، لہذا آنحضور ﷺ کی طرح جملہ انبیاء کی بھی معصیت ثابت ہوتی ہے۔

### عصمت کے ارکان اربعہ

(۳) بعض علماء نے دوسرا طریقہ استدلال اختیار کیا ہے، انہوں نے لکھا ایک عصمت کے ظاہری اسباب چار ہیں۔  
(۱) عدالت و ثقاہت۔ (۲) خیر و شر کے انجام کا قطعی علم۔ (۳) ان علوم کی وحی الہی سے مزید تائید۔ (۴) نسیان اور ترک اولیٰ پر بھی مواخذہ کا خطرہ۔

چونکہ انبیاء کرام میں یہ چار صفیں کامل طور پر موجود ہیں اس لئے ان میں عصمت کی صفت بھی کامل طور پر موجود ہوتی ہے۔ تیسرا طریقہ استدلال یہ ہے کہ انبیاء کرام میں دائمی استحضار الہی کی ایک صفت ہی ایسی ہوتی ہے کہ تنہا یہ صفت ہی ان



کی عصمت کے لئے کافی ہے، اسی کے ساتھ عصمت کے جتنے موانع ہو سکتے ہیں وہ بھی ان میں موجود نہیں ہوتے، یعنی اندرونی اور بیرونی طاقتیں سب کی سب اپنے رب کی حکم برداری کے نشہ میں اس طرح ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں کہ اس کی تافرمانی کا ان کو کبھی تصور بھی نہیں آتا۔ ان حضرت کے دائمی حضوری میں کوئی درجہ کافرق نہیں آتا، بلکہ کبھی غفلت میں نظر بھی آتے ہیں، تو درحقیقت اتنا ہی ان کا قلب منحصر بھی ہوتا ہے اسی لئے تو نیند میں خواب کے ذریعہ انہوے علوم، بیداری کے علوم و وحی کا درجہ رکھتے ہیں، غرض اس قدر استحضار بھی علامت ہے کہ ان پاک طینت سے گناہوں کا صدور نہیں ہوا۔

(۴) جو غلط طریقہ استدلال، انبیاء کرام حکومت الہی کے نمائندے ہیں، ہر حکومت اپنا نمائندہ اور سفیر اسی کو بناتی ہے جو اس کا معتد ہو، لیکن حکومت انسانیہ کے انتخاب میں غلطی ہو سکتی ہے اور خدا کے انتخاب میں ایسا ممکن نہیں، کیونکہ وہ عالم الغیب و اشہادہ ہے، اس لئے خدا کا منتخب کردہ نمائندہ وہی ہو سکتا ہے جس پر حکومت الہیہ کو پورا اعتماد ہو، اور جو حکومت الہیہ کی پوری پوری نمائندگی کر سکیں اور ان کے ذریعہ خداوند قدوس کے مرضیات کا علم ہو سکے، اس لئے انبیاء کا معصوم ہونا لازم ہے۔

### ”عصمت پر“ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کا طریقہ استدلال

(۵) انسان میں شرکی دو طاقتیں ہیں۔ (۱) نفس، یہ اندرونی طاقت ہے۔ (۲) شیطانی، یہ بیرونی طاقت ہے۔ انبیاء کرام کو پیدا انہی طور پر وہ نفس عطا ہوتا ہے جو فطرۃ ہر معصیت سے نفور، اور نشہ عبادت سے چور ہوتا ہے بلکہ یہ انبیاء علیہم السلام خود تو کسی خلاف ورزی کا تصور بھی کیا کر سکتے ہیں؟ دوسروں کی خلاف ورزی بھی ان کے آئینہ فطرت کو مکدر کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اس لئے وہ احکام الہیہ کے خلاف دوسرے کا قدم اٹھاتا ہوا دیکھ کر برداشت نہیں کرتے۔ قرآن نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، کہ کتنی مشقت کے بعد حضرت موسیٰ ان تک پہنچے، اور حضرت خضر نے ساتھ چلنے کے لئے کتنی شرطیں لگائیں، لیکن جب سفر شروع ہوا اور حضرت موسیٰ کی نگاہ میں حضرت خضر کے بعض اعمال بظاہر خلاف شریعت نظر آئے تو فوراً ان کی معیت چھوڑ دی، قرآن نے اس قصہ کو اسی لئے ذکر کیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ انبیاء کی معصومۃ فطرت، کس درجہ بلند ہوتی ہے، کہ وہ اپنے دور حیات میں، کسی بھی خفیہ، اور غیر اولیٰ حرکت کی طرف میلان نہیں رکھتے، زمانہ مصر، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو سامنے رکھتے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی آزمائش کا میدان جتنا خطرناک ہوتا چلا گیا، ان کی عفت نفس کا جو ہر اتنا ہی اور زیادہ کھلتا چلا گیا، کہ جب برائی از خود ان کے اتنا قریب آچکی تھی، کہ اگر اس کو کوئی طاقت دھکا نہ دیتی، تو یقیناً وہ خود آکر ان کو لپیٹ لیتی، جب اتنی نزاکت کا معاملہ آگیا، تو قدرت نے اس کی مدافعت کی اور کہا ”وَكَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ“ کہ ہم نے ان سے سوء اور برائی کو پھیر دیا، یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ آپ کو باز رکھا، بلکہ یہ کہا کہ برائی کو آپ سے باز رکھا، کیونکہ یہ سوء از خود ان کی طرف آرہا تھا، دیکھئے کس قدر احتیاط کے ساتھ، اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے جو ان کی شان عصمت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتا ہے۔

اس طرح ایک موقع پر آپ ﷺ کے سامنے منافقین نے ایک مسلمان پر جھوٹی تہمت لگائی، اور اس کے لئے اس قسم کے قرآن شہادتیں مہیا کر دیں کہ ایک خالی الذہن انسان کے لئے ان کے موافق فیصلہ دیئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا، اس لئے اگر یہاں آپ مسلمان کے خلاف فیصلہ فرما دیتے، تو بالکل قرین قیاس ہوتا، مگر خود آپ کی عصمت نے آپ کو

ایسے فیصلہ سے بچالیا، قرآن نے اس واقعہ کی نزاکت کو کس طرح بیان کیا ہے ”ولو لا ان ثبتتک لقد کذت ترکن الیہم شیئاً قليلاً“ اگر ہم آپ کو سمجھالے نہ رکھتے تو آپ ان کی طرف تھوڑا سا جھک جاتے، اس آیت میں جس بات کا خطرہ ظاہر کیا گیا ہے وہ آپ کا کوئی اقدام نہ تھا بلکہ صرف میلان طبع تھا، پھر اس پر لفظ کذت اضافہ فرما کر یہ بتایا گیا، کہ آپ کا یہ میلان بھی ہوا تو نہ تھا، مگر حالات اس کے قریب آگئے تھے، کہ اگر ہم نہ سنبھال لیتے تو ایسا ہو جاتا، پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ شیئاً کے ساتھ قلیلاً کی صفت بڑھا کر یہ اور حسیہ کی گئی کہ اگر آپ کا رجحان ہوتا تو وہ بہت خفیف ہوتا، غرض اندازہ لگائیے کہ قرآن کس مختاط انداز سے واقعات کو پیش کرتا ہے، یہ اسی لئے تاکہ امت کو یہ معلوم رہے کہ انبیاء کی ذات اقدس من جانت اللہ معصوم ہے، اور قدرت خود اس کے اسباب فراہم کرتی ہے۔

(ب) :- انبیاء کرام خود چلتے نہیں کہ بشری صفت ان کے لئے ٹھوکر کا باعث بنے، یہاں قدرت ان کو بچا بچا کر خود لے چلتی ہے، حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں ”ازد فتن تا بردن فرق ظاہر است“ گویا ہمہ وقت خدائی نگرانی میں ہوتے ہیں ”واصبر لحکم ربک فانک باعینا (الطور)“ آپ اپنے رب کے حکم میں انتظار کیجئے، آپ تو ہماری نگرانی اور ہماری نگرانی کے سامنے ہیں، اس آیت کے ساتھ، ایک دوسری حدیث کو بھی سامنے رکھئے، کہ جب بندہ عبادت نافذ کرتے کرتے آخر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں رضائلی میں وہ اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ پھر نہ اس کی خود کوئی ہستی رہ جاتی ہے اور نہ اس کے اعمال کی، بلکہ وہ سب براہ راست حضرت حق سبحانہ کی طرف منسوب ہونے لگتے ہیں، وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے تو صرف وہی، جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہے، اور ہاتھ بڑھاتا ہے اور قدم اٹھاتا ہے تو صرف اسی طرف جدھر حق تعالیٰ کی مرضی ہوتی ہے۔ اب سوچئے کہ اس کی اس طرح گم شدگی کے بعد اس کے اعضاء و جوارح میں کیا کسی معصیت کے لئے حرکت کرنے کی مجال باقی رہ سکتی ہے؟ اور جب اس کے اعضاء و جوارح اٹھیں گے اس طرح منقاد و مطیع بن جائیں، تو اس کے اعمال میں کیا کسی لوثی سی معصیت، وہ بھی براہ معصیت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے؟ ان کی عصمت کا اندازہ کرنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ جو ان کے نقش قدم پر چل پڑے اس کے اعضاء بھی خدا کی معصیت کے لئے مثل ہو گئے۔

قوله إئتوا محمداً قد غفر الله ما تقدم من ذنبه وما تأخر الخ: قرآن کریم میں اسی بات کا اعلان اس انداز میں کیا گیا ہے ”لیغفر الله ما تقدم من ذنبک وما تأخر“۔ (سورہ فتح)

اس میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک تو تقدم و تاخر سے کون سا ذنب مراد ہے؟ اور دوسرے ذنب سے کیا مراد ہے؟ علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں اور دیگر شارحین نے تقدم و تاخر کی مراد اس طرح بیان کی ہے کہ:

- (۱) ما تقدم سے قبل انبوت، اور ما تاخر سے بعد انبوت کا زمانہ مراد ہے۔
- (۲) ما تقدم سے قبل از نبوت کا زمانہ مراد ہے اور ما تاخر سے بعد از ہجرت۔
- (۳) اول سے قبل از فتح مکہ، اور ثانی سے بعد از فتح مکہ کا زمانہ۔
- (۴) اول سے قبل از نبوت کا زمانہ، اور ما تاخر سے عصمت مراد ہے۔
- (۵) ما تقدم سے حضرت آدم کی زلت، اور ما تاخر سے آپ کی امت کے ذنوب مراد ہیں۔

(ب) حدیث اور آیت قرآنی میں ذنب کی نسبت آپ کی طرف کی گئی، کہ آپ کے ذنب معاف ہیں، تو کیا العیاذ باللہ گناہ کا صدور ممکن ہے؟ کہ معافی کا اعلان کیا گیا، جب معصوم ہیں تو پھر اس اعلان کی کیا ضرورت؟ (عمر القادی ج ۱ ص ۱۶۷)

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ہمیشہ حضور اکرم ﷺ کی ترقی درجہ ہو آرتی تھی، اور اوپر کے درجہ کے لحاظ سے پہلا درجہ کم ہے، آپ ﷺ کو اور اسی طرح اپنے اپنے درجہ کے مطابق ہر سالک کو اوپر کے درجہ پر پہنچ کر جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب تک ہمارے اندر کوتاہی تھی تو اس کا غم ہوتا ہے اور اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اسی کی مغفرت کا اعلان فرمادیا۔

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ دائمی طور پر ذکر الہی میں مشغول رہتے اور ہمیشہ آپ کی توجہ، اللہ کی طرف ہوتی تھی مگر قضاے حاجت کے وقت مثلاً آپ کا ذکر لسانی موقوف ہو جاتا، اور کبھی کبھی تعلیم امت کے واسطے جب ازواج مطہرات کے ساتھ مشغول ہوتے، تب بھی ذکر لسانی موقوف ہو جاتا تھا، اگرچہ یہ چیزیں گناہ نہیں، لیکن آپ اپنی عالی ظرفی کی وجہ سے اس تھوڑی سی ظاہری توجہ الی اللہ کے ہٹنے کو بھی معیوب سمجھتے تھے، اور آپ کو اس پر غم ہوتا تھا، تو خدا نے اس کو بھی معاف فرمادیا۔ (کوکب دری)

(۳) علامہ آلوسی نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ یہ ”حسنات الابرار سیئات المقربین“ کی قبیل سے ہے لکھتے ہیں، ”والمراد بالذنب ما فرط من خلاف الاولیٰ بالنسبة الی مقامہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فهو قبیل حسنات الابرار سیئات المقربین“

(۴) لیکن سب سے بہتر توجیہ وہ معلوم ہوتی ہے جس کو حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فرمائی ہے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کی تحقیق ”بندہ جو نامناسب کام کرتا ہے اس کے لئے دراصل چار لفظ استعمال کئے جاتے ہیں، جن کے درجات کے مختلف ہیں، ذنب، خطیہ، سیدہ، معصیہ، معصیت کے معنی نافرمانی، سیدہ کے معنی برائی، خطا کے معنی خلاف اولیٰ، نادرست، اور ذنب کے معنی عیوب کے آتے ہیں، اس لحاظ سے آیت قرآنی کا مفہوم یہ نکلا، کہ جو چیز آپ کے شان ارفع کے لحاظ سے معیوب ہیں، اس کو بھی ہم نے بخش دیا، اس معنی کے لحاظ سے اس آیت کو عصمت انبیاء کے مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

تنبیہ:- ”حضرت اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر پر رضا خانی علیہ اعتراض کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہمارے علماء نے متعدد کتابوں میں مدلل جواب دیا ہے، یہاں جواب کا ایک پہلو ذکر کیا جاتا ہے، (۱) یہ ترجمہ حضرت تھانویؒ کا نہیں بلکہ اس سے پہلے حضرت شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلویؒ نے کیا ہے، کیا وہ بھی گستاخی رسول تھے، ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو، تاکہ بخشے واسطے حیرے خدا جو کچھ ہوا تھا پہلے گناہوں تیرے سے اور جو کچھ ہوا پیچھے (شاہ رفیع الدین صاحب مرحوم) اسی طرح واستغفر لذنبک وللمؤمنین کا ترجمہ کرتے ہیں، اور معافی مانگ اپنے گناہ کو اور ایماندار مردوں اور عورتوں کو۔

غرض قرآن وحدیث میں ذنب کا عربی معنی گناہ کے لئے جائیں، تو اس سے کفر یا گستاخی رسول کیونکر لازم آیا؟ حضرت شاہ رفیع الدینؒ جن کو سبھی مانتے ہیں انہوں نے یہی ترجمہ کیا ہے، تو ان پر گستاخی رسول کا فتویٰ کیوں چسپاں نہیں کرتے، بغض وعناد میں انسان اتنا غافل ہو جاتا ہے کہ اپنے کی بھی فکر نہیں رہتی، کہ خود ہمارا فتویٰ ہماری گردن اتار رہا ہے، دیکھئے،

مولانا احمد رضا خان صاحب کے والد صاحب نے سرور القلوب نامی کتاب لکھی جس پر مولانا احمد رضا خان صاحب کی تقریظ بھی ہے، اس میں انہوں نے ایک حدیث کا ترجمہ کیا ہے۔

مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ آپ نے اس قدر عبادت کی کہ پائے مبارک سوج گئے، لوگوں نے کہا کہ آپ اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں، کہ خدا نے آپ کی اگلی پچھلی خطا معاف کی سرور القلوب ص ۱۵۴ اسی طرح اس کے ص ۶۸ پر ہے ”حضرت ابراہیم نے کہا جس وقت اپنی خطا پر نظر کرتا ہوں، سب دوستی بھول جاتا ہوں، ان دونوں ترجمہ پر غور کریں کہ ذنب کا ترجمہ خطا سے کیا، یہ ترجمہ کرنا کیا حضور ﷺ کو اور حضرت ابراہیم کو خطا کار نہیں کہنا ہوا، العیاذ باللہ۔

خلاصہ یہ کہ اگر اشرف علی تھانوی کا ترجمہ گستاخانہ ہے تو کیا مولانا بریلوی کے والد گستاخ رسول نہیں ٹھہرے، اور خود مولانا بریلوی اس پر تقریظ لکھ کر گستاخ کے زمرہ میں شامل نہیں ہوئے، اس سلسلہ میں ”رضا خانی ترجمہ و تفسیر پر ایک نظر“ نامی کتاب قابل دید ہے۔ (مرتب)

قوله ولكن اتنوا نوحا اول رسول بعثه الله تعالى: مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ اور یس نوح علیہ السلام کے دادا تھے، اگر معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہو جائے، کہ حضرت اور یس رسول تھے، تو پھر مؤرخین کا ان کو رسول کہنا غلط ہو جائے گا، کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام ہیں، اور اگر ان کا رسول ہونا ثابت نہیں ہے تو پھر ان کو جد نوح کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔

کچھ لوگ حضرت اور یس، الیاس علیہ السلام کو کہتے ہیں، اور ان کا شمار انبیاء بنی اسرائیل میں ہوتا ہے، تو پھر مذکورہ بالا اعتراض ہی نہیں ہوتا۔

وقوله اتنوا ابراهيم الذي اتخذه الله خلیلا الخ: خلیہ کے معنی اختصاص اور صفائی ستھرائی کے ہیں، بعض کی تحقیق یہ ہے کہ ماخوذ من الخلیۃ ہے، جس کے معنی حاجت کے ہیں، سبھوں سے کٹ کر صرف ایک ذات کے سامنے اپنی حاجت پیش کرنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام میں یہی ممتاز وصف تھا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسی جی اور خالص محبت کو کہتے ہیں، کہ اس کے سوا کسی اور سے راز و نیاز کی بات نہ کرے، یا اللطف و محبت کے معنی ہے۔ ابن انباری کی تحقیق یہ ہے کہ کامل دوست، کامل المحبوب، جن کی محبت میں کسی قسم کی کمی کو تابی نہ ہو۔

قوله ان كل واحد من الانبياء صلوات الله الخ: حضرات انبیاء کا بالاتفاق شفاعت سے معذوری ظاہر کرنا تواضع اور مقام شفاعت کی بلندی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے، اظہار معذرت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کام کسی خاص ہستی کے لئے مخصوص ہو چکا ہے، اس خاص ہستی کا یا تو انبیاء کو علم نہ ہو، جب معاملہ سرور انبیاء پر منتہی ہو گا، تب ان لوگوں پر واضح ہو گا، کہ وہ ذات محمد ﷺ کی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے پہلے ہی اسے اس بات کا علم ہے کہ اس کام کے لئے محمد ﷺ متعین ہیں۔ اہل محشر کے دل میں یہ بات شروع ہی میں نہیں ڈالی گئی کہ محمد ﷺ شفاعت کی درخواست کریں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگر شروع ہی میں آپ ﷺ سے درخواست کی جاتی، اور آپ ﷺ اس کو انجام دیدیتے تو آپ کا فضل و کمال دیگر انبیاء پر اتنا واضح نہیں ہوتا۔ کیونکہ اہل محشر یہ سمجھ سکتے تھے، کہ یہ کام آپ ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا بھی انجام دے سکتا تھا۔

لیکن جب آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک نے بالاتفاق معذرت ظاہر کر دی، تو یہ بات واضح ہو گئی کہ اسکو آپ کے سوا کوئی اور انجام دے ہی نہیں سکتا ہے، اس سے اہل محشر پر آپ ﷺ کی برتری ظاہر ہو گئی، اسی کا نام شفاعت کبریٰ ہے۔  
 قوله موسى صلى الله عليه وسلم الخ: اهل سنت والجماعہ میں متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے ہر چیز پر بات چیت کی ہے، یہ کلام بلا واسطہ بالمشافہہ ہوا ہے اسی لئے تمکیم کے ذریعہ مؤکد کر دیا گیا ہے۔

قوله فياتوني الخ: نون مشدود اور مخفف دونوں طرح جائز ہے جیسا کہ قرآن پاک میں "اتحاجونني في الله وقد هذان" میں حضرت انسؓ کی ایک مرفوع روایت میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا میں اپنی امت کے پلصراط پر سے گزرنے کا انتظار کر رہا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میرے پاس آکر کہیں گے یا محمد حضرات انبیاء کی پوری جماعت آپ کے پاس آئی ہوئی ہے اور سب لوگ آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اللہ سے دعا فرمادیں کہ ساری امتوں کا یہ ازدحام یہاں سے ختم ہو تاکہ یہاں کی پریشانی سے ان کو نجات ملے۔

قوله فاذا انا رايته وقعت ساجداً الخ: ابن حبان میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی معرفت کرائیں گے تو میں سجدہ میں گر جاؤں گا پھر اس کی ایسی شہ کر دوں گا کہ وہ مجھ سے خوش ہو جائے گا۔  
 قوله ارفع راسك الخ: ایک حدیث میں ہے کہ آپ اپنا سر اٹھائیں گے تو اللہ کا دیدار ہو گا اور فوراً سجدہ میں گر پڑیں گے اور یہ سجدہ ایک ہفتہ کی مقدار میں لمبا ہو گا۔

قوله فاخرجهم من النار الخ: بیان شفاعت کرنے کا چل رہا تھا اور تذکرہ آگیا جہنم سے نکلنے کا اسی لئے بعض لوگوں نے اس کو دوہم راوی پر محمول کیا ہے کیونکہ جہنم سے نکلنے کا معاملہ میدان محشر سے نکلنے کے بعد جب لوگ پلصراط سے گذریں گے اور جہنمی جہنم میں گر پڑیں گے اس کے بعد ہی نکلنے کا نمبر آئیگا۔ ایک اہم اشکال ہے جو اس روایت پر کیا جاتا ہے اس کا جواب قاضی عیاضؒ اور نوویؒ نے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض راویوں سے کچھ درمیانی باتیں ذہول ہو گئی ہیں جس کا مفصل تذکرہ دوسرے راویوں نے کیا ہے ابو ہریرہؓ کی حدیث میں اس کا مفصل بیان اس طرح سے ہے کہ محشر سے چھٹکارے کے بعد ہر جماعت اپنے معبودوں کے ساتھ ہو جائے گی امانت کو بھیجا جائیگا اور وہ پلصراط کے دونوں کنارہ پر کھڑی ہوگی پہلی جماعت پلصراط کو پہلی کی طرح پار کر جائے گی اور کچھ لوگ گرتے پھڑتے عبور کر جائیں گے اور کچھ لوگ کٹ کر جہنم میں گر جائیں گے اسکے بعد انبیاء علیہم السلام کو گنہگاروں کے حق میں شفاعت کی اجازت دی جائیگی۔ درمیان کے اتنے حصے کو ملانے کے بعد بات مکمل ہو جاتی ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے دوسری طرح جواب دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ابو زرہؓ کی حدیث جو بواسطہ ابو ہریرہؓ مروی ہے اسکے آخری حصہ میں آنحضور ﷺ کے قول "فاقول يا رب امتي امتي" کے بعد ہے "فيقال ادخل من امتك من الباب الايمن من ابواب الجنة من لا حساب عليه ولا عذاب" اس سے معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ جلد حساب کی درخواست کریں گے اس پر جب آپ کو ایسے لوگوں کے جنت میں داخلہ کی اجازت دی جائیگی جو بلا حساب داخل ہونے کے مستحق ہوں گے تو اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ جن لوگوں سے حساب لیا جائیگا ان کے داخلہ میں تاخیر ہوگی کیونکہ ان کا داخلہ جنت میں حساب کے بعد ہی ہو گا۔ علامہ طبریؒ کا خیال ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ "فاخرجهم من النار"

میں ہمارے مراد میدان محشر کی تختی ہو جو آفتاب کے قریب آنے کی وجہ سے اہل محشر سخت پریشانی میں ہوں گے، اور خروج من النار سے مراد انہیں تختیوں سے چھٹکارا ہو لیکن منافق بن حجرؒ نے اس کو احتمالی بعید کہہ کر رد کیا ہے۔

قوله فلا ادرى فى الثالثة او فى الرابعة قال الخ: مستد احمد میں "ثم ادعو الرابعة" کی تصریح ہے اس سے معلوم ہوا کہ "یارب ما بقى الامن حبسه القرآن" چوتھی مرتبہ میں فرمایا ہے۔ اس کے بعد روایت میں حق تعالیٰ کا یہ کلام مذکور ہے کہ باقی لوگوں کو نکالنے کا حق اب آپ کو نہیں ہے۔ حق تعالیٰ جہنم سے کلمہ گو کو نکالیں گے جنہوں نے کبھی بھی عمل خیر نہیں کیا ہو گا، اس حکوم کو ملحوظ رکھنے کے بعد لا محالہ یہ کہنا ہو گا کہ من حبسه القرآن سے کفار اور بعض کثیر مومن دونوں مراد ہیں جب ہی تو اللہ تعالیٰ آپؐ کو لوگوں کو نکالیں گے اس لئے عصاة کے حق میں تخلید کے معنی بقاء فی النار کے ہیں یعنی دیگر عصاة کے نکلنے کے بعد ان لوگوں کا جہنم میں باقی رہنا۔

قوله ما يزن بوزة الخ: یہ مضموم راہ مفتوح مشدد کیہوں اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ہوں کا وزن جو سے تم ہو گا کیونکہ جو کو مقدم کیا گیا ہے اور اس کے بعد یہ ہوں کا تذکرہ ہے پھر ذرا۔

قوله ما يزن ذرة الخ: ذال مفتوح راہ مفتوح مشدد ذرہ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد سب سے معمول وزن کی چیز اور بعض لوگ و ذرات مراد لیتے ہیں جو آفتاب کی شعاع میں سوئی کے سرے کے برابر نظر آجاتی ہے بعض لوگ چھوٹی چیز یعنی مراد لیتے ہیں۔ عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ بتقلیٰ کو زمین پر رکھو اور پھر جھار دیئے پر جو ذرات زمین پر گریں وہ ذرہ کہلاتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ چار ذرات ایک رائی کے وزن کے برابر ہوتے ہیں۔

قوله جعل مكان الذرة ذرة الخ: یعنی بعضوں نے ذال مضموم اور راہ مخفف پڑھا ہے جس کے معنی چنا کے ہیں انہوں نے شیر اور برہ کی رعایت کرتے ہوئے ذرہ بمعنی چنا اس لئے پڑھا کہ یہ سب غلہ کی قبیل سے ہیں۔

قوله صحف فيها ابوبسطام الخ: مراد شعبہ ہیں۔

قوله يارب امتي امتي الخ: اس جملہ پر بھی بعض کو اشکال ہے جب شفاعت کبریٰ کے لئے تمام خلایق آپؐ کے پاس فرما لے کر آئے گی تو پھر اس میں صرف آپؐ کی ہی امت نہیں ہوگی لہذا امتی امتی کہنے کے کیا معنی؟ اسی لئے بعض خیال ہے کہ یہ ٹکڑا غیر محفوظ ہے۔ دوسرے حضرات اس کو محفوظ مان کر تاویل کرتے ہیں۔ (۱) ممکن ہے کہ اس سے آپؐ کی وہ امت مراد ہو جنہوں نے آپؐ سے شفاعت کی درخواست کی ہو۔ (۲) یا جو لوگ آپؐ کے جھنڈے تلے ہوں گے، گرچہ دوسری امتی بھی اس میں شامل ہوں گی، مگر ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے اس کو امتی کہہ یا گیا۔ (۳) اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سارے انبیاء کی نبوت آپؐ کی نبوت سے مستفاد ہے، جیسے نور قمر، نور شمس سے مستفاد ہے اس لحاظ سے تمام انبیاء کی امت حقیقہ آپؐ کی امت ہیں اور آپؐ کی اس سیادت کا اظہار بروز قیامت ہو گا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد کے سارے انبیاء آپؐ کے جھنڈے تلے ہوں گے اور حضرت ابراہیم وغیرہ سب لوگ آپؐ کو ترغیب دلائیں گے۔ قاضی عیاضؒ کی تحقیق یہ ہے کہ فی ذل سے اشارہ ہے شفاعت کبریٰ کی طرف اور "فاقوم بین یدیہ فاحمدہ بمعامد" سے دوسری شفاعت کی طرف اشارہ ہے، جو آپؐ کی امت کے ساتھ مخصوص ہے اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ سیاق کلام میں اختصا ص ہے۔

قوله فلما كنا بظهر الجبان الخ: جیم مفتوح اور باہ مشد رائل لغت نے لکھا ہے کہ جبان اور جبانہ دونوں صحرا ہیں مقبروں کو جبان اور جبانہ کہتے ہیں یہ تسمیہ انکی باسم مواضع کے قبیل سے ہے۔ ظہر جبان سے بلند اور ظاہری حصہ مراد ہے۔  
قوله هیه الخ: بکسر الیاء و اسکان الیاء امت الحدیث کے معنی میں ہے کسی سے مزید بات کہنے کی درخواست کے لئے ہیه کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قوله وهو يومئذ جميع الخ: یعنی قوی مضبوط تھے اور حفظ و یادداشت عمدہ تھی، اشارہ ہے کہ کبر سنی کی اس حد میں نہیں پہنچے تھے جہاں حفظ و یادداشت میں خلل آ جاتا ہے۔

قوله يا رب ائذن في فيمن قال لا اله الا الله الخ: اس کے مصداق دو لوگ ہوں گے جن کے دل میں یقین کی زیادتی اور طمأنیہ نفس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا یا مراد یہ ہے کہ کبھی انہوں نے عمل نہیں کیا ہو گا، ابو سعید خدریؓ کی روایت "لم يعملوا خیراً قط" سے اس دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے۔

قوله ليس ذلك لك الخ: یعنی اس کو میں ہی نکالوں گا۔ آپ کو اس کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث جس میں آپؐ کا ارشاد ہے "أسعد الناس بشفاعتي من قال لا اله الا الله مخلصاً" کے عموم کے لئے یہ شخص ہے۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شفاعت تو آپؐ سب کے لئے کریں گے البتہ اس شخص کو میں نکالوں گا اس صورت میں خصوصیت صرف اخراج کی ہوئی نفس شفاعت کا عموم باقی رہ گیا۔

قوله جبرياء الخ: بکسر الجیم معنی منظم و سلطنت تہر و دبیر۔

حدثنا ابو بکر بن ابی شیبہ قوله وكانت تعجبه الخ: دست کا گوشت اس لئے پسند تھا کہ وہ جلد پک جاتا ہے اور زود ہضم بھی ہوتا ہے، تیز گندی جگہ سے دودھ بھی ہوتا ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آنحضور ﷺ کو ذرا ع کا گوشت اس لئے پسند تھا کہ کاہنگاہ آپؐ گوشت تناول فرماتے تھے اس لئے جلد تناول فرمانا چاہتے تھے، اور دست کا گوشت جلد تیار ہو جاتا ہے، اس لئے پسند تھا کہ اس میں زیادہ انتظار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

فنهس منها نهسة الخ: "نهس" اگے دانت سے پکڑنا، (نوجنا)۔

قوله انا سيد الناس يوم القيامة الخ: تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا اور قرآن میں آپؐ کو تحدیث نعمت کا حکم دیا گیا "واما بنعمة ربك فحدث" سید سے مراد وہ ہستی جو قوم میں سب سے فائق ہو۔ اور غیبتوں میں جس کی طرف رجوع کیا جائے، ظاہر ہے کہ آنحضور ﷺ کو نیا و آخرت میں سردار ہیں۔ قیامت کے دن کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس دن آپؐ کی سیادت ظاہر ہوگی اور سارے انبیاء شفاعت کا معاملہ آپؐ کے حوالہ کر دیں گے، نیز حضرت آدمؑ اور دیگر انبیاء سب آپؐ کے جہنڈا تلے ہوں گے۔

قوله في صعيد واحد الخ: صعد کھلی، ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ قیامت کے دن مختلف موقف ہوں گے، کہیں ہموار زمین ہوگی اور کہیں نیلہ نما حضرت جابرؓ کی حدیث "نحش نحن علی قوم" کا تعلق دوسرے موقف سے ہے۔

قوله فيفذهم البصر الخ: یعنی ایسی برابر زمین ہوگی کہ دیکھنے والوں کے لئے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنے گی۔ اگر

ٹلائی باب نصر سے ہوگا تو خرق کے معنی اور اگر باب افعال سے ہو تو احاطہ کرنے کے معنی ہوں گے، دال اور ذال دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ ابو حاتم حجتی کہتے ہیں کہ محدثین ذال کے ساتھ پڑھتے ہیں، حالانکہ دال کے ساتھ ہے، مقصد یہ ہے کہ محشر کی زمین ہموار ہوگی دیکھنے والا تمام اہل محشر کو دیکھ سکے گا، کوئی اس کی نگاہ سے مخفی نہیں رہے گا۔

قوله وتدنوا الشمس الخ: آفتاب لوگوں سے بہت قریب ہوگا۔ والکرب آفتاب کے قریب ہونے اور کفر سے رہنے کی سخت پڑیٹائی۔

قوله فيقول بعض الناس لبعض الخ: اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی بہت سی باتیں اہل محشر پر مخفی ہوں گی، کیونکہ ساکین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہوں نے دنیا میں اس حدیث کو سنا ہوگا اس کے باوجود وہاں یہ بات مستحضر نہیں ہوگی کہ شفاعت کبریٰ محمد ﷺ کے لئے مخصوص ہے ورنہ تو شروع ہی میں آپ سے درخواست کر لئے ہوتے، دیگر انبیاء کے پاس جانے کی نوبت ہی نہیں آتی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر نسیان طاری کرے گا تاکہ محمد ﷺ کی فضیلت دیگر انبیاء پر سبھی کے سامنے واضح ہو جائے۔

قوله نفسی نفسی الخ: پہلا نفسی مبتدأ اور دوسرا خبر مقصد یہ ہے کہ میں اس بات کا محتاج ہوں کہ میری کوئی شفاعت کرے۔

قوله فانطلق فاتى تحت العرش الخ: جمع انبیاء در سل، ملائکہ پر آپ کی فضیلت اس روایت سے واضح ہے علامہ قرطبی کی رائے یہ ہے کہ آپ کی فضیلت کے لئے یہی بہت کافی ہے، ایسے ہونا کہ موقع پر بھی آپ کو اپنی امت کی قدر ہوگی، اور امتی امتی فرمائیں گے اور دوسرے انبیاء نفسی نفسی کہیں گے۔ جب بڑے بڑے رسول (جن کا تذکرہ روایت میں ہے) پر آپ کی فوقیت ظاہر ہوگی تو جن انبیاء کا تذکرہ نہیں ان پر تو بدرجہ کوئی فوقیت ظاہر ہوگی، کیونکہ یہی حضرات شفاعت کے کام کو انجام دے سکتے تھے، اور جب ان لوگوں نے معذرت ظاہر کر دی، تو دیگر انبیاء کی معذرت خود بخود ثابت ہو گئی اور ان رسولوں کی شخصیتیں کیونکہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں میں بعض ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جو دوسروں میں نہیں ہے، آدم علیہ السلام اس لئے کہ سبھوں کے والد ہیں۔ اور نوح آدم ثانی ہیں۔ حضرت ابراہیم اس لئے کہ ان کی پیروی کا آپ کو صراحتاً حکم دیا گیا ہے۔ اور حضرت موسیٰ اس لئے کہ ان کی امت دوسروں کی بنسبت بہت زیادہ ہے، اور عیسیٰ اس لئے کہ وہ آپ سے قریب ہیں زمانہ کے لحاظ سے بھی، کہ آپ اور عیسیٰ کے درمیان کوئی نبی نہیں آئے، اور اس لحاظ سے بھی کہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ کا نزول ہوگا اور شریعت محمدی کے مطابق زندگی بسر کریں گے اور دوسروں کے فیصلے صادر کریں گے۔

قوله شركاء الناس فيما سوى ذلك الخ: امت کی جو برگزیدہ ہستیاں بلا حساب و کتاب جنت میں جائیں گی اور ان کو جنت کے واسطے دروازہ سے داخلہ کا حکم ہوگا ان کے لئے دوسرے دروازوں سے داخلہ ممنوع نہ ہوگا، بلکہ ان کی شرافت و کرامت کا لحاظ کرتے ہوئے عمدہ ترین دروازہ سے داخلہ کی اجازت ہوگی۔

قوله ان ما بين المصراعين الخ: مصراع، بکسر المیم۔ دروازہ کا کنارہ (چوکھٹ)

قوله كما بين مكة وهجر الخ: بفتح الهاء والجيم، بحرین کا دار السلطنت۔ بحر جوہری نے صحاح میں لکھا



ہے کہ ایک شہر کا نام ہے اور یہ منصرف ہے اور اس کی طرف نسبت ظاہر کرنے کے لئے ہاجری کہا جاتا ہے۔ ابو القاسم زجاجی کہتے ہیں کہ ہجر نہ کر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے یہ وہ ہجر نہیں ہے جہاں مشکاۃ ہوتا تھا جس کا ذکر "اذا كان الماء فلتین من قلال الہجر" میں آیا ہے، یہ ہجر مدینہ منورہ میں ایک گاؤں ہے، اور وہ غیر منصرف ہے۔

قوله او كما بين مكة وبُصرى الخ: بصری بضم الباء مشہور جگہ کا نام ہے یہاں سے دمشق کا فاصلہ تین مرحلہ کا ہے۔  
قوله الاتقولون كيفه الخ: بلا سکتہ کے لئے ہے، وقف کے لئے اخیر میں ملحق کر دیا جاتا ہے۔

قوله وذكر قوله في الكوكب هذا ربي الخ: ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے تین کذب کا صدور ہوا ہے، (۱) انی سقیم۔ (۲) بل فعلہ کبیرہم (۳) حضرت سارہ کی بابت ہذہ اختی۔ اس حدیث میں کواکب کا بھی ذکر ہے تو اس لحاظ سے چار کذب ہو جاتے ہیں، حالانکہ ابن سیرین کی روایت میں حصر کیساتھ تین کا ذکر آتا ہے، اس لئے اس روایت کے لفظ کواکب کی تاویل کرنی ہوگی، ہو سکتا ہے کواکب کا ذکر وہم راوی ہوا اصل میں سارہ ہے اس کو کواکب سمجھ لیا ہو تاکہ عام روایات میں سارہ کا ذکر ہے کواکب کا نہیں، رہا کواکب کو بذاری کہنا یہ بھی خلاف، اقد ہے اس لئے اس کو بھی کذب میں شمار کرنا چاہئے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ بذاری کا کلام، حضرت ابراہیم کی طفولیت کے زمانہ کا ہے اور وہ زمانہ تکلیف کا نہیں ہوتا ہے اس لئے اس کا شمار نہیں کیا گیا۔ اور اگر بلوغ کے بعد کا مانا جائے تو پھر اس کو کلام استغماہی پر محمول کر کے تو بیخ کے لئے کہا جائے گا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم کے خلاف استدلال ہے کہ جو چیز تغیر سے محفوظ نہ ہو اس میں ربوبیت کی صلاحیت نہیں اسی آخری جواب کی طرف اکثر علماء کا رجحان ہے اور اسی لئے اس کا کذب میں شمار نہیں کیا گیا۔  
قوله عضادتي الباب الخ: دروازہ کے دونوں کنارہ کی لکڑی کو عضادہ کہتے ہیں۔

قوله تزلف الخ: نزدیک کرنا باب افعال سے ہے۔ قرآن میں ہے "واذا الجنة ازلفت"

قوله انما كنت خليلا من وراء وراء الخ: حضرت ابراہیم نے تو اضعاف فرمایا ہے یعنی میں اس عالی رتبہ کا مستحق نہیں ہوں، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب نے اس کا ایک اور لطیف معنی بیان فرمایا ہے کہ مجھ پر جو کمالات من جانب اللہ عطا ہوئے، وہ حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے سے ملے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام حق کا سامع بر اور است ہوا ہے، اس لئے اس کام کے حقدار وہی ہیں، رہا "وراء وراء" مکرر اس لئے ذکر کیا گیا کہ آنحضور ﷺ کو شب معراج میں کلام اور دیدار دونوں کی دولت ملی، تو آپ حضرت موسیٰ سے بھی اعلیٰ ہوئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو کا مطلب یہ ہوا کہ میں موسیٰ سے وراء ہوں جو محمد ﷺ سے وراء ہیں اس لئے وراء کو مکرر ذکر کیا گیا ہے۔

قوله وترسل الامانة الرحم الخ: امانت اور رحم کی عظمت اور اہمیت کی وجہ سے دونوں کو پھر اس کے گوشہ میں خاص شکل دے کر کھڑا کر دیا جائے گا، لوگ اس کی صورت ہی سے پہچان لیں گے، شد کے معنی دوڑنے کے ہیں۔ حاشیہ حاشیہ ہے اصل میں حاشیہ تھا اضافت کی وجہ سے نون حاشیہ حذف ہو گیا ہے جانب (کنارہ) کے معنی میں ہے۔ مخدوش بمعنی مجروح۔ مخدوش تعمیر گذر چکی ہے۔

قوله ان قعر جهنم لسبعون خريفاً الخ: یعنی جہنم کے اندرونی حصہ کی مسافت ستر سال کی ہوگی خریف

سال کو کہتے ہیں۔

قوله انا اول الناس يشفع في الجنة الخ: یعنی اپنی گنہگار امت کے داخلہ جنت کی شفا کر دوں گا۔ یا جنت میں جا کر لوگوں کے رفع درجات کی شفاعت کروں گا۔ ممکن ہے کہ یہ شفاعت جنت میں رہ کر ہو، اس کی تائید ہام کی روایت سے ہوتی ہے، الفاظ یہ ہیں "فانستأذن علی ربی فی دارہ فیؤذن لی" حافظ نے فرمایا دارہ سے مراد جنت ہے، دار کی اضافت خدا کی طرف تشریفی اور تخصیص اضافت ہے۔ موقف سے جنت میں منتقل ہونے کی حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ ارضی موقف حساب اور پیشی کا میدان ہے، اس لئے وہ خوف و ہشت کا مقام ہو گا اور شفع کے لئے مناسب ہے کہ وہ محترم اور ممتاز جگہ میں ہو اسی لئے دعا کے لئے بابرکت جگہ کے انتخاب کی ترغیب آئی ہے ایسی جگہ میں دعا قبول ہوتی ہے۔

قوله وانا اکثر الانبياء تبعاً الخ: تتبع تاء اور باہ مفتوح تابع کی جمع ہے امت محمدیہ میں جنتی دو ٹکٹ ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ جس کے متبع زیادہ ہوں گے، متبوع اعلیٰ و افضل ہو گا ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے فضل و کمال کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کے فروغی مسائل میں تقلید کرنے والے زیادہ ہیں۔

### کیا ہر نبی کی دعا قبول ہوگی؟

قوله لكل نبي دعوة يدعوها الخ: ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بہت سی دعائیں مقبول ہوئیں۔ اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک دعا کی قبولیت ہوئی ہے، بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

(۱) اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں مذکورہ روایت میں جس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ایک دعا کے یقینی طور پر مقبول ہونے کا حتمی وعدہ کیا گیا ہے باقی دعاؤں کے بارے میں قبولیت کا حتمی وعدہ نہیں ہے البتہ ان دعاؤں کے بارے میں قبولیت کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(۲) حدیث میں اس دعا کا ذکر ہے جو ساری دعاؤں میں افضل ترین دعا ہے مقصد یہ ہے کہ ہر نبی کی ایک دعا ان کی ساری دعاؤں میں عمدہ ترین ہوتی ہے۔

(۳) ہر نبی کی ایک عام دعا جو انہوں نے اپنی امت کی کامیابی یا ناکامیابی کے لئے کی ہے وہ مقبول ہوئی اور ان کی خاص دعا کا حال یہ ہے کہ بعض ان میں مقبول اور بعض غیر مقبول۔

(۴) ہر نبی کی ایک دعا جو اس کی ذات یا دنیا کیساتھ خاص ہے، یقینی طور پر قبولیت کا وعدہ کیا گیا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے لئے "رب هب لی ملكاً لا ینفی لحد من بعدی" یا حضرت نوح علیہ السلام نے دنیا میں ایک عام عذاب آنے کی دعا کی "رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً" اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے "فہب لی من لدنک ولیاً یورثنی ویورث من ال یعقوب" سے کی اور وہ قبول ہوئی۔

بعض شرح نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث کا تعلق انبیاء کی عام دعاؤں سے نہیں ہے، انبیاء کی تو ساری دعائیں مقبول ہوتی ہیں، مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبی نے اپنی امت پر ہلاکت کی بددعا کی، مگر میں نے اپنی امت پر بددعا نہیں

کی، تو اس کے عوض میں مجھے شفاعت ملی، جو قیامت کے روز اپنی امت کے لئے اس کا استعمال کروں گا، اس جواب پر علامہ طہی نے اعتراض کیا ہے کہ روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بہت سے قبائل پر بددعا کی ہے، جیسے رعل و زکوان پر اور قریش کے بہت سے سرداروں کے نام لے کر بددعا کی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ آنحضور ﷺ نے اپنی امت (دعوۃ) پر بددعا نہیں کی، صحیح نہیں ہے۔ اس لئے بہتر جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کا مقصد یہ ہے کہ ہر نبی نے اپنی امت کے لئے دعائیں کیں، اور وہ دنیا ہی میں ان کے حق میں قبول ہوئیں، اور ہمارے نبی ﷺ نے جب بعض مشرکین پر بددعا کی تو ”لیس لك من الامر شئی او یتوب علیہم“ سے منع کر دیا گیا، لہذا امت کے حق کی دعا محفوظ رہ گئی اور وہ آخرت میں کام آئیں گی۔ بعض شراح مصابیح کا جواب کے شروع میں یہ دعویٰ کرنا کہ انبیاء کی ساری دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ یہ بھی روایت کے خلاف ہے، خود صحیح حدیث میں ہے ”فسألت الله ثلاثاً فاعطانی اثنتین ومنعنی واحدة“

قوله ان اختبئى دعوتى الخ: اختباء بمعنی اختفاء، یہ دعا بروز قیامت گنہگاروں کے لئے کریں گے، کیونکہ یہ لوگ نیکو کاروں سے زیادہ محتاج ہوں گے، یہ آپؐ کے حسن انتخاب اور کمال شفقت پر مبنی ہے۔

قوله فاردت ان يشاء الله الخ: لفظ انشاء اللہ تحرک کے طور پر استعمال ہوا ہے۔  
قوله لكعب الاحبار الخ: کعب بن مالک۔ احبار بمعنی علماء واحد اس کا جبر ہے۔ اصل معنی کتابت کے ہیں، حضرت کعب کا شمار علماء اہل کتاب میں تھا، حضرت ابو بکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں مسلمان ہوئے خلافت عثمانی کے ۳۲ء میں حصص میں ان کی وفات ہوئی، جلیل القدر تابعی تھے بہت سے صحابہ کرام نے ان سے روایت کی ہے۔

قوله فهي نائلة ان شاء الله من مات الخ: من مات محلاً منصوب ہے، مفعول ہونے کی بنا پر اور ”لا یشرون بالله“ حال ہونے کی وجہ سے محلاً منصوب ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے شفاعتی نائلة من مات غیر مشرک، ترسیب اس طرح ہوئی کہ پہلے آپؐ نے اس دعا کو مؤخر کرنے کا ارادہ فرمایا، پھر اس کا عزم کیا، اور اس کی قبولیت کی امید باندھی اور پھر حق تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس کی قبولیت کی اطلاع دی، اس کے بعد جزم کیا تھا قبولیت کا اعلان فرمایا۔

### کیا صرف کلمہ کے ایک جزء پر نجات

در میان حدیث یہ بات آئی ”یخرج من النار من قال لا اله الا الله“ تو کیا کلمہ طیبہ کے صرف ایک جزء پر نجات ہو جائیگی یا شہادت و رسالت کا پایا جانا بھی ضروری ہے، علماء کے مابین اس بارے میں گفتگو ہے، کہ یہ جماعت کو نہی جماعت ہے جس کی مغفرت صرف توحید پر ہو جائے گی۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو کسی رسول کا زمانہ نہیں ملا ہو گا۔ اصطلاح میں ان کو ”اصحاب فترۃ“ کہا جاتا ہے، چونکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول آیا ہی نہیں، اس لئے ایمان بارسالہ کے یہ مکلف بھی نہ ہوں گے، اس لئے ان کی نجات صرف توحید پر ہو جائے گی، اسی لئے حق تعالیٰ ان کو جہنم سے نکالیں گے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی رائے یہ تھی کہ ان حدیثوں میں شہادت رسول کا دوسرا جزء مذکور نہ ہونے کا راز یہ ہے کہ یہ جماعت صرف اسی امت کیساتھ خاص نہ ہوگی، بلکہ سب امتوں کی مشترکہ جماعت ہوگی، اس لئے ان کی نجات کا

مشترک نقطہ بھی عقیدہ توحید قرار پائے گا، رسول پر ایمان اپنے اپنے دور کے اعتبار سے ان میں مختلف تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کو آپ کے ہاتھوں سے نکالا نہیں جائے گا، بلکہ اس کا تکفل وہی فرمائے گا جس کی رحمت کی ساری امتیں اسی طرح متوقع ہوں گی جس طرح پر رسول کی امت اپنے اپنے رسول کی سفارش کی۔ قرآن کریم نے جہاں انفرادی دعوت سے قطع نظر انبیاء علیہ السلام کی مشترک دعوت کو ذکر فرمایا ہے، وہاں صرف توحید ہی کو ذکر فرمایا ہے۔

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحي اليه انه لاله الا انا فاعبدون  
حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر رسول پر اس کے رسالت کی حقانیت کی وحی بھی یقینی طور پر نازل کی گئی ہے لیکن یہ جزع ہر دور کے لحاظ سے مختلف تھا، جو مشترک نقطہ تمام رسولوں کے دور میں کبھی نہیں بدلا، وہ صرف توحید باللہ کا مسئلہ ہے اس کے رسولوں کی سفارش کرنے کے بعد جب اس سفارش کا وقت آیا، جس کا تعلق نہ تو کسی زمان و مکان سے ہو، اور نہ کسی خاص امت سے تو اس کے لئے وہ ذات متکفل ہوگی، جس کی رحمت پر سب بندوں کا حق یکساں ہے، وہ ایک رحم المرحمین کی ذات تھی، مگر خاتم الانبیاء علیہم السلام کی بعثت عامہ کا اثر یہاں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہ رہا، کہ ان کی نجات کی منظوری آپ کی ہی سفارش پر ہوگی، تو اس کا جزو قدرت سے براہ راست خود اپنے ذمہ لے لیا۔

قوله لا يشرك بالله الخ اس میں اس سنت کے اس تحریر کی تائید ہے کہ موجد محمد بنی النار نہیں ہوگا، چہ کہو نہ پر اس امر کہتے ہوئے اس کی موت ہو گئی ہو۔

## باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبکائه شفقة علیہم

حدثني يونس بن عبد الاعلى الصدفي عن عبد الله بن عمرو بن العاص ان النبي صلی اللہ علیہ وسلم تلا قول الله تعالى في ابراهيم عليه السلام رب انهن اضللن كثيرا من الناس فمن تبعني فانه مني الآية وقال عيسى عليه السلام ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفر لهم فانك انت العزيز الحكيم فرفع يديه وقال اللهم امتي وبكى فقال الله يا جبريل اذهب الي محمد وربك اعلم فاسئله ما يبكيك فاتاه جبريل عليه السلام فساله فاخبره رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بما قال وهو اعلم فقال الله تعالى يا جبريل اذهب الي محمد فقل انا سنرضيك في امتك ولا نسوك. (مسلم ص ۱۱۳)

عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے اللہ کا قول جو حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن میں مذکور ہے، تلاوت فرمائی، اے ہمارے رب! بت بہت لوگوں کی گمراہی کا سبب بن گئے جنہوں نے میری پیروی کی دوسرے طریقہ پر ہیں، آخری آیت تک اور عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا (جو قرآن میں مذکور ہے) اگر آپ ان کو عذاب دیں، تو یہ لوگ تیرے بندے ہیں، اور اگر ان کو بخش دیں، تو آپ سب پر غالب اور حکمت والے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا کرتے ہوئے کہا، اے اللہ میری امت میری امت، (کو عذاب سے بچائے رکھنا) تو اللہ نے جبریل علیہ السلام سے کہا، اے جبریل محمدؐ کے پاس جاؤ، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو خوب جانتا ہے، اور دریافت

کرد کہ کس چیز نے آپ کو دلایا جبرئیل علیہ السلام آئے اور آپ سے دریافت کیا تو آپ نے سارا حال کہہ دیا، اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا بھی خوب علم ہے حق تعالیٰ نے فرمایا اے جبرئیل محمدؐ کے پاس جاؤ، اور کہو کہ ہم آپ کو ضرور راضی کریں گے، آپ کی امت کے مسئلہ میں اور آپ کو غمگین نہیں ہونے دیں گے۔

**تشریح** قوله رب انهن اضللن الخ: سے مراد بت ہے، چونکہ بت ضلالت کا سبب ہے اس لئے اضللن میں نسبت بت کی طرف کر دی گئی۔

قوله فمن تبعني الخ: توحید، اخلاص اور توکل میں میری پیروی کرنیوالا میرا اتباع اور میری جہت میں داخل ہے۔

### خدا کو عزیز و حکیم کہنے کی حکمت

قوله فانك انت العزيز الحكيم الخ: حضرت مسیح علیہ السلام نے "انت الغفور الرحيم" نہیں فرمایا بلکہ "انت العزيز الحكيم" فرمایا، علامہ ابن قیمؒ نے اس کا نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ مقصد حضرت مسیحؑ کا یہ ہے کہ اگر ان گنہگاروں کو آپ بخشیں تو انتہائی عزت اور کمال علم و قدرت اور حکمت کے تحت ہوگی، کیونکہ آپ بخشنے پر مجبور نہیں ہیں، اور جن کو بخشیں گے وہ بر محل ہوگا، کیونکہ جانی کے جرم سے آپ اچھی طرح واقف ہیں، لہذا یہ کمال علم و قدرت اور کمال قوت و حکومت کی دلیل ہوگی بے محل ہونے کا شبہ ہی نہیں ہو سکتا ہے کہ اگر "انت الغفور الرحيم" کہہ جاتا، تو اس میں تعریفیں ہوتیں، کہ سبھوں کو بخشیں خواہ بر محل ہو یا بے محل حالانکہ حضرت مسیحؑ کی یہ دعا میدانِ حشر میں ہوگی جو عظمت و جلال اور انتقام کا موقع ہے۔ اس موقع پر ادب کا قاضیہ ہے کہ مغفرت کو اللہ کے علم و قدرت کے حوالہ کیا جائے اور اس کے منسوب، انت العزيز الحكيم ہی ہو سکتا ہے،

خامصہ یہ ہے کہ انت الغفور الرحيم میں علم و قدرت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ غفارت و رحیمیت کا ذکر ہے، اور میدانِ حشر کے مناسب یہی ہے کہ مغفرت کا تعلق ایسے لوگوں سے کیا جائے، جو مغفرت کے قابل ہیں، اور اس کی مغفرت بر محل ہوئے محل نہ ہو، "انت الغفور الرحيم" میں سبھوں کی مغفرت کی تعریف ہوتی، اور اس میں شریعت کی مغفرت کا بھی اشارہ ہو جاتا، جو "ان الله لا يغفر ان يشرك به" کے خلاف ہو جاتا، اس کے برخلاف حضرت ابراہیمؑ نے دنیا میں "رب انت اضللن كثيرا من الناس فمن تبعني فانك غفور رحيم" سے دعا کی، یہاں حضرت خلیل علیہ السلام کا مقصود یہ ہے کہ اس عالم میں اگر آپ مشرکین پر رحم و کرم، اور بخشش کا برہنہ کریں تو آپ کی ذات غفور رحيم ہے، اور اس کی مغفرت اور رحمت کا طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو شرک سے توبہ کی توفیق دے دیں، اور توحید پر لگا دیں، معصیت سے نکال کر طاعت کا جذبہ پیدا کر دیں ظاہر ہے کہ دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے یہ ایسا ہی ہو گا جیسا کہ آنحضور ﷺ نے مشرکین کے حق میں دعا فرمائی تھی "اللهم اهد قومی فانهم لا یعلمون" یعنی ان لوگوں کو میری معرفت کرو، کہ ہم پر ایمان لے آویں تو خود ہی مغفرت کے مستحق ہو جائیں گے، غرض یہ ہے کہ حضرت خلیل اور مسیح علیہما السلام کی دعائیں اپنی اپنی جگہ بر محل ہیں، یہی کمالِ بلاغت ہے۔

قوله فرفع يديه الخ: اس سے عاشر دفعہ یہ دعا استجاب ثابت ہوتا ہے۔

قوله اللهم امتي امتي الخ: حضرت خلیل اور مسیحؑ کی دعا امت پر، کمالِ شفقت کی دلیل ہے لہذا ان دونوں کے

طریقہ کو اپناتے ہوئے آپ نے اپنی امت کے لئے بھی رو رو کر دعا فرمائی ہے، رو تا اور دعا کرنا دلیل ہے کہ آپ کو اپنی امت سے بے پناہ لگجوتی، اگر دیگر انبیاء کو امت کیساتھ تعلق خاطر تھا تو آپ تعلق خاطر میں اکمل تھے۔

قوله وربك اعلم الخ: جملہ معترضہ حالیہ ہے، فاسئلہ سے جولا علمی کا وہم ہو سکتا تھا، ربک اعلم سے اسکو دور کر دیا۔  
قوله انا سنرضيك ولا نسؤك الخ: یعنی امت کے معاملہ میں آپ ﷺ کو غمزدہ نہیں ہونے دیں گے، رضا کے بعد لاسوء تاکید ہے رضا کی کیونکہ ”سنرضی“ سے شبہ ہو سکتا تھا، کہ بعض امت کے بارے میں، آپ کو راضی کریں گے، اور بعض کے بارے میں راضی نہیں کریں گے، سوء تاکید لاکر ظاہر کیا گیا کہ آپ کی کل امت کی طرف سے آپ کو راضی کریں گے اور کسی طرح کا حزن و ملال آپ کو نہیں ہونے دیں گے، اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ آنحضور ﷺ اپنی ایک امت کو بھی جہنم میں دیکھنا نواہ نہیں کریں گے، اور جب تک آپ کی تمام گنہگار امت جہنم سے نکل نہیں جائے گی اسوقت تک آپ ﷺ راضی نہیں ہوں گے۔

## باب بیان ان من مات علی الکفر فهو فی النار ولا تناله شفاعۃ ولا تنفعه قرابة

جو شخص کفر پر مرے وہ جہنم میں جائے گا اور اسکی شفاعت نہ ہوگی اور بزرگوں کی بزرگی کچھ کام نہ آوے گی۔

(۱) حدثنا ابو بکر بن ابی شیبۃ قال نا عفان قال حماد بن سلمۃ عن ثابت عن انس ان رجلاً قال یا رسول اللہ این اسی؟ قال فی النار قال فلما قفی دعاه فقال ان اسی واباک فی النار.  
(۲) حدثنا قتیبۃ بن سعید وزہیر بن حرب ..... عن ابی ہریرۃ قال لما نزلت هذه الآیۃ وَأَنْذِرْ عَشِیرَتَكَ الْأَقْرَبِیْنَ دعا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرِیشًا فَاجْتَمَعُوا فَعَمَّ وَخَصَّ فَقَالَ يَا بَنِي كَعْبٍ انْقَذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِي مُرَّةَ بْنِ كَعْبٍ انْقَذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِي عَبْدِ الشَّمْسِ انْقَذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِي عَبْدِ مَنَاةٍ انْقَذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِي هَاشِمٍ انْقَذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّاسِ يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ انْقَذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّاسِ يَا فَاطِمَةَ انْقَذِي نَفْسَكَ مِنَ النَّاسِ فَاثِي لَا اَمْلَكَ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا غَيْرَ أَنْ لَكُمْ رَحْمًا سَابِلَهَا بَبِلَا لَهَا۔

(۱) انس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ میرا باپ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا دوزخ میں جب وہ پیٹھ سے سوڑ کر چلا تو آپ نے اسکو بلایا اور فرمایا کہ میرا باپ اور تیرا باپ دونوں جہنم میں ہیں۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے جب یہ آیت اتری: ”ذُرِّا تُو اِپنے کتبہ والوں کو“ تو رسول اللہ ﷺ نے قریش کے لوگوں کو بلا بھیجا، وہ سب اکٹھے ہوئے آپ نے عام سب کو ذرا پھر خاص کیا اور فرمایا اے کعب بن لوی کے بیٹو! چھڑو اپنے تئیں جہنم سے۔ اے عبد شمس کے بیٹو! چھڑو اپنے تئیں جہنم سے۔ اے عبد مناف کے بیٹو! چھڑو اپنے تئیں جہنم سے۔ اے ہاشم کے بیٹو! چھڑو اپنے تئیں جہنم سے۔ اے فاطمہ! چھڑو اپنے تئیں جہنم سے اس لئے کہ میں

خدا کے سامنے کچھ اختیار نہیں رکھتا (یعنی اگر وہ عذاب کرنا چاہے تو میں بچا نہیں سکتا) البتہ تم جو مجھ سے ناتار کھتے ہو اس کو میں جو زتار ہوں گا (یعنی دنیا میں تمہارے ساتھ احسان کرتا رہوں گا)

### مقصود حدیث

یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دل میں امت کے لئے خواہ مسلمان ہو، یا غیر مسلم، سب کی خیر خواہی کا بے پناہ جذبہ تھا۔ تمنا یہ تھی کہ تمام لوگ اللہ کی بے پایاں رحمت سے ہمکنار ہو جائیں، دنیا میں دولت ایمان سے سرفراز ہو جائیں، اور آخرت میں ابدی اور دائمی چین و سکون کی زندگی نصیب ہو جائے، جنہوں نے دنیا میں آپ کی دعوت کو قبول کر لیا وہ تو بہر حال آخرت کی کامیاب زندگی سے فیضیاب ہو کر ہی رہیں گے، لیکن جو دولت ایمانی سے محروم رہا وہ جنت والی زندگی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو کر رہے گا، ایسے لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قربت دار ہونے کے باوجود آپ کی شفاعت سے بھی محروم رہیں گے، جب انہوں نے اللہ کی رحمت میں آنا ہی گوارہ نہ کیا تو اللہ کو انکی کیا ضرورت؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ جو لوگ کافر رہتے ہوئے اسلام کی اشاعت میں قربانیاں دیتے رہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی برکت سے ان کے عذاب میں تخفیف ہو جائے، مگر آپ کی شفاعت سے وہ جنت کے ہرگز مستحق نہیں ہو سکتے، قانون خداوندی ہے إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ، اور انہیں لوگوں کے بارے میں ہے وَلَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ۔

### حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین جنتی ہیں یا نہیں؟

مسلم شریف کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے والدین جنت سے محروم ہیں۔ امام نووی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ جو لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت سے قبل زمانہ جاہلیت میں بت پرستی کرتے ہوئے مر گئے وہ جہنمی ہیں، اس لئے کہ ان لوگوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی دعوت توحید پہنچی اور اس پر انہوں نے کان نہیں دھرا۔ لیکن علامہ ابن حجر نے زواج میں نکھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ نے خصوصی معاملہ یہ فرمایا ہے کہ آپ کے والدین محترمین کو زندہ فرمایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ علامہ قرطبی اور شام کے حافظ ابن ناصر الدین نے اس حدیث کو صحیح تسلیم کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز و اکرام میں قاعدہ کے خلاف کیا گیا۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب در مختار میں اسی طرح کا مضمون ہے۔ علامہ شامی کہتے ہیں کہ فقہ اکبر میں امام ابو حنیفہ جو تفسیر کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی موت کفر پر ہوئی، اسی طرح مسلم شریف میں ہے کہ میں نے اپنی والدہ کی مغفرت کے لئے پروردگار عالم سے اجازت چاہی تو ہم کو اجازت نہیں ملی۔ تو یہ تصریحات علامہ ابن حجر کی روایت کے معارض نہیں ہے، ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ کے والدین کو زندہ کرنے کا معاملہ اسکے بعد ہوا ہو۔ یہ بات اشاعرہ کے اس ضابطہ پر مبنی ہے کہ جن کی موت زمانہ جاہلیت میں ہوئی اور ان کو کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی، وہ ناجی کہلائیں گے۔ حضرات مازیدیہ کا نظریہ یہ ہے کہ جن کی موت اتنی جلد ہو گئی کہ ان کو توحید کے معاملہ میں غور و فکر کرنے کا موقع نہ مل سکا، اور ایمان و کفر کا عقیدہ قائم کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے، تو ان کو عذاب نہیں ہوگا، البتہ اگر کفر کا عقیدہ رکھایا غور و فکر کی مدت ملنے کے بعد ایمان و کفر کا اعتقاد رکھے بغیر مر گیا تو نجات نہیں ہوگی۔ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے، محققین کی رائے یہ ہے کہ اس

مسند میں سکوت ہی مناسب ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ساتھ ادب ملحوظ رکھنا چاہئے۔ نہ اس کا سوال قبر میں ہوگا اور وہ حشر میں ہوگا۔ والعلم عند اللہ

قوله لما نزلت هذه الآية: یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں پیش آیا ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ میں مسلمان ہوئے ہیں، اس لئے انہوں نے کسی قدیم الاسلام صحابی سے سن کر بیان کیا ہوگا، جن کا نام حذف کر دیا گیا ہے اسی کو محدثین کے یہاں مرسل صحابہ کہتے ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بار آپ نے مکہ مکرمہ میں اپنے خاندان کے لوگوں کو خطاب کر کے جہنم سے بچنے کی تلقین کی ہو، اور پھر دوبارہ مدینہ منورہ میں بنو ہاشم اور ازواج مطہرات اور اپنی اولاد کو تلقین کی ہو، اس کی تائید طبرانی کی روایت سے ہوتی ہے۔ حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں کہ جب آیت ”وانذر عشیرتک الاقربین“ نازل ہوئی، تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کوہ بالا تمام لوگوں کو فرمایا اے بنو ہاشم! جہنم سے بچو، اپنی گردن رہا کرو۔ اے عائشہ بنت ابوبکر! حصہ بنت عمر! یا ام سلمہ! اپنی اپنی گردنیں جہنم سے رہائی کی کوشش کرو، اگر طبرانی کی یہ روایت صحیح ہے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ واقعہ متعدد بار ہوا، پہلا قصہ تو کی زندگی کا ہے، اس لئے کہ اس میں تصریح ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑ پر چڑھ کر احسان فرمایا، اس وقت حضرت عائشہؓ، حضرت حصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، آپ کے پاس کہاں تھیں؟ ان بیویوں سے نکاح مدینہ منورہ میں ہوا، اور مدینہ کے واقعہ میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا موجود ہوتا ممکن ہے، اس صورت میں ”لما نزلت“ جمع کا مطلب یہ ہوگا کہ اس آیت کے نزل کے بعد آپ نے ان لوگوں کو جمع کیا اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آیت کے نزل کے فوراً بعد جمع کیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب ”وانذر عشیرتک الاقربین“ نازل ہوئی، تو قریش کو جمع فرمایا ہو، پہلے عام قریش کو جمع فرمایا، پھر مخصوص لوگوں کو جمع کیا، اور جب دوسری بار ”ورحطک منهم المخلصین“ نازل ہوئی تو خاص بنو ہاشم اور ازواج مطہرات کو جمع فرمایا۔“

قوله انقذوا انفسکم من النار: یعنی اگر مومن نہیں ہیں تو ایمان لا کر، اور اگر مومن ہیں تو ایمان پر باقی رہ کر عذاب الہی سے رستگاری حاصل کرو۔

### صلہ رحمی کو تراوٹ سے تشبیہ دینے کی حکمت

قوله غیر ان لکم رحمًا سابلہا ببلالہا: بلال، بلہ کو فتح اور کسر دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ قاضی عیاض کسر کے ساتھ اور علامہ خطابی فتح کے ساتھ ترجیح دیتے ہیں، ابن متین فرماتے ہیں کہ اکثر لوگ فتح اور بعض لوگ کسر پڑھتے ہیں مگر ابن متین کسر کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلال، بلل کی جمع ہے جیسے حمل کی جمع جمال آتی ہے۔ بلل کے معنی تری کے ہیں، مراد اس سے صلہ رحمی ہے، جیسے بیس کا اطلاق قطع رحمی پر ہوتا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ تری کی خاصیت ہر بکھری ہوئی چیزوں کو جمع کرنا، اور خشکی کی خاصیت ہر مجتمع کو منتشر کرنا، مراد امداد و عطا ہے، گویا قطع رحمی کو تشبیہ دی گئی حرارت سے اور صلہ رحمی کو پانی سے، جو حرارت کو دور کر دیتا ہے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی کو اس زمین سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جب اس کو پانی سے سیراب کیا جائے، تو تروتازہ ہو کر طرح طرح کے پھل و پھول پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح صلہ رحمی سے



دلوں میں محبت والفت پیدا ہوتی ہے، اور جس طرح زمین کو سوکھا چھوڑ دینے سے وہ بخر رہ جاتی ہے اسی طرح صلہ رحمی چھوڑ دینے سے دلوں میں بغض و عداوت پیدا ہوتی ہے، مقصد یہ ہے کہ دلوں میں محبت والفت پیدا کرنے کے جو مشہور و معروف طریقے ہیں سب کو میں انجام دیتا ہوں۔

قوله يا فاطمة بنت محمد الخ: فاطمہ، صفیہ اور عباس کو نصب کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، اور ضمہ بھی پڑھ سکتے ہیں، لیکن نصب کو ترجیح دی گئی ہے، بنت اور ابن کو صرف منصوب ہی پڑھا جاسکتا ہے۔

قوله يا صفية بنت عبد المطلب: حضرت زبیر بن عوام کی والدہ تھیں، ان لوگوں کی تخصیص قریب تر ہونے کی وجہ سے ہے۔

قوله اشتروا انفسكم: یہ تعبیر ہے جہنم سے رہائی کی، عذاب سے بچنے کو تشبیہ دی گئی ہے، شرعہ گویا خدا کی عبادت و بندگی، عذاب جہنم سے رہائی کے لئے دشمن کی طرح ہے اور "ان الله اشتري من المؤمنين انفسهم" میں مومن بائع ہے، جو اپنی جان کو خدا کے ہاتھ بیچ رہا ہے، اور اللہ خریدار ہے، اور دشمن جنت ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ بندہ جب اپنی جان اللہ کے احکام کی ادائیگی اور منہیات سے پرہیز کرنے میں صرف کر ڈالتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے عوض میں پورا دشمن عطا کر دیتا ہے۔

قوله إلى روضة من جبل: روضہ کا واحد روضہ اور رضام ہے، مختلف چٹانیں جو ایک کے اوپر ایک ہو، رملہ مفتوح اور ضاد کو ساکن اور فتح دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ قوله يربأ باهله الخ: یہ مفتوح رملہ ساکن اور اس کے بعد باہ اور اس پر ہمزہ ہے۔ يقرأ کے وزن پر ہے، حفاظت، نگرانی کے معنی میں ہے۔ ربضہ جاسوس اور قوم کا محافظ، جو دشمن کے حملہ سے بچاتا ہے۔ اور عموماً ایسا محافظ جو پہاڑ اور بلندی پر ہوتا ہے تاکہ دوسرے دشمن کو دیکھ کر قوم کو آگاہ کرے۔

قوله فحسنى ان يسبقوه الخ: یعنی دشمن اس سے آگے نہ بڑھ جائے۔ قوله فجعل يهتف الخ: یہ مفتوح، جہ مسکور چڑخا، چلا نا۔ قوله يا صباحاه: یہ کلمہ کسی بڑے حادثہ کے موقع پر بولا جاتا ہے تاکہ قوم جمع ہو جائے، اور تیار ہو جائے۔

قوله ورهطك منهم المخلصين: اس زائد کلمہ کو طبری نے دوسری سند سے عمرو بن مرد سے موصول ذکر کیا ہے، کہ عمرو بن مرد اسکی قرأت کیا کرتے تھے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ قرآن ہو اور بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی ہو۔ اعتراض یہ ہے کہ آیت کریمہ "وانذر عشيرتک الاقربین" میں حکم ہر کفار کو ڈرانے کا ہے اور مخلصین تو صفت ہے مومن کی، تو اس کا ماقبل سے کیا جوڑ ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ از قبیل عطف خاص علی العام ہے۔ انذر عشيرتک الاقربین عام ہے، مومن غیر مومن دونوں کو، پھر اس پر رھط مومن کا عطف تعظیم و تاکید کے لئے کر دیا گیا ہے۔

قوله ارأيتم لو اخبرتمكم الخ: چونکہ اہل عرب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از نبوت ہر غائبانہ بات میں سچا مانتے تھے اسی نظریہ کی تائید کرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا، حضرت علیؓ کی حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عرب کا کوئی جوان میرے علم میں ایسا نہیں ہے جو دین و دنیا کی مجھ سے بہتر خبر لیکر آیا ہو۔ قوله بسفح هذا الجبل الخ: سین مفتوح، دامن کوہ۔ قوله تبا لك الخ: تبا، خسارہ کے معنی میں ہے۔ قوله فنزلت هذه السورة تثبت يدا ابى لهب الخ: ابولہب کہتا تھا کہ محمدؐ ہم سے ان چیزوں کا وعدہ کرتے ہیں جو مرنے

کے بعد ملیں گی، ہم کو تو وہ چیزیں ہوتی نظر نہیں آتیں، پھر دونوں ہاتھوں سے خطاب کر کے کہتا "تبا لکما مما اری فیكما شیئاً مما یقول محمد" تم دونوں ٹوٹ جاؤ، کہ میں تمہارے اندر اس میں سے کوئی چیز نہیں دیکھتا، جو محمد بیان کرتا ہے۔

### سورۃ تبت کا سبب نزول

حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ کوہ صفا پر چڑھ کر سب کو پکارا، آپ کی آواز پر تمام لوگ جمع ہو گئے، آپ نے نہایت موثر انداز میں اسلام کی دعوت دی، ابولہب بھی موجود تھا، بعض روایات میں ہے کہ ہاتھ جھٹک کر کہنے لگا، تبا لک سائر الیوم الہذا جمعنا، یعنی تو ربار ہو جائے کیا ہم کو اسی بات کے لئے جمع کیا تھا۔ اور روح المعانی میں ہے کہ اس نے ہاتھوں میں پتھر اٹھایا کہ آپ کی طرف پھینکے۔ غرض اسکی شقاوت انتہاء کو پہنچ گئی، تو اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

### کافر کو کینیت کے ساتھ پکارنا

قاضی عیاض مالکی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ کافر کو کینیت سے پکارا جاسکتا ہے، یہ مسئلہ علماء میں مختلف فیہ رہا ہے جو حضرات منع کرتے ہیں یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس کی کینیت میں تعظیم و تحريم کے معنی پائے جاتے ہوں، لیکن جو کافر کینیت ہی سے مشہور ہو نام سے مشہور نہ ہو تو وہاں کینیت سے پکارا جاسکتا ہے، ابولہب کے بارے میں یہی بات ہے یہ ابولہب سے تعبیر کرنے میں اس کے انجام بد کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جہنم کا نگارہ ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا نام عبد العزی تھا جو قبیح ہے اس لئے بجائے نام کے کینیت ذکر کی گئی۔ قوله کذا قرأ الاعمش الخ: یعنی اعمش نے قرأت مشہورہ کے خلاف لفظ قد کو زیادہ کیا۔

### باب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لابی طالب والتخفیف عنہ بسببہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی وجہ سے ابو طالب کے عذاب میں تخفیف ہونے کا بیان

حدثنا عبید اللہ بن عمر القواریری ومحمد بن ابی بکر مقدمی ..... عن العباس بن عبد

المطلب ان قال یا رسول اللہ ﷺ هل نفعت ابی طالب بشئ فانہ کان یحوطک ویغضب لک قال

صلی اللہ علیہ وسلم نعم هو فی ضحضاح من نار ولو لا ان لکان فی الدرك الاسفل من النار.

حضرت ابن عباسؓ نے کہا رسول اللہ ﷺ کیا آپ نے ابو طالب کو بھی کچھ فائدہ پہنچایا وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے واسطے غصہ ہوتے تھے (یعنی جو کوئی آپ کو ستاتا تو اس پر غصہ ہوتے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں وہ جہنم کے اوپر کے درجہ میں ہیں اور اگر میں نہ ہوتا (یعنی میں ان کیلئے دعاء نہ کرتا) تو وہ جہنم کے نیچے کے درجہ میں ہوتے۔ (جہاں عذاب بہت سخت ہے)

قوله یحوطک الخ: حال مشغوم، مآخوذ ہے حیاطۃ سے، نگہبانی کرنا، حفاظت کرنا۔ حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب دونوں کی وفات ایک ہی سال ہجرت سے تین سال قبل ہوئی، حضرت خدیجہؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلام کے معاملہ میں بے مددگار اور باعث سکون قلب تھیں، اور ابو طالب دشمنوں کے مقابلہ میں دست و بازو تھے۔ ابو طالب کی وفات کے بعد قریش

آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے، جن ایذا رسانیوں کی ابو طالب کی زندگی میں ہمت نہیں کرتے تھے وہ اب سب کچھ کرتے گئے۔ ابو طالب کے بعد بعض قریش آپ کے سر پر خاک ڈال دیتے تھے، ایک باری کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ بن زبیر سے فرمایا کہ ابو طالب کے مرنے کے بعد مجھے قریش ناگوار تکلیفیں پہنچانے لگے۔ قوله ویغضب لك النخ: مقصد یہ ہے کہ دشمنوں کی ہاشمیت حرکتوں کا توڑ و فعل سے دفاع کرتے تھے۔ قوله نعم هو ضحضاح من نار النخ: ضحضاح، قبول پانی جو خدائیک یوں یہاں استعارہ آگ سے ہے۔ قوله لکان فی الدرك الاسفل النخ: درک درہ مفتوح اور ساکن دونوں عربی پڑھا جاتا ہے۔ درک: ششہ کی تہ، دراک ہے، جیسے جمل کی تہ جہاں۔ اور درک باسکون تہ کی تہ اور ک جیسے فلس کی تہ فلس۔ درک اس شخص سے مراد جہنم کا سب سے نچلا حصہ۔ جہنم کے بھی طبقات ہیں اس کے ہر طبقہ کا نام درک ہے۔

قوله وجدت فی غسرات من النار النخ: غسرات اور میم دونوں مفتوح، واحد اس کا غمرہ۔ بسکون التیم، معظم من الشیء۔ علامہ سندنی فرماتے ہیں کہ مقصد یہ ہے کہ ابو طالب کو میں نے اس حال میں پایا کہ ان کے لئے روز قیامت بڑے عذاب کا فیصلہ ہوگا، اگر وہ میری مدد نہ کرے اور میں ان کے حق میں شفاعت نہ کرتا۔ قوله فاخرجته: یعنی میں نے ان کے لئے شفاعت کی جس کے نتیجہ روز قیامت معمولی عذاب کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔

### ایک اشکال

قوله لعنة تنفعه شفاعتی يوم القيامة النخ: لعن کا لفظ امید کے معنی میں آتا ہے، علامہ سندنی فرماتے ہیں کہ یہاں وعدہ کے معنی میں ہے، لہذا یقین کے معنی میں ہو گیا۔ حدیث تنفعه شفاعتی اور آیت کریمہ فما تنفعهم شفاعۃ الشافعیین میں بظاہر تعارض ہے اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) آیت کے عموم سے ابو طالب کی شفاعت کو مستثنیٰ کر لیا جائے، یعنی شفاعت ابو طالب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصیات میں سے ہے۔ (۲) دوسرا جواب حدیث اور قرآن کے نفع کا مفہوم، الگ الگ ہے آیت میں نفع سے مراد جہنم سے نکلنا، اور حدیث میں نفع سے مراد تخفیف عذاب ہے۔ علامہ قرطبی نے اسی جواب پر اعتماد کیا ہے۔ (۳) کافر کو عذاب کفر اور معصیت دونوں پر ہو گا ایسا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض کافر سے اس کے معاصی کے عذاب کو دور کر دے، اور اس سے مقصد شفاعت کرنیوالوں کی دلجوئی ہے، کافر کو بدلہ دینا مقصد نہیں ہے کیونکہ جب انسان کی موت کفر پر ہوتی ہے تو اس کے تمام نیک کام رائیگاں ہو جاتے ہیں۔ حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ کافر کو دنیا ہی میں اس کی نیکیوں کا بدلہ دیدیا جاتا ہے آخرت میں اس کی کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی۔

### ابو طالب کی شفاعت زبان حال سے یا زبان قال سے؟

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ابو طالب کی شفاعت کے بارے میں علما میں اس بات میں اختلاف ہے کہ شفاعت زبان قال سے ہوگی یا زبان حال سے، اگر قوی شفاعت مراد لیں تو آیت کریمہ "فلا تنفعهم شفاعۃ الشافعیین" سے تعارض ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی خصوصیت ہو، اور اگر حالی شفاعت مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ابو طالب نے آپ کے اعزاز و اکرام میں اور دشمنوں کی ایذا رسانی کے دفاع میں انتھک کوششیں کی تھیں، تو اس کے صلہ میں عذاب میں تخفیف کر دی گئی، اسی تخفیف عذاب کو شفاعت سے تعبیر کر دیا گیا۔ تعارض کو دور کرنے کا یہ جواب بھی دیا جاتا ہے کہ

تحفیف عذاب کے بعد بھی ابوطالب کو تحفیف کا احساس نہیں ہوگا، تو اس کو ایسا احساس ہوگا کہ شفاعت کا ہم کو کوئی فائدہ نہیں ہو اور اسکی یہ ہے کہ ابوطالب ایسا محسوس کریں گے کہ میں ہی سب سے زیادہ عذاب میں مبتلا ہوں، کیونکہ جہنم کا عذاب پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتا ہے، اس لئے معمولی معذب انسان بھی یہ سمجھے گا کہ تحفیف کا ہم کو کوئی فائدہ نہیں ہو۔

### کافر کے عذاب میں فرق مراتب

علامہ قرطبی نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جب کافر کو جہنم پر پیش کیا جائے گا اور اس کے سینات کا پلٹ کفر کی وجہ سے بھاری پڑ جائے گا تو اس کے نیک کام نیست و نابود ہو جائیں گے، لیکن عذاب میں فرق مراتب ہوں گے جنہوں نے غلام کو آزاد کیا ہوگا، مسلمانوں سے ہمدردی کا رتاؤ کیا ہوگا، ان کو ایسے کافر کے مقابلے میں عذاب کم ہوگا جنہوں نے زمانہ کفر میں کوئی نیک عمل نہیں کیا ہوگا اور جس کے پاس نیک عمل جتنا ہوگا اس کے مقدار میں عذاب میں تحفیف ہوگی، قرآن کی اس آیت میں بھی مضمون ہے ”ونضع الموازين القسط ليوم القيامة فلا تظلم نفس شيئا“ عائدہ ان خیر نے شارح بخاری علامہ ابن منیر کی یہ تحقیق نقل کی ہے کہ یہاں دو باتیں ہیں، پہلی بات یہ کہ کافر کی طاعت کفر کے ہوتے ہوئے معتبر ہو ہی نہیں سکتی ہے اس لئے کہ طاعت کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ صحیح نیت سے ہو اور یہ بات کافر میں مفقور ہے، دوسری بات یہ ہے کہ کافر کو بعض عمل پر جو بدلہ دیا جائے گا وہ صرف اللہ کے فضل و کرم سے ہوگا اور یہ بات عقائد میں نہیں ہے، ابوحساب وغیرہ کے عذاب میں جو تحفیف ہوگی وہ اللہ کے فضل و کرم سے ہوگی اس سلسلے میں توقف ہی مناسب ہے۔

قوله يعلى منه دماغه الخ: ابن السكيت في رواية في التنازع مضمون ہے کہ دماغ قدم پر بہہ جائے گا، غلبان کے معنی پانی کا کھولنا۔ قوله في اخمص قدمين الخ: اخمص، بروزنا اخمص قدم کے نچلے حصہ کی گہرائی، جو چلتے ہوئے زمین سے نہ لگے۔

قوله كما يغلى الرجل الخ: مرسل تابعی کی ہائری۔ قوله وانه لاهونهم عذابا الخ: اس سے معلوم ہوا کہ جہنمیوں کے عذاب میں تفاوت ہوگا، جس طرح جنتیوں کے نعمتوں میں تفاوت ہوگا۔

### باب الدلیل علی ان من مات علی الکفر لا ینفعہ عمل

کفر کی حالت پر مرنے والے شخص کو اس کا کوئی عمل کام نہ آئے گا۔

حدثنا ابو بکر بن ابی شیبہ قال نا حفص بن غیاث ..... عن عائشة قلت یا رسول اللہ  
ثبت ابن جدعان کان فی الجاهلیة یصل الرحم ویطعم المساکین فهل ذاک نافعة؟ قال لا  
لا ینفعه انه لم یقل یوم رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین. (تحریر مسلم ص ۲۱۹، وسند احمد ص ۱۲۰)

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہ جدعان کا مبتلا جاہلیت کے زمانہ میں تاتے جوڑتا تھا (یعنی تاتے والوں کے ساتھ سلوک کرتا تھا) اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا کیا یہ کام اس کو فائدہ دیں گے (قیامت کے دن) آپ نے فرمایا کہ کچھ فائدہ نہ دیں گے اس نے کبھی یوں نہ کہا۔

اب بات سے متعلق باتیں گزرنی چکی ہیں اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔  
 قوله ابن جُدعان الخ: جیم مضموم دال ساکن بنی تسم بن مرہ کے ایک شخص گزرے ہیں، حضرت عائشہ کے قریب تاروں میں تھے، قریش کے سرداروں میں شمار تھا، نام ان کا عبد اللہ تھا، بڑے مہمان نواز تھے، مہمانوں کے لئے برابر تن بنایا تھا، کہ سبز حیوں کے ذریعہ چڑھنا پڑتا تھا۔

قوله كان في الجاهلية الخ: نبوت سے پہلے کے زمانے میں جہالتوں کی کثرت تھی اس لئے زمانہ جاہلیت نام رکھا گیا۔ قوله يحصل الرحم الخ: صلہ رحمی قریب تاروں پر احسان کرنا۔

قوله انه لم يقل يوماً رب اغفر لي الخ: یعنی بعث بعد الموت پر ایمان نہیں تھا، اور بغیر اس کی تصدیق کئے کوئی عمل معتبر نہیں ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کافر اگر مسلمان ہو جائے تو ان کے زمانہ کفر کے نیک کاموں کا ثواب داجر ملے گا۔

## باب موالاة المؤمنين ومقاطعة غيرهم والبراءة منهم

مومن سے دوستی رکھنے اور غیر مومن سے دوستی قطع کرنے اور ان سے جدا رہنے کا بیان

حدثني احمد بن حنبل قال نا محمد بن جعفر ..... عن عمرو بن العاص قال سمعت

رسول الله ﷺ جهاراً غير سر يقول الا ان آل ابی یعنی فلانا ليسوا لي باولياء وانما ولي الله

وصالح المؤمنين .

عمر بن عاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ پکار کر فرماتے تھے چپے سے نہیں،  
 فلاں کی اولاد میری عزیز نہیں بلکہ میرا ملک اللہ ہے اور میرے عزیز وہ مومن ہیں جو نیک ہوں۔

قوله جهاراً غير سر الخ: جہاراً، کا تعلق منقول سے بھی ہو سکتا ہے، یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات جہر کی حالت میں سنی گئی ہے، اور جہاراً کا تعلق فاعل کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، تو معنی یہ ہو گا کہ میں زور سے کہتا ہوں۔ غیر سر، جہاراً کی تاکید ہے مقصد یہ ہے کہ آپ نے بات خفیہ نہیں کہا بلکہ بلند آواز سے فرمایا۔

قوله فلانا الخ: نام ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے درپے آزاد نہ ہو جائے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ بعض راوی نے نام حذف کر دیا ہے نام کی تصریح کرنے میں فساد کا اندیشہ ہو گا، اپنے اوپر یا دوسروں پر یا دونوں پر۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جن کا نام حذف کیا گیا وہ حکم بن ابی العاص ہیں، مگر عامہ ابن دلق العید نے قاضی عیاض کی تردید کی ہے۔ دمیاطی نے جزم و یقین کے ساتھ کہا ہے فلانا کا مصداق آل ابو العاص، ابن امیہ اور اسی طرف رجحان حافظ ابن حجرؒ کا ہے بلکہ ان کے نزدیک یہی متعین ہیں۔

قوله ليسوا لي باولياء الخ: ولی اور دوست ہونے کی نفی کا تعلق صرف غیر مسلموں سے ہے، مسلمان حضرات سے دوستی کی نفی نہیں ہے گویا کل بول کر جزو مراد لیا ہے۔

قوله وصالح المؤمنين الخ: بعض روایت میں "صالحوا المؤمنين" جمع کا صیغہ ہے سورہ تحریم میں ہے "فان الله هو مولاه وجبريل وصالحوا المؤمنين" حدیث میں دو کو لکھنے میں حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ بولنے

میں محذوف ہے، اس کی نظیر "سندع الزبانية" اسی طرح "یوم بدع الداع" اسی طرح "یمح الله الباطل" میں جس طرح واو بولنے میں محذوف ہے، رسم الخط میں بھی حذف کر دیا گیا ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ میری دوستی خاندانی رشتہ کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ایمانی رشتہ کی بنیاد پر ہے جن کو ایمان سے دوستی ہے ان سے میری دوستی ہے، چاہے میرے قریبتدار ہوں یا نہ ہوں، البتہ قریبتداروں کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرتا ہوں۔

## باب الدلیل علی دخول طوائف من المسلمین الجنة بغیر حساب ولا عذاب

مسلمانوں کے ایک گروہ کا بغیر حساب و عذاب کے جنت میں داخل ہونے کا بیان

حدثنا عبد الرحمن بن سلام بن عبید اللہ الجهمی ..... عن ابی ہریرۃ ان النبی ﷺ قال یدخل من امتی الجنة سبعون الفا بغیر حساب فقال رجل یا رسول اللہ ادع اللہ تعالیٰ ان يجعلنی منهم قال اللهم اجعله منهم ثم قام آخر یدع رسول اللہ ﷺ ان يجعلنی قال سبقک بها عکاشہ.

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے، ایک شخص بولا یا رسول اللہ! اللہ سے دعا کیجئے خدا مجھ کو بھی ان لوگوں میں سے کر دے، پھر دوسرا اٹھا اور بولا یا رسول اللہ! دعاء کیجئے خدا مجھ کو بھی ان لوگوں میں سے کر دے آپ نے فرمایا عکاشہ تجھ سے پہلے یہ کام کر چکا۔

ترجمہ

بے حساب کتنے لوگ جنت میں داخل ہوں گے؟

قوله سبعون الفا بغیر حساب الخ: ستر ہزار سے وہ حضرات مراد ہیں جو مستقل ہوں گے اور جو ان کے متبعین ہوں گے وہ ان کے واسطہ میں، مسند احمد اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے سوال کیا تو حق تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ آپ کی امت کے ستر ہزار کو بغیر حساب و عذاب کے جنت میں داخل کروں گا۔ پھر میں نے زیادہ کی درخواست کی تو ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار داخل کرنے کا وعدہ فرمایا۔ یہی مضمون ترمذی کی روایت میں ہے، حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے میرے رب نے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت کے ستر ہزار کو بغیر حساب و عذاب کے جنت میں داخل فرما کیجئے۔ اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے۔ صحیح ابن حبان اور طبرانی میں جید سند کے ساتھ یہی مضمون ہے، اور ان میں اتنا اور اضافہ ہے کہ مزید تین لپ اپنے دونوں ہاتھوں سے، اور لوگوں کو بھی جنت میں داخل فرمائیں گے۔ ہر ایک حدیث کا مقصد بے شمار کثیر تعداد میں بے حساب داخلہ کو بتلانا ہے۔

قوله فقال رجل یا رسول اللہ الخ: رجل مبہم عکاشہ بن حصن اسدی رضی اللہ عنہ ہیں۔

قوله اللهم اجعلنی منهم: بعض روایت میں ہے کہ حضرت عکاشہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ میں بھی ان میں داخل ہوں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں! تم ان میں داخل ہو۔ دونوں حدیثوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ انہوں نے آپ سے دعاء کی درخواست کی تو آپ نے ان کے لئے دعا فرمائی، اسکے بعد عکاشہؓ نے دریافت کیا کہ میرے بارے

میں دعاء قبول ہوئی تو فرمایا کہ قبول ہو گئی۔

قوله ثم قام آخر الخ: یہ کھڑے ہونے والے کوئی انصاری صحابی تھے۔ قوله سبقك عكاشة الخ: ابن بطال فرماتے ہیں کہ سبقك کا مطلب یہ ہے کہ توکل اور دیگر صفات، یعنی بدفالی نہ لینے میں عکاشہ بازی لے گئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ”لست منهم“ کی بجائے ”سبقك عكاشة“ فرمانے میں مصلحت یہ ہے کہ لست منهم فرمانے میں انصاری صحابی کی دل شکنی ہو جاتی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ کی رنجوئی کا لحاظ فرماتے تھے۔

(۱) علامہ ابن جوزی بیان فرماتے ہیں ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ پہلے صحابی نے صدق دل سے سوال کیا تھا، اس لئے ان کے حق میں دعا قبول ہو گئی اور دوسرے کی درخواست پر ”سبقك عكاشة“ فرمانے میں یہ مصلحت ہو کہ اگر ان کے لئے بھی دعاء کر دی تو تیسرے اور چوتھے لوگ بھی سوال کریں گے، اس طرح سوالات کا سلسلہ لمبا ہو جائے گا اور ہر شخص میں اس کی صلاحیت نہیں ہے اس لئے سلسلہ سوال کو بند کرنے کے لئے سبقك عكاشة فرمادیا۔

(۲) علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے دوسرے صحابی میں عکاشہ جیسے صفات نہ ہوں، اس لئے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا اور نہ حاضرین میں سے ہر شخص کے بعد دیگرے یہی سوال کرتا اس لئے سلسلہ سوال کو آپ نے دوسرے صحابی کے سوال پر بند کر دیا (۳) امام نووی فرماتے ہیں اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بذریعہ وحی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عکاشہ کے حق میں قبولیت دعا کی اطلاع دیدی گئی اور دوسرے کے حق میں قبولیت کی اطلاع نہیں دی گئی (۴) علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جس وقت عکاشہ نے سوال کیا وہ وقت اجابت تھا جس کا آپ کو علم تھا، اور جب دوسرے صحابی نے سوال کیا تو وقت اجابت ختم ہو چکا تھا ابن اسحاق کی روایت میں ”سبقك عكاشة“ کے بعد وَبَزَّتِ الدَّعْوَةُ یعنی وقت اجابت ختم ہو گیا کی تصریح موجود ہے یہ توجیہات فتح الباری میں ہیں۔

قوله يدخل الجنة من امتي الخ: امتی کی قید دوسری امتوں سے مذکورہ عدد کو نکالنے کے لئے ہے البتہ ام سابقہ کے بعض وہ افراد جن میں عکاشہ جیسے صفات ہوں ان کے بلا حساب و عذاب جنت میں جانے کی نفی نہیں ہے جیسے انبیاء، شہداء و صدیقین و صالحین وغیرہ۔

### عکاشہ کی خصوصیات

عکاشہ کون تھے؟ یہ بنی اسد بن خزیمہ اور بنو امیہ کے خلفاء کے ایک قدیم مسلمان تھے، بڑے خوبصورت تھے ان کی کنیت ابو حصن تھی، مہاجرین بدر میں تھے، ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ نبی کریم نے ان کے حق میں فرمایا کہ عرب کے بہترین گھوڑ سواروں میں عکاشہ ہیں، ابن اسحاق نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ غزوہ بدر میں بڑی جانبازی کے ساتھ لڑے اور جب لڑتے لڑتے ان کی تلوار ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی لکڑی عنایت فرمائی، اور اسی لکڑی سے وہ لڑنے لگے خدا کی شان کہ وہ لکڑی بڑی لمبی سفید تلوار بن گئی، یہ تلوار ان کے پاس محفوظ رہی اور برابر رہی جب ۱۲ھ میں حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں مرتدین سے جنگ ہوئی تو عکاشہ اس جنگ میں شریک تھے اور اسی جنگ میں اس کی شہادت ہوئی۔

قوله يرفع نمرة عليه الخ: نمرہ نون مفتوح، میم کسور، اون کی چادر جس میں سیاہ و سفید دھاریاں ہوں عرب دیہات کے باشندے پہنا کرتے تھے۔

قوله على صورة القمر الخ: یہاں صورت سے مراد صفت ہے یعنی ان کے چہروں کی تابانی چاند کی روشنی جیسی ہوگی جب چاند مکمل ہو جائے اور وہ چودہویں کا چاند ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جنتیوں کے صفات مختلف ہونگے اور جنتیوں کے چہروں کی تابانی حسب درجات ہونگے، یہی حال ان کے حسن و جمال کا ہوگا۔

هم الذين لا يكتوون ولا يسترقون الخ: آنے والی روایت میں ولا یکتویرون کا بھی اضافہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاصانِ خدا کے یہ اوصاف اس لئے بیان فرمائے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ توکل نام ہے خلاف شرع اسباب ترک کرنے کا، اور شریعت کے مطابق اسباب اختیار کرنے کا، لوہے سے داغنے کی ممانعت ترمذی شریف میں حضرت عمران بن حصین کی روایت میں موجود ہے اور تعویذ گندہ کی ممانعت مسلم شریف میں حضرت جابرؓ کی حدیث میں موجود ہے، اور لا عدوی ولا طیرہ کی مشہور حدیث بخاری و مسلم میں موجود ہے، ترمذی میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بدقالی کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حدیث کا مقصد یہ ہے کہ خلاف شرع اسباب کو ترک کر دینا ہے اگرچہ بعض ضرورت کے موقع پر ان اسباب کے اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ علامہ کرمائی فرماتے ہیں بوقت ضرورت لوہے سے داغنے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ شافی مطلق صرف خدا کو سمجھے اسکو صرف ظاہری اسباب کا درجہ دیا جائے۔ ”لا یسترقون“ سے مراد وہ تعویذات ہیں جن میں قرآن و حدیث کے سوا کلمات کفر ہوں اور اسی طرح وہ کلمات جن میں شرک کا احتمال ہو، جیسے وہ الفاظ جن کے معنی معلوم نہ ہوں۔

”لا یطیرون“ یعنی کسی چیز سے بدقالی نہیں لینا چاہئے، خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے خاص بندے وہ ہیں جو مشرکانہ اور جاہلیت کے کاموں سے مکمل پرہیز کرتے ہیں، ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائیکہ ان صفات کے حاملین کی تعداد ستر ہزار سے بھی زائد ہے پھر اتنی ہی تعداد میں منحصر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ہو سکتا ہے کہ ستر ہزار سے کثرت مراد ہو، تحدید مقصود نہیں ہے، حضرت مولانا شبیر احمدؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر ہزار کی تعداد تحدید کے لئے ہے اور حدیث کی مراد یہ ہے کہ رقیہ اور بدقالی کو ترک کرنے کے ساتھ توکل علی اللہ کی قید لگی ہوئی ہے، مقصد یہ ہے کہ تمام امور میں خدا پر توکل کرنا اسبابِ منہیہ کو بالکل ترک کر دینا، اور جائز اسباب اختیار کر کے خدا پر توکل کرنا، ان دونوں کا لحاظ کرنا ہر انسان کے بس کا نہیں ہے۔ ستر ہزار کی تعداد ان حضرات کی ہے جو ان دونوں چیزوں کا پورے کام میں لحاظ کرتے ہیں ایسے لوگوں کی تعداد اتنی ہی ہوگی جو حدیث میں ہے کامل متوکلین اقل قلیل ہیں۔ علامہ حلیمیؒ اس حدیث کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں جن برگزیدہ ہستیوں کا ذکر ہے یہ وہ حضرات ہیں جو دنیا اور اسبابِ دنیوی سے غافل ہیں، نہ تو وہ لوہے سے داغنے کو جانتے ہیں، نہ جھلا پھونک کو جانتے ہیں، بس دنیوی عوارض اور پریشانیوں سے بچنے کے لئے دعا اور توکل علی اللہ کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں ہے، نہ ان کو بیماریوں میں



اطباء کی جستجو ہوتی ہے اور نہ جھاڑ پھونک والوں کی تلاش ہوتی ہے، پس ہر معاملہ میں رضامت بالقضاء کا سہارا لیتے ہیں۔ بعض حضرات اس حدیث کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ رقیہ کے ترک کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ہر وقت اللہ پر توکل ہے اور تقدیر الہی پر راضی برضا رہتے ہیں، باقی اسباب کو محض اسباب کے درجہ میں اختیار کرتے ہیں اور ”ربنا ما خلقت هذا باطلا“ پر عمل کرتے ہوئے احتمالی امر کی نیت سے ان اسباب کو جائز سمجھ کر کرتے ہیں کیونکہ وہ اور قرآن وحدیث کے کلمات سے تعویذات کا ثبوت حدیث و قرآن سے ملتا ہے اس لئے ان اسباب کو بیکار محض بھی نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ بوقت ضرورت عقیدہ کو درست رکھتے ہوئے اسباب کو اسباب محض سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ یہی رجحان علامہ خطابی کا ہے۔ ابن اثیر اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ دنیوی اسباب سے اعراض کرنا، خاصان خدا کا شیوہ رہا ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا اور تعویذات کے استعمال کا جہاں ثبوت ملتا ہے وہ بیان جواز کے لئے ہے، اور ترک اسباب کو عزیمت کا درجہ دیتے ہوئے اسباب کو اس لئے ترک کر دیتے ہیں کہ وہ حضرات توکل کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں، لہذا جو اسباب کو اسباب سمجھ کر استعمال کرتے ہیں وہ بھی متوکل ہیں، اور جو لوگ ترک اسباب کئے ہوئے ہیں وہ توکل کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں۔ علامہ طبرنی فرماتے ہیں کہ توکل کے مستحق وہی حضرات ہیں جن کے دلوں میں خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو، نہ ان کے دلوں میں دردوں کا خوف ہو تا ہے، اور نہ نقصان پہونچانے والے دشمنوں کا، اور نہ وہ لوگ تلاش رزق میں کوشاں رہتے ہیں، اور امراض میں دوا دارو کرتے رہتے ہیں۔ علامہ طبرنی فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ جن کو اللہ پر پورا اعتماد ہو اور اس کا پورا یقین ہو، کہ فیض خداوندی کو کوئی ٹال نہیں سکتا ہے اس عقیدہ کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کی اتباع میں اسباب کو اختیار کر لی تو توکل کے معنی نہیں ہے۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض جنگ کے موقع پر دوڑیں زیب تن فرمائیں، اور سر مبارک پر خود پہنا اور پہرہ کے لئے گھائیوں پر پہرہ دار مقرر فرمایا اور مدینہ کے ارد گرد خندق کھدوائے، اور مشرکین کی ایذاؤں سے بچنے کے لئے حبشہ اور مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا، اور بذات خود مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور خورد و نوش کے سامان مہیا کرنے میں اسباب اختیار کئے اور اپنے اہل و عیال کو خورد و نوش کے سامان عطا فرمائے، اور اس امید پر اسباب رزق کو ترک نہیں فرمایا کہ آسمان سے سامان رزق اترے گا، حالانکہ آپ امام المتوکلین تھے ایک صحابی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اونٹوں کو باندھ دوں یا یونہی چھوڑ دوں تو جواب میں فرمایا باندھ کر خدا پر توکل کرو، معلوم ہوا کہ اسباب کو اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

قوله وعلى ربهم يتوكلون الخ:

### توکل کی حقیقت

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کی حقیقت، یہ ہے کہ خدا پر اتنا کامل یقین ہو جائے کہ منافع کے حصول اور دفع ضرر کی سعی اسباب کی طرف سے کمزور پڑ جائے، لیکن اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اسباب کی تلاش میں رہے، مگر اعتماد اسباب پر نہ ہو۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ توکل اس کا نام نہیں ہے کہ انسان اسباب سے بالکل بے نیاز ہو جائے کیونکہ کبھی توکل کے

خلاف نتیجہ سامنے آئے گا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ وہ شخص گھر میں بیٹھے یا مسجد میں، اور یہ عقیدہ رکھ کر بیٹھے کہ میں کوئی کام نہ کروں اور میرا رزق خود میرے پاس آجائے؟ تو امام احمدؒ نے فرمایا کہ یہ شخص صحیح علم سے جاہل ہے، دلیل میں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا رزق میرے نیزے کے سایہ کے نیچے ہے، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم اللہ پر کماحقہ توکل کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو اسی طرح رزق دے گا جیسے پرندوں کو دیتا ہے وہ صبح کو بھوکا گھونسلہ سے نکلتا ہے اور شام کو بھرپیٹ واپس آتا ہے، گویا پرندہ کو بھی تلاش رزق میں آنا جانا پڑتا ہے، حضرات صحابہ تجارت کیا کرتے تھے اور باغات میں کام کیا کرتے تھے، ان حضرات کا یہ طریقہ ہمارے لئے نمونہ ہے۔

کسب کی مشروعیت کی واضح دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہترین کھانا وہ ہے جو انسان اپنے کسب سے حاصل کرے، اور حضرت دؤد علیہ السلام کھائی کر کے کھاتے تھے حق تعالیٰ نے فرمایا "وَعَلِمْنَا ذَٰلِكُمْ وَلَكُمُ الثَّوَابُ عِندَ اللَّهِ" ایک جگہ حق تعالیٰ نے فرمایا "خُذُوا حِذْرَكُمْ" حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے وعدہ پر اعتماد ہو، اور اس بات کا یقین ہو کہ اللہ کا فیصلہ ہو کر رہے گا، اور تلاش رزق میں اتباع سنت کو ترک نہ کرے، خورد و نوش کے حاصل کرنے کے جو ضروری اسباب ہیں انہیں اختیار کرے، اسی طرح دشمن کی زد سے حفاظت کے لئے ہتھیار بنانا اور استعمال کرنا اور چور و غیرہ کے ڈر سے، گھر کا دروازہ بند کرنا، اور اسکے ساتھ ساتھ صرف اسباب پر دل مطمئن نہ ہو بلکہ یہ یقین ہو کہ کوئی چیز بھی بذات خود نافع نہیں اور ضرر کو دفع نہیں کر سکتی ہے، بلکہ سبب اور حقیقی سبب اللہ کا فعل اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی مشیت سے ہوتا ہے، جس کا میلان اسباب کی طرف ہو اس کا توکل کھوتا ہے اس لحاظ سے متوکلین کی دو قسمیں ہیں،

### توکل کی قسمیں اور محل

(۱) اصل (۲) سالک۔ اصل کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ اسباب حاصل ہونے کے بعد بھی اس کی طرف التفات نہیں کرتا، اور سالک کا التفات گاہ بگاہ اسباب کی طرف ہو جاتا ہے، مگر اس کی کو علم و فکر اور موجودہ ذوق کے ذریعہ دھیرے دھیرے ترقی کر کے اصل کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ ابو القاسم کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ توکل کا محل قلب انسانی ہے، اور اعضاء جوارح کی حرکت توکل کے منافی نہیں ہے، جب بندہ کو اس کا یقین ہو جائے کہ سب کچھ منجانب اللہ ہوتا ہے اس کے آسان کرنے سے آسان ہوتا ہے اور مشکل کرنے سے مشکل ہوتا ہے، جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ توحید میں جس قدر خلوص ہو گا توکل میں اسی قدر کمال آئے گا، کیونکہ بندہ جس قدر غیر اللہ کی طرف التفات کرے گا اس کے نتیجہ میں غیر اللہ کا نقش دل پر قائم ہو گا، اور توکل علی اللہ میں کی آئے گی اسی وجہ سے بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ توکل بغیر اسباب کو ترک کئے صحیح نہیں ہو سکتا ہے، یہ بات ان کی صحیح ہے لیکن اسباب کو دل سے چھوڑنا چاہئے مگر جوارح کا اسباب سے تعلق رہنا چاہئے، پس اسباب سے دل ہٹائے اور اعضاء جوارح سے جوڑے رکھے۔

قوله متماسكون الخ: متماسكون دلو کے ساتھ ہے، اور بعض نسخہ میں متماسکین حال ہونے کی وجہ سے

منسوب ہے۔ متماکین کے معنی بعض، بعض کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے ہوں گے، مقصد یہ ہے کہ صف بندی کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے اور سارے لوگ ایک ہی صف میں ایک دوسرے کے پہلو میں ہو گئے اور ایک ساتھ جنت میں داخل ہوں گے، اس سے جنت کے دروازہ کے غیر معمولی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(نسأ اللہ الکریم رضاه والجنة لنا ولاحبائنا ولسائر المسلمين)

قوله الكوكب الذي انقض الخ: قاف اور ضاد کے ساتھ، گرنے کے معنی میں ہے۔ قوله البارحة الخ: گذشتہ رات، برج سے ماخوذ ہے، زائل ہونے کے معنی میں ہے۔ قوله اما انی لم اکن فی صلوة الخ: اس جملے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کہیں یہ نہ دھوکہ ہو جائے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا، اور میں "لم تقولون ما لا تفعلون" کا مصداق بن جاؤں۔ امام ابو حنیفہؒ کو ایک عورت نے کہا تھا کہ آپ ابو حنیفہ ہیں آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ تہجد گزار ہیں، امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں رات جاگتا نہیں تھا اس کے بعد ہی سے میں شب بیداری کرنے لگا، مجھے شرم آئی کہ کہیں ناکردہ کام سے متصف نہ کیا جاؤں۔

قوله ولكنی لدغنت الخ: زہریلے جانور کا ڈسنا۔ قوله لارقیة من عین الخ: کسی کی نظر لگ جانا۔ قوله ادحمه الخ: حار مضموم اور میم مفتوح، بچھو کا زہریا بچھو کا ڈنگ۔ خطابی کی تحقیق یہ ہے کہ ہرزہ بریل کا کڑہ جیسے سانپ، بچھو۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ کسی اور مرض میں جھاڑ پھونک اتنا نفع بخش نہیں ہے جس قدر نظر زہریلے جانور میں مفید ہے، نبی کریم ﷺ نے خود جھاڑ اور جھاڑنے کی اجازت دی، اگر قرآنی آیات اور اللہ کے ناموں کو پڑھ کر جھاڑا جائے تو جائز ہے، کراہت اس صورت میں ہے کہ غیر عربی کلمات سے جھاڑا جائے کیونکہ بعض کلمات کفریہ ہوتے ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ممانعت زمانہ جاہلیت کے جھاڑ پھونک سے ہو، جس کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس سے قیمتی طور پر آفات ٹل جاتے ہیں اور یہ بھی عقیدہ تھا کہ اس میں کار فرمائی جنوں کی ہوتی ہے۔

قوله ومعہ الرھیط الخ: رھط کی تغیر ہے، دس افراد سے کم کی جماعت کو کہتے ہیں۔

قوله والنبی لیس معہ احد الخ: مقصد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے متبعین کی تعداد میں تفاوت ہے۔ قوله سواد عظیم الخ: سواد بیاض کی ضد ہے، دور سے دکھائی دینے والا شخص۔ قوله انظر الی الافق الخ: افق کنارہ کو کہا جاتا ہے، یہاں مراد ہے آسمان کا کنارہ۔ قوله فاذا سواد عظیم الخ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ مردوں کے چہروں سے آسمان کے کنارے بند ہو گئے تھے، مسند احمد میں ہے کہ میں نے اپنی امت کو دیکھا تو زمین اور پہاڑ کو بھردیا تھا، مجھے اپنی امت کی کثرت سے بہت خوشی ہوئی مجھ سے دریافت کیا گیا کہ اے محمد! آپ راضی ہیں؟ میں نے کہا ہاں!

مخبر میں امت محمدیہ کی پہچان کب ہوگی؟

اسماعیلی نے اعتراض کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امت محمدیہ پر امت موسوی ہونے کا کیسے شبہ ہو گیا حالانکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے اپنی جن امت کو نہیں دیکھا ہے انہیں کیسے پہچان لیں گے؟ تو آپ نے فرمایا چہرہ اور پاؤں کی روشنی سے پہچان لوں گا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جن اشخاص کو

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے افق میں دیکھا اشخاص کی تمیز کے بغیر، صرف کثرت کو دیکھا۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قریب سے دیکھ کر اپنی امت کو پہچان لیں گے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ پہچان اس وقت ہوگی جب حوض کوثر پر امت آپ کے پاس آئے گی۔ قولہ فحاض الناس الخ: فناء اور ضاد کے ساتھ ہے، یعنی حضرات صحابہ باہم گفتگو کرنے لگے اور مناظرہ کرنے لگے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علوم میں مناظرہ اور قصوص شریعہ میں استفادہ اور اظہار حق کے لئے مباحثہ جائز ہے۔ قولہ و ذکر و الاشياء الخ: حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ ہم میں سے بعض نے کہا کہ اسکے مصداق حضرات شہد ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ یہ وہ حضرات ہیں جن کے دلوں میں اسلام کی باتیں سما جاتیں۔

قوله هم الذين لا يرقون الخ:

### علامہ ابن تیمیہ اور مسئلہ تعویذ

علامہ ابن تیمیہؒ نے اس روایت کا انکار کیا ہے، اور ان کا خیال ہے کہ راوی سے غلطی ہو گئی، اور وجہ اسکی یہ بیان کرتے ہیں کہ تعویذ کے ذریعہ علاج کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں جن کا علاج تعویذ سے کرتا ہوں، مریض کے ساتھ اچھا برتاؤ کر رہا ہوں، لہذا ایسی چیز کا ترک مطلوب کیسے ہو سکتا ہے، نیز حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جھاڑ پھونک کیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ کو جھاڑ پھونک کرتے تھے، اور آپ نے امت کو اسکی اجازت دی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو شخص بھی اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اس میں دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا جواب بعض حضرات نے اس طرح دیا ہے کہ ثقہ کی زیادتی قابل قبول ہے، سعید بن جبیر، حافظ اور ثقہ ہیں، بخاری و مسلم نے ان پر اعتماد کیا ہے، اور اس روایت پر امام مسلم نے اعتماد کیا ہے اگر ثقہ راوی کی زیادتی کے صحیح معنی بن سکتے ہیں تو روکی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ جو شخص دوسرے سے جھاڑ پھونک کر اسے وہ کامل متوکل نہیں ہے، اور جو جھاڑ پھونک کرتا ہے وہ بھی کامل متوکل نہیں ہے، جہاں تک معاملہ حضرت جبریل علیہ السلام اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جھاڑ پھونک کرنے کا ہے اس کا مقصد حکم شرعی بیان کرنا ہے، جو شارع کا اہم فریضہ ہے مقصد یہ ہے کہ جھاڑ پھونک ترک کرنا عزیمت ہے، اور کرنا خست ہے۔

قوله لا يتطهرون الخ: یعنی زمانہ جاہلیت کی طرح بد فانی کا عقیدہ نہیں رکھتے ہیں، جاہلیت کے زمانہ میں دستور یہ تھا کہ جب کسی مقصد سے باہر جانے کے لئے گھر سے نکلتے تھے اگر کوئی پرندہ اپنے جانب اڑ جاتا تو مقصد میں کامیابی کی علامت سمجھتے تھے، اور اگر بائیں جانب سے نکل جاتا تو ناکامی کی علامت سمجھتے تھے، اور بعض لوگ تو اس مقصد سے پرندہ کو اڑاتے تھے اگر دائیں جانب سے نکل گیا تو سفر میں نکل جاتے تھے، اور اگر بائیں جانب سے نکل جاتا تو گھر واپس آ جاتے اور اس طرح پرندہ کو دائیں بائیں اڑانے کو سنانے اور ہارج سے موسوم کرتے تھے، سنانع وہ چڑیا جو سفر کرنے والے کے بائیں سے دائیں جانب اڑ جائے۔ اور ہارج جو دائیں سے بائیں جانب کو اڑ جائے۔ سارنج کو باریک اور ہارج کو بے برکت سمجھتے تھے، یہ سب فاسد خیالات تھے جن کو مذہب اسلام نے مٹایا۔

## باب بیان کون ہذا الامة نصف اهل الجنة

جنت کے آدھے لوگ اس امت کے ہونگے

حدثنا هناد بن السرى ..... عن عبد الله قال قال لنا رسول الله ﷺ اما ترضون ان

تكونوا ربع اهل الجنة قال فكبرنا ثم قال اما ترضون ان تكونوا ثلث اهل الجنة قال فكبرنا

ثم قال انى لارجوا ان تكونوا شطر اهل الجنة وساخيركم عن ذلك ما المسلمون فى الكفار الا

كشعرة بيضاء فى ثور اسود او كشعرة سوداء فى ثور ابيض

ترجمہ | عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ جنتیوں کے چوتھائی تم میں سے ہونگے یہ سن کر ہم نے تکبیر کہی (خوشی کے مارے) پھر آپ نے فرمایا کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہوتے کہ تہائی جنتیوں کے تم ہو گے، یہ سن کر ہم نے تکبیر کہی، پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ جنتیوں میں آدھے تم لوگ ہو گے اور اسکی وجہ یہ ہے جو میں بیان کرتا ہوں مسلمان کافروں میں ایسے ہیں جیسے ایک سفید بال سیاہ تیل میں ہو یا ایک سیاہ بال سفید تیل میں ہو۔

قوله اما ترضون ان تكونوا النخ: تدریجی طور پر جنتیوں کی تعداد ذکر کرنے میں خوشی میں اضافہ مقصود تھا۔ قوله فكبرنا النخ: بعض روایت میں فحمدنا ہے، اور بعض میں ففرحوا ہے، ان تمام الفاظ سے قدر مشترک یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ خبر سن کر حضرات صحابہ کو خوشی ہوئی، اور اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا، اور اس نعمت کو عظیم الشان سمجھ کر اللہ کی کبریا کی کا اظہار کیا۔

قوله ان تكونوا شطر اهل الجنة النخ: بعض روایت میں نصف اهل الجنة ہے، اور بعض روایت میں دو تہائی کا ذکر ہے، ترمذی شریف میں ہے کہ میدان حشر میں جنتیوں کی ایک سو بیس صفیں ہونگی، ان میں میری امت کی اسی صفیں ہوں گی، اور طبرانی میں عبد اللہ ابن مسعود کی روایت اسی طرح کی ہے پہلی بار شطر اهل الجنة نہیں فرمایا، اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بار بار کے ذکر سے بات ذہن نشین ہو جائے۔ دوسری وجہ امت محمدیہ کا انتہائی اکرام و اعزاز بتانا ہے، کیونکہ کسی کو بار بار بار لدا و عطا اور پیہم نوازشات ان پر خاص توجہ کی واضح دلیل ہے، اور اس طرح بار بار خوشی دلانا بھی مقصود ہے اور اس کی وجہ سے بندوں کو بار بار خدا کا شکر ادا کرنے کا موقع ملا، اور اس میں قائل ذکر بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بار بار کی خواہش کو پورا کرنا "وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى" کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

قوله كشعرة بيضاء النخ: اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جنتیوں کے مقابلہ میں جہنمیوں کی کتنی بڑی تعداد ہے۔ قوله فى قبة النخ: بعض روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ منی میں چڑا کے ایک قبة سے سہارا لگائے ہوئے تھے۔

قوله اخرج بعث النار النخ: بعث معنی میں مبعوث کے ہے، اصل میں اس لشکر کو کہا جاتا ہے جس کو امیر دشمن کے مقابلے میں بھیجتا ہے، یہاں مقصد یہ ہے کہ جہنمیوں کو غیر جہنمیوں سے جدا کر دو۔ حضرت آدم چو۔ سب کے والدین

ہیں، اس لئے انہیں کو خطاب کیا گیا اور اس لئے بھی کہ آدم علیہ السلام کو جہنمی اور جنتی کی پہچان سے نبی کریم ﷺ کے معراج کی شب میں حضرت آدم علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے دائیں جانب جنتی اولاد ہیں، اور بائیں جانب جہنمی۔ معراج کی حدیث میں اسکی تفصیلات دیکھی جائیں۔

قوله وما بعث النار الخ: ولوعاظفہ ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے تقدیر عبارت ہے سمعت واطعت وما بعث النار یعنی آپ کے حکم کو سنا، اور اس کے امتثال کے لئے تیار ہوں، یہ فرمادیں کہ جہنمیوں کی تعداد کس قدر ہے۔  
قوله من کل الف ستمائة وتسعة وتسعين الخ: بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ ہر سو میں سے ننانوے کو الگ کیجئے، تعداد کو دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کو ترجیح دی جائے حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث پر، کیونکہ ابو ہریرہؓ کی حدیث میں امر زائد کا ثبوت ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنتیوں کی تعداد ایک ہزار میں ایک ہے، اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے مطابق جنتیوں کی تعداد ہزار میں دس ہے لہذا زائد کو ترجیح ہوگی۔

(۲) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عدد کو بالکل نہ دیکھا جائے، بلکہ دونوں حدیث کے قدر مشترک مضمون کو دیکھا جائے دونوں حدیث میں جنتیوں کی تعداد جہنمیوں کے مقابلے میں کم ہے (۳) اور یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ کی حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اولاد میں ہر ایک ہزار میں ایک جنتی ہوگی، اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یاجوج ماجوج کے ماسوا ہر ہزار میں دس ہزار جنتی ہونگے، اور وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ کی حدیث میں یاجوج ماجوج کا ذکر ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یاجوج ماجوج کا ذکر نہیں ہے۔ (۴) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ کی حدیث کا تعلق تمام مخلوق سے ہو، اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کا تعلق صرف امت محمدیہ کے ساتھ ہو۔ (۵) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تقسیم دومرتبہ ہوگی، ایک بار امت محمدیہ کی تقسیم ہے قبل تمام امتوں سے ان میں ہر ہزار میں ایک جنتی اور دوسری بار صرف اس امت کی تقسیم ہوگی تو ان میں ہر ہزار میں دس جنتی ہونگے۔ (۶) اور یہ بھی ممکن ہے کہ جہنمیوں سے مراد کفار اور عاصی مسلمان دونوں کو لیا جائے تو ہر ہزار میں نو سو ننانوے کافر اور ہر سو میں ننانوے گنہگار۔ واللہ اعلم

قوله فذاک حین یشیب الصغیر الخ: قرآن کریم میں ہے "اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ یَوْمَ تَرْوُنَهَا تَدْهَلُ کُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ" اسی طرح ایک اور جگہ قرآن میں ہے "فَکَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ کَفَرْتُمْ یَوْمَ اَیْجَعِلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا" حاملہ کے وضع حمل کے وقت کی تعیین میں علماء کی رائے مختلف ہے۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ دنیا میں صور پھونکنے کے وقت یہ حادثہ ہوگا، بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ حادثہ قیامت میں ہوگا، پہلی صورت میں حقیقی معنی مراد لیں گے اور دوسری صورت میں مجازی معنی مراد لیں گے، کیونکہ قیامت میں نہ حمل ہوگا اور نہ ولادت ہوگی۔ مقصد یہ ہے کہ ایسا ہولناک منظر ہوگا کہ اگر وہاں کوئی حاملہ عورت ہوتی تو اس کا حمل گر جاتا، اہل عرب کہا کرتے ہیں کہ مجھ پر ایسی مصیبت آئی کہ بچہ کہ بچہ پر آئے تو اس مصیبت کی تاب نہ لا کر بوڑھا ہو جائے، مقصد مصیبت کی سختی کو بتانا ہے۔

قوله اینا ذاک الرجل الخ: حضرات صحابہ یہ بات سن کر انتہائی خوف و دہشت کے عالم میں دریافت کیا کہ ہم

میں کتنے لوگ ہیں جو جنت میں جائیں گے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ جب ہمارے سو آدمی میں سے ننانوے جہنمی ہو گئے تو پھر کیا بچ گیا، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ صحابہ کرامؓ رونے لگے۔  
 قوله فان ياجوج وما جوج الف الف: الف سے مراد نو سو ننانوے ہے گویا کسریٰ یعنی ایک کو حذف کر دیا گیا یا تقدیر عبارت الفأ واحد آ۔ علامہ طبریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ وعید اور مذکورہ عدد میں یاجوج ماجوج داخل ہیں۔

### یاجوج و ماجوج کے مختصر حالات

قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ بات صحیح ہے کہ یاجوج ماجوج انسانوں ہی کی قومیں ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں ہیں، قرآن کریم میں ہے ”وجعلنا ذریتہ ہم الباقین“ یعنی طوفان نوح کے بعد جتنے انسان دنیا میں ہیں، وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، تاریخی روایات اس بات پر متفق ہیں کہ دیانت کی اولاد ہیں ان کے حالات کے بارے میں سب سے زیادہ تفصیلی حالات حضرت نورس ابن سمانؒ کی روایت ہے، جو کہ صحیح مسلم اور دیگر مستند کتب حدیث میں منقول ہے، ان احادیث سے حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

(۱) یاجوج ماجوج حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، جمہور محدثین و مورخین نے ان کو یانٹ بن نوحؑ کی اولاد قرار دیتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یانٹ بن نوح علیہ السلام کی اولاد دو القرنین کے زمانہ تک دور دور تک مختلف قبائل، مختلف قوموں اور مختلف آبادیوں میں پھیل چکی تھی۔

یاجوج ماجوج جن قوموں کا نام ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب سد ذوالقرنین کے پیچھے ہی محصور ہوں، ان کے کچھ قبائل سد ذوالقرنین کے باہر ہوں، البتہ ان میں سے جو قتل و غارتگری کرنے والے وحشی لوگ تھے وہ سد ذوالقرنین کے ذریعہ روک دیئے گئے۔ مورخین عام طور سے ان کو ترک اور مغول اور منگولین لکھتے ہیں مگر ان میں سے یاجوج ماجوج نام صرف ان وحشی خونخوار ظالم لوگوں کا ہے، انہی کے برادری کے مغول اور ترک یا منگولین متمدن ہو گئے، وہ اس نام سے خارج ہیں۔ (۲) یاجوج ماجوج کی تعداد پوری دنیا کے انسانوں کی تعداد سے بدرجہا زیادہ کم از کم ہزار میں ایک اور دس کی نسبت سے ہے۔ (۳) یاجوج ماجوج کی جو قومیں سد ذوالقرنین کے ذریعہ ادھر آنے سے روک دیئے گئے ہیں وہ قیامت کے بالکل قریب تک اسی طرح محصور رہیں گے، ان کے نکلنے کا وقت مقررہ ظہور مہدی علیہ السلام اور خروج دجال کے بعد ہوگا، جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کے قتل سے فارغ ہو جائیں گے (۴) یاجوج ماجوج کے نکلنے کے وقت سد ذوالقرنین منہدم ہو کر زمین کے برابر ہو جائے گی، اس وقت یہ یاجوج ماجوج کی بے شمار قومیں بیک وقت پہاڑوں کی بلندیوں سے اترتی ہوئی سرعت رفتار کے سبب ایسی معلوم ہوں گی کہ گویا پھسل پھسل کر گر رہے ہیں، اور یہ لاقعدا وحشی انسان، عام انسانی آبادی اور پوری زمین پر ٹوٹ پڑیں گے، اور ان کے قتل و غارتگری کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے گا، اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی محکم الہی اپنے ساتھی مسلمانوں کو لیکر کوہ طور پر پناہ لیں گے، اور عام دنیا کی آبادیوں میں جہاں تلے یا محفوظ مقامات ہیں وہ ان میں بند ہو کر اپنی جانیں بچائیں گے، کھانے پینے کا سامان ختم ہو جانے کے بعد ضروریات زندگی انتہائی گراں ہو جائے گی، باقی انسانی آبادی کو یہ وحشی قومیں ختم کر ڈالیں گی ان کے دریاؤں کو چاٹ جائے گی۔ (۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان

کے رفقہ کی دعائے پھر یہ مڑی دل قسم کی بے شمار قومیں بیک وقت ہلاک کر دی جائیں گی، ان کی لاشوں سے ساری دنیا بھرت جائے گی ان کی بدبو کی وجہ سے زمین پر بسا مشکل ہو جائے گا۔ (۶) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقہ کی دعائے ان کی لاشیں دریا بردیا غائب کر دی جائے گی اور عالمگیر بارش کے ذریعہ پوری زمین دھو کر پاک صاف کر دی جائے گی، (۷) اس کے بعد تقریباً چالیس سال امن و امان کا دور دورہ رہے گا، زمین اپنی برکات اگل دے گی، کوئی فلس محتاج نہ ہوگا، کوئی کسی کو نہ ستائے گا، سکون و اطمینان آرام و راحت عام ہوگی، (۸) اس امن و امان کے زمانہ میں حج و عمرہ جاری رہے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی حج یا عمرہ کے لئے حجاز کا سفر کریں گے، اسکے بعد مدینہ طیبہ میں وفات ہوگی، اور روضہ انور کے پاس دفن ہو گئے (۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانہ میں پذیرید و وحی خواب میں آپ کو دکھلایا گیا کہ سید و القرنین میں ایک سوراخ ہو گیا ہے جس کو آپ نے حرب کے لئے شرف و فتح کی علامت قرار دی، اس دیوار میں سوراخ ہو جانے کو بعض محدثین نے اپنی حقیقت پر محمول کیا، اور بعض نے اس کا مطلب بطور استعارہ اور مجاز کے یہ قرار دیا ہے کہ اب یہ سید و القرنین کمزور ہو چکی ہے، مایا جوج ماجوج کا وقت قریب آچکا ہے، اور اس کے آثار عرب قوم کا تنزل و انحطاط کے رنگ میں ظاہر ہوں گے۔

### حضرت عیسیٰ اور حضرت مہدیؑ کتنے دن رہیں گے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کا قیام زمین پر چالیس سال ہو گا ان سے پہلے بھی حضرت مہدی علیہ السلام کا زمانہ بھی چالیس سال رہے گا، جس میں کچھ حصہ دونوں ایک ساتھ رہیں گے۔ سید شریف برزنجی نے اپنی کتاب اشراف السلفہ ص ۱۳۵ پر لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا قیام قتل دجال اور امن و امان کے بعد چالیس سال ہو گا، اور مجموعہ قیام پینتالیس ہو گا اور ص ۱۱۲ پر ہے کہ مہدی علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تیس سے کچھ اوپر کچھ سال پہلے ظاہر ہو گئے، اور ان کا مجموعہ زمانہ چالیس سال ہو گا، اس طرح پانچ یا سات سال تک دونوں حضرات کا اجتماع ہو گا اور دونوں کی یہ خصوصیت ہو گی کہ پوری زمین پر عدل و انصاف کی حکومت ہو گی، زمین اپنی اپنی برکات اور خزانے اگل دے گی، لوگوں میں محبت خوب ہو گی، کوئی غریب نہیں ہو گا، سید و القرنین اور یاجوج ماجوج کے یہ وہ معلومات ہیں جو قرآن اور احادیث نے امت کو بتادیئے ہیں اسی پر عقیدہ رکھنا ضروری اور مخالفت ناجائز ہے، باقی رہی اس کی جغرافیائی بحث کہ سید و القرنین کس جگہ واقع ہے اور قوم یاجوج ماجوج کونسی قوم ہے اور اس وقت کہاں کہاں موجود ہے؟ مزید بصیرت اور مخالفین کی بکو اس کا جواب دینے کے لئے علماء امت نے اس سے بحث فرمائی ہے، علامہ قرطبیؒ نے بحوالہ سدی نقل کیا ہے کہ یاجوج ماجوج کے پانچ قبیلوں میں سے ایکس قبیلوں کو سید و القرنین سے بند کر دیا گیا ہے، ان کا ایک قبیلہ سید و القرنین سے اس طرح باہر رہ گیا وہ ترک ہیں، اس کے بعد قرطبیؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک کے بارے میں جو باتیں بتائی ہیں وہ یاجوج ماجوج سے ملتی ہوئی ہیں اور آخر زمانہ میں مسلمانوں کی ان سے جنگ ہوگا صحیح مسلم کی حدیث میں مذکور ہے، پھر فرمایا کہ اس زمانہ میں ترک قوم کی بڑی بھاری تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں نکلی ہوئی ہے جنت کی صحیح تعداد اللہ ہی جانتا ہے، وہی مسلمانوں کو ان کے شر سے بچا سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی یاجوج ماجوج ہیں یا کم از کم ان کا مقدمہ ہیں۔ (۱۰)



قرطبی کا زمانہ چھٹی صدی ہجری ہے، جس میں فتنہ تاتار ظاہر ہوا، اور اسلامی خلافت کو تباہ و برباد کیا ان کا عظیم فتنہ تاریخ اسلام میں معروف اور تاتاریوں کا مغل ترک میں سے ہونا مشہور ہے، مگر قرطبی نے ان کو یا جوج ماجوج کے مشابہ اور ان کا مقدمہ قرار دیا ہے، ان کے فتنہ کو وہ خروج یا جوج ماجوج نہیں بتلایا، جو علامت قیامت میں سے ہے کیونکہ صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ وہ خروج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا۔

اسی لئے علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں ان لوگوں پر سخت رد کیا ہے، جنہوں نے تاتاری ہی کو یا جوج ماجوج قرار دیا، اور فرمایا کہ ایسا خیال کرنا کھلی ہوئی گمراہی ہے، اور نصوص حدیث کے صراحۃً خلاف ہے، البتہ یہ انہوں نے بھی فرمایا کہ بلاشبہ یہ فتنہ یا جوج ماجوج کے فتنہ کے مشابہ ضرور ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اس زمانہ میں جو بعض مؤرخین موجودہ روس یا چین یا دونوں کو یا جوج ماجوج قرار دیتے ہیں اگر اس سے ان کی مراد وہی ہوتی جو قرطبی اور علامہ آلوسی نے فرمایا کہ ان کا فتنہ فتنہ یا جوج ماجوج کے مشابہ ہے تو یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوتا مگر اسی کو خروج یا جوج ماجوج قرار دینا جس کی خبر قرآن و حدیث میں بغور علامت قیامت دی گئی اور اس کا وقت نزول عیسیٰ علیہ السلام بتلایا گیا، یہ قطعاً غلط اور گمراہی اور نصوص حدیث کا انکار ہے۔

دانش بانہ خلیفہ عباسی کا سد ذوالقرنین کی تحقیق کرنے کے لئے ایک جماعت کو بھیجا، اور ان کا تحقیق کر کے آنا، ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا ہے، اور یہ کہ یہ دیوار لوہے کی تعمیر کی گئی ہے، اس میں بڑے بڑے دروازے بھی ہیں، جن پر قفل پڑا ہوا ہے اور یہ شمال مشرق میں واقع ہے، اور تفسیر کبیر و طبری نے اس واقعہ کو بیان کر کے یہ بھی لکھا ہے کہ جو آدمی اس دیوار کا معائنہ کر کے واپس آتا چاہتا ہے تو روٹنا ایسے چٹیل میدان میں اسکو پہونچا دیتے ہیں جو سمرقند کے محاذات میں ہے، بس یا جوج ماجوج کے اجمالی حالات معلوم کرنے کیلئے اتنا ہی اقتباس کافی ہے، کتب اخبار سے منقول ہے کہ یا جوج ماجوج آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں مگر ان کی ماں حولہ نہیں ہیں، بلکہ صورت یہ ہوئی کہ آدم کو احتلام ہوا اور انکا نطفہ مٹی میں ملا تو اسے یا جوج ماجوج پیدا ہوئے۔ نووی نے اس کو جمہور علماء کا قول بتلایا ہے۔

اکثر لوگوں کے نزدیک یا جوج ماجوج عجی ہے، علیت اور عجمہ دو سبب کی وجہ سے غیر منصرف ہے بعض لوگ عربی ہونے کی بھی قائل ہیں، یا تو یہ مشتق ہے "احبیج نار" سے جس کے معنی آگ بھڑکنے کے ہیں، یا اجۃ بالتشدید سے مشتق ہے جس کے معنی اختلاط اور شدت حرارت کے ہیں، یا آج سے مشتق ہے جز تیز دوڑنے کے معنی میں آتا ہے، یا اجاج سے سے مشتق ہے سخت کھار پانی کو کہا جاتا ہے۔ یہ تمام معانی یا جوج ماجوج کے مناسب حال ہیں۔

قوله او كالرقمة في ذراع الحمار الخ: رقم وہ سفید حصہ جو گھوڑا یا گدھا کے اندرون عضو میں ہوتا ہے، اور بکری کے پاؤں میں ہوتا ہے، بلودی کہتے ہیں کہ رقم وہ گول دائرہ ہے جس میں ہال نہ ہوں۔

آخر کتاب الايمان والحمد لله تعالى وصلى الله على خير خلقه وآله وصحبه اجمعين

مرتب: محمد انعام الحق قاسمی، سیتا سڑھی

مدرس دارالعلوم عالی پور توساری

مکرات ۵ رذیقہ ۱۴۲۰ھ



## روضۃ الازہار

### ترجمہ شرح اردو کتاب الآثار

امام ابو حنیفہ اور ان کی فقہ جس طرح کائنات کے اصول و عرف میں فائق ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ”کتاب الآثار“ اسی سید القضا کی تفسیر کا بے مثال شاہکار ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ درس نظامی میں داخل نصاب اور برصغیر (پاک ہند) کے تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔

چونکہ اس کتاب کا اسلوب اختصار کے پہلو کو لئے ہوئے ہے اس لئے ایک عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی ایسی صاحب علم شخصیت اس کی شرح لکھنے کے لئے قلم اٹھائے جس کا علم وسیع، مطالعہ عمیق، اور تحریر کا تجربہ طویل ہو۔ الحمد للہ اللہ رب العزت نے یہ سعادت سے حضرت مولانا محمد حسین صدیقی صاحب دامت برکاتہم کو عطا فرمائی اور یوں کتاب الآثار کے حوالے سے یارانِ مکتبہ دان کی تشنگی دور کرنے کا موقع سے بڑھ کر شائد اراہتمام ہوا۔

”روضۃ الازہار“ مولانا موصوف کی فقہ اسلامی اور کتاب الآثار کی اس خدمت کا نام ہے جو ان کی کئی سالوں کی دن رات محنت شاقہ کا حاصل۔

### خصوصیات

ہر حدیث کا سلیس ترجمہ، مختصر جامع الفاظ میں سہل تشریح، متفقہ مسئلہ پر فقہاء اربعہ کا مسلک، مسائل اربعہ کے دلائل ان کی اصل کتابوں کے حوالوں سے اور ان دلائل کا فقہ حنفی کی جانب سے جواب اور مسلک احناف کی عقلی اور نقلی وجوہ ترجیح اس شرح کی اہم خصوصیات میں سے شمار کی جاتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مولانا محمد حسین صدیقی صاحب نے یہ بھی کمال فرمایا ہے کہ ہر مسئلے پر اپنا حاصل مطالعہ لکھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مآخذ کے حوالے بھی درج کر دیئے ہیں جس سے قاری کے لئے فقہ اسلامی کے وسیع ذخائر کی جانب مراجعت آسان ہو گئی ہے۔

یہ کتاب اپنی اقداریت کے حوالے سے علماء اور طلباء کے ساتھ ساتھ عوام کے لئے بھی یکساں مفید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ آپ کو فقہ اسلامی کی وسیع و عریض لائبریریوں میں پہنچا دیگا۔

زمزم پبلشرز: — شاہ زیب سنٹر گوالی لائن نمبر ۳۳ رتن تلاء و نژاد مقدس مسجد اردو بازار کراچی۔

# نصرة الحديث

— مؤلف —

حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمن صاحب الاعظم امیر الہند

انگریزی دور حکومت میں اسلام اور تعلیمات اسلام کے خلاف بہت سارے فتنے وجود میں آئے جن میں سے بعض اب تک موجود ہیں۔

ان فتنوں میں ایک بڑا فتنہ منکرین حدیث کا ہے جو بڑی قوت سے یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ ہماری رہنمائی کیلئے قرآن کافی ہے، حدیث نبوی کی ہمیں ضرورت نہیں کیونکہ حدیث کا عظیم الشان ذخیرہ قابل اعتماد نہیں ہے اس بات کا اتنے مؤثر انداز سے پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جو جدید تعلیم سے گو آراستہ ہے مگر کتاب و سنت کی تعلیم سے بے بہرہ ہے، اس گمراہ فرقہ کے دھوکے میں آنے لگا۔ منکرین حدیث کے ایسے ہی غلط پروپیگنڈہ کی تردید کیلئے ضرورت حدیث و حجت حدیث کے موضوع پر محدث کبیر حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمن صاحب الاعظم نے ۱۹۳۳ء میں ”نصرة الحديث“ کے نام سے ایک محققانہ کتاب تصنیف فرمائی جس میں فاضل مصنف نے نہ صرف یہ کہ منکرین حدیث کی جانب سے احادیث نبوی کو مجروح کرنے اور انہیں محاذ اللہ ناقابل اعتبار ٹھہرانے کیلئے جو وسوسے سے مسلمانوں کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں یا جو نکتے تراشے جاتے ہیں، کے مسکت جوابات دیئے ہیں، بلکہ ان وسوسوں کا ازالہ کر کے اس قسم کے تمام شیطانی وسوسوں اور منافقانہ الزامات کی بڑی کٹ کر رکھ دی ہیں اور منکرین حدیث کے ایک ایک الزام کے پرچے اڑا دیئے ہیں۔ اسی وجہ سے حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نصرة الحديث“ کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے:

”جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا۔“

ہر عالم و طالب علم کیلئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ الحمد للہ اب یہ گوہر نایاب پاکستان میں پہلی بار زم زم پبلشر کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے، کسی بھی کتب خانے یا براہ راست ہم سے طلب کیجئے۔

زم زم پبلشرز: — شاہ زیب سینئر گوالی لائن نمبر ۳۳ رتن ملاد نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی۔

## عطرِ ہدایہ

اس کتاب میں:

- بیع و تجارت اور دیگر معاملات سے متعلق قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں قدیم و جدید مسائل کا عمدہ پیرایا میں حل پیش کیا گیا ہے۔
- حرام و حلال ذرائع آمدنی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔
- جدید تجارت کے اصول کی شرعی حیثیت، ہندی جدید معاملات، اجارہ کتب اور نئی ایجادات کے حفاظت حقوق، مزدور کارخانے دار اور کمپنیوں کے معاملات اجارہ اور مالیات وغیرہ کے مسائل کا شرعی حل بتایا گیا ہے۔
- حکومتی محاصل میں جائز و ناجائز ٹیکسوں کو واضح کیا ہے۔
- مالیات کے قدیم و جدید مسائل کے ہر پہلو کو حرام و حلال کے شرعی پیمانہ میں الگ الگ واضح کر دیا گیا ہے۔
- فقہ اسلامی کے طلبہ و کلاء اور حلال ذرائع آمدنی کے معنی تجارت پیشہ حضرات کے لئے یہ کتاب ایک نہایت قیمتی تحفہ ہے۔ حرام و حلال ذریعہ معاش سے واقفیت حاصل کر کے حلال کو اختیار کرنے میں دنیا و آخرت دونوں کی نفع مضرب ہے۔

## تلخیص شرح عقیدہ الطحاویہ کی خصوصیات

مخلص نے اپنی تلخیص میں مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کیا ہے:

- ایک جامع مقدمہ علم کلام اور اس کی نشاط و ارتقاء کے بارے میں لکھا ہے۔
- بنیادی عقائد پر الگ الگ نمبرات لگا کر ضبط کے لئے آسان بنا دیا ہے۔
- ہر اساسی عقیدہ کے لئے جلی عنوان لگا کر اس کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔
- ہر عقیدہ کے اثبات کے لئے کتاب و سنت سے مزید دلائل کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔
- ہر عقیدہ کی تشریح کے لئے آسان و عام فہم عبارت کو اختیار کیا گیا ہے۔
- متکلمانہ و فلسفیانہ مباحث کو قلیل القاعدہ سمجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔
- شرح میں جو احادیث مذکور ہیں ان کی اختصار کے ساتھ تخریج بھی کی گئی ہے۔
- متاخرین کے علم کلام پر حسن کا اساس عقلیات مخلص پر ہے۔
- یہ واضح کیا گیا ہے سلف صالحین، صحابہ و تابعین، کا عقیدہ تقویٰ تھانہ کہ تاویل۔
- جن فرقہ ضالہ کا عقیدہ الطحاویہ کے آخر میں ذکر ہے ان کا مختصر تعارف بھی کیا گیا ہے۔

زم زم پبلشرز: — شاہ زیب سینٹر گوالی لائن نمبر ۳۲۱۱ تاج محل روڈ نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی۔

## بہجۃ الدرر

### شرح اردو نزہۃ النظر علی نخبة الفکر

نخبة الفکر علم اصول حدیث کی نہایت جامع کتاب ہے جو حافظ الحدیث علامہ ابن حجر عسقلانی کی تالیف ہے، مصنف نے اصل کتاب کو آسان کرنے کے لئے خود ہی اس کی تشریح بھی فرمائی اور شرح نخبة الفکر کے نام سے یہ کتاب عرصہ سے متداول ہے اہل علم اس سے استفادہ کرتے آرہے ہیں اسی مقبولیت و جامعیت کے پیش نظر رصغیر کے دینی جامعات کے نصاب میں بھی عرصہ دراز سے یہ کتاب شامل ہے اور اس کی متعدد اردو شرحیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔

جناب مولانا محمد ارشاد قاسمی صاحب نے اس کی طرف توجہ فرمائی اور کتاب کا ترجمہ اور حل لغات کے ساتھ مختصر تشریح فرمائی تاکہ لمبی بات کی آکٹاہٹ سے بچتے ہوئے طلبہ اس سے فائدہ اٹھائیں، یہ حل کتاب کے لحاظ سے شرح باوجود اختصار کے مفید ہے، امید ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ اس کی پذیرائی کریں گے۔

## تعلیم و تعلم اور دعوت کے اسلامی اصول و آداب

حصول دین و اشاعت کے رہنما اصولوں کا ایک جامع ترین مجموعہ جس میں کتاب اللہ، اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلاف کے زندہ و جاویدہ آثار و واقعات کی روشنی میں مؤثر، ترتیب سہل و سادہ زبان، عام فہم تشریحات اور بصیرت افروز دلائل کے ساتھ تعلیم و تعلم اور دعوت کے اصول و آداب نمبردار بیان کئے گئے ہیں ہر طالب علم، استاد اور داعی کے لئے بہترین تحفہ۔

## احکام مسافر

جس میں مستند فقہی عبارتوں کے ساتھ سفر سے متعلق ہر ان مسئلوں کا حل پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق جائز و ناجائز سفر سے ہو، یا آداب سفر سے، سفر میں طہارت اور اذان و اقامت سے ہو یا وقت اور قبلہ سے، جماعت و امامت سے ہو، یا سجدہ سہو اور عیدین و جمعہ سے، قضا نماز سے ہو یا سواری پر نماز سے، نماز جنازہ سے ہو یا روزہ و حج سے، زکوٰۃ و قربانی سے ہو یا سفر میں طلاق و عدت اور نفقہ سے، مسجد کے استعمال سے ہو یا سفر میں آمد و رفت اور ملاقات و معائنہ سے ہو۔

زم زم پبلشرز: — شاہ زیب سنٹر گوالی لائن نمبر ۳۲ رتن ٹلاؤ نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی۔